زندگی کے نشیب و فراز کا آئینہ، انسانوں کے ظاہر و باطن کی عکاسی
آدھا چہرہ
محی الدین نواب

بہترین معاشرتی ناول

معاشرے کے جراح محی الدین نواب کے نشتر قلم سے ایک نوکیلی، کٹیلی آب دار کہانی

(حصہ اوّل)

محی الدین نواب

محی الدین نواب ایک نام ہے' ایک پہچان ہے۔ اچھی کہانیوں کی پہچان' بلند پایہ تحریروں کی شناخت۔ نواب کے بارے میں یہ بات بالکل ٹھیک کہی گئی ہے کہ اس کی کہانیاں آنکھوں سے نہیں' دل کی گہرائیوں سے پڑھی جاتی ہیں۔ حقیقتاً وہ الفاظ کا جادوگر ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ لفظوں کی جادوگری میں وہ نفسِ مضمون کو فراموش کردیتا ہو۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی ایک کہانی میں کئی کئی داستانیں بکھری نظر آتی ہیں۔ نواب کا قلم بلاشبہ معاشرے کے جسم پر ایک تیز نشتر کی حیثیت رکھتا ہے' جو اپنے عملِ جراحی سے انہیں کھولتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک وجود پر کئی چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ کالے چہرے.... آدھے چہرے! نواب کو اگر معاشرے کا تلخ ترجمان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا مشاہدہ وسیع ہے اور اس کے قلم میں بے پناہ سچائی ہے۔ معاشرے کا کوئی پہلو اس کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہے۔ لکھنے کے معاملے میں وہ بڑی گہری نظر رکھتا ہے اور ایک عام سی کہانی میں بھی بہت بڑی بات کہہ جاتا ہے۔

نواب' ہمارے بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) پھر لاہور اور لاہور سے کراچی تک انتہائی ہنگامہ خیز حالات سے گزرا ہے۔ اس سفر میں اس نے بے شمار صعوبتیں برداشت کیں' بڑی کٹھن راہوں کو طے کیا ہے۔ تاہم اس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ نواب نے اپنی آنکھوں سے مشرقی پاکستان کا سہاگ اجڑتے دیکھا ہے۔ وہ آگ و خون کے دریا سے گزر کر مغربی پاکستان پہنچا لیکن کراچی آکر ایک عظیم اور ناقابلِ تلافی صدمۂ جانکاہ

سے دوچار ہونا پڑا۔ جب اس کا جوان اور باصلاحیت فرزند ایک سفاک اور بے رحم ڈرائیور کی غفلت کا شکار ہو گیا۔ غالباً یہ غم نواب کی زندگی کا سب سے بڑا غم تھا۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ نواب صرف معاشرتی کہانیوں کا مصنف ہے۔ اگر اس اعتراض کو درست تسلیم کرلیا جائے تو اس میں بھی نواب کی ستائش کا پہلو موجود ہے۔ ظاہر ہے معاشرہ انسانوں سے تخلیق پاتا ہے اور کہانیاں انسانی اقدار سے جنم لیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ نواب کی کہانیاں سچی' صاف اور دوٹوک ہوتی ہیں۔ جو کہانیاں فطرت سے ہٹ کر لکھی جاتی ہیں' ان میں تصنع اور غیر حقیقی پن صاف محسوس ہوتا ہے' جبکہ نواب اس دنیا اور اس دنیا میں بسنے والوں کی کہانیاں تخلیق کرتا ہے' معاشرے کو تہ در تہ کھولتا چلا جاتا ہے۔ لیکن نواب نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس نے تاریخی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور جرم و سزا کے موضوع کو بھی اپنایا ہے۔ سسپنس ڈائجسٹ کی مشہور سلسلے وار کہانی "دیوتا" کی مثال روزِ روشن کی طرح موجود ہے۔ جس نے نہ صرف پڑھنے والوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی بلکہ نواب کی اس تخلیق کو یہ انفرادیت بھی حاصل ہے کہ وہ دنیا کی طویل ترین کہانی کہلائی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں "دیوتا" نے کتابی شکل میں شائع ہو کر جو مقبولیت حاصل کی ہے' وہ پاکستان میں چھپنے اور بکنے والی کتابوں کے ضمن میں ایک ریکارڈ ہے۔

بڑھتی عمر کے ساتھ نواب کی تحریر میں پختگی پیدا ہوئی ہے لیکن اس کی تحریر میں جھنجلاہٹ' مایوسی اور تھکاوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ قاری کو تحریر کے سحر میں جکڑ کر اس تیزی سے آگے بڑھتا ہے کہ بسا اوقات پڑھنے والا بھی اس کا ساتھ نہیں دے پاتا جس کے نتیجے میں وہ کوئی صفحہ یا پیراگراف دوبارہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں نواب کی زیرِ نظر تصنیف "آدھا چہرہ" کو پیش کیا جاسکتا ہے' جو اس کی تحریر کی پختگی اور پلاٹ کی ندرت کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔

"آدھا چہرہ" نواب کی ضخیم ترین تصنیف ہے' بلاشبہ یہ نواب کے ان شہ پاروں میں سے ایک ہے' جس پر وہ خود بھی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں' اسے اردو کے ناولوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہونا چاہیے۔ ہر چند کہ یہ کوئی علامتی کہانی نہیں ہے ورنہ اب عام قاری کا مزاج بدل گیا ہے' سو تحریر کی نہج اور زاویے میں بھی نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ آج کا دور حقیقت پسندی کا ہے اور "آدھا چہرہ" میں یہ فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔

"آدھا چہرہ" ایک ایسی کہانی ہے جو عام آدمی کے درمیان گردش کرتی ہوئی معاشرے کے کئی حساس پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ درحقیقت آج کا مصروف اور تھکا ہوا قاری بوجھل فلسفوں اور الجھی ہوئی تحریروں سے وابستگی نہیں رکھتا۔ وہ سیدھے سادے' عام فہم اور اثر پذیر زبان میں اپنی دنیا اور اپنے ماحول کے بارے میں پڑھنا پسند کرتا ہے۔ "آدھا چہرہ" میں یہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

محی الدین نواب کی یہ عظیم تخلیق ان کتابوں میں سے ایک ہے' جسے ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ امید ہے کہ اسے' بار بار پڑھا جائے گا اور یہ اُردو کی زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ایک ہوگی۔

آدھا چہرہ

عجیب بات ہے' جانور ہر حال میں جانور ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے' دیکھو اس جانور میں کتنی انسانیت ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جانور' انسان بن جائے لیکن ہم کسی آدمی سے بے دھڑک پوچھ لیتے ہیں "ابے تو آدمی ہے یا جانور؟"

بادشاہ جانی نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "چاچا! میں آدمی ہوں آدمی۔ بس جانوروں کی طرح زندگی گزارتا ہوں۔ تم ہی بولو نا کیا کیا جائے؟ اگر آدمی بیل کی طرح ہل نہ چلائے' گدھے کی طرح بوجھ نہ اٹھائے' بکرے کی طرح پان نہ چبائے تو اسے آدمی کون بولے گا۔ ارے اسے تو کوئی اپنی لڑکی بھی نہیں دے گا۔"

چھوٹو نے پچھلے پہیے کی طرف جیک لگاتے ہوئے کہا "واہ بادشاہ جانی' کیا بولتے ہو' کلیجا نکال کے رکھ دیتے ہو۔ کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی آدمی کی ایسی تعریف نہیں کر سکتا۔"

مستری چاچا نے بادشاہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا "ارے تو کیا ہمارا بادشاہ جاہل ہے۔ آٹھ جماعتیں پاس کر چکا ہے۔ ائرپورٹ' کلفٹن اور بندرگاہ سے انگریزوں کی سواریاں اٹھاتا ہے۔ فر فر انگریزی بولتا ہے۔ کیوں رے بادشاہ' تجھے تو کوئی بھی اپنی لڑکی دے سکتا ہے' اچھا کماتا ہے اور رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا مکان بھی بنوالیا ہے۔ بھلا کس بات کی کمی ہے' بس ایک گھر والی کی' ہے نا؟"

بادشاہ نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا "چاچا' میری ٹیکسی میں کتنی ہی لڑکیاں آکر بیٹھتی ہیں مگر کوئی ایسی نہیں ہوتی جسے میں گھر میں لا کر بٹھا سکوں۔ پتا نہیں یہ دل کیا مانگتا ہے' آنکھیں کسے ڈھونڈتی ہیں' جب کسی کو ڈھونڈ لیں گی تو تمہاری قسم اسے بھگا کر لے آؤں گا۔"

"ارے ارے' ایسے کام کے لیے میری قسم کھا رہا ہے۔ مردود' اچھی باتیں سوچا کر' پرائی بہنوں اور بیٹیوں کی بھی عزت ہوتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ سب کی عزت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں جتنی بھی بہنیں اور بیٹیاں ہیں نا' میں سب کی عزت کرتا ہوں۔ پچھلی سیٹ کی طرف مڑ کر انہیں نہیں دیکھتا۔ وہ جو سائڈ مرر ہوتا ہے نا' عقب نما آئینہ! اسے بھی گھما کر دوسری طرف کر لیتا ہوں تاکہ پرائی بہو بیٹیاں نظر نہ آئیں لیکن دیکھو نا چاچا' اتنی بڑی دنیا میں ایک تو لڑکی ایسی ہوگی نا جسے میں بھگا کر لے جانے کا حق رکھتا ہوں۔"

"ارے تو اسی بات کو سیدھی طرح بول نا کہ نکاح پڑھائے گا اور شرافت سے رخصت کر کے لائے گا۔ یہ بدمعاشوں جیسی باتیں کیوں کرتا ہے۔"

"ہم ٹیکسی والوں کو تو کوئی شریف سمجھتا ہی نہیں ہے۔ اگر مجھے کوئی شریف گھرانے کی لڑکی نظر آجائے گی تو کیا وہ لوگ مجھے داماد بنا لیں گے؟"

"بیٹے تم کسی شریف گھرانے کا پتا تو بتاؤ۔ میں تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گا۔"

بادشاہ نے گیراج کے مزدوروں کی طرف منہ کر کے کہا "ایسی بات ہے یارو تو پھر اپنی بھی شادی ہو جائے گی' دعا کرو سب مل کے۔"

سب لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "آمین! اس کے ساتھ ہی ایک نہایت ہی سریلی سی' میٹھی سی آواز سنائی دی "ٹیکسی خالی ہے؟"

سب یک بیک چپ ہو گئے۔ سب کی نگاہیں اس آنے والی پر جم گئیں۔ بادشاہ تو جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ادھر دعا زبان سے نکلے گی' ادھر عرش پر پہنچے گی اور ادھر فرش پر ایک حسین لڑکی نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔

لڑکی کیا تھی' گڑگڑاتی ہوئی دعا کی قبولیت تھی۔ وہ ایسی تھی کہ ویسی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ بادشاہ جانی کا دل دھڑک دھڑک کر اس کو مانگ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اسی کو

ڈھونڈنے کے بعد پا رہی تھیں۔ وہ فیروزی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ اوپر سے ایک سفید ڈاکٹری کوٹ پہنا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک کاپی اور کتاب تھی۔ اس نے کہا "میں ڈاؤ میڈیکل کالج جانا چاہتی ہوں۔"

بادشاہ ہڑبڑا کر آگے بڑھا پھر ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "ہاں ہاں' ضرور آیئے' تشریف لایئے۔"

ٹیکسی کی دوسری طرف سے چھوٹو نے سر اٹھا کر کہا "استاد کیا کرتے ہو۔ کیا بغیر پہیے کی ٹیکسی میں لے جانے کا ارادہ ہے۔ ارے پہیہ تو بدلنے دو۔"

وہ غصے سے بولا "ابے گدھے! ایک پہیہ بدلنے میں اتنی دیر لگا دی۔ اپنے بیوی بچوں کو کیا کھلائے گا؟"

یہ کہہ کر وہ لڑکی کی طرف پلٹ گیا پھر بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے بولا "یہ لوگ کام کم کرتے ہیں اور مسخری زیادہ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے' ابھی ایک منٹ میں گاڑی بالکل فٹ فاٹ ہو جائے گی۔"

لڑکی نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا "اوہ آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔"

بادشاہ جانی نے سر کھجاتے ہوئے اس کی بات کو غور سے سنا پھر بولا "لیٹ' ہاں لیٹ میں سمجھتا ہوں۔ میں انگریزی جانتا ہوں۔ میں آٹھ جماعت تک پڑھا ہوں۔ کوئی بھی انگریزی سواری آتی ہے تو میں اس کو بولتا ہوں کہ میٹر سے نہیں جاؤں گا۔ آتا ہے تو "کم" نہیں تو "گو" بس وہ چلا جاتا ہے۔"

اس کی انگریزی سنتے ہی لڑکی منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔ وہ جلدی سے دوڑتا ہوا مستری چاچا کے پاس آیا پھر آہستگی سے بولا "دیکھو چاچا' وہ مسکرا رہی ہے۔ ایک دم پھنس گئی ہے۔ بس میرا انتظار کرنا۔ میں اسے لے جاؤں گا اور واپسی تک اس کے گھر کا' اس کے ماں باپ کا' اس کے پورے خاندان کا پتا معلوم کر کے آؤں گا۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟ بات پکی ہے نا! میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا ٹیکسی کے پاس چلا گیا۔ وہاں سے چلا کر بولا "ابے او چھوٹو' کیوں میرا کام بگاڑ رہا ہے۔ میں تیری صورت بگاڑ دوں گا۔ جلدی کر۔"

دوسری طرف سے چھوٹو نے چلا کر کہا "بس آخری بولٹ کس رہا ہوں۔ اپنی

سواری کو بٹھاؤ اور گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

بادشاہ جانی نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹرنی صاحبہ' بیٹھ جایئے' گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے' ادھر میں ایکسیلیٹر دباؤں گا' ادھر کالج آجائے گا' ایک دم ہوائی جہاز کے موافق پہنچاؤں گا۔"

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی "مجھے تیز رفتاری سے ڈر لگتا ہے۔ یقیناً مجھے جلدی ہے لیکن میں مرنا نہیں چاہتی' اطمینان سے چلو۔"

بادشاہ نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "میں بھی یہی چاہتا ہوں' اطمینان کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد لڑکی نے چونک کر پوچھا "کیا تم نے میٹر آن نہیں کیا؟"

"جی نہیں' اس کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ ذرا سخت لہجے میں بولی "تم ٹیکسی ڈرائیور لوگ مسافروں کو اس طرح کیوں لوٹتے رہتے ہو؟ میٹر سے کیوں نہیں چلتے؟"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ دراصل آج میں میٹر آن نہیں کروں گا اور نا ہی آپ سے کرایہ لوں گا۔"

وہ حیرانی سے بولی "کیا مطلب؟ کرایہ کیوں نہیں لوگے؟"

"بس کیا بولوں' آج مجھے بڑی خوشی مل رہی ہے۔ میں اتنا خوش ہوں' اتنا خوش ہوں کہ اسی وقت ارادہ کرلیا تھا کہ آپ کو مفت کالج لے جاؤں گا اور کالج سے مفت واپس گھر پہنچاؤں گا۔"

"تعجب ہے' کچھ معلوم تو ہو کہ ایسی کیا خوشی مل گئی؟"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے۔ اب وہ براہ راست یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم مل گئی ہو۔ ابھی اس بات کا یقین کرنا تھا کہ وہ مل بھی جائے گی یا نہیں۔ دل تو دیوانہ ہے' ہر اچھی چیز دیکھ کر مچلنے لگتا ہے۔

پچھلی سیٹ سے لڑکی نے پوچھا "تم نے جواب نہیں دیا' تمہیں ایسی کون سی خوشی مل گئی ہے؟"

"وہ بات دراصل میں یہ ہے کہ وہ جو ہمارے مستری چاچا ہیں نا' وہی وہی' تم نے وہاں گیرج میں دیکھا ہوگا۔ ایک داڑھی والے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔"

لڑکی نے کہا "ہاں' میں نے دیکھا تھا۔ آگے بولو۔"

"آگے کیا بولوں جی۔ شرم آتی ہے۔"

وہ تعجب سے بولی "شرم آتی ہے! تم مرد ہو کر شرما رہے ہو۔ ایسی کیا بات ہے آخر؟"

"بات دراصل میں یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو ٹیکسی ڈرائیور سمجھتا ہوں اور وہ مستری چاچا بولتے ہیں کہ میں انسان ہوں' شریف آدمی ہوں۔ اگر کسی شریف گھرانے کی لڑکی پسند کروں گا تو وہ لوگ مجھے داماد بنالیں گے۔" میں نے کہا "یہ نہیں ہوسکتا۔" مستری چاچا نے کہا "ہوسکتا ہے' بس دونوں میں شرط لگ گئی ہے اور اب وہ کسی شریف گھرانے کی لڑکی سے میری شادی کرادیں گے۔ اس کے ہاں رشتہ مانگنے جائیں گے۔"

"یعنی ابھی رشتہ نہیں مانگا ہے۔ کیا لڑکی کا گھر دیکھ لیا ہے؟"

"شام تک دیکھ لوں گا۔"

"یعنی گھر بھی نہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ رشتہ قبول ہوگا یا نہیں ہوگا اور تم ہو کہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے ہو۔ خواہ مخواہ مجھے مفت کالج لے جاؤ گے اور کالج سے گھر پہنچاؤ گے۔ کیا تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟"

"وقت سے پہلے خوش ہونے والے کو پاگل بولتے ہیں مگر یہ جو امید ہوتی ہے نا' یہ وقت سے پہلے خواب دکھاتی ہے اور خوش کرتی رہتی ہے۔"

"تم نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ پڑھے لکھے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"میں بہت پڑھا لکھا ہوں جی۔ یہ جو میری ٹیکسی ہے نا' یہ بہت بڑی انورسیٹی ہے۔"

"یہ انورسیٹی کیا چیز ہوتی ہے؟"

"وہی جہاں تمہاری جیسی لڑکیاں اور لڑکے پڑھنے جاتے ہیں۔"

"اوہ' یونیورسٹی!"

"ہاں وہی' میں کہہ رہا تھا کہ یہ میری ٹیکسی بہت بڑی انورسیٹی ہے۔ یہاں دنیا کی ہر قوم آکر بیٹھتی ہے' ہر مذہب' ہر نسل کے لوگ اپنی اپنی بولی بولتے ہیں' اپنے اپنے تجربے

بیان کرتے ہیں اور جانے سے پہلے اس ٹیکسی کے چھوٹے سے گھر میں' چھوٹی سی انورسیٹی میں جتنی باتیں چھوڑ جاتے ہیں' وہ سب میرے دماغ میں خزانے کی طرح موجود رہتی ہیں۔"

"کمال ہے' تم بہت اچھی باتیں کرلیتے ہو۔ کسی شریف گھرانے میں تمہارا اٹھنا بیٹھنا رہا تو وہ لوگ تمہیں ضرور اپنا داماد بنالیں گے۔"

"سچ؟" اس نے خوشی سے چیختے ہوئے اچانک ہی بریک لگادیے۔ لڑکی ایک دم سے جھٹکا کھا کر اگلی سیٹ سے ٹکرائی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی "یہ کیا حرکت ہے؟ تم نے اچانک گاڑی کا بریک کیوں لگادیا؟"

وہ پلٹ کر بولا "جی' وہ تم نے اتنی اچھی بات کہہ دی کہ میں خوشی سے گاڑی آگے نہیں بڑھا سکا۔"

وہ پریشان ہوکر بولی "پتا نہیں تم کس قسم کے آدمی ہو۔ ایسے تو تم مجھے مار ڈالو گے۔ گاڑی کو کہیں لے جاکر ٹکرادو گے۔ خدا کے لیے ہوش و حواس میں رہ کر گاڑی چلاؤ۔"

اس نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو چوٹ لگ گئی۔ میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں الو کا پٹھا ہوں۔"

"اب کیوں اپنے آپ کو گالی دے رہے ہو۔ چپ چاپ چلو۔ عجیب آدمی ہو' نا لڑکی کا گھر جانتے ہو' نہ ہی رشتے کی بات ہوئی ہے اور میں خواہ مخواہ تمہارے ساتھ بکواس کیے جارہی ہوں۔"

"ایسی بات مت بولو۔ کوئی خوش ہوتا ہے تو اس کو خوش کرنے والی بات بولنا چاہیے۔ تم نے ابھی ٹھیک کہا کہ پہلے لڑکی کے گھر کا پتا معلوم کرنا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی "ہاں ٹھیک ہے۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

لڑکی نے ایک دم سے چونک کر اس کی طرف دیکھا' پھر پوچھا "تم میرے گھر کا پتا کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"وہ' بس یونہی۔ میں نے کہا تھا نا کہ کالج سے واپسی پر گھر تک پہنچاؤں گا اس لیے

پوچھ رہا ہوں۔"

"اوہ' اچھا' میں ناظم آباد میں عباسی اسپتال کے سامنے رہتی ہوں۔ مکان کا نمبر جے بتیس ہے۔"

"مگر ابھی تو تم جہانگیر روڈ سے میری ٹیکسی میں بیٹھی ہو۔"

"اپنی ایک سہیلی کے گھر گئی تھی۔ مجھے اس کے پاس سے اپنی کتاب اور نوٹس لینے تھے۔"

"نوٹ تو اپنے پاس بھی بہت ہوتے ہیں۔ پانچ کے' دس کے' پچاس کے' سو کے' ہردم جیب میں رہتے ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس نے کالج کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا "میں ٹھیک دو بجے یہاں لینے آجاؤں گا۔"

وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی "نہیں یا تو تم مجھ سے کرایہ لو یا پھر دوبارہ نہ آؤ۔"

"دیکھو جی' میرا دل مت توڑو۔ میں نے کہا نا کہ میں بہت خوش ہوں۔ مجھ کو خوش ہونے دو۔ تمہارا کیا بگڑتا ہے؟"

"میرا کچھ نہیں بگڑتا لیکن یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں دو بجے اپنے کالج کی بس میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔ تم یہاں نہ آنا۔"

"دیکھو' یہاں کوئی انگریزی سواری ہوتی تو میں اس کو انگریزی میں کیا بولتا۔ ہیر آئی ویٹنگ تو او کلاک' میں انگریزی بولنا جانتا ہوں۔ آئی ٹاکنگ گڈ گڈ انگلش۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

وہ پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کے بعد بولی "ہاں تم ٹیکسی ڈرائیور ہو نا' کام چلانے والی انگریزی بول لیتے ہو مگر یہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان نہیں ہے' اس کے لیے تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے۔ اچھا میں جاتی ہوں' آج تم نے میرے پیسے بچا دیے۔ شکریہ۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی پھر کالج کے گیٹ کی طرف ایسی چال چلتی ہوئی گئی جیسے بادشاہ جانی کے دل کی بساط پر چال چل رہی ہو۔ وہ بے چارا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھا رہا۔ پھر سیدھا ہو کر اسٹیئرنگ کی طرف گھوم گیا اور سامنے

ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ اپنے دل کو سمجھانے لگا کہ وہ اس سے دور نہیں گئی ہے' اس کے پاس ہی ہے۔ پیچھے سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے' اسے پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہیے ورنہ وہ غائب ہو جائے گی۔ کتنا دلفریب خیال تھا' وہ اس خیال سے بہلنے لگا۔

اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا کہ وہاں سے اب سیدھا جہانگیر روڈ مستری چاچا کے پاس جائے گا اور وہاں تک کسی سواری کو نہیں بٹھائے گا۔ پچھلی سیٹ پر تو کسی کو بٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ابھی اس کی جانِ تمنّا وہاں بیٹھی ہوئی تھی' وہ اس خیال کو اس سیٹ پر سے نہیں مٹانا چاہتا تھا۔

راستے میں کتنے ہی ضرورت مندوں نے ہاتھ دکھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ ٹیکسی بھگاتا رہا۔ اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے اپنی دماغی آنکھوں سے پچھلی سیٹ پر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے مسکرا کر کہا "میں دو بجے تمہارے پاس آؤں گا۔ ابھی یہ تو بتا دو کہ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔ ارے تم تو شرما رہی ہو۔ دیکھو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ساری زندگی کا سوال ہے۔ شرمانا نہیں چاہیے۔ ایک دم صاف صاف بول دینا چاہیے۔ اگر مجھ میں کوئی برائی ہے' اگر میں اچھا نہیں لگتا تو پھر میں تم کو اچھا بن کر دکھاؤں گا۔ یہ ذرا سا شیو بڑھا ہوا ہے' دو بجے تک سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میں ایسا فٹ فاٹ بن کر آؤں گا کہ تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔"

ایک سگنل کے پاس گاڑی کو رکنا پڑا۔ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا پھر ہانپتے ہوئے بولا "ارے بھئی' اتنے اشارے کر رہا ہوں' ذرا گاڑی تو روک دیا کرو۔ مجھے صدر جانا ہے۔"

بادشاہ نے کہا "مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"میں تمہیں میٹر سے کچھ زیادہ دوں گا۔ مجھے لے چلو۔"

"بولا نا بابا۔ کیوں خالی پیلی مغز خراب کرتے ہو' ہم نہیں جائے گا۔"

"تم ٹیکسی والے اتنا ظلم کیوں کرتے ہو' خالی ٹیکسی لے جاتے ہو اور سواری نہیں بٹھاتے۔"

بادشاہ نے ہاتھ نچا کر کہا "اے خبردار! خالی ٹیکسی مت بولنا' تم اندھے ہو' دیکھتے ہی نہیں پیچھے سواری بیٹھی ہے۔"

"ایں!" اس شخص نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا' پھر سر

کھجاتے ہوئے کہا "کیوں مذاق کرتے ہو بھائی' ٹیکسی تو خالی ہے۔"

بادشاہ نے اس کی پیشانی پر انگلی رکھ کر کہا "تمہاری کھوپڑی خالی ہے۔ تم اندھے ہو' ارے وہاں میری گھر والی بیٹھی ہے۔ ٹھیک سے دیکھو۔"

اتنے میں وہاں سے گزرنے کا سگنل ہو گیا اور وہ ٹیکسی کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ چوراہے کو کراس کرنے کے بعد اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "دیکھا جان! اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اصل بات یہ ہے کہ محبت کسی کو نظر نہیں آتی' وہ اندر ہوتی ہے نا۔"

آگے چل کر کچھ ٹریفک پولیس والے نظر آئے۔ وہاں ایک موٹر سائیکل کے پاس ٹریفک پولیس کا سارجنٹ بھی کھڑا تھا۔ ہاتھ دکھا کر اسے گاڑی روکنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی' پھر ڈیش بورڈ کھول کر اپنا ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ نکالنے لگا۔ سارجنٹ نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہے۔ مجھے ناظم آباد چورنگی تک پہنچا دو۔"

وہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ پولیس سارجنٹ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے سے روکتا۔ ویسے وہ اسے روک کیسے سکتا تھا؟ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ٹریفک پولیس والے تو شاہراہوں کے شہنشاہ ہوتے ہیں۔ ڈرائیوروں کو مرغا بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

وہ مجبوراً گاڑی کو اسٹارٹ کر کے ڈرائیو کرنے لگا۔ اس پر مردنی چھا گئی تھی۔ وہ ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔ اب پچھلی سیٹ کا تصور بالکل ہی مٹ گیا تھا۔ اس نے ذرا نظر اٹھا کر عقب نما آئینے میں دیکھا۔ اس آئینے میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا گول مٹول سا سارجنٹ نظر آیا جو مینڈک کی طرح پھولا ہوا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی ہواؤں کی رو پر اس کی بڑی بڑی مونچھوں کے دونوں سرے پھڑپھڑا رہے تھے۔ سارا تصور فنا ہو گیا تھا۔

سارجنٹ نے ذرا سخت لہجے میں کہا "اے! میٹر آن کر دو۔"

اس نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر میٹر آن کر دیا۔ پھر کہنے لگا "جناب آپ پہلے آفیسر ہیں جو میٹر کے ساتھ چل رہے ہیں ورنہ یہاں ٹریفک پولیس میں جتنے بھی لوگ ہوتے ہیں' وہ گدھا سمجھ کر سواری کرتے ہیں۔ ہمارے دن بھر کا آدھا پیٹرول جلا دیتے ہیں۔ آپ کی

بڑی مہربانی۔"

ناظم آباد چورنگی پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ سارجنٹ پیچھے بیٹھا ہوا اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا پھر دروازہ کھول کر اتر گیا۔ ایک دھڑاکے سے دروازے کو دوبارہ بند کرتے ہوئے بولا "میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہارا میٹر صحیح چل رہا ہے یا نہیں۔ ٹھیک ہے تم ایماندار لگتے ہو' جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ خود وہاں سے چلا گیا۔ بادشاہ جانی اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اسے غصے سے دیکھتا رہا۔ غصہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پلٹ کر میٹر آف کردیا پھر دانت پیس کر بولا "ٹھیک ہے بیٹا' میں ڈبل کرایہ تمہارے باپ لوگوں سے وصول کروں گا۔ آنے دو کسی سواری کو۔ خواہ مخواہ بیچ میں ہم بدنام ہوتے ہیں۔ پبلک بولتی ہے' ہم بدمعاش ہیں۔ میٹر سے نہیں چلتے' کرایہ زیادہ مانگتے ہیں۔ ارے اگر نہ مانگیں گے تو پولیس والوں کا بھتا کہاں سے دیں گے۔ مہاجن کا پیٹ کہاں سے بھریں گے۔ کوئی نہیں سمجھتا۔ بس زبان تالو سے لگائی اور بدمعاش بول دیا۔"

اسی وقت ایک بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی "بیٹا' دھوپ ہے' میرے بچے پریشان ہو رہے ہیں۔ سورج سوا نیزے پر آگیا ہے۔ ہمیں ناگن چورنگی پہنچا دو۔ ایک گھنٹے سے کوئی گاڑی نہیں مل رہی ہے۔"

بادشاہ جانی نے اس کے بچوں کو اور اسے دیکھا' پھر کہا "ماں جی تم جہاں کہو گی پہنچا دوں گا مگر میٹر سے نہیں جاؤں گا۔ ناگن چورنگی کے پندرہ روپے لوں گا۔"

"بیٹا' ایسا ظلم نہ کرو۔ میٹر سے چلو۔"

"میٹر خراب ہے۔ پندرہ روپے دے سکتی ہو تو بیٹھ جاؤ۔"

وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ بوڑھی تھی' مجبوری تھی چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر دھوپ میں نکلی تھی لیکن بادشاہ جانی کو اس پر ترس نہیں آیا کیونکہ ابھی وہ اپنی چوٹ سہلا رہا تھا۔

پہلے اس نے سوچا کہ ناگن چورنگی سے جہانگیر روڈ جائے اور مستری چاچا کو خوش خبری سنائے گا۔ اسے اس لڑکی کے گھر کا پتا بتائے گا لیکن ناگن چورنگی کی سواری ملی تو ارادہ بدل گیا۔ اسے کمانے کی دھن نہیں تھی۔ وہ اپنا حلیہ بدلنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو

اس لڑکی کے شایان شان بنانا چاہتا تھا۔ ناگن چورنگی میں اس کا اپنا مکان تھا اس لیے وہاں جانے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔

وہاں بڑھیا اور بچوں کو اتار کر' ان سے پندرہ روپے وصول کر کے وہ اپنے گھر آیا۔ اس کا مکان اسی گز کے پلاٹ پر تھا۔ ایک کمرہ' ایک باورچی خانہ اور ایک باتھ روم۔ گو کہ چھوٹا سا مکان تھا مگر اچھا خوب صورت تھا۔ باغیچے کے لیے کافی جگہ بچی ہوئی تھی لیکن کبھی پھول کھلانے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ جب وہ اپنے پلاٹ پر پہنچا تو پہلے ویرانی ہی نظر آئی۔ دل نے کہا کہ اگر وہ یہاں آئے گی تو اس کے جوڑے کے لیے پھول کہاں سے لائے گا۔

اس کے مکان کے ساتھ ہی ایک خالی پلاٹ پڑا تھا۔ اسٹیٹ ایجنسی والوں نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ پانچ ہزار میں یہ پلاٹ خرید لے۔ نیو کراچی بہت دور تک پھیلنے والا ہے اور یہ اتنی بڑی آبادی ہو جائے گی کہ کل کو یہ پلاٹ لاکھوں روپے میں فروخت ہو گا لیکن اسے پلاٹ حاصل کرنے' مکانات بنانے اور دولت جمع کرنے کا لالچ نہیں تھا۔ وہ کماتا تھا' کھاتا تھا اور خوب عیش کرتا تھا۔ اس روز اسے پہلی بار خیال آیا کہ وہ ڈاکٹرنی دلہن بن کر یہاں آئے گی تو اسے ایک چھوٹا سا اسپتال کھولنا ہو گا لہٰذا آنے والی کے لیے دوسرا پلاٹ خریدنا بہت ضروری ہے۔

اب وہ ڈھیر ساری باتیں سوچ رہا تھا جو پہلے کبھی اس کے دماغ میں نہیں آئی تھیں۔ اس کے مکان کی دوسری طرف ایک اور مکان بنا ہوا تھا۔ پڑوسن نے دروازہ کھول کر اسے دیکھتے ہوئے کہا "بھائی صاحب' اچھا ہوا آپ آگئے۔ میری بیٹی کی طبیعت خراب ہے...... شام کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے گاڑی لے آؤ گے۔"

اس نے کہا "اگر شام تک ادھر کی کوئی سواری ملی تو تمہاری بیٹی کو ضرور لے جاؤں گا۔ ہاں یاد آیا۔ یہ تمہارے یہاں جو مالی آیا کرتا ہے' کیا وہ میرے یہاں باغیچہ لگا دے گا؟"

"کیوں نہیں لگائے گا' جہاں اسے چار پیسے ملیں گے' وہاں کام کرے گا۔"

"تو ٹھیک ہے بہن جی' آپ میرا یہ کام کردیں۔ مالی سے کہیں کہ وہ آج ہی سے کام

شروع کردے۔ یہاں بہت خوب صورت سا باغیچہ لگادے' میں آپ کی بیٹی کو کسی وقت
بھی آکر ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"

وہ مگن تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے بولتے ہی مالی نے آکر باغیچہ لگادیا ہے۔ وہ
خوشی سے جھومتا ہوا اپنے مکان کے اندر داخل ہوا۔ کمرے میں ایک پرانی سی چارپائی
تھی جس پر میلا بستر پڑا ہوا تھا۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر پوری بھاجی اور تھوڑا سا حلوہ
رکھا ہوا تھا جسے وہ صبح ناشتا کرنے کے بعد چھوڑ گیا تھا۔ اب وہاں مکھیاں بھنبھنا رہی
تھیں۔ اس نے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ارے باپ رے۔ وہ گدھی یہاں آئے تو
الٹے پاؤں بھاگ جائے گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ اسے گدھی کیوں کہہ دیا۔ ٹیکسی
ڈرائیوروں والی بولی اس کے ساتھ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تو ایسی چیز ہے کہ اسے جان کہنا
چاہیے' ایمان کہنا چاہیے اور کیا کیا کہنا چاہیے۔ اب وہ ناولیں لے کر پڑھے گا اور ان
میں سے اچھی اچھی باتیں کاغذ پر لکھ کر یاد کرے گا۔

اب لکھنے اور یاد رکھنے کی بہت سی باتیں جمع ہو رہی تھیں۔ بے آباد گھر کا حلیہ بدلنا
تھا۔ اچھا سا ایک پلنگ لانا تھا۔ صاف ستھرا سا بستر' اجلی اجلی سی چادریں' نئے نئے لحاف'
اچھے غلاف والے تکیے۔ صوفے یا کرسیاں اور پتا نہیں کیا کچھ خریدنا تھا۔ ایک ایک تنکا
جمع کرکے اس ڈاکٹرنی کے شایان شان ایک خوب صورت سا آشیانہ بنانا تھا۔ اس نے
گھڑی دیکھی تو ساڑھے گیارہ ہوچکے تھے۔ وہ بوکھلا گیا۔ اب اس کے پاس پہنچنے کے لیے
صرف ڈھائی گھنٹے رہ گئے تھے۔ ان ڈھائی گھنٹوں میں بہت سارا کام کرنا تھا۔ اس نے
جلدی سے ٹین والے سوٹ کیس کو کھولا اور اپنا بہت ہی پسندیدہ لباس نکالا۔ ایک پتلون'
ایک شرٹ اور ایک واسکٹ۔ پتلون اور شرٹ کا کپڑا اس نے سپرہائی وے کی باڑہ مارکیٹ
سے خریدا تھا۔ بہت قیمتی کپڑا تھا اور بہت اچھی سلائی تھی۔ جب وہ اسے پہنتا تھا تو
دوسرے ٹیکسی ڈرائیور اور گیراج والے اسے دیکھ کر یوں حیران ہوجاتے تھے جیسے ان کے
سامنے بادشاہ جانی ٹیکسی ڈرائیور نہ ہو کوئی بادشاہ سلامت کھڑا ہو۔

اس نے لباس نکالنے کے بعد سوٹ کیس کی تہ میں ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی ایک
گڈی نکالی۔ وہ پونے دو ہزار روپے تھے۔ بینک میں اس نے اکاؤنٹ کھولا تھا' وہاں

صرف پچاس روپے جمع تھے البتہ پانچ برس کے عرصے میں اس نے مستری چاچا کے پاس
ساڑھے بارہ ہزار جمع کئے تھے۔ وہ بھی مستری چاچا نے زبردستی کی تھی۔ اس سے کہا تھا کہ
وہ بینک کی طرف نہیں جائے گا اور نہ ہی اُدھر پیسے جمع کرے گا لہٰذا جب بھی وہ شام کو
ٹیکسی لے کر گیراج پہنچتا تو مستری چاچا اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کبھی دو سو اور کبھی
تین سو نکال کر اپنے پاس رکھ لیا کرتے تھے۔ ایک کاپی میں حساب لکھ کر اسے بتادیتے
تھے۔ دیکھ اتنی تاریخ کو اتنے پیسے لیے ہیں۔ اپنا حساب رکھا کر' یہ پیسے کام آتے ہیں۔ تو
اکیلا سہی لیکن برے وقت کے لیے بچانا چاہیے۔

یہ کتنے مزے کی بات تھی۔ لوگ برے وقت کے لیے بچاتے ہیں لیکن اس کی جمع
پونجی اچھے وقت کام آرہی ہے۔ اس نے کپڑے اور نوٹوں کی گڈی اٹھالی۔ پچھلی عید اس
نے نئے جوتے اور موزے خریدے تھے جو بہت کم استعمال ہوئے تھے۔ انہیں بھی اس
نے ساتھ رکھ لیا' پھر ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا۔

ابھی ناگن چورنگی کا علاقہ پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ دکانیں نہیں تھیں۔ خاص
طور پر کسی ایسے حجام کی دکان نہیں تھی جہاں حمام ہو' وہ شیو کرنے اور غسل کرنے کے
لیے کریم آباد جایا کرتا تھا۔ مینا بازار کے سامنے اس نے ٹیکسی روک دی۔ ایک چھوٹا سا
لڑکا ہاتھ میں صافی لیے دوڑتا ہوا آیا۔ بادشاہ نے کہا "بیٹے' گاڑی کو باہر سے خوب چمکا دو۔
پورا ایک روپیہ دوں گا۔ شاباش۔"

یہ کہہ کر وہ سیلون میں داخل ہوا۔ تمام حجام اسے پہچانتے تھے اور اس کے آنے سے
خوش ہوتے تھے۔ وہ بخشش دے کر جایا کرتا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "یار آج
ایسی شیو کرو کہ دیکھنے والی آنکھیں میرے چہرے پر کچھ ڈھونڈتی رہ جائیں۔"

حجام نے کہا "فکر نہ کرو استاد' اتنی فسٹ کلاس شیو بناؤں گا کہ صورت نکھر آئے
گی۔ معلوم ہوگا ابھی پیدا ہوئے ہو۔"

"ابے جا' پیدا کرکے مجھے بچہ بناتا ہے۔ الٹی کھوپڑی کے' میں کہیں دودھ پینے نہیں
دودھ کی نہر نکالنے جارہا ہوں۔ کچھ سمجھا؟"

اس نے انکار میں سرہلا کر سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "استاد سمجھ میں نہیں
آئی' کیا بول رہے ہو۔"

"اب اپنی بات سمجھنے کے لیے انورسٹی میں پڑھنا بہت ضروری ہے۔ چل تو چلا استرا۔"

وہ استرے کی دھار بناتے ہوئے بولا "پہلے غسل کرلو تو اچھا ہوگا۔ اس سے بال نرم ہوجاتے ہیں۔"

"کچھ نرم درم نہیں ہوتے' جیسے بھی ہیں جلدی سے شیو کردے میں غسل کرنے کے بعد جو کپڑے پہنوں گا اس کے بعد پھر یہاں نہیں بیٹھوں گا۔"

اتنے میں جھورا پینٹر سیلون میں داخل ہوا۔ اس نے بادشاہ کو دیکھتے ہی سلام کرتے ہوئے کہا "استاد' اپنی ٹیکسی میں کبھی پھول پتے نہیں بنواتے ہو۔ اس شہر کی کتنی گاڑیوں میں جھورا پینٹر کا نام لکھا ہوا ہے۔"

باربر شیو کرنے سے پہلے صابن لگا رہا تھا۔ بادشاہ نے آئینے میں جھورا پینٹر کو دیکھتے ہوئے کہا "تم ٹرکوں اور آئل ٹینکروں کے پیچھے جو دریا' پہاڑ' جنگل اور شیر چیتے وغیرہ بناتے ہو' وہ ہماری ٹیکسیوں پر نہیں چلتے۔ منی بسوں میں جو پھول پتیاں بنتی ہیں' انہیں بھی ہماری ٹیکسیوں میں بیٹھنے والے اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے' بچوں کو خوش کرنے کے لیے رنگ برنگے پھول بنادیے گئے ہوں۔ جھورے' تو کیا پھول بنائے گا۔ میری ٹیکسی میں تو ایسا پھول کھل رہا ہے' ارے ایسا پھول کھل رہا ہے۔"

وہ سرہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ باربر نے کہا "استاد سر کو ایک جگہ رکھو۔ میں استرا چلا رہا ہوں' نہیں تو چہرے پر اتنے پھول کھلیں گے کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ بادشاہ کے چہرے کی صفائی ہوتی رہی پھر باربر نے کہا "جھورے! معلوم ہوتا ہے کہ استاد نے کسی کو پھانسا ہے۔"

بادشاہ نے کہا "ذرا منہ سنبھال کر بات کر۔ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے جسے پھانسا جائے۔ وہ بہت شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ ڈاکٹرنی بننے والی ہے۔"

"مبارک ہو' مبارک ہو۔ بہت لمبا ہاتھ مار رہے ہو۔ بہت اونچے جارہے ہو' کہاں تک بات پہنچی۔"

بادشاہ جانی نے جواب دینے کے لیے ہونٹ کھولے پھر بند کرلیے کیونکہ ٹھوڑی کے

نیچے استرا چل رہا تھا۔ جھورے نے کہا "استاد' میں منہ دیکھی بات نہیں کہتا۔ ایمان کی کہتا ہوں' تم ہو ہی ایسے کہ تم پر بڑے بڑے خاندان کی لڑکیاں مرنے کے لیے تیار ہوجائیں گی۔ ہاں تو بات کہاں تک پہنچی ہے؟"

باربر کا ہاتھ رک گیا تھا۔ بادشاہ نے کہا "آج پہلا دن ہے' سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔"

جھورے نے پوچھا "کیا وہ تم سے بات کرتی ہے؟"

"ہاں کرتی ہے۔"

"کیا وہ مسکراتی ہے؟"

"ہنستی بھی ہے۔"

"ارے تو پھر بات ہی کیا رہ گئی۔ اب کیا وہ تمہارے سامنے سر پھوڑے گی تب تمہیں اس کی محبت کا پتا چلے گا۔"

"یہ بات نہیں ہے جھورے۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ ڈاکٹرنی بننے والی ہے۔ زیادہ پڑھنے والیاں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ اب اس گہرائی کو کیسے معلوم کروں۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اس پر یہ ظاہر کردو کہ تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔ اس کی طرف سے ہاں یا نا میں جواب تو ملے گا۔"

"جوتے کھانے والا مشورہ نہ دو۔ میں چاہتا ہوں' زبان نہ کھولوں اور اسے میرے دل کی بات معلوم ہوجائے۔"

جھورے پینٹر نے ہاتھ اٹھا کر داد دیتے ہوئے کہا "واہ' کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے' کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے۔ استاد اپنے دل کی بات تم شاعری کے ذریعے ہی کرسکتے ہو۔ ادھر بسوں اور منی بسوں میں بہت سے جو شعر لکھے رہتے ہیں نا' وہ میرے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں پانچ روپے ایک شعر کے حساب سے لکھ دیتا ہوں۔ یہ دوسرے ڈرائیور بھی تو تمہاری طرح دل والے ہوتے ہیں بلکہ تم سے زیادہ ہی دل والے ہوتے ہیں کیونکہ بسوں اور منی بسوں میں عورتوں کا کلاس آگے ہوتا ہے۔ ڈرائیور کے آس پاس پریوں کا میلا لگا رہتا ہے۔"

بادشاہ جانی نے کہا "ابے، کیوں چھچھوری باتیں کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی مائیں بہنیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، وہ دوسروں کی ہوتی ہیں، ڈرائیور کی نہیں ہوتیں نا؟ وہ بے چارا صبح سے شام تک پریوں میں گھرا رہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی تو اسے پسند آئے گی۔ ایک نہیں درجنوں پسند آئیں گی۔ ان درجنوں میں سے کسی نہ کسی کو شکار کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لینا پڑتا ہے اسی لیے ہمارے شہر کی ہر منی بس میں دیکھ لو، کیسے شعروں کے تیر چھوڑے جاتے ہیں اور جگر کے پار کیے جاتے ہیں۔ بس تم بھی ایسا ہی ایک پھڑکتا ہوا شعر ٹیکسی کے ڈیش بورڈ کے اوپر لکھوالو۔ وہ پڑھے گی تو تمہارے دل کی بات سمجھ جائے گی۔"

بادشاہ اس مشورے پر غور کرنے لگا۔ باربر نے کہا "یہ مشورہ بہت اچھا ہے۔ کیا حرج ہے، اگر ایک ایسا شعر لکھوالیا جائے جس سے تمہارے دل کی بات ظاہر ہوجائے، اسے معلوم ہوجائے گا، اس سے اچھا راستہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔"

بادشاہ نے کہا "مجھے پہلے بھی ایک پینٹر نے کہا تھا کہ ڈیش بورڈ پر ایک شعر لکھوالو۔ مگر یہ بات مجھے بہت گندی لگی۔ میرے پیچھے والی سیٹ پر کتنی ہی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں بیٹھتی ہیں۔ ان کے مرد بھی بیٹھتے ہیں۔ اگر وہ ایسے شعر پڑھیں گے تو ان کے دلوں پر کیا گزرے گی؟ شاعری اچھی چیز ہے۔ کتابوں میں پڑھائی جاتی ہے لیکن وہی شاعری ڈیش بورڈ پر آجائے تو گالی بن جاتی ہے۔"

وہ کرسی پر سے اٹھ گیا۔ آئینے میں دیکھنے لگا۔ چہرہ صاف ہوگیا تھا۔ نکھر آیا تھا۔ بہت ہی خوبرو لگ رہا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ پھر اپنے کپڑے وغیرہ لے کر غسل خانے کی طرف جانے لگا۔ تبھی سوا بارہ ہوگئے۔ "دو بجے سے پہلے اس کے پاس پہنچنا تھا۔" یہ کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا غسل خانے کے اندر چلا گیا۔ جھورے آہستہ آہستہ چلتا ہوا غسل خانے کے دروازے پر آیا پھر بلند آواز میں بولا "استاد، ایسا کرو کہ ایک دو گھنٹے کے لیے ڈیش بورڈ پر شعر لکھوالو۔ وہ پڑھ لے گی اور جب وہ ٹیکسی سے اتر کر چلی جائے گی تو اس شعر کو مٹا دینا۔"

باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز کے ساتھ بادشاہ جانی نے کہا "ہاں یہ آئیڈیا اچھا

ہے، جا لکھ دے ایک شعر۔"

"استاد کچھ حال چال تو بتاؤ کہ تم اس سے کیا کہنا کیا چاہتے ہو؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر اندر سے آواز آئی "بھئی کہنا کیا ہے، اس سے محبت ہوگئی ہے۔ مجھے اتنی اچھی لگتی ہے کہ اب میں اپنے آپ کو بھی اچھا نہیں لگتا۔ بس وہ ہی وہ نظر آتی ہے لیکن اتنی بڑی دنیا میں مجھ جیسا ٹیکسی ڈرائیور اس سے عشق کیسے کرے۔ اپنی حیثیت کو یاد رکھنا پڑتا ہے۔ ٹیکسی چلانے کے وقت عشق کیسے ہو؟ سامنے رستے کا بھی خیال ہے کہ ایکسیڈنٹ نہ ہوجائے۔ ٹریفک پولیس کا بھی ڈر لگا رہتا ہے، اتنے خوف اور پریشانیوں میں بھلا کیسے عشق ہوسکتا ہے۔ یہی مجبوریاں ذرا بیان کردو۔"

"بس ابھی لو استاد۔ تھوڑا سا سوچوں گا۔ سگریٹ کا کش لگاؤں گا اور شعر نکل آئے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے دماغ سے شعر نکال کر کہا "اوہ کیا پھڑکتا ہوا شعر ہے ذرا سنو استاد۔ وہ آئی ٹیکسی میں ہماری خدا کی قدرت ہے۔ کبھی ہم ان کو، کبھی راستے کو، کبھی پولیس والے کو دیکھتے ہیں۔"

اندر سے آواز آئی "چالان کرائے گا کیا۔ میں نے جیسی بات کہی تھی، ویسا ہی شعر کہہ دیا۔ شعر کہاں ہوا۔ یہ تو میری ہی بات ہوئی نا۔ ارے جیسا شاعر بولتے ہیں نا، بس ویسی ہی کوئی پھڑکتی ہوئی چیز پیش کر۔"

جھورے نے کہا "استاد جو دل کی بات ہوتی ہے وہی شاعری کہلاتی ہے۔ میں ایک اور شعر سناتا ہوں۔ میں نے دو چار بس ڈرائیوروں اور منی بس والوں کو یہ شعر لکھ کر دیے، بڑے کارگر ہوئے۔ دیکھو گاڑیوں میں لڑکیاں آکر بیٹھتی ہیں نا تو ان کے سر جھکے رہتے ہیں۔ آنکھیں بھی جھکی رہتی ہیں۔ بڑی معصوم لگتی ہیں مگر اسی معصومیت سے دل چرالیتی ہیں۔"

اندر سے آواز آئی "ہاں ہاں، بالکل ایسی ہی بات ہے۔ وہ بالکل ایسی ہی ہے اور اس نے ایسی ہی معصومیت سے میرا دل چرالیا ہے۔ بس اسی پر کوئی شعر بول دو۔"

جھورے نے کہا "شعر حاضر ہے سنو۔ وہ نیچی نظر کرکے، سر جھکا کے بیٹھی ہے، وہی تو ہے جو میرا دل چرا کے بیٹھی ہے۔"

"یہ تو کھلم کھلا بات ہوگئی۔ ٹیکسی کے اندر لکھانے سے تو اچھا ہے کہ میں خود ہی زبان سے بول دوں۔ مجھے ایسی شاعری نہیں چاہیے۔"

"استاد کیوں میرے پانچ روپے کھوٹے کرتے ہو' کوئی شعر پسند کرلو۔ میں فائنٹ لکھ دوں گا۔ چلو اس سے بھی اچھا شعر سوچ کرتا ہوں۔"

وہ غسل خانے سے باہر آگیا۔ موزے اور جوتے پہننے کے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنا جائزہ لیا۔ خوب کھل رہا تھا۔ کسی پہلو سے ٹیکسی ڈرائیور نہیں لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی پڑھا لکھا' اسمارٹ نوجوان ہے۔ باربر نے اسے دیکھ کر کہا "ایک دم فسٹ کلاس لگ رہے ہو۔ بس ذرا سی خوشبو چھڑک لو۔ مزہ آجائے گا۔"

وہ باربر کے ہاتھ میں دس روپے کا ایک نوٹ رکھ کر باہر آگیا۔ پاس ہی ایک جنرل اسٹور تھا' وہاں جاکر اس نے پوچھا "کوئی اچھی خوشبو ہو تو بتاؤ۔"

دکان دار نے اس کے آگے پرفیوم کی کئی شیشیاں لاکر رکھ دیں۔ اچھی خوب صورت ڈیزائن کی بہت سی شیشیاں تھیں۔ بادشاہ نے پوچھا "ان میں سے کون سی خوشبو ایسی ہے جو لڑکیوں کو پسند ہے؟"

دکان دار نے کہا "خوشبو سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور لڑکیاں تو ہر طرح کی خوشبو پسند کرتی ہیں۔ ویسے زیادہ تر لڑکیاں وائٹ روز لے جاتی ہیں۔ یہ سستا بھی ہے' صرف ڈھائی سو روپے کی ایک شیشی ہے۔"

اس نے کبھی ڈھائی روپے کا عطر نہیں خریدا تھا لیکن ڈھائی سو روپے کی وہ شیشی بلا تامل خریدلی۔ اسے لے کر ٹیکسی کی طرف آیا۔ بچے نے ٹیکسی کو صاف کرکے چمکا دیا تھا۔ اس نے لڑکے کو دو روپے دیے پھر دروازہ کھول کر بیٹھنا چاہتا تھا کہ جھورا پینٹر دوڑتا ہوا آیا۔ "استاد ہوگیا۔ بالکل پکا سچا شعر ہوگیا۔ تمہیں پسند آئے گا۔ سن لو عرض کرتا ہوں۔"

بادشاہ جانی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا "شعر سنانے سے پہلے میری ایک شرط سن لو۔"

"سناؤ استاد۔"

"شرط یہ ہے کہ یہاں ڈیش بورڈ پر جو بھی شعر لکھے گا' وہ شعر لکھنے کے بعد تو اپنے گھر

کی کسی عورت کو پچھلی سیٹ پر لاکر بٹھادے گا۔ بول منظور ہے۔"

وہ ایک دم سے بھڑک گیا "استاد تم میرے گھر تک پہنچ رہے ہو' یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"ابے جا' اپنے گھر کی بات آتی ہے تو شریف بن جاتے ہو۔ کمینے اتنا نہیں سمجھتے کہ محبت میں پھانسا نہیں جاتا' اپنا بنایا جاتا ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسے بیک کیا۔ پھر ڈاؤ میڈیکل کالج کی طرف جانے لگا۔ وہ بار بار عقب نما آئینے میں خود کو دیکھتا اور خوش ہوکر سوچتا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر ضرور متاثر ہوگی مگر اسے اور زیادہ کس طرح متاثر کرنا چاہیے' وہ سوچنے لگا۔ ارادہ تھا کہ میڈیکل کالج کے قریب پہنچ کر اپنے کپڑوں پر تھوڑی سی خوشبو چھڑک لے گا۔ دل نے کہا' کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔ بعد میں افسوس نہ ہو کہ اسے اپنا بنانے کے لیے' اس پر اپنی شخصیت کی چھاپ ڈالنے کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا تھا' اسے اور کچھ کرنا چاہیے۔

آگے بڑھتے بڑھتے' سوچتے سوچتے اس نے ایک پھول والے کی دکان کے پاس ٹیکسی روک دی۔ اس نے ڈھیر ساری گلاب کی پتیاں خریدیں اور پتیوں کے پیکٹ کو اپنے پاس رکھ کر گاڑی کو آگے بڑھادیا۔ بہت دور جانے کے بعد اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روکی۔ پھر گلاب کی پتیوں کو لے کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ پچھلی سیٹ کو اچھی طرح صاف کیا۔ پھر اس سیٹ پر تروتازہ خوشبودار پتیاں چھڑکنے لگا جیسے دلہن کی سیج پر پھول بکھیر رہا ہو۔

وہ آدھا گھنٹا پہلے ہی منزل کے قریب پہنچ گیا۔ سول اسپتال کے پاس پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔ کھڑکی کے شیشے چڑھائے ہوئے تھے۔ اس نے پرفیوم کی شیشی نکال کر اسے پچھلی سیٹ کی طرف اسپرے کیا۔ تھوڑی سی خوشبو اپنے لباس پر بھی اسپرے کی۔ اس کے بعد ڈیش بورڈ کھول کر شیشی رکھنے لگا تو وہاں چرس بھرا ہوا سگریٹ دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ نکال کر دیکھا اور سوچا' اگر لڑکی نے اس سگریٹ کو دیکھ لیا تو کیا رائے قائم کرے گی۔ یہ سوچتے ہی اس نے کھڑکی کے شیشے کو ذرا نیچے کرکے سگریٹ باہر پھینک دیا پھر شیشے چڑھائے۔ اس کے بعد ٹیکسی آگے بڑھا کر ڈاؤ میڈیکل کالج کے

دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ اب اس کا دل رہ رہ کر اپنی رفتار سے زیادہ دھڑکنے لگا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا' وہ آئے گی اور میں فوراً ہی ٹیکسی سے اتر کر اس کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دوں گا پھر وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے گی تو پھولوں کی پتیاں دیکھ کر اور خوشبودار ماحول میں پہنچ کر حیران رہ جائے گی۔ مجھے خوش ہو کر دیکھے گی پھر پوچھے گی کیا یہ جنت میرے لیے بنائی ہے؟

وہ سوچ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اندر سے گھبراہٹ بھی تھی۔ پسینا پسینا ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے چڑھائے ہوئے تھے' کہیں سے ہوا نہیں آرہی تھی۔ گرمی سے برا حال تھا۔ اگر وہ شیشے نیچے اتارتا تو اسپرے کی ہوئی خوشبو ہوا میں تحلیل ہو کر معدوم ہو جاتی۔ تھوڑی دیر تک وہ گرمی برداشت کرتا رہا پھر اس نے سوچا پسینے سے اپنا حلیہ خراب ہو جائے گا لہٰذا باہر کھلی ہوا میں کھڑے رہنا چاہیے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا پھر فوراً ہی اسے بند کر دیا تاکہ خوشبو قید رہے۔

دو بج گئے' وہ نظر نہیں آئی۔ دوسری لڑکیاں اور لڑکے دو دو' چار چار کی ٹولی میں نکل رہے تھے اور اپنے اپنے رستے جا رہے تھے۔ کچھ طلبا اور طالبات وہاں کھڑی ہوئی کالج کی ایک بس کے اندر بیٹھ رہے تھے۔ دو بج کر دس منٹ ہو گئے' پھر پندرہ منٹ ہو گئے۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی' کیا وہ چلی گئی؟ اس کا دل ڈوبنے لگا' کیا صبح سے اب تک وہ جو سپنے دیکھ رہا تھا' وہ سچ مچ سپنے ہی بن کر رہ جائیں گے یا وہ تعبیر بن کر سامنے آئے گی؟ دو بج کر بیس منٹ پر وہ گیٹ کے پاس نظر آ ہی گئی۔

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے چل رہی تھی۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ جیسے چلنے سے معذور ہو۔ تھک گئی ہو اور بہت پریشان ہو۔ اس کی زلفیں کہیں کہیں سے بکھری ہوئی تھیں۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اس نے ابھی تک بادشاہ جانی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لیے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔

بادشاہ نے سوچا "کیا کسی نے اسے چھیڑا ہے؟ کسی نے پریشان کیا ہے؟ ضرور کوئی بات ہے۔ اسے ستایا گیا ہے۔ وہ بہت بے حال نظر آرہی ہے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے دو چار قدم آگے بڑھا پھر رک گیا۔ اسی وقت لڑکی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی جیسے وہ چونک گئی۔ اس نے نیوی بلو کلر کی پتلون اور گلابی رنگ

کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس پر سیاہ رنگ کی واسکٹ تھی۔ اگرچہ کلر میچنگ بے ڈھنگی تھی لیکن رنگوں کے تضاد میں بھی وہ بڑا ہی دلکش اور بہت ہی خوبرو دکھائی دے رہا تھا یا شاید وہ حیران حیران سی ہو کر سوچ رہی تھی کہ یہ کون ہے؟ ڈرائیور نہیں ہے کوئی شہزادہ ہے جو بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنے نکلتا ہے پھر شہزادے کے روپ میں آجاتا ہے۔

وہ جلدی سے سنبھل کر بولی "میں نے جھوٹ سمجھا تھا۔ تم سچ مچ آگئے۔"

"یہ مرد کی زبان ہے۔ گاڑی کا بریک فیل ہو سکتا ہے' مرد کی زبان فیل نہیں ہو سکتی۔"

وہ اس سے کترا کر ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی چال سے پتا چل رہا تھا کہ وہ بری طرح تھک گئی ہے۔ اندر سے کمزور ہو گئی ہے۔ اس نے پوچھا "تم بہت پریشان ہو۔ کیا کسی نے تم سے کچھ کہا ہے؟ اگر کہا ہے تو بتاؤ میں ایک ایک کا کچومر نکال دوں گا۔"

وہ پچھلی سیٹ کے دروازے کی طرف پہنچ کر بولی "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بھلا مجھے کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا۔ پھر اندر جانے سے پہلے ہی ٹھٹھک گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا اندر سے آیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ دھوپ میں چلتے چلتے ایک دم سے ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گئی ہو۔ اس نے حیرانی سے بادشاہ کی طرف دیکھا پھر گاڑی کے اندر بیٹھ کر دروازے کو بند کر دیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا دوسری طرف سے اسٹیرنگ سیٹ پر پہنچا۔ اس وقت وہ پچھلی سیٹ پر بکھری ہوئی پھولوں کی پتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ذرا خواب ناک ہو گئی تھیں' جیسے سوچ رہی ہوں کہ پھولوں کی پتیاں میرے خوابوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر یہاں کیسے بکھر گئی ہیں۔ ہائے ان پتیوں کی بارات میں دولہا کی خوشبو آرہی ہے۔

اس نے نظر اٹھا کر بادشاہ کو دیکھا۔ وہ اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ جلدی سے سیدھا ہو کر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے سوچنے لگا' میں نظریں کیسے ملاؤں۔ یوں لگتا ہے اس کی آنکھیں میرے چہرے پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ میں ان پڑھ ہوں' پڑھ نہیں سکتا۔ نظروں کی زبان کس مکتب میں سیکھوں؟ مگر لڑکی تو بس لڑکی ہوتی ہے نا مگر

ایسے وقت پہیلی بن جاتی ہے' بوجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

وہ تھوڑی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنا بھول گیا اور انتظار میں رہا کہ کچھ بولے گی' ضرور پوچھے گی کہ یہ سب کیا ہے؟ یہاں پھولوں کی پتیاں کیوں بکھری ہوئی ہیں؟ گاڑی میں اتنی خوشبو کہاں سے آگئی ہے؟ پہلے تم عجیب سے حلیے میں تھے' واپس آئے تو شہزادے لگ رہے ہو۔ یہ سب کچھ کس کے لیے ہے؟ وہ ضرور کچھ پوچھے گی اور وہ اسی انتظار میں بیٹھا رہا۔

آخر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ بندر روڈ کو کراس کرنے کے بعد اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ دماغ اندر ہی اندر سوالات کر رہا تھا۔ وہ چپ کیوں ہے؟ کیا بہت ہی محتاط ہے؟ خدایا اس کے جذبے کو ایک جھٹکا لگے اور وہ بھول کر مسکرا دے اور مسکرا کر بھول جائے' اس کا بھی مان رہے کہ میں نے چوری نہیں پکڑی۔

گاڑی آرام باغ کی طرف سے گھومتی ہوئی پھر بندر روڈ پر پہنچ گئی۔ تب پچھلی سیٹ سے ایک گہری سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ بادشاہ جانی سے رہا نہ گیا۔ اس نے عقب نما آئینے کا رخ بدل کر دیکھا۔ وہ پچھلی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے نڈھال سی بیٹھی تھی۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا "تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں' مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے؟ میں ہر طرح سے تمہارے کام آؤں گا۔ تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری پریشانی اپنی جان دے کر دور کر دوں گا۔"

لڑکی نے پٹ سے آنکھیں کھول کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظریں پوچھ رہی تھیں کہ تم جان دے کر میری پریشانی کیوں دور کرو گے؟ میں تمہاری کیا لگتی ہوں؟ تم میرے کون ہو؟

وہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔ کبھی کبھی کن انکھیوں سے عقب نما آئینے میں دیکھتا رہا۔ اب اس کی سوچ کہہ رہی تھی "اے لڑکی! کیا تو میری کچھ نہیں لگتی؟ دیکھ ان آنکھوں کا دیکھنا تجھ سے ہے۔ یہ کان تیری آہٹ کے لیے ہیں۔ میری جان تجھ سے ہے' پہچان تجھ سے ہے۔ آج صبح سے میری ایک ایک سانس کا رشتہ تجھ سے ہے' کیا اب بھی تو میری کوئی نہیں لگتی؟"

وہ بولی "میں پریشان نہیں ہوں۔ بس کیا کہوں؟ تم نہیں سمجھ سکو گے۔"

"واہ' ایسی کیا بات ہے جو میں نہیں سمجھ سکتا۔ میں اتنے بڑے شہر کے ایک طرف سے لے کر دوسری طرف تک ٹیکسی دوڑاتا ہوں۔ ہر طرح کے آدمیوں کو سمجھتا ہوں۔ ان کی بولیاں بھی سمجھ لیتا ہوں۔"

"اچھا تو سنو' آج میری ڈس سیکشن کی کلاس تھی۔ ڈس سیکشن سمجھتے ہو۔ یعنی میں ابھی ایک لاش کے ٹکڑے کر کے آرہی ہوں۔"

"ایں؟" بادشاہ جانی نے اچانک ہی کار کی رفتار سست کر دی' پھر حیرانی سے پوچھا "کیا تم لاش کے ٹکڑے کرتی ہو؟"

"ہاں' ہم اناٹومی کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اب تمہیں اناٹومی کا مطلب سمجھانا ہوگا۔"

وہ جلدی سے بولا "ارے نہیں' میں بچہ نہیں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ تم ڈاکٹرنی ہو' لاشوں کو چیرتی پھاڑتی ہو پھر پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

"ہاں' اس سے پہلے بھی میں ڈس سیکشن کلاس اٹینڈ کر چکی ہوں مگر آج ہوا یوں کہ میرا ایک ساتھی لاش کے چہرے کو ڈس سیکٹ کر رہا تھا۔ جب اس نے آدھے چہرے کی جلد کاٹ کر الگ کر دی تو میرا سر چکرانے لگا۔"

"کیوں؟ سر کیوں چکرانے لگا؟"

"اس لیے کہ وہ ایک بہت حسین لڑکی کی لاش تھی۔ بہت خوب صورت تھی۔ جب اس کا آدھا چہرہ کٹ گیا تو اچانک میرے اندر کچھ ہونے لگا۔ مجھے خوب صورتی اور بدصورتی کا سنگم دکھائی دیا۔ اس لمحے احساس ہوا کہ ہم سب مکمل نہیں ہیں۔ ہم سامنے بس اپنا آدھا چہرہ رکھتے ہیں اور باقی آدھے چہرے کو چھپاتے ہیں کیونکہ وہ آدھا چہرہ بہت ہی بھیانک ہوتا ہے ہم کسی کو دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ دنیا والوں سے اسے چھپاتے ہیں۔ صرف اپنی خوب صورتی کا پرچار کرتے ہیں۔ اوہ' مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

بادشاہ جانی نے ایک جوس والے کے قریب گاڑی روک دی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے بولا "میں ابھی مالٹے کا جوس پلاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جوس والے کے پاس گیا۔ اسے دو گلاس کا آرڈر دیا۔ وہیں ایک ٹریفک کانسٹیبل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے بادشاہ جانی کو اپنے قریب بلایا پھر

پوچھا "یہ گاڑی میں کسے بٹھا کر لے جا رہے ہو؟"

اس نے ذرا قریب ہو کر کانسٹیبل کے کان کے پاس کہا "یہ بہت بڑی ڈاکٹرنی ہے۔ ابھی ایک لاش کو چیر پھاڑ کر آرہی ہیں۔ کوئی قصائی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"اچھا؟" کانسٹیبل نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں' ابھی جوس پی کر دوسری لاش کی بوٹی کرنے جائے گی۔"

کانسٹیبل نے بوکھلا کر منہ کھولتے ہوئے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ کی طرف ایسے دیکھا جیسے آنکھوں کے بجائے منہ سے اس لڑکی کو دیکھ رہا ہو۔ بادشاہ جانی نے کہا "اُدھر کیا دیکھ رہے ہو' اِدھر دیکھو۔ جانتے ہو ایناٹومی کسے کہتے ہیں؟"

کانسٹیبل نے مرعوب ہو کر انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا "نہیں۔"

"مجھ سے سنو! ایناٹومی کہتے ہیں آدھے چہرے کو' آدھا چہرہ سمجھتے ہو؟"

اس نے پھر انکار میں سرہلا کر کہا "نہیں۔"

بادشاہ نے کہا "مجھ سے سنو' دیکھو ابھی تم ظہر کی نماز پڑھ کر آرہے ہو نا؟"

"ہاں ابھی نماز پڑھ کر آرہا ہوں۔"

"اچھا' یہاں اس تاک میں کھڑے ہو کہ کوئی غلط جگہ گاڑی کھڑی کرے گا تو اس سے کچھ لے کر قانون اپنے ہاتھ میں لے لوگے اور غلط جگہ کو صحیح جگہ بنا دو گے۔"

کانسٹیبل نے ڈھیٹ بن کر مسکراتے ہوئے کہا "بادشاہ تو بڑا سمجھ دار ہے' نکال دو روپے۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو روپے نکالے پھر اسے دیتے ہوئے کہا "اس کو آدھا چہرہ کہتے ہیں۔"

جوس پینے کے بعد وہ پیسے ادا کرنا چاہتی تھی لیکن بادشاہ نے بل ادا کر دیا۔ جب گاڑی دوبارہ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو اچانک لڑکی نے پوچھا "تم نے مجھ سے پیسے کیوں نہیں لیے؟"

"بس ایسے ہی۔"

"ایسے ہی کیا مطلب؟ کیا تم اس قدر خوش ہو کہ آج میرے لیے کسی سواری کو نہیں اٹھا رہے ہو۔ کمائی نہیں کر رہے ہو۔ اتنے خوش ہو کہ جوس پلا رہے ہو۔ اب میں

تم سے کہوں گی کہ بھوک لگ رہی ہے تو کھانا بھی اپنی جیب سے کھلاؤ گے۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ میں ضرور کھلاؤں گا۔"

"دیکھو' میں جلدی گھر نہیں جانا چاہتی' کیا تم مجھے سمندر کے کنارے لے جاؤ گے۔ میں ٹھنڈی ہوا کھانا چاہتی ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا "یہ تو میرے دل کی بات ہے' میں ابھی لے چلتا ہوں۔"

وہ خوشی میں کہہ گیا تھا کہ یہ اس کے دل کی بات ہے اور اسی بات نے بہت کچھ ظاہر کر دیا۔ ویسے بھی وہ پیچھے بیٹھنے والی نادان نہیں تھی۔ بہت دیر سے بہت کچھ سمجھتی جا رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"یہ تم نے پھول کی پتیاں کیوں بکھیری ہیں؟"

"وہ بات یہ ہے کہ.... ایک بارات کی سواری تھی۔ دلہن کو لے گیا تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو' اگر ان پتیوں پر دولہا' دلہن یا کوئی بھی بیٹھتا تو ان میں سے کچھ مسلی ہوئی ہوتیں۔ کچھ مرجھائی ہوتیں لیکن سب کی سب تروتازہ ہیں۔"

وہ چپ رہا۔ جواب میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ وہ کہنے لگی "میں نادان نہیں ہوں اور ایسی بھی نہیں ہوں کہ کسی اجنبی کے ساتھ سمندر کے کنارے ہوا کھانے تنہا چلی جاؤں۔ یہ بے حیائی نہیں ہے بلکہ میری خود اعتمادی ہے۔ مجھے اپنے آپ پر بہت اعتماد ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب میں کمزور نہیں ہوں تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے کمزور نہیں بنا سکتی۔"

"میں کیا بولوں۔ بس تمہاری باتیں سن کر دل خوش ہو جاتا ہے۔"

"مجھے بتاؤ تم کون ہو؟"

"وہی ہوں جو تم دیکھ رہی ہو۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور۔"

"تم مجھے ایسے نہیں لگتے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی بڑے خاندان کے یا بہت اچھے خاندان کے فرد ہو اور بہت پڑھے لکھے ہو۔ حالات سے مجبور ہو کر ٹیکسی چلا رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ حالات تو ہر آدمی کو مجبور کرتے ہیں۔ میں ادھر دو برس تک سعودی عرب میں کام کرتا رہا۔ وہاں سے اسی ہزار روپے لے کر آیا۔ ادھر بیس ہزار میں ایک چھوٹا سا مکان بنایا۔ پچاس ہزار میں یہ ٹیکسی خریدی۔ پانچ برس سے یہ ٹیکسی چلا رہا ہوں۔"

"تم نے شادی نہیں کی۔"

"نہیں، مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے میں آدمی نہیں ہوں، صرف ڈرائیور ہوں۔ اگر ہوں تو پورا آدمی نہیں ہوں۔ ابھی تم نے بہت اچھی بات کہی تھی کہ ہمارے پاس آدھا چہرہ ہوتا ہے اور ہم باقی آدھے کو چھپاتے ہیں۔ جو میرا ٹیکسی ڈرائیور والا چہرہ ہے، اسے میں چھپانا چاہتا ہوں مگر چھپتا نہیں ہے۔ اگر یہ کہیں چھپ جاتا ہے تو میری بہت بڑی خواہش پوری ہو جاتی کہ مجھے کسی اچھے شریف گھرانے میں لڑکی ملے۔"

"وہ تو مل گئی ہے۔"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا "آج مجھے جنٹلمین بن کر ٹیکسی میں بیٹھنا اچھا لگا۔ خوشبو بہت پیاری لگی۔ اپنی ٹیکسی میں پھولوں کی بارش کرنے کو جی چاہا۔ اب اگر وہ نہ ملی تو میں ایمان سے کہتا ہوں، مر جاؤں گا۔"

پچھلی سیٹ کی طرف خاموشی رہی۔ ٹیکسی اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ بڑی سی شاہراہ پر دوڑتے ہوئے کلفٹن کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پچھلی سیٹ سے ایک سوال ابھرا "کیا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگ سکتا ہے؟"

وہ ذرا چپ رہا، ذرا سوچتا رہا پھر بولا "میں اسی بات کو ذرا الٹا کر بولتا ہوں، میں گدڑی ہوں، مجھ میں لعل لگ سکتے ہیں۔"

بڑی ہی جوڑ توڑ کرنے والی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی پھر سوچ کر بولی "تم اس لڑکی کے دماغ میں بیٹھ کر سوچو جو کوٹھی میں رہتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے۔ جس کا اونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا ہے، کیا وہ لڑکی اپنے لوگوں سے یہ بول سکے گی کہ اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنا جیون ساتھی بنایا ہے۔ کیا ہمارے سماج میں الگ الگ مرتبے نہیں ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "اسی لیے تو میں اپنے آپ کو پورا آدمی نہیں سمجھتا۔ آدھا آدمی ہوں اگر پورا آدمی ہوتا تو ٹیکسی میں نہ ہوتا۔ ایک ائرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھ کر اس لڑکی کے دروازے پر رشتہ مانگنے جاتا۔"

"تم ایسے نہیں ہو پھر کیا ہو سکتا ہے؟"

"میں نے اپنی انورسٹی میں یہ سیکھا ہے کہ جھک کر کسی کو نیچے سے اٹھا لو اور اپنے

برابر لے آؤ۔ کیا کتابوں والی انورسٹی میں یہ سبق نہیں پڑھایا جاتا۔"

وہ ونڈاسکرین کے پار دیکھتا ہوا اپنے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پیچھے خاموشی رہی۔ گاڑی اپنی رفتار سے دوڑتی رہی۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ بہت دیر بعد آواز آئی۔ "تم مجھے ان پڑھ نہیں لگتے۔ میری بات کو بڑی سادگی سے کاٹ رہے ہو۔"

وہ بولا "ہمارے مستری چاچا ہیں نا، وہ کہتے ہیں ہمارے رسولؐ اللہ نے کچھ نہیں پڑھا تھا مگر ساری دنیا کو پڑھا دیا۔ ان پڑھ ہونا ایک مجبوری بھی ہو سکتی ہے مگر جاہل ہونا سب سے بری بات ہے اور چاچا کہتے ہیں کہ میں جاہل نہیں ہوں، صرف ان پڑھ ہوں۔"

اس نے کلفٹن کے پارکنگ ایریا میں گاڑی کو روکتے ہوئے کہا "تم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے؟"

وہ بولی "کیا تم نے کھالیا ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "آج پہلی بار میں نے دن کا کھانا نہیں کھایا؟"

"کیوں نہیں کھایا؟"

"بس کیا بتاؤں۔ صبح سے اتنا خوش ہوں، اتنا خوش ہوں کہ اپنے آپ کو بھولا ہوا ہوں، کھانا کہاں یاد رہے گا۔"

لڑکی کی نظریں جھک گئیں پھر وہ بولی "اگر تمہیں بھوک لگی ہے تو چل کر کھالو۔"

"اور تم؟"

"میں ٹھہر کر کھاؤں گی۔ میں نے بتایا نا کہ ایک لاش کے ساتھ وقت گزار کر آ رہی ہوں۔ اسے اپنے ہاتھوں سے چیرا ہے، کاٹا ہے اس کی اناٹومی کی ہے۔ اس لیے ابھی میرا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی ٹھہر کر کھالوں گا۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔"

اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کرکے بیک کیا پھر اسے ساحل کی طرف لے جانے لگا۔ کھڑکی کے شیشے اتر گئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ لڑکی کی سیاہ زلفیں ہوا کی زد میں اڑ رہی تھیں۔ سیاہ بالوں کے پیش منظر میں اس کا گورا گورا چہرہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آئینے سے نظریں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں، اس کی ناک، اس کے ہونٹ اور اس کے چہرے کی فن کارانہ تراش کو دیکھ کر وہ

بے چینی سے سوچتا تھا کہ شاعر کیسے اپنی محبوبہ کی ایک ایک چیز کی تعریف کرتے ہیں۔ میں تو کچھ بول بھی نہیں سکتا۔ شاید اس کی تعریف یہی ہے کہ اس کے حسن کے بارے میں کوئی بول ہی نہ سکے۔

ساحل پر مرد' عورتیں اور بچے دور دور تک نظر آرہے تھے۔ وہ ساحل کے ساتھ ڈرائیو کرتا چلا گیا۔ لوگوں کی بھیڑ سے دور نکل گیا۔ ساحل کے ایک ویران حصے میں پہنچ کر اس نے ٹیکسی روک دی۔ لڑکی نے یہ سوال نہیں کیا کہ وہ اتنی دور ویرانے میں کیوں لے آیا ہے؟ ٹیکسی میں کوئی اور ہوتی تو بادشاہ جانی اس کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کرتا۔ اس کا تجزیہ یہی تھا۔ دن رات ٹیکسی چلاتے چلاتے اس نے ایسی بے حیا عورتوں کو دیکھا تھا جو تنہا کسی مرد کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر ویران علاقوں کی طرف جاتی تھیں۔ یہ سمندر کے ساحل پر بھی آتی تھیں لیکن اس لڑکی کے متعلق وہ کوئی غلط بات سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا بلکہ محبت کا زور وشور ایسا تھا کہ کسی کمزور پہلو سے لڑکی کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔

وہ دونوں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر آگئے۔ پکی سڑک کو چھوڑ کر ساحل کی ریت پر پہنچ گئے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں سمندر کی لہریں زور سے آتی تھیں اور ان کے قدموں تک پہنچ کر سست پڑ جاتی تھیں پھر وہ ایک طرف چلنے لگے۔ بادشاہ جانی نے کہا "تم اپنی کوئی بات بولو؟"

"میں کیا بولوں' میں تمہاری ٹیکسی میں بیٹھ کر کالج گئی تو تمہاری باتیں بہت دلچسپ لگیں۔ تم ایسے انداز میں گفتگو کر رہے تھے کہ آج تک میں نے کسی ٹیکسی ڈرائیور کو اتنی سادگی اور اتنی نادانی سے باتیں کرتے ہوئے نہیں سنا پھر کالج جا کر میں تمہیں بھول گئی۔ ڈس سیکشن کے بعد میری طبیعت بگڑ سی گئی تھی۔ مجھے اندر سے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر پنکھے کے نیچے بیٹھی رہی پھر وہاں سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ باہر گیٹ پر آگئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کوئی آرام دہ گاڑی ہو اور میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ کالج کی گاڑی میں لڑکے لڑکیاں بہت شور مچاتے ہیں اور پبلک بس میں جگہ نہیں ملتی۔ ایسے ہی وقت تم نگاہوں کے سامنے آگئے۔ میں تمہاری ٹیکسی کا دروازہ کھولا تو ایسی خوشبو' ایسی جنت ملی جس کی مجھے تلاش تھی۔ ایک لاش کے پاس سے

گزر کر آنے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی مہربان کی پناہ میں آگئی ہوں اور وہ ابھی مجھے تھپک تھپک کر سلا دے گا۔"

اس نے اپنی سینڈلیں اتار کر ہاتھ میں پکڑلیں اور ننگے پاؤں ریت پر چلتے ہوئے بولی "جب میں کالج سے آرہی تھی اس وقت میرے پاس صرف پندرہ روپے تھے۔ زیادہ رقم ہوتی اور ایسے میں تم کرایہ لینے سے انکار کرتے' خواہ تم کتنے ہی خوش ہوتے' تو مجھے وہ بات بری لگتی۔ میں غصے ہو کر پوچھتی کہ کرایہ کیوں نہیں لوگے؟ تم نے مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھا ہے لیکن اس وقت میں نے تمہیں ایک احمق سمجھ کر پیسے بچا لیے۔ میری امی ایک اسکول ٹیچر ہیں۔ بہت محدود آمدنی ہے۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ میں امی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ سوچتی ہوں جلدی سے یہ آخری سال ختم ہو جائے تو پریکٹس شروع کروں۔ کچھ آمدنی کا ذریعہ ہو۔"

وہ ایک دم چونک کر بولی "اوہ' میں کیا کہنے جا رہی تھی اور کیا کہنے لگی۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے تمہاری ٹیکسی میں ایک بار مفت سفر کرنے کے بعد دوسری بار نہیں بیٹھنا چاہیے تھا مگر حالات نے مجبور کر دیا۔ ایک تو میں بہت زیادہ تھکی ہوئی تھی' پریشان تھی' آرام دہ گاڑی میں سفر کرنا چاہتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ....."

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سر اٹھا کر بادشاہ جانی کو دیکھا پھر کہا "تمہارے بدلے ہوئے حلئے کو دیکھ کر ہی ساری باتیں مجھ پر روشن ہو گئیں۔ تم نے یہ حلیہ میرے لیے بدلا ہے۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پھولوں کی پنکھڑیاں میرے لیے بکھیری ہیں۔ ٹیکسی میں محدود خوشبو بھی میرے لیے ہی ہے۔ میں تھوڑی دیر گم صم رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں کیا کہوں؟ تمہارے خوابوں کو کیسے چکنا چور کر دوں؟ پھر میرے اندر کسی نے کہا کہ تم کوئی برے آدمی نہیں ہو۔ تمہارے اندر چھچھورا پن نہیں ہے۔ اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی بہت ہی چھچھورے اور بے ڈھنگے انداز میں اپنی پسند' اپنی محبت اور اپنی طلب پیش کرتے ہیں۔ تم ایک ان پڑھ ٹیکسی ڈرائیور ہو مگر پھولوں اور خوشبوؤں کی زبان سے اپنے دل کی بات ظاہر کر دی' اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ تمہارا یہ شاعرانہ انداز مجھے بہت اچھا لگا۔ میں اتنی دور ویران ساحل تک اس اعتماد سے آگئی ہوں کہ تم کوئی سستی طبیعت کے آدمی نہیں ہو۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی پھر سمندر کو دور تک دیکھنے لگی۔ وہ جس جگہ کھڑی ہوئی تھی' وہاں تک سمندر کی لہریں پہنچ رہی تھیں۔ بادشاہ جانی کے جوتے بھیگ رہے تھے۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اپنے جوتے اتارنے لگا۔ وہ بولی "ہم باتوں ہی باتوں میں بہت دور نکل آئے ہیں۔ واپس چلیں؟"

وہ اپنے ایک ہاتھ میں جوتے اور موزے اٹھا کر کھڑا ہو گیا پھر اس کے ساتھ واپس چلتے ہوئے بولا "اپنی بات کچھ تو بولو۔"

"اور کیا بولوں۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے تمہاری گاڑی کا پیٹرول جل رہا ہے۔ تم میرے لیے اپنی سواریاں چھوڑ کر نقصان اٹھا رہے ہو اور میں تفریح کر رہی ہوں۔"

"ایسی بات نہ بولو۔ تم پیٹرول جلنے کی بات کرتی ہو۔ میں تمہارے لیے اپنا گھر پھونک سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا سکتا ہوں۔ بس تم اپنی اچھی اچھی باتیں بولتی جاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔ بہت اچھا لگ رہا ہے' جب تم گھر چلی جاؤ گی تو میں انہی باتوں سے آج کا دن' آج کی رات گزار لوں گا۔ کل صبح تمہاری باتیں پھر سنوں گا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اسی طرح میری زندگی گزر جائے۔ میں آگے پیچھے' دائیں بائیں دنیا کو بالکل نہ دیکھوں۔ دیکھوں تو تمہیں ہی دیکھوں۔"

"کیا میں بہت اچھی لگتی ہوں؟"

"بہت اور بہت اچھی لگتی ہو۔"

"میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ جیسی میں نظر آ رہی ہوں' ویسی خوب صورت نہیں ہوں۔ تم مجھے مکمل دیکھ رہے ہو اور میں آدھی ہوں۔ میرا آدھا چہرہ بہت ہی بھیانک ہے۔"

وہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا پھر بولا "ابھی تک تمہیں اس لاش کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ ایک حسین لڑکی کی لاش تھی۔"

"ہاں' میں نے اس کا آدھا خوب صورت اور آدھا بد صورت چہرہ دیکھنے کے بعد ہی رائے قائم کی ہے کہ حسن پانی کا بلبلہ ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہو جاتا ہے۔ اگر میرے پاس یہ حسن نہ رہے' میرا چہرہ بگڑ جائے تو کیا تمہاری طلب ویسی ہی رہے گی۔"

"میں تمہیں چاہتا ہوں' تم جس صورت میں بھی ملو گی' میں تمہیں اپنا بنا لوں گا۔"

"سوچ سمجھ کر جواب دو۔ تم نے مجھے کیوں پسند کیا؟ پہلے میرا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ لوگ پہلے ظاہری حسن کو دیکھتے ہیں۔ اس حسن کے اندر جو خوب صورت ہوتی ہے اسے بعد میں پہچانا جاتا ہے۔ کتنی ہی بد صورت لڑکیاں ہوتی ہیں جو اندر سے خوب صورت ہوتی ہیں لیکن کوئی انہیں پسند نہیں کرتا کیونکہ ان میں بظاہر متاثر کرنے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔"

"میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ زندگی میں پہلی بار تمہیں پسند کیا ہے۔ تمہیں ہی صبح سے اب تک بار بار دیکھا ہے ورنہ میں کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اب تم جیسی بھی صورت لے کر مجھے ملو گی' تم ہی رہو گی۔ کوئی دوسری لڑکی نہیں بن جاؤ گی پھر میں تم سے منہ کیسے پھیر سکوں گا۔"

وہ باتیں کرتے کرتے ٹیکسی کے پاس آ گئے۔ بادشاہ جانی نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ لڑکی نے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا پہلے تو آگے نہیں بڑھی پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کر دیا۔ ٹیکسی کے دوسری طرف گھوم کر گئی اور آگے والے دروازے کو کھول کر سامنے کی طرف بیٹھ گئی۔ بادشاہ جانی خوشی سے کھل گیا۔ اس نے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کار کو اسٹارٹ کیا پھر اسے واپس موڑ کر کلفٹن کے ریستوران کے سامنے پہنچ گیا۔ "اب تو بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہی ہوگا۔"

وہ گاڑی سے اتر گئی۔ اس نے گاڑی کو لاک کیا پھر وہ ریستوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے کہا "سچی بات بتا دوں کہ میں نے بڑے ہوٹلوں میں کبھی نہیں کھایا۔ تم خود ہی کھانے کا آرڈر دے دو۔"

جب بیرا آیا لڑکی نے کھانے کا آرڈر دیا۔ بیرے کے جانے کے بعد بادشاہ جانی نے پوچھا "تم کالج سے نکل کر میرے ساتھ چلی آئی ہو۔ تمہارے گھر والے پریشان نہیں ہوں گے۔ جب تم جاؤ گی تو معلوم نہیں وہ لوگ کیا کیا پوچھیں گے؟"

وہ بڑے اعتماد سے بولی "میری امی کو مجھ پر بھروسا ہے۔ میں یہاں سے جا کر بتاؤں گی کہ میں تمہارے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ میری امی نے بچپن ہی سے سچ بولنے کی تعلیم

دی ہے' جہاں سچائی ہوتی ہے' وہاں بے اعتمادی نہیں ہوتی۔ ماں کو بیٹی پر اعتماد ہے اور بیٹی کو ماں پر فخر ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے مگر سوچ کے دیکھو تو خون کے رشتوں میں اتنا اعتماد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی اکیلی عورت ٹیکسی میں سفر کرتے وقت ڈرائیور پر بھروسا کرتی ہے کہ وہ اسے بھگا کر نہیں لے جائے گا۔ جو منزل بتادی ہے' اسی منزل پر پہنچائے گا۔ اس سے بڑا اعتماد اور کسی پر نہیں ہو سکتا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ نظریں ٹکرائیں تو اس نے نظریں جھکالیں۔ کرسی پر ذرا بے چینی سے پہلو بدلا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ نام بتانا نہیں چاہتی ہو یا اپنا نام بھول گئی ہو اور یاد کر رہی ہو پھر اس نے بتادیا "رخسانہ فرید۔"

میز پر کھانا چن دیا گیا۔ کھانے کے دوران بادشاہ نے پوچھا "تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

"تاش کھیلتے ہیں' شعروشاعری کرتے ہیں۔ ان سے محنت نہیں ہوتی۔ کبھی ایک ملازمت کرتے ہیں پھر دوسری ملازمت کرتے ہیں' چھوڑ دیتے ہیں۔ اکثر بے کار رہتے ہیں۔ گھر کا زیادہ بوجھ امی کے کاندھوں پر ہے۔ وہ اسکول ٹیچر ہیں۔ میرے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشن بھی پڑھاتی ہیں۔ میری امی بہت اچھی ہیں۔"

"میں تمہاری امی کا بوجھ تھوڑا ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم کہو تو میں مستری چاچا کو رشتے کی بات کرنے کے لیے تمہارے گھر بھیج دوں۔"

اس نے ایک دم حیران ہو کر دیکھا جیسے کوئی انہونی بات کہی گئی ہو پھر وہ سر جھکا کر بولی "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہم آج ہی ملے ہیں اور آج ہی تم اس حد تک بڑھنا چاہتے ہو۔ پہلے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہم آپس میں اس طرح اتنی جلدی مل بیٹھے ہیں۔ یہ ابتدائی اعتماد کی بات ہے اس اعتماد کے ذریعے آگے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔"

"تم اپنی جگہ ٹھیک کہتی ہو لیکن میں اپنے چاروں طرف یہی دیکھتا ہوں کہ شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کو دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ سمجھنے کی بات تو دور کی ہے' تم بولو' ہمارے ملک میں ایسا ہوتا ہے کیا؟"

"نہیں ہوتا لیکن ہمارا معاملہ الگ ہے۔ ہمارے درمیان سماجی مرتبے کی جو اونچ نیچ ہے' اسے کیسے برابر کیا جائے۔ اس مسئلے پر ذرا غور کرنا ہوگا۔"

"تو دیر کیا ہے' ہم ابھی غور کر لیتے ہیں۔"

وہ کھانا کھانے لگے۔ دونوں چپ تھے۔ جیسے اپنی اپنی جگہ سوچ رہے ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ جانی نے پوچھا "تم غور کر رہی ہو نا؟"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ تمہیں سوچنا چاہیے کہ کس طرح ایک ٹیکسی ڈرائیور کی سطح سے اٹھ کر سفید پوشوں کی سطح تک پہنچ سکتے ہو۔ تم مرد ہو' اپنی جدوجہد کو خود سمجھ سکتے ہو۔"

"ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ٹیکسی چلانا چھوڑ دوں تاکہ یہ ٹیکسی ڈرائیور والا جو سائن بورڈ میرے اوپر لگا ہوا ہے' یہ ہٹ جائے۔"

"تم کہتے ہو کہ ٹیکسی سے تمہیں کافی منافع حاصل ہوتا ہے۔ اچھا کماتے ہو' اچھا کھاتے ہو' ایک مکان بھی بنالیا ہے پھر آمدنی کے اتنے اچھے ذریعے کو کیوں ختم کرو گے۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"کچھ ایسا کرو کہ ٹیکسی بھی چلتی رہے اور تم ٹیکسی ڈرائیور بھی نہ کہلاؤ مثلاً یہ کہ تم کسی اور سے ٹیکسی چلوایا کرو اور خود مہاجن بن کر رہو۔"

وہ ذرا چپ رہا پھر نیم دلی سے بولا "ہاں' ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھی۔ ایک لقمہ چباتے ہوئے بولی "اور اس میں جھوٹ بھی کیا ہے۔ ٹیکسی تمہاری ہے اور تم مالک ہو' میں اپنے گھر والوں سے بے دھڑک کہہ سکتی ہوں کہ تم ٹیکسی ڈرائیور نہیں ہو۔"

وہ چپ چاپ کھاتا رہا' کھانا ختم ہونے کے بعد انہوں نے بل ادا کیا پھر وہاں سے ٹیکسی میں آگئے۔ وہ پہلے کی طرح اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جانی چپ چاپ سا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو رخسانہ نے پوچھا "کیا بات ہے' تم بالکل خاموش ہوگئے۔ کچھ سوچ رہے ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "میں نے ابھی کہا تھا کہ میرے اوپر سے ٹیکسی

ڈرائیور کا سائن بورڈ کیسے ہٹ سکتا ہے۔ تم نے طریقہ بتادیا۔ اچھا طریقہ ہے۔ اس سے
میں تمہارے گھرانے میں اپنی عزت بنا سکتا ہوں مگر اندر سے میرا دل کہتا ہے کہ یہ اچھی
بات نہیں ہے۔ میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ اس میں برائی کیا ہے' کیا میں محنت نہیں کرتا
ہوں کہ لوگ میری طرف انگلی اٹھا کر کہیں کہ یہ بدمعاش ہے' مجرم ہے' گناہ گار ہے۔ اگر
میں یہ سب نہیں ہوں تو ٹیکسی ڈرائیور ہونا بری بات کیوں ہے۔"

"تم ایسے نہیں ہو' دوسرے تو ایسے ہیں۔ مسافروں کو لوٹتے ہیں۔ ٹیکسی کا میٹر تیز
سے تیز کردیتے ہیں۔"

"تم لوٹنے کی بات نہ کرو۔ ہمارے شہر میں کون سی ایسی جگہ ہے جہاں ایک آدمی
دوسرے کو نہیں لوٹتا ہے۔ یہ ڈاکٹر لوگ جنھوں نے بڑی بڑی بلڈنگوں میں اپنی اپنی دکان
کھول رکھی ہے اور ایک مریض سے سو روپے فیس لیتے ہیں تو ان کے میٹر کتنے تیز ہیں۔
میں نے سنا ہے یہ اسپیشل ڈاکٹر لوگ ایک دن میں دو تین ہزار روپے کماتے ہیں۔ یہ
اندھی کمائی' یہ اندھا میٹر کتنی تیز رفتاری سے چل رہا ہے لیکن انہیں کوئی یہ نہیں کہتا کہ
یہ لوٹ رہے ہیں۔ ایک غریب آدمی کیا سو روپے دے کر ان سے علاج کرا سکتا ہے۔ کیا
بڑے آدمیوں کو ہی اسپیشل مرض ہوتا ہے کہ وہ اسپیشل ڈاکٹر بنتے ہیں۔ لوٹ گھسوٹ
بڑے لوگوں میں زیادہ ہے' ہم چھوٹے لوگ ذرا میٹر تیز کردیتے ہیں تو بدنام ہوجاتے
ہیں۔"

"دوسروں کو برا کہنے سے اپنی برائی ختم نہیں ہوتی۔"

"کیا دولت کمانے والے لوگ ٹیکسی ڈرائیوروں کو بدمعاش کہہ کر برائی ختم کردیتے
ہیں؟ اصل بات یہ ہے جی کہ ہم سب لوگوں نے مل کر اپنی اپنی ایک جماعت بنائی ہے اور
ہم اپنی اپنی جماعت میں بیٹھ کر اپنے اپنے کو شریف بولتے ہیں۔ تم سفید پوش لوگ اپنے
گن گاتے ہو۔ اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہو۔ دولت والے کسی کو منہ نہیں لگاتے
کیونکہ ان کی نظر میں ہم سب لوگ نیچ ہیں۔ اس طرح ہم ٹیکسی ڈرائیور بھی اپنے بارے
میں یہی سمجھتے ہیں کہ ہم جو کرتے ہیں' اچھا کرتے ہیں۔ جو کچھ ہمیں دنیا والوں سے ملتا
ہے' وہ ہم انہیں واپس لوٹا دیتے ہیں۔ کوئی پولیس افسر ہماری گاڑی میں مفت بیٹھ کر
پیٹرول جلاتا ہے تو ہم مسافروں کو جلاتے ہیں۔ ایئرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن کے

مسافروں سے ہم تین گنا وصول کرتے ہیں کیونکہ وہاں کے ٹیکسی اسٹینڈ میں گاڑی کھڑی
کرنے کے لیے پولیس والوں کو روزانہ بھتا دینا پڑتا ہے پھر ہم یہ پیسے کہاں سے لائیں
گے؟ ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے' مسافروں کی جیب۔ جب دو چار
مسافر ٹیکسی میں بیٹھ کر نفرت سے بولتے ہیں "ابے اِدھر کہاں جاتا ہے' اُدھر چل۔" تو ہم
اندر ہی اندر غصے سے کھولنے لگتے ہیں۔ ان دو چار آدمیوں کا اکیلے کچھ بگاڑ نہیں سکتے اس
لیے دوسرے مسافروں سے انتقام لینے کے لیے ہم بھی نفرت اور بدتمیزی سے باتیں کرتے
ہیں' پھر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ جن سے ہم بدتمیزی کررہے ہیں' وہ بدمعاش ہیں یا شریف؟
ہمارے یہاں ایسی کوئی کسوٹی نہیں ہے جس سے ہم شریفوں اور بدمعاشوں میں تمیز
کرسکیں۔ اگر ہے تو مجھے بتادو۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔ راستہ خاموشی سے کٹ
رہا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد بادشاہ جانی نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا
پھر پوچھا "معلوم ہوتا ہے کہ تم ناراض ہوگئی ہو؟"

وہ چونک کر بولی "آں' کیا کیا؟ نہیں تو ناراض کیوں ہوسکتی ہوں۔"

"اس لیے کہ میں نے تمہاری جماعت کے لوگوں کو برا کہا ہے۔ دیکھو نا برائی تو ہر
جگہ ہے جہاں انسان ہوں گے' وہاں برائی ہوگی تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں نا کہ ہم سب
کے آدھے آدھے چہرے ہیں اور ہم سب اپنے آدھے چہرے کو دوسروں سے چھپا کر رکھتے
ہیں پھر ہم سب پورے شریف تو نہ ہوئے نا؟ آدھے بدمعاش' آدھے شریف ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "واقعی ہم دوسروں کو نیچا دکھانے میں اتنے مصروف رہتے
ہیں کہ ہمیں اپنی گری ہوئی حیثیت یاد نہیں رہتی۔"

"تو پھر ہماری بات کہاں تک پہنچی؟"

وہ سوچنے لگی' پھر بولی "ہم ایک دوسرے کی سچی اور کھری باتوں کو مان لیں گے مگر
ہمارے گھر والے نہیں مانیں گے۔ یہاں بات بات پر پردہ پوشی ہوتی ہے' یہاں ہر لمحہ یہ
سوچا جاتا ہے کہ ہم دوسروں سے کیسے برتر رہیں اور برتری قائم رکھنے کا سب سے آسان
طریقہ یہی ہے کہ دوسروں کو کمتر ظاہر کریں۔ میرے گھر والے تم کو کمتر سمجھیں گے۔ ہاں
اگر تم ٹیکسی کے مالک بن جاؤ گے تو تمہاری حیثیت بدل جائے گی۔"

"تو بات یہاں تک پہنچی کہ میں اپنی حیثیت بدل دوں گا' اس کے بعد اور کوئی بات غور کرنے کے لیے رہ گئی ہے۔"

"کیا تم نشہ کرتے ہو؟"

"ایسی باتیں پوچھنے کا کیا فائدہ ہے؟ جب ہم اس بات کو مان گئے ہیں کہ ہر آدمی اپنا آدھا چہرہ چھپاتا ہے معلوم نہیں ہم دونوں بھی کیا چھپا رہے ہیں' جو بات چھپی ہوئی ہے اسے چھپی ہی رہنے دو۔"

وہ چپ رہی' جیسے اس نے بھی کوئی بات چھپا رکھی ہو اور اسے چھپائے رکھنا چاہتی ہو۔ بادشاہ جانی نے کہا "ویسے میں یہ بتادوں کہ کل تک نشہ کرتا تھا لیکن آج میں نے اپنے ڈیش بورڈ سے چرس کا سگریٹ نکال کر پھینک دیا۔ اب کبھی نشے کو منہ نہیں لگاؤں گا۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تمہاری سچائی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو' وہ سچ ہوگا۔ تم آئندہ کبھی نشہ نہیں کروگے۔ صبح سے میں نے تمہاری بہت ساری سیدھی سادی باتیں سنی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں....."

وہ بات پوری نہ کرسکی سر جھکا کر چپ ہوگئی۔ اس کے چہرے پر حیا کی لالی تھی۔ عباسی اسپتال کے قریب پہنچ کر اس نے رہنمائی کی۔ بادشاہ جانی نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئی بولی "میں ابھی تمہیں بلاؤں گی' انتظار کرو۔"

وہ ذرا گھبرا کر بولا "تت.... تم مجھے گھر بلاؤ گی۔ تمہارے گھر والے کیا بولیں گے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "میں نے کہا نا کہ امی صرف میری امی ہی نہیں' میری سہیلی بھی ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ بادشاہ جانی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے اس طرح کسی گھر میں ہونے والے داماد کی حیثیت سے جانا ہوگا اور جب جانا ہی ہوگا تو وہ وہاں کیسے بیٹھے گا۔ کس طرح باتیں کرے گا' اگر اس کے ماں باپ نے کہہ دیا کہ میاں ہماری لڑکی بے حد حسین ہے' بے حد ذہین ہے۔ لیڈی ڈاکٹر بننے والی ہے۔ بڑے

بڑے گھرانوں سے اس کے رشتے آرہے ہیں۔ وہ بہت بڑی ڈاکٹرنی بن کر سیکڑوں' ہزاروں اور لاکھوں روپے کمائے گی۔ تم نے اپنی حیثیت دیکھی ہے' تب وہ کیا جواب دے گا؟

اگر صرف داماد بننے والی بات ہوتی تو وہ وہاں سے بھاگ جاتا لیکن رخسانہ کی کشش نے اسے بٹھائے رکھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی اور مسکراتے ہوئے بولی "اندر آجاؤ' میں نے امی سے تمہارا غائبانہ تعارف کرادیا ہے۔"

اس نے ٹیکسی کو لاک کیا' پھر سہمے ہوئے انداز میں اس کے پیچھے چلتا ہوا اس مکان کے پہلے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ پرانے فرنیچر تھے اور ایک پرانا ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس کمرے کو ڈرائنگ روم بنانے کی ایک ناکام کوشش کی گئی تھی۔ فرش پر قالین کی جگہ دری بچھی ہوئی تھی پھر بھی ڈرائنگ روم بادشاہ جانی کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا کیونکہ وہاں جو بھی پرانی اور سستی چیزیں رکھی ہوئی تھیں' وہ بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور ایسا سلیقہ بادشاہ جانی کی زندگی میں نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک گھر والی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک معمر خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی بادشاہ ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ خاتون نے مسکرا کر جواب دیا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اس کا نام پوچھا۔ نام کے بعد مقام کا پوچھا۔ "کہاں رہتے ہو۔ تمہارے کون کون رشتے دار ہیں؟"

"میرا کوئی نہیں ہے۔ دور کے رشتے دار بنگلہ دیش میں ہیں۔"

"تمہاری تعلیم کیا ہے؟"

"آٹھ جماعتیں پاس کرچکا ہوں۔"

"آگے تعلیم جاری کیوں نہیں رکھی؟"

"کوئی کمانے والا ہوتا' مجھے کھلانے اور پڑھانے والا ہوتا تو میں آگے پڑھ لیتا۔ اپنی زندگی گزارنے کے لیے پیٹ بھرنے کے لیے مزدوری کرنا پڑی۔"

"کیا ٹیکسی چلاتے ہو؟"

"کبھی ڈرائیور نہیں ہوتا تو مجبوراً چلانی پڑتی ہے۔ نہیں تو ڈرائیور چلاتے ہیں۔"

"تمہارے پاس کتنی ٹیکسیاں ہیں؟"

"ابھی تو ایک ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی دوسری خریدلوں گا۔"
"کیا تمہارا مکان اپنا ہے۔"
"جی ہاں' اپنا ہی ہے۔"
"کتنے گز کے پلاٹ پر ہے؟"
"ابھی تو اسی گز کا پلاٹ ہے۔ کل اس کے ساتھ ایک اور اسی گز کا پلاٹ خریدلوں گا۔"

وہ تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچتی رہیں پھر بولیں "رخسانہ کو تم نے دیکھا ہے' وہ ایسی ہے کہ اس کے لیے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آتے ہیں۔ لڑکے والے میری بیٹی کے نام اپنا مکان لکھنے کو تیار ہیں۔ پکے کاغذ پر یہ بھی لکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ہر مہینے دو ہزار روپے لڑکی کو خرچ کے لیے دیا کریں گے۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو مہر کی رقم ایک لاکھ روپے تک مقرر کرنے کو تیار ہیں۔"

وہ سر جھکا کر سن رہا تھا اور احساس کمتری میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا "میں جو کچھ بھی ہوں' آپ کے سامنے ہوں' اپنے سے جو کچھ بھی ہو سکے گا' میں کروں گا۔"

رخسانہ ایک ٹرے میں چائے اور ناشتا لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ ہولے سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا پھر ایک ہاتھ سے اپنے سر پر آنچل درست کیا۔ سر کو جھکایا اور اپنی امی کے سامنے بڑے ادب سے چلتے ہوئے آئی۔ ایک تپائی پر ناشتے کی ٹرے رکھی پھر اس تپائی کو بادشاہ جانی کے قریب کر دیا۔ ایسا کرنے کے دوران میں جب بھی وہ بادشاہ جانی کی طرف رخ کرتی تھی تو پلکیں اٹھا کر بڑے ہی میٹھے انداز میں دیکھتی تھی۔ اس کی نظریں سیدھی دل میں اتر جاتی تھیں۔ وہ اتنی بھولی بھالی' اتنی پیاری پیاری سی لگ رہی تھی۔ اس کی اداؤں میں ایسی اپنائیت تھی کہ اس کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کر سکتا تھا' اپنا گھر' اپنی ٹیکسی اور اپنی جان بھی۔ بشرطیکہ اس کی امی یہ سب کچھ قبول کر لیتیں۔
وہ ناشتا رکھ کر چلی گئی۔ خاتون نے کہا "ناشتا کرو۔"
وہ بولا "میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے دوپہر کا کھانا کھایا ہے اس لیے صرف چائے پیوں گا۔"

پھر اس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا "مجھ کو کبھی کسی کی محبت نہیں ملی۔ میں اتنی بڑی دنیا میں ہمیشہ اکیلا اکیلا رہا۔ آج ایک مدت کے بعد کسی گھر میں آیا ہوں۔ آپ سے محبت چاہتا ہوں' آپ مجھے بیٹا بنالیں گی تو میرا سب کچھ آپ ہی لوگوں کے لیے ہوگا۔ میں بہت زیادہ پیسے والا نہیں ہوں مگر اتنا کمالیتا ہوں کہ کبھی تنگی نہیں ہوئی' آرام سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔"
وہ چائے پینے لگا۔ اسے خاطر خواہ جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی ہوئی اسے دیکھے جا رہی تھیں اور وہ نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ چائے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ وہ جبراً زہر مار کر رہا تھا' پھر پیالی خالی ہو گئی۔ اس نے ٹرے پر پیالی رکھ دی اور جواب کے انتظار میں اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ خاتون نے بہت دیر بعد کہا "ٹھیک ہے' میں رخسانہ کے ابو سے بات کروں گی' پھر تم سے باتیں ہوں گی۔ میں اکیلی عورت اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ تم ابھی جاؤ۔"
وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا' پھر سلام کرنے کے بعد سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔ جب وہ باہر ٹیکسی کے پاس پہنچا تو وہاں رخسانہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا "معلوم نہیں تمہاری امی کب جواب دیں؟ کیا جواب دیں؟ میرا دل اندر سے گھبرا رہا ہے۔ بڑے بڑے رشتے تمہارے لیے آئے ہوئے ہیں۔"
یہ کہتے ہوئے وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رخسانہ نے کہا "اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کل بتاؤں گی کہ امی کا فیصلہ کیا ہے؟ تم بالکل اطمینان رکھو۔"
"میں کل تمہارے کالج جانے کے وقت گاڑی لے کر آؤں گا۔"
"یہاں گھر کے پاس مت آنا۔ امی شاید پسند نہ کریں۔ عباسی اسپتال کے پاس انتظار کرنا۔ میں ٹھیک نو بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔"
اس کی امی کی آواز سنائی دی "رخسانہ! یہاں آؤ۔"
وہ جلدی سے سر پر آنچل رکھ کر وہاں سے پلٹ کر جانے لگی۔ بادشاہ جانی نے ایک سرد آہ بھر کر بڑی حسرت سے دیکھا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ جہانگیر روڈ پر گیراج ابھی کھلا ہوا تھا۔ مزدور اسے دیکھ کر مسکرائے۔ مستری چاچا نے پوچھا "کیا بات ہے' بڑی جلدی ٹیکسی لے آیا۔ کیا گاڑی بند کرنے کا ارادہ ہے؟"

"چاچا' آج میں نے کوئی سواری نہیں اٹھائی۔ اس لڑکی کے ساتھ تمام دن گھومتا رہا۔"

یہ سنتے ہی تمام مزدور اچھل پڑے۔ سب اس کے قریب آنے لگے۔ وہاں دو ٹیکسی والے بھی تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "ہاں بھئی' سنا ہے کوئی سونے کی چڑیا پھانسی ہے۔"

بادشاہ نے غرا کر کہا "منہ سنبھال کر بات کرو۔ وہ میری گھروالی بننے والی ہے۔"

اس نے کہا "ارے تو بادشاہ جانی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ ایسی بات ہے تو ہم اپنی ہونے والی بھابی کا نام عزت سے لیں گے مگر نام کیا ہے؟"

وہ اکڑ کر بولا "رخسانہ 'لیڈی ڈاکٹر رخسانہ ہے۔ وہ بہت بڑی ڈاکٹرنی ہے۔ معلوم ہے' وہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرتی ہے۔"

سب لوگ اور قریب آ گئے۔ حیرانی سے اس کی باتیں سننے لگے۔ مستری چاچا بھی اس کی طرف متوجہ تھا۔ بادشاہ جانی کو خیال آیا کہ وہ ریسٹورنٹ میں کیسے کھا رہی تھی۔ اس نے کہا "معلوم ہے' وہ چھری کانٹے سے کھاتی ہے۔"

کتنے ہی لوگوں کے حلق سے حیرت بھری چیخ نکلی پھر ایک نے کہا "کیا مطلب! وہ لاشوں کو چیرتی پھاڑتی ہے؟ اور چھری کانٹے سے کھاتی ہے؟"

وہ ایک دم سے بھڑک کر بولا "ابے گدھے کہاں کی بات کہاں ملاتا ہے۔ میں نے کب کہا کہ وہ لاشوں کو کھاتی ہے۔ کوئی انسان ایسا کر سکتا ہے کیا؟ کمینے بات ہی نہیں سمجھتے' جاہل کے جاہل ہو۔ کبھی کسی پڑھی لکھی لڑکی کے ساتھ وقت گزارا ہو تو میری بات سمجھ میں آئے۔"

مستری چاچا نے کہا "ارے تم لوگ اپنا کام کرو۔ کیوں اسے پریشان کر رہے ہو۔ بادشاہ ادھر آ۔ مجھ سے بات کر۔ وہ لڑکی آج پھر تجھے ملی۔ سارا دن تیرے ساتھ گھومتی رہی اور تیری گھروالی بننے .... کے لیے راضی ہو گئی۔ دیکھ مجھے گڑبڑ لگتی ہے۔ تجھے اس کے بزرگوں سے ملنا چاہیے۔"

"چاچا اس کے سارے خاندان سے مل کر آ رہا ہوں۔ معلوم ہے اس کے لیے بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آئے ہیں۔ اس کے نام کتنے ہی لوگ کوٹھی لکھنا چاہتے

ہیں۔ لاکھوں روپے مہر کی رقم دینا چاہتے ہیں۔ اس کے ماہانہ خرچ کے لیے کاغذ پر لکھنے کو تیار ہیں۔"

"اس کی اتنی اونچی بولیاں لگ رہی ہیں' کیا وہاں تیری بولی قبول ہو جائے گی؟ کیا تو گھاس کھا گیا ہے۔ کچھ عقل سے کام لے۔"

"چاچا' آج صبح سے عقل میرے ساتھ نہیں ہے۔ بس وہی سامنے رہتی ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا' بس اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا تیرے حال پر رحم کرے۔ پتا نہیں کہاں جا کر پھنسنے والا ہے۔"

اس نے مستری چاچا کا ہاتھ پکڑ کر عاجزی سے کہا "ایسا مت بولو۔ میرا دل چھوٹا مت کرو۔ میری ہمت بندھاؤ۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ کوئی شریف لڑکی پسند آ جائے گی' تو اس کے گھر جا کر میرا رشتہ مانگو گے۔ میں شروع میں ہونے والی ساری باتیں اس کی ماں سے کر چکا ہوں۔ اب آگے کی بات ہو گی' تم ضرور جاؤ گے چاچا۔"

"جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ یہ بات ہم بوڑھے اچھی طرح جانتے ہیں' اسی لیے اپنی اولاد کا رشتہ خوب چھان بین کے بعد طے کرتے ہیں۔ اگر تو مجھے اس کے متعلق اچھی طرح چھان بین کا موقع دے گا تو میں تیرے رشتے کی بات کروں گا۔ اگر دیوانہ ہو کر' آنکھیں بند کر کے اس لڑکی کو قبول کرنا چاہے گا' تو میں پہلے سے کہے دیتا ہوں کہ مجھے بیچ میں نہ ڈالو۔"

"چاچا' میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بڑے بن کر وہاں جاؤ مگر کوئی ایسی بات نہ کرو جو ان لوگوں کو پسند نہ آئے۔ نہیں تو بات بگڑ جائے گی۔"

"بیٹا' میں وہی بات کروں گا جو عقل سمجھاتی ہے اور تجربہ سکھاتا ہے۔ اگر وہ اصول کے خلاف کوئی بات کریں گے' تجھے لوٹنا چاہیں گے تو میں کیسے برداشت کر سکوں گا۔"

"چاچا' لوٹنے کی بات نہیں ہے۔ میں نے بتایا نا کہ ان کے ہاں بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آ رہے ہیں جو اس کے نام کوٹھی بھی لکھنا چاہتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ تیرا وہ مکان اپنی لڑکی کے نام لکھوائیں گے۔ دیکھ میں پیشن گوئی کرتا ہوں کہ وہ اچھی طرح پکے کاغذ پر لکھا پڑھی کریں گے اور تیری ساری چیزیں ہتھیا لینے کے بعد تجھے اپنی لڑکی دیں گے۔ تو اپنا سب کچھ ہارنے کے لیے تیار ہے تو

پھر ہماری کیا ضرورت ہے؟ خود جا کے بات کرلے اور دلہن بنا کر لے آ۔ ہم اپنے اوپر یہ الزام کیوں لیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے تو لٹ گیا۔"

"چاچا' تم تو پہلے ہی دل توڑنے والی بات کرنے لگے ہو۔ ٹھیک ہے کل میں اس سے ملوں گا۔ دیکھوں گا کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔"

وہ پلٹ کر اپنی ٹیکسی کے پاس جانے لگا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا "چاچا' اچھا یاد آیا۔ مجھے آٹھ ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ میں اپنے بازو والا پلاٹ خریدنا چاہتا ہوں۔ کیا تم دے دو گے؟"

"ٹھیک ہے' کل بینک کھلے گا تو میں پیسے نکال کر دے دوں گا مگر یاد رکھنا' اپنے نام پلاٹ خریدنا۔ لڑکی کے نام جو کچھ بھی خریدنا ہے' وہ شادی کے بعد کرنا' میری نصیحت پر عمل نہیں کرو گے تو پچھتاؤ گے۔"

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "بادشاہ' تیری زندگی میں بڑی خوشی آئی ہے۔ اسی خوشی میں بوتل کھول لی جائے۔"

وہ انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "مجھ سے ایسی بات مت بولو۔ میں نے نشہ چھوڑ دیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا پھر اسے اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "یہ تو بالکل ہی دیوانہ ہو گیا ہے۔ عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کے لیے نشہ چھوڑ دیا ہے' گیا کام سے۔"

دیوانہ اپنی دیوانگی کو سمجھ نہیں سکتا' کوئی سمجھائے تب بھی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

آج بادشاہ نے اتنا خوب صورت دن گزارا تھا۔ اتنا خوب صورت کہ اسے اپنی ساری گزشتہ زندگی بیکار معلوم ہوئی۔ یہ دن اس کی تقدیر سے زیادہ خوب صورت تھا۔ آج اسے اتنی مسرتیں ملی تھیں جو اس کی جھولی سے زیادہ تھیں۔ اسے رخسانہ کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ونڈ اسکرین پر گزرے ہوئے حسین لمحات کی فلم چل رہی تھی۔ رخسانہ کی ایک ایک ادا یاد آرہی تھی۔ اب رات کیسے گزرے گی' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آج سے وہ رت جگے کا سبق شروع کرنے والا تھا۔

اس نے اسٹیٹ ایجنسی میں جا کر پانچ سو روپے ایڈوانس دیے اور ان سے کہہ دیا کہ

وہ کل کاغذات تیار رکھیں۔ وہ بازو والے پلاٹ کی رقم ادا کرکے کاغذات اپنے نام سے لے جائے گا۔ وہاں سے وہ گھر آگیا۔ شام کو کھانا کھا چکا تھا۔ بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ رات گزرنے لگی تو پتا چلا کہ نیند نہیں آئے گی۔ وہ تمام رات چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اپنے گھر کا نقشہ بدلنے کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ اس کمرے کو رخسانہ کے ڈرائنگ روم کے مطابق بنانا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا رہا اور رات گزرتی رہی۔ تین بجے کے قریب اسے نیند آنے لگی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ خیال آیا کہ اب سوئے گا تو صبح پتا نہیں کس وقت آنکھ کھلے گی۔ دیر سے سونے کا مطلب تو یہی ہوتا ہے کہ دیر تک سوتا رہے گا۔

وہ پریشان ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اب نیند دشمن بن رہی تھی۔ اسے تھپک کر سلا دینا چاہتی تھی۔ اگر الارم والی گھڑی ہوتی تو وہ اطمینان سے سو سکتا تھا یا پھر اپنے پڑوسی سے کہہ دے کہ اسے صبح جگا دیا جائے تو؟

لیکن اتنی رات کو وہ پڑوسی کے دروازے پر دستک دے کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ چاند کو دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگا۔ دل نے پوچھا' وہ کیا کر رہی ہوگی۔ رات اتنی زیادہ گزر چکی ہے۔ سو رہی ہوگی۔ نہیں اس کی طرح جاگ رہی ہوگی۔ کیا دونوں طرف برابر کی آگ لگی ہوئی ہے؟

چاندنی ستا رہی تھی۔ اس لیے نیند پھر اڑ گئی۔ وہ بازو والے خالی پلاٹ کو دیکھ کر اس کے لیے محل بنانے لگا۔ چار بجے کے قریب پڑوسی کا دروازہ کھلا۔ روشنی باہر آئی۔ اس نے گھوم کر دیکھا اس کا پڑوسی تیزی سے چلتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے کہا "بادشاہ جانی' اچھا ہوا آپ جاگ رہے ہیں۔ میری بچی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اسے اسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔"

بادشاہ نے کہا "اوہ' میں تو بھول ہی گیا۔ ہماری بھابی صاحبہ نے کہا تھا کہ شام کے وقت بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں مگر میں دیر سے واپس آیا۔ کوئی بات نہیں' ابھی لے چلتا ہوں۔"

وہ گھر کے اندر آگیا۔ وہاں سے گاڑی کی چابی لی۔ باہر آکر گھر کے دروازے کو مقفل کیا' پھر گاڑی میں بیٹھ کر اسے آگے بڑھاتے ہوئے پڑوسی کے دروازے کے سامنے اسے روک دیا۔ پڑوسی اور پڑوسن اپنی دس سالہ بچی کو سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے

پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ ان لوگوں نے کہا کہ قریبی اسپتال میں لے جانا چاہیے۔ بادشاہ نے مشورہ دیا کہ عباسی شہید اسپتال چلا جائے' اگرچہ وہ دور ہے لیکن ٹیکسی میں جلدی پہنچ جائیں گے۔

اس نے گاڑی کو عباسی اسپتال کی طرف بڑھادیا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کی گلی کی طرف جارہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر لڑکی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے' پھر پڑوس میں ایک اسپتال کھل جائے گا۔ لیڈی ڈاکٹر رخسانہ علاج کیا کرے گی' پھر اتنی دور عباسی اسپتال جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اس نے پڑوسیوں کو ایمرجنسی وارڈ میں پہنچادیا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد پتا چلا کہ لڑکی کو اسپتال میں داخل کردیا گیا ہے۔ وہ اسپتال کے ایریا سے ٹیکسی نکال کر لے آیا۔ اب دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ اس نے اسپتال کے سامنے ہی ایک طرف گاڑی روک دی' پھر پچھلی سیٹ پر آکر لیٹ گیا۔ وہاں سے وہ گلی دکھائی دے رہی تھی جہاں رخسانہ کا گھر تھا۔ اس نے سوچا' جب وہ گلی سے نکلے گی تو اسے دیکھتے ہی گاڑی آگے بڑھادے گا۔ جب تک نہیں آئے گی۔ اس وقت تک اس کی گلی کی طرف دیکھتا رہے گا۔

پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھتے دیکھتے سوگیا۔ اتنی گہری نیند آئی کہ اپنی بھی خبر نہیں رہی۔ اچانک ہی اس کی آنکھ کھلی تو کوئی کھڑکی کے شیشے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شیشے کے باہر رخسانہ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا "میری آنکھ لگ گئی تھی۔ پتا نہیں چلا کہ نو بج گئے۔"

وہ بولی "ساڑھے نو ہوچکے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے سے ادھر کھڑی ہوئی تھی۔ ادھر آکر دیکھا تو تم سوتے ہوئے نظر آئے۔ کیا رات بھر یہیں تھے۔ گھر نہیں گئے؟"

"گیا تھا' مگر وہاں ڈر لگ رہا تھا کہ صبح آنکھ نہیں کھلے گی۔ اس لیے رات بھر جاگتا رہا۔ صبح چار بجے پڑوس کی ایک لڑکی بیمار پڑگئی۔ اسے یہاں اسپتال لے کر آیا۔ یہاں پہنچ کر دن نکل گیا۔ میں نے سوچا' یہیں تھوڑی دیر آرام کرلیتا ہوں۔ تم آؤ گی تو تمہیں یہیں سے لے کر چلوں گا۔"

وہ بول رہا تھا اور وہ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھتی جارہی تھی' پھر بڑے جذباتی

اس نے اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری آنکھیں بھی کچھ ایسی لگ رہی ہیں مگر کیا تم رو رہی تھیں؟"

وہ ایک دم سے چونک گئی پھر نظریں جھکا کر بولی "نہیں تو' میں بھلا کیوں روؤں گی؟"

یہ کہتے ہوئے وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جانی اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھتے ہوئے بولا "کیا بات ہے' تم پیچھے بیٹھ گئی ہو؟"

"یہ ہمارا محلہ ہے' بہت سے جان پہچان کے لوگ ہیں۔ آگے جاکر گاڑی روک دینا میں اگلی سیٹ پر آجاؤں گی۔"

وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا "میرا دل گھبرا رہا ہے' کوئی خوش خبری سناؤ۔"

"گھبرانے سے کام نہیں چلتا۔ تم مرد ہو' ہمت سے کام لینا جانتے ہو۔ کبھی راستے میں رکاوٹیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور پھر وہ رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں' حوصلے سے کام لینا چاہیے۔"

"ایک بات سچ سچ بتاؤ گی؟"

"ہاں پوچھو۔"

"تم کیوں رو رہی تھیں؟"

"یہ تمہارا خیال ہے' میں بالکل نہیں رو رہی تھی۔"

"جھوٹ بول رہی ہو' تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔"

"وہ تو میں جاگ رہی تھی۔ سو نہیں سکی اس لیے ذرا سرخ پڑگئی ہیں۔ میری ایک بات مانو گے۔"

"ہاں بولو۔"

"کسی چیز کی تمنا بہت شدت سے نہ کرو۔ کبھی وہ چیز حاصل نہ ہو تو دل کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے۔"

"میں نے کبھی کسی کی تمنا نہیں کی۔ پہلی بات تم کو چاہتا ہوں۔ تمہارے بعد اور کسی کو نہیں چاہوں گا۔ تمہاری باتوں سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ صاف صاف بولو کیا بات ہے' کیا تمہاری امی نے مجھ کو پسند نہیں کیا ہے؟"

انتظار کررہے ہیں۔ تم مجھے کالج تک پہنچا کر میرے گھر چلے جاؤ، پھر ابو تمہارے گھر جائیں گے۔ وہ تمہارے مکان اور ٹیکسی کے کاغذات دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں کالج میں دو بجے تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس کی باتوں سے کچھ ڈھارس بندھی۔ جائداد کی انکوائری کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اسے پسند کیا جارہا ہے۔ وہ رخسانہ کو کالج تک پہنچانے کے بعد اس کے گھر پہنچا۔ وہاں انہی معمر خاتون نے جو رخسانہ کی امی تھیں، ایک شخص سے اس کا تعارف کرایا جو رخسانہ کے ابو تھے۔ ان کا نام فرید احمد تھا۔ فرید احمد ایک چھوٹے سے قد کا آدمی تھا۔ چہرے پر کہیں کہیں جھریاں تھیں، آنکھیں کسی قدر دھنسی ہوئی تھیں۔ اس نے بغیر استری کیے ہوئے شکن آلود کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کپڑوں میں اس کی شخصیت بھی سکڑی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دوسری قسم کا آدمی ہے اور اس گھر میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

وہ انکوائری کے لیے بادشاہ جانی کے ساتھ آکر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کہا "اوہو، میں تو اپنا سگریٹ گھر میں بھول آیا ہوں۔"

بادشاہ جانی نے ایک پان کی دکان کے سامنے ٹیکسی روکتے ہوئے پوچھا "آپ کون سا برانڈ پیتے ہیں؟"

"بیٹا تم کیوں تکلیف کرتے ہو میں گھر جاکر سگریٹ پی لوں گا۔"

"آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے تو پھر جھجکنے کی کیا بات ہے۔ آپ مجھے بیٹا سمجھ کر حکم دیں، کون سا برانڈ پیتے ہیں۔"

وہ دانت نکال کر ہی ہی کرتے ہوئے، ذرا شرماتے ہوئے بولا "گولڈ لیف پیتا ہوں۔"

وہ گولڈ لیف کا مہنگا پاکٹ اور ایک ماچس خرید کرلے آیا پھر ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ فرید احمد مہنگے سگریٹ کا کش لگانے لگا۔ بادشاہ جانی سب سے پہلے گیرج میں پہنچا۔ وہاں مستری چاچا اس کے لیے بینک سے آٹھ ہزار روپے نکال کرلے آیا تھا۔ اس نے مستری چاچا اور فرید احمد کا تعارف کرایا۔ مستری چاچا نے خوش ہوکر اس سے مصافحہ کیا۔ پھر چائے پینے کی پیش کش کی۔ فرید احمد نے اپنے کالر کو درست کرتے ہوئے کہا "بہت گرمی ہے، اس گرمی میں چائے نہیں پی جاسکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ٹھنڈی بوتل پی لیں۔"

اس کے لیے ٹھنڈی بوتل منگوائی گئی۔ پاس والی دکان سے ایک کرسی منگوا کر اسے بٹھایا گیا، پھر مستری چاچا کسی کام کے بہانے بادشاہ جانی کو ذرا دور لے گیا اور بولا "بیٹے یہ کیا معاملہ ہے۔ لڑکی کا باپ تمہارے ساتھ کیوں گھوم رہا ہے؟"

"دیکھو نا چاچا، ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں اور شریف گھرانے میں جارہا ہوں۔ وہ انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔ ہاں انکوائری، یہ لوگ میرے بارے میں انکوائری کررہے ہیں کہ میں اچھا آدمی ہوں یا برا آدمی ہوں۔ میرے پاس اپنی کچھ جائداد ہے یا میں ننگوں کی طرح فٹ پاتھ پر رہتا ہوں۔ یہ تو ان کا فرض ہے نا؟"

مستری چاچا نے دور بیٹھے فرید احمد کو دیکھا پھر مایوسی سے سر ہلا کر کہا "دیکھو بیٹا، فرض تو ہے مگر مجھے یہ لڑکی کا باپ نہیں لگتا۔ وہ لڑکی کل کتنی صاف ستھری، پیاری پیاری اور معصوم سی لگ رہی تھی۔ یہ آدمی اس کے برعکس ہے جو بغیر استری کیے ہوئے کپڑے پہنتا ہو اور گولڈ لیف جیسا مہنگا سگریٹ پیتا ہو تو یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ اپنی شرم بیچ کر اپنا مہنگا سگریٹ پیتا ہوگا۔ میرے تجربے کو تم جھٹلا نہیں سکتے۔"

بادشاہ جانی جھٹلا نہیں سکتا تھا کہ اس نے مہنگا پاکٹ خرید کردیا تھا۔ یہ بات اگر چاچا کو معلوم ہوجاتی تو وہ اسے اور آڑے ہاتھوں لینا شروع کردیتے۔ اس نے کہا "چاچا، آپ نہیں جانتے، یہ شاعر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے پہننے اوڑھنے کا خیال نہیں رہتا۔ یہ بہت بڑے شاعر ہیں۔"

"جو بھی ہوں، میں پھر کہتا ہوں جس طرح لڑکی کے بزرگ تمہارے متعلق چھان بین کررہے ہیں، اسی طرح مجھے تم لڑکی والوں کے متعلق چھان بین کرنے کا موقع دو۔ اگر تم چھپاؤ گے اور صرف لڑکی کی تمنا کرتے رہو گے تو کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھاؤ گے۔ مجھے حالات سے پتا چل رہا ہے۔ بیٹا میں بوڑھا ہوں، میرے تجربے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

بادشاہ جانی اس کے آگے باتیں بناتا رہا پھر جلدی سے فرید احمد کو ٹیکسی میں بٹھا کر وہاں سے ناگن چورنگی کی طرف گیا۔ اسٹیٹ ایجنسی میں اس کے کاغذات تیار ہورہے تھے۔ بازو والے پلاٹ کی قیمت ساڑھے پانچ ہزار نکال کر اس نے ان کے آگے رکھ دی۔ تھوڑی دیر میں وہ کاغذات مکمل ہوگئے پھر وہ وہاں سے فرید احمد کو لے کر اپنے پلاٹ

پر آگیا۔ اس نے کہا "ابھی میرا یہ مکان خالی سا ہے۔ بس ایک چارپائی اور ایک میز ہے کوئی رہتا نہیں ہے اس لیے میں نے سامان نہیں رکھا ہے۔ بہت جلدی نئے فرنیچر اور ضرورت کا سارا سامان لے آؤں گا۔ ابھی صرف مکان کو دیکھیں باقی کی بعد میں پوری کردوں گا۔"

فرید احمد نے کہا "کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ تم نے میرے سامنے ہی بازو والا پلاٹ بھی خریدا ہے۔ اب اس مکان کے اور ٹیکسی کے کاغذات بھی مجھے دکھادو۔"

وہ مکان کے اندر آکر بیٹھ گئے۔ بادشاہ جانی نے اپنے سوٹ کیس سے وہ تمام کاغذات نکال کر اسے دکھا دیے۔ فرید احمد انہیں اچھی طرح دیکھنے کے بعد مطمئن ہوگیا پھر بولا "اب گھر چلیں گے، وہاں باتیں ہوں گی۔"

ٹیکسی تو جیسے ہوائی جہاز تھی۔ وہ دونوں گھر پہنچ گئے۔ وہ تھوڑی دیر تک ٹیکسی میں بیٹھا رہا۔ فرید احمد گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ شاید اپنی بیگم کو اس کے متعلق تفصیلات بتارہا تھا پھر اسے گھر کے اندر بلایا گیا۔ وہی کمرا تھا جہاں وہ پچھلے دن بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے وہی معمر خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ فرید احمد نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید اس کا کام ختم ہوگیا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ معمر خاتون نے کہا "میرے شوہر نے تمہارے تمام کاغذات دیکھ لیے ہیں اور ہم ان کاغذات سے مطمئن ہیں۔ تمہارا جو رشتہ یہاں ہوگا تو کیا اس سلسلے میں تمہاری طرف سے کچھ لوگ آئیں گے؟ وہ رشتے دار ہوں گے یا یونہی جان پہچان والے؟"

"میں تو پہلے ہی بول چکا ہوں۔ میرا یہاں اپنا کوئی نہیں ہے۔ ایک مستری چاچا ہیں۔ وہ گیرج کے مالک ہیں۔ وہی میرے بزرگ ہیں۔ آپ کہیں تو میں انہیں بات کرنے کے لیے بھیج دوں گا۔"

خاتون نے کہا "دیکھو جب تمہارا کوئی رشتے دار نہیں تو غیر آدمی تمہاری ضمانت کیسے لے سکتا ہے اور ہم ایسی ضمانت کیسے قبول کرسکتے ہیں۔ اپنے خون کے رشتے دار ہوں، پورا ایک خاندان ہو تو اس خاندان کو دیکھ کر کوئی بھی اپنی بیٹی دیتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہیں مایوس کرنا چاہتی ہوں۔ میں ایک اصولی بات کہہ رہی

ہوں۔ جب کوئی تمہارا اپنا نہیں ہے تو کوئی غیر بھی تمہارے معاملے میں نہ ہو، ہمیں اپنا بزرگ سمجھو اور خود ہی ہم سے معاملات طے کرو۔"

وہ سرہلا کر بولا "جیسے آپ کہیں گی، ویسے ہی کروں گا۔ آپ فرمایئے مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"سب سے پہلے ہمیں مطمئن کرو کہ شادی کے بعد ہماری بیٹی کو کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ تم اسے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ اسے پریشان نہیں کرو گے۔ اسے تکلیف نہیں پہنچاؤ گے۔ بھوکا نہیں رکھو گے.... فٹ پاتھ پر نہیں سلاؤ گے۔"

"آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ میں ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ٹھیک ہے، تم بہت اچھے لڑکے ہو مگر کوئی کسی کے دل میں جھانک کر تو نہیں دیکھ سکتا۔ میں کیا جانوں کہ تم آگے چل کر کیا روپ دکھاؤ گے اس لیے ہمیں ضمانت چاہیے اور ضمانت اس طرح ہوسکتی ہے کہ تم شادی سے پہلے ہماری بیٹی کے نام وہ دونوں پلاٹ اور اس پر بنا ہوا مکان لکھ دو پھر کچے کاغذ پر یہ لکھنا ہوگا کہ تم ہماری بیٹی کو ہر ماہ...."

یہ کہہ کر وہ ذرا رکیں پھر بولیں "ہاں، یہ تو پوچھنا ہی بھول گئی کہ تمہاری آمدنی کیا ہے؟"

"کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی کم کبھی زیادہ ہوتی ہے۔ مہینے میں کم از کم پانچ ہزار روپے کمالیتا ہوں۔ اس میں سے گاڑی خراب ہوئی تو دو تین ہزار نکل جاتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میرے پاس مہینے میں دو ہزار ضرور ہوتے ہیں۔"

"اتنے پیسے تم کیا کرتے ہو؟"

"دوستوں میں اڑاتا تھا۔ کبھی بچانے کے متعلق نہیں سوچا..... مستری چاچا نے زبردستی مجھ سے روپے لے لے کر بارہ ہزار بچالیے تھے۔ اس میں سے آٹھ ہزار آج لے لیے۔ آپ کے شوہر کے سامنے پلاٹ خریدا ہے۔"

وہ تائید میں سرہلا کر بولیں "ہاں میں نے سب سن لیا ہے۔ تم کچے کاغذ پر کیا یہ لکھ کر دو گے کہ تم ہر ماہ میری بیٹی کو دو ہزار روپے گھر کے اخراجات کے لیے دیا کرو گے۔"

"جی ہاں، میں لکھ دوں گا۔"

"دیکھو بیٹے، ہم تمہارے ساتھ سودے بازی نہیں کررہے ہیں۔ ہم بیٹی والے ہیں۔

بیٹی کا تحفظ چاہتے ہیں۔ شادی کے بعد تمہاری بیوی ہوگی' تمہارا نقصان' تمہارا منافع' سب کچھ اس کا ہوگا۔ وہ تمہارے حکم کی پابند ہوگی۔ جیسا تم رکھو گے' ویسے رہے گی۔ پکے کاغذ پر صرف اتنا لکھنا ہوگا کہ اسے آگے پڑھنے سے نہیں روکو گے۔ یہ آخری سال ہے اگر وہ ڈاکٹر بن جائے گی تو تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ آمدنی کا ذریعہ ہو جائے گا' کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"آپ ہماری بزرگ ہیں۔ ہمارے لیے برا نہیں چاہیں گی۔ میں آپ کی باتوں کو مانتا ہوں' میں نے بھی یہ سوچ کر بازو والا پلاٹ خریدا ہے۔ ہم وہاں ایک چھوٹا سا اسپتال بنائیں گے۔"

"میں بیٹی کو جلدی یہاں سے رخصت کرنا چاہتی ہوں۔ تم سے سارے معاملات طے ہو رہے ہیں اس لیے میں اپنے گھر کی یہ بات تم سے نہیں چھپاؤں گی کہ ہمارے مالی حالات بہت خراب ہیں۔ بیٹی کا یہ آخری سال ہم پر بھاری ہے۔ اس کے کالج کی فیس سر پر چڑھی ہوئی ہے اور آگے پڑھانا ہمارے لیے ممکن نہیں رہا ہے' ہم نے سوچا کہ بیاہ دی جائے گی تو اپنے شوہر کی کمائی سے پڑھ لے گی اسی لیے ہم جلد سے جلد شادی کر دینا چاہتے ہیں۔"

"آپ تو میرے دل کی بات کہہ رہی ہیں۔ آپ جب کہیں گی' میں بارات لے کر آجاؤں گا۔"

"میں بارات پسند نہیں کرتی۔ یہاں تمہارا کوئی اپنا نہیں ہے۔ ہاں تمہارے دو چار دوست ہوں تو انہیں ساتھ لے آنا تاکہ وہ اس شادی کے گواہ رہیں اور تمہاری خوشی میں شریک ہو سکیں۔ نکاح نہایت سادگی سے پڑھایا جائے گا اور ہم رخسانہ کو دلہن بنا کر تمہارے ساتھ رخصت کر دیں گے مگر دو ایک روز میں مکان کے کاغذات تم رخسانہ کے نام منتقل کر دو گے۔ جب یہ سارا کام ہو جائے گا تو ایک ہفتے بعد ہی شادی ہو جائے گی۔"

بادشاہ جانی خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی وہاں سے اڑ کر رخسانہ کے پاس پہنچ جائے اور اسے یہ خوش خبری سنائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے رخصت ہو کر کالج پہنچ گیا۔ ابھی دو نہیں بجے تھے اس لیے وہ بے چینی سے گیٹ کے باہر ٹہلنے لگا۔ دوسری طرف بھی بے چینی تھی۔ وہ دو بجے سے بہت پہلے ہی گیٹ سے باہر آگئی

مگر وہ پریشان نظر آرہی تھی۔ پچھلے دن بھی جب وہ کالج سے نکل رہی تھی تو اسی طرح پریشان اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ بادشاہ جانی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا "کیا آج بھی لاش کے پاس سے آرہی ہو؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "بس میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جانی دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آگیا' پھر بیٹھتے ہوئے بولا "میں فوراً ہی تمہیں یہ خوش خبری سنادوں کہ تمہاری امی راضی ہو گئی ہیں۔ انشاء اللہ ایک ہفتے کے اندر ہماری شادی ہو جائے گی۔"

رخسانہ اس کی بات سن رہی تھی اور یک ٹک اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اسے شرمانا چاہیے تھا۔ ذرا مسکرانا چاہیے تھا۔ اپنا منہ چھپانا چاہیے تھا' یا کچھ نہیں تو اپنی شادی کی بات سن کر خوش ہونا چاہیے تھا مگر اس کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا۔ اگر کوئی تاثر ہوگا بھی تو اسے بادشاہ جانی سمجھ نہیں سکتا تھا۔

اس نے حیرانی سے پوچھا "کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"آں!" وہ جیسے خیالات سے چونک گئی۔ فوراً ہی اس نے نظریں جھکا لیں پھر گھوم کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ ذرا توقف کے بعد آہستگی سے بولی "مجھے بتاؤ' امی سے کیا باتیں ہوئی ہیں؟"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا کہ اس کے ابو کس طرح اس کے ساتھ گئے تھے پھر واپسی میں اس کی امی نے اس کے ساتھ کس طرح معاملات طے کیے ہیں اور وہ راضی ہو گیا ہے۔

"تم راضی ہو گئے۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "کیوں راضی ہو گئے؟ تم اتنا مہنگا سودا کیوں کر رہے ہو۔ مجھے اتنا کیوں چاہتے ہو؟"

"تم ایسے بات پوچھ رہی ہو جیسے کوئی بچہ پوچھتا ہے کہ میں سانس کیوں لیتا ہوں؟ یہ ہنسنے کی بات ہے۔ میں محبت کرتا ہوں' تمہارے لیے سب کچھ قربان کیوں کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ میں تمہارے لیے پیدا ہوا ہوں اور آج تک جو بھی میں نے کیا ہے' وہ تمہارے ہی لیے کیا ہے اور اب تمہارے نام کر رہا ہوں تو یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں

ہے۔ بولو کہاں چلوں۔"

"بہت دور۔" وہ ونڈ اسکرین کے پار بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی "اتنی دور چلو کہ آج کی یہ ملاقات ختم نہ ہو۔"

"ختم ہوگی تو کیا ہوگا۔" بادشاہ نے مسکرا کر کہا "کل ہم پھر ملیں گے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہیں، کل سے ہم نہیں ملیں گے۔ امی نے کہہ دیا تھا کہ باتیں طے ہو جائیں گی تو میں کالج جانا چھوڑ دوں گی اور تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے' ان کے پاس بھی نہیں آسکو گے۔ آج بھی ....." وہ کہتے کہتے رک گئی پھر بڑے کرب سے بولی "آخری ملاقات ہے۔"

"ہاں' آج آخری ہو سکتی ہے ایک ہفتے کے بعد تو ہم ہمیشہ کے لیے مل جائیں گے۔"

رخسانہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے حقیقت سے منہ چھپا رہی ہو۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں پانی بھر آیا تھا۔ اس نے آہستگی سے پوچھا "تم نے اپنے مستری چاچا کا ذکر کیا تھا' کیا وہ تجربہ کار بزرگ ہیں؟"

"ہاں بہت تجربے والے ہیں' بڑی گہری گہری باتیں بولتے ہیں۔"

"ایسے بزرگ کے ہوتے ہوئے تم نے اکیلے امی سے معاملہ کیوں طے کیا؟ ہم جوان ہیں' اپنے آپ کو بہت سمجھ دار سمجھتے ہیں لیکن ہم سے کہیں نہ کہیں غلطی ہو سکتی ہے۔ اگر تم اپنے مستری چاچا کو بھی ان باتوں میں شریک کرلیتے تو کیا برا تھا؟"

"میں چاہتا تھا مگر تمہاری امی نے کہا جب میرا کوئی خون کا رشتہ یہاں موجود نہیں ہے' اپنا کوئی سگا بھی نہیں ہے تو پھر ایسے لوگوں کو شریک کرنے کا کیا فائدہ جن سے صرف زبان کا رشتہ ہے' میں تمہاری امی سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ تمہاری ہی نہیں' میری بھی امی ہیں۔ ویسے تم بولو' کیا میں ان کی بات مان کر غلطی کر رہا ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی "زندگی میں کوئی سا بھی سودا کرو' تو بہت زیادہ جھک کر نہ کرو۔ بہت زیادہ مہنگا نہ کرو اور بہت زیادہ اپنے اوپر اعتماد نہ کرو۔ اپنے آس پاس کچھ تجربہ کار لوگ ہوں' اپنے بزرگ ہوں تو انہیں ضرور شریک کرنا چاہیے۔ میں ایک اصولی بات کہہ رہی ہوں۔ دیکھو یہ بات کہیں تم امی کے سامنے نہ کرنا ورنہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گی۔"

"تم بہت اچھی باتیں کرتی ہو۔ سچ مچ جھک کر سودا نہیں کرنا چاہیے مگر میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ زندگی میں پہلی بار محبت کے لیے جھک گیا ہوں ورنہ کوئی مجھے جھکا نہیں سکتا۔ اب جو کچھ ہو گیا' وہ ایک مرد کی زبان سے ہو گیا۔ میں اپنی بات سے پھر نہیں سکتا اور پھرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جو کچھ بھی کیا ہے' تمہارے لیے کیا ہے۔ شادی کے بعد اگرچہ میرا سب کچھ تمہارے نام ہوگا لیکن تم تو میرے نام ہوگی پھر اس میں نقصان اٹھانے یا دھوکا دینے والی بات کیا ہے؟"

وہ موضوع بدل کر باتیں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ جانی ان باتوں میں بہل گیا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھے سڑکوں پر گھومتے رہے۔ کبھی پارک میں گئے' کبھی اوپن ریسٹورنٹ میں۔ بادشاہ جانی نے اسے کھانے کے لیے مجبور کیا تو اس نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کرکے انکار کردیا۔ شام تک اس نے ضد کرکے ایک جگہ اسے دہی بڑے کھلائے اور ٹھنڈی بوتل پلائی۔ آخر پانچ بجے وہ ناظم آباد کی طرف واپس جانے لگے۔ جب ٹیکسی ناظم آباد کی حدود میں پہنچی تو اچانک ہی وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ بادشاہ جانی نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا ہوا' کیا بات ہے۔ تم کیوں رو رہی ہو؟"

وہ بدستور منہ چھپائے انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی "کچھ نہیں۔"

"کیسے کچھ نہیں' کچھ تو ہے۔ ایسی کیا بات ہے جو تمہیں رلا رہی ہے؟"

"بس یونہی' تم اتنے اچھے ہو کہ میں خود کو بھلا کر بھی ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گی۔"

"تم دل چھوٹا کر رہی ہو' بھئی ایک ہفتے کی بات ہے اس کے بعد تو ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔"

دوپٹے میں منہ چھپا ہوا تھا۔ اسی دوپٹے میں سے چھپی چھپی "آہ" نکلی پھر وہ وہیں گھٹ کر رہ گئی۔

○☆○

وہ ایک ہفتہ بڑی مصروفیت میں گزرا۔ اس دوران میں بادشاہ جانی نے اپنے دونوں پلاٹ اور اس پر بنا ہوا مکان رخسانہ کے نام پکے کاغذ پر منتقل کردیا اور پکے کاغذ پر یہ بھی لکھ دیا کہ وہ رخسانہ کو ہر ماہ دو ہزار روپے گھریلو اخراجات کے لیے دیا کرے گا۔ اس کو آگے پڑھنے سے نہیں روکے گا۔ وہ ان مصروفیات کے بعد رخسانہ کو ایک نظر دیکھنے کے

کے لیے کبھی عباسی اسپتال کی طرف جاتا تھا۔ کبھی کالج کی طرف پہنچ جاتا تھا مگر صبح کالج آنے اور دو بجے کالج سے واپس جانے کے وقت وہ کبھی نظر نہیں آئی۔ شاید اس کے والدین نے اسے کالج جانے سے روک دیا تھا کیونکہ ایک ہفتے ہی میں وہ دلہن بننے والی تھی۔ ایسے موقع پر لڑکیوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی۔

اس نے اپنے گھر کو سجا بنا کر رکھنا شروع کر دیا تھا۔ کم قیمت کے فرنیچر' پلنگ اور دوسری ضروریات کے سامان خرید لیے تھے۔ ایک گھر گرہستی کے لیے جو کچھ بھی ضروری ہوتا ہے' وہ سب کچھ جمع کر لیا تھا۔ دیواروں پر چونا قلعی کرائی تھی لیکن مستری چاچا اس کے خلاف تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ ناراضگی ظاہر کرتے تھے۔ کہتے تھے "تم نے مجھے اس معاملے سے الگ رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ مجھ پر بھروسا نہیں تھا تو کسی دوسرے بزرگ کو اس معاملے میں شریک کر لیتے یا اپنے کسی اچھے سمجھ دار دوست کو ساتھ لے جاتے۔"

بادشاہ جانی ایسے وقت ان کے ہاتھ پاؤں دباتا ان کی خوشامد کرتا تھا "چاچا' غصہ تھوک دو۔ سمجھ لو کہ میں اندھا ہوں' دیوانہ ہوں' مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا' کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے رخسانہ چاہیے۔ اس کے لیے میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہا ہوں۔ تم مجھے نادان سمجھ کر ہی میرا ساتھ دو اور شادی کے دن ضرور میرے ساتھ چلو' چچی اور بچوں کو بھی ضرور لے آؤ۔"

"نہیں بیٹے' تمہارے سسرال والوں نے تم پر پابندی لگائی ہے کہ تم دو چار دوستوں کے ساتھ آسکتے ہو اس لیے ہم میں سے کوئی اپنی عورتوں کو تمہاری شادی میں نہیں لے جائے گا۔ ہاں دوسرے دن تم ولیمہ کرو گے تو ہم پورے خاندان کے ساتھ تمہارے گھر آئیں گے اور تمہاری دلہن کو اپنے ہاتھوں سے تحفے اور اپنے دل سے دعائیں دیں گے۔"

☆☆

شادی کے دن اس کے گھر میں بڑی ویرانی سی تھی حالانکہ کمرے کو پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ دلہن کی سیج کو بھی پھولوں سے مہکایا گیا تھا۔ باہر ٹیکسی کو بھی پھولوں کی لڑیوں سے دلہن بنا دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود کچھ ویرانی سی تھی۔ شادی بیاہ کے گھروں میں جب تک

عورتیں اور بچے نہ ہوں' اس وقت تک شادی بیاہ کا ہنگامہ مکمل نہیں ہوتا۔ ان کے بغیر شادی کی خوشیاں ادھوری رہتی ہیں۔ جب وہ بارات لے کر چلا تو اس کے ساتھ پانچ ساتھی تھے۔ بزرگوں میں ایک مستری چاچا' دو ٹیکسی ڈرائیور' ایک بس کنڈیکٹر اور ایک پولیس والا تھا جس سے بہت پرانی دوستی تھی۔

نکاح سے پہلے قاضی صاحب نے رخسانہ اور بادشاہ جانی کے نام اور ولدیت لکھنے کے بعد پوچھا "مہر کی رقم کتنی ہوگی۔"

لڑکی کے باپ نے کہا "پچاس ہزار روپے۔"

مستری چاچا یہ سنتے ہی ایک دم بھڑک گئے۔ "صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں بھی پچاس ہزار مہر کی رقم نہیں ہوتی۔ آپ ہمارے لڑکے کی حیثیت اور آمدنی دیکھیں۔ اس کے پاس جو ٹیکسی ہے' وہ بھی پچاس ہزار کی نہیں ہوگی۔ آپ زیادہ سے زیادہ دس ہزار لکھوائیں۔"

وہاں لڑکی والے بھی زیادہ نہیں تھے۔ مردوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ پچاس ہوگی البتہ عورتیں کی زیادہ بھیڑ تھی۔ گھر کے اندر عورتوں اور بچوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اسی شور میں رخسانہ کی امی کی آواز سنائی دی "یہ کیا بے ہودگی ہے' جب پہلے سے تمام باتیں طے ہو چکی ہیں تو پھر نکاح کے وقت بحث کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ مہر کی رقم پچاس ہزار ہو یا پچاس لاکھ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دینے والوں کے لیے اس وقت رقم زیادہ ہوتی ہے جب لڑکی کو چھوڑنے کا ارادہ ہو۔ جب شرافت سے نباہ کرنا ہے تو مہر کی رقم کو کیا دیکھنا؟"

بات بڑھنے لگی۔ بادشاہ جانی نے خوشامدانہ انداز میں مستری چاچا کا ہاتھ تھام کر کہا "چاچا جو بھی ہو رہا ہے' ہونے دو۔ میں پہلے ہی زبان ہار چکا ہوں۔ اب پچاس ہزار لکھانے سے کیا ہوتا ہے۔ دیکھو نا' میں لڑکی کو چھوڑنے کے لیے تو شادی نہیں کر رہا تا۔ اس کے ساتھ ساری زندگی نباہ کروں گا تو پچاس ہزار روپے دینے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

مستری چاچا اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑے ہو گئے پھر بولے "میاں جہاں لڑکے کے بزرگوں کی کوئی عزت نہ ہو' وہاں ہمارا کیا کام؟ یہاں مردوں کی نہیں عورتوں کی

باتیں چلتی ہیں۔ اب تم عورت ہی کے غلام بنے رہو۔ میں ایسی جگہ کا پانی بھی نہیں پیوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے جانے لگے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے آگے بڑھ کر انہیں روکنا چاہا۔ انہوں نے ڈانٹ دیا۔ غصہ دکھاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ بادشاہ جانی پریشان ہو کر سہرے کے پیچھے سے انہیں دیکھتا رہا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ان کے پیروں پر گر کر انہیں روک لیتا لیکن اس وقت وہ دولہا بنا ہوا تھا پھر یہ کہ رخسانہ کو چھوڑ کر ان کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا اس لیے پچاس ہزار مہر کی رقم لکھوا کر اس نے نکاح پڑھوالیا۔

شادی کی خوشیاں جاری رہیں۔ کھانا کھلایا گیا پھر رات کے آٹھ بجے دولہا کو کچھ رسمیں ادا کرنے کے لیے اندر بلایا گیا۔ وہاں دلہن کے سامنے اسے بٹھا کر عورتیں رسمیں ادا کرنے لگیں۔ بادشاہ جانی کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی چور نظروں سے اس گھونگٹ کی طرف دیکھتا تھا جس کے پیچھے تھوڑا تھوڑا سا چہرہ جھلک رہا تھا۔ وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ چہرے پر بڑی سی نتھ نے گھیرا کر رکھا تھا۔ افشاں کی چمک اور میک اپ کا نکھار ایسا تھا کہ وہ بار بار چور نظروں سے اسے دیکھنے لگتا تھا۔ کئی بار عورتوں نے اس کے سر کو پکڑ کر زبردستی جھکاتے ہوئے کہا "کیا بے شرموں کی طرح دلہن کو دیکھ رہے ہو' اپنے گھر لے جا کر دل بھر کے دیکھ لینا۔" اس پر تمام عورتیں قہقہے لگاتی تھیں۔

رخصتی کا وقت آیا تو قہقہے آنسوؤں میں بدل گئے۔ کتنی ہی عورتیں رو رہی تھیں۔ رخسانہ کی امی نے اس کا ہاتھ دلہن کے ہاتھ میں دے کر اس سے وعدے لیے' قسمیں لیں کہ وہ ایک شریف آدمی کی طرح اس رشتے کو عمر بھر نبھاتا رہے گا۔ اس کے بعد دولہا دلہن کو وہاں سے اٹھنے کے لیے کہا گیا۔ دولہا نے دلہن کو سنبھالا' پھر دونوں کلام پاک کے سائے میں گزرتے ہوئے اس مکان سے باہر نکلے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔

بادشاہ جانی کے ساتھیوں نے اس کے گھر کے باہر قمقموں کی لڑیاں سجا دی تھیں تاکہ رات کو وہ شادی کا گھر معلوم ہو' پڑوسی اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ اپنے ملک جا چکا تھا۔

سے چابی لے کر دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ اس کے ساتھ ہی باہر رنگ برنگے قمقمے جلنے بجھنے لگے۔ بادشاہ جانی خوش ہو کر قمقموں اور گھونگٹ میں لپٹی دلہن کو دیکھ کر بولا "میرا سہارا لے کر ٹیکسی سے باہر آجاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا کوئی خاندان نہیں ہے۔ میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے جو تمہیں سہارا دے کر گھر کے اندر لے جائے' یہاں میں ہی سب کچھ ہوں۔"

وہ اسے سہارا دے کر ٹیکسی سے باہر لے آیا۔ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ مکان کے اندر پہنچا۔ سیج دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ وہاں اس نے دلہن کو آرام سے بٹھا دیا اس کے بعد باہر آ کر اپنے ساتھیوں سے بولا "تم سب یہاں سے نہ جانا' پتا نہیں ہمیں کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔"

ایک ساتھی نے کہا "استاد دودھ اور مٹھائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تو ہم لانا ہی بھول گئے۔ تمہاری ٹیکسی لے کر جاتے ہیں اور ابھی لے آتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "تم دلہن کے پاس جاؤ' وہ اکیلی ہے۔"

بادشاہ جانی نے ذرا جھینپ کر مسکراتے ہوئے کہا "یار میرے دل میں کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ کیسے جاؤں' کیا بولوں؟ اس سے کیسے باتیں کروں گا؟"

"یار جا کر دروازے کو اندر سے بند کر لو۔ اس کے بعد خود ہی بولنا آ جاتا ہے۔ تم جاؤ تو سہی۔"

وہ ان کے پاس سے پلٹ کر کمرے میں داخل ہوا پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے کو اندر سے بند کرنے لگا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ دلہن کو بٹھا کر چلا گیا اور پنکھا چلانا بھول گیا' بے چاری گھونگٹ کے پیچھے پسینے میں نہا رہی ہوگی۔ اس نے فوراً ہی چھت کے پنکھے کو آن کرتے ہوئے کہا "میں بھی عجیب ہوں پنکھا چلانا بھول گیا تھا اب چل رہا ہے۔ ہوا لگ رہی ہے نا۔"

وہ تھوڑے فاصلے پر کھڑا دلہن کو تکنے لگا۔ اس کے بعد بولا "میں بھی عجیب ہوں۔ تمہارے بولنے کا انتظار کر رہا ہوں بھلا دلہن بھی کبھی بولتی ہے۔"

[illegible] ہو گیا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر [illegible] "اگر تم اپنا [illegible]

باتیں چلتی ہیں۔ اب تم عورت ہی کے غلام بنے رہو۔ میں ایسی جگہ کا پانی بھی نہیں پیوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے جانے لگے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے آگے بڑھ کر انہیں روکنا چاہا۔ انہوں نے ڈانٹ دیا۔ غصہ دکھاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ بادشاہ جانی پریشان ہو کر سہرے کے پیچھے سے انہیں دیکھتا رہا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ان کے پیروں پر گر کر انہیں روک لیتا لیکن اس وقت وہ دولہا بنا ہوا تھا پھر یہ کہ رخسانہ کو چھوڑ کر ان کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا اس لیے پچاس ہزار مہر کی رقم لکھوا کر اس نے نکاح پڑھوالیا۔

شادی کی خوشیاں جاری رہیں۔ کھانا کھلایا گیا پھر رات کے آٹھ بجے دولہا کو کچھ رسمیں ادا کرنے کے لیے اندر بلایا گیا۔ وہاں دلہن کے سامنے اسے بٹھا کر عورتیں رسمیں ادا کرنے لگیں۔ بادشاہ جانی کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی چور نظروں سے اس گھونگٹ کی طرف دیکھتا تھا جس کے پیچھے تھوڑا تھوڑا سا چہرہ جھلک رہا تھا۔ وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ چہرے پر بڑی سی نتھ نے گھیرا کر رکھا تھا۔ افشاں کی چمک اور میک اپ کا نکھار ایسا تھا کہ وہ بار بار چور نظروں سے اسے دیکھنے لگتا تھا۔ کئی بار عورتوں نے اس کے سر کو پکڑ کر زبردستی جھکاتے ہوئے کہا "کیا بے شرموں کی طرح دلہن کو دیکھ رہے ہو' اپنے گھر لے جا کر دل بھر کے دیکھ لینا۔" اس پر تمام عورتیں قہقہے لگاتی تھیں۔

رخصتی کا وقت آیا تو قہقہے آنسوؤں میں بدل گئے۔ کتنی ہی عورتیں رو رہی تھیں۔ رخسانہ کی امی نے اس کا ہاتھ دلہن کے ہاتھ میں دے کر اس سے وعدے لیے' قسمیں لیں کہ وہ ایک شریف آدمی کی طرح اس رشتے کو عمر بھر نباہے گا۔ اس کے بعد دولہا دلہن کو وہاں سے اٹھنے کے لیے کہا گیا۔ دولہا نے دلہن کو سنبھالا' پھر دونوں کلام پاک کے سائے میں گزرتے ہوئے اس مکان سے باہر نکلے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔

بادشاہ جانی کے ساتھیوں نے اس کے گھر کے باہر قمقموں کی لڑیاں سجا دی تھیں تاکہ رات کو وہ شادی کا گھر معلوم ہو' پڑوسی اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ اپنے ملک چلا گیا تھا۔

سے چابی لے کر دروازہ کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ اس کے ساتھ ہی باہر رنگ برنگے قمقمے جلنے بجھنے لگے۔ بادشاہ جانی خوش ہو کر قمقموں اور گھونگٹ میں لپٹی دلہن کو دیکھ کر بولا "میرا سہارا لے کر ٹیکسی سے باہر آجاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا کوئی خاندان نہیں ہے۔ میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے جو تمہیں سہارا دے کر گھر کے اندر لے جائے' یہاں میں ہی سب کچھ ہوں۔"

وہ اسے سہارا دے کر ٹیکسی سے باہر لے آیا۔ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ مکان کے اندر پہنچا۔ سیج دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ وہاں اس نے دلہن کو آرام سے بٹھا دیا اس کے بعد باہر آ کر اپنے ساتھیوں سے بولا "تم سب یہاں سے نہ جانا' پتا نہیں ہمیں کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔"

ایک ساتھی نے کہا "استاد دودھ اور مٹھائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تو ہم لانا ہی بھول گئے۔ تمہاری ٹیکسی لے کر جاتے ہیں اور ابھی لے آتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "تم دلہن کے پاس جاؤ' وہ اکیلی ہے۔"

بادشاہ جانی نے ذرا جھینپ کر مسکراتے ہوئے کہا "یار میرے دل میں کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ کیسے جاؤں' کیا بولوں؟ اس سے کیسے باتیں کروں گا؟"

"یار جا کر دروازے کو اندر سے بند کر لو۔ اس کے بعد خود ہی بولنا آجاتا ہے۔ تم جاؤ تو سہی۔"

وہ ان کے پاس سے پلٹ کر کمرے میں داخل ہوا پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے کو اندر سے بند کرنے لگا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ دلہن کو بٹھا کر چلا گیا اور پنکھا چلانا بھول گیا' بے چاری گھونگٹ کے پیچھے پسینے میں نہا رہی ہو گی۔ اس نے فوراً ہی چھت کے پنکھے کو آن کرتے ہوئے کہا "میں بھی عجیب ہوں پنکھا چلانا بھول گیا تھا اب چل رہا ہے۔ ہوا لگ رہی ہے نا۔"

وہ تھوڑے فاصلے پر کھڑا دلہن کو تکنے لگا۔ اس کے بعد بولا "میں بھی عجیب ہوں۔ تمہارے بولنے کا انتظار کر رہا ہوں بھلا دلہن بھی کبھی بولتی ہے۔"

[illegible] ہو گیا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر قریب آیا "اگر تم [illegible] تو میں

تمہارے پاس بیٹھ جاؤں۔"

وہ پھر دلہن کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا "کیا ہو گیا ہے مجھے، تم بولوگی ہی نہیں، پھر میں اجازت کیوں لے رہا ہوں۔ اچھا بیٹھ جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ گھونگٹ میں چھپی ہوئی تھی۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔ گھونگٹ کے اندر سے اس کا چہرہ تھوڑا سا جھلک رہا تھا۔ اس نے کہا "میں تمہارا حسین چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ دیکھو مجھ کو زیادہ بولنا نہیں آتا۔ سنا ہے ایسے وقت محبت بھری باتیں کی جاتی ہیں۔ دلہن کو بہت بہلایا پھسلایا جاتا ہے مگر مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔ پہلی پہلی شادی ہے۔ آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے گھونگٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دو خوب صورت حنائی ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو روک دیا۔ بادشاہ جانی نے اس کے گورے گورے گلابی ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا "تم کتنی حسین ہو۔ سر سے پاؤں تک حسین ہی حسین ہو۔ تمہارے چہرے کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ ایسے تو میں نے تمہیں دو دونوں تک نہیں دیکھا مگر دلہن کے روپ میں تم کیسی لگتی ہو۔ یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم نہیں دکھاؤ گی؟"

دوسری طرف خاموشی رہی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے گھونگٹ کو سنبھالتی رہی اس نے کہا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ مستری چاچا نے سمجھایا تھا کہ دلہن کا چہرہ دیکھنے سے پہلے اسے کچھ دینا پڑتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں ایک انگوٹھی پہنا دوں۔ وہ میری جیب میں رکھی ہوئی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔ اس ڈبیا میں سے ایک سونے کی انگوٹھی نکال کر اس کی ایک انگلی میں پہنانے لگا۔ انگوٹھی پہنانے کے بعد اس نے اس کی ہتھیلی کی پشت پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر گھونگٹ کو تھامنے لگا، اسی وقت باہر سے "آں چھیں" کی آواز آئی۔ وہ رک گیا۔ باہر کی طرف ناگواری سے دیکھنے کے بعد دلہن کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا "باہر باراتی بیٹھے ہیں۔ کمبخت ٹیکسی ڈرائیور ہیں نا، ٹھیک سے نہیں جانتے کہ ایسے وقت چھینکنا نہیں چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے گھونگٹ آہستگی سے اٹھانا چاہا۔ دلہن دونوں ہاتھوں سے اپنے گھونگٹ کو مضبوطی سے تھام کر چہرے کو چھپانے لگی۔ وہ خوشامدیں کرنے لگا۔ "میری بات مان جاؤ۔ مجھے اور نہ تڑپاؤ۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ رخسانہ ایک ہفتے تک میں نے تمہیں دیکھے بغیر کیسے دن گزارے ہیں۔ میں جانتا ہوں اور میرا خدا جانتا ہے، بس اب میری بات مان لو۔"

مگر وہ بات نہیں مان رہی تھی۔ خود کو چھپائے جا رہی تھی۔ اس نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے شانے سے لگالیا۔ اسے بڑی محبت سے تھپکنے لگا۔ اسے پیار بھری قسمیں دینے لگا۔ آخر اس نے راضی کر لیا۔ اس بار دلہن نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ آہستہ آہستہ گھونگٹ اٹھانے لگا۔ آہستہ آہستہ بلب کی روشنی دلہن کے چہرے کو واضح کرنے لگی پھر یکبارگی بادشاہ جانی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے گیا اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اپنی دلہن کو دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے جیسے ایک لاش تھی اور اس لاش کے آدھے چہرے کو جیسے ڈس سیکٹ کیا گیا تھا۔ ڈس سیکشن کرنے والے نے آدھے چہرے کو چھوڑ دیا تھا اور آدھے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس دلہن کا آدھا چہرہ تھا۔

وہ آدھا چہرہ بے حد حسین تھا۔ اس آدھے چہرے کی خوب صورت آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بادشاہ جانی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ پھر اس نے غور سے دیکھا تو اسے حماقت کا احساس ہوا۔ دراصل رخسانہ نے ڈس سیکشن والی جو بات کہی تھی، وہی اس کی کھوپڑی میں سما گئی تھی ورنہ دلہن کے آدھے چہرے کو کسی نے چیرا پھاڑا نہیں تھا۔ وہ آدھا چہرہ بھی سلامت ہی تھا لیکن جلا ہوا تھا۔ کچھ مٹا مٹا سا تھا۔ اس آدھے چہرے پر ہلکی ہلکی سی ایسی لالی تھی جیسے گوشت جل رہا ہو۔ وہ حصہ کچھ بھیانک سا تھا۔ بادشاہ جانی اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا "تم کون ہو؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپالیا پھر روتے ہوئے بولی "میں رخسانہ ہوں، وہی رخسانہ۔"

وہ چیخ کر بولا "تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں لاش کے ٹکڑوں کو تیزاب میں گلا رہی تھی۔ ایسے ہی،

وقت تیزاب میرے چہرے پر پڑ گیا تھا۔ میری یہ حالت ہو گئی۔"

وہ غصے سے بولا "تم کبھی لاش سے کھیلتی ہو۔ کبھی تیزاب سے کھیلتی ہو' تم کس قسم کی عورت ہو۔ تمہیں دیکھنے سے پتا ہی نہیں چلتا کہ تم وہی رخسانہ ہو' اپنے چہرے کو کیوں چھپا رہی ہو۔ ہاتھ ہٹاؤ' مجھے اچھی طرح دیکھنے دو۔"

اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ نہیں ہٹائے اور انکار میں سرہلاتے ہوئے بولی "مجھے نہ دیکھو' میں پہلے ہی ڈر رہی ہوں۔ تم مجھے دیکھتے ہی مجھ سے نفرت کرنے لگو گے' مجھے پہچاننے سے انکار کرو گے۔ انسان صرف مکمل حسن کی پوجا کرتا ہے۔ اس حسن میں ذرا بھی عیب پیدا ہو جائے تو وہی محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔"

"تم میرے سامنے لچھے دار باتیں نہ کرو۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم وہ رخسانہ نہیں ہو۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا دروازے کے پاس آیا پھر ایک جھٹکے سے دروازے کو کھول کر برآمدے کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت دودھ اور مٹھائی لانے والے ٹیکسی میں واپس آ گئے تھے اور برآمدے میں کھڑے ہو کر اس کی چیخ پکار سن رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ایک نے پوچھا "کیا ہوا استاد؟"

وہ بھڑک کر بولا "ہو گا کیا؟ یہ شریف لوگ بہت بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ ہم جیسے بدمعاشوں کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ کمینوں نے لڑکی بدل دی ہے۔"

ایک ساتھی دودھ سے بھرا ہوا جگ اور مٹھائی کا ڈبہ پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔ بادشاہ جانی نے ایک ہاتھ مار کر ان چیزوں کو پرے پھینکتے ہوئے کہا "یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ اس کتیا کو دودھ نہیں زہر پلانا چاہیے مگر پہلے میں اس کی ماں سے اور اس کے باپ سے سمجھوں گا اور اسے یہاں سے لے جا کر دروازے پر دھکا دے دوں گا۔ انہوں نے مجھے سمجھا کیا ہے؟"

ایک ساتھی نے اسے بازو سے پکڑ کر سمجھاتے ہوئے کہا "بادشاہ جانی' غصے کو تھوک دے۔ ذرا ٹھنڈے دماغ سے کام لے' ان لوگوں نے قانون کے اور مذہب کے مطابق لڑکی کو رخصت کر کے تیرے حوالے کیا ہے۔ اگر تو اس لڑکی پر ظلم کرے گا یا وہاں جا کر ہنگامہ کرے گا تو سارے لوگ یہی کہیں گے کہ تو اندھا بن کر شادی کیسے کر رہا تھا' کیا تو

نے پہلے لڑکی نہیں دیکھی تھی؟"

"ہاں دیکھی تھی' جیسی دیکھی تھی' ویسی نہیں ہے۔"

"تو پھر اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"وہ کہتی ہے کہ چہرے پر تیزاب پڑ گیا ہے۔ آدھا چہرہ بگڑ گیا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو اس لڑکی کا کیا قصور ہے؟"

وہ چیخ کر بولا "میں اسے طلاق دے دوں گا۔"

"بادشاہ ذرا ہوش کی بات کر طلاق دینے کے لیے پچاس ہزار روپے کہاں سے لائے گا۔"

یہ سنتے ہی بادشاہ جانی جھاگ کی طرح برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے آس پاس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا "ہمارا مستری چاچا بہت پتے کی بات بولتا ہے اور جب بولتا ہے تو اس کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

بادشاہ جانی نے شرمندگی سے کہا "یار مستری چاچا کا نام نہ لو۔ اب میں چاچا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

ایک نے کہا "چاچا کو تو کل منہ دکھانا۔ ابھی کی سوچ کہ دلہن کا کیا کرے گا۔ تجھے تو اسے قبول کرنا ہی پڑے گا۔ نہیں کرے گا تو یہ پلاٹ اور یہ مکان اس کے نام لکھ چکا ہے پھر پچاس ہزار روپے تیرے پاس نہیں ہیں۔ تو طلاق نہیں دے سکتا۔ ٹیکسی بیچ کر طلاق دے بھی دے گا تو نہ ٹیکسی رہے گی' نہ یہ مکان رہے گا۔ نہ پلاٹ رہے گا اور تو فٹ پاتھ پر نظر آئے گا۔"

وہ جھنجلا کر چیختے ہوئے بولا "میں فٹ پاتھ پر پہنچ جاؤں گا۔ سب کچھ بیچ دوں گا مگر یہ دھوکا' یہ مکاری برداشت نہیں کروں گا۔ ارے کہیں سے بھی کچھ لے کر آؤ میں نشہ کرنا چاہتا ہوں۔ اتنا نشہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان مکاروں کو بھول جاؤں۔"

ایک ڈرائیور نے کہا "بادشاہ ہم تم سے چھپا کر ایک بوتل لائے تھے۔ ہم نے سوچا ادھر تم سہاگ رات مناؤ گے اور ہم نشہ کریں گے۔ اب ہم بوتل کھول لیتے ہیں۔ وہاں ٹیکسی کی ڈگی میں رکھی ہوئی ہے' ابھی لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کی طرف چلا گیا۔ بادشاہ نے سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی کی طرف

دیکھا پھر پوچھا "ہماری ٹیکسی کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟"

ایک نے کہا "اور کیسا ہوگا۔ اوپر سے پیلا ہوتا ہے اور نیچے سے کالا ہوتا ہی۔"

بادشاہ نے نفرت سے کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔ یہ دلہن بھی ایسی ہی ملی ہے۔ آدھی کالی ہے' آدھی پیلی ہے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا "سنا ہے اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہے اور ٹیکسی والوں کو ٹیکسی جیسی چیز دیتا ہے۔ تجھے بھی ایسی ہی چیز ملی' پر اب غم کیا کرنا ہے چیز آگئی ہے' غم غلط کر۔"

اس کے سامنے بوتل کھل گئی۔ ایک ساتھی باورچی خانے میں گیا اور وہاں سے چار گلاس اور پانی کا جگ اٹھا کر لے آیا پھر پینے کا دور شروع ہوا۔ پہلا گلاس پینے کے دوران بادشاہ نے کہا "اب سوچنا یہ ہے کہ ہم کیا کریں گے؟ ان شریف لوگوں نے جیسے ہمیں دھوکا دیا ہے' ویسے ہی میں بھی ان کے ساتھ کروں گا مگر کیا کروں گا' یہ سوچنے کی بات ہے۔"

ایک نے کہا "بادشاہ تو لڑکی سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اس کا دیوانہ بن گیا تھا۔ مستری چاچا کی بات بھی نہیں سنتا تھا۔ پہلے تو اس بات کا یقین کرلے کہ یہ وہی لڑکی ہے یا نہیں؟ اگر وہی لڑکی ہوگی تو پھر یہ ظلم ہوگا' وہ تیری محبت ہے۔ تجھے اس محبت کی قدر کرنی ہوگی۔ دنیا والوں کو بتانا ہوگا کہ ہم ٹیکسی والے بھی شریف ہوتے ہیں۔ شرافت سے اپنی عورت کے ساتھ نباہ کرتے ہیں۔"

بادشاہ نے ایک سانس میں گلاس خالی کردیا پھر دوسری بار گلاس بھرنے کے لیے دیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ یہ میری رخسانہ ہے یا نہیں ہے؟ میں ابھی اس کو پہچان کر آتا ہوں۔ میرا گلاس بھردو۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ کھڑے ہوتے ہی اچانک اس کا سر چکرایا۔ کیونکہ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کیا تھا کچھ تو اثر ہونا ہی تھا پھر وہ سنبھل گیا اور کمرے کے اندر پہنچا' پھر بولا "اے! تم نے چہرے سے ہاتھ ہٹالیا ہے یا نہیں۔"

اس نے ذرا آگے جھک کر دیکھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

"ارے روتی کیوں ہو؟ مجھے ساری زندگی رلانے کے لیے آئی ہو۔ تیرے ماں باپ -

نے جو فراڈ کیا ہے' وہ کوئی قاتل' بدمعاش اور اسمگلر بھی نہیں کرتا ہوگا۔ اب منہ کیوں چھپاتی ہو۔ ذرا دیکھنے تو دو کہ تم وہی رخسانہ ہو یا نہیں ہو۔ وہی ہوگی تو میں معافی مانگ لوں گا.... تمہارے ساتھ بڑی محبت سے زندگی گزار لوں گا۔ میں محبت کرتا ہوں' مذاق نہیں کرتا۔"

وہ اپنے گھٹنوں پر سے چہرے کو اٹھاتے ہوئے بولی "تم مذاق کررہے ہو۔ محبت نہیں کرتے۔ اگر کرتے تو میرا مذاق نہ اڑاتے' دوستوں میں بیٹھ کر شراب نہ پیتے۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ نشہ نہیں کروگے۔"

وہ سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا "کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ دیکھو ایسا کرو' تم اپنے گھونگٹ سے اپنے آدھے چہرے کو چھپالو اور وہ جو اچھا والا چہرہ ہے نا اسے دکھاؤ' ذرا میں ٹھیک سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میں نہیں دکھاؤں گی۔ مجھے مت ستاؤ۔ مجھ سے نفرت کرو۔ میں کون ہوتی ہوں تمہاری۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ اگر تمہاری محبت تمہیں مجبور کرے تب میرے پاس آجانا۔"

وہ کمرے سے باہر آگیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر اپنے باراتیوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ ایک نے اس کی طرف گلاس بڑھاتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بے بسی سے بولا "باتوں سے تو وہی لگتی ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"لے تھوڑی سی پی لے۔ دماغ صاف ہوجائے گا۔ ہربات سمجھ میں آنے لگے گی۔"

اس نے گلاس کو لے کر منہ لگایا پھر بولا "یارو ایک بات بتاؤ' اگر آدھا چہرہ بگڑ جائے تو باقی آدھا چہرہ بھی بدل جاتا ہے کیا؟ پہچانا نہیں جاتا؟"

ایک نے کہا "بھئی' ہم نے تو ایسا آدھا چہرہ دیکھا نہیں ہے' ہم کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"دیکھا کیوں نہیں ہے۔ یہ ہم سب جو ہیں نا' سب آدھے چہرے والے ہوتے ہیں۔ یہ میری رخسانہ کہتی تھی' ہم سب اپنا آدھا بھیانک چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں مگر یہ کمبخت اپنا آدھا بھیانک چہرہ لے کر آئی ہے۔ اسے کہاں چھپاؤں؟ اور یہ چھپتا نہیں ہے تو دوسرا آدھا اچھا چہرہ پہچان میں نہیں آتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے گلاس کو دوبارہ منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پینے لگا۔ ایک ساتھی نے سامنے والی کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "استاد' وہ سامنے والی کوٹھی دیکھ رہے ہو' وہ پوری کی پوری کتنی اچھی اور کتنی خوب صورت لگتی ہے۔ اگر اس کوٹھی کو آدھا توڑ کر گرادیں تو پھر وہ کچھ بھی نہیں رہے گی۔"

ایک نے کہا "آدھی کوٹھی رہے گی۔"

اس نے کہا "آدھی کوٹھی کی بات نہیں ہے پہلے جیسی کوٹھی کا نقشہ تو نہیں رہے گا نا' اب آدھی کوٹھی کا نقشہ رہ جائے گا۔ یعنی نقشہ بدل جائے گا۔ پہلے جو لوگ اس کوٹھی کو پہچان کر ادھر گلی میں مڑجاتے تھے۔ اب وہاں کھڑے ہو کر سوچیں گے کہ یہ وہی کوٹھی ہے؟ کیا اسی گلی میں مڑنا ہے؟ بات اصل میں پہچان کی ہوتی ہے' نقشے والی بات ہوتی ہے۔ اگر آدھی کوٹھی ٹوٹ جائے تو نقشہ بدل جاتا ہے' اس طرح اس لڑکی کا چہرہ ذرا سا بدل گیا ہوگا۔ اسی لیے استاد تم پہچان نہیں رہے ہو۔ ایک بار پھر جاؤ اور اس آدھے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرو۔"

بادشاہ جانی نے دوسرا گلاس خالی کردیا۔ اب ذرا نشہ ہو رہا تھا۔ ذرا جھومنے کو جی چاہتا تھا اور ذرا اٹھ کر بڑک مارنے کو دل کرتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔ دلہن سیج پر بیٹھی اپنی نتھ اور زیورات اتار رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی رک گئی۔ وہ ذرا لڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آیا پھر ایک دم قریب بیٹھ گیا۔

وہ گم صم بیٹھی رہی۔ اس بار نہ تو اس نے اپنے چہرے کو چھپایا اور نہ ہی کوئی التجا کی۔ بادشاہ جانی کے بہکتے ہوئے ہاتھوں نے اس کے گرے ہوئے گھونگٹ کو تھام لیا پھر اس گھونگٹ کو اٹھا کر اس کے آدھے بگڑے ہوئے چہرے پر رکھ دیا۔ آدھا چہرہ چھپ گیا اور آدھا حسین چہرہ نظر آنے لگا۔

اب وہ غور سے اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے دونوں آنکھوں سے دیکھتا رہا پھر ایک آنکھ بند کر کے غور کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا "یہ بتاؤ' اگر آدھی کوٹھی گرادی جائے تو کیا آدھی کوٹھی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔"

وہ نظر جھکا کر بولی "کچھ نہیں بدلتا۔ مرد کی نظریں بدل جاتی ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر بولا "تم دیسی تگڑی باتیں کرتی ہو۔ ٹھہرو میں ابھی آتا

ہوں۔"

وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر گیا۔ وہاں تیسرا گلاس تیار تھا۔ باقی دو ساتھی ٹیکسی لے کر دوسری بوتل لانے گئے تھے۔ اس نے گلاس کو منہ سے لگالیا۔ پیتے وقت کچھ کہا نہیں جاسکتا "اوں' اوں" کی آواز نکلنے لگی۔ ایک نے پوچھا "استاد کیا بول رہے ہو؟"

اس نے گلاس کو منہ سے ہٹا کر کہا "اب سمجھ میں آیا۔ یہ وہی ہے۔ میری جان ہے۔ میری رخسانہ ہے۔ بات اصل میں کیا ہے۔ جانتے ہو؟"

"کیا بات ہے استاد؟"

"یہ جو کمرے میں روشنی ہے نا' یہ گڑبڑ کرتی ہے۔ اگر اندھیرا ہوگا تو چہرہ نہیں دکھائی دے گا اور چہرہ دکھائی نہیں دے گا تو آنکھیں دھوکا نہیں کھائیں گی اور میری جو رخسانہ ہے نا' وہ مجھے مل جائے گی۔"

سب نے واہ واہ کرتے ہوئے کہا "کیا بات کہی ہے استاد۔ جب چہرہ نظر نہیں آئے گا تو وہ دھوکا کہاں رہے گا۔ وہ تو خالی دلہن رہے گی۔"

وہ تیسرے گلاس کو خالی کر کے اسے ایک طرف پھینکتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے کمرے میں آیا پھر دروازے کو ایک دھڑاکے سے بند کردیا۔ اس کے بعد لائٹ آف کرتے ہوئے کہا "اے اپنی جگہ سے مت ہلنا۔ میں سوال کرتا ہوں۔ تم جواب دیتی جاؤ۔ پہلا سوال' ہم پہلے دن کالج سے کہاں گئے تھے۔"

اندھیرے میں جواب ابھرا۔ وہ بول رہی تھی "مجھے پیاس لگی تھی تم نے ایک جگہ مجھے جوس پلایا تھا۔ وہاں ایک سپاہی کو دو روپے رشوت دیئے۔ وہاں سے ہم کلفٹن گئے' پھر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔"

وہ نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا "بس' بس تم پاس ہوگئی ہو۔ میں گدھا الو کا پٹھا ہوں۔ تم کو ابھی تک پہچان نہیں سکا۔ کہاں ہو تم! ہاں ادھر ہو۔"

وہ ایک طرف بڑھا۔ کسی چیز سے ٹکرایا۔ "ارے' ادھر تو نہیں ہو۔"

وہ دوسری طرف بڑھا۔ کسی چیز سے ٹکرایا "وہ کبھی اِدھر جارہا تھا کبھی اُدھر' آخر اِدھر سے اُدھر بھٹکتے ہوئے سیج کے قریب پہنچا اور آدھے چہرے کی پناہ میں گر پڑا۔

○☆○

وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے کانوں میں میٹھی رس بھری آواز ٹپک رہی تھی
"اٹھو' اٹھ بھی جاؤ۔ صبح ہو چکی ہے۔ پلیز اٹھ جاؤ' میری امی آنے والی ہیں' وہ ناشتا لے کر آئیں گی۔ اس سے پہلے تمہیں نہا دھو کر تیار ہو جانا چاہیے۔"

اسے ہولے ہولے جھنجوڑا جا رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے آنکھیں کھولیں۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ اوندھے منہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔ سر گھما کر دیکھا تو سامنے ریشمی لباس میں کھڑی ہوئی کوئی نظر آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک آدھا حسین چہرہ نظر آیا۔ باقی آدھا چہرہ اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ چہرے کے اس حصے پر اس نے بڑے سلیقے سے سفید پٹیاں چپکا دی تھیں۔ تیزاب نے آدھے چہرے کو کہیں کہیں سے بگاڑ دیا تھا لیکن دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔ ان غزالی آنکھوں میں کاجل کی لکیریں بڑی خوب صورت لگ رہی تھیں۔ وہ اتنی حسین لڑکی تھی کہ بادشاہ جانی اسے چند لمحوں تک دم بہ خود ہو کر دیکھتا رہا پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا' اسے احساس ہوا کہ کسی اجنبی لڑکی کے پاس ہے۔

غسل خانے میں اس کے لیے پتلون' قمیص' بنیان' صابن' تولیا' سب کچھ پہلے سے رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس نے نلکے کے نیچے بالٹی رکھ کر اسے کھول دیا۔ نلکے سے پانی کی دھار گرنے لگی۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور سر کھجاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس سے کیسی غلطی ہو گئی۔ اسے شراب نہیں پینی چاہیے تھی۔ نشے میں وہ بہک گیا تھا۔ اب کیا ہو گا۔

وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر غسل خانے سے باہر آیا۔ برآمدہ خالی تھا۔ باہر ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی دلہن نے دروازے میں آ کر کہا "تمہارے ساتھی نشے میں دھت پڑے ہوئے تھے۔ وہاں برآمدے میں عجب تماشا تھا۔ میں نے انہیں پہلے تو آواز دے کر اٹھانے کی کوشش کی' جب کوئی ٹس سے مس نہ ہوا تو پانی سے بھری ہوئی بالٹی لے کر آئی اور ان پر پانی پھینکا تو وہ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے پھر ٹیکسی لے کر چلے گئے۔ ایک نے کہا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی واپس لے آئے گا۔"

وہ پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔ بادشاہ جانی تیزی سے چلتا ہوا اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا پھر دروازے کو بند کرتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا "تم نے جواب نہیں

دیا' بتاؤ تم کون ہو؟"

وہ پلٹ کر بولی "میں تمہاری شریک حیات ہوں۔ اس گھر کی عزت ہوں۔ میرا نام رخسانہ ہے۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ یہ رات کا وقت نہیں ہے' میں اس وقت دھوکا کھا گیا تھا۔ تم اس وقت دلہن کے روپ میں تھیں۔ تم کبھی سمجھ میں آتی تھیں کبھی نہیں آتی تھیں پھر نشے نے مجھے بہکا دیا لیکن اب دن کی روشنی میں' میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم وہ رخسانہ نہیں ہو۔"

وہ اس سے ذرا دور گئی پھر پلٹ کر بولی "تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھے ایک حادثہ پیش آیا اور تم پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔ کیا میری آواز اور میرا لب ولہجہ بھی کسی دوسری لڑکی جیسا ہے؟"

وہ سر کھجا کر غور کرنے لگا پھر بولا "میں یہ نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ تم سے دوبار ملاقات ہوئی اور تم جیسی باتیں کرتی ہو' تو باتیں ویسی ہی ہیں لیکن آواز ولہجہ میں نہیں پہچان سکتا۔ مجھے تو ویسا ہی لگ رہا ہے۔"

"جب سب کچھ ویسا ہی ہے تو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ تیزاب نے میری شکل بدل کر رکھ دی ہے۔"

وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ رخسانہ نے کہا "ہاں اچھی طرح دیکھ لو۔ مجھ سے دوبار مل چکے ہو۔ کیا میرا قد نہیں ہے۔ میں نہ تو موٹی ہوں' نہ دبلی۔ جیسا تم دیکھ چکے ہو' ویسی ہی ہوں۔ اگر کچھ فرق ہے تو مجھے بتا دو۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ رخسانہ نے آگے بڑھ کر کہا "امی تمہیں بتانا چاہتی تھیں کہ میرا چہرہ بگڑ گیا ہے لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ مجھے اپنی محبت پر اور تم پر بڑا اعتماد تھا۔ میں جانتی تھی کہ تم مجھے ہر صورت کے ساتھ قبول کر لو گے لیکن یہاں میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم شش و پنج میں مبتلا ہو اور مجھے قبول کرنے سے کترا رہے ہو۔ اب بھی تم جس طرح چاہو' تصدیق کر سکتے ہو۔"

اس نے سر اٹھا کر پوچھا "کیا تم کالج میں پڑھتی ہو؟"

"بے شک پڑھتی ہوں۔ تمہارے ساتھ دوبار جا چکی ہوں اور اب بھی تمہارے

ساتھ کالج جاؤں گی۔ وہاں رجسٹر میں تمہیں اپنا نام دکھاؤں گی۔ میرا نام رخسانہ ہے اور یہ میرا آخری سال ہے۔ اس کے بعد میں ڈاکٹر بن جاؤں گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر ایک دم قریب پہنچ کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ دیکھنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ انگلیوں سے اس کے چہرے کو چھونے لگا پھر اچانک ہی پیچھے ہٹ کر بولا "ارے تم کیا بولتی ہو۔ ٹماٹر کو آدھا کاٹ کر پھینک دینے سے کیا باقی آدھا ٹماٹر صورت بدل کر بینگن بن جائے گا۔ میں جس رخسانہ کو جانتا ہوں' وہ ٹماٹر کی طرح سرخ تھی' ٹماٹر کی طرح اور تم بینگن ہو۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "ایک طرح سے تم میری تعریف کر رہے ہو کیونکہ میں رخسانہ ہوں۔ دوسری طرف تم میری توہین کر رہے ہو کیونکہ موجودہ صورت میں' میں تمہارے لیے قابل قبول نہیں ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ کچھ دنوں تک تمہاری یہی حالت رہے گی لیکن رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ جس کے لیے تم دیوانے تھے' وہی تمہارے پاس ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ رخسانہ نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا پھر پلٹ کر بولی "امی ہمارے لیے ناشتا لے کر آئی ہیں۔ خدا کے لیے ان کے سامنے میری توہین نہ کرنا یہ میرا اور تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جب تم مجھے سمجھ نہ سکو اور اپنی رخسانہ تسلیم کرنے سے انکار کر دو' تب ہم یہ معاملہ بڑوں تک پہنچائیں گے اور دس آدمیوں کے سامنے فیصلہ رکھیں گے۔ دیکھتے ہیں کہ دنیا مجھے جھوٹا کہتی ہے یا تمہیں؟"

وہ اس کی باتیں سنتا جا رہا تھا۔ اسے دیکھتا جا رہا تھا اور اندر ہی اندر کہتا جا رہا تھا کہ مجھے اس کی صورت کو اور اچھی طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ پہلے تو اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہوں۔ کیا اس رخسانہ کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں مگر مجھے تو ٹھیک طرح یاد نہیں آ رہا ہے لیکن جب وہ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھتی تھی تو میں نظریں جھکا لیتا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو میں نے اس کے چہرے کو ٹھیک طرح سے دیکھا نہیں تھا۔ مجھے شرم آتی تھی۔ میں مرد ہو کر اس سے جھجک جاتا تھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا۔ میں اُلّو کا پٹھا ہوں۔ اس کو دو دن میں اتنی اچھی طرح نہیں دیکھ سکا کہ اس رخسانہ اور اس رخسانہ کا بہت زیادہ فرق معلوم

کر سکوں۔ میں کیا کروں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ یہ وہی رخسانہ ہے۔

اس کی ساس ایک بڑا سا ناشتے کا تھال اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ رخسانہ نے سر جھکا کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "امی آداب۔"

وہ بیٹی کو دعائیں دیتے ہوئے اپنے داماد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں کیونکہ وہ یک ٹک رخسانہ ہی کو دیکھتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا۔ رخسانہ نے پوچھا "آپ اکیلی ہی آئی ہیں؟"

"ہاں بیٹی' میں نے سوچا یہاں تم نے معلوم نہیں کیسا وقت گزارا ہو گا؟ بادشاہ جانی نے تمہیں اس صورت میں قبول کیا ہو گا یا نہیں؟ یہی سب کچھ سوچ کر میں کسی کو ساتھ نہیں لائی۔ اکیلی آئی ہوں۔ کیوں بیٹے تم اس طرح گم صم کیوں بیٹھے ہو؟"

وہ ویسے ہی بیٹھا رہا۔ رخسانہ نے قریب آ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے آہستگی سے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں' امی آئی ہیں' اٹھ کر سلام کرو۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر سلام کرنے کے بعد رخسانہ کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی ماں کے ہاتھوں سے ناشتے کا تھال لے کر میز پر رکھ رہی تھی۔ بادشاہ جانی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "محترمہ' میں نہیں جانتا کہ آپ کو کس طرح مخاطب کرنا چاہیے۔ کیا میں امی بولوں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولیں "اس سے اچھی بات کیا ہو گی بیٹے۔ اب تو میں تمہاری بھی ماں ہوں۔"

دیکھئے' اگر آپ میری ماں ہیں تو سچ سچ ایک ماں کی طرح مجھے جواب دیجئے۔ کیا یہ وہی رخسانہ ہے جس کے ساتھ میں پہلی بار آپ کے گھر آیا تھا؟"

اس کی ساس نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر اپنی بیٹی کو دیکھنے کے بعد بولیں "ہاں' یہ وہی رخسانہ ہے۔ کیا یہ تمہیں کوئی دوسری لڑکی لگ رہی ہے؟"

"آپ خود انصاف سے بولیے۔ کیا جب میں پہلی بار اس رخسانہ کے ساتھ آیا تھا تو اس کا چہرہ ایسا ہی تھا۔"

"نہیں ایسا نہیں تھا۔ یہ بات میں مانتی ہوں۔ اب تھوڑا سا بدل گیا ہے۔ میں تمہیں پہلے بتانا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے منع کر دیا۔ کہتی تھی کہ اس کی صورت جیسی

بھی ہوگی، تم اسے قبول کرلوگے۔ تمہیں اس کی صورت کے متعلق پہلے سے بتادینے سے شاید کوئی ہنگامہ کھڑا ہوجائے۔ تم شادی سے انکار کردیتے۔ یوں ہمارے خاندان میں، ہمارے محلے میں بڑے بے عزتی ہوتی، بہت ساری باتیں اس سلسلے میں ہوسکتی تھیں اس لیے ہم نے تم سے بات چھپائی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کہ بات چھپائی۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ چہرہ اس چہرے سے بالکل الگ کیسے ہوگیا؟"

"بالکل الگ نہیں ہے بیٹے، آدھے چہرے کی خرابی نے باقی آدھے چہرے پر اثر ڈالا ہے اس لیے جو اچھا چہرہ نظر آرہا ہے، اس سے ہلکی سی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے تم گڑبڑا گئے ہو۔ پہلے جس توجہ سے تم نے رخسانہ کو دیکھا تھا اسی توجہ سے اور اپنائیت سے اب بھی دیکھو گے تو تمہیں فرق نظر نہیں آئے گا۔ چلو اب ناشتا کرلو۔"

وہ میز کے اطراف کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اس کی ساس نے کہا "میں کھا کر آئی ہوں۔ تم دونوں ناشتا کرو، میں پانی لے کر آتی ہوں۔"

وہ باورچی خانے کی طرف جانے لگیں۔ اس وقت دوسری گاڑی کی آواز سنائی دی۔ بادشاہ جانی نے کہا "شاید میری ٹیکسی آگئی ہے۔ مجھے کسی ایسے آدمی سے یہ سب کچھ پوچھنا چاہیے جو سچی اور انصاف کی بات کرتا ہو۔ میرے مستری چاچا بہت سچے اور کھرے ہیں، وہ کھرے تجربے کی باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے پہلے مجھے بہت سمجھایا تھا مگر میری کھوپڑی میں بات نہیں آئی۔ اب میں ان کو بلا کر لاؤں گا۔ وہ رخسانہ کو ایک بار اپنے گیرج کے سامنے دیکھ چکے ہیں۔ جب وہ پہلی بار میری ٹیکسی میں آکر بیٹھی تھی۔ مستری چاچا ضرور تمہیں پہچان لیں گے وہی فیصلہ کریں گے کہ تم کون ہو؟"

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولی "دیکھو جانی! کیا میں بدصورت ہوں کیا اتنی بری ہوں کہ تم صرف میرے ہی بارے میں سوچتے جارہے ہو اور مجھے اپنی زندگی سے نکال دینے کے لیے میری مخالفت ہی میں بولتے جارہے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ تم بری نہیں ہو، تم تو اتنی اچھی ہو کہ کوئی بھی تمہارے آدھے چہرے پر قربان ہوسکتا ہے لیکن میں کیا کروں۔ مجھے تو وہی صورت یاد آتی ہے اور وہی صورت اچھی لگتی ہے۔ میں اسی صورت سے پیار کرتا ہوں، اسی صورت پر مرتا ہوں۔"

"اگر تقدیر ظالم بن گئی اور اس نے اس صورت کو ذرا سا بدل دیا ہو تو کیا تم اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کروگے؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر بولا "یہ ناشتا تو بہت اچھا ہے مگر میرے حلق سے نہیں اتر رہا ہے۔ جب تک میں مستری چاچا سے تمہارے متعلق فیصلہ نہیں کراؤں گا، اس وقت تک مجھے سکون نہیں ملے گا، میں ابھی ان کو بلا کر لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے جانے لگا۔ رخسانہ نے اسے آواز دی "کہاں جاتے ہو، ناشتا تو کرلو۔"

وہ تیزی سے جارہا تھا۔ دوسری طرف سے اس کی ساس پانی کے دو گلاس بھر کر لارہی تھی۔ دونوں دروازے پر ٹکرا گئے۔ گلاس فرش پر گر پڑے۔ اس کی ساس نے حیرانی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ بولا "میں اندھا ہوگیا ہوں۔ مستری چاچا سے آنکھیں مانگنے جارہا ہوں، ابھی آجاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر آیا۔ اس کی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اسٹیرنگ سیٹ سنبھال لی پھر دوسرے ہی لمحے گاڑی کو اسٹارٹ کرکے اسے پیچھے کی طرف موڑ کر تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں سے چاچا کا گیرج بہت دور تھا۔ تمام راستے ونڈ اسکرین کے پار اسے دو چہرے نظر آتے رہے۔ ایک اس رخسانہ کا تھا جو اس کی محبوبہ تھی لیکن اس کا چہرہ دھندلا دھندلا سا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سا چہرہ اصل ہے۔ قصور اس کا ہی تھا کہ اس نے پوری توجہ سے نظر بھر کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ اب جو دلہن بنی ہوئی تھی اس کا چہرہ بالکل صاف تھا۔ ونڈ اسکرین کے پار وہ آئینے کی طرح نظر آتی تھی اور اس چہرے پر پہلے والی رخسانہ کا چہرہ گڈمڈ ہوجاتا تھا۔ کبھی وہ آنکھیں بدل جاتی تھیں اور کبھی دلہن کی آنکھیں نظر آنے لگتی تھیں۔ چہرہ بھی یوں لگتا تھا کہ کبھی ادھر ہورہا ہے اور کبھی ادھر ہورہا ہے۔ اس کی دماغی حالت بڑی عجیب سی ہورہی تھی۔ شاید وہ پاگل ہونے والا تھا۔

وہ گیرج کے سامنے پہنچ گیا۔ مستری چاچا اس وقت کہیں جانے کی تیاری کررہے تھے اور مزدوروں کو سمجھا رہے تھے۔ بادشاہ جانی کو دیکھتے ہی انہوں نے ناراضگی سے منہ

پھیرلیا پھر اپنے ایک مزدور سے باتیں کرنے لگے۔ بادشاہ گاڑی سے اتر کر ان کے پاس آیا
پھر ہاتھ جوڑ کر بولا "چاچا مجھے معاف کردو۔ میں دولہا بنا ہوا تھا۔ آگے بڑھ کر آپ کو
روک نہیں سکتا تھا۔ اتنے سارے لوگ کیا کہتے۔ ہم تماشا بن جاتے۔ آپ کو نہیں آنا
چاہیے تھا۔ برے وقت میں بھلا کوئی اپنوں کا ساتھ چھوڑتا ہے۔"

مستری چاچا نے ہاتھ ہلا کر کہا "بس کر' چلا جا یہاں سے۔ اپنا پن جتانے آیا ہے۔
اگر میری بات مان لیتا تو تیرے ساتھ وہ کیوں ہوتا جو کل رات سے ہو رہا ہے۔ ارے'
مجھے ساری بات معلوم ہے۔ تیرے باراتیوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"پھر تو بہت اچھا ہوا چاچا۔ اب مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس
ابھی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں' اب میں تمہارے معاملے میں نہیں پڑوں گا۔ نہ شادی میں شریک ہوا اور
نہ اب تمہاری ازدواجی زندگی کے معاملے میں کچھ بولوں گا۔"

"چاچا' میرا قصور معاف کردیں۔ میں گدھا ہوں' اُلّو کا پٹھا ہوں' مجھے دو جوتے مار لو
مگر ابھی میرے ساتھ چلو۔"

"مگر مجھے کیوں ساتھ لے جانا چاہتا ہے؟ اب میں کیا کروں گا؟"

"تم اس لڑکی کو دیکھ کر صرف اتنا بتادو کہ یہ وہی ہے کہ نہیں جو اس روز یہاں گیرج
میں آئی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ ٹیکسی خالی ہے اور میں پہلی بار اسے بٹھا کر لے گیا تھا۔
اس لڑکی کو تم نے دیکھا تھا؟"

"ہاں دیکھا تھا۔"

"تم اسے پہچان لوگے نا؟"

مستری چاچا سوچنے لگے پھر ذرا انکار میں سر ہلا کر بولے "دیکھو بیٹے' میں پرائی بہو
بیٹیوں کو توجہ سے نہیں دیکھتا۔ میں نے ایک بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر نظریں جھکا لی
تھیں۔ اب اتنے میں' میں کیا جانوں' وہ کیسی ہے اور میں اسے دوسری لڑکیوں میں پہچان
سکوں گا یا نہیں۔"

"چاچا' میرے گھر میں دس لڑکیاں نہیں ہیں۔ وہ ہے' اس کی ماں ہے۔ بس اسے
دیکھ کر اتنا بول دو کہ یہ وہی رخسانہ ہے یا نہیں۔"

"میں کیسے بولوں۔ کہہ تو رہا ہوں کہ اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔"

"چلو غور سے نہیں دیکھا تھا مگر دیکھا تو تھا ناں۔"

مستری چاچا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا پھر آہستگی سے پوچھا "کیا تو نے اس
کے ساتھ رات گزاری؟"

"ہاں گزاری۔"

"سوچ سمجھ کر جواب دے۔ دولہا' دلہن والی رات گزاری۔"

"آں۔" وہ بوکھلا گیا۔ نظریں جھکا لیں پھر کترانے کے انداز میں دوسری طرف
دیکھنے لگا۔

"دیکھو بادشاہ' مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔"

اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "چاچا' میری تقدیر خراب ہے۔ کل
رات کو میری کھوپڑی الٹ گئی تھی۔ میں نشہ کرکے پچھتا رہا ہوں۔ بس غلطی ہوگئی۔"

"ابے او غلطی کے بچے' جب تو نے اسے دلہن بنالیا' دلہن مان لیا اور دلہن کا رشتہ
پورا کردیا' تب یہ پوچھنے کا تجھے کیا حق ہے کہ وہ پہلے والی رخسانہ ہے یا نہیں؟ وہ جو بھی
ہے اب تیری بیوی ہے' تیری عزت ہے۔"

"عزت کی ایسی کی تیسی' جہاں دھوکا ہوتا ہے' وہاں عزت نہیں ہوتی۔"

"ایک تو بڑی مصیبت یہ ہے کہ تیری کھوپڑی الٹی ہے۔ تجھے سمجھانے میں دیر لگتی
ہے۔ سن ذرا توجہ سے سن۔ مان لے کہ وہ جو تیری بیوی ہے' وہ تیری پہلے' والی رخسانہ
نہیں ہے۔"

وہ سر ہلا کر بولا "یہی تو میں کہتا ہوں۔"

"ابے سن' بڑا کہنے والا آیا۔ جب تو یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ تیری رخسانہ نہیں ہے تو پھر
تو نے اس کے ساتھ رات کیوں گزاری؟"

"وہ تو نشے میں غلطی ہوگئی۔"

"ابے تو کیا تھانے اور کچہری میں جاکر یہی بولے گا۔ بولے گا تو جوتے پڑیں گے۔
بات سمجھنے کی کوشش کر۔ فرض کرلے کہ وہ تیری رخسانہ نہیں ہے کوئی دوسری لڑکی ہے
جسے تیری بیوی بنایا گیا ہے۔ ساری پنچایت' ساری عدالتیں تجھ سے یہی سوال کریں گی کہ

جب وہ تیری رخسانہ نہیں تھی، تجھے اس پر شک تھا تو شک کو برقرار رکھتا۔ پنچایت میں فیصلہ کراتا لیکن ایسا تو نے نہیں کیا۔ اسے بیوی مان لیا۔ اس کے ساتھ رات سے صبح کردی۔ اب وہ جو کوئی بھی ہو، تجھے اس کا شوہر بن کر رہنا پڑے گا۔ انکار کرے گا تو اسے طلاق دینا ہوگی۔ طلاق دے گا تو پچاس ہزار روپے دینے ہوں گے۔ پچاس ہزار روپے دے دے گا تو تیرے دونوں پلاٹ اور مکان، سب کچھ تیرے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ تیرے پاس رہے گا کیا؟ ابے عقل کے اندھے تو نے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے تو اب اس کی چوٹ کو بھی برداشت کر۔"

"چاچا، میں اس لیے نہیں آیا کہ تم میرے زخم پر نمک چھڑکو۔ میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں، مجھے اس مصیبت سے نکالو۔ بس ایک بار کسی طرح یہ معلوم کرلو کہ وہ میری رخسانہ ہے یا نہیں ہے۔"

"بادشاہ تو جوان ہے۔ تیری آنکھوں کی روشنی تیز ہے۔ تو نے شادی سے پہلے دو دنوں تک اسے دیکھا، کل رات سے صبح تک اسے دیکھتا رہا۔ جب تو جوان ہوکر اسے نہیں پہچان رہا ہے تو میری بوڑھی آنکھیں اسے کیسے پہچانیں گی۔"

"چاچا، پہچاننے کے لیے صرف آنکھ ہی ضروری نہیں ہے، عقل بھی ضروری ہے اور وہ میرے پاس نہیں ہے۔ تمہارے پاس ہے۔ تم اپنی عقل لڑاؤ اور جو سچ ہے اسے معلوم کرلو۔"

مستری چاچا سر جھکا کر سوچنے لگے، پھر اس سے دور جاکر ٹہلنے لگے۔ بادشاہ جانی انہیں سوالیہ نظروں سے اور کبھی التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر انہوں نے سر اٹھا کر کہا "چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔ میں اسے آزمالوں گا کہ وہ پہلے والی رخسانہ ہے یا نہیں ہے۔"

بادشاہ نے خوشی سے اچھل کر نعرہ لگایا "واہ چاچا زندہ باد۔ یہ بات ہوئی نا۔ مجھے یقین تھا کہ تم کسی نہ کسی طرح تدبیر سے اصل بات معلوم کرلو گے۔"

وہ دونوں وہاں سے ناگن چورنگی پہنچے۔ وہاں گھر میں دونوں ماں بیٹی بادشاہ کا انتظار کررہی تھیں۔ اس کے ساتھ مستری چاچا کو آتے دیکھا تو دونوں نے اپنے اپنے سروں پر آنچل رکھ لیے۔ بادشاہ نے کہا "چاچا آجاؤ، اپنا ہی گھر ہے۔ یہ تو آپ ہی کی بہو ہے،

پردے کی کوئی بات نہیں ہے۔ امی شاید آپ بھی پردہ نہیں کرتی ہیں۔"

اس کی ساس نے کہا "ہاں ہاں کوئی بات نہیں ہے۔ آیئے اندر تشریف لے آیئے۔"

مستری چاچا اندر آئے۔ انہیں ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ رخسانہ نے سر جھکا کر آداب کیا۔ مستری چاچا نے اسے دعائیں دیں پھر اسے ایک نظر دیکھا۔ اس کے بعد نظریں جھکالیں۔ رخسانہ کی امی نے کہا "دیکھیے کل مہر کی رقم کے سلسلے میں ہمارے درمیان جھگڑا ہوگیا تھا، آج آپ کو ماننا پڑے گا کہ میں نے پچاس ہزار روپے کی رقم لکھوا کر دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ آج کل کے نوجوان بہت گرم مزاج ہوتے ہیں۔ اگر بادشاہ غصے میں آکر میری بیٹی کو طلاق دے دیتا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی لیکن اس پچاس ہزار کی رقم نے اس کے منہ پر تالا لگادیا۔ آپ یقین کریں ہم شریف لوگ ہیں۔ ہمارے یہاں طلاق کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ میری بیٹی اب جیسی بھی ہے، بادشاہ کی عزت ہے یہ اسے اپنے پاس عزت سے رکھے یا اس پر ظلم کرے، یہ ہر حال میں بادشاہ کے ساتھ زندگی گزارے گی لیکن پچاس ہزار کے لالچ میں کبھی طلاق کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لائے گی۔"

مستری چاچا سر جھکائے سن رہے تھے اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر رخسانہ کو دیکھ لیتے تھے۔ اسے پہچاننے کی کوشش کررہے تھے۔ بے چارے نے ایک ہی بار رخسانہ کو دیکھا تھا اس لیے آنکھوں کے ذریعے فیصلہ نہیں کرسکتے تھے۔ اب عقل سے ہی فیصلہ کیا جاسکتا تھا اس لیے انہوں نے کہا "بیٹی میں کچھ پوچھوں گا۔ برا نہیں ماننا جب تم پہلی بار میرے گیرج آئیں تو تم نے ٹیکسی کے پاس آکر بادشاہ سے کیا پوچھا تھا؟"

رخسانہ نے کہا "محترم بزرگ، اس کا جواب ایک بچہ بھی دے دے گا کیونکہ ایک ٹیکسی کے پاس آکر یہی پوچھا جاتا ہے کہ ٹیکسی خالی ہے یا نہیں۔"

"ہاں بیٹی تم درست کہتی ہو۔ میں دوسرا سوال کرتا ہوں اس کے بعد تم نے انگریزی میں کچھ کہا تھا، بتاؤ تو کیا کہا تھا؟"

"وہاں گاڑی کا پہیہ لگایا جارہا تھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھ کر کہا تھا۔ آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔"

یہ کہتے ہی وہ منہ دبا کر ہنسی پھر بولی "اس کے بعد بادشاہ نے کہا تھا کہ یہ بھی انگریزی جانتے ہیں۔ کوئی انگریزی سواری آتی ہے تو یہ اس سے کہتے ہیں کہ میٹر سے نہیں جائیں گے آنا ہے تو "کم" نہیں تو "گو"۔"

یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔ مستری چاچا نے تائید میں سر ہلا کر کہا "بیٹی تم بالکل درست کہتی ہو۔ یہی سب کچھ ہوا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم وہی رخسانہ ہو۔ اس لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

رخسانہ کی امی نے کہا "میری بیٹی ابھی بادشاہ کے ساتھ میڈیکل کالج جائے گی۔ وہاں یہ ثابت کردے گی کہ یہ میڈیکل کی طالبہ ہے اور یہ اس کا آخری سال ہے۔ اس کا نام رخسانہ ہے۔ یہ اب تک کلاسیں اٹینڈ کرتی رہی تھی۔ یہ ساری باتیں بادشاہ کو کالج پہنچ کر معلوم ہو جائیں گی۔ اب اس کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بادشاہ کو کس طرح یقین دلایا جائے۔"

مستری چاچا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "بس محترمہ، مجھے تو یقین آگیا ہے۔ یہ لڑکا پہلے ہی الٹی کھوپڑی کا ہے۔ اس کی سمجھ میں جلدی کوئی بات نہیں آتی ہے، آہستہ آہستہ سیدھا ہو جائے گا۔"

وہ رخسانہ کے پاس آئے پھر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا "بیٹی بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہارے چہرے کے ساتھ ایسا ہو گیا۔ اس کے باوجود تم خوب صورت ہو، بہت پیاری ہو۔ میں تمہیں بیٹی کہتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔"

انہوں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالا پھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں تمہارے لیے کوئی تحفہ نہ لاسکا۔ اسے ایک غریب چاچا کی طرف سے قبول کرلو۔"

بادشاہ نے دانت نکال کر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ یہ میری رخسانہ ہے، بس ذرا دل میں شک ہو رہا تھا۔ جب تم نے مان لیا چاچا تو مجھے بھی شک نہیں رہا، میں بھی مانتا ہوں۔"

مستری چاچا نے اس کی ساس کو دیکھتے ہوئے کہا "بہن چلو، میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ ان دونوں کو آپس میں اچھی طرح سمجھوتا کرنے دو۔"

وہ کمرے سے باہر جانے کے لیے دروازے تک گئے پھر وہاں سے پلٹ کر کہا "بادشاہ

میں تمہاری ٹیکسی لے جا رہا ہوں۔ اپنے کسی چھوکرے سے واپس بھیج دوں گا اور ٹنکی بھی فل کرادوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ اس کی ساس بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل گئی۔ بادشاہ نے لپک کر دروازے کو ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا پھر چٹخنی چڑھادی۔ رخسانہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا "یہ کیا حرکت ہے؟ دروازہ اتنی زور سے بند کیا جاتا ہے؟ امی کیا سوچیں گی۔"

"وہ بات یہ ہے کہ ذرا جوش میں بند ہو گیا۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ قریب آیا اور پھر اسے اپنے قریب کھینچ لیا "میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے کل رات سے تمہیں بہت پریشان کیا۔ اب مجھے ایک دم سے یقین آگیا ہے۔ اب میں کبھی بھول کر بھی تم پر شبہ نہیں کروں گا۔"

"بس رہنے دو ابھی میں کالج جاؤں گی۔"

"دیکھو آج، تو شادی کا دوسرا دن ہے آج تمہیں کالج نہیں جانا چاہیے۔"

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو کر بولی "میں پڑھنے کے لیے نہیں، خود کو رخسانہ ثابت کرنے کے لیے تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔"

وہ ہاتھ جھٹک کر بولا "کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین آگیا ہے۔ میں خدا کے بعد مستری چاچا پر بھروسا کرتا ہوں۔ وہ بہت عقل مند ہیں۔ تم نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں نا، وہ تم سے بھی زیادہ عقل مند ہیں۔ وہ کبھی غلط نہیں کہتے۔ بس میں نے یقین کرلیا ہے۔"

وہ بولی "نہیں، ایسے یقین کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ بات بالکل پکی ہونی چاہیے۔ تم میرے ساتھ کالج چلو گے۔"

"کیوں کالج لے جا کر میری بے عزتی کرنا چاہتی ہو۔ میں جاہل، ان پڑھ ہوں۔ وہاں کسی لڑکے یا لڑکی نے کوئی بات پوچھی، انگریزی میں کچھ کہا تو میں منہ دیکھتا رہ جاؤں گا۔ بس میں نے کہہ دیا نا، لو کان پکڑتا ہوں، تم ہی میری رخسانہ ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے ایک دم سے اداس سی ہو گئی۔

○☆○

مستری چاچا ٹیکسی لے کر پہلے ناظم آباد گئے۔ وہاں انہوں نے رخسانہ کی امی کو چھوڑا پھر بمبینو کی طرف جاکر ایک پرانی گاڑی کا سودا کیا۔ وہاں سے وہ گیرج آئے۔ گیرج سے چھوٹو کو لے کر اپنے گھر پہنچے پھر چھوٹو سے کہا کہ وہ ٹیکسی کو بادشاہ کے گھر تک پہنچا دے اور وہاں سے بس میں بیٹھ کر گیرج واپس چلا جائے۔

بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آکر پنکھے کے نیچے بیٹھ گئے۔ ان کی بیگم نے پوچھا "آج تو آپ بادشاہ کی ٹیکسی لے کر آئے ہیں۔ کیا پھر اس معاملے میں ٹانگ اڑا رہے ہیں۔"

انہوں نے کہا "ایسا نہ کہو۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔ اس کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ جس لڑکی سے اس نے شادی کی ہے' اس کا چہرہ تیزاب سے جھلس گیا ہے۔"

بیگم نے ایک دم سے کہا "ہائے بے چاری' پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے۔ اپنا ہی لڑکا الٹی کھوپڑی کا ہے۔ لڑکی کا آدھا چہرہ بگڑ گیا ہے تو وہ اسے پہچاننے سے انکار کر رہا ہے۔ کہتا تھا کہ لڑکی والوں نے لڑکی بدل دی ہے۔ مجھے بھی شبہ ہوا تھا لیکن ابھی میں لڑکی سے مل کر آرہا ہوں۔ وہ بہت اچھی ہے۔ میرے سوالوں کے اس نے صحیح جواب دیے ہیں پھر یہ کہ بادشاہ کو اپنے ساتھ کالج لے جاکر یہ ثابت کر دینا چاہتی ہے کہ وہی رخسانہ ہے۔ وہ وہاں تعلیم حاصل کر رہی ہے اور اس کا یہ آخری سال ہے۔"

"چلو اچھا ہے۔ اس لڑکے کو عقل آگئی ہے نا؟"

"ہاں وہ مان گیا ہے کہ وہی اس کی رخسانہ ہے۔"

بیگم نے پوچھا "لڑکی والے کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں' شریف لوگ ہیں۔ بادشاہ کو کسی معاملے میں دھوکا نہیں دے رہے ہیں۔ اگر دھوکا دینا ہوتا تو اس کی ساس یہ ضرور کہتی کہ لڑکی کو طلاق دے دو اور پچاس ہزار روپے رکھ دو۔ لڑکی کا پلا بھاری ہے۔ بادشاہ کے دونوں پلاٹ اور مکان بھی لڑکی کے نام ہیں۔ اب بادشاہ کو دھوکا دینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا لیکن وہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بادشاہ عزت و آبرو سے اس رشتے کو نباہتا رہے۔"

وہ خاموش رہ کر کچھ سوچنے لگے۔ ان کی بہو نے آکر کہا "ابا کھانا تیار ہے' کمرے میں آجائیے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اپنی بیگم سے بولے "بیگم اگر لڑکی والے لڑکی کو بدل دیتے اور بادشاہ کو دھوکا دیتے تو جانتی ہو' میں بادشاہ سے کیا کہتا؟"

"کیا کہتے؟"

"میں اس سے جھوٹ بولتا۔ اس سے کہہ دیتا کہ لڑکی بدلی نہیں گئی ہے' وہ اس کی رخسانہ ہی ہے۔"

بیگم نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے پوچھا "ہائے آپ اس سے جھوٹ کیوں بولتے؟ دھوکا کیوں دیتے؟"

"اس لیے کہ کمبخت سہاگ رات گزار چکا ہے۔ آخر لڑکی کی کوئی عزت ہوتی ہے۔ ماں باپ دھوکا دیتے تو اس میں لڑکی کا کیا قصور تھا۔ قصور تو سراسر بادشاہ کا تھا۔ جب اسے انکار تھا' جب اسے شبہ تھا تو اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ لڑکی کو ہاتھ بھی لگاتا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

بیگم نے تائید میں سر ہلایا پھر وہ دونوں کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

○☆○

وہ اپنے آدھے چہرے کو بڑے سلیقے سے چھپا کر رکھتی تھی۔ بادشاہ جانی نے دن رات اس کے چہرے کو قریب سے دیکھا تھا۔ اچھی طرح دیکھا تھا۔ اس کے آدھے چہرے پر کہیں کہیں تیزاب کے چھینٹے پڑے تھے اور چہرہ جل کر ایسی رنگت اختیار کر گیا تھا جیسے گوشت جلتے وقت ہلکا ہلکا سرخ پڑ جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں' اس کی ناک اور اس کے ہونٹ سلامت تھے۔ بھویں بھی سلامت تھیں۔ پیشانی پر دو ایک چھینٹے پڑے تھے جہاں جہاں تیزاب نے اپنا اثر چھوڑا تھا' وہاں وہ سفید کپڑے کی پٹیاں بڑے سلیقے سے کاٹ کر چپکا لیتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی ہو اور جب وہ زخم اچھے ہو جائیں گے تو پٹیاں ہٹا دی جائیں گی پھر چہرہ مکمل ہو جائے گا۔

ان پٹیوں کی موجودگی میں بھی چہرہ مکمل ہی لگتا تھا کیونکہ جو چہرے کا بھیانک پن تھا' وہ چھپ جاتا تھا۔ دونوں خوب صورت آنکھیں مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی تھیں تو وہ ساری دنیا کو بھول جاتا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ وہ ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ اتنی حسین لڑکی اس پر عاشق کیسے ہو گئی؟ پھر یہ اس کی شریک حیات کیسے بن گئی؟ کیا یہ بھی

تقدیر کا کوئی مذاق ہے؟

ایک بار اس نے پوچھا "رخسانہ میری یہ الجھن دور کردو۔ میں اپنے آپ کو بہت چھوٹا سمجھتا ہوں۔ یہ خیال مجھ کو ستاتا رہتا ہے۔ تمہاری جیسی حسین اور شریف خاندان کی لڑکی' ناظم آباد کی کوٹھی میں رہنے والی نے مجھے کیسے پسند کرلیا۔ تم میری شریک حیات کیوں بن گئیں' تمہارے لیے تو بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آرہے تھے۔"

رخسانہ نے جواب دینے سے پہلے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا پھر دور کہیں خیالوں میں گم ہو کر بولی "تم چھوٹے کہاں ہو۔ تم اتنے قدر آور ہو کہ میں تمہیں سر اٹھا کر دیکھتی ہوں تو تمہارا سر آسمان سے لگتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یاد رہے شادی سے پہلے ہم نے خوب بحث کی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور لوگ چھوٹے ہوتے ہیں۔ شریف نہیں ہوتے ہیں اور ہم جیسے سفید پوش لوگوں نے شرافت کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ اس بحث میں تم جیت گئے تھے' مجھے قائل کردیا تھا۔ ایک تو میں تمہاری شخصیت اور تمہارے انداز گفتگو سے متاثر ہوتی رہی تھی' دوسرے تمہارے خیالات نے مجھے اپنا بنالیا۔ تمہاری ایک بات نے تو دل پر بہت ہی اثر چھوڑا تھا۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ بلندی سے جھک کر کسی کو نیچے سے اٹھانا اور اپنے برابر کھڑا کرنا سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا تعریفی عمل ہے۔ اس بات کو سن کر میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ ای سے تمہارا تعارف کراؤں گی اور شریک حیات بنوں گی تو صرف تمہاری۔"

"تمہارے خاندان میں اور تمہارے طبقے میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں چھوٹا آدمی ہوں؟"

"کون کہے گا۔ ہم نے تو سب سے یہی کہا ہے کہ تم ٹیکسی کے مالک ہو۔ مکان کے مالک ہو۔ دو دو پلاٹوں کے مالک ہو۔ تمہارے پاس جتنا ہے' اتنا سفید پوشوں کے پاس نہیں ہوتا ہے۔ وہ سب تم سے مرعوب ہیں' بس ایک ٹیکسی ڈرائیور کا نام تمہاری پیشانی سے مٹادیا ہے۔"

یعنی اس کا آدھا چہرہ چھپادیا گیا تھا۔ شادی کے بعد بادشاہ جانی نے ٹیکسی نہیں چلائی

تھی۔ اس نے اپنی ٹیکسی ایک ڈرائیور کے حوالے کردی تھی۔ وہ صبح سات بجے ٹیکسی لے جاتا تھا اور شام کو سات بجے واپس لے آتا تھا۔ جو بھی آمدنی ہوتی تھی اس کا حساب کرلیا جاتا تھا۔ ایک دن بادشاہ جانی نے کہا "آمدنی تو ہو رہی ہے لیکن کم ہو رہی ہے۔ خود ٹیکسی چلانے اور دوسرے سے چلوانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

رخسانہ نے کہا "کوئی بات نہیں۔ تم رات کو ٹیکسی چلاسکتے ہو۔ ایسے علاقوں میں جہاں ہمارے جان پہچان والے نہ ہوں۔ اس طرح ڈبل آمدنی ہوگی۔ دن کو بھی ٹیکسی چلے گی اور رات کو بھی۔"

"مگر گاڑی کو زیادہ استعمال کرنے سے وہ جلد خراب ہوجاتی ہے۔ ہر چیز کو دیکھ بھال کر کام میں لانا پڑتا ہے۔"

وہ بولی "تم نہیں جانتے کہ میں کیا سوچتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہماری آمدنی بڑھتی رہے۔ میں جلدی سے یہ آخری سال پورا کرلوں' پھر یہاں اپنی ایک ڈسپنسری کھول لوں۔ کچھ نہ کچھ تو میں بھی کمالیا کروں گی۔"

وہ تنہائی کے محبت بھرے لمحات میں اس پر قربان ہوتا تھا اور پوچھتا تھا "آخر تمہیں کمائی کی اتنی دھن کیوں ہے؟"

وہ اسے دیکھتی تھی۔ اس کی نظروں میں ڈوبتی تھی پھر بڑے دکھ سے کہتی تھی "میں یہ آدھا چہرہ لیے ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں تمہیں دکھانا چاہتی ہوں کہ میں کتنی حسین ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ پیسے کمائے جائیں اور انہیں جمع کیا جائے پھر اتنی رقم ہوجائے کہ میں پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنے چہرے کا یہ عیب دور کرلوں اس کے بعد دیکھنا میں تمہارے ساتھ کتنے فخر سے باہر گھوما کروں گی۔"

تنہائی کے لمحوں میں جب بھی چہرے کا ذکر چلتا' تو وہ بے اختیار اپنی انگلیوں سے اس کے چہرے کو چھونے لگتا تھا۔ ادھر ادھر سے ٹٹول کر دیکھتا تھا۔ اس روز بھی اس نے اسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "ہاں رخسانہ' میں تمہارے چہرے کو دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ کچھ گم ہوگیا ہے۔ وہ چہرہ نظر نہیں آتا جو میں نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر دیکھا تھا۔ جب پلاسٹک والی بات ہوجائے گی' تو کیا کہتے ہیں اسے......"

وہ بولی "پلاسٹک سرجری۔"

"ہاں' پلاسٹک سرجری ہو جائے گی اور تم اپنا پہلے والا چہرہ پالو گی تو مجھے بھی سب کچھ مل جائے گا۔"

رخسانہ نے بڑے کرب سے پوچھا "کیا تمہیں ابھی میری ذات سے کچھ نہیں مل رہا ہے؟"

"آں۔ ہاں ملتا تو ہے۔ بہت کچھ مل رہا ہے اور جو کچھ مل رہا ہے' اس کے بعد ایک اور تمنا ہے۔ بتاؤں کیا ہے۔"

وہ نظریں جھکا کر مایوسی سے بولی "بتاؤ۔"

"تمہیں کمائی کی دھن ہے اور مجھے دھن ہے کہ ہمارے یہاں ایک بہت ننھا سا منا سا' پیارا پیارا سا بیٹا ہو۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس سے ذرا دور ہو کر بولی "اب میں تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "کیوں؟"

"میں دو چار سال تک بچے کے بارے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ دو ماہ کے بعد امتحانات ہیں۔ میں پریکٹیکل کی کلاسیں اٹینڈ کرتی رہتی ہوں۔ کیا بچے کا بوجھ اٹھا کر یہ سب کچھ کر سکوں گی۔"

وہ قائل ہو کر بولا "ہاں' اس طرح تم پریشان ہو جاؤ گی۔ چلو کوئی بات نہیں' امتحان پاس کرنے کے بعد۔"

"جی نہیں' امتحان پاس کرنے کے بعد ہم یہاں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری کھولیں گے۔ یہاں اتنی مصروفیات ہوں گی' اتنے مریض آیا کریں گے کہ میں مریضوں کو سنبھالوں گی یا تمہارے بچے کو؟"

"بڑی مصیبت ہے' تو پھر بچہ کیا بڑھاپے میں ہو گا؟"

"سوچا جائے گا' دیکھا جائے گا' ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ کام کی باتیں سوچا کرو۔ آمدنی بڑھانے کی باتیں سوچا کرو۔ یہ سوچو کہ یہاں بڑا سا مکان کیسے بن سکتا ہے۔ چھوٹی سی ڈسپنسری کیسے بن سکتی ہے۔ ہمارے پاس ایک ٹیکسی ہے۔ پانچ ٹیکسیاں کیسے ہو سکتی

ہیں۔"

"مجھے فکر ہے کہ پانچ بچے کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ رمضو ڈرائیور ہے نا۔ اس کے یہاں چار بچے ہیں۔ میں اس سے کسی طرح کم ہوں کیا۔ میرے یہاں ایک زیادہ ہونا چاہیے نا؟"

اس بحث و تکرار میں رخسانہ کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ وہ امتحان کا آخری پرچہ دے رہی تھی کہ اچانک ہی اس کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ متلی سی محسوس ہوئی پھر وہ پرچہ ادھورا چھوڑ کر اجازت لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ وہاں سے واپس آئی تو ایک دم نڈھال سی تھی۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ پسینا پسینا ہونے لگی۔ وہ کسی طرح ہمت سے کام لے کر اس آخری پرچے سے گزرنا چاہتی تھی۔ اپنا آخری سال ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ہمت جواب دے رہی تھی۔ اندر سے بری طرح طبیعت گھبرا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ چاروں شانے چت لیٹی رہے۔ لیڈی ایگزامنر نے قریب آکر پوچھا "کیا بات ہے۔ کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے آہستگی سے کہا "شاید میں ایڈوانس اسٹیج میں ہوں۔ امتحان ہال سے نکلنے کے بعد اپنا چیک اپ کراؤں گی۔ فی الحال تو میں تھوڑی سی مہلت چاہتی ہوں۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میری کیا حالت ہو گی۔"

لیڈی ایگزامنر نے اس کی پیٹھ تھپک کر اسے تسلی دی' پھر اسے آرام کرنے کے لیے ایک طرف جانے کی اجازت دی۔ اس سے کہا "آرام کرو' وقت ختم ہونے کے بعد بھی تمہیں آدھا گھنٹہ مزید دیا جائے گا۔"

اس نے میز پر کہنیاں ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ نگاہوں کے سامنے میز پر کاپی کھلی ہوئی تھی۔ ایک طرف قلم رکھا ہوا تھا۔ سارے کاغذ پر بادشاہ جانی کا مسکراتا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ابھی بچہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بڑے بڑے سپنے دیکھے تھے۔ مستقبل کے لیے محل تعمیر کر رہی تھی۔ بچہ ابھی رکاوٹ بن جاتا۔ اس لیے اسے بچے کی خواہش نہیں تھی لیکن اب ایسی حالت میں آنکھوں کے سامنے بادشاہ جانی مسکرا رہا تھا۔ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اڑ کر جائے اور اپنے جانی کی آغوش میں چھپ کر یہ خوش خبری سنا دے۔

شام کو بادشاہ جانی نے سنا تو مارے خوشی کے رخسانہ کو دونوں بازوؤں میں اٹھالیا۔ سارے گھر میں یہاں سے وہاں تک ناچتا پھرا۔ گنگناتا رہا اور بچے کا نام تجویز کرتا رہا۔ رخسانہ نے کہا "خدا کے لیے مجھے نیچے اتارو۔ یہ کیا کررہے ہو۔"

وہ کچھ نہیں کررہا تھا۔ خوشی سب کچھ کررہی تھی۔ وہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر مستری چاچا کے گیرج میں پہنچ گیا۔ ٹیکسی سے نکل کر فوراً ہی دوڑتا ہوا مستری چاچا کے سامنے آیا پھر بلند آواز سے تمام مزدوروں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "ابے' سب کام چھوڑ دو۔ ادھر آؤ' منہ میٹھا کرو۔ میں باپ بن گیا ہوں۔"

یہ بات سنتے ہی سب ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ مستری چاچا اسے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ بادشاہ جانی نے ایک گلاب جامن ان کے کھلے ہوئے منہ میں رکھ دی۔

وہ جلدی سے گلاب جامن کو منہ سے نکالتے ہوئے بولے "یہ کیا بے ہودگی ہے' تیری شادی کو تو ابھی پانچواں مہینہ ہے تو باپ کیسے بن گیا؟"

"واہ چاچا' کیوں نہیں بن سکتا۔ آج ہی تو رخسانہ نے کالج سے آکر بتایا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ ہاں اس کے پاؤں سخت ہوگئے ہیں۔"

"ابے سخت نہیں' بھاری ہوگئے ہیں۔"

"ہاں وہی۔ اب نو مہینے کے بعد ہمارے ہاں ننھا منا سا' پیارا پیارا سا بیٹا ہوگا۔"

مستری چاچا نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اچھا تو ایسے بول نا کہ بچہ ہونے والا ہے اور جب ہونے والا ہے تو ابھی سے باپ کیسے بن گیا۔"

"کیسے نہیں بنا؟ جب میری عورت نے بچے کا بندوبست کردیا ہے تو پھر میں باپ بن گیا۔ چاچا' یہ دنیا والوں کا حساب کتاب بہت ہی الٹا ہوتا ہے۔ جس دن بچہ پیدا ہوتا ہے' اس دن سے اس کی عمر جوڑنا شروع کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کے نو مہینے کو بھول جاتے ہیں جب کہ وہ پیدا ہونے والا نو مہینے پہلے اپنا پتا بتا رہا ہے اس لحاظ سے ہم کو اپنی عمر پیدائش کے وقت سے نہیں بلکہ وہ نو مہینے اور جوڑ کر بتانا چاہیے اب چاچا بتاؤ تو تمہاری عمر کیا ہے؟"

مستری چاچا نے کہا "میری عمر اس وقت پچاس برس ہے۔"

"یہی غلطی ہوگئی نا۔ اس وقت تمہاری عمر پچاس برس نو مہینے ہے اور اس وقت میری عمر اٹھائیس برس نو مہینے ہے۔ کیوں چھوٹے تیری عمر کیا ہے؟"

مستری چاچا نے اس کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ لے کر کہا "بس بس تیرے ساتھ مٹھائی کھائی جاسکتی ہے۔ دماغ نہیں لڑایا جاسکتا۔ آؤ رے لڑکو! شروع ہوجاؤ۔"

بادشاہ اب دن رات گننے لگا۔ اس کا وقت ایسی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا جیسے رکشا' ٹیکسی کا میٹر چل رہا ہو۔ رخسانہ اس کے بازوؤں میں منہ چھپا کر سوتی تھی اور صبح پریکٹیکل کے لیے جاتے وقت اس کے چہرے کو خوب جی بھر کر دیکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتی تھی۔ وہ پوچھتا "تم مجھے اتنا کیوں چاہتی ہو؟ میرے چہرے کو اتنا کیوں دیکھتی ہو؟"

"اس لیے دیکھتی ہوں کہ ہمارا منا بھی بالکل ایسا ہی ہو۔ بالکل ایسا ہی ناک نقشہ' ایسا ہی مردوں کی طرح دل میں اتر جانے والا چہرہ' تم نہیں جانتے' اگر عورت ماں بننے والی ہو اور وہ کسی صورت کو اپنے دل ودماغ میں نقش کرتی رہے تو بچہ ویسا ہی ہوتا ہے۔"

بادشاہ نے اچانک ہی گھبرا کر پوچھا "یہ تو بتاؤ' ہمارا بچہ پورا کا پورا ہوگا نا؟"

"یہ کیسا بے تکا سوال ہے؟"

"دیکھو نا' ڈر لگتا ہے۔ ہم شادی سے پہلے بھی آدھے چہرے والی بحث کرچکے ہیں۔ شادی کے بعد تمہارے ساتھ ایسا ہوگیا۔ اگر ہمارا بچہ' بھی آدھے چہرے والا....."

رخسانہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر بولی "خدا نہ کرے' ایسا ہو' انشاءاللہ وہ بہت ہی اچھا ہوگا۔ ہمارے خوابوں سے بھی زیادہ اچھا۔"

○☆○

شادی کو ایک برس گزر گیا۔ رخسانہ نے ایک دن اپنے بینک کا حساب دیکھتے ہوئے کہا "دیکھو جانی' تم نے پانچ برس میں..... مستری چاچا کے پاس ساڑھے بارہ ہزار روپے جمع کیے تھے جب کہ میں نے ایک سال میں پندرہ ہزار روپے جمع کرلیے ہیں۔ اب میں اس پلاٹ کے چاروں طرف دیوار اٹھاؤں گی اور ایک چھوٹے سے اسپتال کی چار دیواری بھی اٹھے گی۔"

بادشاہ جانی نے پوچھا "ابھی زچگی کو کتنا ٹائم ہے؟"

"دو مہینے باقی ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم چار چھ مہینے تک بچے کے ساتھ لگی رہو گی۔ ڈسپنسری میں بیٹھ کر ڈاکٹری نہیں کرسکو گی' پھر ابھی سے یہاں پیسے پھنسانے سے کیا فائدہ۔ تمہارے پاس پندرہ ہزار ہیں۔ میں مستری چاچا سے دس ہزار ادھار مانگوں گا تو وہ دے دیں گے۔ پچیس ہزار میں ہم ایک ٹیکسی قسطوں پر خرید سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے پاس دو ٹیکسیاں ہو جائیں گی۔"

رخسانہ خوشی سے کھل گئی پھر بولی "واہ جانی' تم نے کتنی عقل مندی کی بات کی ہے۔ بس فوراً ہی مستری چاچا سے دس ہزار مانگو اور دوسری ٹیکسی لو۔ یہ تو بالکل چلتا ہوا کاروبار ہے۔ آمدنی روز کی روز آتی ہے۔"

دو ہفتے کے اندر دوسری ٹیکسی بھی آگئی۔ بادشاہ جانی نے پوچھا "کیا اس دوسری کے لیے بھی ڈرائیور رکھا جائے گا؟"

رخسانہ نے کہا "نہیں ایک گاڑی تم چلاؤ۔"

"اور وہ تمہارے خاندان والے' وہ اونچی سوسائٹی والے کیا بولیں گے؟"

"بولنے دو۔ تم کوئی چوری تو نہیں کر رہے ہو۔ کوئی گرا ہوا کام تو نہیں کر رہے ہو۔ ٹیکسی چلاتے ہو۔ اپنی ٹیکسی چلاتے ہو۔ اپنی کمائی کرتے ہو اور شان سے کرتے ہو۔ کسی کے غلام بن کر نہیں کرتے' پھر کسی سے کیا ڈرنا؟ ہمیں صرف اپنی بڑھتی ہوئی آمدنی کو دیکھنا چاہیے۔"

بادشاہ جانی ہنسنے لگا' جب حالات بدلتے ہیں تو نظریات بھی بدل جاتے ہیں۔ جب پیسہ چاروں طرف سے آنے لگتا ہے تو چھوٹے کام میں بھی عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ سماجی طور طریقے بدل جاتے ہیں۔ اونچ نیچ کا فرق کچھ اور ہو جاتا ہے۔ جو نیچ ہوتا ہے' وہ اونچ کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کا ہر کام اونچا ہو جاتا ہے۔ اتنا اونچا کہ اونچے کلاس کی لڑکی بیوی بن جاتی ہے۔ بادشاہ جانی کو ہنسی آگئی تھی۔

وہ دو مہینے بھی گزر گئے۔ زچگی کا وقت قریب آگیا۔ ایک بار رخسانہ بڑی تکلیف میں مبتلا ہوئی ایسا درد اٹھا کہ فوراً ہی اسپتال لے جانا پڑا۔ نارتھ ناظم آباد کے میٹرنٹی ہوم میں رہی پھر تکلیف کم ہو گئی پھر اسے وہاں سے چھٹی دے دی گئی۔

ایسا دوبارہ ہوا۔ دوبارہ بڑی شدت سے تکلیف میں مبتلا ہوئی۔ بادشاہ کی ساس نے بھی کہا کہ اب ضرور زچگی ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ زچگی کے سلسلے میں سبھی لوگوں کو بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔ بادشاہ اپنی ایک ٹیکسی ہمیشہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی رکھتا تھا کہ پتا نہیں کس وقت ضرورت پیش آجائے۔ جب وہ ٹیکسی لے کر نکلتا تو دوسری ٹیکسی وہاں موجود رہتی اور مستری چاچا کا حکم ہوتا کہ گیرج کا کوئی نہ کوئی آدمی اس دوسری ٹیکسی کے ساتھ موجود رہے۔

بادشاہ کی حالت عجیب تھی۔ وہ رخسانہ کی حالت کو دیکھ کر پریشان بھی ہوتا تھا اور اندر ہی اندر باپ بننے کی خوشی بھی ہوتی تھی۔ اس کے دماغ میں اوٹ پٹانگ سی باتیں آتی تھیں۔ مثلاً اگر اللہ میاں نے پوچھا کہ دو میں سے کوئی ایک چیز پسند کرو۔ بچہ چاہتے ہو یا رخسانہ کو؟ تب وہ کیا جواب دے گا۔ وہ گھبرا جاتا تھا۔ فوراً ہی کان پکڑ کر کہتا تھا۔ اللہ میاں ایسے امتحان میں نہ ڈالنا۔ رخسانہ میری محبت ہے' میں نے اسے کتنی چاہت سے اپنایا ہے پھر وہ میرے بچے کی ماں بنے گی۔ ہم تین ہو جائیں گے۔ ہم تینوں کا رشتہ اتنا مضبوط رہے گا کہ تیرے سوا اسے کوئی نہیں توڑ سکے گا۔ یا اللہ ہم میں سے کسی کو نہ توڑنا۔"

وہ شام کو ٹیکسی لے کر چلا تو رخسانہ ہلکے ہلکے سے درد میں مبتلا تھی۔ اس نے کہا "کہو تو میں رک جاؤں۔"

وہ بولی "نہیں تم جاؤ۔ یہاں تو گیرج کا ایک لڑکا موجود رہتا ہے۔ زیادہ تکلیف ہوئی تو میں دوسری ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔ تم اپنا خیال رکھو۔ ہو سکے تو جلدی آجانا۔"

وہ ٹیکسی لے کر نکلا پھر ادھر ادھر کی سواریاں اٹھانے لگا۔ اس کے دماغ میں رخسانہ اور اس کا ہونے والا بچہ اس قدر سمایا ہوا تھا کہ کوئی بچے والی سواری ملتی تو وہ اس سے کرایہ نہیں لیتا تھا یا پھر میٹر سے کم کرایہ لے کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس نے ایمپریس مارکیٹ پہنچ کر ایک جگہ ٹیکسی کھڑی کر دی۔ ایک ٹریفک پولیس والے نے آکر سخت لہجے میں پوچھا "کیوں' یہ گاڑی کھڑے کرنے کی جگہ ہے؟"

بادشاہ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک روپے کے دو نوٹ نکالے اور اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "سنتری بادشاہ' یہ سامنے والے ہوٹل میں چائے پینے جا رہا ہوں۔

اس کے بعد گاڑی یہاں سے لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ سڑک پار کرتے ہوئے اس چائے خانے کی طرف جانے لگا۔ سڑک پار کرتے ہی وہ ایک رکشے کی طرف دیکھ کر ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ رکشے کی پچھلی سیٹ پر رخسانہ بیٹھی ہوئی تھی۔

کون رخسانہ؟

وہی رخسانہ جو شادی سے پہلے اس کی ٹیکسی میں آکر بیٹھی تھی۔ وہی رخسانہ جس کے لیے اس نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پھولوں کی پنکھڑیاں بکھیر دی تھیں۔ وہی رخسانہ جس کے لیے اس نے ٹیکسی کو خوشبوؤں کی جنت بنا دیا تھا۔ وہی رخسانہ اس وقت رکشے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آس پاس لوگوں کی بھیڑ تھی۔ رکشا ٹریفک کے ہجوم سے گزرنے ہی والا تھا اور اس کے قریب سے گزر بھی چکا تھا۔ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا دوڑتا ہوا رکشے کے آگے پہنچ گیا تاکہ اپنی آنکھوں پر یقین کرلے اور پہلے اچھی طرح اطمینان کرلے کہ وہ اسی رخسانہ کو دیکھ رہا ہے۔ یقین اس لیے نہیں آرہا تھا کہ ایک رخسانہ تو اس کی بیوی تھی اور اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی پھر وہی رخسانہ رکشے کی پچھلی سیٹ پر آکر کیسے بیٹھ سکتی تھی۔

ہاں، دونوں میں فرق تھا۔ اس کی محبوبہ رخسانہ کا جو چہرہ شادی کے بعد گم ہوگیا تھا، وہ اب ایک سال دو مہینے کے بعد رکشے کی پچھلی سیٹ پر نظر آرہا تھا۔ وہ جب تک غور کرتا، دوسری بار تصدیقی نظروں سے دیکھتا، اس وقت تک رکشا پھر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ ٹریفک کی زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ وہ تیزی سے بھاگنے لگا۔ اس نے چیخ کر آواز دی۔ "رخسانہ رک جاؤ، رخسانہ میں بادشاہ جانی ہوں۔ ادھر دیکھو۔"

اس کی آواز ادھر تک یقیناً گئی تھی۔ رکشے کی پچھلی کھڑکی کا پردہ اٹھا ہوا تھا اور رخسانہ اپنی سیٹ پر پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رکشا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، اسے دور اور دور کرتا جارہا تھا۔ اس رخسانہ کے چہرے پر ہلکی سی حیرانی، پریشانی اور جانے کیا کچھ نظر آیا۔ اس ایک لمحے میں بادشاہ جانی اس کے چہرے کو پوری تفصیل سے پڑھ نہیں سکتا تھا۔

وہ دوڑنے لگا کسی کو دھکے مار کر آگے بڑھنے لگا۔ کسی سے دھکے کھا کر پیچھے ہٹنے لگا۔

رکشا تیزی سے دور ہوتا جارہا تھا۔ وہ برابر اسے پلٹ کر دیکھے جارہی تھی۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں گھر کر رہ گیا تھا۔ ایک شخص نے اسے جھنجوڑ کر کہا "ابے کیا اندھے ہوگئے ہو۔ دیکھ کر نہیں چلتے۔"

وہ اندھا تھا۔ اپنی جان کے سوا کسی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دیوانہ تھا، کسی سے لڑنا نہیں جانتا تھا۔ صرف آگے بڑھنا چاہتا تھا اور دنیا والے اسے آگے نہیں بڑھنے دے رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ انسانوں کے سمندر میں گھر گیا ہے۔ نہ تیر کر پار ہو سکتا ہے اور نہ ڈوب کر رکشے تک پہنچ سکتا ہے۔

پھر بھی وہ آگے بڑھتا رہا۔ تیزی سے چلتا رہا۔ جہاں دوڑنے کی جگہ ملتی، وہاں دوڑنے لگتا۔ رکشا آگے جاکر دوسری سڑک پر مڑ گیا تھا۔ وہ بھی ادھر مڑ گیا لیکن اتنی گاڑیاں چل رہی تھیں کہ رکشا نظر نہیں آرہا تھا۔ اب وہ فٹ پاتھ پر تیزی سے چلتا جارہا تھا پھر خیال آیا کہ وہ واپس جائے اور اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کا تعاقب کرے لیکن ٹیکسی بہت دور تھی۔ جب تک وہ وہاں جاکر، اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر تعاقب کرنے کے لیے وہاں تک آتا، اس وقت تک وہ رکشا پتا نہیں کہاں چلا جاتا۔ کس راستے پر نکل جاتا اور اس وقت بھی وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک جگہ رک کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اس وقت اس کے اندر ایسا اضطراب اور ایسی دیوانگی تھی کہ وہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ چیخ چیخ کر تمام لوگوں سے کہنا چاہتا تھا۔ لوگو آواز دو اسے، سب مل کر آواز دو۔ ایک آواز ہوکر اس سے کہو کہ اس کا دیوانہ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ ایک سال دو مہینے سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ ایک مدت سے اس کی خاطر دھوکا کھا رہا ہے۔ وہ واپس آجائے۔ آواز دو لوگو، آواز دو۔

اس کے اندر شور مچا ہوا تھا۔ وہ اپنے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر دانت جمائے ایک طرف دیکھے جارہا تھا۔ کچھ لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک بزرگ نے دور سے کہا "معلوم ہوتا ہے، اس پر کسی قسم کا دورہ پڑا ہے۔ اسے ایک طرف فٹ پاتھ پر پہنچا دینا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ گاڑی کی زد میں آجائے۔"

اس نے بولنے والے کو گھور کر دیکھا پھر ایک دم سے پلٹ کر ایمپریس مارکیٹ کی طرف بھاگنے لگا۔ اب وہ اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے

راستہ بھی دشوار گزار تھا۔ آدمی پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنالیتا ہے لیکن انسانوں کے درمیان سے گزرنا آسان نہیں ہوتا۔ جب وہ ٹیکسی کے پاس پہنچا تو کافی دیر ہوچکی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے گاڑی اسٹارٹ کی، وہاں سے ڈرائیو کرتا ہوا پھر اس راستے پر آیا جہاں رکشا مڑا تھا۔ وہاں سے ون وے راستے کی مناسبت سے گاڑی کو دوسرے راستے پر موڑلیا۔ وہ آہستہ آہستہ ڈرائیو کررہا تھا اور سڑک کے دونوں طرف دیکھتا جارہا تھا۔ شاید وہ رکشا کہیں رک گیا ہو۔ شاید رخسانہ کہیں نظر آجائے۔

پہلے خوش فہمی تھی کہ وہ پھر نظر آجائے گی پھر وہ خوش فہمی دم توڑ گئی۔ اس کے بعد امید نے جگہ لی اور امید تو زندہ رکھ کر آخری سانس تک دوڑاتی ہے۔ وہ صدر کے پورے علاقے میں جہاں جہاں سڑکوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور جن گلیوں سے ٹیکسی گزر سکتی تھی، ہر جگہ اسے تلاش کرتا رہا۔ حتیٰ کہ دوکانیں بند ہوگئیں۔ لوگوں کا ہجوم غائب ہوگیا۔ آہستہ آہستہ سناٹا چھانے لگا، پھر وہ ایک جگہ ٹیکسی روک، اپنا سر اسٹیئرنگ پر ٹیک کر آنکھیں بند کرنے کے بعد جیسے اپنے اندر مرگیا۔

بند آنکھوں کے پیچھے رخسانہ کا مکمل ماہتابی چہرہ تھا اور اس چہرے کے مقابل دوسری رخسانہ کا آدھا چہرہ دیکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہورہا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "میں کہاں ہوں، کیا میں زندہ ہوں یا میری لاش پڑی ہوئی ہے۔ ادھر وہ لیڈی ڈاکٹر رخسانہ اور ادھر یہ لیڈی ڈاکٹر رخسانہ، دونوں ہی میری لاش کو چیر پھاڑ کر کھیل رہی ہیں۔ یہ کیسا درندگی کا کھیل ہے۔ یہ مجھ سے کیا حاصل کرنا چاہتی ہیں؟ کیوں مجھے تماشا بنا رکھا ہے؟"

وہ رکشے میں بیٹھی ہوئی رخسانہ کو تصور میں دیکھنے لگا۔ جس طرح وہ رکشے کی پچھلی کھڑکی کی طرف سے اسے گھوم کر، پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز سن رہی تھی۔ اس سے دور ہوتی جارہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر دور ہوتی چلی گئی۔ چاہتی تو وہ رکشے والے کو روک سکتی تھی۔ اس نے بادشاہ جانی کو بھلایا نہیں تھا۔ اچھی طرح یاد رکھا تھا، اس لیے پلٹ پلٹ کر دیکھنے کا رشتہ اب بھی قائم تھا۔

حقیقتاً ایک چور رشتہ قائم تھا کیونکہ وہ نظروں سے اوجھل ہونے تک پلٹ کر دیکھتی رہی تھی۔ اس کی زبان بند تھی لیکن دل جیسے پکار رہا تھا۔ وہ رکنا چاہتی تھی، رکشا والا بھی

رک سکتا تھا، لیکن تقدیر اسے اغوا کرکے لے جارہی تھی۔

نہیں، تقدیر نے کچھ نہیں کیا، اس آدھے چہرے والی رخسانہ نے اس کی محبت کا اسٹیئرنگ موڑ کر اپنی طرف کرلیا تھا۔ کتنی زبردست فریبی اور مکار ہے۔ اتنے عرصے تک کتنی خوب صورتی سے دھوکا دیتی رہی۔ رخسانہ نہیں تھی لیکن رخسانہ بنی رہی۔ مستری چاچا جیسے تجربہ کار بوڑھے شخص نے بھی دھوکا کھایا، اور تو اور، اس آدھے چہرے والی کی ماں، اس کا باپ، اس کا سارا خاندان، سب کے سب کتنی چالاکی سے اپنی شرافت دکھاتے رہے۔

اس نے آنکھیں کھول دیں، اسٹیئرنگ پر سے سر اٹھا کر اپنے آس پاس دیکھا، رات دور تک اندھی محبت کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ سچ ہے، محبت اندھی نہ ہوتی تو وہ دور نکل جانے والی رخسانہ کو اب تک ڈھونڈ نکالتا۔ اب اسے آدھے چہرے والی رخسانہ کے ڈھونگ کا علم ہوگیا تھا اور اس کی پرفریب باتوں پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھا، پھر گاڑی کو اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادیا۔ رات کے وقت سڑکیں تقریباً سنسان تھیں۔ وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا ناگن چورنگی کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن گرومندر کے شراب خانے کے پاس گاڑی روک دی۔ مستری چاچا نے کئی بار نصیحت کی تھی، جانی نشہ نہ کیا کر، یہ بری لعنت ہے۔ آدمی دین سے بھی جاتا ہے اور دنیا سے بھی۔

نصیحت کا اثر ہوتا تو آدم سے پہلی غلطی کبھی نہ ہوتی۔ بادشاہ جانی سے نصیحت نے نہیں، رخسانہ کی محبت نے نشہ چھڑایا تھا۔ اب وہ پھر نشے کے لیے شراب خانے کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے باہر مال سپلائی کرنے والے چھوکرے سے ایک پوا منگوایا، پھر شروع ہوگیا۔

جب کچھ سرور آنے لگا تو بھولی ہوئی باتیں بھی یاد آنے لگیں۔ شادی سے پہلے جب وہ دو دنوں تک رخسانہ سے ملتا رہا تھا تو دوسرے اور آخری دن رخسانہ کچھ بدلی بدلی سی تھی، اداس تھی، اندر کسی غم اور صدمے کو چھپائے ہوئے تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کالج سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد کہا تھا۔ کہیں بھی لے چلو، اتنی دور لے چلو کہ آج کی ملاقات ختم نہ ہوسکے۔ اس نے ایسا کیوں کہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ

ملاقات آخری ملاقات ہے اور وہ اس ملاقات کو ختم نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

اس نے ایک پورا پوا حلق سے اتار لیا' بوتل خالی کر دی۔ اب سر گھوم رہا تھا۔ دنیا گھوم رہی تھی۔ رات چپ چپ سسک رہی تھی۔ ہاں اسے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنی بازو والی سیٹ کی طرف دیکھا تو وہاں رخسانہ بیٹھی ہوئی آنچل میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا "کیوں رو رہی ہو؟ ہم تو شادی کے بعد ہمیشہ کے لیے مل جائیں گے۔"

مگر وہ جواب نہیں دے رہی تھی۔ کیسے جواب دیتی؟ اسے معلوم تھا' وہ ملاقات کا آخری دن ہے' اس کے بعد پھر کبھی نہیں مل سکے گی۔ شادی کے بعد دلہن بدل جائے گی۔ یہ بات وہ پہلے سے ہی جانتی تھی۔ جانی کو بعد میں رونا تھا اور اب بعد میں وہ رو رہا تھا۔

"مجھے کیوں رلا رہی ہو' کیوں مجھ سے دور بھاگ رہی ہو رخسانہ؟ آہ' مگر تمہارا نام رخسانہ ہے بھی یا نہیں۔ نہیں' تمہارا نام رخسانہ نہیں ہونا چاہیے۔ رخسانہ اس فریب کا نام ہے جو ایک برس دو مہینے سے میرے گلے میں کتے کے پٹے کی طرح بندھا ہوا ہے۔ میں کتا ہوں۔ میں آدھے چہرے والی رخسانہ کی مٹھی میں بند ہوں اور ساری عمر کتے کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا رہوں گا۔"

اس نے اسٹیئرنگ پر ایک زور کا گھونسا مارتے ہوئے کہا "نہیں! میں غلام نہیں ہوں۔ کیا ہوا اگر اس نے شادی سے پہلے سب کچھ اپنے نام لکھوالیا مگر وہ مجھے خرید نہیں سکے گی' میں اسے طلاق دے دوں گا۔ اگر وہ طلاق نہیں لے گی اور میں پچاس ہزار ادا نہیں کر سکوں گا تو اسے قتل کر دوں گا۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی' غصے سے گیئر بدلا' پھر ایک جھٹکے سے گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کی رفتار طوفانی کرتا گیا' اب وہ جلد سے جلد اس فریبی' مکار اور آدھے چہرے والی شہ رگ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر جو آگ لگی ہوئی تھی' وہ خون کے چھینٹوں سے ہی بجھ سکتی تھی۔

وہ تلملا رہا تھا' اسٹیئرنگ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں بہک رہا تھا۔ وہ کشادہ سڑک پر گاڑی کو کبھی دائیں اور کبھی بائیں لے جاتا تھا پھر غصے کے باوجود چونک کر' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس

سنبھلنے کے دوران دماغ نے سمجھایا کہ جاتے ہی اسے قتل کرو گے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا' پہلے تو اس سے حقیقت اگلوانی چاہیے۔

اس نے زور سے کہا "میں جاتے ہی اس کی گردن دبوچ لوں گا اور پوچھوں گا "بتا تو میری محبت کا گھونگٹ اوڑھ کر کیوں آئی تھی' اس گھونگٹ کے پیچھے تو نے میری رخسانہ کو کیوں مار دیا۔ تیرا نام رخسانہ نہیں ہے اور اگر تیرا نام رخسانہ نہیں ہے تو پھر میری محبت کا نام کیا تھا۔ تو نے اس کا نام' اس کا نشان سب کچھ میرے سامنے سے ہٹا دیا۔ بتا وہ کہاں ہے' کون ہے' اس سے تیرا کیا رشتہ ہے کہ اس نے تیرے لیے اپنی محبت کو اور اپنی خوشیوں کو' اپنے مستقبل کو' اپنے جذبوں کو اور اپنی جنت کو' جو میں نے اس لیے پھولوں اور خوشبوؤں سے بنائی تھی' سب کو ٹھکرا دیا۔ اس نے کیوں ایسا کیا؟"

ٹیکسی تیز رفتاری سے وہ علاقے عبور کر چکی تھی جہاں ٹریفک سگنل ہوتے ہیں۔ وہ تمام سگنل رات کے وقت سرد پڑ چکے تھے' اب وہ نارتھ ناظم آباد کے علاقے سے گزر رہا تھا جہاں کسی چوراہے پر ٹریفک سگنل نہیں ہوتے۔ اس کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں تھی' ٹریفک کی بھیڑ نہیں تھی۔ وہ بڑی آسانی سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا اور منصوبے بھی بناتا جا رہا تھا۔ منصوبے کو بدلتا بھی جا رہا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ آدھے چہرے والی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا' اپنے سامنے اس کا سانس لینا بھی برداشت نہیں ہوگا۔ جی تو بس یہی چاہتا تھا کہ جاتے ہی اسے قتل کرے بلکہ تڑپا تڑپا کر قتل کرے۔ باقی جو جھوٹ اور فریب کا حساب کتاب ہوتا ہے' وہ سب عدالت میں ہوتا رہے۔

وہ اپنے علاقے میں پہنچ گیا۔ دور سے اس کا گھر نظر آ رہا تھا۔ چاند نکل آیا تھا۔ اجلی اجلی سی چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور پورے علاقے کو روشن کر رہی تھی۔ اس کے پلاٹ کے احاطے میں اس کی دوسری ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ شاید کوئی خرابی ہوگئی تھی۔ بادشاہ جانی نے جیسے ہی ٹیکسی روکی' چھوٹو نے دوڑتے ہوئے آکر کہا "بادشاہ جانی' بہت اچھے وقت پر آئے ہو۔ بھابی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ تمہاری ساس کہہ رہی تھی کہ اسپتال نہیں پہنچایا جائے گا تو جان جانے کا خطرہ ہے۔"

بادشاہ نے چھوٹو کو ایک طرف دھکا دے کر کہا "مرنے دو کتیا کو' میں تو اسے مارنے ہی آیا ہوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے مکان کے احاطے میں داخل ہوا۔ ٹیکسی کی آواز سن کر اس کی ساس کمرے سے نکل آئی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی اس نے روتے ہوئے کہا "ہائے میں لٹ رہی ہوں' میری بچی کی زندگی خطرے میں ہے اس کے لیے کچھ کرو بیٹے۔"

بادشاہ نے برآمدے میں پہنچ کر پوچھا "وہ کتنی دیر میں مرجائے گی؟"

اس کی ساس نے پہلے تو چونک کر اسے دیکھا پھر غصے میں کہا "کیا بکتے ہو؟ تم اپنی بیوی' اپنے بچے کے لیے ایسی باتیں کررہے ہو؟"

بادشاہ اسے دھکیلتے ہوئے دیوار کی طرف لے گیا۔ دیوار سے اسے لگا کر بولا "بڑھیا میں تجھے زندہ رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ عدالت میں تجھ سے حساب کرنا ہے' ابھی میں تیری بیٹی کو قتل کرنے آیا ہوں اور اب سن رہا ہوں کہ وہ خود مررہی ہے۔ میرے ساتھ تو بھی تماشا دیکھ کہ قدرت کیسے انتقام لیتی ہے۔"

وہ گڑگڑا کر بولیں "بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو۔ دیکھو ایسے وقت تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں' ان کے دل بھی موم ہوجاتے ہیں۔ وہ تمہاری بیوی ہے' تم چاہو تو اسے مار ڈالنا مگر ابھی بچالو۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ ٹیکسی میں اسپتال تک لے جایا جاسکے کہیں سے اچھی لیڈی ڈاکٹر یا دائی کو بلالاؤ بیٹے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیسے سنبھالوں' کیسے اس کی تکلیف دور کروں۔"

کمرے کے اندر سے رہ رہ کر کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ درد کی شدت سے چیخنے لگتی تھی۔ اس کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی آواز کا گلا خود ہی گھونٹنا چاہتی ہے۔ شرم کے مارے' وہ رونا نہیں چاہتی' اپنی آواز کمرے سے باہر نہیں پہنچانا چاہتی مگر تکلیف اتنی ہے کہ وہ اسے برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔

بادشاہ نے اپنی ساس کو چھوڑ دیا' پھر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "دیکھو یہ یہیں تڑپتی رہے گی' زچگی ہو یا نہ ہو' مرجائے' نہ مجھے اس کی ضرورت ہے' نہ اس سے پیدا ہونے والی اولاد کی ضرورت ہے۔ میری محبت کو چھیننے والی' میرا گھر لوٹنے والی بڈھی چڑیل! میں دیکھوں گا کہ تیری کوکھ کیسے اجڑتی ہے' تیری آنکھوں کے سامنے تیری جوان بیٹی کیسے دم توڑتی ہے۔"

اس وقت اندر سے رخسانہ کی چیخ سنائی دی' اس کی ماں ایک دم سے تڑپ کر وہاں سے دوڑتے ہوئے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بادشاہ جانی نے دیوانہ وار قہقہہ لگایا "ذلیل مررہی ہے' مجھے اب تک دھوکا دیتی رہی' آج یہ اپنی سزا کو پہنچ رہی ہے۔"

وہ ہنستا ہوا برآمدے سے اتر گیا۔ اپنے مکان کے احاطے میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر جانے لگا۔

اب اندر سے رخسانہ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کیونکہ وہ دور تھا پھر اس نے سوچا کہ جب ظلم کرہی دیا ہے تو مظلوم کی آہیں بھی سننی چاہئیں۔ جب تک مظلوم کی آہوں اور کراہوں کو نہ سنا جائے' ظلم کرنے کا مزہ نہیں آتا۔ پتا تو چلے کہ وہ حالات کی چھری تلے کیسے تڑپ رہی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اب اندر سے آوازیں سنائی دینے لگی تھی۔ وہ رہ رہ کر کراہ رہی تھی۔ تکلیف سے چلا رہی تھی۔ تکلیف سے پکار رہی تھی "جانی! کہاں ہو تم؟ آجاؤ' میرے پاس آجاؤ۔ تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا کہ اچھے اور برے وقت میں میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ میرا ہاتھ پکڑے رہو گے۔ دیکھو میں خالی ہاتھ ہوں' مجھے پکڑلو۔ مجھے سہارا دو۔ مجھ سے کہو کہ میں تمہارے لیے ایک بیٹے کو جنم دوں گی۔ میں زندہ رہوں گی اور اسے اپنا دودھ پلاؤں گی' اپنی گود میں کھلاؤں گی۔ تمہارے بیٹے کو جوان کروں گی۔ میری جوانی ایک دھوکا ہوسکتی ہے مگر تمہاری اولاد کے بچپن سے جوانی تک میں خوب محنت کروں گی' اسے تعلیم و تربیت دوں گی۔ اپنی جوانی اس پر قربان کردوں گی تو اس میں کوئی دھوکا' کوئی بے ایمانی نہیں ہوگی۔ کوئی ماں اپنی اولاد کے حوالے سے اس کے باپ کو دھوکا نہیں دیتی۔ آجاؤ جانی آجاؤ' میرے پاس۔"

رخسانہ نے کراہتے ہوئے اور فریاد کرتے ہوئے اچانک ہی زور کی چیخ ماری' وہ ایک دم سے دہل گیا۔ اگرچہ وہ ظالم بنا ہوا تھا' تاہم یہ نہ سمجھ سکا کہ محبت کی کوکھ سے نکلی ہوئی چیخ کیسے دہلا دیتی ہے۔ رخسانہ کی وہ چیخ بجلی کی طرح کوند کر دل میں روشن ہوگئی۔ انسان محض مظلومیت سے نہیں چیختا' محبت سے بھی چیختا ہے۔ رخسانہ کی کراہتی ہوئی سرگوشی اس کے کانوں میں کہہ رہی تھی "میری چیخ کو سمجھو۔ یہ چیخ ایک سہاگن کی سیج سے ابھری تھی اور اب تخلیق کے بستر پر تڑپ رہی ہے۔ یاد کرو' جب تم نے پہلی بار میری کلائی

کو پکڑا تھا تو میری ریشمی باہیں چیخ رہی تھیں۔ تم نے میرے مکھڑے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیا تھا تو میری جھکی جھکی شرمیلی نظریں چیخ رہی تھیں۔ تم نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک مانگا تھا تو میں سراپا قبولیت سے چیخ رہی تھی۔ ایک سال دو مہینے کے ہر لمحے میں، میری وفا اور میری خدمت گزاری تمہارے نام پر چیختی رہی۔ میرے پیار کو سمجھو، شادی سے پہلے تو یقیناً جھوٹ اور فریب کا سلسلہ تھا لیکن میرے بادشاہ جانی!

ننھے بچے نے چیخ کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ یکبارگی چاندنی اور نکھر گئی۔ رات کا چہرہ دھل گیا، ماحول کا مزاج بدل گیا۔ پہلے اس ماحول پر نوحہ خوانی کا تسلط تھا، اب وہاں بچے کی پرمسرت چیخیں تھیں، وہ رو رہا تھا۔ ہاں، رونا بھی مسرت سے بھرپور ہوتا ہے۔ وہ ننھا سا گورا رو رو کر کہہ رہا تھا "ابو جانی! تم نے مجھے میری ماں کی محبت سے حاصل کیا ہے، بولو میں کیسا ہوں؟ اگر اچھا ہوں تو میری ماں کو برا نہ کہو، اسے برا کہو گے تو میں کھوٹا سکہ کہلاؤں گا کیونکہ میں اسی ٹکسال سے آیا ہوں۔"

وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ٹیک لگائے ہوئے وہ جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔ اسکی نگاہوں کے سامنے ایک ننھا منا سا، پیارا پیارا سا بچہ ہاتھ پیر چلا چلا کر رو رہا تھا۔ رخسانہ نے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے بیٹے کو جنم دے گی۔ وہ خلا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیٹے ہی کو دیکھ رہا تھا۔ بیٹے کے پاس رخسانہ لیٹی ہوئی آدھے چہرے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ جس پلاٹ پر وہ بیٹھا ہوا ہے، وہ اب رخسانہ کا ہے۔ وہ گھر بھی رخسانہ کا ہے۔ اگر وہ لالچی ہوتی تو اس سے پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کرتی اور طلاق لے کر کسی دوسرے کو اپنا سب کچھ بنا لیتی لیکن وہ ایک برس دو مہینے سے صرف اس کی تھی، اسے چھوڑ کر اپنے میکے بھی نہیں جاتی تھی۔ صبح اسے محبت سے رخصت کرتی تو شام کو اس کی آنکھیں اس کے انتظار میں لگی رہتیں۔ ٹھیک ہے، اس نے دھوکا دیا تھا مگر یہ حقیقت پہلے بھی معلوم تھی کہ کوئی آدمی مکمل نہیں ہوتا۔ اگر وہ آدھی فریبی تھی تو آدھی وفادار تھی۔ اگر بے ایمان تھی تو ایمانداری سے بیوی کا رشتہ بھی نباہ رہی تھی۔ وہ اپنی محبت، اپنا دل، اپنی جان، اپنی روح، اپنی زندگی، اپنا حال اور اپنا مستقبل، سب کچھ اسے دیتی آ رہی تھی۔ اگر اسے دولت کا لالچ ہوتا تو ایک برس میں پندرہ ہزار کی رقم بچانے کے بعد اسے واپس نہ دیتی بلکہ چھپا کر رکھ لیتی۔ اس حساب سے

اب جو بیوی تھی اور اب اس کے بچے کی ماں بن گئی تھی تو اس میں کیا کھوٹ تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔

وہ قائل ہو کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ہاں ہاں، یہ جو میری بیوی بنی ہوئی ہے یہ تو بہت ہی اچھی عورت ہے، میں اس میں کوئی خرابی نکال ہی نہیں سکتا مگر وہ والی رخسانہ....."

وہ پھر خلا میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا، اسے اپنی محبوبہ رخسانہ نظر آئی۔ نگاہوں کے سامنے وہ سر سے پاؤں تک ایسے جلوے دکھا رہی تھی کہ وہ پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ کتنی پیاری تھی وہ اور کتنی تمنا تھی اس کی؟ لیکن وہ گم ہو گئی تھی، ابھی ابھی ملی تھی اور ملنے سے پہلے دور ہو گئی تھی۔ یہ کیا مذاق تھا، یہ کیا تماشا ہو رہا تھا، اس کو تو سمجھنا ہی ہو گا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اسی وقت اس کے مکان کے سامنے ایک پرانی سی کار آ کر رکی۔ مستری چاچا گیراج سے کار لے کر آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں۔ انہوں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "ارے بادشاہ جانی کیا خبر ہے؟ تمہاری چاچی نے کہا کہ زچگی ہو گئی ہو گی، چل کر دیکھ لیتے ہیں اس لیے ہم آ گئے، کوئی خوش خبری سناؤ۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، برآمدے سے اس کی ساس نے کہا "بھائی صاحب! اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، میری بیٹی نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ بہت ہی خوب صورت بچہ ہے مگر کیا کروں، میں دروازہ چھوڑ کر آگے نہیں آ سکتی۔ یہ تمہارا بادشاہ جانی ابھی مجھے مارنے دوڑ رہا تھا۔ میرا گلا دبا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی بیٹی کو کیسے اس کے بھروسے پر چھوڑ جاؤں۔ یہ تو میری بیٹی کے ساتھ میرے نواسے کو بھی مار ڈالے گا۔"

مستری چاچا نے گھور کر پوچھا "کیوں بے نالائق، یہ کیا حرکتیں کر رہا ہے، کیا آج پھر زیادہ پی لی ہے؟"

وہ مستری چاچا سے کتراتے ہوئے ان کی بیگم کو دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "چاچی سلام علیکم۔"

چاچی نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا "اے خبردار! مجھے سلام نہ کرنا، تیرے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے، میں شرابیوں سے بات نہیں کرتی۔"

"چاچی قسم سے کہتا ہوں میں نشہ نہیں کرتا۔ جب کوئی مجھ سے جھوٹ بولتا ہے،

مجھے دھوکا دیتا ہے تو بس غصے میں پینے لگتا ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ شادی میں میرے ساتھ گھپلا ہوا ہے۔ دلہن بدل گئی ہے‘ جس رخسانہ سے شادی کرنا چاہتا تھا‘ وہ رخسانہ میری بیوی نہیں بن سکی۔ یہ جو ابھی میرے گھر میں ہے نا‘ یہ دوسری لڑکی ہے۔“

اس کی چاچی نے کہا ”ارے کمبخت! سال بھر کے بعد پھر وہی ذکر چھیڑ دیا ہے۔ پہلے تو یہ صرف تیری بیوی تھی‘ اب تیرے بچے کی ماں بھی بن گئی ہے‘ اب تو یہ قصہ ختم کردے۔“

”کیسے ختم کردوں؟ میں نے صدر میں اس رخسانہ کو دیکھا جس کو میں نے پسند کیا تھا‘ جسے میں شریک حیات بنانا چاہتا تھا‘ جسے چاچا نے بھی ایک بار گیراج کے سامنے دیکھا تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ رخسانہ یہی ہے جو اس وقت میرے گھر میں ہے مگر یہ سب اتنا بڑا گھپلا ہے کہ ٹھیک سے سمجھاؤں تو سمجھ میں آئے گا‘ نہیں تو خالی چکر بازی معلوم ہوگی۔“

”دیکھ جانی! یہ جو تیرے گھر میں بیوی ہے‘ کیا یہ وفادار ہے؟“

”ہے۔“ وہ سرہلا کر بولا۔

”کیا خدمت گزار ہے؟“

وہ پھر سرہلا کر بولا ”ہاں ہے۔“

”یہ تیرے لیے کھانا پکاتی ہے‘ تیرے لیے گھر میں جھاڑو دیتی ہے‘ تیرے لیے گھر کو سجا کر رکھتی ہے‘ تو آدمی نہیں تھا۔ تجھے بھی آدمی بنا کر رکھتی ہے۔ تیرے پاس ایک ٹیکسی تھی اس نے دوسری ٹیکسی کا اضافہ کیا۔ ارے ایسی بیوی تو تجھے کبھی نہیں ملتی‘ پھر قسمت اچھی ہوگئی تو یہ مل گئی‘ شکر کر۔“

”وہ تو میں کرتا ہوں۔“

”کیا کرتا ہے؟“

”یعنی یہی کہ شکر تو ادا نہیں کیا ہے کرلوں گا۔ اچھی بیوی ہے۔ میں نے یہ شکایت تو نہیں کی کہ اس میں کوئی برائی ہے کوئی خرابی ہے۔“

”جب اس میں کوئی برائی نہیں ہے تو پھر کیوں کسی دوسری لڑکی کے متعلق سوچتا ہے؟“

”کیوں نہ سوچوں؟ وہ جو لڑکی تھی‘ وہ میری محبت تھی اور محبت ہے اور کیا انصاف کوئی چیز نہیں؟ اور آپ لوگ یہ نہیں پوچھیں گے کہ میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا گیا؟ وہ رخسانہ مجھے کیوں نہیں ملی جسے ملنا چاہیے تھا۔“

”تو انصاف چاہتا ہے‘ ہم اس معاملے میں بات کرلیں گے مگر یہ کوئی اہم معاملہ نہیں ہے۔ اہمیت یہ ہے کہ ابھی تیرے گھر بیٹا ہوا ہے۔ اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں ہوتی‘ اس خوشی کے بعد ساری باتوں کو بھول جا۔“

مستری چاچا نے اس کی ساس سے کہا ”بہن ہماری بہو سے کہئے کہ میں بچے کے کان میں اذان دینے آرہا ہوں۔ اس کمبخت نے تو ابھی بچے کو دیکھا بھی نہیں ہوگا۔“

مستری چاچا کی بیگم نے کہا ”اسے بچے کے قریب جانے بھی نہ دینا۔ وہ معصوم ابھی اس دنیا میں آیا ہے اور یہ اپنے شرابی منہ سے اسے پیار کرے گا۔ جب تک اس کا نشہ نہ ختم ہوجائے‘ اس کے منہ سے بدبو نہ ختم ہوجائے‘ یہ اپنے بچے کے پاس نہیں جائے گا۔“

وہ لوگ مکان کے برآمدے کی طرف جانے لگے۔ بادشاہ جانی نے ہاتھ ہلا کر کہا ”واہ‘ اچھی زبردستی ہے۔ میرا بچہ ہے اور مجھے روکا جارہا ہے۔ ارے جاؤ‘ جاؤ‘ میں جب چاہوں گا اسے دیکھ لوں گا اور ہاں سنو‘ اس کا نام گھپلا رکھ دینا کیونکہ وہ بھی اپنی ماں اور اپنی نانی کی طرح گھپلے باز نکلے گا۔“

وہ لوگ اندر چلے گئے اور جانی تنہا رہ گیا۔ اس کے آس پاس دور دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی کی بہار میں پھر وہ بہار آفریں صورت نظر آنے لگی۔ وہ رکشے کی پچھلی کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ رکشا دور بھاگتا جارہا تھا اور وہ اس کے پیچھے دوڑتا جارہا تھا۔ رخسانہ مجھ سے دور نہ جاؤ‘ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ دوڑتا جارہا تھا‘ پھر اس نے دوڑتے دوڑتے کھڑکی کی چوکھٹ کو پکڑ لیا۔ اس کھڑکی کے فریم میں وہ اپنے حسن کے جلوے لٹارہی تھی‘ اسے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی اور وہ تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا ”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ دنیا والے مجھے تم سے الگ نہیں کرسکتے۔ میرے پاس آجاؤ یا مجھے اپنے پاس بلالو۔ رخسانہ!.....رخسانہ!....“

اچانک ہی کھڑکی کا پٹ کھل گیا۔ مستری چاچا کا چہرہ نظر آیا۔ انہوں نے ڈانٹ کر کہا

"ابے ایک تو تو ان لوگوں کے خلاف باتیں کرتا ہے' جب میں نے حکم دیا کہ تو اپنے بچے سے نہیں مل سکتا تو یہاں آکر گڑگڑا رہا ہے' فریاد کر رہا ہے کہ دنیا والے تجھے اس سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ ہمارا کیا دماغ خراب ہے کہ تمہیں الگ رکھیں گے۔ تم میاں بیوی ہو' یہ تمہارا بچہ ہے جب چاہو آکر ملو مگر آدمی کی طرح۔"

وہ بوکھلا کر مستری چاچا کا منہ تک رہا تھا۔ آہ' ابھی ایک لمحے پہلے تک کتنے حسین جلوے تھے۔ نگاہوں کے سامنے جوانی کھل رہی تھی اور اب بڑھا چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس وقت کمرے کے اندر سے رخسانہ کی پیار بھری آواز سنائی دی "جانی آجاؤ' یہ لوگ ہمیں جدا نہیں کریں گے' آکر اپنے بیٹے کو تو دیکھو' تم جیسا چاہتے ویسا ہی ہے۔ بادشاہ پیارا پیارا سا' اسے گود میں لے کر پیار نہیں کرو گے۔ یہ تمہارا خون ہے جانی۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ وہ اپنے بچے کو کھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ جب بچہ پیارا تھا تو اس کی ماں کیسے پیاری نہ ہوتی۔ شکایتیں اپنی جگہ ہوتی ہیں لیکن اس رخسانہ نے بیوی کی حیثیت سے جو خدمت کی تھی' اس کی حقیقت اپنی جگہ مسلم تھی۔ اس نے مستری چاچا کے پیچھے دیکھا۔ کھڑکی کے پاس رخسانہ ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ اسے بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ اب مستری چاچا اس کے بستر کے پاس ایک کرسی پر جاکر بیٹھ رہے تھے اور بچے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اسے اپنے منہ کے قریب لاکر آہستہ آہستہ اس کے کانوں میں اذان سنا رہے تھے۔

"اللہ اکبر' اللہ اکبر" (اللہ سب سے بڑا ہے)

جب اللہ سب سے بڑا ہے تو میں کیسے بڑا ہو سکتا ہوں۔ میں عمر میں بڑا ہوں' وہ تعلیم میں بڑی ہے' میں کمائی میں بڑا ہوں' وہ میری کمائی کو بچانے میں بڑی ہے۔ میں بڑا ہوں کہ میں نے ایک گھر بنایا' وہ بڑی ہے کہ اس نے اس گھر کو بسایا اور آج ایک ننھا سا پھول کھلایا۔ ہم ایک دوسرے سے بڑے نہیں ہیں۔ جب ایک دوسرے سے بڑے نہیں ہیں تو ایک دوسرے سے چھوٹے بھی نہیں ہیں۔ بڑائی کا ذکر جب بھی ہوگا تو خداوند کریم کے لیے ہوگا۔ وہی ایک ذات سب سے بڑی ہے۔

وہ سر جھکا کر' کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر برآمدے کی طرف جانے لگا۔ آواز آرہی تھی اشھد ان لا الٰہ الا اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے)

جب میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے تو پھر میں اپنی بیوی سے اپنی پرستش کیسے کرا سکتا ہوں۔ یہ پرستش کرانا ہی ہے۔ ہم اپنی بیویوں سے یہ نہیں پوچھتے کہ وہ خدا کی عبادت کرتی ہیں یا نہیں؟ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عبادت کی حد سے بڑھ کر وہ ہماری خدمت کرتی ہیں یا نہیں۔ ایک تعلیم یافتہ عورت نے ایک برس دو مہینے میں ایک ان پڑھ شوہر کی جتنی خدمت کی ہے' وہ عبادت کی حد سے گزر جاتی ہے۔ اب سوچتا ہوں' تو میری یہ بیوی میری سمجھ میں آتی ہے۔

وہ مکان کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ اذان کی دھیمی دھیمی آواز وہاں تک آرہی تھی اشھد ان محمد رسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ (حضرت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔)

یہ جو ہمارے آخری پیغمبر ہیں' یہ چودہ سو سال سے ہمارے گھر گھر میں ہیں مگر ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ ان کا پیغام سن نہیں سکتے۔ سن سکتے ہیں تو سمجھ نہیں سکتے' سمجھ سکتے ہیں تو عمل نہیں کر سکتے۔ جب ہم یہ سب کچھ نہیں کر سکتے تو ہم سب کے سب جاہل ہوئے نا۔

برآمدے کے بعد ایک چھوٹا سا کوریڈور تھا۔ کوریڈور کے ایک طرف باورچی خانہ' غسل خانہ اور اسٹور روم وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ کوریڈور کی دوسری طرف وہ بڑا سا کمرا تھا' وہ کمرے کے دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ آواز آئی "حی علی الصلوٰۃ" (آؤ نماز کی طرف)

پھر تمہیں آدھے چہرے کے حسن پر باقی آدھے چہرے کا حسن قائم کرنا آجائے گا۔ نماز ایک ڈسپلن ہے اور ڈسپلن کے بغیر کوئی چہرہ مکمل نہیں ہوتا۔

"حی علی الفلاح" (آؤ اپنی فلاح کی طرف)

بادشاہ جانی دروازہ کھول کر کمرے میں آگیا۔ بھلائی اسی میں ہے کہ معصوم بچے کی کڑی سے بیوی اور شوہر کی کڑیاں مل کر ایک مضبوط زنجیر بنتی جائے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مستری چاچا کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کبھی اپنی شریک حیات کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنے بچے کی طرف۔ نظر جب بھی بچے کی طرف جاتی تو آپ ہی آپ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لہرا جاتا۔ بہت ہی پیارا پیارا سا گورا گورا سا بچہ تھا۔ اسے لے کر چومنے کو دل چاہتا

تھا۔ مستری چاچا نے اذان مکمل کر کے بچے کو اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بچے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا پھر اسے لے کر رخسانہ کے پاس بیٹھ گیا' اس کے بعد بچے کی پیشانی چوم کر رخسانہ کو یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو' پیار بچے کے لیے ہے لیکن اس کا سلسلہ تم سے ہے۔

وہ شرما بھی رہی تھی اور مسکرا بھی رہی تھی۔ اس سے نظریں بھی چرا رہی تھی' اور چور نظروں سے قربان بھی ہو رہی تھی۔ وہاں ان کے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے ورنہ وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہتی' تم بہت دیر سے غصہ اور نفرت دکھا رہے ہو' دیکھو جس رخسانہ کو تم ڈھونڈتے ہو' وہ تمہاری زندگی میں صرف دو دن کے لیے مہمان بن کر آئی تھی' آئندہ بھی تمہارے خوابوں' خیالوں میں تمہارے لیے صرف مہمان بن کر آئے گی۔ میں تمہاری ازدواجی مسرتوں کی میزبان ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ تم پر وار دیا ہے' تم کب تک نفرت سے مجھ پر وار کرتے رہو گے؟"

بچہ رونے لگا۔ بادشاہ جانی اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر نیچے کر کے جھولے کی طرح اسے جھلانے لگا۔ ہو' ہو کہہ کر خاموش کرنے لگا۔ رخسانہ نے مسکرا کر کہا "مجھے دے دو' شاید یہ بھوکا ہے۔"

اس نے بچے کو اس کے بازو پر لٹا دیا۔ رخسانہ اسے شہد چٹانے لگی۔ اس کی ماں نے کہا "بیٹی! اس شہر میں تو کھانے پینے کی کوئی چیز خالص نہیں ملتی' معلوم نہیں اس شہد میں کیا ملا ہوا ہو۔ ہمارے ایک پڑوسی صمد صاحب کوئٹہ سے خالص شہد لے کر آئے ہیں۔"

بادشاہ جانی نے کہا "میرے بیٹے کو خالص کھانا ملنا چاہیے۔ مجھے ان صمد صاحب کا پتا بتاؤ' میں شہد خرید لاؤں گا۔"

اس کی ساس نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا "اے! تم مجھ سے بات نہ کرنا۔ تم لچے لفنگے بدمعاش ہو۔ مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے۔"

رخسانہ نے بڑے دکھ سے کہا "جانی! یہ بری بات ہے۔ کیا تم میری امی کی عزت نہیں کرو گے؟ کیا ان سے معافی نہیں مانگو گے؟"

وہ بولا "تم کہتی ہو تو مانگ لیتا ہوں مگر میں نے تمہاری ماں کے ساتھ جو کچھ بھی کیا' وہ کیوں کیا' جانتی ہو؟ اب جانے دو۔ چھوڑو میں ابھی بات نہیں بڑھانا چاہتا' ابھی مجھے

اپنے بچے کے لیے اصلی خوراک چاہیے۔ اپنی امی سے بولو کہ میرے ساتھ چل کر وہ اصلی شہد لے کر آجائیں۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ وہاں راستے میں تم نے مجھے اکیلی پاکر مار دیا تو میں کیا کروں گی؟"

رخسانہ نے کہا "امی آپ بھی بچی بن گئی ہیں۔ میں آپ کو ہزار بار سمجھا چکی ہوں کہ جانی ایسے نہیں ہیں۔ اوپر سے سخت اور ظالم نظر آتے ہیں' اندر سے یہ بہت نرم ہیں۔ آپ ان کے ساتھ جائیے۔"

مستری چاچا نے کہا "ہاں بہن! آپ اس کے ساتھ چلی جائیں۔ میں اور میری بیگم آپ کے آنے تک رخسانہ کے پاس رہیں گے۔"

بادشاہ جانی کمرے سے نکل کر باہر آیا پھر اپنی ٹیکسی کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ساس باہر آئی۔ اس نے بادشاہ جانی کو دیکھا' اس کے پاس والی خالی سیٹ کو دیکھا' پھر پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ دوسری ٹیکسی کے پاس سے چھوٹو نے آکر کہا "بادشاہ' وہ دوسری گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے۔"

بادشاہ نے پیچھے مڑ کر اپنی ساس کو دیکھا پھر چھوٹو سے کہا "ارے گاڑی بگڑ جائے تو بن جاتی ہے' آدمی بگڑ جائے تو اس کا بنانا مشکل ہوتا ہے۔"

اس کی ساس نے گھور کر دیکھا۔ "اے! تم مجھے دیکھ کر کیوں بول رہے ہو؟"

"دیکھا' بولتے ہی بگڑ گئیں۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر وہاں سے ناظم آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ دونوں خاموش رہے۔ بادشاہ جانی کے اندر یوں تو بہت سا لاوا پک رہا تھا' وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ کون تھی اور اب کہاں ہے لیکن وہ صبر و تحمل سے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنے بچے کے لیے خالص شہد کی ضرورت تھی اور وہ شہد حاصل کرنے سے پہلے جھگڑے کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ خاموشی سے راستہ طے کرتے ہوئے ناظم آباد پہنچ گئے۔ عباسی اسپتال کے سامنے والی گلی میں گاڑی کو موڑ کر اس نے اس مکان کے آگے گاڑی روک دی۔ جہاں سے دولہا بن کر اپنی دولہن کو لے کر گیا تھا۔ جب اس نے گاڑی روک کر ہیڈ لائٹس کو بجھانا چاہا۔ تبھی اسے سامنے سڑک پر ایک نوجوان دوشیزہ نظر آئی۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آیا

لیکن اس کا قد' اس کی جسامت' اس کا پہناوا دیکھ کر بادشاہ جانی چونک گیا۔ یک بارگی دل نے زور زور سے دھڑک کر کہا۔ وہ جان حیات جارہی ہے' اس نے آنچل کو سر پر اس طرح رکھا ہوا تھا کہ وہ آنچل گھونگھٹ بن گیا تھا۔ چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس وقت وہ سڑک پار کرتے ہوئے دوسری طرف جارہی تھی۔ بادشاہ جانی نے ایک جھٹکے سے دروازے کو کھولتے ہوئے چیخ کر آواز دی "رخسانہ' رک جاؤ۔ رک جاؤ رخسانہ۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔"

اس کی ساس نے گھبرا کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل کر کہا "یہ کیا کررہے ہو' رخسانہ کو تو گھر چھوڑ کر آئے ہو' یہاں پاگلوں جیسی حرکتیں نہ کرو۔"

اس نے ڈانٹ کر کہا "چپ رہو' تم فریبی ہو' جھوٹی ہو' مکار ہو۔"

یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا اس لڑکی کی طرف جانے لگا۔ اس وقت تک اس نے سڑک پار کرلی تھی۔ جب اس نے کسی کے دوڑنے کی آواز سنی اور وہ آواز اپنی طرف آتے ہوئے محسوس کی تو اچانک ہی پلٹ کر دیکھا' دونوں روبرو ہوگئے۔ بادشاہ جانی دوڑتے دوڑتے ایک دم سے ٹھٹک گیا۔

وہ رخسانہ نہیں تھی' وہ کوئی اور تھی۔ رات کے وقت اپنی جسامت سے وہ لڑکی لگتی تھی۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ آدھے درجن بچوں کی ماں ہوگی۔ بادشاہ جانی سر جھکا کر وہاں سے پلٹ گیا پھر ٹیکسی کی طرف واپس آنے لگا۔ اس کی ساس نے غصے سے کہا "کیوں ہمیں بدنام کرنا چاہتے ہو۔ ہم برسوں سے اس محلے میں رہتے ہیں' ہمیں تماشا نہ بناؤ' گھر کے اندر چلو۔"

وہ اپنی ساس کے پیچھے اس مکان میں داخل ہوا۔ ڈرائنگ روم میں اس کا سسر فرید احمد بیٹھا تاش کے پتوں سے کھیل رہا تھا۔ اس کی ساس پڑوسی کے یہاں شہد لینے کے لیے چلی گئی۔ فرید احمد نے اس سے پوچھا "بیٹھو' تاش کے کون کون سے کھیل جانتے ہو؟"

وہ خاموشی سے بیٹھ کر فرید احمد کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ساس ایک چھوٹی سی شیشی میں شہد بھر لائی۔ بادشاہ جانی نے اس کے ہاتھ سے شیشی لیتے ہوئے کہا "یہ مجھے دے دو۔"

ساس نے کہا "میرے پاس رہنے دو۔ میں یہاں سے بچے کے لیے اور بھی کچھ

ضروری سامان لے کر جارہی ہوں۔"

بادشاہ جانی نے شیشی کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "میرے بچے کے لیے نہ تو کسی سامان کی ضرورت ہے اور نہ ہی تمہاری ضرورت ہے۔ میں اب اپنے بچے پر تم لوگوں کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔"

فرید احمد نے حیرانی سے پوچھا "یہ کیسی باتیں کررہے ہو؟"

"میں درست کہہ رہا ہوں۔ اگر تم لوگ میرے بچے کو غائب کردو گے اور اس کی جگہ دوسرے بچے کو میرے پاس پہنچادو گے تو میں تم لوگوں کا کیا بگاڑلوں گا؟"

اس کی ساس نے کہا "تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے' ہم ایسا کیوں کریں گے بھلا؟"

"اس لیے کریں گے کہ یہ تم لوگوں کی خاندانی عادت ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں' مجھے سچ سچ بتادو کہ رخسانہ کہاں ہے جسے میں نے پسند کیا تھا اور جس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا۔"

اس کی ساس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہا "دیکھو جانی! یہ ہمارا گھر ہے' یہاں ہم عزت سے رہتے ہیں' بلاوجہ شور مچا کر بات نہ بڑھاؤ۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولا "بڑی عزت والے ہو' بڑی شرافت والے ہو' ہم ٹیکسی ڈرائیوروں کو جو سواری جہاں پہنچانے کے لیے کہتی ہے' ہم اسے اسی جگہ پہنچادیتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں کرتے کہ اسے بھٹکا کر دور کہیں ویرانے میں لے جاکر لوٹ لیں' ہم ایسا نہیں کرتے۔ میں نے بھی تم سے کہا تھا کہ مجھے میری رخسانہ کے پاس پہنچادو مگر تم نے مجھے اپنی بیٹی کے پاس پہنچادیا۔ یہ تمہاری شرافت ہے یا ذلالت ہے؟"

"تمہیں اپنے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ جو منہ میں آتا ہے بولتے چلے جاتے ہو' تم نے جسے پسند کیا تھا' ہم نے اسی کو تمہاری دلہن بنایا ہے۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولا "بکواس مت کرو' جھوٹ مت بولو۔ آج شام کے وقت میں نے رخسانہ کو دیکھا ہے جسے میں نے پسند کیا تھا۔ جب وہ رکشے میں بیٹھ کر جارہی تھی اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا تھا۔ میں جانتا ہوں' وہ بھی مجھے پہچان گئی تھی لیکن انجان بن گئی تھی' ایسا کیوں ہے؟ آخر وہ کون ہے؟ میرے قریب آنے کے بعد مجھ سے دور کیوں بھاگ رہی ہے؟ تم لوگوں نے ایسا کیا کردیا ہے کہ وہ مجھ سے کتراتی ہے؟ کیا کھیل

ہے مجھے بتاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میں پاگل ہو جاؤں اور تم لوگوں کو چن چن کر قتل کردوں۔"

وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ چیختے ہوئے گھر سے باہر نکل جاتے اور محلے والوں کو جمع کرلیتے مگر داماد کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتے تھے اس طرح وہ خود ہی تماشا بن جاتے۔ اس کی ساس نے پریشان ہو کر اس کی طرف سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا' پھر کہا "میری بیٹی کہتی ہے کہ تم درندے نہیں ہو' تمہیں محبت سے سمجھایا جائے تو سمجھ لیتے ہو۔ اگر تمہیں پوچھنا ہے تو اپنے گھر چلو۔ وہاں رخسانہ سے پوچھ لینا' وہی تمہیں بتائے گی کہ ہم سچے ہیں یا جھوٹے ہیں' یہاں جھگڑا کرنا فضول ہے' تمہارا بیٹا بھوکا ہے' اسے فوراً ہی شہد پہنچانا ہے۔"

یہ آخری بات کارگر ثابت ہوئی۔ بیٹے کی بھوک کا خیال آتے ہی وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ دونوں نے اطمینان کی سانس لی پھر رخسانہ کی ماں نے کہا "اے جی! آپ میرے ساتھ چلیں' مجھے اس لڑکے سے ڈر لگتا ہے۔"

فرید احمد نے دروازے کے باہر دیکھتے ہوئے کہا "ہماری بیٹی کہتی ہے اسے پیار سے سمجھایا جائے تو سمجھ لیتا ہے۔ ابھی تم نے اسے بیٹے کی بھوک یاد دلائی تو فوراً ہی درندے سے انسان بن کر ہماری بات مان لی' آؤ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ دونوں باہر آئے اپنے گھر کے دروازے کو مقفل کیا پھر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بادشاہ جانی نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کے بعد اسے ایک یوٹرن دے کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد فرید احمد نے اپنی جیبوں کو ٹٹول کر اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "اوہو' میں اپنے سگریٹ بھول آیا ہوں۔"

بادشاہ جانی نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر کہا "مجھ سے چالاکی نہ دکھاؤ۔ پہلی بار جب میں نے تمہیں گولڈلیف کا پیکٹ خرید کردیا تھا تو تم نے میری محبوبہ بدل دی تھی' آج سگریٹ خرید کردوں گا تو کیا اپنی بیوی بدل دو گے؟"

رخسانہ کی امی نے گھور کر اپنے شوہر سے پوچھا "کیا آپ نے اپنے داماد سے سگریٹ لے کر پیا تھا؟"

وہ ہچکچانے لگا پھر بے بسی سے بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "نہیں' میں نے تو نہیں لیا' بات دراصل یہ ہے کہ....."

بادشاہ جانی نے بات کاٹ کر کہا "دیکھو سسر جی! جھوٹ کو صرف ہم غریبوں کے لیے رکھو اور اپنی ہٹلر جیسی بیوی سے سچ بول دو۔"

اس کی ساس نے پچھلی سیٹ سے ہاتھ نچا کر کہا "یہ کیا سچ بولیں گے' یہ تو نہ کام کے نہ کاج کے' دشمن اناج کے ہیں۔ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ میں کماتی ہوں تو کھاتے ہیں اور دوسروں سے مانگ مانگ کر سگریٹ پیتے ہیں۔ ہماری عزت خاک میں ملادی ہے۔"

بادشاہ جانی نے حیرانی سے پوچھا "اچھا ساس جی! تمہاری عزت بھی ہے؟"

وہ بھڑک کر بولیں "بکواس مت کرو۔ تم بہت دیر سے ہمیں تم کہہ کر مخاطب کررہے ہو' تم بڑوں کی عزت کرنا نہیں جانتے؟"

اس وقت گاڑی ہلکے ہلکے جھٹکے کھا کر رکنے لگی پھر تھوڑی دور جا کر بالکل خاموش ہوگئی۔

فرید احمد نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔" وہ گاڑی سے باہر گیا پھر اس کا بونٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ حیدری کے ایسے راستے پر تھے جو بالکل سنسان تھا۔ نہ کوئی راہ گیر نظر آتا تھا اور نہ ہی کوئی گاڑی گزر رہی تھی۔ اس وقت رات کے ڈیڑھ بج چکے تھے۔ اس نے بونٹ گرا کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "گاڑی ٹھیک ہوگئی ہے' ذرا دھکا لگانا ہوگا۔"

فرید احمد نے تھوک نگل کر کہا "کیا دھکا لگانا ضروری ہے؟"

"ارے ہاں' ضروری ہے۔ کیا گاڑی کو دھکا نہیں دے سکتے' چلو اترو۔"

وہ دروازہ کھول کر گاڑی سے اترا اور اسے آگے دھکیلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ بادشاہ جانی بریک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس بات کو فرید احمد نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے پیچھے پلٹ کر اپنی ساس سے کہا "یہاں آرام سے کیا بیٹھی ہو' تمہارے مرد میں اتنا زور نہیں ہے کہ گاڑی کو دھکیل سکے' جاؤ' اس کے ساتھ زور لگاؤ۔"

وہ تھوڑی دیر تک غصے سے اسے دیکھتی رہیں پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں اور فرید احمد کو گھور کر بولیں "دن رات بیٹھے بیٹھے کھاتے رہتے ہو' اتنی بھی طاقت نہیں ہے کہ اکیلے گاڑی کو دھکا لگا سکو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ساڑی کے آنچل کو اپنی کمر کے گرد لپیٹا پھر اپنے شوہر کے ساتھ

گاڑی پر ہاتھ رکھ کر زور لگانے لگیں۔ ذرا سی دیر میں وہ اسٹارٹ ہو گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ دونوں آگے بڑھ کر گاڑی میں بیٹھنے کے لیے آتے وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

دونوں نے چلا کر کہا "گاڑی روکو۔"

مگر گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کی طرف گئے لیکن قریب پہنچنے سے پہلے گاڑی پھر آگے بڑھ گئی۔ بادشاہ جانی کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ اس کی ساس ہاتھ اٹھا کر کوسنے لگی۔ فرید احمد فریاد کرنے لگا لیکن وہ قہقہے اب دور ہوتے جا رہے تھے۔ گاڑی تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

بادشاہ جانی اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھا اسٹیئرنگ سنبھالے مسکرا رہا تھا۔ اس کے دل کا' دماغ کا بوجھ تھوڑی دیر کے لیے ہلکا ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے دشمنوں سے انتقام کی پہلی قسط پوری ہو چکی ہے۔ انتقام لینے کے بعد کتنا مزہ آتا ہے' اسے وہی سمجھ رہا تھا پھر اس نے کہا "کمینے' ہمیں بدنام کرتے ہیں کہ ہم دھوکا دیتے ہیں۔ آج سے میں نے بھی دھوکا سیکھ لیا ہے۔ ان شریف لوگوں کو ان کی منزلوں تک نہیں پہنچانا چاہیے' راستے میں چھوڑ دینا چاہیے۔"

اس نے ایک قہقہہ لگایا پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا "ذلیل بولتی ہے بڑوں کا ادب کرو۔ تم تم مت بولو۔ آپ کی بولی بولو۔ ارے! تم لوگوں نے ہمیں اچھے الفاظ بولنے کے قابل کہاں رکھا ہے۔ پہلے تو ہمیں بگاڑ دیتے ہو پھر بولتے ہو بگڑ گیا۔"

اس نے گیئر بدلا۔ رفتار بڑھائی پھر اپنے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ گاڑی سے اتر کر شیشی کو اپنی جیب سے نکال کر تیزی سے چلتے ہوئے اپنے مکان کے اندر داخل ہوا۔

مستری صاحب نے اسے دیکھتے ہی پوچھا "آ گئے' کیا یہی خالص شہد ہے؟"

انہوں نے شیشی کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے کھولا' ذرا سا چکھ کر دیکھا پھر سر ہلا کر بولے "واقعی بہت اچھا شہد ہے' بچے کو یہی چٹایا کرو۔"

رخسانہ نے شیشی کو لیتے ہوئے بادشاہ جانی سے پوچھا "امی نہیں آئیں؟"

"نہیں' وہ تمہارے ابو کے ساتھ سڑک پر ٹہل رہی ہیں۔"

مستری چاچا نے پوچھا "کیا مطلب؟ وہ تو یہاں آنا چاہتی تھیں۔"

"ہاں آنا چاہتی تھیں مگر میرے سسر صاحب نے فرمایا کہ یہاں کمرا ایک ہے۔ میاں

بیوی اپنے بچے کے ساتھ یہاں سوئیں گے تو ان دونوں کو جگہ نہیں ملے گی۔ سب کے سب ایک ہی کمرے میں نہیں رہ سکتے اس لیے وہ نہیں آئے۔"

مستری چاچا نے قائل ہو کر کہا "ہاں یہ بات تو درست ہے کہ یہاں ایک کمرے میں سب ہی کو تکلیف ہوگی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے' جانی تم تو ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر سو کر بھی رات گزار سکتے تھے۔ یہاں کسی بزرگ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بچہ ہماری بہو کو پریشان کرے گا۔"

مستری چاچا کی بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا "بہو' تم اتنی پیاری لگتی ہو کہ تمہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا مگر رات بہت ہو گئی ہے میں کل پھر آؤں گی۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر رخسانہ کی بلائیں لیں پھر اپنے پرس سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر بچے کی مٹھی میں پکڑا دیا' اس کے بعد دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

جانی مستری چاچا کے ساتھ چلتا ہوا باہر آیا' وہاں بیگم نے کہا "جانی تیری بیوی بہت ہی ملنسار' سگھڑ اور سمجھ دار ہے تو اس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہے۔"

"دیکھو چاچی! مجھے اتنا تو نہ گراؤ۔ یہ بھی تو سوچو کہ اس کا آدھا چہرہ ہے۔"

"ارے آدھے چہرے سے کیا ہوتا ہے' چہرے کو نہیں دیکھا جاتا' عمل اور حسن سلوک کو دیکھا جاتا ہے۔"

"چاچی! ابھی تو تم نہیں سمجھتیں۔ چہرہ دیکھا جاتا ہے اور چہرے کو جب غور سے دیکھو گی تو سب کے آدھے چہرے نظر آئیں گے۔"

چاچی نے اسے گھور کر دیکھا پھر پوچھا "یہ فلسفہ ہے یا نشے میں بول رہا ہے؟"

"اپنی زندگی میں جو ہو رہا ہے' وہی بول رہا ہوں۔ تم نے رخسانہ کو تو دیکھا ہے مگر اس کے آدھے چھپے ہوئے چہرے کو نہیں دیکھا۔"

"کیا ہے اس کے چھپے ہوئے چہرے میں۔"

"جھوٹ اور فریب۔ اب جانے دو چاچی رات بہت ہو گئی ہے تم لوگوں کو نیند آ رہی ہوگی میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔"

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ بادشاہ جانی نے اپنی ٹیکسی مکان کے احاطے

میں کھڑی کی' دونوں ٹیکسیوں کو لاک کیا پھر مکان کے اندر گیا۔

رخسانہ بچے کو بڑے پیار سے سلا رہی تھی۔ ممتا بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی' آہٹ سن کر اس نے اپنے جانی کو دیکھا۔ جانی دروازے کو بند کرنے کے بعد دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور وہیں سے رخسانہ کو دیکھنے لگا۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ وہ بولا "تم مجھے دیکھ کر شرما رہی ہو جیسے ابھی تمہارے پاس آؤں گا مگر میں نہیں آؤں گا۔"

رخسانہ نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر یقین سے کہا "تم آؤ گے جانی۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا "میں نہیں آؤں گا۔"

"آؤ گے۔ پہلے میں تمہیں تنہا پکارتی تھی' اب میرے ساتھ یہ بچہ بھی تمہیں پکارے گا اور تم آؤ گے۔"

بادشاہ جانی نے بچے کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر سوچنے لگا اس کے بعد کہا "دیکھو میں مانتا ہوں کہ تم بہت اچھی ہو' مجھے اچھی لگتی ہو مگر تمہارے ساتھ مجھے ایک کانٹا چبھتا ہے۔ جھوٹ اور فریب کا کانٹا۔ اس کانٹے کو نکال دو رخسانہ۔"

رخسانہ کا سینہ سانسوں سے بھر گیا پھر وہ آہستہ آہستہ سانس چھوڑتے ہوئے بولی "مجھے بھی ایک کانٹا چبھ رہا ہے اور وہ تمہاری دیوانگی کا کانٹا ہے۔ میں تمہارے ظلم کو سہتے سہتے تمہارے ہاتھوں خوشی سے مر جاؤں گی مگر یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کے دیوانے کہلاؤ۔ میں نے سوچا کہ میں اپنی محبت' اپنی وفاؤں سے اپنی خدمت گزاری سے تمہیں ایسے جیت لوں گی کہ تم صرف مجھے ہی دیکھو گے باقی سب کو بھول جاؤ گے۔ میں بچے کی ماں نہیں بننا چاہتی تھی کیونکہ ابھی ہمیں بہت ہی روشن اور خوش حال مستقبل بنانا تھا۔ میں پریکٹس کرنا چاہتی تھی مگر امی نے سمجھایا کہ اولاد ضروری ہے' اولاد ہو گی تو تم مجھے اور دیوانہ وار چاہو گے اور اس کے بعد کبھی مجھے چھوڑ کر کسی دوسری کے پیچھے نہیں بھاگو گے۔"

بادشاہ جانی نے ایک قدم اور بڑھ کر پوچھا "وہ دوسری کون ہے؟ کہاں ہے؟ اسے مجھ سے کیوں چھپایا گیا؟"

رخسانہ دونوں ہاتھوں کے سہارے ذرا اٹھ کر سرہانے کی طرف نیم دراز ہو کر بولی "مجھے دیکھو جانی! ٹھیک ہے کہ مجھے دیکھو گے تو آدھا چہرہ نظر آئے گا۔ آدھا چہرہ پٹیوں سے چھپا ہوا ہے مگر ایمان سے بولو کیا میں خوب صورت نہیں ہوں' مجھ میں کس بات کی کمی ہے؟ میں نے تمہاری خدمت کرنے میں کوئی کمی چھوڑی ہے؟ میں نے اس ننھے کو تمہارے لیے جنم دیا ہے کیا میری ان تمام خدمت گزاریوں اور وفاداریوں کا کوئی انعام نہیں دو گے؟"

"انعام ضرور دوں گا۔ تمہیں تمام عمر چاہتا رہوں گا۔"

"یہ انعام نہیں ہے جانی! عورت کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ اس کا مرد صرف اسے چاہے' کسی اور کی تمنا نہ کرے۔ کسی اور کے بارے میں سوال نہ کرے۔ کسی اور کے پیچھے نہ بھاگے۔ تم کسی اور کے بارے میں مجھ سے سوال کر رہے ہو۔ میں اس کا کس دل سے جواب دوں؟"

"جس دل سے تم نے پہلی بار مجھے دھوکا دیا۔"

"آہ دھوکا۔" وہ اپنے سر کو ایک شانے کی طرف ڈھلکا کر بولی "وہ دھوکا ایسا ہی ہے جیسے آدمی سوچتا ہے کہ کہیں سے بہت بڑا خزانہ چوری کر کے اپنے گھر لے جائے اور اس کے بعد ساری عمر ایمانداری سے زندگی بسر کرے' محتاجوں کی مدد کرے' غریبوں کو خیرات دے۔ نیک کام کرے اور اپنی اس چوری کی تلافی کرتا رہے مگر اپنی زندگی خوش حال بنا لے۔ وہ دھوکا ایسا ہی ہے جیسے ایک اسمگلر لاکھوں کروڑوں کا سامان اسمگل کرتا ہے۔ راتوں رات امیر بنتا ہے' پھر اپنے گناہوں کو دھونے کے لیے اپنے محلے میں مسجد تعمیر کراتا ہے۔ یتیم خانوں میں چندہ دیتا ہے۔ گھر میں میلاد کی محفل کراتا ہے اور جتنے نیک کام وہ سوسائٹی میں رہ کر کر سکتا ہے' کرتا ہے اس کی نیکی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر بہت دور اس کے پیچھے ایک جرم چھپا ہوتا ہے بس ایسا ہی میں نے سوچا تھا کہ زندگی میں ایک بار جھوٹ بولوں گی' ایک بار دھوکا دوں گی پھر جسے دھوکا دوں گی اس کے قدموں کی خاک بن جاؤں گی اور اس کی ایسی خدمت کروں گی' ایسی وفادار بن کر رہوں گی کہ دوسری عورتوں کے لیے مثال بن جاؤں گی اور میں ایسا کرتی آ رہی ہوں۔"

"کیا تمہارے ایسے کرتے رہنے سے وہ ظلم ختم ہو جائے گا' جو مجھ پر کیا گیا ہے؟"

"میں سمجھتی تھی' وہ ظلم ختم ہو جائے گا' تم اس بات کو زیادہ محسوس نہیں کرو گے۔ رفتہ رفتہ سر سے پاؤں تک میرے ہو جاؤ گے۔ تمہاری سوچ بھی میرے لیے ہوگی اور میرے گھر والے کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمہاری یہ دیوانگی قائم رہے گی۔"

"یہ دیوانگی مرتے دم تک قائم رہے گی۔ مجھے بتاؤ' وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟"

"جب میں یقین کرلوں گی کہ اب بتانا ہی ہوگا تو بتا دوں گی لیکن وہ وقت آنے سے پہلے میں کہتی ہوں کہ میری اور میرے بچے کی محبت کو اپنی نگاہوں میں' اپنے دل کے ترازو میں تول لو۔ اگر یہ بچہ تمہارا ہے تو میری طرف سے ہے۔ اگر میری محبت' میری وفا' میرا جسم' میری روح سب کچھ تمہارے ہیں اور تم اس کا اعتراف کرتے ہو تو....."

وہ بات پوری ہونے سے پہلے بولا "میں مانتا ہوں' ان سب باتوں کو مانتا ہوں۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ تمہیں چھوڑنے کا خیال نہیں کر سکتا۔ اگر یہ ظلم تم پر کروں گا تو یہ ظلم مجھ پر ہوگا اس سے بڑھ کر میری محبت تمہارے لیے اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"میرے جانی! جب تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو تو مذہب کی رو سے' قانون کی رو سے اور تہذیب کے حوالے سے اپنی بیوی کے سامنے کسی غیر عورت کا ذکر نہیں کرنا چاہیے' کجا یہ کہ تم مجھ سے ایک پرائی لڑکی کا پتا پوچھ رہے ہو۔"

"وہ میرے لیے پرائی نہیں ہے' وہ میری پہلی محبت ہے۔ میری پہلی آرزو ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے اندر کیسی بے چینی ہے میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس ایک بار میں اس سے مل لوں گا اور اس سے معلوم کرلوں گا کہ اس نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟ اس نے مجھے تمہارے حوالے کیوں کیا؟ جب مجھے جواب مل جائے گا' جب میں مطمئن ہو جاؤں گا تو یہ سارا قصہ ختم کر دوں گا۔"

"میں تمہیں سمجھا رہی ہوں' مجھ پر بھروسا کرو' وہ تم سے محبت نہیں کر رہی تھی' اگر محبت کرتی تو دلہن بننے سے پہلے تمہیں چھوڑ کر نہ بھاگ جاتی۔"

"کیا وہ بھاگ گئی تھی؟"

"اسے بھاگنا ہی کہتے ہیں کہ تمہاری زندگی میں آنے کے بجائے' وہ تم سے کترا کر نکل گئی۔"

"میں تم پڑھے لکھے لوگوں کی لچھے دار باتوں میں نہیں آسکتا۔ مجھے ایک بار اس سے ملا دو۔"

"میں چار ماہ پہلے اس کا پتا ٹھکانا جانتی تھی لیکن اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر ہی چلی گئی ہو۔"

اس نے ایک انگلی سے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ اسی شہر میں ہے' میں نے آج شام کو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اسے اچھی طرح پہچانا ہے' اس نے بھی مجھے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔"

رخسانہ نے حیرانی اور ذرا بے یقینی سے اسے دیکھا پھر پوچھا "کیا اس سے تمہاری ملاقات ہو چکی ہے؟"

"ہاں۔ ایسی ملاقات' جسے میں کیا نام دوں' میری سمجھ میں نہیں آتا' وہ مجھ سے ملتے ملتے' بچھڑ گئی۔ وہاں صدر میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں اس کے قریب نہ جا سکا۔ وہ رکشے میں بیٹھی بیٹھی مجھ سے دور ہوتی چلی گئی پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔"

رخسانہ نے بے اختیار اطمینان کی سانس لی۔ خیال آیا کہ جانی اس کے رد عمل کو پڑھ لے گا۔ اس لیے وہ جلدی سے سنبھل کر بولی "کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ تم سے دور بھاگ رہی ہے۔ تمہیں دیکھنے کے بعد اسے رک جانا چاہیے تھا۔ وہ رکشے کو روک کر تمہارے پاس آسکتی تھی مگر نہیں آئی۔ جانی سمجھنے کی کوشش کرو۔ اتنی بڑی دنیا میں اگر تمہیں کوئی دل و جان سے چاہنے والی ملے گی تو وہ صرف میں ہوں گی۔"

"میں مانتا ہوں' مجھ کو تم سے زیادہ کوئی نہیں چاہے گا۔ وہ مجھ سے بھاگنے والی بھی نہیں چاہے گی لیکن میں ایک بار اس سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے دھوکا کیوں دیا۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ دھوکا کس نے دیا؟ کیا دونوں نے دیا؟ تم نے بھی اور اس نے بھی؟"

رخسانہ نے کہا "ہاں' سچ تو یہ ہے کہ دونوں طرف سے تمہیں اندھیرے میں رکھا گیا۔ جو ہونے والا تھا' اس سے تمہیں آگاہ نہیں کیا گیا اور بعد میں جو ہوا' وہ تمہارے سامنے ہے۔"

"ایسا کیوں ہوا مجھے سچ سچ بتا دو۔"

وہ اسے التجا آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں 'کچھ نہ پوچھو' یہاں اس گھر کی چار دیواری کے اندر ہماری چھوٹی سی دنیا ہے۔ میں ہوں' تم ہو' ہمارا بچہ ہے۔ ہم اپنی باتیں کریں گے' ہمارے درمیان کسی دوسری عورت کو نہیں آنا چاہیے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں جب تم دوسری رخسانہ کی بات کرتے ہو تو مجھے اپنی توہین کا احساس ہوتا ہے۔ کیا میں اپنے مرد کی نظروں میں کچھ بھی نہیں ہوں؟ اور میرے ہوتے ہوئے کوئی دوسری تمہارے دل ودماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔

بادشاہ جانی اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا' انتظار کر رہا تھا کہ وہ جواب دے گی۔ جب اس کی طرف سے خاموشی رہی تو اس نے کہا "تم سوچ رہی ہو کہ مجھے کس طرح ٹال سکتی ہو۔"

وہ بولی "یہ بات نہیں ہے' میں...."

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ دفعتاً دروازے کو دھڑا دھڑ پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد رخسانہ نے اپنی امی کی آواز سنی "دروازہ کھولو بیٹی! دروازہ کھولو' ذرا دیکھو۔ اس جانی کے بچے نے ہمارا کیا حال بنا دیا ہے۔"

جانی نے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا "اے خبردار! میرے بچے کو کچھ نہ کہنا۔ میرے بچے نے تمہیں حال سے بے حال نہیں کیا۔"

رخسانہ نے کہا "جانی دروازہ کھولو۔"

وہ ہاتھ جھٹک کر بولا "ارے رہنے دو۔ ہم یہاں اتنی ضروری باتیں کر رہے ہیں۔ یہ بڑھیا اپنے بوڑھے کے ساتھ یہاں کیوں پہنچ گئی؟"

"جانی! بدتمیزی نہیں کرتے' وہ ہمارے بزرگ ہیں' ایسا نہ کہو۔ میرے والدین کی عزت کرو' چلو دروازہ کھول دو۔"

"تم صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے ماں باپ کے آجانے سے مجھے ٹالنے کا موقع مل گیا ہے۔ تم سمجھتی ہو مجھ سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ کبھی نہیں' میں تمہارے والدین کے سامنے ساری سچائی معلوم کر کے رہوں گا۔"

اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر چٹخنی گرادی پھر دونوں پٹ ایک جھٹکے سے کھول

دیے۔ ان دونوں کو شاید امید نہ تھی کہ جانی دروازہ کھولے گا۔ وہ تھکے ہارے وہاں تک پہنچے تھے اس لیے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ جیسے ہی جانی نے دروازہ کھولا' وہ لڑکھڑاتے ہوئے اور چیختے ہوئے کمرے کے اندر آکر گر پڑے۔ رخسانہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی پھر چیخ کر بولی "جانی! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بادشاہ جانی نے اس کی طرف پلٹ کر کہا "اب اس کا الزام تم مجھے دو گی کہ میں نے تمہارے ماں باپ کو گرایا ہے۔ ارے! مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ دروازے کے اوپر سو رہے ہیں اور کھلے گا تو گر پڑیں گے۔"

وہ دونوں زمین پر پڑے کراہ رہے تھے۔ اس کی ساس نے فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا "ہائے بیٹی! اس لڑکے نے تو ہمیں آج مار ہی ڈالا تھا۔ ادھر حیدری کے علاقے میں اس نے کہا ٹیکسی خراب ہو گئی ہے۔ دھکا لگانا ہے۔ میں اور تمہارے ابو گاڑی سے اتر کر دھکا لگانے لگے' تو یہ کمبخت گاڑی بھگا کر یہاں لے آیا۔ اس سے پوچھو کہ اس نے ہمارے ساتھ ایسی حرکت کیوں کی۔ ہمیں کس جرم کی سزا دے رہا ہے؟"

رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ شکایت بھری نظروں سے جانی کو دیکھنے لگی۔ بادشاہ جانی نے کہا "مجھے ایسے نہ دیکھو' میں نے تمہارے ابو سے پوچھا تھا کہ وہ رخسانہ کون ہے؟ جو شام کو نظر آئی تھی لیکن یہ مجھے بتانے سے انکار کرتے رہے۔ یہ نادان بچے نہیں ہیں۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ کسی کو راستے سے بھٹکانا نہیں چاہیے لیکن انہوں نے مجھے میرے راستے سے بھٹکا دیا تھا پھر میں انہیں راستے پر چھوڑ کر کیسے نہ آتا۔ انہیں کچھ تو سبق سکھانا چاہیے اور وہ میں نے سکھا دیا۔"

فرید احمد نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا "ہائے بیٹی! ہم کم سے کم تین میل پیدل چل کر ضرور آئے ہیں۔ یہ نئی آبادی ہے ادھر بسیں بھی نہیں آتیں۔ کوئی رکشا ٹیکسی والا بھی نہیں آتا۔ ہم چاہتے تو آدھے راستے سے گھر واپس چلے جاتے مگر سوچا کہ جو ہمیں راستے میں دھوکا دے کر آسکتا ہے' وہ ہماری بیٹی کے ساتھ جانے کیا سلوک کرے اس لیے ہم ادھر ہی چلے آئے۔"

"ابو! امی! وہاں سے اٹھ جائیے اور میرے پاس آکر بیٹھیے۔ میں جانی کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔"

وہ دونوں اٹھنے لگے۔ اس کی امی نے کہا "بیٹی! تمہارے معافی مانگنے سے یہ لڑکا سیدھے راستے پر نہیں آجائے گا۔"

جانی نے آگے بڑھ کر کہا "ارے! یہ کیوں سوچتے ہو کہ تمہارے سامنے جو ہے' وہ سیدھے راستے پر آجائے۔ پہلے اپنے لیے کیوں نہیں سوچتے کہ ٹیڑھے راستے پر کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ بولو مجھے سیدھا دیکھنے کے لیے کیا سیدھی طرح میرے سوالوں کا جواب دے سکتے ہو۔ یہ بتا سکتے ہو کہ میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا گیا اور میری وہ رخسانہ کون ہے؟ ان باتوں کا جواب دے دو پھر دیکھو جانی سے سیدھا اور شریف آدمی کوئی نہیں ملے گا۔"

رخسانہ نے کہا "جانی! تم اپنی ہی بات پر اڑے ہوئے ہو۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ وہ جو کوئی بھی تھی تمہیں نہیں چاہتی تھی۔ تمہیں ایک چھوٹا آدمی سمجھتی تھی' ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور سمجھتی تھی اس لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ شادی سے پہلے چلی گئی تھی۔ میری امی نے ابو نے مجھے دلہن بنادیا۔ مجھے تمہاری شریک حیات بنا کر اب یہ دونوں تمہاری طرف سے بے عزتی اٹھا رہے ہیں۔ تمہیں اپنی حرکتوں پر شرم آنی چاہیے۔ ان سے معافی مانگنی چاہیے۔"

"میں ایک ہزار بار معافی مانگ لوں گا مگر یہ بزرگ بچوں کو بگاڑتے کیوں ہیں۔ انہیں بے ادب اور بدتمیز بننے پر مجبور کیوں کرتے ہیں۔ جو بات تم رخسانہ کے بارے میں کہہ رہی ہو۔ اگر یہ یقین دلادیں کہ تمہاری بات درست ہے' پھر میں سوچوں گا کہ ان سے معافی مانگنی چاہیے یا نہیں۔"

اس کی ساس نے کہا "میری بیٹی درست کہہ رہی ہے۔ وہ لڑکی تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تمہیں حقیر سمجھتی تھی۔ یہ ہمارا ظرف ہے کہ ہم نے اپنی بیٹی کو تمہاری شریک حیات بنایا اور تم اس کا یہ صلہ دے رہے ہو۔"

وہ چڑ کر بولا "لعنت ہے تم لوگوں پر۔ ابھی تک مجھ سے جھوٹ بولتے جا رہے ہو۔ اگر وہ مجھ کو حقیر سمجھتی تو دو دن تک میرے ساتھ ٹیکسی میں کیسے گھومتی رہی۔ آخری بار اس نے کہا تھا کہ میں اسے کہیں دور لے چلوں اور وہ ملاقات کبھی ختم نہ ہو۔ اس کی یہ بات اب بھی میرے دل میں چبھ رہی ہے۔ اب مجھے اس کی تڑپ سمجھ میں آرہی ہے کہ وہ کیوں مجھ سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی؟ کیوں اس ملاقات کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی پھر

وہ مجھ سے بچھڑنے کے بعد رو رہی تھی؟ کس کے لیے رو رہی تھی؟ اگر میں ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اگر وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی' مجھے بے وقوف بنا رہی تھی تو بتاؤ' اس کے آنسو کس کے لیے تھے؟ وہ آخری ملاقات کو کیوں ختم نہیں کرنا چاہتی تھی؟ تم لوگوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا اس لیے کہ تم نے اس کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ کاروباری انداز میں میرے سے جھوٹ بول رہے ہو۔"

اس کی ساس نے ہاتھ نچا کر کہا "ارے ہاں ہاں' ہم کاروباری ہیں' جو کرنا ہے کرلو' سیدھی طرح سمجھاتے ہیں تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم ہمارا کیا بگاڑلو گے۔ کیا ہماری لڑکی کو چھوڑ دو گے؟ کیا تمہارے اندر اتنا دم ہے؟ کیا پچاس ہزار روپے تم لا سکتے ہو؟ کیا تمہاری موٹی عقل میں یہ بات ابھی نہیں آئی کہ یہ گھر' یہ پلاٹ' یہ سب میری بیٹی کا ہے۔ ہم چاہیں تو ابھی تمہیں یہاں سے نکال سکتے ہیں۔"

رخسانہ نے چیخ کر کہا "امی! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ میرے شوہر کی توہین کررہی ہیں۔ کیا میں آپ کی بچی ہو کر سمجھاؤں کہ میاں بیوی کے درمیان نفرت اور تفرقہ پیدا ہونے والی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

جانی نے پاؤں پٹخ کر کہا "تم بکواس نہ کرو۔ اپنی ماں اور باپ کے ساتھ مل کر اب یہ نیا ڈراما نہ کرو۔ شوہر پرستی دکھا رہی ہو۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ جب تم میری توہین برداشت نہیں کرسکتیں تو ان ساری چیزوں کو کیوں اپنے نام لکھوایا تھا کیوں مہر کی رقم پچاس ہزار رکھوائی۔ تم سب لوگ ڈرامے باز ہو۔ میں اس گھر سے ابھی چلا جاؤں گا۔ بے شک یہ میرا گھر نہیں ہے۔"

وہ پلٹ کر باہر جانے لگا۔ رخسانہ نے چیخ کر آواز دی "رک جاؤ جانی! پہلے میری بات سن لو۔"

وہ دروازے سے پلٹ کر بولا "میں تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتا مگر جانے سے پہلے میں یہ کہہ دوں کہ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ اس شہر کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ٹیکسی چلاتا رہتا ہوں۔ تمہارے جیسے کتنے ہی مکاروں کو دیکھتا اور سنتا رہتا ہوں۔ میں اس بات کا فیصلہ کیے بغیر نہیں رہوں گا کہ میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا گیا ہے اور میری محبت کو کہاں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ میرا نام بادشاہ جانی ہے۔ میں تم لوگوں کی

زبان سے سچائی اگلوا کر رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا مکان سے باہر آیا۔ مکان کے احاطے میں اس کی ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ دوسری ٹیکسی کو اس نے باہر ہی روکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی دوسری ٹیکسی کو بھی اسٹارٹ کر کے مکان کے احاطے کے باہر لا کھڑا کیا پھر اس احاطے کے پاس کھڑے ہو کر مکان کی طرف گھونسا دکھاتے ہوئے بولا "باہر آ کر دیکھو' میں تمہارے احاطے سے باہر ہوں۔ یہ دونوں ٹیکسیاں تمہاری جائداد نہیں ہیں۔ تمہارے نام سے نہیں خریدی گئی ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں باہر رکھ لیا ہے۔ اب میں یہاں رات گزاروں گا۔ تم لوگ صبح تک فیصلہ کر لو کہ سچی بات بتاؤ گے یا نہیں' نہیں بتاؤ گے تو میں کل شام تک یہ دونوں ٹیکسیاں بیچ کر پچاس ہزار روپے لا کر تمہاری بیٹی کے منہ پر پھینکوں گا اور تمہاری بیٹی کو طلاق دے دوں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آیا اور ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازے کو بند کر دیا تاکہ وہ آواز کمرے تک پہنچ جائے اور وہ سمجھ لیں کہ جانی پچھلی سیٹ پر صبح کرنے لیے سو رہا ہے۔

وہ پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا پھر وقفے وقفے سے ادھر ادھر پہلو بدلنے لگا۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو غصہ' دوسرے اپنی حماقت پن پر کڑھ رہا تھا کہ اس نے اپنا پلاٹ اور مکان وغیرہ کیوں رخسانہ کے نام لکھ دیا تھا اور مستری چاچا کے منع کرنے کے باوجود پچاس ہزار مہر کی رقم کیوں لکھوائی تھی۔

وہ کروٹیں بدلتا رہا پھر اسے رخسانہ کی یاد آئی۔ وہ ہر رات اس کے سر کو سہلاتے ہوئے اسے سلاتے ہوئے کہتی تھی "جانی تم میرے عادی ہو چکے ہو۔ تم میرے بغیر نہیں سو سکو گے۔"

وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر دروازہ کھول کر باہر نکلا اور مکان کی طرف دیکھ کر چلاتے ہوئے بولا "اے! تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارے بغیر سو نہیں سکوں گا۔ میں سو رہا ہوں۔"

وہ پلٹ کر اپنی ٹیکسی کے پاس آیا پھر پلٹ کر بولا "نہیں' میں سو چکا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ دروازے کو بند کر کے پھر لیٹ گیا۔ تب اسے اپنی

غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ سو چکا ہے لیکن بھلا سونے والا بولتا کہاں ہے پھر اس نے سوچا چلو غلطی ہو گئی لیکن اب کسی طرح سونا ہی ہوگا نہیں تو اپنی کمزوری ظاہر ہوگی۔

وہ ناراض ہوتا تھا تو رخسانہ اسے مناتی تھی۔ اس کی خوشامدیں کرتی تھی۔ وہ نہ مان کر برآمدے میں چلا آتا تھا تو وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں بھی آ جاتی تھیں اور پیچھے سے آ کر اس کی گردن میں باہیں ڈال دیتی تھی۔ اس کی قربت ایسی تھی کہ وہ اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ چونکہ بھول نہیں سکتا تھا اس لیے اس وقت بھی وہ یاد آ رہی تھی۔ اگرچہ اس کا جھوٹ اور فریب غصہ دلاتا تھا مگر اتنے عرصے تک ساتھ گزاری ہوئی زندگی کو بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ خصوصاً سوتے وقت تنہائی میں تو صرف وہی یاد آتی تھی۔

اچانک اسے روشنی محسوس ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو مکان کے برآمدے کا بلب روشن ہو گیا تھا اور وہاں رخسانہ دیوار کا سہارا لیے ہوئے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر ٹیکسی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ ایک دم سے تڑپ گیا۔ زچگی کے بعد اسے بستر سے نہیں اٹھنا چاہیے تھا لیکن وہ اس کے لیے آ رہی تھی۔ وہ بھی تو خوشامدیں کرنے اور منانے کی عادی ہو گئی تھی۔ جب تک وہ اپنے شوہر کو منا نہیں لیتی' اس وقت تک سو نہیں سکتی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی عادتوں سے مجبور تھے۔

وہ برآمدے کے سامنے والے چھوٹے سے باغیچے میں پہنچ گئی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ شاید اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ بادشاہ جانی بے چین سا ہو گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر جائے اور اسے چلنے سے روک دے۔ دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اسے کمرے میں پہنچا دے مگر وہ چیخ چیخ کر کہہ چکا تھا کہ وہ سو چکا ہے اس لیے وہ پچھلی سیٹ پر دم سادھ کر لیٹ گیا۔

لیٹنے کے باعث وہ دروازے کے اس پار سے نظر نہیں آ رہی تھی لیکن دل جانتا تھا کہ وہ آ رہی ہے اور بڑی مشکلوں سے تھوڑا تھوڑا فاصلہ طے کر رہی ہے اور یہ سب اس کے لیے کر رہی ہے۔ یہ سوچ کر اسے اپنی بیوی پر پیار آنے لگا پھر اچانک ہی اسے اپنے پیار پر غصہ آنے لگا۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ایک پل میں غصہ اور ایک پل میں پیار آنے

لگا۔ یہ عورت اسے پاگل بنادے گی۔

اب وہ احاطے کے گیٹ کو پار کر چکی تھی۔ کھڑکی کے پاس نظر آ رہی تھی۔ وہ کسی طرح لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھی پھر ٹیکسی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چاندنی میں اسے ہانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا پھر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولی "جانی! مجھ سے انجان نہ بنو۔ تم جاگ رہے ہو۔ بچے بھی اتنی جلدی نہیں سو پاتے۔ تم تو بچوں سے بھی زیادہ بچے بن گئے ہو۔ اٹھو جانی دیکھو میں تمہارے لیے کتنی دور سے چل کر آئی ہوں۔"

وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ ٹیکسی کے اندر تاریکی تھی۔ رخسانہ باہر سے دیکھ نہیں سکتی تھی کہ اس کی آنکھیں بند ہیں یا کھلی ہوئی ہیں اور وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی "ہاں میری یہی سزا ہے کہ میں اس حالت میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے بھاگتی رہوں۔ دیکھو جانی! ہمارا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ نہ تو طلاق کے بول اسے توڑ سکتے ہیں اور نہ ہی پچاس ہزار روپے۔"

وہ کھڑکی کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کے پاؤں پکڑتے ہوئے بولی "اٹھ جاؤ جانی! میرا سر چکرا رہا ہے۔ بڑی کمزوری سی محسوس ہو رہی ہے۔ میں گر پڑوں گی۔ پچاس ہزار کیا چیز ہیں جانی! تم آ کر تھام لو۔ مجھے دنیا کی دولت مل جائے گی۔"

بادشاہ جانی کے جی میں آیا کہ فوراً ہی اٹھ جائے اور اسے تھام لے۔ اپنے بازوؤں میں چھپالے اور اسے اتنا پیار دے' اتنا پیار دے کہ وہ اپنی ساری کمزوری بھول جائے پھر اسے یاد آیا کہ وہ غصے میں ہے اور اتنی جلد موم نہیں ہونا چاہیے۔ نہیں تو عورت سر پر چڑھ جاتی ہے۔

ٹیکسی کا دروازہ کھل گیا۔ اگر وہ اس وقت نہ کھلتا تو شاید وہ گر پڑتی کیونکہ دروازہ کھلتے ہی وہ وہیں سیٹ کے نیچے گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ نڈھال سی ہو کر اس نے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔

تب اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ فوراً ہی محبت سے اٹھا مگر غصے سے بولا "کیوں آئی ہو؟ تمہیں ایسی حالت میں' اتنی دور چل کر آنے کے لیے کس نے کہا تھا؟ کیا مرنے کا ارادہ ہے؟"

"تم مجھ سے ناراض رہو گے تو مر ہی جاؤں گی۔"

"بس بس' زیادہ بکواس نہ کرو۔ اپنے گھر میں جاؤ۔ تمہیں یہ پلاٹ اور گھر مبارک ہو۔ میرے لیے یہ ٹیکسی کافی ہے۔"

"ایسا نہ کہو جانی! وہ گھر تمہارا ہے' میرا ہے اور سچ پوچھو تو ہم دونوں کا نہیں ہے' یہ سب کچھ ہمارے بچے کا ہے۔ امی نے اگر غصے میں کہہ دیا ہے تو ان کی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ تم نے راستے میں انہیں چھوڑ کر جو تکلیف پہنچائی' وہ اس کا ردعمل تھا۔ ویسے وہ دل کی بری نہیں ہیں۔ تم میرے سب کچھ ہو پھر بھلا وہ تمہارا برا کیسے چاہیں گی۔ چلو جانی! اپنے گھر میں چلیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ میرے اور تمہارے درمیان میں جھوٹ کی ایک دیوار ہے۔ تمہاری وہی مثال ہے کہ آدمی ایک طرف چوری کرے اور دوسری طرف نماز پڑھے اور سمجھتا رہے کہ اس کا گناہ دھل گیا ہے۔ تم بھی ایک طرف مجھے دھوکا دے رہی ہو اور دوسری طرف اتنی محبت جتا رہی ہو۔ اتنی محبت کر رہی ہو کہ میں تمہاری طرف جھک جاتا ہوں مگر وہ کانٹا چبھتا ہے۔ میں تمہارے دھوکے کو کیسے قبول کر سکتا ہوں؟ اب ہماری دوستی اسی صورت میں ہوگی کہ پہلے تم مجھے رخسانہ کے بارے میں بتاؤ گی۔ نہیں بتاؤ گی تو میں کبھی تمہارے گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔"

"نہیں جانی! اسے میرا گھر مت کہو۔ وہ ہم دونوں کا گھر ہے۔ میں یہ سوچ کر آئی ہوں کہ اب تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ یہ دھوکا' یہ جھوٹ تمہیں غصہ دلاتا ہے اور مجھ سے دور لے جاتا ہے۔ جو چیز تمہیں اور مجھے ایک دوسرے سے دور کرے میں اسے اپنے درمیان قائم نہیں رکھوں گی۔ گھر کے اندر چلو' میں اطمینان سے تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔"

جانی خوش ہو کر وہاں سے اٹھا پھر ٹیکسی سے باہر آگیا۔ اس نے رخسانہ کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔ چاندنی ان کے چہروں پر کھل رہی تھی۔

○☆○

آئینے کے سامنے جاؤ تو آئینہ نظر نہیں آتا' بس ہم نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ سر سے پاؤں تک کوئی عیب نہیں تھا۔ اس کا چہرہ بھی آدھا نہیں تھا' پورا تھا۔ وہ چہرہ چپ رہ کر بھی بولتا ہوا نظر آتا تھا۔ سنجیدہ رہ کر مسکراتا ہوا

محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایسا چہرہ تھا جو نظروں سے گم ہو کر بھی جانی کو نظر آتا رہتا تھا۔

ٹھیک ہے' آئینے کے سامنے جاؤ تو آئینہ نظر نہیں آتا۔ جو سامنے ہوتا ہے' وہی نظر آتا ہے لیکن وہ آئینے کے سامنے پہنچ کر اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب بھی اپنا چہرہ دیکھنے جاتی' جانی نظر آجاتا تھا۔ جانی کو آئینے سے مٹانا چاہتی تو ٹیکسی نظر آجاتی تھی' پھولوں کی پنکھڑیاں چور جذبوں کی طرح پچھلی سیٹ پر بکھر جاتی تھیں وہ اس کے خیال سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی' پھر ناکام ہو کر آئینے کے پاس سے ہٹ جاتی تھی۔ کھانے کے لیے بیٹھتی تو کلفٹن کا ریسٹورنٹ یاد آجاتا۔ جانی کی مردانہ وجاہت اور شخصیت نے ایسا اثر چھوڑا تھا کہ کالج کے تمام ساتھی حقیر نظر آتے تھے۔

آج تو حد ہو گئی۔ ایک سال دو مہینے تک اس سے چھپتے رہنے کے بعد اچانک ہی سامنا ہو گیا تھا۔ اگر صدر میں اتنی بھیڑ نہ ہوتی اور رکشا ڈرائیور رکشا کو اپنی دھن میں چلاتا نہ رہتا تو کیا ہوتا؟ جانی آکر اس کی کلائی پکڑ لیتا اور وہ چھڑا نہ سکتی۔ وہ اسے باتیں سناتا اور وہ ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے سنتی رہتی۔ اگر وہ اسے سربازار اٹھا کر لے جاتا' تب بھی وہ کچھ نہ کر سکتی۔ اس لمحے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے رکشا والے کو رکنے کے لیے نہیں کہا تھا صرف اس وجہ سے کہ وہ جانی سے ڈر گئی تھی ورنہ اس کے لیے تو دل پھڑپھڑاتا رہتا تھا اور وہ سوچ کے پر پھڑپھڑا کر اس کے پاس پہنچ جایا کرتی تھی۔

اس وقت بھی وہ جانی کے پاس پہنچی ہوئی تھی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن تصور کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ رکشے کے پیچھے دوڑتا ہوا اور اسے پکارتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی تڑپ اسے تڑپا رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ لوگوں کی بھیڑ میں وہ کیسے ٹکرا رہا ہے' کیسے گر رہا ہے اور پھر سنبھل رہا ہے اور اسے پکارتا چلا آرہا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ ایک برس دو مہینے میں وہ اسے بھلا نہیں سکا تھا۔ اسے اس قدر یاد رکھا تھا کہ اسے دیکھتے ہی دیوانہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ سربازار پکارے گا تو خود رسوا ہو گا اور اسے بھی رسوا کرے گا۔ عشق' رسوائی کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا۔

اچانک ہی تصور کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ جانی نگاہوں کے سامنے سے بجھ گیا اور اب کمرے کی روشنی میں اسے اپنی امی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ سوئچ بورڈ

کے پاس کھڑی ہوئی حیرانی سے پوچھ رہی تھیں "فری! تم کب تک اندھیرے میں بیٹھی رہو گی؟ وہاں مریض عورتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا "امی! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آج ڈسپنسری میں نہیں بیٹھوں گی۔ عورتوں سے کوئی بہانہ کر دیں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی! مریضوں کے لیے اپنا مرض بھولنا پڑتا ہے۔ اپنی تکلیف کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تب ہی تم ڈاکٹر بن کر عملی زندگی گزار سکتی ہو۔ کیا پھر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے جو تمہارے دل اور دماغ کو متاثر کر رہی ہے۔ تم تو ٹھیک ہو چلی تھیں کیا وہ پھر.....؟"

فری نے گہری سانس کھینچی پھر ایک طرف سر کو ڈھلکا کر کہا "ہاں امی! وہ پھر....."

"ہائے بیٹی! یہ کیسی نادانی ہے۔ تم نے اسے بھلا دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں' اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے بعد اپنے کٹے ہوئے پاؤں کو دیکھو اور دل کو سمجھاؤ کہ تمہارے قدم اب اس کی طرف نہیں جا سکتے۔ تم نے اپنی خوشی سے اپنی خوشیوں کو رخسانہ کی جھولی میں ڈال دیا تھا' اب ماتم کرو گی تو یہ تمہاری حماقت ہو گی۔ اسے یاد نہ کرو بیٹی! یہ روگ بہت برا ہوتا ہے۔"

"امی! یاد کرنے کی بات ہوتی تو میں سچ کہتی ہوں کہ اسے کبھی یاد نہ کرتی۔ آپ یقین کریں کہ وہ خود یاد آتا ہے۔ یاد کی دھوکا بازی تو یہی ہے کہ وہ دھوکے سے چلی آتی ہے۔"
اس نے اپنی امی کو دیکھتے ہوئے کہا "مگر امی آج تو کچھ اور ہی بات ہو گئی۔"

"کیا ہو گیا؟"

"آج وہ یاد نہیں آیا' خود سامنا ہو گیا۔"

"کیا؟" اس کی امی نے چونک کر اپنی بیٹی کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "کیا آج اس سے سامنا ہو گیا؟"

فری نے اثبات میں سر ہلایا انہوں نے کہا "بیٹی! میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ ایک شہر میں کوئی کسی سے چھپ کر نہیں رہ سکتا۔ آج نہیں تو کل' ایک دن بعد نہ سہی ایک سال

بعد‘ کبھی تو سامنا ہوگا۔ اسے تو بہت پہلے ہی پتا چل گیا ہوگا کہ دلہن بدل گئی ہے پھر اس سے چھپنے کا فائدہ؟ رخسانہ نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہوگا۔“

”امی! اگر رخسانہ سمجھا دیتی اور وہ سمجھ لیتا تو اتنی بھیڑ میں مجھے دیوانوں کی طرح پکارتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے نہ بھاگتا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ رکشے والا تیزی سے رکشا دوڑاتا ہوا مجھے بھیڑ سے نکال کر لے گیا۔ اگر وہ میرے قریب چلا آتا تو میں اس سے کیا کہتی؟ کیسے اس کا سامنا کرتی؟“

”بیٹی! بات بڑھاؤ تو بڑھتی ہے۔ ختم کرنا چاہو تو جلد ہی ختم ہوجاتی ہے۔ میں اگر بادشاہ جانی سے جاکر ملوں اور اس کو سب کچھ بتادوں‘ پھر اس کے قدموں میں گر کر التجا کروں کہ وہ تمہارا خیال دل سے نکال دے اور تمہارا پیچھا نہ کرے تو....“

فری نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا ”تو کچھ نہیں ہوگا۔ امی آپ جانتی ہیں کہ رخسانہ کتنی ذہین اور معاملہ فہم ہے۔ جب وہ جانی کو نہ سمجھا سکی‘ اس کی شریک حیات ہوکر اس کا دل نہ جیت سکی تو آپ اسے کیا سمجھائیں گی۔ اس کی دیوانگی بتاتی ہے کہ جو لوگ سیدھے سادے‘ سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی لگن کے بھی سچے اور پکے ہوتے ہیں۔ اس کی یہ لگن میرے لیے پریشانی کا باعث بن گئی ہے۔“

”فری! میں تمہاری ماں ہوں مگر سہیلی بن کر بھی تمہارے دکھ بانٹ لیتی ہوں۔ تمہیں طرح طرح کے مشورے دیتی ہوں میں‘ پھر کہتی ہوں کہ ماں بن کر جو مشورہ تمہیں دے رہی ہوں اسے قبول کرو کیونکہ بڑوں کا تجربہ کچھ اور ہوتا ہے۔ تم اگر اب تک شادی کرچکی ہوتیں تو بادشاہ جانی کا خیال کم از کم تمہارے دل اور دماغ سے نکل چکا ہوتا تو وہ باہر سے چاہے جتنی محبت‘ ہمدردی اور دیوانگی لے کر آئے‘ اس کا اثر ایسا نہیں ہوتا‘ جیسا تم پر ہورہا ہے۔“

فری نے کوئی جواب نہیں دیا‘ آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی امی نے کہا ”بیٹی! ہم اس معاملے پر بعد میں بھی غور کرسکتے ہیں اور بحث کرسکتے ہیں۔ دیکھو‘ مریضوں کو واپس نہ لوٹاؤ۔ ان کے پاس جاؤ۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہو گی تو اپنا دکھ ذرا ہلکا ہوگا۔ چلی جاؤ بیٹی۔“

فری نے آنکھیں کھولیں پھر تھکے ہوئے انداز میں کرسی سے اٹھ کر اس کمرے کا

دروازہ کھولتے ہوئے باہر والے کمرے میں چلی گئی جو کہ ڈسپنسری کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے میں ایک میز اور کرسی تھی۔ وہاں وہ بیٹھ کر مریض عورتوں کو دیکھتی تھی۔ ان کے مرض کی تشخیص کرتی تھی۔ نسخے لکھتی تھی۔ وہیں ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک لڑکا کمپاؤنڈر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ دوسرا کیبن ایک ویٹنگ روم تھا جہاں مریض عورتیں اور بچے اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

فری کا سارا دھیان صدر ایمپریس مارکیٹ والے راستے پر تھا۔ نگاہوں کے سامنے بادشاہ جانی بھیڑ میں دھکے کھاتا دوڑ رہا تھا اور اس کے رکشے تک پہنچنے میں ناکام ہورہا تھا۔ فری نے سوچا کہ آج مریض عورتوں اور بچوں کو سرسری طور پر دیکھے۔ کسی کی نبض تھام لے‘ کسی کو اسٹیتھسکوپ لگا کر دیکھے۔ ان کی تسلی کرے پھر پچھلے دن والا نسخہ دہرا دے تاکہ تشخیص کرنے اور نسخہ لکھنے میں حاضر دماغی کی ضرورت نہ پڑے۔ دماغ اس وقت کسی کام کا نہیں رہا تھا لیکن جب پہلی مریضہ اس کے پاس آئی تو وہ اسے یونہی نہ ٹال سکی۔ وہ بے چاری بری طرح بیمار تھی۔ اس کی صحیح طرح تشخیص کرنے میں اس کا دل لگ گیا۔ یکے بعد دیگرے دوسری مریض عورتیں اور بیمار بچے آتے گئے اور وہ ان میں مصروف ہوگئی۔ اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ جب آخری مریضہ رہ گئی تو ڈسپنسری کے باہر سڑک پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کمپاؤنڈر سے کہا ”ذرا دیکھو تو کون آیا ہے۔“

کمپاؤنڈر نے کیبن کی کھڑکی سے جھانک کر باہر کی طرف دیکھا پھر کہا ”ٹیکسی میں کوئی آیا ہے۔“

یہ سنتے ہی فری ایک دم گھبرا گئی۔ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر آخری مریضہ سے یہ بولتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ ”بس ابھی آتی ہوں‘ تم بیٹھی رہو۔“

یہ کہتے ہی وہ دروازہ کھول کر اپنے مکان کے رہائشی حصے میں چلی آئی۔ اس کمرے میں اس کی امی نہیں تھیں۔ وہ وہاں سے گزرتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچی۔ اس کمرے کے ساتھ ایک کوریڈور تھا۔ اس کے بعد ایک باورچی خانہ تھا۔ وہاں امی مل گئیں۔ انہوں نے پوچھا ”کیا بات ہے بیٹی! ساری مریض عورتیں چلی گئیں؟“

”امی! بس ایک رہ گئی ہے مگر وہ باہر ٹیکسی آئی ہے۔“

اس کی امی نے بھی گھبرا کر اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا "کیا وہ یہاں تک بھی پہنچ گیا ہے؟"

وہ بولی "پتا نہیں، میں نے دیکھا نہیں ہے۔"

اس کی امی نے اطمینان کی سانس لے کر کہا "بیٹی! تم خود بھی گھبرا جاتی ہو اور مجھے بھی پریشان کر دیتی ہو۔ تمہیں دیکھنا تو چاہیے کہ ٹیکسی میں کون آیا ہے؟ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔ ذرا ہانڈی کا خیال رکھو سالن نہ جل جائے۔"

یہ کہہ کر وہ باورچی خانے سے نکل آئیں۔ فری چولہے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیگچی سے ڈھکن ہٹا کر سالن کو دیکھا۔ اس میں چمچہ ہلایا۔ ایسا کرتے وقت وہ دماغی طور پر حاضر نہیں تھی۔ باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر آگیا تھا اور اب اس کی ڈسپنسری کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "دروازہ کھولو، میں تمہیں تلاش کرتے ہوئے آگیا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد اس کی امی نے واپس آ کر کہا "بیٹی! ڈسپنسری میں جاؤ۔ ٹیکسی میں ایک مریضہ آئی ہے۔ بے چاری کی حالت بہت خراب ہے۔ تم تو خواہ مخواہ گھبرا گئی تھیں۔ وہ بھلا یہاں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ وہ اگر آئے گا تو باہر ٹیکسی میں بیٹھا رہے گا۔ تم تو صرف عورتوں اور بچوں کا علاج کرتی ہو۔ تمہارا اس سے یہاں سامنا نہیں ہو گا۔"

وہ مطمئن ہو کر باورچی خانے سے نکلی اور ڈسپنسری کی طرف جانے لگی۔ محبت ایک بار دھوکا بن جائے تو بار بار دھوکا دے کر ڈراتی ہے۔ شہر کی سڑکوں پر دوڑنے والی ہر ٹیکسی کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ اس کا محاسبہ کرنے چلا آ رہا ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہتی اور باہر سے کسی ٹیکسی کی آواز سنائی دیتی تب بھی ڈر لگتا کہ وہی ٹیکسی آگئی ہے۔

اس نے کسی طرح ڈسپنسری کا کام نمٹا لیا پھر کمپاؤنڈر کو ڈسپنسری بند کرنے کے لیے کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کی امی نے کہا "منہ ہاتھ دھو لو، میں کھانا لگا رہی ہوں۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔"

"تمہاری مرضی لیکن یہ تو جانتی ہو نا کہ تمہارے بغیر میں بھی نہیں کھاتی۔ چلو آج ہم دونوں ہی بھوکے سو جائیں گے۔"

"امی! آپ کی محبت کبھی کبھی میرے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ یہ کیا تک ہے، آپ کیوں نہیں کھا لیتیں؟"

"یہی سوال میں تم سے کر سکتی ہوں۔ تم نے یہ روگ کیوں پال رکھا ہے؟ تم ڈاکٹر ہو، دنیا جہاں کی بیماریوں کا علاج کرتی ہو۔ اگر تمہارے پاس اپنی اس بیماری کا علاج نہیں ہے تو میں علاج تجویز کرتی ہوں، اس پر عمل کرو۔"

وہ سر جھکا کر باتھ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر آئی اور کھانے کے لیے بیٹھ گئی۔ کھانے کے بعد جلد ہی وہ ماں سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آئی۔ دروازے کو بند کیا پھر تھوڑی دیر تک ایک کرسی پر بیٹھی سوچتی رہی۔ اس کے بعد اپنی چھوٹی سی میز کے پاس آئی۔ وہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے میز کی دراز کھولی۔ اس میں پچھلے سال کی ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ اس کی پلاسٹک کی جلد سبز رنگ کی تھی۔ اس ڈائری کو اٹھاتے وقت وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے میز پر رکھ کر بے خیالی میں اپنے ایک ہاتھ سے اسے سہلانے لگی۔ جب وقت کچھ دے کر یا کچھ لے کر گزر جاتا ہے، جب کوئی ظالم لمحہ اپنے پیاروں سے جدا کر دیتا ہے اور جب محبت کی آنکھوں میں آنسو خشک ہونے لگتے ہیں اور دل کو ذرا ذرا صبر آنے لگتا ہے۔ تب یہ ڈائری ماتم کا گھر بن جاتی ہے۔ گزرے ہوئے لمحوں کی ایک ایک تصویر دکھاتی ہے۔ آنکھوں کے آنسوؤں کو تازہ کرتی ہے اور دل میں یادوں کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں اور یہ ڈائری بھی یہی کر رہی تھی۔

دس برس پہلے جب وہ پندرہ برس کی تھی تب پہلی بار رخسانہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ناظم آباد کے ایک مکان میں رہائش کے لیے آئے تھے۔ وہ مکان اس کے ابو نے خرید لیا تھا۔ وہ اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھنے لگی تو پڑوس میں ایک نہایت ہی حسین لڑکی نظر آئی جو اس کی ہم عمر تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مسکرائیں پھر لڑکی کھڑکی کے قریب آ کر بولی "میرا نام رخسانہ ہے۔ کیا تم یہاں نئی آئی ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی "ہاں! میرے ابو نے یہ مکان خریدا ہے۔ میرا نام فرزانہ ہے۔ ابو اور امی پیار سے مجھے فری کہتے ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولی "تم بڑی پیاری ہو۔ میں بھی تمہیں فری کہوں گی۔"

فری نے کہا "تم بھی تو بہت پیاری ہو۔ میں تم سے دوستی ضرور کروں گی۔"

پھر دونوں میں دوستی ہو گئی۔ وہ نویں جماعت میں پڑھ رہی تھیں۔ اسکول الگ الگ تھے مگر کچھ ہی دنوں میں ایک دوسری کی گہری سہیلیاں بن گئیں۔ یہ فیصلہ کرلیا کہ میٹرک پاس کرلیں تو ایک ہی کالج میں داخلہ لیں گی۔ وہ دونوں رفتہ رفتہ ایک دوسرے کی عادی ہونے لگی تھیں۔ کھانے کے وقت بھی کبھی کبھی فری اپنے گھر کا سالن لے کر اس کے یہاں پہنچ جاتی اور اس کے ساتھ کھانے بیٹھ جاتی اور کبھی رخسانہ اپنے گھر کا کھانا لے کر فری کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ دونوں ایک ساتھ ہی پڑھنے بیٹھتی تھیں۔ جیسی حسین تھیں ویسی ہی ذہین بھی تھیں۔ اپنی اپنی کلاس میں ٹاپ پر رہتی تھیں وہ نویں سے دسویں کلاس میں آئیں اور دبے قدموں جوانی کی سرحد میں پہنچ گئیں۔

انہیں پتا نہ چلا کہ وہ کیسے رفتہ رفتہ جوان ہوئیں لیکن جب ان کی دنیا بدلنے لگی، آس پاس کا ماحول پہلے سے زیادہ رنگین اور پر فضا دکھائی دینے لگا تو کبھی کبھی سرگوشیاں کرنے لگیں۔ منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔ رات کو پڑھتے پڑھتے ایک ہی بستر پر سو جایا کرتی تھیں۔ بڑی رات تک دونوں میں کھسر پھسر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی رخسانہ کی ماں دوسرے کمرے سے آواز دیتی۔ یہ تم اتنی رات تک کیوں جاگتی رہتی ہو؟ چلو اب منہ دبا کر سو جاؤ۔ کبھی فرزانہ کی ماں صبح اٹھ کر کہتیں یہ دن چڑھے تک کیوں سوتی رہتی ہو؟ جلدی اٹھنے کی عادت ڈالو، صبح اٹھ کر پڑھا کرو۔

مگر صبح ان سے اٹھا نہیں جاتا تھا۔ انگڑائیوں پر انگڑائیاں آتی تھیں۔ اب وہ اتنی اونچی پوری ہو گئی تھیں کہ انگڑائی کے لیے اٹھنے والے ہاتھ طاق تک پہنچ جاتے تھے۔ کبھی رخسانہ کی ماں کہتی تھی "ان لڑکیوں نے میڈیکل میں داخلہ لیا ہے۔ اگر کچھ اور پڑھائی پڑھتیں تو میں رخسانہ کی ضرور شادی کر دیتی۔"

فرزانہ کی امی کہتیں "ہاں بہن! اب تو مجبوری ہے۔ ان لوگوں کے ڈاکٹر بننے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

رخسانہ اور فرزانہ تنہائی میں کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اداس ہو جاتی تھیں اور ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں "کیا ہم شادی کے بعد بچھڑ جائیں گے؟ اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں گے۔ ہمارے گھر کہاں ہوں گے؟ کتنی دور ہوں گے؟ ایک ہی بستی میں ہوں گے یا ایک ہی شہر میں ہوں گے؟ یا ایک یہاں رہے گی اور دوسری کو کوئی سمندر پار

لے جائے گا؟"

دونوں نے فیصلہ کیا کہ شادی کے لیے باقاعدہ منصوبہ بنائیں گی۔ اپنے اپنے لیے ایسے جیون ساتھی تلاش کریں گی جو ایک ہی محلے اور ایک ہی پڑوس میں رہتے ہوں تاکہ وہ شادی کے بعد ایک دوسرے کی پڑوسنیں بن کر رہ سکیں۔ دونوں سہیلیوں میں صرف خوبیاں ہی نہیں تھیں انسانی خامیاں بھی تھیں۔ رخسانہ ذرا مغرور تھی۔ وہ اکثر فخر سے کہتی تھی "میرے لیے تو رشتوں کی لائن لگی رہتی ہے۔ گھر سے باہر نکلو تو محلے میں، سڑکوں پر اور کالج میں، جسے دیکھو وہی مجھے دیکھتا رہتا ہے۔"

بے شک وہ فرزانہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ حسین تھی مگر فرزانہ اس کے مقابلے میں کچھ زیادہ ذہین تھی۔ فرزانہ کے حسن میں سادگی تھی۔ مشرقیت تھی۔ اس کے حسن میں دھیمی دھیمی سی آنچ تھی جو دیکھنے والوں کو گرماتی تھی۔ رخسانہ شعلہ تھی۔ دیکھنے والوں کو جلا کر رکھ دیتی تھی۔

فرزانہ کو رخسانہ کا یہ غرور پسند نہیں تھا۔ جب وہ بڑھ چڑھ کر اپنے بارے میں کچھ بولتی تو فرزانہ بھی اس سے پیچھے نہیں رہتی تھی۔ اپنی تعریف میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور بولتی تھی۔ اس طرح دونوں سہیلیوں میں کبھی کبھی ناراضگی ہو جاتی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے روٹھ جاتی تھیں مگر جلد ہی ایک دوسرے کو منا بھی لیتی تھیں۔

ایک بار یوں ہوا کہ کالج کے پتے پر انہیں ایک خط موصول ہوا۔ کالج کے ہی کسی شریر اسٹوڈنٹ نے خط لکھا تھا۔

"اے پیاری سہیلیو! تم میں سے ایک شعلہ ہے ایک شبنم ہے۔ ایک حسن سے مالا مال ہے۔ دوسری حسین اداؤں سے بھرپور ہے۔ میں تم میں سے ایک کا دیوانہ ہوں۔ بھلا بتاؤ تو، کس نے مجھے دیوانہ بنایا ہے؟"

وہ دونوں ایسی چھچھوری نہیں تھیں کہ اس خط سے متاثر ہو جاتیں اور اپنے آپ پر اترانے لگتیں۔ انہوں نے اس خط کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن وہ خط ایک بارودی سرنگ کی طرح تھا جو ان کے لاشعور میں آہستہ آہستہ بارود کی طرح جلتا جا رہا تھا، ایک طرف رخسانہ فخر سے سوچ رہی تھی۔ وہ لکھنے والا بھلا اور کس کا دیوانہ ہوگا؟ میرے ہی متعلق اس نے لکھا ہے۔ دوسری طرف فرزانہ خود کو کمتر نہیں سمجھتی تھی، اس خط کو اپنی ذات

سے منسوب کر رہی تھی۔ وہ دونوں اس لکھنے والے کے عشق میں مبتلا نہیں تھیں اور نہ ہی اس لکھنے والے کو کوئی اہمیت دے رہی تھیں لیکن اس خط نے عورت والے حسد اور جلاپے کو دونوں سہیلیوں کے درمیان سلگا دیا تھا۔

رخسانہ نے وہ خط فرزانہ کو دیتے ہوئے کہا "اونہہ! یہ لڑکے مجھے چھیڑنے سے باز نہیں آتے۔"

فرزانہ نے اس کے ہاتھ سے خط لینے کے بعد اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا "جو مجھے چھیڑتا ہے میں اس کے ایسے ہی ٹکڑے کر دیتی ہوں۔"

رخسانہ نے کہا "اس نے مجھے چھیڑا ہے۔"

فرزانہ نے ہنستے ہوئے کہا "دونوں کو چھیڑا ہے۔ وہ اس کالج کے احاطے میں کہیں بھی کھڑا ہو کر دیکھ رہا ہوگا تو اسے جواب میری طرف سے مل گیا ہے۔ وہ مجھے خط پھاڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوگا۔"

"جواب میں بھی دے سکتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے رخسانہ نے اس کے ہاتھ سے پھٹے ہوئے خط کو چھین لیا پھر اسے اور پھاڑتے ہوئے بولی "اب تو وہ مجھے بھی دیکھ رہا ہوگا نا؟"

بات آئی گئی ہو گئی لیکن ان دونوں کو چپ لگ گئی۔ وہ گھر پہنچ کر ایک دوسرے سے ذرا کھنچی کھنچی سی رہیں۔ دونوں کے دماغ میں ایک ہی تجسس تھا۔ ایک ہی بے چینی تھی۔ وہ دل میں سوچتی تھیں کہ خط لکھنے والے پر ہزار بار لعنت لیکن اس نے کسے لکھا تھا۔ مجھے لکھا تھا؟

دوسری بھی یہی سوچتی تھی۔ مجھے لکھا تھا مگر میں اس لکھنے والے پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔

دونوں کے درمیان ایک خاموش جنگ جاری تھی۔ پھر انہی دنوں فرزانہ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ گھر کا سرپرست دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ رخسانہ نے بے نام سی لڑائی کو بھول کر فرزانہ کو گلے لگا لیا۔ اسے تسلیاں دیں۔ اسے محبت دی۔ رخسانہ کی امی نے فرزانہ کی امی کو حوصلہ دیا مگر صرف حوصلے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اب یہ مسئلہ سامنے آ گیا تھا کہ ڈاؤ میڈیکل کالج کی مہنگی پڑھائی فرزانہ جاری رکھ سکے گی یا نہیں؟

فرزانہ کے ابو ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے۔ موت کے بعد اس ملازمت سے

کچھ نہ ملا۔ البتہ ان کی پچیس ہزار روپے کی بیمہ پالیسی تھی۔ وہ رقم مل گئی لیکن اتنی سی رقم کب تک ساتھ دے سکتی تھی۔ رخسانہ کی امی ایک اسکول میں ٹیچر تھیں۔ انہوں نے اسی اسکول میں فرزانہ کی امی کو بھی کام سے لگا دیا۔ وہ بھی لڑکیوں کو پڑھانے لگیں۔ اس طرح ماہانہ آمدنی کا ذریعہ نکل آیا۔ فرزانہ کی تعلیم کسی طرح جاری رہی۔

میڈیکل کا دوسرا سال شروع ہوا تو رخسانہ کو ویسا ہی ایک شرارتی خط ملا جس میں لکھا تھا۔

"میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ تمہارے بغیر چین سے نہیں رہ سکتا۔ سوتے جاگتے تمہاری صورت دیکھتا ہوں۔ کیا تم میری محبت کا جواب محبت سے دوگی؟"

رخسانہ کو وہ خط پڑھ کر غصہ آیا۔ وہ ایسا چھچھورا پن پسند نہیں کرتی تھی لیکن اس نے خط اپنی کاپی میں رکھ لیا پھر کلاس میں بیٹھی ہوئی فرزانہ کے پاس جا کر وہ خط اسے دکھایا۔ فرزانہ نے وہ خط پڑھ کر اسے واپس کرتے ہوئے کہا "اس خط کو پھاڑ کر پھینک دو۔ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔"

رخسانہ نے اسی وقت مسکراتے ہوئے فاتحانہ انداز میں اس خط کو پھاڑ دیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ دونوں دوسرے طلبا اور طالبات کے ساتھ مردہ خانے میں گئیں وہاں لاشوں کو دیکھتی رہیں۔ ان کی کلاس لینے والے ایک ڈاکٹر نے کہا کہ کل ڈس سکشن کی کلاس ہوگی۔ وہ کلاس اٹینڈ کرنے کے لیے جن طلبا اور طالبات کی فہرست بنائی گئی تھی ان میں فرزانہ اور رخسانہ کا نام بھی شامل تھا۔

مردہ خانے سے واپسی پر رخسانہ کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ لاشوں کو دیکھنے کے بعد عجیب سی طبیعت ہو گئی تھی۔ فرزانہ نے کہا "تم تو ابھی سے گھبرا رہی ہو۔ کل جب کسی لاش کو چیرنا پھاڑنا ہوگا تب کیا ہوگا؟ ڈاکٹر بننا ہے تو ایسے کام کرنے ہی ہوں گے۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کینٹین سے کوک لے کر آتی ہوں۔"

وہ اپنی کتاب اور کاپی ساتھ والی میز پر رکھ کر کینٹین کی طرف چلی گئی۔ دس منٹ میں ہی وہ ایک ٹھنڈی بوتل لے آئی رخسانہ اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر پینے لگی۔ اسی وقت فرزانہ کی نظر اپنی کتاب اور کاپی کی طرف گئی۔ کاپی سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ جھانک رہا تھا۔ اس نے اسے فوراً ہی کاپی سے کھینچ کر دیکھا اور پھر اسے کھول کر پڑھا۔

"ڈیئر فری! میں آتشی حسن کا نہیں شبنمی حسن کا دیوانہ ہوں۔ کیا تم میری محبت کا جواب محبت سے دوگی۔"

یہ پڑھتے ہی فرزانہ نے وہ کاغذ رخسانہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دیکھو! اس بدمعاش لڑکے نے مجھے بھی خط لکھا ہے۔"

رخسانہ نے وہ کاغذ لے کر پڑھا پھر اسے مٹھی میں بھینچ کر فرزانہ کو دیکھتے ہوئے بولی "تم احساس کمتری میں مبتلا کیوں ہو جاتی ہو؟ ابھی دو گھنٹے پہلے میں نے تمہیں وہ خط دکھایا تو تم نے جواب میں یہ خط پیش کر دیا۔ سچ سچ بتاؤ۔ کیا یہ خط تم نے کسی سے لکھوایا نہیں ہے؟"

فرزانہ نے کہا "کیسی بات کرتی ہو رخسانہ؟ کیا میں اس بات کی پبلسٹی کرتی پھرتی ہوں کہ لوگ مجھے خط لکھتے ہیں۔ کیا تم مجھ سے ایسی سستی حرکتوں کی توقع کرتی ہو؟"

"میں خوب سمجھتی ہوں۔ تم میری کاٹ کرنا چاہتی ہو۔ یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میں تم سے کم تر ہوں۔ تم ایک ایسی روشن شمع ہو جس کے چاروں طرف پروانے دیوانہ وار چکر لگاتے رہتے ہیں۔"

"تم بکواس کر رہی ہو۔ اگر میں نے خود لکھا ہے یا کسی سے لکھوایا ہے تو کب لکھوایا ہے؟ میں تو تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔ صرف دس یا پندرہ منٹ کے لیے کینٹین تک گئی تھی اور وہاں سے تمہارے لیے بوتل لے کر واپس آئی ہوں۔ اس وقت تم یہاں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میری کتاب اور کاپی کی طرف توجہ نہیں دے رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کسی نے موقع پا کر یہ کاغذ رکھ دیا ہو لیکن میں یہ وضاحت کیوں کر رہی ہوں؟ کیا تم میری اماں لگتی ہو؟ کیا تم اپنے وقت کی قلوپطرہ ہو کہ میں تمہارے سامنے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاؤں۔"

"اصل بات یہی ہے کہ تم میرے سامنے احساس کمتری میں مبتلا رہتی ہو۔"

فری نے "اونہہ" کہا پھر اس نے اپنی کتاب اور کاپی اٹھائی اور اس کے پاس سے دور چلی گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے دور رہیں۔ کالج کی بس میں بیٹھ کر جاتے وقت وہ الگ الگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر پہنچنے کے بعد بھی شام تک وہ ایک دوسرے سے نہیں بولیں۔ ان کی ماؤں نے سمجھ لیا کہ دونوں سہیلیوں نے پھر جھگڑا کیا ہے

لیکن انہوں نے ان کی صلح نہیں کرائی۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتیں پھر مل بیٹھیں گی۔ رات کو کھانے کا وقت ہوا تو رخسانہ اپنے گھر سے سالن لے کر فری کے پاس آگئی پھر بولی "چلو بہت غصہ دکھالیا۔ آؤ کھانا کھالیں۔"

فری نے کہا "میں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ جاؤ تم اپنے گھر میں کھالو۔"

"کیوں جاؤں؟ کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟ زیادہ نخرے نہ دکھاؤ...."

لیکن وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں بھی رخسانہ نے آکر اسے منایا لیکن فری اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ تب رخسانہ لال رنگ کے مارکر سے اپنے چہرے کو بگاڑنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "اگر تم مجھ سے ناراض ہو تو میں چلی جاؤں گی۔ ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھ لو۔"

"میں تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ تم بہت مغرور ہو۔"

"تم دیکھو تو سہی۔ میں نے اپنا غرور ختم کر دیا ہے۔"

فری نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ اس کے چہرے پر لال رنگ کے نشانات ایسے بنے ہوئے تھے کہ وہ کارٹون بن گئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی فری کو ہنسی آگئی۔ وہ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔ رخسانہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا "اچھا بابا! سمجھ گئی' میرا چہرہ بگڑا ہوا رہے تو تجھے خوشی ہوتی ہے۔ اللہ کرے میرا چہرہ ہی بگڑ جائے مگر تو مجھ سے نہ بگڑے۔"

فری نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "کیوں منحوس باتیں کرتی ہو؟ چلو بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ دونوں کھانے کی میز پر آگئیں۔

دوسرے دن کالج میں طلبا و طالبات چپ چپ سے تھے کیونکہ آج انہیں ایک لاش کے ساتھ وقت گزارنا تھا۔ وہ لوگ ڈریسنگ روم میں آئے' وہاں ان لوگوں نے اپنے لباس کے اوپر ایپرن پہنی۔ چہرے پر نقاب چڑھائی۔ ہاتھوں پر ربر کے پتلے دستانے پہنے پھر اس ہال میں پہنچے جہاں ایک میز پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی اور وہ سر سے پاؤں تک چادر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ اس لاش کے دونوں طرف دو ٹرالیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر

آپریشن سے متعلق اوزار رکھے ہوئے تھے۔ چھوٹے سے ہال میں یوں تو بلب روشن تھے لیکن لاش کے اوپر ایک ہیڈ لائٹ بھی تھی جو اس وقت روشن نہیں تھی۔ تمام طالب علم ایک ایک کر کے اس لاش کے دونوں طرف آکر کھڑے ہوگئے۔

ان کی رہنمائی کے لیے ایک انسٹرکٹر وہاں موجود تھا۔ پہلے تو اس نے یہ بتایا کہ ٹرالی پر رکھے ہوئے اوزاروں کو کس ترتیب سے رکھنا چاہیے تاکہ ضرورت کے وقت فوراً ہی وہ اوزار اپنی دسترس میں ہوں پھر اس نے طلبا اور طالبات کی دو ٹیمیں بنائیں۔ ایک ٹیم کا کام یہ تھا کہ وہ لاش کو ڈس سیکٹ کرتی اور انسٹرکٹر کی ہدایات کے مطابق اس لاش کو چیر کر اور کاٹ کر اس سے عملی سبق حاصل کرتی۔ دوسری ٹیم کا کام یہ تھا کہ وہ لاش چیرنے والوں کو اوزار سپلائی کرتی۔ جس وقت جو اوزار طلب کیا جاتا اس ٹیم کے ارکان کے ذریعے وہ فوراً ہی ان کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جاتا۔ ان ابتدائی مراحل سے گزرنے کے بعد' انسٹرکٹر کے حکم سے ہیڈ لائٹ روشن کر دی گئی۔ اب لاش کے اوپر بھرپور روشنی تھی۔ اس کے بعد اس کے اوپر سے چادر ہٹا دی گئی۔ چادر ہٹی تو کتنے ہی لڑکے اور لڑکیاں سہم کر ایک دم ساکت ہوگئے۔ فرزانہ نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے رخسانہ کے بازو کو تھام لیا۔ وہ لاش آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

انسان مرتے وقت آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اگر آنکھیں بند نہ کر سکے تو اس کے قریب رہنے والے مرنے کے بعد اس کی آنکھیں بند کر دیتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آنکھوں کو بند کرنے والا کوئی نہیں ہوتا یا پھر بقول شاعر وہ وعدے کے پابند ہوتے ہیں۔

فاضل نے بعد مرگ بھی رکھا وفا کا پاس
آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ترے انتظار میں

رخسانہ آگے بڑھ گئی اور فرزانہ ٹرالی کے پاس کھڑی رہی کیونکہ رخسانہ اس ٹیم میں تھی جو لاش کو ڈس سیکٹ کر رہی تھی۔ فرزانہ دوسروں کے ساتھ اس ٹیم میں تھی جو اوزار سپلائی کرنے پر مامور تھے اور عملی اناٹومی کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور سیکھ رہے تھے۔

ڈس سیکشن کی ابتدا اکثر لاش کے سینے پر دل کے قریب سے ہوتی ہے۔ جب یہ

ابتداء ہوئی تو ایک لڑکی کا سر چکرا گیا۔ اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک ساتھی کو تھام لیا اور کہا "میں باہر جاؤں گی۔"

اس کا ساتھی اسے تھام کر باہر لے گیا پھر وہ بھی واپس نہیں آیا۔ شاید وہ بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

ڈس سیکشن کا عمل جاری رہا۔ کس طرح جاری رہا' یہ وہی عمل کرنے والے سمجھ رہے تھے۔ رخسانہ اور فرزانہ کی تو یہ حالت تھی کہ وہ لاش پر ہونے والے عمل کو دیکھ تو رہی تھیں لیکن لاش کے چہرے پر نظر نہیں ڈالتی تھیں' اس کے چہرے سے نظریں چرا رہی تھیں۔ معلوم نہیں کیوں لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی ان کے درمیان اٹھ بیٹھے گی۔

رخسانہ ذرا دلیر تھی۔ فرزانہ اتنی دلیر نہیں تھی۔ ان حالات میں ڈر جاتی تھی۔ یوں تو کبھی گھر میں تنہا رہنا پڑ جاتا تو وہ اپنی امی کے بغیر دن رات گزار لیا کرتی تھی لیکن ایسے کمرے میں جہاں ایک لاش رکھی ہو' وہاں تو وہ کبھی تنہا نہیں رہ سکتی تھی۔ اگرچہ اس وقت وہ تنہا نہیں تھی مگر کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ اچانک بجلی فیل ہو جائے اور اندھیرا چھا جائے تو کیا ہوگا؟ کیا وہ لاش اندھیرے میں اٹھ کر بیٹھ جائے گی۔

وہ گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ جہاں کھڑی ہوئی تھی وہاں سے دروازے کا فاصلہ ذہن نشین کر رہی تھی تاکہ اچانک اندھیرا ہو تو وہ کسی طرح وہاں سے بھاگتی ہوئی اس ہال سے باہر نکل جائے گی۔ ڈاکٹر بننے والی سبھی لڑکیاں دلیر نہیں ہوتیں۔ کچھ فرزانہ کی طرح بزدل بھی ہوتی ہیں لیکن اپنی بزدلی کو چھپائے رکھتی ہیں جس طرح فرزانہ نے چھپایا ہوا تھا اور بڑے حوصلے کا اظہار کرتی ہوئی وہاں ڈس سیکشن کے لیے آگئی تھی۔ اس کلاس کو اٹینڈ کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے ڈس سیکشن کا عمل ختم ہوا۔ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ اس کے کسی بھی ٹکڑے کو ہال کے باہر نہیں لے جایا جاتا۔ اس لیے ان سب کو تیزاب میں گلا دیا جاتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے پیالے اور تیزاب کی بوتلیں لا کر طلبا اور طالبات کے پاس رکھ دی گئی تھیں تاکہ وہ آخری مرحلے سے گزریں۔ فرزانہ تیزاب کی بوتل کھول کر پیالے میں تیزاب انڈیلنے لگی۔ اس کے دائیں طرف ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ بائیں طرف

رخسانہ تھی جہاں پیالا رکھا ہوا تھا۔ وہیں لاش کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ تیزاب انڈیل رہی تھی اور اس ہاتھ کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے بازو میں کھڑے لڑکے نے پتا نہیں لاش کو کس طرح ہاتھ لگایا' یا کوئی حرکت کی کہ لاش کا ہاتھ ذرا ادھر ادھر ہل گیا۔ فرزانہ کی سمجھ میں یہی آیا کہ لاش حرکت کر رہی ہے اور اب اٹھ کر بیٹھنے والی ہے۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ مارے دہشت کے تیزاب کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پیالے پر گری تو اس پیالے کا تیزاب ایک دم سے اچھل کر رخسانہ کے چہرے کی طرف آیا۔ اس کے ساتھ ہی رخسانہ کی چیخیں ہال میں گونجنے لگیں۔ فرزانہ تیزاب سے محفوظ رہی تھی کیونکہ وہ ہاتھ کے جلتے ہی بوتل کو پیالے میں چھوڑ کر ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی تھی اور بھاگتے ہوئے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ جو طلبا اور طالبات پہلے سے دہشت زدہ تھے۔ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگتے چلے گئے۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ رخسانہ پر کیا گزر رہی ہے۔

وہ فرش پر تڑپ رہی تھی۔ انسٹرکٹر اور دو لڑکے جو خاصے دلیر تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اسے سنبھالا تاکہ یہ جان سکیں کہ تیزاب سے کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ انہوں نے فوراً ہی رخسانہ کے چہرے سے نقاب کو کھول دیا۔ اس کا آدھا چہرہ متاثر ہوا تھا۔ گردن اور شانے پر بھی تیزاب کے چھینٹے پڑے تھے۔ وہ اسے فوراً ہی اٹھا کر ہال سے باہر لے گئے اور دوسرے کمرے میں لے جا کر فوری طبی امداد پہنچانے لگے۔

وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن کالج کے تمام طلبا اور طالبات آ کر اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے اور افسوس کرنے کے ساتھ ساتھ منہ پھیر رہے تھے اس لیے کہ وہ آدھا چہرہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ فرزانہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ ہر آنے جانے والا سوال کرتا تھا۔ یہ کیسے ہوا؟ جواب ملتا تھا۔ فرزانہ کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ کر پیالے میں گری۔ پیالے کا تیزاب اچھل کر رخسانہ کے چہرے پر آ گرا۔

ایسا دانستہ ہوا یا نادانستہ' لیکن فرزانہ مجرم بن گئی تھی۔ اب آنے والا وقت ہی اپنا فیصلہ سناتا کہ حقیقت کیا ہے؟ اور جو حقیقت ہے اسے رخسانہ کے گھر والے تسلیم کریں گے یا نہیں؟ رخسانہ کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس کے والد اور والدہ کو خبر کر دی گئی۔

دوسرے رشتے دار بھی اسپتال میں دوڑے چلے آئے۔ جب وہ اسپتال پہنچے تو رخسانہ کو ہوش آ چکا تھا۔ دو نرسیں اور وارڈ بوائے اسے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اسے اس کا چہرہ دکھایا جائے اس کے سامنے آئینہ لایا جائے۔

اس کی امی نے اسے دیکھا تو چیخ مار کر اس کے بستر کے پاس گر پڑیں "ہائے! یہ کیا ہو گیا۔ میری بیٹی سے کس نے دشمنی کی ہے کس نے تیزاب پھینکا ہے۔ میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔ اس کی صورت بگاڑ دوں گی۔"

فرزانہ ایک طرف کھڑی تھی۔ رخسانہ نے اس کی طرف دیکھا' پھر ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی بولی "وہ کمینی کھڑی ہے۔ اس نے میرے منہ پر تیزاب پھینکا ہے۔ یہ مجھ سے جلتی تھی۔ حسد کرتی تھی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے کچا چبا جاؤں گی۔ میں اس کے منہ پر تھوکوں گی' یہ کمینی' حرام زادی ہے۔ میں بھی اس کی صورت بگاڑ دوں گی۔ چھوڑ دو۔ ذرا مجھے اس کے پاس تو جانے دو۔"

وہ چیخ رہی تھی' مچل رہی تھی۔ اپنے ہاتھ پاؤں چھڑا کر بستر سے اٹھنا چاہتی تھی پھر وہ اچانک ہی ساکت ہو گئی۔ اس کا بدن تن گیا پھر وہ ڈھیلی ہو کر بستر پر گر پڑی۔ وہ دوسری بار بے ہوش ہو گئی تھی۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو اس کے کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ شاید پورے اسپتال میں سناٹا ہو اور مریض سو رہے ہوں۔ وہ چند لمحوں تک خاموشی سے بستر پر پڑی چھت کو تکتی رہی۔ اس کے بعد آہستہ سے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر بہت احتیاط سے اپنے چہرے کو چھوا پھر جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اسے تکلیف کا احساس ہوا تھا اور اس کی انگلیوں میں کوئی دوا لگ گئی تھی۔

ان انگلیوں کو دیکھتے ہی اس نے انکار میں سر ہلایا۔ حقیقت سے انکار کہ چہرہ نہیں بگڑا ہے' صحیح سلامت ہے مگر انگلیوں میں لگی ہوئی دوا اس بات کی گواہ تھی کہ چہرہ بگڑ چکا ہے۔ ایک دم سے چیخ مار کر وہ اٹھ بیٹھی پھر اپنے بستر سے اٹھ کر دوڑتے ہوئے چیختے ہوئے' کمرے سے باہر نکل گئی۔ وارڈ بوائے اور نرس نے اسے دوڑ کر پکڑ لیا۔ وہ ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے تھی "آئینہ کہاں ہے' مجھے آئینہ دکھاؤ' میں اپنی صورت دیکھنا

چاہتی ہوں۔"

دو ہٹے کٹے وارڈ بوائے اسے دونوں طرف سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ وہ ان کے ساتھ آ رہی تھی اور چیختی جا رہی تھی "مجھے آئینہ کیوں نہیں دکھاتے ہو؟ میں اپنی صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی صورت دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اپنی صورت دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک بار مجھے آئینہ دکھا دو' جب دیکھوں گی کہ میری صورت نہیں رہی ہے تو میں بھی نہیں رہوں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔"

ڈاکٹر نے کمرے میں آکر گرجتے ہوئے کہا "خاموش رہو۔ یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے۔ یہاں دوسرے مریض بھی ہیں۔ بہت سے دل کے مریض بھی ہیں۔ تمہارے شور مچانے سے ان پر کیا اثر پڑے گا؟ تمہیں اتنی عقل نہیں ہے؟ تم میڈیکل کی طالبہ ہو اور تمہیں دوسرے مریضوں کا احساس تک نہیں ہے۔ اپنے دکھ کے سامنے دوسروں کے دکھ بھول بیٹھی ہو۔"

وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی "مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ جب اپنا آپ جل رہا ہو' تو میں دوسروں کے جلتے ہوئے گھر کو نہیں دیکھ سکتی۔ میں خود کو دیکھوں گی' مجھے دکھا دو کہ میں کیا ہوں۔"

ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا "اسے خاموشی سے لٹا دو' اگر اب یہ اٹھے گی یا پاگل پن کرے گی تو اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔ بستر سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں گے' بولو! تم کیا کہتی ہو۔ سکون سے لیٹی رہو گی یا تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ پر ٹیپ لگا دیا جائے۔"

وہ بستر پر لیٹ گئی پھر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر رونا چاہتی تھی کہ خیال آیا' آدھے چہرے پر دوا لگی ہوئی ہے پھر وہ تڑپ کر بولی "یہ کتنا ظلم ہے کہ میں روتے وقت اپنے منہ پر ہاتھ بھی نہیں رکھ سکتی۔"

ڈاکٹر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے بولا "میں ظالم نہیں ہوں مگر تم مجھے سخت بننے پر مجبور کر رہی ہو۔ کیا تم تقدیر سے لڑ سکتی ہو؟ جو ہوا ہے کیا اسے جھٹلا سکو گی کہ نہیں ہوا ہے۔ حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ بڑے صبر اور حوصلے سے کام لینا پڑتا ہے۔ تمہیں کالج سے نکلنے کے بعد اپنے جیسی

کتنی دکھی انسانیت کو دیکھنا ہو گا اور ان کے ساتھ ہم سفر بن کر چلنا ہو گا۔ میں ڈاکٹر بھی ہوں' تمہارا استاد بھی ہوں اور تمہارے باپ کی جگہ بھی ہوں۔ بس ایک آخری اور فیصلہ کن بات تمہیں سمجھاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جو کچھ ہو چکا ہے اسے برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ نہیں برداشت کرو گی تو پاگلوں کی طرح حرکتیں کرتی رہو گی اور اس کا نتیجہ برا ہو گا۔ اچھا کبھی نہیں ہو گا۔"

وہ سر جھکا کر رونے لگی۔ ڈاکٹر نے وارڈ بوائے سے کہا "رخسانہ کے لیے کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "میں نہیں کھاؤں گی' کچھ نہیں کھاؤں گی' بھوکی مر جاؤں گی۔"

"کوئی بھوکا نہیں مرتا۔ یہ سب جذباتی باتیں ہیں' جنونی باتیں ہیں۔ جنون کم ہو جائے گا' جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو تم کھانے بھی لگو گی' سونے بھی لگو گی۔ اس سے بہتر ہے کہ اپنے استاد' اپنے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرو۔"

رخسانہ نے بے بسی سے سر اٹھا کر التجا آمیز لہجے میں پوچھا "آپ اتنا بتا دیجئے کیا میں بدصورت ہو گئی ہوں۔"

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا "بدصورتی آئینے میں ہوتی ہے۔ تم آئینہ نہیں دیکھو گی تو سدا خوب صورت رہو گی۔"

"آپ مجھے لفظوں سے بہلا رہے ہیں۔ آپ سچ سچ بتا دیجئے۔ کیا میرا چہرہ اتنا بگڑ گیا ہے کہ اب ٹھیک نہیں ہو سکے گا؟ اگر ٹھیک ہو سکے گا تو کب تک؟"

ڈاکٹر نے ہمدردی سے دیکھا پھر کہا "ہم سارے زخم ٹھیک کر سکتے ہیں' چہرہ ٹھیک نہیں کر سکتے۔ تم میڈیکل کی طالبہ ہو' تم جانتی ہو کہ ایسی حالت میں پلاسٹک سرجری کے ذریعے ہی چہرے کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔" پھر وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولا "اور یہ سرجری ہمارے یہاں نہیں ہوتی۔ اس کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ بڑا مہنگا علاج ہے۔ خدا تمہیں اس کی توفیق دے۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے پاس سے پلٹ گیا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ رخسانہ رو رہی تھی۔ آنسو نہیں تھم رہے تھے پھر اسے فرزانہ یاد آ گئی۔ سب کچھ

اسی نے کیا تھا۔ اس کے دل سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ بددعائیں دینے لگی۔ اسے کوسنے لگی مگر اس سے کیا ہوتا؟ ہاں اتنا ضرور ہو رہا تھا کہ دل کا غبار نکل رہا تھا۔

ادھر اس کی ماں گھر پہنچ کر اپنے دل کا غبار نکال رہی تھی۔ اس نے چیخ چیخ کر محلے والوں کو جمع کر لیا تھا اور پڑوس کی طرف اشارہ کرکے فرزانہ اور اس کی ماں کو گالیاں دے رہی تھی۔ لوگوں کے سامنے فریاد کر رہی تھی کہ اس لڑکی نے حسد اور جلاپے میں اس کی بیٹی کا چہرہ بگاڑ دیا ہے۔ اس کے منہ پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ دوسری طرف فرزانہ کی ماں اپنے دروازے پر کھڑی ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کر رہی تھی۔ خدا اور رسول کا واسطہ دے کر کہہ رہی تھی کہ میری بیٹی ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔

محلے کے کچھ لوگوں نے سمجھایا کہ چیخنے چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر رخسانہ کے ساتھ واقعی زیادتی کی گئی ہے اور جان بوجھ کر اس کا چہرہ بگاڑا گیا ہے تو پولیس میں رپورٹ لکھائی جائے۔ فرزانہ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

رخسانہ کی امی نے پھر چیخ چیخ کر کہا "میں کیا کروں؟ میں تو ایسا کرنا چاہتی تھی لیکن کوئی میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ وہاں جو انسٹرکٹر تھا اور جو لڑکے اور لڑکیاں تھے وہ فرزانہ کی حمایت کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سب کچھ ایک حادثہ تھا۔ میں نہیں مانتی' یہ حادثے سے نہیں سازش سے ہوا ہے۔"

محلے کے دو چار لوگوں نے کہا "تم جو کچھ بھی کہو' جرم ثابت کرنے کے لیے گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے اور وہاں کالج میں کتنے ہی چشم دید گواہ ہیں جو فرزانہ کی حمایت کر رہے ہیں لہٰذا تم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکو گی۔"

محلے کی ایک عورت نے کہا "بہن یہ بات تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ فرزانہ اور رخسانہ اتنی گہری سہیلیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ایک ساتھ آتے جاتے دیکھا۔ ایک جیسے کپڑے پہنتے دیکھا ہے۔ دونوں ایک ساتھ کھانا کھاتی ہیں۔ ایک ہی جگہ سوتی ہیں ایک ہی جگہ پڑھتی ہیں پھر فرزانہ کو رخسانہ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

فرزانہ اپنے کمرے میں منہ چھپائے بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی۔ رفتہ رفتہ محلے والے اس کی حمایت میں بول رہے تھے' اسے مجرم نہیں سمجھ رہے تھے لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ بے شک سب

کچھ نادانستگی میں ہوا لیکن ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ غلطی اس کی تھی کہ وہ دہشت زدہ ہو گئی تھی اگر اتنے ہی کمزور دل کی تھی تو کیا ضرورت تھی کہ وہ ڈس سیکشن کے لیے وہاں جاتی۔ بے شک وہ قانون کی نظروں میں مجرم نہیں تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے ہاتھوں سے اس کی سہیلی کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

○☆○

دوسری صبح رخسانہ کی آنکھ کھلی تو وہی اسپتال کا کمرا نظر آیا۔ وہی دل میں خنجر مارنے والی حقیقت یاد آئی کہ چہرہ بگڑ چکا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ابھی اس سے حقیقت تسلیم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار گھبرا جاتی تھی' پریشان ہو کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھاگ کر کہاں جائے کہ چہرہ چھپ جائے یا کوئی ایسی دوا یا کوئی ایسا طلسم ہاتھ آ جائے کہ بگڑا ہوا چہرہ پھر سے بن جائے۔ وہ رات کو سونے سے پہلے ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہی تھی اور سوچتے سوچتے دوا کے اثر سے سو گئی تھی۔ اب پھر وہی سوچیں دماغ میں آ رہی تھیں۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ کھلے ہوئے دروازے پر اس کا ایک کلاس فیلو جمشید علی کھڑا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں یوں لگ رہی تھیں جیسے وہ رات بھر جاگتا رہا ہو۔ لباس پر شکنیں تھیں۔ جیسے کروٹیں بدلتا رہا ہو۔ اسے دیکھتے ہی رخسانہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا پھر بولی "تم یہاں کیوں آئے ہو؟ چلے جاؤ' دروازہ بند کر دو۔ میں اپنے کمرے میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے آیا پھر آہستگی سے بولا "تمہارے چہرے پر تمہارے دل و دماغ پر جو قیامت ٹوٹی ہے اس کی وجہ سے میں سو نہیں سکا۔ کھا نہیں سکا۔ میں اپنے آپ کو رات بھر گالیاں دیتا رہا۔ جانتی ہو کیوں؟ وہ جو خطوط تم دونوں سہیلیوں کے پاس پہنچتے تھے وہ میں ہی لکھتا رہا۔ مجھے لڑکیوں کو چھیڑنا اچھا لگتا تھا۔ پتا نہیں کیوں انہیں چھیڑ کر' انہیں خطوط لکھ کر مجھے ایک طرح کی تسلی ہوتی۔ میں نے تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ بچپن میں مجھے ماں کا پیار نہیں ملا۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ جوان ہوا تو کوئی محبوبہ نہیں ملی۔ میں جتنی لڑکیوں کو چھیڑتا تھا' تصور میں انہیں اپنی محبوبہ کے روپ میں دیکھتا تھا۔ تم دونوں کے ساتھ بھی میں نے یہی کیا۔"

رخسانہ منہ پھیر کر بیٹھی ہوئی تھی' وہ بولی "تم نے جو کچھ کیا' اب نہیں کرو گے۔ کیونکہ اب میں اس قابل نہیں ہوں۔ یہاں کیا لینے آئے ہو۔ چلے جاؤ۔"

"ابھی چلا جاؤں گا' مگر اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا جرم؟"

"کل ڈس سیکشن کا کام ختم ہونے کے بعد جب فرزانہ پیالے میں تیزاب ڈال رہی تھی تو میں اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے ڈرانے کے لیے لاش کے ہاتھ کو ذرا سا ہلایا تھا۔ بس وہ ڈر کر بوتل کو چھوڑ کر تمہارے پاس سے بھاگی تو یہ حادثہ پیش آیا۔ اگر میں وہ شرارت نہ کرتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ میں مجرم ہوں اور اب میں تمام کالج میں چیخ چیخ کر کہوں گا کہ جوانی کے زعم میں شرارت کرنے کا انجام بھی دیکھ لو۔ ہم لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہماری چھیڑ چھاڑ سے وہ کہاں کہاں بدنام ہوتی ہیں۔ ہمیں ان کی بے بسی پر ہنسی آتی ہے۔ ہم کالج میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں لیکن ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو ہماری ہی بہنوں کے کردار پر اور چہرے پر تیزاب کے چھینٹے اڑاتی ہیں۔"

"تم چیختے چلاتے رہو۔ ایک ایک کو پکڑ کر نصیحتیں کرتے رہو تو کیا ہوگا۔ مجھے میرا چہرہ واپس تو نہیں ملے گا۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا "ضرور ملے گا۔ میں تمہارا چہرہ تمہیں لوٹاؤں گا۔ میں نے کل تمام رات جاگ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہاں سے ٹرانسفر سرٹیفکیٹ لے کر لندن جاؤں گا۔ وہاں پر پلاسٹک سرجری کا کورس کروں گا اور ایک دن بہت بڑا سرجن بن کر واپس آؤں گا پھر سب سے پہلے تمہارے چہرے کی خوب صورتی تمہیں لوٹاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ جب تک ایسا نہیں کروں گا میرا ضمیر مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔"

"مجھے سہانے سپنے نہ دکھاؤ۔ جب تک تم سرجری سیکھ کر آؤ گے اس وقت تک میں بوڑھی ہو چکی ہوں گی۔ ہاں' رہ گئی تمہارے ضمیر کی بات' تو میں سمجھ رہی ہوں کہ تم پوری سچائی سے اپنے جرم کا اعتراف کر رہے ہو اور واقعی پچھتا رہے ہو۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں معاف کرے مگر اس سے پہلے میں تمہیں معاف کر رہی ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تم جہاں رہو خوش رہو۔"

"رخسانہ! تم بہت خوب صورت ہو۔ تمہارے خیالات اور زیادہ خوب صورت ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حسن مٹ جاتا ہے حسن خیال کبھی نہیں مٹ سکتا۔ میں تمہیں پہلے بھی چاہتا تھا اور اب آپنی جان' اپنی زندگی سے بھی زیادہ تمہیں چاہتا ہوں۔ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ تمہاری سرجری کے بعد تم سے تمہیں مانگوں گا۔ چاہو تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دینا ورنہ مجھے ٹھکرا دینا مگر میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔ اچھا اب جا رہا ہوں دعا کرو کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب رہوں۔"

وہ منہ پھیرے خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اپنے پیچھے ۔ جمشید علی کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی پھر اس نے اپنے آدھے چہرے کو چھپاتے ہوئے ادھر پلٹ کر دیکھا تو کمرا خالی تھا۔ وہ جا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی امی اور ابو بھی آ گئے۔ ان کے ساتھ رشتے کی کچھ عورتیں بھی اسے دیکھنے آئی تھیں۔ رخسانہ اپنے آدھے چہرے کو بار بار چھپالیتی تھی۔ اس کی امی اس وقت بھی فرزانہ کو گالیاں دے رہی تھیں اور اسے بتا رہی تھیں کہ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرانا چاہتی تھیں لیکن کوئی ان کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ اس کے ابو نے کہا "کسی کے ساتھ نہ دینے سے کیا ہوتا ہے ہم تو ان ماں بیٹی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ایسا انتقام لیں گے کہ وہ کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔"

رخسانہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ سب نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تو وہاں فرزانہ کھڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے ہوئے تھی مگر نظریں اٹھائے رخسانہ کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی رخسانہ کی امی نے بھڑک کر کہا "کیوں آئی ہے یہاں؟ دفع ہو جا' ورنہ میں تیری صورت بگاڑ کے رکھ دوں گی۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تو پھر سے میری بیٹی کو بہلا پھسلا کر دوستی کرنے آئی ہے۔"

وہ کمرے میں آ گئی پھر اس نے آہستگی سے کہا "میں یہاں آؤں گی اور آپ کے گھر میں بھی آؤں گی۔ میرا رخسانہ پر حق ہے۔ یہ میری بہن ہے۔ اگر میرے ہاتھوں سے اس کا چہرہ بگڑا ہے تو میں اس کی بگڑی کو بنانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔ میں سب سے پہلے رخسانہ سے معافی مانگوں گی۔ اگر مجھے معافی مل گئی تو میں اپنی ساری زندگی اس کے لیے

وقف کردوں گی۔ محنت کروں گی۔ ڈاکٹر بن کر جو کچھ بھی کماؤں گی سب کچھ اس کے لیے جوڑوں گی اور پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس کے چہرے کی خوب صورتی کو واپس لاؤں گی۔"

اس کی باتوں کے دوران رخسانہ اپنے بستر پر سے سرکتی ہوئی کنارے پر آگئی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر کھڑی ہوگئی پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے روبرو آگئی۔ فرزانہ نے کہا "میں تمہاری مجرم ہوں۔ تم چاہو تو ابھی میرا چہرہ بگاڑ سکتی ہو۔"

رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یک بارگی وہ بڑے ہی کرب سے' دل کی گہرائیوں سے بولی "ہائے! فری میں تو لٹ گئی۔"

یہ کہتے ہی وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح فری کے اوپر آگری اور اس سے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فری کا بھی یہی حال تھا۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی' تڑپ تڑپ کر بول رہی تھی۔ رخسانہ کو بھینچ بھینچ کر اپنے اندر چھپالینا چاہتی تھی اور رخسانہ خود اس کے اندر چھپ کر مرجانا چاہتی تھی۔

"رخسانہ' میری جان! میں سچ کہتی ہوں۔ میں نے تجھ سے کوئی دشمنی نہیں کی ہے۔ میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں' ایسا دھوکے سے بھی کیوں ہوا؟ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گی۔"

"فری! مجھے سب معلوم ہوچکا ہے۔ یہ سب کچھ دھوکے سے ہوا اور نادانستہ ہوا۔ تو بالکل نہیں جانتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ تو دہشت زدہ ہوکے بھاگ گئی تھی۔ میں تیرے مزاج کو خوب سمجھتی ہوں' فری میری جان! میں نے تجھے معاف کیا۔ تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تو خود کو لعنت ملامت کرے۔"

"رخسانہ! تو کتنی اچھی ہے۔ میں کیا کہوں؟ بس اتنا کہتی ہوں کہ جب تک تجھے اپنا چہرہ واپس نہیں ملے گا۔ اس وقت تک میں سنگار نہیں کروں گی' جب تک تو سہاگن نہیں بنے گی' میں دلہن نہیں بنوں گی۔ تیرا دکھ میرا ہے۔ تجھ سے کوئی منہ پھیرے گا تو میں ساری زندگی کے لیے اس سے منہ پھیرلوں گی۔"

دونوں سہیلیاں بول رہی تھیں اور دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اندر سے ایک دوسرے کے لیے کتنی سچی ہیں۔ دونوں کو

ایک دوسرے سے کتنی گہری محبت ہے۔ ایسی ہوتی ہے محبت جس کے منہ پر کوئی تیزاب نہیں پھینک سکتا۔

ایک ہفتے کے بعد رخسانہ اسپتال سے گھر آگئی۔ زندگی کسی نہ کسی طرح گزرنے لگی۔ دونوں سہیلیوں کی محبت پہلے سے بڑھ گئی۔ کچھ دنوں بعد رخسانہ نے برقع پہننا شروع کردیا اور اپنے چہرے کو نقاب میں چھپا کر کالج جانے لگی۔ وہ بڑے حوصلے سے تقدیر کے ظلم کو برداشت کررہی تھی مگر اندر ہی اندر غیر شعوری طور پر نفسیاتی مریض بنتی جارہی تھی۔ یہ بات بہت چپکے چپکے اس کے دماغ میں پک رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھتا نہیں ہے۔ اب کوئی اسے اپنی شریک حیات بنانے کبھی اس کے دروازے پر نہیں آئے گا' اب وہ ہمیشہ کسی کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔

فرزانہ اسے حوصلہ دیتی تھی۔ کہتی تھی "ہم دونوں ڈاکٹر بننے کے بعد خوب محنت کریں گے' کسی اچھے علاقے میں پریکٹس کریں گے۔ ڈھیروں روپے کمائیں گے اور ایک دن اتنی رقم جمع کرلیں گے کہ تم انگلینڈ یا امریکا جاکر پلاسٹک سرجری کے ذریعے بگڑے ہوئے چہرے کو بنالوگی۔"

فرزانہ حوصلہ دیتی تھی اور وہ حوصلہ پاتی تھی مگر چپکے سے اپنے دل کی بات کہہ دیتی تھی "ٹھیک ہے فری کہ ہم دونوں مل کر بہت کچھ کریں گے مگر اپنا جیون ساتھی ہو تو بات کچھ اور ہوتی ہے۔ میں اپنے ساتھی کی پناہ میں بڑی جلدی' بڑے تحفظ کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ سکتی ہوں۔ کاش کہ میری شادی ہوجاتی' کوئی مجھے قبول کرلیتا پھر تم میرا حوصلہ دیکھتیں۔"

فرزانہ نے یہ بات اپنی امی اور رخسانہ کی امی تک پہنچائی۔ سب سر جوڑ کر سوچنے لگیں کہ لڑکی کی شادی جلد سے جلد کرنا بہتر ہے۔ یوں بھی اب وہ مان نہیں رہا تھا کہ وہ بلا کی حسین ہے۔ رشتے خود ہی بھیک مانگنے آئیں گے۔ اب تو خود ہی بھیک مانگنے کی نوبت آگئی تھی۔

پہلے تو اونچے گھرانوں کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا گیا کیونکہ اونچے گھرانوں سے کئی بار پیغامات آئے تھے اور انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا گیا تھا کہ لڑکی جب تک ڈاکٹر نہیں بن جائے گی شادی نہیں کرے گی۔ اب انہیں گھروں کے چکر لگانے پڑے مگر کوئی اندھا یا

بہرہ تو ہوتا نہیں ہے کہ رخسانہ کے بگڑے ہوئے چہرے کو نہ دیکھے۔ جنھوں نے نہیں دیکھا تھا انھوں نے دوسروں کی زبانی سن لیا تھا۔ اب لڑکے والے رخسانہ کی امی کو دیکھتے ہی سنا دیتے کہ ان کے لڑکے کی بات فلاں جگہ طے پاگئی ہے اور لڑکا ملک سے باہر جانے والا ہے۔ اتنی سنگ دلی تو کسی میں نہ تھی کہ کوئی زبان سے رخسانہ کی بدصورتی کا ذکر کرتا اور منہ پر کہہ دیتا کہ چڑیل کو کون دلہن بنا کر لائے۔ سنگ دل بھی اتنے سنگ دل نہیں ہوتے ٹھکرانا بھی ہو تو حسنِ ادا سے ٹھکرایا جاتا ہے۔

فرزانہ بڑی جذباتی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی امی سے کہا "امی! ہم اپنا گھر بیچ دیں گے۔ کم از کم پچاس ہزار روپے تو ضرور مل جائیں گے۔ یہ ساری رقم رخسانہ کو دے دوں گی۔ اس سے وہ پلاسٹک سرجری کرالے گی۔"

اس کی امی پیار سے سمجھاتی تھیں "بیٹا! میں تمھاری طرح نادان نہیں ہوں۔ میں بھی اپنے آگے پیچھے دیکھتی ہوں۔ اگر تمھاری جگہ کوئی بیٹا ہوتا تو میں رخسانہ کے لیے یہ قربانی ضرور دیتی۔ اول تو یہ کہ اس کے چہرے کے بگڑنے میں تمھارا ہاتھ دانستہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں اسے اپنی بیٹی سمجھتی ہوں اور اس کے لیے میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ جلد از جلد چہرہ اچھا ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنا گھر بیچ دیں۔ یہ گھر میں نے ایک خاص وقت کے لیے رکھا ہے جب تم ڈاکٹر بن جاؤ گی اور جب تمھیں ڈسپنسری کھولنے کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت پیش آئے گی تب میں یہ مکان فروخت کردوں گی۔ اس کے بعد تم سہیلیاں ڈاکٹر بن کر کماؤ گی، پیسے جوڑو گی۔ اس طریقے سے جو کام ہوگا وہ دانش مندی کا ہوگا۔"

رات کا وقت تھا۔ دونوں ماں بیٹی باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک پڑوس سے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ فرزانہ اپنی سہیلی کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی پھر بولی "امی! یہ تو رخسانہ چیخ رہی ہے۔ کیا ہو گیا ہے اسے؟"

دونوں ماں بیٹی دوڑتے ہوئے اپنے مکان سے باہر نکلیں پھر دوسرے مکان میں داخل ہوئیں۔ رخسانہ اپنے کپڑے پھاڑ رہی تھی، بال نوچ رہی تھی۔ اس کی امی اور ابو اسے پکڑ کر اپنے قابو میں کرنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ فرزانہ جاتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ اس سے کہنے لگی "رخسانہ! میں تمھاری بہن ہوں۔ تمھاری

سہیلی ہوں۔ مجھے بتاؤ، تمھیں کیا تکلیف ہے؟"

"آگ!" رخسانہ نے چیخ کر کہا "آگ لگی ہے، میرے اندر آگ لگی ہے، میرے باہر آگ لگی ہے۔ کیا تم سب اندھے ہو گئے ہو؟ تم لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا، پانی.... مجھ پر پانی ڈالو۔ مجھے سمندر میں لے جا کر ڈبو دو۔ میں یہ آگ برداشت نہیں کر سکتی۔"

وہ فرزانہ سے الگ ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ فرزانہ نے اسے نہیں چھوڑا تو وہ اسے نوچنے کھسوٹنے لگی۔ سب نے اسے مل کر پکڑ لیا تھا۔ وہ مچل رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی پھر اسی طرح تڑپتے تڑپتے سرد پڑ گئی۔ اس کے دیدے پھیل گئے پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کی امی نے ایک زور دار چیخ ماری "ہائے میری بیٹی کو کیا ہو گیا؟ کوئی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے؟"

ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے رخسانہ کو ہوش میں لا کر کچھ دوائیں کھانے کے لیے دیں اور ان سب کو تسلی دے کر چلا گیا۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ فرزانہ نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟ تمھیں کیا دکھ ہے؟ تم ایسا کیوں کر رہی تھیں؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے فرزانہ کو دیکھا، پھر کہا "میں کیا کر رہی تھی؟ کیا مجھے کچھ ہو گیا تھا؟"

"ہاں! تم چیخ رہی تھیں۔ اپنے کپڑے پھاڑنا چاہتی تھیں۔ اپنے بال نوچ رہی تھیں اور بار بار کہہ رہی تھیں کہ تمھارے اندر آگ لگی ہے۔"

یہ سنتے ہی رخسانہ نے بڑی آہستگی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

دو دن بعد پھر اس پر دورہ پڑا۔ اس بار ایک تجربے کار لیڈی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے دو روز تک اس کا علاج کیا۔ تیسرے دن اس نے بتایا "لڑکی ہسٹریا میں مبتلا ہے۔ دواؤں سے یہ وقتی طور پر اچھی تو ہو جائے گی۔ اسے سکون تو مل جایا کرے گا لیکن یہ مرض ہمیشہ کے لیے اسی وقت جا سکتا ہے جب اس کی شادی کردی جائے۔ اس کا آخری علاج شادی ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر کے جانے کے بعد فرزانہ کی امی نے رخسانہ کی والدہ سے کہا "بہن! اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

انہوں نے کہا "اب برا ماننے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ میں تو ہر طرف سے لٹ رہی ہوں۔ میری بچی کی زندگی برباد ہو رہی ہے۔"

"یہی میں کہنا چاہتی ہوں کہ اس کی زندگی بچانے کے لیے شادی ضروری ہے اور شادی کے لیے اب یہ ضروری نہیں رہا کہ اونچے گھر کے لڑکے دیکھے جائیں۔ ہمارے طبقے کے کتنے ہی لوگ ہیں جو معمولی ملازموں کو اپنی بیٹیاں دیتے ہیں۔ وہ جو ہمارے محلے میں مرزا صاحب ہیں، کتنے شریف لوگ ہیں۔ خاندانی آدمی ہیں۔ ان کے بیٹے اچھے کماتے ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی ایک ایسے آدمی کو دی ہے جو چپلوں کا کارخانہ کھولے بیٹھا ہے۔ خود بھی چپلیں بناتا ہے، کیا ہم اسے موچی کہیں گے؟"

"وہ موچی کا کام کرتا ہے تو موچی ہی کہلائے گا۔"

"نہیں۔ نہیں، اس کے کام کو نہ دیکھو۔ اس کے ہنر کو دیکھو۔ اس کی آمدنی کو دیکھو۔ وہ جب سوسائٹی میں اپنی عزت بنا کر رکھتا ہے، اپنے لیے ایک مکان بناتا ہے اپنے لیے تین وقت کی روٹی عزت سے کماتا ہے۔ کسی کا محتاج نہیں رہتا تو پھر اس آدمی میں کھوٹ کیا ہے؟ آخر ہم جو سفید پوش کہلاتے ہیں۔ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں کیا ہے؟ ہم دونوں اسکول میں ٹیچر ہیں۔ کتنی مشکل سے ہماری گزر بسر ہوتی ہے۔ دوسروں کے گھروں میں بھی ہم جھانک کر دیکھتے ہیں۔ ایک ایک دو دو وقت کے فاقے ہوتے ہیں، اپنی کمزوریاں ہم دنیا والوں سے چھپاتے ہیں تاکہ کوئی ہمیں غریب، نادار اور محتاج نہ سمجھے، اپنے سے کم تر نہ سمجھے۔"

رخسانہ کی امی نے پوچھا "تم کیا چاہتی ہو، میں اپنی بیٹی کسی ایرے غیرے کو دے دوں؟"

"یہاں ایرا غیرا کون ہے؟ جب سے پاکستان بنا ہے یہاں کتنے ہی ایسے لٹے ہوئے خاندان آئے ہیں جو کبھی ہاتھوں سے اپنے کرتے کا بٹن نہیں ٹانکتے تھے۔ اب وہ یہاں آکر مزدوری کرنے لگے ہیں۔ یہاں پہنچ کر لوگ چھوٹے بن گئے ہیں۔ انہیں تین وقت کی روٹی کے لیے موچی بننا پڑا، اور پتا نہیں کیسے کیسے کام کرنے پڑے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی خاندانی شرافت مر گئی ہے۔ لوگ شریف ہوتے ہیں مگر پیشے کے اعتبار سے ہم انہیں کمتر سمجھتے ہیں۔ اگر ہم اپنی بیٹیاں ایسے لوگوں کو دیں تو اس میں ہماری بے عزتی

نہیں، بڑائی ہے۔"

پہلے تو رخسانہ کی امی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی لیکن جب تیسرے ہفتے تیسری بار پھر دورہ پڑا تو وہ اچھی طرح سمجھ گئیں کہ بیٹی کو دلہن بنا کر جلد سے جلد رخصت کرنا ہوگا اور اس کے لیے اب گھرانا نہیں، بس لڑکے کی شرافت اور اس کی آمدنی دیکھنی ہوگی۔

دونوں سہیلیاں رات کو ایک ہی بستر پر سوتی تھیں۔ اب ان کی گفتگو کا بھی یہی موضوع ہوتا تھا کہ لڑکے کو اس کے مزاج اور اس کی شرافت سے پرکھنا چاہیے حالات سکھا دیتے ہیں کہ انسان کو انسانی اقدار کے مطابق کس طرح پرکھنا چاہیے۔ فرزانہ نے کہا "ہاں! یہ جو محنت مزدوری کرنے والے ہوتے ہیں، یہ بھی تو بے چارے انسان ہوتے ہیں۔ ان کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں شرم ہوتی ہے۔ یہ ہمیں دیکھ کر سر جھکائے ہوئے گزر جاتے ہیں اور ہم ان کی قدر نہیں کرتے۔ یہ لوگ چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں تو ہم انہیں محض معمولی دکان دار سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ جب ہم ان کے پاس سے چیزیں خریدنے جاتے ہیں تو یہ کس طرح ہماری عزت کرتے ہیں۔ اتنی خوشامدیں کرتے ہیں کہ ہم مغرور ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال قائم کرتے ہیں کہ ہم قابل عزت، قابل احترام ہیں اور ان بے چاروں پر احترام کرنا واجب ہے۔ وہ ہماری عزت کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم خود کو معزز اور ان کو کم تر سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ہماری بھول ہے۔"

رخسانہ اس کی بات سن رہی تھی اور اس کے چہرے کو تک رہی تھی پھر اس نے آہستگی سے کہا "کوئی بھی ہو۔ چھوٹا دکان دار ہو یا ایک معمولی مزدور ہو۔ بس تین وقت کی روٹی عزت سے کماتا ہو۔ میں بھی تو کوئی اپاہج بن کر نہیں رہوں گی۔ یہ آخری سال ختم ہوتے ہی پریکٹس شروع کر دوں گی۔ آمدنی کی کوئی فکر نہیں ہے بس آدمی شریف ہونا چاہیے۔ کوئی بھی آکر عزت سے میرا ہاتھ پکڑے تو میں اس کے لیے مرجانے کے لیے تیار رہوں گی۔ تم دیکھ لینا جو شخص مجھے قبول کرے گا۔ میں اس کی اتنی خدمت کروں گی۔ ایسی وفاداری کا ثبوت دوں گی کہ عورتوں کے لیے ایک مثال قائم کر دوں گی۔"

دوسرے دن وہ دونوں کالج سے واپس آئیں۔ فرزانہ اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنے گھر میں آ گئی۔ اپنے بستر پر تھوڑی دیر تک لیٹی رہی۔ ارادہ تھا کہ

شام کی چائے پیتے وقت رخسانہ کو اپنے یہاں بلائے گی۔ شام کو پتا چلا کہ وہ برقع پہن کر کہیں گئی ہے۔ اسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ اس کے بغیر کہیں جاتی نہیں تھی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو اس نے پوچھا "کہاں گئی تھیں؟"

وہ برقع اتارتے ہوئے بولی "اپنے آپ کو آزمانے گئی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی "مطلب یہ ہے کہ پاپوش نگر میں وہ جو نقلی زیورات کی دکان ہے نا' اس کا مالک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا ہے۔ دیکھنے میں بھی ٹھیک ہی ہے۔ اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ سلیقے سے باتیں کرتا ہے۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتی تھی۔ اس کی دکان پر جاتی تھی تو وہ اشارے کنائے سے اپنے دل کی بات زبان پر لاتا تھا لیکن میں انجان بن جاتی تھی۔ آج میں اپنا آدھا چہرہ چھپا کر اس کے پاس گئی تو اس نے پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔ تب میں نے اپنا باقی چہرہ بھی کھول دیا۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ فرزانہ نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "پھر کیا ہوگا' مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور پیچھے والی ریک سے جا ٹکرایا۔ ریک میں رکھا ہوا سامان اس کے اوپر گر پڑا۔ میں نے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔ مجھ سے بچے ہی نہیں بڑی عمر کے لوگ بھی ڈرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جلدی جلدی اپنے سامان کو ریک پر رکھنے لگا۔ اب وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ جب اس نے سامان رکھ لیا تو میں نے پوچھا "کیا اب اور کچھ نہیں بولو گے؟"

وہ ہچکچایا' پھر ذرا سا جھینپ کر بولا "میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔ مجھے کبھی بہن کا پیار نہیں ملا۔ میں تم سے پاکیزہ محبت کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہک کی طرف مڑ گیا۔

"بس میں سمجھ گئی۔ جب سے میرا چہرہ بگڑا ہے اس وقت سے میں سمجھ رہی ہوں کہ بولنے والے کے اندر کیا ہے اور وہ کس جذبے سے بول رہا ہے۔ میں وہاں سے چلی آئی۔"

فرزانہ نے کہا "مجھے ساتھ لے جانا چاہیے تھا۔ میں اسے کھری کھری سناتی۔"

"نہیں فری! تجھے ساتھ لے جاتی تو وہ تیرے حسن میں کھو جاتا۔"

یہ کہہ کر اس نے فری کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ چند لمحوں تک اسے تکتی رہی پھر اس کی پیشانی کو چوم کر بولی "بدصورتی سب سے بڑا عیب ہے۔ اس عیب کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ ساری دنیا حسن کی پجاری ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جانوروں کو قربانی دی جاتی ہے تو انہیں بھی ٹٹول کر دیکھا جاتا ہے کہ ان جانوروں میں کوئی عیب نہ ہو۔ خداوند کریم عیب پسند نہیں کرتا۔ وہ اس نے مجھے دے دیا۔ یا اللہ! یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے۔ میں بے شک مغرور تھی مگر اس کی اتنی بڑی سزا تو نہ دیتا میرے مالک!"

یہ کہہ کر وہ فری کے گلے لگ گئی۔ فری بڑے صدمے سے اور بڑی محبت سے اس کی پیٹھ کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔ جب سے چہرہ بگڑا تھا' تب سے اسے سمجھانے کے لیے اور تسلیاں دینے کے لیے اتنا کچھ کہا گیا تھا کہ لفظوں کا خزانہ اب خالی ہو گیا تھا۔ بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ بس وہ ایک ہاتھ تھا جو اس کی پیٹھ تک پہنچ جاتا تھا اور اب خاموش ہاتھ کی تھپتھپاہٹ ایک سہیلی کے جذبے کو بیان کرتی تھی۔

"چپ ہو جا میری جان! میرے بس میں ہو تو میں تجھے اپنا چہرہ دے دوں۔ میرے بس میں ہو تو اپنی تقدیر بھی تیرے نام کر دوں اور اگر میرے بس میں ہو تو میں کہیں سے ایک پیار کرنے والے کو تیرے لیے پکڑ لاؤں۔ کتنی حیرانی کی بات ہے کہ اتنی بڑی دنیا میں ایک پیار کرنے والا نہیں ملتا۔ سب چہرے کو پوجتے ہیں۔ انسان کی کوئی قدر نہیں کرتا میں ان بے قدروں کی دنیا میں تیرے لیے کیا کروں' سمجھ میں نہیں آتا۔"

ایک ہفتے کے بعد دو عورتیں اور دو لڑکیاں وہاں آئیں۔ وہ رخسانہ کا رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ رخسانہ فوراً ہی دوسرے کمرے میں جا کر چھپ گئی۔ لڑکیاں شریر ہوتی ہیں۔ اس کمرے میں بھی اس کو دیکھنے کے لیے گھستی چلی آئیں۔ اس نے ایک چادر سر پر رکھ لی۔ ارادہ تھا کہ کوئی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوگا' وہ چادر کا گھونگھٹ بنا ڈالے گی' اپنے چہرے کو چھپا لے گی۔ باہر ڈرائنگ روم میں وہ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور بتا رہی تھیں کہ ان کا لڑکا ایک لانڈری کا مالک ہے۔ مہینے کی اچھی خاصی آمدنی ہے۔ ابھی کرائے کے مکان میں رہتا ہے لیکن جلد ہی کوئی پلاٹ خرید کر مکان بنا لے گا۔

رخسانہ کی امی اپنے کمرے میں جا کر ایک البم میں سے رخسانہ کی تصویر لے آئیں پھر

ان عورتوں کو دکھاتے ہوئے کہا "میری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔ کتنے ہی رشتے اس کے لیے آئے ہیں مگر ابھی ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا اس کے آدھے چہرے پر تیزاب گر گیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹری پاس کرتے ہی یہ اپنے چہرے کو پھر سے بنالے گی پھر ایسی ہی پوری طرح خوب صورت ہو جائے گی۔"

ایک عورت نے کہا "بہن! ہم نے بہت پہلے تمہاری بیٹی کو دیکھا تھا۔ بہت دنوں سے ہمارے دماغ میں یہ بات تھی کہ تمہاری بیٹی کو بہو بنائیں گے پھر یہ بات بھی سنی کہ اس کا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ ہم یہی دیکھنے آئے ہیں۔ اگر تھوڑی بہت خرابی ہوئی تو کوئی بات نہیں۔ حادثہ تو کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ انسان کو چہرے سے نہیں، انسان کے دل سے محبت کرنی چاہیے۔"

رخسانہ کی امی خوش ہو کر دعائیں دیتی ہوئی بولیں "بہن! ہماری دنیا میں ایسے خیالات رکھنے والے بہت کم ہیں۔ آپ بہت ہی نیک خاتون ہیں۔ میری بیٹی بہت جلد ڈاکٹر بن جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کا آدھا چہرہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بہن! تصویر تو ہم نے دیکھ لی۔ لڑکی بھی دیکھی بھالی تھی مگر اب اور بات ہے ایک نظر اسے دکھا دو پھر ہم جا کر لڑکے کی رضامندی معلوم کرلیں گے۔"

رخسانہ کی امی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "لڑکے کی رضامندی ہی حاصل کرنا ہے تو اسے یہ تصویر لے جا کر دکھا دیں۔"

"تصویر میں اور لڑکی کو دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے ہم تو عورتیں ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ اسے لڑکے کو دکھایا جائے۔"

رخسانہ کی امی کو راضی ہونا پڑا۔ وہ ساری عورتیں دوسرے کمرے میں آئیں۔ رخسانہ چادر میں منہ چھپا رہی تھی مگر انہوں نے زبردستی چادر کو ہٹا کر اسے دیکھ ہی لیا۔ بس ایک بار دیکھا۔ دوسری بار ادھر نظر نہیں ڈالی۔ فوراً ہی پلٹ کر کمرے سے باہر چلی گئیں دوسرے کمرے میں پہنچ کر رخسانہ کی امی نے کہا "آپ لوگ بیٹھیں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں بہن، رہنے دیں، ہم کھا پی کر آرہے ہیں۔ چائے کی طلب نہیں ہے۔"
یہ کہتے ہی عورتوں نے اپنی چادریں سنبھالیں۔ لڑکیوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا پھر سب کی سب وہاں سے چلی گئیں۔ ایسے وقت فرزانہ وہاں نہیں آئی تھی۔ اس کی امی نے اسے روک کر کہا تھا "بیٹی نہ جاؤ! یہ بوڑھی عورتیں تھالی کا بینگن ہوتی ہیں، دیکھنے کسی کو آتی ہیں پسند کسی اور کو کرلیتی ہیں۔ اگر انہوں نے تمہیں پسند کرلیا تو یہ بات رخسانہ کی ماں کو بہت بری لگے گی۔ وہ پھر سے دشمنی پر اتر آئیں گی۔"
بہرحال ان عورتوں کے جانے کے بعد رخسانہ خود ہی اس کے پاس آئی اور آتے ہی پیش گوئی کی "وہ جو گئی ہیں نا، اب واپس نہیں آئیں گی۔"
فرزانہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "مایوسی کفر ہے۔ یقین رکھو، تم پر بھی اللہ کا کرم ہوگا۔"

وہ بولی "بے شک جھولی پھیلانے والوں کو اللہ دیتا ہے مگر میری جھولی میں تو چھید ہیں۔ میرا معبود جن رشتوں کو بھیجتا ہے وہ جھولی کے چور راستوں سے نکل جاتے ہیں۔"
رخسانہ کی امی دوسرے دن تک پرامید رہیں۔ تیسرے دن مایوس ہوئیں، چوتھے دن ان عورتوں کو گالیاں دینے لگیں "کمینے ہیں، کم ظرف ہیں۔ خود کو لانڈری والے کہتے ہیں اصل بات نہیں کہتے کہ دھوبی ہیں۔ کیسا زمانہ آگیا ہے۔ اپنے پیشے کو چھپانے کے لیے انگریزی نام رکھ لیتے ہیں۔ دھوبی بولیں گے تو کوئی اپنے گھر میں رشتے کے لیے گھسنے نہیں دے گا۔ اس لیے خود کو لانڈری کا مالک بتاتے ہیں۔ اونہہ، اچھا ہوا۔ میری بیٹی کیا ایسوں میں جائے گی۔ خاندان والے ہمیں باتیں سناتے کہ ہم نے اپنی بیٹی دھوبی کو دے دی ہے۔ تھو کیے ان پر۔"
رخسانہ کے باپ فرید احمد نے تاش کے پتے پھینٹتے ہوئے کہا "اب تو بس ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔ ہماری بیٹی بڑے آرام کے ساتھ بیاہی جاسکتی ہے۔"
رخسانہ کی امی اور فرزانہ کی امی ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ جلدی سے پوچھا "بتاؤ کیا راستہ ہے؟"
انہوں نے کہا "یہی کہ کسی اندھے لڑکے سے اسے بیاہ دیا جائے۔ وہ کبھی اس کی صورت نہیں دیکھ سکے گا۔"

رخسانہ کی امی نے جل کر کہا "اندھی تو میں ہوگئی تھی کہ تم سے شادی کی اور اپنی زندگی برباد کرلی۔ تمہیں تاش کھیلنے کے سوا آتا کیا ہے؟ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ لڑکی جوان ہوگئی ہے۔ لڑکی پر کتنی مصیبتیں آئی ہیں۔ اب اسے سہاگن بنانے کے لیے لڑکے والوں کو زیادہ سے زیادہ رقم کا لالچ دینا ہوگا۔ اس کے لیے کمانا پڑتا ہے اور کیا کمانے کے لیے میں ہی ایک عورت رہ گئی ہوں۔ تم سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے آرام کی کھاتے رہتے ہو۔"

اس نے تاش کے پتوں سے کھیلتے ہوئے کہا "اسی لیے میں نہیں بولتا۔ بولتا ہوں تو سننا پڑتا ہے۔ میں تو ایک اچھا مشورہ دے رہا ہوں۔ نہیں مانوگی تو پھر دوسرا مشورہ بھی سن لو۔"

رخسانہ کی امی نے ہاتھ اٹھا کر کہا "بس خبردار! مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔"

فرید احمد نے کہا "دیکھو! گھر کے کونے میں پڑا ہوا ایک بھاری پتھر بھی کبھی کبھی کام آجاتا ہے۔ کام نہ آئے تو زندگی سے بیزار ہوکر اس پتھر کو اپنے سر پر بھی مارا جاسکتا ہے میں کچھ تو کام آسکتا ہوں۔"

فرزانہ کی امی نے کہا "بہن! سن تو لیں کہ بھائی صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں دھوکے' فریب اور جھوٹ کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اگر لڑکی کو بیاہنا ہی چاہتی ہو' تو کسی عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کو پکڑنا ہوگا۔ اس سے اپنی بیٹی کو چھپا کر بیاہنا ہوگا۔ صورت کسی کی دکھانی ہے۔ دلہن کسی کو بنانا ہوگا۔ کیا میری بات سمجھ میں آرہی ہے۔"

فرزانہ کی امی نے تائید میں سر ہلا کر کہا "ہاں بھائی صاحب! آپ جو بات کہہ رہے ہیں' وہ دل کو لگ رہی ہے۔ ہم اتنے عرصے تک ایمان دار بن کے دیکھ چکے۔ اپنی شرافت اور خاندانی تذکرے کہاں کہاں نہیں کیے۔ لڑکی کی پہلی خوب صورت تصویر کسے نہیں دکھائی مگر کوئی ہمارے دکھ کو نہیں سمجھتا۔ ہمیں دنیا کے اس دستور کو سمجھ لینا چاہیے کہ مال کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے اوپر سب سے زیادہ خوب صورت لیبل لگا کر بیچا جاتا ہے۔ ہر دکان دار یہی کرتا ہے پھر ہم ایسا کیوں نہ کریں؟"

رخسانہ کی امی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "کیا تم دونوں یہ کہنا چاہتے ہو کہ صورت فرزانہ کی دکھائی جائے اور دلہن رخسانہ کو بنایا جائے؟"

"ہاں! یہی کرنا ہوگا۔"

"مگر کیسے؟ شادی تو رخسانہ کی ہوجائے گی۔ دھوکا اس حد تک کامیاب ہوگا لیکن جب دولہا اس کی صورت دیکھے گا تو قیامت آجائے گی۔ سسرال والے میری بیٹی کو نوچ کھائیں گے۔"

فرید خان نے ہاتھ اٹھا کر کہا "میں نے سب سوچ لیا ہے۔ یہ جو میں تاش کے پتے پھینٹتا رہتا ہوں تو اس دوران میرے سامنے میری بیٹی کا آدھا چہرہ ہوتا ہے' میں بے حس ہوں' میں محنت نہیں کرتا' مگر باپ تو ہوں نا۔ بیٹی کے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اب کسی کو دھوکا دیا جائے۔ ایسے شخص کو دھوکا دیا جائے جو تنہا رہتا ہو۔ جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ اس کی شادی میں عورتیں نہ آئیں۔ عورتیں آئیں گی تو یہاں گھونگھٹ کے پیچھے جھانک کر دلہن کو دیکھیں گی لہٰذا کوئی ایسا تنہا نوجوان ہو جو اچھا کماتا ہو' اچھا کھاتا ہو۔ رہنے کے لیے جگہ ہو۔ عزت سے زندگی گزار رہا ہو۔ مزاج کا اچھا ہو شریف ہو۔ خواہ وہ نچلے طبقے کا ہو۔ طبقہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اصل میں انسان کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔"

رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے فرزانہ نے پوچھا "رخسانہ! کیا ان باتوں سے متفق ہو جو ہمارے بزرگ سوچ رہے ہیں۔"

رخسانہ نے پوچھا "تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟"

"یہی کہ سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ آدمی برا کیوں بنتا ہے' جھوٹا کیوں بنتا ہے' جرم کیوں کرتا ہے' عام لوگ پیدائشی جھوٹے اور بدمعاش نہیں ہوتے۔ سب کچھ اس دنیا میں آکر سیکھتے ہیں اور دوسروں کو سیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

رخسانہ نے کہا "ٹھیک ہے۔ اب یہی ایک صورت رہ گئی ہے لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ میں زبردستی کسی کی شریک حیات بن جاؤں۔"

فرزانہ نے کہا "یوں دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں زبردستی ہی کی شادیاں

زیادہ ہوتی ہیں۔ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے۔ شادی کے بعد دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو قبول کرلیتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ تمہارا ہونے والا شوہر تمہیں پہلے نہیں دیکھے گا۔ کیا تم اس وقت کے حالات سے نمٹ سکتی ہو۔"

"فری! میرا چہرہ میرا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ جب سے یہ بگڑا ہے' میں تمام بگڑے ہوئے حالات سے گزرنے کا حوصلہ پارہی ہوں۔"

تب ایک احمق کی تلاش شروع ہوگئی۔ فرید احمد سے کہا گیا کہ وہ تمام دن بیکار گھر میں بیٹھا رہتا ہے یا محلے میں جاکر تاش کھیلتا ہے۔ وہ ایسے لڑکے کو تلاش کرے جو اچھا خاصا کماتا ہو اور تنہا رہتا ہو۔ بہت زیادہ پڑھا لکھا نہ ہو اور زیادہ دانش مندی کی باتیں نہ کرتا ہو۔

فرید احمد باتیں کرنے اور مشورہ دینے میں پیش پیش رہتا تھا مگر کام کی بات آتی تو پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ وہ لڑکے کی تلاش میں صبح نکلتا تھا اور شام کو واپس آتا تھا دن بھر کہیں بیٹھ کر تاش کھیلتا تھا۔ گھر آکر من گھڑت باتیں سنا کر اپنی بیوی کی تسلی کردیتا تھا کہ وہ کتنے لوگوں سے ملتا رہا اور اس کے کتنے ہی ساتھی ایسے کسی لڑکے کی تلاش میں ہیں پھر دوسری صبح وہ آنے جانے کے لیے بس کے کرائے کے پیسے لے کر گھر سے نکل جاتا تھا۔ رخسانہ کی امی اور فرزانہ کی امی بھی اسی تلاش میں تھیں۔ اس تلاش اور جستجو میں وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ فرزانہ اور رخسانہ میڈیکل کے آخری سال میں پہنچ گئیں ایک صبح فرزانہ کالج جانے سے دو گھنٹے پہلے گھر سے نکلی۔ رخسانہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے جانے سے انکار کردیا۔ فرزانہ کو جہانگیر روڈ کی طرف جاکر اپنی ایک کلاس فیلو سے نوٹ بک لینی تھی۔ جب وہ نوٹ بک لے کر سہیلی کے گھر سے نکلی اور ایک گیراج کے پاس سے گزرنے لگی تب اسے بادشاہ جانی نظر آگیا۔

اس میں بظاہر اتنی خوبی یا کشش تھی کہ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہ قد آور تھا' خوب رو تھا' صحت مند تھا۔ دراصل اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ اس کی بات سنتے ہی وہ ذرا دیر کے لیے رک گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "چاچا! اگر آدمی بیل کی طرح ہل نہ چلائے' گدھے کی طرح بوجھ نہ اٹھائے' بکری کی طرح پان نہ چبائے' تو اسے آدمی کون کہے گا۔ ارے اسے تو کوئی اپنی لڑکی بھی نہیں دے گا۔"

بادشاہ جانی کے باتیں کرنے کا اسٹائل غضب کا تھا۔ اگر اتنی ہی بات ہوتی تو فرزانہ آگے بڑھ جاتی لیکن اس کے بعد مستری چاچا نے بادشاہ جانی کی ایک مختصر ہسٹری پیش کردی جس کی وجہ سے فرزانہ توجہ سے سننے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ مستری چاچا کہہ رہے تھے "ارے! تجھے کون لڑکی نہیں دے گا۔ تو اچھا کماتا ہے' اچھا کھاتا ہے' اچھا لباس پہنتا ہے۔ تیری ٹیکسی ہے۔ تیرے پاس اپنا ایک مکان ہے۔ تجھے تو کوئی بھی اپنی لڑکی دینے کو تیار ہوجائے گا۔"

مستری چاچا کی یہ بات ایسی تھی جو فرزانہ اور رخسانہ کے مختصر سے خاندان کو متاثر کرسکتی تھی۔ اب وہ شخص نظر آرہا تھا جسے شکار کیا جاسکتا تھا۔ صرف اسے سمجھنے کی ضرورت تھی اور اسے سمجھنے کے لیے اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنا ضروری تھا۔ فرزانہ نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ وہ بس میں نہیں' اس ٹیکسی میں بیٹھ کر جائے گی اور اس طرح اسے کریدنے کی اور سمجھنے کی کوشش کرے گی۔

پھر اس نے سمجھنے کی کوشش شروع کردی۔ گیرج کے پاس سے چلتی ہوئی ٹیکسی کے پاس آئی اور پوچھا "ٹیکسی خالی ہے؟"

اس کے بعد اس نے بادشاہ جانی کو پتھر بنتے دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیوانہ وار تکتے ہوئے پایا۔ وہ بادشاہ جانی کی ایک ایک حرکت کو محسوس کرتی رہی۔ اس سے نظریں چراتی رہی۔ بظاہر انجان بنتی رہی۔ قدرت نے لڑکیوں کی آنکھوں میں شرم دی ہے۔ وہ کسی کے سامنے نظریں نہیں اٹھاتیں' کسی کو نظر بھر کر نہیں دیکھتیں۔ آنکھیں جھکالیتی ہیں جب آنکھیں جھک جائیں تو سامنے کچھ نظر نہیں آتا لیکن نہیں۔ جب لڑکیوں کی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو ان کے تجسس کی ایک چور آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس آنکھ سے وہ سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں۔ فرزانہ نے بھی دیکھا کہ وہ کس انداز سے آرہا ہے اور کس اسٹائل سے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول رہا ہے۔ جب وہ بولتا تھا تو فرزانہ اس کی آواز کو ندا سے سنتی تھی۔

ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اسے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر پرکھ رہی ہے حالانکہ اسے دماغ سے پرکھنا چاہیے۔ وہ ایسی غلطی کیوں کررہی ہے؟ یہ زندگی کوئی فلم تو نہیں ہے کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور سے

چشم زدن میں متاثر ہو جائے۔ اس غلطی کا پس منظر بہت دور تک تھا۔ بات یوں بھی کہ رخسانہ کے لیے اب کوئی معمولی درجے کا لڑکا ہی تلاش کیا جا رہا تھا اور جب معمولی درجے کی بات آئی تھی تو معمولی لوگ بھی اچھے بھلے لگ رہے تھے۔ وہ انسان نظر آتے تھے۔ اچھے کھانے کمانے والے دکھائی دیتے تھے جو اونچے اونچے گھرانے میں اپنا بول بالا کرتے ہیں۔ اپنی شان دکھاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ چھوٹے چھوٹے لوگ بہتر نظر آنے لگے تھے۔ رخسانہ کے ساتھ کالج میں 'گھر میں' دن رات اٹھتے بیٹھتے ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔ ایسے ہی لوگ دل کو بھا رہے تھے اور ایسے ہی لوگوں کو آزمانے کا حوصلہ پیدا ہو رہا تھا' انہیں قبول کرنے کے لیے ذہن غیر ارادی طور پر آمادہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غیر شعوری طور پر بادشاہ جانی کو دماغ سے دیکھنے کے بجائے دل کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔

بے شک یہ اس کی غلطی تھی لیکن غلطی جان بوجھ کر نہیں ہوتی اور اس نے جان بوجھ کوئی غلطی نہیں کی تھی اور اس نے نظر بھر کر بادشاہ جانی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ البتہ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ایک وقت جو کچھ نظر آتا ہے۔ دوسرے وقت وہی نظر آنے والی بات کوئی اور مفہوم لے کر آتی ہے' جیسے یہ کہ جب اس نے چور نظروں سے بادشاہ جانی کو ٹیکسی کی جانب آتے دیکھا' ٹیکسی کا دروازہ کھولتے دیکھا تو وہ بات' وہ منظر کچھ اور تھا اور جب ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے غور کیا تو تصور کی آنکھ نے پھر وہی منظر دکھایا وہ لانبے قد کا جوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ٹیکسی کی طرف آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا پاؤں کسی کچی زمین پر پڑ رہا ہے اور زمین دہل رہی ہے۔ جب اس نے پچھلی سیٹ کے دروازے کے ہینڈل کو تھام کر اسے کھولا تو اس کی بڑی سی ہتھیلی اور چوڑے پنجے نظر آئے۔ موٹی موٹی بھدی انگلیاں ایسے لگیں جیسے سلاخیں ہوں۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کو جکڑ لیا۔ اس کی مٹھی اتنی مضبوط اور مستحکم لگی کہ فرزانہ کی کلائی کانپنے لگی۔

ایسا ارادتاً نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو فرزانہ کو پہلے ہی خبر ہو جاتی۔ اسے تو بعد میں ہوش آیا کہ وہ کیا دیکھ رہی تھی؟ اور اس کا دماغ چوری چوری کیا محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت تک ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ خیالات سے چونک گئی۔ اس نے سامنے کی طرف دیکھا

تو ٹیکسی کا میٹر نظر آیا۔ اس نے بات شروع کرنے کے بہانے ذرا ناراضگی سے کہا "یہ تم نے میٹر کیوں نہیں آن کیا؟"

تب بادشاہ جانی نے اسے بتایا کہ آج وہ بہت خوش ہے۔ اس لیے میٹر آن کرے گا اور نہ ہی کرایہ لے گا اور اسے کالج سے واپس گھر بھی کرایہ لیے بغیر پہنچائے گا۔ اس نے پوچھا تھا کہ آخر خوشی کس بات کی ہے؟

تب اس نے بتایا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ اپنی باتوں سے کچھ احمق اور کچھ بھولا بھالا سا لگا۔ نہ تو اس نے لڑکی کی مرضی پوچھی تھی اور نہ ہی لڑکی کا گھر دیکھا تھا۔ خواہ مخواہ خوش ہو رہا تھا کہ اسے کسی شریف گھرانے میں رشتہ مل جائے گا۔

بہرحال فرزانہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کسی اچھے گھرانے میں شادی کرنا چاہتا ہے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کی اپنی ٹیکسی ہے' اپنا مکان ہے۔ اچھا کماتا ہے اور اچھا کھاتا ہے لیکن باتوں سے اس کے مزاج کا اور اس کی عادتوں کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ کبھی تو وہ اپنی باتوں سے بہت چالاک اور دانش مند لگتا تھا کیونکہ اس نے اپنی ٹیکسی کو یونیورسٹی کہا تھا اور اس کی تفصیل بیان کی تھی۔ ایک بار اس نے کہا تھا کہ وقت سے پہلے ہنسنے والے کو پاگل کہتے ہیں لیکن یہ امید وقت سے پہلے ہی ہنساتی ہے چاہے بعد میں رلا دے۔

کبھی اس کی باتوں سے حماقت ظاہر ہوتی تھی۔ ایک بار فرزانہ نے کہا کہ وہ جہانگیر روڈ پر اپنی سہیلی کے یہاں کتاب اور نوٹس لینے آئی تھی۔ اس کے جواب میں بادشاہ جانی نے کہا تھا کہ اس کے پاس بھی پانچ کے' دس کے' پچاس کے اور سو کے نوٹ ہر وقت جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ اس پر فرزانہ کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں جلد ہی یہ بھید بھی کھل گیا کہ بادشاہ جانی دراصل اسے پسند کرنے لگا ہے۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور زیادہ دور تک سوچ نہیں سکتا تھا اس لیے اچانک ہی آپ کہتے کہتے تم کہنے لگا تھا۔

ٹیکسی میں سفر کے دوران باتیں آگے بڑھتی رہیں تھیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی تھی جب وہ خود ہی میری طرف مائل ہو گیا ہے تو بات کو آگے بڑھتے رہنا چاہیے یہ دو بجے مجھے کالج سے گھر پہنچانے آئے گا تو مجھے انکار نہیں کرنا چاہیے۔

لیکن جب یہی بات بادشاہ جانی نے کہی تو اس نے رسمی طور پر انکار کیا۔ مجھے ٹیکسی

میں مفت سفر کرنا اچھا نہیں لگتا اور یہ کہہ کر وہ کالج کے گیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دو بجے بادشاہ جانی ضرور آئے گا۔

کالج کے احاطے میں داخل ہو کر وہ ایک دیوار کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ اس طرح کہ بادشاہ جانی اسے نہ دیکھ سکے لیکن اسے وہ ٹیکسی نظر آ رہی تھی۔ بادشاہ جانی کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا' سوچتا رہا پھر ٹیکسی اسٹارٹ کر کے چلا گیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ضرور دو بجے آئے گا۔ اچانک رخسانہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ رخسانہ برقع پہنے چہرے پر نقاب ڈالے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا "تمہاری تو طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تم آج کالج آنا نہیں چاہتی تھیں پھر کیسے آ گئیں؟"

"کیا کروں' تمہارے جانے کے بعد دل نہیں لگ رہا تھا۔ کالج کی بس آئی تو میں نے فوراً ہی کتابیں اور کاپی اٹھائی اور بس میں آ کر بیٹھ گئی۔ اب تم بتاؤ کہ باہر کسے دیکھ رہی تھیں؟"

"ہائے رخسانہ! اگر تھوڑی دیر پہلے آ جاتیں تو میں اسے دکھاتی۔ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے اور ٹیکسی کا مالک بھی ہے۔ اسے ڈرائیور نہیں کہنا چاہیے۔ بہت اچھی آمدنی ہے۔ اس کی اپنی ٹیکسی ہے۔"

رخسانہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا "ایک بار تم نے کہہ دیا کہ ٹیکسی کا مالک ہے پھر تم یہ کیوں کہتی ہو کہ اس کی ٹیکسی ہے؟ بار بار ایک ہی بات دہرا رہی ہو۔ تم اپنے آپ میں نظر نہیں آتیں؟"

وہ ذرا سنبھل کر بولی "مجھے گرمی لگ رہی ہے اس لیے گڑبڑا رہی ہوں۔ کینٹین میں بیٹھیں گے۔ کچھ ٹھنڈا پئیں گے پھر میں تمہیں بتاؤں گی۔"

وہ کینٹین میں آ گئیں۔ وہاں فرزانہ نے بتایا کہ بادشاہ جانی کس قسم کا آدمی ہے' کیسی باتیں کرتا ہے' اسے دیکھ کر' اس سے کچھ باتیں کرنے کے بعد فرزانہ نے اسے رخسانہ کے لیے منتخب کیا ہے۔

رخسانہ نے کہا "اگر وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے تو اس کی بڑی بڑی مونچھیں ہوں گی یا بدمعاشوں کی طرح دونوں جانب سے مونچھیں لٹکتی ہوں گی۔ گال پچکے ہوں گے' آنکھیں

بڑی بڑی سرخ ہوں گی جیسے ابھی چرس کا دم لگا کر آیا ہو۔"

فرزانہ نے انکار میں سرہلا کر کہا "یہی تو بات ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے' وہ کسی طرح بھی ٹیکسی ڈرائیور معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بس ذرا ان پڑھ ہے۔"

رخسانہ نے کہا "صرف یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ وہ پیشے کے اعتبار سے ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ امی وغیرہ کیا سوچیں گی؟"

"سوچنا تمہارا کام ہے۔ امی کا کام نہیں ہے۔ یہ فیصلہ آج ہی ہو جانا چاہیے۔ وہ دو بجے آئے گا۔ اچھا ہوا کہ تم یہاں آ گئیں۔ اب اسے دیکھ لینا۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔ تھوڑی دیر وقت گزار کر اس سے باتیں کروں گی۔ اس کی عادتوں کو' اس کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کروں گی پھر اسے گھر لے آؤں گی۔ تم پہلے سے جا کر امی وغیرہ کو بتا دینا۔"

رخسانہ نے پوچھا "مجھے اس کی ایک ایک بات بتاؤ۔ وہ دیکھنے میں اور سننے میں کیسا ہے؟"

فرزانہ سوچنے لگی۔ رخسانہ نے سوال کیا تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہے؟ فرزانہ اسے خلا میں دیکھنے لگی۔ رخسانہ نے سوال کیا تھا کہ وہ سننے میں کیسا ہے؟ وہ سننے میں ایسا ہے کہ اس کی آواز سے دل کو دھڑکنوں کی آواز ملتی ہے۔ رخسانہ نے پوچھا "تم ادھر دیوار کو کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا اس کے خیالوں میں کھو گئی ہو؟"

فرزانہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی "ہاں' میں اسی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں' کہاں سے بتانا شروع کروں؟ وہ بہت ہی دلچسپ آدمی ہے۔"

وہ اس کے متعلق ایک ایک بات پوری تفصیل سے بتانے لگی۔ اس سے بادشاہ جانی کی ایک گھنٹے کی ملاقات تھی مگر وہ چار گھنٹے تک اس کے بارے میں بولتی رہی۔ ایسا ہوتا ہے۔ جب ایک ٹیکسی ڈرائیور کے متعلق کچھ کہنا ہو تو ایک حقارت بھری اونہہ کے بعد ساری بات مکمل ہو جاتی ہے۔ ایک اونہہ میں ساری تفصیل آ جاتی ہے کہ ایسے لوگ قابل ذکر نہیں ہوتے لیکن جس کے ذکر میں ہائے کا چٹخارہ ہو اس کی بات کرتے صبح سے شام اور شام سے صبح ہونے لگتی ہے۔ فرزانہ اسے بادشاہ جانی کے متعلق بتا رہی تھی اور

بار بار اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ یوں جیسے بات حلق میں اٹک رہی ہو اور رخسانہ کی بھلائی کی خاطر' اپنی غلطی کی تلافی کی خاطر ان باتوں کو اگلتی جا رہی ہو۔ اگر اس کے سامنے رخسانہ نہ ہوتی' اس کا بگڑا ہوا چہرہ نہ ہوتا تو وہ آج کی انجانی اور ادھوری ملاقات کو ایک راز کی طرح دل کی ڈبیہ میں چھپا کر رکھ لیتی اور بڑی فرصت سے' چپکے چپکے اس راز کا انکشاف اپنی ذات پر کرتی رہتی۔

وہ دو بجے آنے والا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے دونوں سہیلیوں کی عجیب حالت تھی۔ ایک اس کی باتیں سن رہی تھی اور دوسری سناتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر جھنجلا جاتی تھی کہ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کیوں متاثر ہو رہی ہے۔ آخر اس میں کیا بات ہے۔ کیا وہ فلمی ہیرو ہے؟ یا آسمان سے اترا ہے؟ جو ایک گھنٹے کی ملاقات میں اتنا سر پہ چڑھا جا رہا ہے۔

بات سر پر چڑھنے کی نہیں تھی' سر پر چڑھانے کی تھی۔ وہ لڑکیاں ہی اسے اہمیت دے رہی تھیں۔ ایک چھوٹے آدمی کو قدر آور بنا رہی تھیں کیونکہ وہ جو بھی تھا' جیسا بھی تھا' ان کی ضرورت تھا۔ ضرورت رخسانہ کے لیے تھی کیونکہ اس سے بہتر اسے اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ فرزانہ کو تو ایک سے بڑھ کر ایک جیون ساتھی مل سکتا تھا پھر وہ کیوں باؤلی ہو رہی تھی؟ زمین کی دھول اٹھا کر اپنے سر پر ڈال رہی تھی۔ کوئی دیوانے سے پوچھے کہ وہ مٹی اپنے سر پر کیوں ڈالتا ہے؟ تو دیوانہ ہنس دے گا۔ اس کی ہنسی ایک گہرا جواب ہوگی۔ جیسے طنز کر رہا ہو کہ پوچھنے والو! تم کیا جانو دیوانگی کیا ہوتی ہے۔ وہ اونچ نیچ نہیں دیکھتی' مشرق و مغرب کی سمت نہیں پہچانتی۔ وہ جھکنا جانتی ہے اور جھک کر کسی بھی چیز کو اٹھا کر اسے برابر لانا چاہتی ہے۔

دونوں سہیلیوں نے اس دن کی آخری کلاس اٹینڈ نہیں کی۔ ایک بجے ہی اوپری منزل پر آگئیں اور وہاں سے سڑک کی طرف دیکھنے لگیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ٹیکسی نظر آئی۔ بادشاہ جانی مقررہ وقت سے آدھے گھنٹے پہلے پہنچ گیا تھا۔ فرزانہ نے بتایا۔ "دیکھو' وہی ٹیکسی ہے اور اس میں وہ بیٹھا ہوا ہے۔ ہاں! اب دیکھو وہ گاڑی سے نکل رہا ہے۔ تم گیٹ کے باہر جاؤ اور اسے قریب سے دیکھو۔ جب کالج کی بس جانے لگے گی تو تم بس میں بیٹھ کر چلی جانا۔ اس کے بعد میں یہاں سے نکلوں گی۔"

رخسانہ چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی فرزانہ کے دل نے کہا۔ یہ بادشاہ جانی کے ساتھ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ بے شک رخسانہ ضرورت مند ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے لیکن ایک لڑکی کا علاج کرنے کے لیے کسی دوسرے کو گڑھے میں نہیں گرانا چاہیے۔ اسے بادشاہ جانی کی سادگی اور بھولپن یاد آ رہا تھا۔ ایسے سیدھے اور بھولے بھالے آدمی کو دھوکا دینا کہاں کی شرافت ہے؟ کیا وہ اچھا کر رہی ہے؟

گیٹ کے باہر وہ ٹیکسی کے پاس ٹہل رہا تھا۔ بار بار گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ کتنے ہی طلبا اور طالبات باہر آ رہے تھے اور کالج کی بس میں بیٹھ رہے تھے۔ وہیں ایک برقع پوش لڑکی کھڑی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے تو بس ایک ہی لگن تھی کہ جسے ایک بار دیکھا ہے' وہ جلد دوبارہ نظر آجائے۔

رخسانہ وہاں سے پلٹ کر پھر کالج کے احاطے میں داخل ہوئی۔ دوسری طرف فرزانہ اوپری منزل سے اتر آئی تھی۔ دونوں کینٹین کے پاس ملیں۔ رخسانہ نے فرزانہ کا ہاتھ دبا کر خوشی سے کہا "وہ تو بہت ہی خوب صورت اور اسمارٹ دکھائی دے رہا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ ان پڑھ اور ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ تم اسے ڈرائیور نہ کہو وہ ٹیکسی کا مالک ہے۔"

فرزانہ نے اس کے ہاتھ کو تھپک کر کہا "اچھی بات ہے' میں باتوں ہی باتوں میں اسے سمجھاؤں گی کہ وہ خود کو ڈرائیور نہ سمجھے' خود کو ٹیکسی کا مالک کہتا رہے اس طرح اس کا طبقہ بدل جائے گا۔ معاشرے میں اس کی عزت بڑھ جائے گی اور ایک شریف خاندان اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔"

رخسانہ نے خوش ہو کر کہا "بس جانے والی ہے' میں جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ گیٹ کی طرف بڑھی۔ چند قدم جانے کے بعد پھر پلٹ کر آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی "دیکھو جلدی آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ امی کو ساری باتیں بتا دوں گی۔ جلدی آؤ گی نا؟"

"ہاں بابا! جلدی آؤں گی۔ تو جا اب بس جانے والی ہے۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے گیٹ کے باہر آگئی اور بس میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد کالج کی وہ بس وہاں سے رخصت ہوگئی۔ اس کے بعد فرزانہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گیٹ کی

طرف جانے لگی۔ اس کا دل آپ ہی آپ دھڑک رہا تھا۔ وہ پسینا پسینا ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ اپنے اندر کی بات کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہی تھی۔ دوسرے اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ وہ ایک سیدھے سادے آدمی کو دھوکا دینے جا رہی تھی۔ فرزانہ سے رخسانہ بننے والی تھی اور رخسانہ بن کر اسے کسی اور کا دولہا بنانے والی تھی۔

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اسے پھر اپنی سہیلی کی بے بسی اور بیماری کا شدت سے احساس ہوا۔ کئے ہوئے وعدے اور قسمیں یاد آئیں کہ وہ سہیلی کے لیے اپنی جان بھی دے دے گی۔ جب تک اس کی سہیلی سہاگن نہیں بنے گی' اس وقت تک وہ بھی دلہن نہیں بنے گی۔ اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دے گی۔ یہ جذبہ اس پر غالب آنے لگا۔ تب ہی گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے نظریں اٹھا کر بادشاہ جانی کو دیکھا تو ایک دم سے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ صبح والا ٹیکسی ڈرائیور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں تو کوئی دوسرا ہی اسمارٹ اور خوبرو نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ لباس بھی بدلا ہوا تھا اور اس کی شخصیت بھی بدلی ہوئی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ وہ بادشاہ جانی کو دیکھ رہی ہے۔

وہ انجان بن کر بولی "میں نے جھوٹ سمجھا تھا' تم سچ مچ آ گئے؟"

وہ بولا "یہ مرد کی زبان ہے' گاڑی کا بریک فیل ہو سکتا ہے' مرد کی زبان فیل نہیں ہو سکتی۔"

ہائے! کیسی بات کرتا تھا' بات کرنے کا حق ادا کر دیتا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر ٹیکسی کی طرف جانے لگی۔ بادشاہ جانی نے پوچھا "تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟ اگر کہا ہے تو بتاؤ' میں ایک ایک کا کچومر نکال دوں گا۔"

وہ بولی "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بھلا مجھے کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا پھر وہ ایک دم سے جاگتی آنکھوں کے ساتھ خوابوں کی جنت میں پہنچ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی خوشبو کا جھونکا آیا تھا۔ ایسا لگا جیسے وہ جلتی دھوپ سے گزرتے گزرتے اچانک ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گئی ہو۔ پچھلی سیٹ پر پھولوں کی تازہ پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اتنی اچھی خوشبو تھی' اتنی آرام دہ جگہ لگ رہی تھی کہ وہ کچھ سوچنے سے پہلے بے اختیار وہاں بیٹھ گئی۔ دروازے کو بند کر لیا۔ پھولوں کی پتیوں کو نظریں جھکائے دیکھنے لگی۔ ہائے یہ کیا ہو گیا؟ وہ تو رخسانہ کے

لیے پھولوں کی سیج بچھائے آئی تھی۔ دیوانے نے اس کے لیے سیج بچھا دی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اسے پتا نہ چلا کہ بادشاہ جانی کب اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھا۔ کتنی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر گاڑی آگے بڑھی تو فرزانہ نے سر اٹھا کر دیکھا' بادشاہ جانی اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن پوچھ رہا تھا کہ وہ پریشان کیوں ہے؟ اسے خدا کا واسطہ دے کر اس کی پریشانی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ کیا جواب دیتی۔ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس کے لیے پھولوں کی پتیاں بچھا رہا ہے اور وہ شریف لوگ اس کے لیے جال بچھا رہے ہیں؟

اس نے ذرا سوچنے کے بعد بات بنائی کہ وہ ابھی ایک لاش کو چیر کر آ رہی ہے اس لیے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' حلق خشک ہو رہا ہے۔ اسے سخت پیاس لگ رہی ہے۔ بادشاہ جانی نے اسے ایک جگہ سے جوس پلایا پھر وہ وہاں سے کلفٹن گئے۔ کلفٹن میں ساحل کے کنارے ریت پر چلتے ہوئے وقت گزارتے رہے اور خوب باتیں کرتے رہے۔ باتیں جو بنتی ہیں تو بتنگڑ بن جاتی ہیں۔ بات دل میں رہے تو کینہ ہے' زبان پر آئے تو محبت ہے۔ بات دو دھاری تلوار بھی ہوتی ہے جسے فرزانہ آزما رہی تھی۔ بات پھولوں کا ہار بھی ہوتی ہے۔ جس کے زخم بادشاہ جانی سہہ رہا تھا۔

وہ شام کے وقت اسے رخسانہ کے گھر لے آئی پھر اسے رخسانہ کی امی کے سامنے پہنچا دیا۔ خود دوسرے کمرے میں رخسانہ کے پاس آ گئی۔ ادھر رخسانہ بری طرح بے تاب ہو رہی تھی۔ اسے تنہائی میں پاتے ہی طرح طرح کے سوالات کرنے لگی۔ فرزانہ نے کہا "کیوں بے چین ہو رہی ہو؟ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔ میں تمام باتیں تمہیں تفصیل سے سمجھا دوں گی۔"

جانی جب رخصت ہونے لگا تو فرزانہ پہلے ہی ٹیکسی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے آہستہ سے سمجھا دیا کہ دوسرے دن عباسی اسپتال کے سامنے صبح نو بجے ملے گی۔ اس وقت رخسانہ کی امی نے اندر سے آواز دی "رخسانہ! ادھر آؤ۔"

وہ جانی سے رخصت ہو کر اندر آئی تو رخسانہ کی امی نے کہا "بیٹی! اب اس سے تمہارا ملنا مناسب نہیں ہے۔ تمہارا کام ختم ہو چکا ہے' ہم صرف تمہاری صورت دکھانا چاہتے تھے۔ وہ لڑکا دیکھ چکا ہے' اب تم اس سے ملتی رہو گی تو وہ تمہاری ہی ذات میں دلچسپی لیتا رہے گا لہٰذا اب تمہیں اس کا سامنا بالکل نہیں کرنا چاہیے۔"

پلاننگ یہی تھی کہ فرزانہ اپنا چہرہ دکھا کر رخسانہ بن کر پھر چھپ جائے گی اس کا کام ختم ہو جائے گا لیکن بادشاہ جانی کے ساتھ اپنا وقت گزارنے کے بعد وہ بھول گئی تھی کہ اسے بادشاہ جانی کی نگاہوں سے چھپنا ہوگا۔ یہ بات اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے بے اختیار کہا "خالہ جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ مجھے تو بادشاہ جانی سے ملنا چاہیے۔"

رخسانہ کی امی نے ذرا گھور کر پوچھا "کیوں ملنا چاہیے؟"

وہ ذرا ہچکچائی پھر بولی "وہ اس لیے کہ بات آگے بڑھی نہیں ہے اور بات آگے چلانے کے لیے اسے یہاں لانے کے لیے میں ہی تو اس سے رابطہ قائم کروں گی۔"

رخسانہ کی امی نے ذرا سوچ کر کہا "ہاں' یہ تو میں نے لڑکے سے کہا ہی نہیں کہ وہ کل یہاں آئے۔ اسے آنا چاہیے۔ ٹھیک ہے' وہ تم سے باہر ملے تو اس سے کہنا کہ کل یہاں آجائے پھر میں رخسانہ کے ابو کو اس کے ساتھ بھیجوں گی وہ اس کی زمین کے اور ٹیکسی کے کاغذات دیکھیں گے اور معلوم کریں گے کہ اس کا کوئی آگے پیچھے ہے یا نہیں۔"

اس کے بعد سب ہی وہاں بیٹھ کر آپس میں خیالی پلاؤ پکانے لگے۔ طرح طرح کے منصوبے بنانے لگے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اگر بادشاہ جانی کی بارات میں عورتیں آئیں گی اور نکاح سے پہلے ہی انہوں نے گھونگٹ کے پیچھے رخسانہ کے آدھے چہرے کو دیکھ لیا تو بات بگڑ جائے گی پھر بادشاہ جانی بھڑک کر چلا جائے گا۔ ہر طرح کی پیش بندی ضروری تھی۔ بادشاہ جانی کو پابند کرنے کے لیے پہلے سے سوچ لیا گیا تھا کہ مہر کی رقم پچاس ہزار رکھی جائے تاکہ وہ طلاق کا لفظ زبان پر نہ لا سکے۔ دیکھا جائے گا کہ وہ کس شدت سے رخسانہ کی تمنا کرتا ہے پھر اسے بہلا پھسلا کر اس کا مکان اور پلاٹ رخسانہ کے نام لکھوا لیا جائے گا تاکہ وہ ہر طرح سے پابند ہو جائے اور شادی کے بعد رخسانہ کا چہرہ دیکھ کر فریاد بھی نہ کر سکے۔

ان باتوں کے دوران میں فرزانہ بات [illegible] [illegible]سانہ کرکے اپنے گھر آئی پھر اپنے کمرے میں پہنچتے ہی بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔ اس [illegible] بری طرح گھبرا رہا تھا۔ طبیعت پریشان تھی' دماغ پر بوجھ تھا۔ رہ رہ کر بادشاہ جانی کی صورت آنکھوں کے سامنے آتی تھی۔ اس کا ضمیر ایک ہی بات پوچھتا تھا کہ اس آدمی نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ وہ کیوں اسے دھوکا دے

رہی ہے؟

رخسانہ کی بے چینی الگ تھی۔ وہ اب فرزانہ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی تھی۔ تنہائی کا موقع ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ کہیں بھی اکیلی جائے تو اس کے پیچھے پہنچ جائے۔ وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اسے بستر پر اوندھے منہ لیٹے دیکھ کر بولی "تم یہاں آکر سو رہی ہو۔ کیا مجھ سے پیچھا چھڑا رہی ہو؟"

فرزانہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رخسانہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ارے! تمہاری تو آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں۔ کیا بات ہے؟"

فرزانہ نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ تب پتا چلا کہ وہ کسی کے لیے رونا بھی سیکھ گئی ہے وہ جلدی سے سنبھل کر بولی "کوئی بات نہیں ہے بس یونہی ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔"

رخسانہ نے قریب آکر کہا "اٹھو' میرے سامنے کھڑی ہو جاؤ۔ مجھ سے آنکھیں ملا کر بولو۔ کیا بات ہے۔ مجھ سے چھپاؤ گی تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

فرزانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر زبردستی مسکراتے ہوئے بولی "کوئی بات نہیں ہے' تم خواہ مخواہ پیچھے پڑ جاتی ہو۔"

رخسانہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "کیا تم بادشاہ جانی کے متعلق سوچ رہی تھیں؟"

فرزانہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "میں جس انداز میں سوچ رہی ہوں' وہ تمہیں بتاؤں تو شاید تمہیں دکھ ہوگا۔"

"مجھے دکھ نہیں ہوگا۔ میں سچ سننا چاہتی ہوں۔"

"رخسانہ! میرا ضمیر مجھے بار بار کہتا ہے کہ میں غلطی کر رہی ہوں' وہ بادشاہ جانی ہیرا ہے ہیرا۔ ایسا سیدھا سادا اور شریف انسان ہے کہ اسے دھوکا دینا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

رخسانہ حیرانی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی پھر بولی "کیا تم سمجھ رہی ہو کہ ہم اسے لوٹ رہے ہیں؟ اس کا مکان' اس کا پلاٹ میرے نام لکھا جائے گا تو کیا میں اسے گھر سے بے گھر کر دوں گی۔ اس کے مکان پر قبضہ کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کر لوں گی؟ تم مجھے

اتنی گری ہوئی لڑکی سمجھتی ہو؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم ایسا کرو گی۔ تم لالچی نہیں ہو لیکن اسے صورت کسی اور کی دکھائی گئی ہے اور دلہن کوئی اور بنے گی تب وہ میرے متعلق کیا سوچے گا۔ فریبی' مکار' جھوٹی' دغاباز اور جانے کیا کچھ کہے گا۔"

"اچھا تو تم اس کے سامنے نیک نام رہنا چاہتی ہو۔ ہاں وہ ایسا ہے کہ اس کے لیے تم بدنام ہو جاؤ گی۔ ایک سہیلی کے لیے بدنام ہونے کا بھلا فائدہ ہی کیا ہو گا؟"

"رخسانہ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں بھلا اس کے لیے کیوں بدنام ہونے جاؤں گی۔ میں تو تمہارے لیے اپنی جان بھی دینے کو تیار ہوں۔"

رخسانہ غصے سے بولی "بکواس مت کرو۔ جان دینے والیاں ایسی نہیں ہوتیں۔ ایک بات بن رہی ہے تو تم اسے بگاڑنے کے انداز میں سوچ رہی ہو۔ تمہیں اس سے ہمدردی ہو گئی ہے تم اتنا تو سوچو کہ وہ میرا جیون ساتھی بنے گا تو کیا میں اس کی دشمن بن کر رہوں گی؟ کیا میں اسے برباد کر دوں گی؟ کیا میں اس کی جائداد پر قبضہ جما لوں گی؟ کیا میں اس سے مہر کے پچاس ہزار روپے وصول کر کے اسے ٹھوکر مار دوں گی؟"

"دیکھو رخسانہ! میں تمہیں دشمن نہیں کہہ رہی ہوں' میں اپنے آپ کو کہہ رہی ہوں کہ اسے بے وقوف بنا کر اس سے دشمنی کر رہی ہوں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے فری بیگم۔ اس کے گلے کا ہار بن جاؤ۔ دوستی ہو جائے گی۔ میں تمہاری نیت کو خوب سمجھ رہی ہوں۔ جب جمشید علی ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے خط لکھا کرتا تھا اس وقت بھی تم احساس کمتری میں مبتلا ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھ سے برتر ہونے کے لیے ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ وہ تمہیں بھی خط لکھتا ہے' آج بادشاہ جانی ہمارے درمیان آیا ہے تو پھر وہی چالیں چل رہی ہو۔ تم اپنی فطرت سے باز نہیں آؤ گی۔"

وہ پاؤں پٹختے ہوئے دروازے تک گئی پھر وہاں سے پلٹ کر بولی "میں لعنت بھیجتی ہوں تمہاری دوستی پر اور تمہاری مہربانیوں پر' میں تمہاری صورت دکھا کر کسی کو پھانسنا نہیں چاہتی۔ میں اپنی زندگی آپ بناؤں گی۔ تمہیں وہ ٹیکسی ڈرائیور مبارک ہو۔ تھو ہے تم پر۔"

یہ کہہ کر وہ غصے سے چلی گئی۔ فرزانہ نے اسے آواز دی مگر وہ واپس نہیں آئی۔ اس رات پڑوس کے مکان سے رخسانہ کے رونے کی آوازیں سنائی دیں پھر اس کے قہقہے سنائی دیے اس کے بعد چیخیں بلند ہونے لگیں' محلے والے سمجھ گئے کہ کیا ہو رہا ہے' اس لیے کوئی نہیں آیا۔ ادھر سے فرزانہ کی امی آگئیں۔ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ پھر رخسانہ پر ہسٹیریا کا دورہ پڑا ہے۔ اسے بڑی مشکلوں سے سنبھالا گیا ہے۔ ڈاکٹر انجکشن لگا کر گیا ہے۔ وہ ابھی چپ چاپ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی ہے۔

فرزانہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ رخسانہ ابھی پرسکون تھی تو کیا ہوا' اسے دورہ پڑے گا اور بار بار پڑے گا۔ اس کی چیخیں فرزانہ پر پتھر برسائیں گی۔ تب اس نے اسی وقت مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ بادشاہ جانی کو دھوکا دے گی' جھوٹ بولے گی لیکن رخسانہ کی زندگی برباد نہیں ہونے دے گی۔ وہ اسے ضرور بادشاہ جانی کی دلہن بنائے گی۔

اس کی امی نے حیرانی سے پوچھا "وہ اتنی دیر تک چیختی چلاتی رہی مگر تم اسے دیکھنے نہیں گئیں؟"

وہ سر اٹھا کر بولی "ہاں جاؤں گی' ابھی جاؤں گی۔"

"کیا بات ہے تم دونوں میں پھر جھگڑا ہو گیا ہے؟ تم کیوں رو رہی ہو؟"

"بس یونہی۔"

"یونہی تو کبھی رونا نہیں آتا۔ کوئی تو وجہ ہوتی ہے۔ اگر جھگڑا نہیں ہوا ہے تو تم اس کے دکھ' اس کی بیماری پر آنسو بہا رہی ہو اور اگر اس کی بے چارگی پر آنسو بہا رہی تھیں تو تمہیں سب سے پہلے اس کے پاس جانا چاہیے۔ اس کے سرہانے بیٹھنا چاہیے' اسے تسلی دینا چاہیے۔ جیسے کہ تم ہمیشہ کرتی ہو۔ آج اس سے دور یہاں بیٹھی ہوئی ہو کیا ہمیں نہیں معلوم کہ تم دونوں کھانا چھوڑ کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی ہو۔ جب جھگڑا کرتی ہو تو دکھ بیماری میں بھی شریک نہیں ہوتیں' آخر تم دونوں کا مزاج کیسا ہے؟"

وہ بیزاری سے بولی "بس ایسا ہی ہے' جانے دیجیے امی۔"

"یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ رخسانہ کے پاس جاؤ۔"

"اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس ڈرامے میں' میں نے اپنا رول ادا کر دیا۔ میری ایکٹنگ ختم ہو گئی' میری صورت دکھا دی گئی۔ اب میرا کیا؟"

اس کی امی اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں پھر بولیں "ضرور کوئی خاص بات ہے ورنہ تم ایسی باتیں نہ کرتیں۔ یہ سب جو کچھ کہا گیا ہے' وہ اس لڑکے کے لیے کہا گیا ہے مگر تمہاری سہیلی سے تو تمہارا رشتہ نہیں ٹوٹ گیا۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تم دونوں میں کس قسم کے اختلافات ہیں' مجھے بتاؤ۔"

فرزانہ نے نظریں اٹھا کر امی کو دیکھا پھر بڑے دکھ سے بولی "امی میں نے بادشاہ جانی کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے' اچھا نہیں کیا۔ مانا کہ رخسانہ کے علاج کے لیے راستہ ہموار ہو رہا ہے مگر وہ بھی بہت اچھا آدمی ہے۔ اچھے آدمیوں کو دھوکا دیتے وقت' جھوٹ بولتے وقت دل دکھتا ہے۔ بس یہی بات میں نے رخسانہ سے کہہ دی تو وہ آگ بگولا ہو گئی' کہنے لگی کہ میں بادشاہ جانی پر مرمٹی ہوں۔ وہ بہت الٹی سیدھی باتیں کر کے غصے میں یہاں سے گئی تھی۔"

"تم دونوں کو بڑی جلدی غصہ آتا ہے۔ کسی بات پر وہ اکڑ دکھاتی ہے اور کسی بات پر تم بھڑک جاتی ہو' چلو جاؤ۔ وہ ہوش میں آگئی ہوگی اور یقیناً تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ اسے سمجھاؤ' اسے تسلیاں دو' انشاء اللہ وہ جلد ہی دلہن بنا دی جائے گی۔"

"امی میں رخسانہ کے لیے بہت کچھ کر رہی ہوں مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ آپ میرے احساسات کو اہمیت نہیں دے رہیں۔"

انہوں نے پوچھا "کون سے احساسات؟"

"تعجب ہے' ابھی میں نے ایک شخص کی سادگی اور بھولپن کا ذکر کیا' اس کی شرافت بتائی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ ایک شریف آدمی کو دھوکا دیتے وقت دل دکھتا ہے کیا آپ اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتیں؟ اس کی حمایت یا مخالفت میں کچھ نہیں کہہ سکتیں؟"

"بیٹی میں کیا کہوں' اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس لڑکے کی حمایت میں بولنا چاہیے لیکن ہمارے سامنے رخسانہ کا دکھ بھاری ہے۔"

"کچھ بھی ہو امی' ہم اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

"بس یہی کہہ کر تم نے اسے غصہ دلا دیا ہے۔ چلو اس کے پاس' میں بھی وہیں چل رہی ہوں۔"

وہ ابھی رخسانہ کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی مگر ماں کی ضد پر گھر میں تالا لگا کر وہاں پہنچ گئی۔ جب ماں بیٹی رخسانہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں تو انہیں کمرے سے اس کی امی کی ذرا بلند آواز سنائی دی' وہ اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی "بیٹی تم ہی فری کو گلے لگاتی رہتی ہو۔ میں تو کئی بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ وہ ایک نمبر کی خود غرض ہے' کبھی دل وجان سے تمہاری سہیلی بن کر نہیں رہ سکتی۔ ہمیشہ تمہاری کاٹ کرتی رہتی ہے۔ غضب خدا کا' اس کے تو دیدے کا پانی مر گیا ہے۔ آج ہم نے اپنی بیٹی کے لیے ایک لڑکے کو پسند کیا تو وہ اس پر نیت خراب کر رہی ہے' بڑی چھچھوری ہے' معلوم ہوتا ہے اسے اور کوئی نہیں ملے گا۔"

فرزانہ کی امی نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "بہن! کیوں میری بیٹی پر کیچڑ اچھال رہی ہو؟ میری بیٹی نے آج ایک اجنبی لڑکے سے ملاقات کی' اسے گھیر کر یہاں تک لائی۔ کوئی بھی شریف زادی ایسے کام نہیں کرتی' یہ بہت بڑی ذلالت ہے اور یہ ذلالت ہم نے تمہاری بیٹی کے لیے کی' تم اس کا یہ صلہ دے رہی ہو کہ میری بیٹی کو بدنام کر رہی ہو۔"

بستر پر لیٹی ہوئی رخسانہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی' اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کا لباس کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ اس نے ذرا نقاہت سے اور ذرا حقارت سے فرزانہ کی طرف دیکھا پھر اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں۔ اس کی امی نے کہا "ٹھیک ہے' فری اسے ہمارے پاس لے کر آئی تھی لیکن ایسی مہربانی کا کیا فائدہ؟ تمہاری بیٹی تو میری رخسانہ کے بجائے' اس ڈرائیور سے مہربانی جتا رہی ہے' اس کے لیے آنسو بہا رہی ہے' اسے بھولا بھالا کہہ رہی ہے اور ہم اس کی نظروں میں ظالم' جھوٹے اور مکار ہو گئے ہیں۔ ابھی لڑکے نے ہمارے گھر قدم رکھا ہے تو یہ اس قدر بدنام کر رہی ہے کل شادی تک نوبت پہنچے گی تو پتا نہیں ہمیں کہاں کہاں بدنام کرتی پھرے گی' بھئی ایسی مہربانی' ہمدردی اور دوستی سے تو ہم باز آئے' دور سے ہاتھ جوڑتے ہیں۔"

رخسانہ نے کہا "امی ہمیں دور سے بھی ہاتھ نہیں جوڑنا چاہیے' میں اس لڑکی کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ یہ کسی سے بھی دوستی کے قابل نہیں ہے۔ یہ دنیا کو دکھاتی ہے کہ میری محبت میں میرے پاؤں کی جوتی بن گئی ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ جوتی کہاں

سے کاٹتی ہے۔"

فرزانہ نے آگے بڑھ کر کہا "جوتی کاٹتی ضرور ہے لیکن پاؤں میں کانٹا نہیں چبھنے دیتی' راستے کی ہر بلا سے محفوظ رکھتی ہے لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ویسے میں بھی سمجھ گئی ہوں کہ اب ہماری دوستی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہمیں آج کے بعد ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔"

رخسانہ نے غصے سے کہا "ہاں! کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ چلی جاؤ یہاں سے مگر جانے سے پہلے یہ سن لو' اگر انسان کی بچی ہو تو یہ کبھی نہیں بھولوگی کہ میرا چہرہ تمہارے ہاتھوں سے بگڑا ہے اور آج میری بنی ہوئی تقدیر تم سے بگڑ رہی ہے۔"

رخسانہ کے والد فرید احمد نے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے فرزانہ کے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا "بیٹی تم سب غصے میں ہو' مجھے کبھی غصہ نہیں آتا اور جنہیں غصہ نہیں آتا وہ دانش مند ہوتے ہیں۔ میں اس وقت تم لوگوں کے درمیان عقل کی بات کر سکتا ہوں اور عقل کی بات یہ ہے کہ جو کام بن رہا ہے' اسے غصے میں نہ بگاڑو۔ میری بیٹی کو دلہن بنادو بس میں اور کچھ نہیں چاہتا۔"

فرزانہ نے کہا "انکل! میں نے کب دشمنی لی ہے۔ میں کب چاہتی ہوں کہ رخسانہ دلہن نہ بنے۔ میں نے اسی کے لیے سب کچھ کیا ہے' یہ ذرا ذرا سی بات میں غصہ دکھاتی ہے۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گی' اتنا کہتی ہوں کہ کل بادشاہ جانی کالج میں میرے پاس آئے گا تو میں اسے یہاں بھیج دوں گی۔ آپ لوگوں کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہوں گی۔ انشاء اللہ وہ یہاں داماد بن کر رہے گا۔ میں اپنا یہ فرض ادا کردوں گی' اس کے بعد ہم آئندہ آپ لوگوں سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے' آیئے امی۔"

وہ اپنی امی کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔ رخسانہ کی امی نے کہا "ہم کیسے یقین کریں کہ تم ہمارے ساتھ اب دشمنی نہیں کروگی؟"

فرزانہ نے دروازے سے پلٹ کر کہا "یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا ہے۔ ویسے میں ایک شریف باپ کی بیٹی ہوں' اپنے ابا مرحوم کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ رخسانہ سے دشمنی نہیں کروں گی اور آئندہ بھی اس کے لیے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی امی کے ساتھ ان کے گھر سے آئی اور اپنے گھر میں پہنچ کر سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی امی نے کہا "بیٹی کھانا کھالو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

وہ اپنی بیٹی کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں پھر کہا "یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ماں بیٹی تمہارا نام اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ کیوں لے رہی تھیں۔ آخر یہ بات شروع کیسے ہوئی؟ کیوں ان کے دماغ میں ایسی بات آئی؟"

"اور کیسے آئے گی؟ رخسانہ نے اپنی امی سے کہا ہوگا۔ میں بادشاہ جانی کی حمایت میں بول رہی تھی' اس حمایت کو اس نے محبت سمجھ کر بات آگے بڑھا دی اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی۔"

اس کی امی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں پھر اسے غور سے دیکھنے لگیں۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ فرزانہ نظریں چراتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگی پھر اسے خیال آیا کہ اس طرح نظریں چرانے کا علم ہوجائے گا' وہ میز پر سے کتاب اٹھا کر یوں ہی اس کی ورق گردانی کرنے لگی مگر یہ سمجھتی جارہی تھی کہ اس کی امی اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھے جارہی ہیں پھر انہوں نے کہا "کبھی میں بھی ایک لڑکی تھی' تمہاری طرح بن بیاہی تھی۔ شادی نہیں ہوئی تھی مگر شادی کے خواب دیکھتی تھی۔ مجھے شہنائی کی آواز اچھی لگتی تھی۔ کانوں میں ڈھولک کی تھاپ سنائی دیتی تھی۔ کہیں محلے پڑوس میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو میں سوچتی تھی' میری شادی کب ہوگی' میرا جیون ساتھی کب آئے گا اور آئے گا بھی یا نہیں۔ نہیں آئے گا تو کس طرح ڈھونڈا جائے گا۔ میں نے بادشاہ جانی کو دیکھا ہے' وہ ایسا ہے جسے کوئی بھی لڑکی ڈھونڈنا چاہے گی۔ تم نے اسے ڈھونڈ لیا اور شاید تم نے اسے پا بھی لیا۔"

فرزانہ نے ایک دم سے چونک کر اپنی امی کو دیکھا۔ نظریں ملیں تو اس نے فوراً ہی اپنی نظریں جھکا لیں۔ اس کی امی نے کہا "بیٹی رخسانہ کو سہیلی بنانے کے بعد تم یہ بھول گئیں کہ تمہاری یہ ماں بھی تمہاری سہیلی رہی ہے' کوئی بات تم مجھ سے نہیں چھپاتی تھیں' آج بھی نہ چھپاؤ' صاف صاف کہو' میں دیوار نہیں بنوں گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس کے متعلق میں

کیا سوچ رہی ہوں۔ کسی کو ڈھونڈنا اور ڈھونڈ کر پالینا اور بات ہے مگر پالینے کے بعد اسے اپنا لینا ایک الگ سی بات ہے۔ کیا میں بادشاہ جانی کے متعلق ایسا سوچتی ہوں؟ یہ بات ابھی پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔"

"بیٹی تم تعلیم یافتہ ہو' اپنے خیالات' اپنے احساسات کا تجزیہ کرو۔ دیکھو کہ تمہارے اندر کیا ہے؟"

"امی! میری سمجھ میں یہی بات آتی ہے کہ مجھے بادشاہ جانی سے بہت زیادہ ہمدردی ہوگئی ہے۔ میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔ اگرچہ صرف چھ سات گھنٹے تک دیکھا ہے مگر اتنے کم عرصے میں وہ ایک کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے آیا۔ اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے' وہ جھوٹ نہیں بولتا اور جب سچ بولتا ہے تو اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ ایسے انسان کو دھوکا دیتے وقت ہمارا ضمیر کیا کہے گا۔ یہ آپ اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ میرا ضمیر بھی مجھے ملامت کررہا ہے' بار بار میرا دھیان بادشاہ جانی کی طرف چلا جاتا ہے' میں اسی کے متعلق سوچتی ہوں۔ میری عمر کی لڑکیاں اگر کسی مرد کے متعلق بار بار سوچنے لگیں تو اسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں محبت چھپی ہوئی ہو' تو جو چیز چھپی ہو اس کا تذکرہ فضول ہے' ابھی جو بات سامنے آئی ہے' وہ یہی ہے کہ بادشاہ جانی مفت میں مارا جارہا ہے اور میرے ہاتھوں سے مارا جارہا ہے۔"

اس کی امی نے سر جھکالیا پھر وہاں سے اٹھ کر جانے لگیں۔ فرزانہ نے کہا "امی میرے پچھتانے اور آپ کے سر جھکا کر جانے سے کیا ہماری اس غلطی کی تلافی ہوجائے گی؟"

وہ پلٹ کر بولیں "ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں' بے شک بادشاہ جانی قابل رحم ہے' مجھے بھی اس سے ہمدردی ہے لیکن ہمارا یہ فیصلہ اٹل رہے گا کہ بادشاہ جانی خواہ کیسا ہی فرشتہ کیوں نہ ہو' ہم اسے دھوکا ضرور دیں گے۔ جانتی ہو کیوں؟"

فرزانہ نے انہیں سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ بولیں "اس لیے کہ رخسانہ کا چہرہ تمہارے ہاتھوں سے بگڑا ہے۔ خواہ نادانستہ ایسا ہوا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے الزام تمہارے سر پر آگیا ہے۔ اگر تم اس کی یہ بگڑی بنادو' اسے سہاگن بنادو اور بادشاہ جانی اسے قبول کرلے تو یہ الزام کسی حد تک مٹ جائے گا'

کہنے کو تو ہوگا کہ تم نے صورت بگاڑی تھی تو اسے سہاگن بھی بنادیا تھا۔ اس کے ہسٹیریا کے مرض کو ختم کردیا تھا۔ کچھ تو ہم اپنے بچاؤ کے لیے کہہ سکتے ہیں اور اس کے لیے ہمیں اپنی سطح سے گر کر ہی وہ کام کرنا ہوگا جو شریف لوگ نہیں کرتے۔"

اس رات فرزانہ کو نیند نہیں آئی۔ اپنی ماں کو یہ سمجھانے کے لیے کہ وہ سو رہی ہے' اس نے کمرے کی بتی بجھادی مگر تمام رات جاگتی رہی۔ وہ جان بوجھ کر نہیں جاگ رہی تھی' اسے اس کے اندر کوئی بات جگا رہی تھی' ایسی بات جو لفظوں میں دکھائی دیتی ہے مگر ان لفظوں کے معنی معلوم نہیں ہوتے۔ وہ اس بات پر آکر ٹھہر جاتی تھی کہ اسے صرف بادشاہ جانی سے ہمدردی ہے اور اگر ہمدردی ہے تو وہ کل صبح نو بجے کس لیے ملے گی؟ ہمدردی کے لیے یا اس سے دشمنی کے لیے؟

صبح ہوئی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے رات بھر میں ایک بار بھی سونے کے لیے پلک نہیں جھپکائی۔ جاگتی بھی رہی اور شاید چپکے چپکے روتی بھی رہی۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر تولیا لپیٹے اپنے کمرے میں آئی پھر الماری کھول کر ایک اچھا سا سرخ رنگ کا لباس نکالا' اسے پہننے کا ارادہ تھا' اچانک خیال آیا کہ وہ کس کے لیے یہ لباس پہننے جارہی ہے؟ یہ لباس پہننے کے بعد بناؤ سنگھار بھی کرے گی لیکن کیوں؟ ادھر رخسانہ نے اسے سنگھار کے بعد دیکھا تو جل کر راکھ ہوجائے گی۔ اس نے ضد میں آکر سوچا' کیا میں رخسانہ سے ڈرتی ہوں' میں تو ہمیشہ اس سے اچھا پہنتی ہوں اور سنگھار کرتی ہوں مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔

پھر دل نے سمجھایا' بے شک کسی کا ڈر نہیں ہے لیکن بادشاہ جانی کے سامنے نہایت سادگی سے جانا چاہیے۔ ایسے انداز میں نہیں کہ وہ اور دیوانہ ہوجائے اور صرف اس کی تمنا کرے اور جب رخسانہ سے بہلنے کا وقت آئے تو ضدی بچے کی طرح اپنے پہلے ہی کھلونے کے لیے مچلنے لگے۔

اس نے ایک سادہ سا لباس پہن لیا۔ صبح سات بجے رخسانہ کی امی مسکراتے ہوئے اس کے گھر آئیں۔ "بیٹی' تم دونوں سہیلیاں سمجھ میں نہیں آتیں۔ گھڑی میں لڑتی ہو گھڑی میں ایک دوسرے پر مرتی ہو۔ اب وہ ضد کررہی ہے کہ تم کو بلالاؤں۔ تم جانتی ہو کہ اس پر دورہ پڑتا ہے تو بستر سے اٹھ نہیں سکتی۔ آج کالج بھی نہیں جاسکے گی۔ وہ تم

سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

فرزانہ نے کہا "میں نے اور امی نے کل رات آخری فیصلہ سنا دیا۔ اب آپ لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہے گا لیکن میرا یہ وعدہ قائم رہے گا کہ آپ کا ہونے والا داماد آپ کے گھر آئے گا' اس کے بعد جو باتیں آپ لوگ طے کریں گے' اس میں نہ ہماری مداخلت ہوگی اور نہ ہی ہم شادی میں شریک ہوں گے۔"

رخسانہ کی امی نے فرزانہ کی امی کو سمجھایا کہ بات ختم کرو۔ لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن فرزانہ کی امی نے بھی یہی جواب دیا "بہن اگر ہماری بہت زیادہ ضرورت آپڑے تو ہم تمہارے یہاں ضرور بہ ضرور آئیں گے مگر ابھی آنا جانا بالکل غیر ضروری ہے' آپ کا کام یقیناً ہوگا' آپ خدا پر بھروسا رکھ کر جائیں۔"

وہ چلی گئیں' ان کے جانے کے بعد فرزانہ نے کہا "امی بہتر یہی ہے کہ ہم یہ مکان فروخت کر دیں اور کسی دوسرے علاقے میں چھوٹا سا مکان لے کر رہیں۔"

"اتنی جلدی جذباتی ہو کر ایسے فیصلے نہیں کرنا چاہئیں۔ یہ مکان میں نے اس دن کے لیے رکھا ہے' جب تم ڈاکٹر بنو گی اور تمہیں ڈسپنسری کھولنے کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہوگی۔ ابھی ہم ان سے دور کیوں بھاگیں۔ ہم کوئی مجرم تو نہیں ہیں۔"

"ہم مجرم نہیں ہیں لیکن میں ان لوگوں کے قریب نہیں رہ سکوں گی۔ ہم اتنے عرصے کے لیے تو دور چلے جائیں جب تک رخسانہ دلہن بن کر چلی نہ جائے۔ میں سکھر جانا چاہتی ہوں' وہاں ہم کچھ دن چچا جان کے یہاں رہیں گے پھر واپس آجائیں گے۔"

"ہاں' تمہارا یہ مشورہ مجھے قبول ہے۔ میں بھی بہت عرصے سے جانا چاہتی تھی۔"

"تو پھر کیوں نہ ہم آج ہی رات کو یہاں سے چلیں' دیکھئے امی' اب میں بادشاہ جانی کے سامنے نہیں جانا چاہتی۔ رخسانہ کی شادی سے پہلے کہیں سامنا ہوا تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گی۔"

"میں تمہاری مجبوریوں کو سمجھ رہی ہوں۔ ٹھیک ہے' تو کالج جاؤ۔ میں سامان پیک کرتی ہوں انشاء اللہ ہم آج رات یہاں سے چلے جائیں گے۔"

صبح نو بجے سے پہلے وہ گھر سے نکلی اور عباسی اسپتال کی طرف جانے لگی۔ جو بھی ٹیکسی نظر آتی تھی' اس پر یہی گمان ہوتا تھا کہ بادشاہ جانی آگیا لیکن اسپتال کے سامنے کوئی

ٹیکسی نہیں تھی۔ بہت دور ایک طرف ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی لیکن وہ سمجھ نہ سکی کہ اس ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بادشاہ جانی سو رہا ہے۔ وہ بھی رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اسے نیند نے دبوچ لیا تھا۔ جب وہ ساڑھے نو بجے تک انتظار کرتی رہی اور وہ نظر نہیں آیا تب وہ اسی ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگی۔ پچھلی سیٹ پر کوئی سوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ جب اس نے جھانک کر دیکھا تو بادشاہ جانی نظر آگیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ دل نے کہا دیکھو' یہ تمہارے لیے کل سے یہاں موجود ہے' اپنے گھر نہیں گیا' آج اس نے تمہارے لیے گھر چھوڑا ہے' کل تمہارے لیے دنیا چھوڑ دے گا۔

وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ جانی کو جگایا' اس کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھی' شام تک اس کے ساتھ ٹیکسی میں گھومتی رہی۔ وہ ان کی ملاقات کا آخری دن تھا۔ شام کو جدا ہوتے وقت وہ بے اختیار رونے لگی تھی۔ بادشاہ جانی نے اسے سمجھایا کہ عارضی جدائی ہے' پھر تو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جائیں گے۔

وہ بڑی خاموشی سے بچھڑ گئی۔ اس کی امی نے بتایا کہ وہ کل صبح کی ٹرین سے سکھر جائیں گے۔ رات کو رخسانہ اس کے گھر آئی۔ اسے دیکھتے ہی فرزانہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا "دیکھو' مجھے پریشان نہ کرو۔ مجھ سے محبت جتانے نہ آؤ۔"

رخسانہ نے کہا "میں جانتی ہوں' تم مجھ سے بری طرح ناراض ہو' چلو میں بھی آخری بار ملنے آئی ہوں۔ ہاں جب تمہارا دل چاہے گا' ملنا چاہو گی تو پھر میں ہزار بار ملوں گی' ابھی تو میں کچھ ضروری باتیں کرنے آئی ہوں۔"

فرزانہ نے کہا "بیٹھو" اور بغیر کسی تمہید کے ضروری باتیں سنا دو۔ میں ضروری سمجھوں گی تو جواب دوں گی ورنہ چپ چاپ چلی جانا۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی پھر بولی "امی نے بادشاہ جانی سے تمام باتیں طے کر لی ہیں اور وہ امی کی ہر شرط ماننے کے لیے راضی ہیں لیکن ایک بات ہم سب نے محسوس کی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں' تمہارے لیے کر رہے ہیں۔ وہ ایک مکان میرے نام لکھیں گے لیکن ان کے دماغ میں تم ہوگی۔ مہر کی رقم میرے نام سے باندھی جائے گی مگر وہ اتنی بڑی رقم تمہارے تصور سے قبول کریں گے۔ نکاح میرے نام سے پڑھا جائے گا لیکن ان کے دل میں تم دھڑکتی رہو گی اور جب یہ سب کچھ ہوگا اور سہاگ رات کو تم نہیں ملو گی اور

میری صورت نظر آئے گی تو کیا ہوگا۔"

فرزانہ نے کہا "یہ سوچنا تمہارا کام ہے' میرا کام ختم ہو چکا ہے۔"

"ہاں یہ سوچنا میرا ہی کام ہے اسی لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ میں بادشاہ جانی کو کسی نہ کسی طرح ہینڈل کرلوں گی۔ ہر طرح سے باتیں بنا کر انہیں یقین دلاؤں گی کہ میں وہی رخسانہ ہوں جسے وہ چاہتے ہیں لیکن وہی رخسانہ بننے کے لیے اپنے آپ کو تمہاری شخصیت اور تمہارے روپ میں پیش کرنے کے لیے وہ تمام باتیں جاننا ضروری ہیں جو آج اور کل تم دونوں کے درمیان ہوتی رہیں۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کہ تم دونوں کہاں کہاں گئے اور کیسے وقت گزارا۔"

فرزانہ نے دو دن کے تمام حالات و واقعات اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو اور گفتگو کا انداز' یہ ساری باتیں تفصیل سے سنا دیں۔ اس کے بعد کہا "میں کل امی کے ساتھ سکھر جا رہی ہوں۔ پندرہ دن کے بعد واپس آؤں گی' تم اس وقت تک سہاگن بن چکی ہوگی۔ جس دن سہاگن بن جاؤ اور تمہیں تمہارا جیون ساتھی مل جائے تو اس کے بعد میرے سر سے یہ الزام ہمیشہ کے لیے مٹا دینا کہ میں نے تمہارا چہرہ بگاڑا تھا۔ ایک بات میں اب بھی یاد رکھتی ہوں کہ مجھے ڈاکٹر بننے کے بعد اپنی آمدنی کے ذرائع بنانے ہیں اور تمہاری پلاسٹک سرجری کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنی ہے۔"

رخسانہ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "نہیں! میں تم سے اس سلسلے میں ایک پیسہ نہیں لوں گی۔ تم نے میرا چہرہ جان بوجھ کر نہیں بگاڑا۔ وہ تو میں غصے میں کہہ دیتی ہوں۔ تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے' میں سہاگن بن جاؤں گی تو پھر کبھی تمہارے خلاف کوئی بات نہیں کہوں گی' یہ میں وعدہ کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگی پھر رک گئی' بولی "فری! تم نے بادشاہ جانی کو مجھ سے پہلے سمجھا ہے اور مجھ سے زیادہ جانا ہے' میں کچھ اور معلوم کرنا چاہتی ہوں' کوئی ایسی بات جس سے میں اسے جیت لوں۔"

"دیکھو رخسانہ! اپنے مرد کو کیسے جیتنا چاہیے' یہ عورت ہی سمجھتی ہے۔ ویسے پہلے پہل خاموشی سے اپنے مرد کے مزاج کو سمجھنا ہوتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ تم نے مجھ سے پہلے بادشاہ جانی کے مزاج کو سمجھا ہے'

کوئی مشورہ دو۔"

"جب مشورہ مانگ رہی ہو تو میری ایک بات سن لو' یہ کھیل جو تم بادشاہ جانی سے کھیلنے جا رہی ہو' تمہیں شاید راس آ جائے لیکن یہ کھیل مہنگا بہت پڑے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ یوں کہ تم میری شخصیت اور میرے روپ کا سہارا لے کر بادشاہ جانی کو یقین دلاؤ گی کہ تم پہلے والی رخسانہ ہو' جسے وہ دو دن پہلے تک دیکھتا رہا۔ وہ ایسا احمق تو نہیں ہے' کیا تمہارے آدھے چہرے سے تمہیں نہیں پہچانے گا۔ میرا اور تمہارا چہرہ مختلف ہے' آدھے چہرے سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔"

"ہاں' یہ میں نے سوچا ہے' میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ وہ مجھے پہلے دو دن پہلے والی رخسانہ سمجھ لے۔ اس کے لیے میں مثالیں بھی دوں گی' اپنی مصیبتیں بھی بیان کروں گی کہ تیزاب کے چہرے پر گرنے کے بعد باقی بچے ہوئے چہرے پر بھی اس کا اثر ہوا ہے' میں باتیں بناؤں گی' تم جانتی ہو کہ مجھے باتیں بنانا آتا ہے۔"

فرزانہ نے تائید میں سر ہلا کر کہا "مجھے یقین ہے کہ تم اسے اپنی باتوں سے قائل کر لو گی لیکن کب تک؟ میرا مشورہ ہے کہ شادی کی پہلی رات ہی اسے سب کچھ بتا دو' وہ بہت خدا ترس آدمی ہے۔ دل میں انسانی ہمدردی رکھتا ہے۔ تم پر گزرنے والے المیے کی بات سنے گا تو پہلے تم سے ہمدردی کرے گا پھر یہی ہمدردی محبت میں بدل جائے گی۔ وہ رفتہ رفتہ تمہیں تمہاری اپنی شخصیت کے ساتھ قبول کر لے گا۔"

"تم یہ مشورہ کیوں دے رہی ہو؟ شادی کی رات ہی اس نے ہنگامہ کر دیا' مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا' یہاں آ کر شور مچانا شروع کر دیا تو محلے میں ہماری کیا عزت رہے گی۔"

فرزانہ نے چند لمحوں تک سوچ کر کہا "ہاں وہ ایسا کر سکتا ہے اور نہیں بھی کر سکتا لیکن تم اسے میرا روپ' میری شخصیت لے کر اپناؤ گی تو بعد میں یہ بات بہت مہنگی پڑے گی۔ ذرا سوچو' وہ جب بھی تمہارا ہاتھ پکڑے گا' تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرے گا تو اس کے تصور میں' میں رہوں گی' اور جب میں وہاں رہوں گی تو تمہاری اپنی

ذات' اپنی شخصیت' اپنی انانیت سب کچھ کہاں رہے گی؟ تم تو کچھ بھی نہیں رہو گی۔"

رخسانہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی پھر اچانک مسکرا کر بولی "فری! تمہیں اپنے متعلق بہت زیادہ خوش فہمی ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ میں صرف سہاگن بننے کے لیے تمہارے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہی ہوں اور ساری زندگی تمہارے ہی سہارے چلوں گی۔ نہیں' ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میرا جو آدمی ہوگا اور جو مجھے سر سے پاؤں تک قبول کرتا رہے گا اس کے سامنے میرا ہی چہرہ رہے گا اور وہ میرے اس چہرے کا عادی ہو جائے گا پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ تمہارا تصور بالکل ہی مٹ جائے گا اور ہر جگہ اسے میری تصویر نظر آئے گی۔"

"اور اس دوران کہیں میں اُسے نظر آگئی تو؟"

"ہوں' اگر تمہارا اور ان کا سامنا ہو جائے تو تمہارا کیا فرض ہونا چاہیے' یہ تم نہیں سمجھتی ہو؟"

"تم سمجھا دو۔"

"تو سنو' تمہیں بالکل انجان بن جانا چاہیے۔ وہ تمہیں مخاطب بھی کرے تو تمہیں انکار کر دینا چاہیے کہ تم وہ ہو جو کبھی اسے ملی تھیں۔ جب تم اجنبی بن جاؤ گی تو پھر وہ کسی اجنبی لڑکی سے بات نہیں منوائے گا' کوئی ہنگامہ نہیں کرے گا۔ چار آدمی تمہاری حمایت کریں گے اور اس کی مخالفت کریں گے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے تک گئی پھر وہاں سے پلٹ کر بولی "یہ بات کبھی نہیں بگڑے گی اگر میں اپنی بات پر اڑی رہوں کہ میں اس کی وہی دیکھی بھالی رخسانہ ہوں اور تم اس بات پر اڑی رہیں کہ تم کبھی رخسانہ نہیں تھیں' بچپن سے اب تک فرزانہ ہو۔ ایک اجنبی لڑکی ہو۔ تم نے بادشاہ جانی کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ اگر ہم دونوں اپنی اپنی جگہ اٹل رہیں گی تو میرا سہاگ سلامت رہے گا۔ وہ رفتہ رفتہ میرے ہو جائیں گے اور اس بات کے قائل ہو جائیں گے کہ چہرہ بگڑ جائے تو اس حد تک بگڑ جاتا ہے کہ بعد میں پہچانا نہیں جاتا۔ بہرحال کیا تم آئندہ ان کے سامنے ایک اجنبی لڑکی بن کر رہو گی۔"

"جہاں میں نے اتنا کچھ کیا ہے' یہ بھی کر گزروں گی۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ بادشاہ جانی کا سامنا کبھی نہ ہو' تم اطمینان رکھو۔"

وہ چلی گئی۔ دوسرے دن فرزانہ بھی اپنی امی کے ساتھ وہ شہر چھوڑ کر سکھر چلی گئی' وہاں پندرہ دن گزارے' کس طرح گزارے' یہ اس کا دل جانتا تھا یا خدا جانتا تھا۔ دن رات بادشاہ جانی کا خیال آیا کرتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ اسے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اس کی یاد میں گم ہوگا پھر سوچتی اب رخسانہ سے شادی ہو گئی ہوگی پھر یہ خیال آتا کہ اس نے رخسانہ کو قبول نہیں کیا ہوگا۔ وہ اندھا تو نہیں ہے کہ رخسانہ کے چہرے کو فرزانہ کا چہرہ سمجھ لے گا۔

پھر کیا ہوا ہوگا؟ کیا لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے ہوں گے؟ بادشاہ جانی نے ہنگامے کیے ہوں گے؟ ماں بیٹی کو اور ان کے پورے خاندان کو گالیاں دی ہوں گی؟ محلے میں آکر فساد برپا کیا ہوگا؟ لوگوں کو جمع کیا ہوگا' کیا ہو رہا ہوگا؟

وہ بڑی بے چینی میں مبتلا رہتی تھی۔ نہ اچھی طرح کھاتی تھی نہ پوری نیند سوتی تھی۔ دل ادھر ہی لگا رہتا تھا۔ جی چاہتا تھا فوراً ہی اڑ کر چلی جائے پھر ڈر لگتا تھا کہ پتا نہیں شادی ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی ہے تو بادشاہ جانی اپنی پہلی رخسانہ کو تلاش کر رہا ہوگا' ایسے میں سامنا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟

ڈرنے سے کیا ہوتا ہے' موت سے بھی تو ڈر لگتا ہے مگر زندگی کی ہر سانس میں موت سے سامنا کرتے رہنا پڑتا ہے۔ یہ بات اٹل تھی کہ کبھی بادشاہ جانی سے سامنا ہوگا اور جو بات موت کی طرح اٹل ہو' وہ رفتہ رفتہ ڈرانا چھوڑ دیتی ہے۔ پندرہ دن کے بعد وہ اپنی امی کے ساتھ واپس آگئی' محلے میں امن امان تھا۔ بادشاہ جانی کی طرف سے دنگے فساد کے آثار نہیں تھے۔ جب وہ گھر کے سامنے پہنچیں تو فرید احمد اپنے گھر کے دروازے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ فرزانہ نے انہیں سلام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے قریب آئے پھر بولے "بیٹی کیسی ہو؟ خیریت سے تو رہیں نا؟"

"جی ہاں' آپ لوگ اپنی خیریت سنائیں۔"

"سب ٹھیک ہے' اللہ کا کرم ہے' میری بیٹی سسرال میں بہت خوش ہے۔"

یہ بات فرزانہ کی توقع کے خلاف تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بادشاہ جانی اس کے بدلے کسی دوسری کو دلہن کے روپ میں قبول کر لے گا۔ وہ ایسا تو نظر نہیں آتا تھا کہ محبت ایک سے کرے اور دوسری سے بہل جائے۔

وہ دل برداشتہ ہو کر اپنے مکان میں آئی۔ ماں کو اس بات کا اطمینان تھا کہ شادی کامیاب رہی۔ فرزانہ سے جو اس کا چہرہ بگڑا تھا' اس کی تلافی ہو گئی تھی۔ کسی نے اسے بیوی کی حیثیت سے تمام عمر کے لیے قبول کر لیا تھا۔ فرزانہ کے سر سے الزام ہٹ گیا تھا لیکن فرزانہ کے اندر عجیب سی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ جو بات وہ سوچ نہیں سکتی تھی' وہ ہو رہی تھی۔ وہ سچ مچ ٹیکسی ڈرائیور نکلا۔ سواری بدلنا اس کا پیشہ تھا۔ اس نے سواری بدل لی۔

شام کو رخسانہ اپنی امی کے ساتھ سسرال سے واپس آئی جب پتا چلا کہ فرزانہ آئی ہے تو دونوں ماں بیٹی ملنے کے لیے ان کے یہاں آگئیں۔ رخسانہ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھی۔ بدن پر سونے کے ہلکے زیورات بھی تھے' وہ اپنے ہر انداز سے شادی شدہ لگ رہی تھی۔ چہرے پر رونق بھی تھی۔ اس نے فرزانہ کے آگے دونوں بانہیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا مجھے مبارک باد نہیں دو گی؟"

فرزانہ نے مصافحے کے لیے ایک ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "مبارک ہو' میری دعا ہے کہ تمہاری زندگی کی ہر سانس مبارک سلامت رہے۔"

وہ بولی "فری میں گلے لگنے کے لیے بانہیں پھیلا رہی ہوں اور تم مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی ہو۔ کیا ابھی تمہاری ناراضگی دور نہیں ہوئی' کیا تمہیں میری اس زندگی سے خوشی نہیں ہوئی؟"

"میں بہت خوش ہوں اور مطمئن بھی کہ میں نے اپنی ایک نادانستہ غلطی کی تلافی کر دی۔ جہاں تک گلے لگنے کا تعلق ہے تو ہمیں اپنے درمیان تھوڑا فاصلہ رکھنا چاہیے' اتنا فاصلہ کہ ہمیں ایک دوسرے کا چہرہ نظر آتا رہے۔ گلے لگنے سے چہرے پیچھے چلے جاتے ہیں۔"

رخسانہ کی امی نے مسکرا کر کہا "بیٹی ہم فری کی خوشی میں خوش ہیں' چلو صرف ہاتھ ہی ملا لو۔"

رخسانہ نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ سب بیٹھ گئے پھر رخسانہ کی امی نے پوچھا "سکھر میں دن کیسے گزرے؟ کیسا موسم ہے؟"

فرزانہ نے کہا "خالہ جان! آپ رسمی گفتگو نہ کریں۔ جس مقصد کے لیے آئی ہیں

بیان کریں۔"

"ہائے بیٹی! تو تم سمجھتی ہو کہ ہم صرف مطلب ہی سے آتے ہیں۔"

فرزانہ نے کہا "سکھر جانے سے پہلے ہم ماں بیٹی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ ہم صرف ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے ملیں گے ورنہ دور رہیں گے۔ یہی بات میں پھر دہراتی ہوں' اگر کوئی ضرورت ہو تو بیان کریں۔ میں آج بھی ہر طرح آپ لوگوں کے کام آؤں گی۔"

رخسانہ کی امی نے دور ہی سے بلائیں لیتے ہوئے کہا "میں جانتی ہوں بیٹی تم بڑی سعادت مند ہو' خدا تمہیں خوش رکھے' تمہاری مرادیں پوری کریں۔ میں یہ بتانے آئی ہوں کہ بادشاہ جانی بہت خوش ہے اور میری بیٹی کو بہت مانتا ہے مگر بات یہ ہے کہ وہ اب بھی اسے وہی رخسانہ سمجھ رہا ہے' یعنی وہ سمجھ رہا ہے کہ تمہارا چہرہ بگڑ گیا ہے اور تمہاری صورت کچھ بدل گئی ہے۔"

فرزانہ کی امی نے تعجب سے پوچھا "بہن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ رخسانہ کے اور فرزانہ کے چہرے میں بڑا فرق ہے' یہ ٹھیک ہے کہ دونوں کا رنگ گورا ہے' دونوں خوب صورت ہیں مگر ناک نقشے میں تو فرق ہے۔ بادشاہ جانی کو کیا یہ فرق دکھائی نہیں رہا؟"

"دکھائی تو دیا تھا اور وہ سہاگ رات کو غصہ بھی دکھا رہا تھا مگر دوسرے دن جب وہ مستری چاچا کو پکڑ کر لایا اور مستری چاچا نے میری بیٹی سے کچھ سوالات کیے اور صحیح جوابات ملے تو وہ قائل ہو گیا' انہوں نے بادشاہ جانی کو قائل کر دیا۔"

فرزانہ کی امی نے کہا "بڑی خوشی کی بات ہے کہ معاملہ نمٹ گیا۔ کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی' اب آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"دیکھیے بہن! بات تو صاف ہے کہ بادشاہ جانی میری بیٹی کو فرزانہ سمجھ کر قبول کر رہا ہے' وہ جتنا سیدھا ہے' اتنا ہی ٹیڑھا بھی ہے۔ اگر اسے فریب اور جھوٹ کا پتا چلے گا تو وہ بڑے ہنگامے کرے گا۔"

"یہ تو رخسانہ کا فرض ہے کہ یہ رفتہ رفتہ اپنے شوہر کو سچ باتیں بتاتی جائے' جھوٹ آخر کب تک چھپے گا؟"

"جب تک چھپ سکتا ہے' ہمیں چھپانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شادی کو کچھ وقت گزر جائے گا۔ بادشاہ جانی میری بیٹی کی خدمت گزاری' وفاداری اور اس کی محبت سے متاثر ہوجائے گا تو پھر یہ رفتہ رفتہ موقع دیکھ کر بادشاہ جانی کو بتادے گی مگر ابھی بادشاہ جانی نے کہیں فرزانہ کو دیکھ لیا تو بڑی آفت آجائے گی۔"

فرزانہ نے کہا "آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے داماد مجھے نہ دیکھیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی دن سامنا تو ہوگا۔"

"بیٹی میں یہی درخواست کرنے آئی ہوں' تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں' جہاں تم نے میری بیٹی کے ساتھ اتنا کیا' وہاں ایک مہربانی اور کرو' اب برقع پہن کر باہر نکلا کرو۔"

فرزانہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ میں ساری دنیا سے اپنا چہرہ چھپاتی پھروں۔ مجھے برقعے سے وحشت ہوتی ہے۔ میں کیوں برقع پہنوں۔ جب میری آنکھوں میں شرم نہیں رہے گی' میری امی کو مجھ پر اعتماد نہ ہوگا اور وہ مجھے سات پردوں میں چھپا کر رکھنا چاہیں گی تو میں ان کی خواہش کا احترام کرنے کے لیے ایسا کرلوں گی' ابھی مجھ میں کیا کھوٹ ہے؟ میں کیوں برقع پہن کر رہوں۔"

رخسانہ نے کہا "تم مجھ سے بری طرح ناراض ہو۔ پچھلی تمام محبتوں کو تم نے بھلا دیا ہے۔"

"مجھے الزام نہ دو۔ تم نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ تم اتنی مغرور اور اتنی غصیلی ہو کہ مجھ پر کیچڑ اچھالتے وقت تمہارے دل میں ذرا بھی محبت اور مروت نہیں ہوتی۔ پچھلی باتوں کو مت یاد دلاؤ' جو کام کی بات ہے وہ کرو۔"

"میں یہی کہنے آئی ہوں کہ میرے سہاگ کو سلامت رکھنے کے لیے تم ہی میرے کام آسکتی ہو۔ بادشاہ جانی سے چھپ کر رہنے کے لیے برقع پہننا شروع کردو۔ تمہاری یہ مہربانی میں کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"دیکھو رخسانہ! تم ایسی بات کررہی ہو جو میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ بادشاہ جانی سے دور رہوں گی' اس کی نظروں میں نہیں آؤں گی اگر وہ مل بھی گیا تو انجان بن جاؤں گی اور اجنبی بن کر اس سے کترا جاؤں گی۔"

"تمہارے چہرے پر نقاب ہوگا تو تمہیں ان سے کترانے کی ضرورت نہیں پڑے گی' میں تمہیں کچھ عرصے کے لیے ایسا کرنے کو کہہ رہی ہوں جب میں اپنے شوہر کو ساری باتیں سچ سچ بتادوں گی اور معاملہ بالکل ٹھیک ہوجائے گا تو تم بے شک برقع اتار کر پھینک دینا۔ خدا کے لیے میری یہ بات مان لو' میں تمام عمر تمہاری احسان مند رہوں گی۔"

"اگر کچھ دنوں کی بات ہوتی تو میں ضرور مان لیتی لیکن میری بات گرہ میں باندھ لو کہ تم نے سہاگ رات کو فرزانہ بن کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے' تمہیں چاہیے تھا کہ سہاگ رات کو اپنی تمام داستان اپنی مجبوریوں کے ساتھ بیان کردیتیں۔ وہ ایک سیدھا سادا اور رحم دل آدمی ہے۔ جتنا ٹیڑھا ہے' اتنا سیدھا بھی ہے۔ وہ یقیناً تم سے متاثر ہوجاتا مگر تم نے اسے میری شخصیت سے متاثر کیا۔ سہاگ رات سے لے کر اب تک اس پر میرے نام کا سحر طاری ہے۔ تم نے اس کے دماغ پر مجھے مسلط کر رکھا ہے پھر وہ کیسے کچھ دنوں میں یہ تسلیم کرلے گا کہ میں اس کے دماغ سے نکل جاؤں اور تم وہاں جگہ بنالو۔ جگہ بنانے کا وقت تم نے کھو دیا ہے رخسانہ بیگم!"

رخسانہ نے اسے غصے سے دیکھا پھر فوراً ہی نظریں جھکالیں۔ وہ ابھی غصہ نہیں دکھا سکتی تھی۔ ضرورت مند تھی' فرزانہ کی محتاج تھی۔ فرزانہ نے کہا "میں جانتی ہوں' اس وقت تمہیں مجھ پر کتنا غصہ آیا ہوگا۔ میں نے تمہارے ساتھ کئی برس گزارے ہیں۔ تمہاری رگ رگ کو سمجھتی ہوں۔ بہرحال میں خود بادشاہ جانی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ وہ دیوانہ ہے' اگر سرِبازار اس نے میرا پیچھا کرنا شروع کردیا تو میں کسی کو کیا جواب دوں گی۔ تماشا بن جاؤں گی اس لیے میرے دماغ میں بھی یہ بات آئی تھی کہ جہاں بادشاہ جانی سے سامنا ہونے کی توقع ہوسکتی ہے' وہاں میں اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر رکھوں گی۔ مثلاً وہ تمہیں کالج چھوڑنے تو ضرور آیا کرے گا۔ میں کالج میں برقع پہن کر جاؤں گی۔ یہاں اس محلے میں جب تک رہوں گی' دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے دیکھ لیا کروں گی کہ اس کی ٹیکسی تمہارے دروازے پر کھڑی ہے یا نہیں۔ اگر وہ یہاں آیا ہوگا تو میں باہر نہیں نکلوں گی۔ نکلوں گی تو اس طرح کہ وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ اب تو تمہاری تسلی ہوگئی نا؟"

رخسانہ کی امی نے کہا "ہاں بیٹی! اتنا بھی ہوجائے تو بہت ہے۔ ہماری اپنی کوشش بھی یہی ہوگی کہ بادشاہ جانی اس محلے میں نہ آئے اور کالج کی طرف بھی نہ جائے' بہرحال

تمہاری ہمدردی کا شکریہ۔"

دونوں ماں بیٹی وہاں سے چلی گئیں۔ فرزانہ مسکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ اسے ایک عجیب سی جیت کا احساس ہو رہا تھا مگر اس کی امی بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے تنہائی میں بیٹی کو دیکھتے ہی پوچھا "تم خوش نظر آ رہی ہو' کیا تمہیں اس بات کی پریشانی نہیں ہے کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور تمہارے حوالے سے رخسانہ کو قبول کر رہا ہے؟ وہ تمہیں چاہتا ہے اور اگر تمہیں چاہتا ہے تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"امی! میں نے اسے چاہنے کے لیے نہیں کہا۔ اگر وہ چاہتا ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی' اپنی پسند ہے اور اس پسند میں شدت پیدا کرنے والی رخسانہ ہے۔ وہ جب تک فرزانہ بن کر زندگی گزارتی رہے گی' اس وقت تک میں بادشاہ جانی کی نگاہوں میں رہوں گی۔ یہ بادشاہ جانی کا تصور نہیں ہے' یہ میری غلطی بھی نہیں ہے۔ غلطی وہ کر رہی ہے اور اس کا احساس اسے' سمجھانے کے باوجود نہیں ہو رہا ہے۔"

"بیٹی اسے احساس ہو یا نہ ہو لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور لوگ بڑے غنڈے بدمعاش ہوتے ہیں۔ اس نے تمہیں کہیں راستے میں پکڑ لیا' تم پر دھوکا دینے کا الزام لگایا' تم سے کوئی زیادتی کی تو کیا ہو گا؟"

"ہاں یہ میں بھی سوچتی ہوں کہ میں نے دھوکا دیا ہے تو وہ مجھے سزا دینے کا حق رکھتا ہے مگر میں کوشش کروں گی کہ بات نہ بگڑے۔ دیکھیں کبھی سامنا ہو گا تو کیا ہوتا ہے۔"

اور پھر ایک برس دو مہینے بعد سامنا ہو ہی گیا۔

وہ رکشے میں بیٹھی ایمپریس مارکیٹ کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ پیچھے سے آواز سنائی دی "رخسانہ۔"

وہ ایک دم سے چونک گئی۔ اس آواز کو وہ قیامت کے شور میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ آواز اسے راتوں کو جگاتی تھی' اس آواز کو اس نے دل سے ازبر کیا تھا۔ اس لیے ایک سبق کی طرح یاد رکھا تھا تاکہ قیامت کے دن وہ اس آواز کو سنے تو فوراً پہچان لے۔

اور اس نے فوراً ہی اسے پہچان لیا تھا۔ بے اختیار پیچھے کی طرف پلٹ کر رکشے کی پچھلی کھڑکی سے دیکھنے لگی۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور ہاتھ اٹھا کر چیخ رہا تھا "رخسانہ ادھر دیکھو' میں بادشاہ جانی ہوں۔" اسے کچھ یاد نہ رہا۔ ایک ہی چہرہ سامنے تھا جو لوگوں کی

بھیڑ میں الجھ رہا تھا۔ ٹکرا رہا تھا۔ کسی کو دھکے مار کر آگے بڑھ رہا تھا اور کسی سے دھکے کھا کر پیچھے گر رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا' پکار رہا تھا۔ ایسی جنونی پکار تھی' ایسا سچا جذبہ تھا جو اس بھیڑ میں اس طرح پھڑپھڑا رہا تھا کہ وہ تڑپ گئی۔ ایک دل کہتا تھا کہ رکشے والے کو روک دے اور اس کے پاس پہنچ جائے مگر ایک خوف بھی تھا۔ اس نے رکشے والے کو رکنے کے لیے نہیں کہا۔ اس کا جنون اس کی محبت جتنی خوش آئند تھی' اتنی خوف زدہ کر دینے والی بھی تھی۔ اس نے سوچا اگر وہ دیوانہ اتنے لوگوں کے ہجوم میں اسے برا بھلا کہے گا' اسے الزام دے گا۔ اسے جھوٹی اور دھوکے باز کہے گا تو وہ کہیں منہ نہ چھپا سکے گی پھر دیوانہ تو دیوانہ ہوتا ہے۔ اگر وہ سربازار اسے اٹھا کر لے جانے لگے تب کیا ہو گا؟ بس وہ اسی گھبراہٹ میں اس سے دور ہو گئی۔ ایک گلی میں پہنچ کر اس نے رکشے والے کو روکا جیسے تیسے کرایہ ادا کیا پھر دوسری گلی میں پہنچ کر وہاں سے گزرتے ہوئے مین روڈ پر آئی۔ اورنگی جانے والی ایک بس گزر رہی تھی' وہ اس میں سوار ہو گئی۔ جب اسے اطمینان ہوا کہ وہ بچ کر نکل آئی ہے' تب اسے افسوس ہوا کہ بچ کر کیوں نکل آئی؟

رات گزرتی جا رہی تھی۔ میز پر وہ ڈائری رکھی ہوئی تھی جس کی جلد کا رنگ سبز تھا۔ اس پر فرزانہ ہاتھ رکھے ہوئے سوچ میں گم تھی۔ جب وہ اپنے خیالات سے چونکی تو احساس ہوا کہ وہ بہت دیر سے اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی اور اس ڈائری کی جلد پر ہاتھ پھیر رہی تھی پھر اس نے اسے کھولا۔ اس کے کتنے ہی صفحات ماضی کی داستان سے پُر تھے۔ اس نے وہ صفحہ کھولا' جہاں داستان ادھوری رہ گئی تھی۔ اس ادھوری داستان کو اس نے آگے بڑھایا قلم کھول کر لکھنے لگی۔

"میں سمجھتی تھی کہ ایک برس دو مہینے میں اب وہ رخسانہ کا عادی ہو چکا ہو گا۔ وہ سر سے پاؤں تک اسے بہلا رہی تھی۔ اس کے لیے اپنے دن رات لٹا رہی تھی۔ ایک مرد یقیناً ایسے میں لٹ جاتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اب اس سے سامنا ہو گا تو وہ شدت نہیں ہو گی۔ ایک ٹھہراؤ آ گیا ہو گا۔ وہ سہولت سے شکایت کرے گا پھر شکایت آئی گئی ہو جائے گی۔

لیکن آج سربازار اس دیوانے نے میرے دل کو دہلا دیا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ میرا فرضی نام لے رہا تھا۔ اس کی چیخ کے پیچھے یہ چیلنج تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے میرے پاس پہنچنے

سے نہیں روک سکتی۔ یہ انسانوں کا سمندر بھی اسے نہیں روک سکے گا۔ ایک دن وہ میرے سامنے چلا آئے گا پھر اپنے ایک برس دو مہینے کا یعنی ایک ایک پل کا حساب لے گا اور پوچھے گا۔ بتاؤ فرزانہ! تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟ میں ایک برس دو ماہ میں ایک ایک دن' ایک ایک رات' جب اس کا ہاتھ پکڑتا تھا تو ہاتھ تمہارا ہوتا تھا۔ جب میں اسے گلے لگاتا تھا تو میری سانسوں میں تم ہوتی تھی۔ جب میں اسے ایک مرد کا پیار' ایک مرد کا اعتماد' ایک مرد کی کمائی اور اپنا سب کچھ دیتا تھا تو وہ سب کچھ تمہارے لیے ہوتا تھا۔

ڈائری کا یہ صفحہ لکھتے ہوئے اس کی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے' فرزانہ! میری ایک بات کا جواب دو' جب قاضی صاحب کلام پاک کی تلاوت کررہے تھے اور خدا کو حاضر وناضر جان کر میرا نکاح رخسانہ سے پڑھا رہے تھے تو وہ رخسانہ کون تھی؟ اگر وہ نام غلط تھا تو میرا نکاح اس نام سے نہیں ہوا' میرا نکاح تمہاری محبت سے ہوا' تمہارے تمنا سے ہوا پھر جب میں رخصتی کے وقت دلہن کے روپ میں رخسانہ کو سہارا دے کرلے جانے لگا تو ہمیں کلام پاک کے سائے سے گزارا گیا۔ میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں کلام پاک کے سائے میں تمہارے ساتھ گزرا تھا۔

کون کہتا ہے کہ ہماری شادی نہیں ہوئی؟ میری بیوی تم ہو۔

ان لوگوں کی باتیں نہ کرو جو کلام پاک کے سائے سے بھی دھوکا دے کر گزار دیتے ہیں۔ تم میری بات کرو۔ محبت ایک آسمان ہے اور میں آسمانی کتاب کے سائے میں آج بھی تمہارے ساتھ گزر رہا ہوں۔

میری بن بیاہی شریک حیات! ہمارے ایک برس دو مہینے کے ایک ایک لمحے کا حساب کرکے تو دیکھو تم میرے بچے کی ماں بن چکی ہو.....

اس کی امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے میز پر سے سر اٹھایا' پھر پلٹ کر دیکھا' وہ دروازے پر کھڑی ہوئی کہہ رہی تھیں "تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"جی..... جی ہاں' میں ذرا لکھ رہی تھی' اب میں سونے جارہی ہوں۔"

وہ جلدی سے ڈائری کو اٹھاکر دراز کے اندر رکھنے لگی۔ اس کی امی نے کمرے میں داخل ہوکر دراز کی طرف دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے کہا "دل کے بھید دل میں چھپ کر نہیں رہتے۔ چہرے پر ظاہر ہوجاتے ہیں۔"

فرزانہ وہاں سے اٹھ گئی اس نے اپنی امی کو دیکھا' پھر نظریں جھکاکر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ اس کی امی نے کہا "تم اس طرح نہیں سوؤ گی۔ میں تمہیں سلاؤں گی چلو لیٹ جاؤ۔"

وہ چپ چاپ لیٹ گئی اور اس کی امی نے زیرو پاور کے بلب کو آن کیا پھر دوسری لائٹ بجھادی۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے سر کو سہلانے لگیں۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ ماں بیٹی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ آنکھیں کھولے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی' کیا وہ بھی اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوگا' جیسے بھی ہو' وہ اکیلا تو نہیں ہوگا۔ اس نے آہستگی سے پوچھا "امی جب آپ نے آخری بار رخسانہ کو دیکھا تھا تو وہ ماں بننے والی تھی؟"

"ہاں بیٹی' میرے حساب سے تو وہ اب تک ماں بن چکی ہوگی مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ تمہارا ذہن سوتے جاگتے ادھر ہی لگا رہتا ہے۔ میں کہتی ہوں' سوچنا چھوڑ دو۔ اپنے دماغ کو پرسکون رکھو۔ کسی دوسری طرف دھیان بٹاؤ۔"

وہ دھیان بٹانے کی کوشش کرتی تھی لیکن وہ اس کی کوششوں میں بھی موجود رہتا تھا۔ اس نے آہستگی سے پوچھا "امی کیسے دھیان بٹاؤں' میں تو سوچتے سوچتے تھک گئی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے سامنا ہوجائے' تب دل میں جو اندیشہ ہے' وہ ختم ہوسکتا ہے۔"

"بیٹی! میں نادان نہیں ہوں۔ تمہاری گھبراہٹ اس لیے نہیں ہے کہ وہ تمہیں نقصان پہنچائے گا' اس لیے ہے کہ اس سے ایک بار سامنا ہونے کے بعد تم اس سے دور نہ جاسکو گی۔ کمزور پڑجاؤ گی' اس کے دکھوں کو سمیٹنے لگو گی اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی بیٹی۔"

"میں کیا کروں امی؟"

"سوجاؤ بیٹی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ سانس بتارہی تھی کہ نیند نہیں آئے گی۔ اس کی امی نے کہا "بیٹی' اللہ کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ دو چار آیتیں یاد کرلو اور رات کو انہیں پڑھ کر سویا کرو۔ ابھی ایسا کرو کہ آنکھیں بند کرلو۔ دل اور دماغ سے بوجھ اتارنے

کی کوشش کرو' اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دو پھر دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کو پکارو' اس سے دعا مانگو کہ وہ تمہیں سکون دے۔"

فرزانہ نے اپنے چاروں طرف کالی رات کو دیکھا پھر آنکھیں بند کرلیں اور دل کی گہرائیوں سے اپنے خداوند کریم کو پکارنے لگی۔

"میرے معبود مجھے سلا دے میں سونا چاہتی ہوں۔ میں ایسی نیند نہیں چاہتی' بس میں آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری محبت کو ایسی نیند آئے کہ پھر اس کی آنکھ کبھی نہ کھلے۔

خدایا! تو نے زلیخا کے بڑھاپے میں اس کی دعا قبول کی تھی' اسے دوبارہ جوانی دی تھی۔ آج میری دعا قبول کرلے۔ مجھے بڑھاپا دے دے۔ نہ جوانی ہوگی' نہ یہ رت جگے کی کہانی ہوگی۔ روز سکون سے سوجایا کروں گی۔

میرے مالک میں بہت کوشش کرتی ہوں' اسے دل سے نکال دیتی ہوں' دماغ سے نوچ کر پھینک دیتی ہوں۔ یادوں کی دستک پر دروازہ نہیں کھولتی۔ اس کی کوئی بات یاد آئے تو نہیں بولتی' اس کے لیے خیالوں کے پر نہیں کھولتی۔ اپنے دل اور دماغ پر شعور کے جاگتے پہرے بٹھا دیتی ہوں مگر کیا کروں' یہ تو بھی دیکھ رہا ہے کہ جب اسے کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ چپکے سے میری دعاؤں میں بھی چلا آتا ہے' اب میں سکون کی دعا کیا مانگوں؟

○☆○

بادشاہ جانی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے' دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ سامنے بستر پر لیٹی ہوئی رخسانہ کو دیکھ رہا تھا۔ رخسانہ اپنے بچے کے ساتھ پلنگ پر نیم دراز تھی اور اسے اپنی داستان سنا رہی تھی۔ وہ داستان جس کی ابتدا فرزانہ اور بادشاہ جانی نے کی تھی لیکن انتہا سے پہلے یہ داستان بیچ میں اٹک رہی تھی۔ بادشاہ جانی کو فرزانہ نہیں مل رہی تھی۔ فرزانہ کو سکون نہیں مل رہا تھا اور رخسانہ کے ہاتھ سے اپنے شوہر کی محبت پھسلی جارہی تھی۔

رخسانہ کی امی اور ابو برآمدے میں سو رہے تھے۔ صبح ہونے والی تھی۔ ساری رات داستان سننے سنانے میں گزر گئی تھی۔ بادشاہ جانی نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے ذرا دور تھے۔ رخسانہ نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ

پاس آکر بیٹھے مگر وہ اجنبی کی طرح دور ایک دیوار سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔ جب باتیں ختم ہوگئیں تو اس نے کہا "تم کتنا سچ بول رہی ہو' یہ میں نہیں جانتا۔ جب فرزانہ ملے گی تو اس سے باتیں سننے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ اصل بات کیا ہے۔"

"جانی' میں نے تمہاری زندگی میں آنے کے بعد کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ ہمیشہ تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' وہ درست ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا "ایک بار دھوکا کھا چکا ہوں' جب تک تمہاری باتوں کی سچائی معلوم نہیں ہوگی' اس وقت تک میں تمہاری بات کا یقین نہیں کروں گا اور یہ دیکھو کہ تم نے ساری داستان سنا دی مگر یہ نہیں بتایا کہ فرزانہ اب کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی' اگر جانتی تو ابھی تمہیں اس کے پاس پہنچا دیتی اور وہ میری باتوں کی تصدیق کر دیتی۔"

"تم اپنی سچائی دکھانا چاہتی ہو۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ شادی کی پہلی رات سب کچھ سچ سچ بتا دیتیں۔ آہ' وہ تمہاری پڑوسن تھی اور میں اس بات سے بے خبر رہا۔"

دونوں کے درمیان خاموشی رہی پھر بادشاہ جانی نے پوچھا "فرزانہ نے کتنے عرصے کے بعد ناظم آباد کا مکان چھوڑ دیا تھا؟"

"ہماری شادی کے تقریباً چھ ماہ بعد۔"

"کیا تم ماں بیٹی نے یا محلے والوں نے ان ماں بیٹی سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مکان بیچنے کے بعد کہاں جارہے ہیں؟"

"ہم نے نہیں پوچھا۔ ہمیں ان کے جانے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ ان کے جانے کے بعد معلوم ہوا۔ محلے والوں کو بتا گئی تھیں کہ فی الحال پاپوش میں کرائے کے مکان میں رہیں گی پھر اپنا مکان خریدیں گی۔ کبھی کبھار آتی رہیں گی۔"

"وہ تمہاری پکی سہیلی تھی پھر تم سے دور کیوں چلی گئی؟ تمہیں اپنا پتا کیوں نہیں بتایا اس نے؟"

"وہ مجھ سے دور نہیں جاسکتی تھی' تمہاری وجہ سے دور ہوگئی۔ ڈرتی ہے کہ مجھ سے

ملے گی تو تم سے بھی سامنا ہوگا۔"

وہ جھنجلا کر بولا "مجھے فریب دینے سے پہلے اسے ڈر نہیں لگا۔"

"فریب دینے کے بعد ڈر لگتا ہے۔"

"کیا میں اسے کھا جاؤں گا؟"

"تم اسے نہیں کھاؤ گے مگر یہ بھی تو معلوم ہو کہ مل کر کیا کرو گے؟"

"میں معلوم کروں گا کہ اس نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟"

"یہ ساری باتیں میں تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"میں اس کی زبان سے بھی سننا چاہتا ہوں۔"

"تم اس کی زبان سے کچھ سننے کے لیے نہیں' اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو یہ دیکھنا چاہتے ہو کہ دو دنوں تک محبت جتانے والی کی محبت صرف دو دنوں تک ہی تھی یا اب بھی ہے۔"

بادشاہ جانی اس پر سے نظریں ہٹا کر' اپنے بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ رخسانہ نے کہا "مجھ سے نظریں چراؤ گے تو بات نہیں چھپے گی۔ تم تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے ہو جانی۔ سچ سچ بتاؤ کہ مجھے چھوڑ کر اس سے شادی کرو گے؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آیا پھر بستر کے ایک سرے پر بیٹھ کر بچے کو دیکھتے ہوئے بولا "میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ بات میں پہلے بھی بول چکا ہوں پھر تم شک کیوں کرتی ہو' بس میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں ملنا چاہتے ہو؟ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تمہارے لیے کسی بات میں کمی نہیں کرتی پھر تم کسی دوسری سے کیوں ملو گے' کیوں میرا دل جلاؤ گے؟"

"اس میں جلنے کی کیا بات ہے اس نے مجھے محبت کا فریب دیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ واقعی فریب تھا یا محبت بھی تھی۔ اگر وہ مجھ سے محبت کر رہی ہوگی تو میں اسے کچھ نہیں کہوں گا اور اگر اس نے مجھ سے محبت نہیں کی تھی' الو بنایا تھا اور مجھے پھانس کر تم تک پہنچایا تھا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا کیونکہ میں الو نہیں ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ اب تم تنہا نہیں رہے۔ تم پر میری اور بچے کی ذمے داری ہے۔ خدانا خواستہ تم قتل کرنے کے الزام میں پھانسی پر چڑھ گئے تو میرا اور بچے کا کیا

ہوگا۔ تم ہمارے بارے میں سوچا کرو۔"

وہ جھنجلا کر کھڑا ہوگیا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ بڑبڑانے لگا "تم کہتی ہو تمہارے لیے سوچوں' بچے کے لیے سوچوں' ادھر فرزانہ کے لیے نہ سوچوں تو دماغ خود اس کے لیے سوچنے لگتا ہے۔ کبھی تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو تمہارا جھوٹ اور فریب مجھے بے چین کر دیتا ہے۔ میں محبت کرتے کرتے تم سے نفرت کرنے لگتا ہوں۔"

رخسانہ نے بستر سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "اگر نفرت ہے تو میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالو۔ ایک دم نہیں مار سکتے تو ہرجائی شوہروں کی طرح آہستہ آہستہ مارو۔ فرزانہ کا نام لو اور میری نیند اڑا دو۔ میری بھوک مار دو۔ فرزانہ کا نام لو اور مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دو۔ میرے دل میں امید کی کلی نہ کھلنے دو۔ میری سب آرزوؤں کو ہلاک کر دو۔ مجھے تو نکاح کے دو بول نے تمہارا کر دیا۔ وفا کے نام پر تمہاری پابند ہوگئی۔ کسی دوسرے کا نام بھی لوں تو حیا کی مار پڑتی ہے۔ بے شک میں تمہیں دھوکا دے کر اپنی مرضی سے تمہاری زندگی میں آئی مگر یہ یاد رکھو کہ آ کر کیسے اسیر ہوئی۔ پر ہوتے ہوئے بھی کبھی یہاں سے اڑ کر نہ جا سکوں گی۔"

"میں مانتا ہوں لیکن تمہیں بھی ماننا ہوگا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں اس دھوکے کو کیسے بھلا دوں۔"

"جانی تم کیسے ہو۔ میرے فریب کا احساس کرتے ہو' میری وفا کا شمار نہیں کرتے۔ وہ کون سی جگہ ہے جہاں اچھے اور برے کو' پسند اور ناپسند کو ایک ساتھ نہیں تولا جاتا۔ کیا قصائی تمہارے لیے گوشت کے ساتھ ہڈیاں نہیں تولتا؟ کیا تمہیں تقدیر پھول کے ساتھ پتھر نہیں مارتی۔ ہماری دنیا میں جب ایسا ہوتا ہے تو پھر میری بھی ایک ایسی ہی خطا معاف کرو' میں نے تم سے کچھ نہیں مانگا' صرف معافی مانگتی ہوں۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آیا پھر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد لیٹ گیا۔ وہ اس پر جھک گئی۔ اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ جانی نے کہا "رونا شروع نہ کر دینا۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔"

"بتاؤ کیسے معاف کیا ہے؟"

"ایسے کہ اب میں تمہیں جھوٹی اور فریبی نہیں کہوں گا۔ جو کچھ تم نے کیا' وہ ایک

غلطی تھی اور میں جانتا ہوں کہ تم اور کوئی غلطی نہیں کرو گی۔"

"نہیں جانی! مجھے یہ معافی نہیں چاہیے۔ تم مجھے ساری عمر میری غلطی اور میرے فریب کا طعنہ دیتے رہو۔ میں اسے برداشت کرلوں گی۔ تم اب تک نہیں سمجھے کہ عورت کسی دوسری عورت کا ذکر برداشت نہیں کرتی۔ تم فرزانہ کو بھول جاؤ۔ اس کا نام تک زبان پر نہ لاؤ۔"

اس نے رخسانہ کو تھپکتے ہوئے' چھت کی طرف گھورتے ہوئے' کچھ سوچتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا دل نہیں جلاؤں گا۔ فرزانہ کی بات بھی نہیں کروں گا۔ اس کا نام بھی نہیں لوں گا۔ اب ٹھیک ہے نا؟"

وہ خوش ہوگئی۔ اس کے سر کو سہلاتے ہوئے بولی "دیکھو' دن نکل آیا ہے۔ میں سر سہلاتی ہوں' تم سو جاؤ۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا "نہیں' تمہیں آرام سے گہری نیند سو جانا چاہیے اور تمہاری امی کو کمرے میں رہنا چاہیے تاکہ وہ بچے کا خیال رکھیں۔ میں باہر جاتا ہوں۔ ٹیکسی میں پچھلی سیٹ پر سو کر اپنی نیند پوری کرلوں گا۔"

وہ بڑی محبت سے رخصت ہوگیا۔ دروازہ کھول کر باہر آیا تو اس کی ساس ایک طرف بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اور فرید احمد گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھا۔ اس نے ساس کو گھور کر دیکھا۔ وہ ہاتھ ہلا کر بولی "اے مجھے ایسے نہ دیکھا کر' نہیں تو آنکھیں پھوڑ دوں گی۔"

وہ بیک وقت نرم ہو کر مسکراتے ہوئے بولا "میں غلطی پر تھا' ابھی آپ کی بیٹی نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ وہی میری رخسانہ ہے۔ میں خواہ مخواہ کسی دوسری لڑکی کے متعلق سوچ رہا تھا اور شک کر رہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ توبہ توبہ میں کیسی غلطی پر تھا۔"

وہ فوراً خوش ہو کر بولی "کوئی بات نہیں بیٹے' بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے اور ہم بڑے تو معاف کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ جاؤ آرام سے سو جاؤ۔"

"مجھے نیند کہاں آئے گی۔ میں تو ابھی بہت کچھ سوچ رہا ہوں آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہائے بیٹے' میرے لیے کیا کرو گے۔ اپنی بیوی اور بچے کے لیے سوچو۔"

"نہیں پہلے میں آپ کے لیے سوچ رہا ہوں کہ ایک پلاٹ اور خرید لوں۔ وہاں میں ایک بڑا سا باغیچہ بناؤں گا۔ اس میں بہت سے رنگ برنگے پھول کھلیں گے۔ وہاں ایک فوارہ بھی ہوگا۔"

وہ حیرانی سے بولی "کیا تم میرے لیے باغیچہ بناؤ گے۔"

"ہاں' اس باغیچے میں پھولوں کی بارہ دری میں ایک چاندنی کا جھولا ہوگا اور اس جھولے کے نیچے ایک قبر ہوگی۔"

وہ چونک کر بولی "قبر! کس کی قبر؟"

وہ دانت کچکچا کر گھونسا دکھاتے ہوئے بولا "تمہاری قبر اور اس قبر کے اوپر میں جھولا جھولتا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ کر جانے لگا۔ اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ اس کی ساس یقیناً بڑبڑا رہی ہوگی۔ اسے بہت کچھ سنا رہی ہوگی لیکن اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر دور کھڑی ہوئی ٹیکسی کے پاس آیا پھر دروازہ کھول کر اندر پہنچا' دروازے کو بند کیا اور پچھلی سیٹ پر آرام سے لیٹ گیا۔

اس کی ساس بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں آئی۔ رخسانہ نے پوچھا "کیا ہوا امی؟"

"ہوگا کیا! یہ لڑکا تو میری بالکل عزت نہیں کرتا ہے۔ کوئی ایک بات ہو تو تمہیں بتاؤں۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"وہ پاگل کا بچہ کہہ رہا تھا کہ میرے لیے پلاٹ خریدے گا۔"

"امی آپ خواہ مخواہ انہیں گالیاں دے رہی ہیں۔ کیا آپ کے لیے پلاٹ خریدنا کوئی جرم ہے؟"

"آگے تو سنو' کہتا ہے کہ میرے لیے بہت ہی خوب صورت باغیچہ بنائے گا۔"

"امی' وہ ایسا کریں یا نہ کریں مگر آپ کے لیے محبت سے ایسا سوچتے تو ہیں۔"

"واہ بیٹی' بڑی محبت ہے۔ آگے تو سنو۔"

"آپ سنائیں تو۔"

"وہ اس باغیچے میں ایک قبر بنائے گا اور اس قبر کے اوپر جھولا جھولے گا۔ یعنی قبر

میری ہوگی اور جھولا اس کا ہوگا۔ میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے داماد پر۔"

رخسانہ کے چہرے سے دکھ اور پریشانی کے تاثرات ابھرے پھر وہ آہستگی سے بولی "امی، مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے آپ کی شان میں گستاخی کی لیکن آپ میرے سامنے ان پر لعنت نہ بھیجیں اور نہ ہی اپنی زبان سے گالی نکالیں۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں "واہ بیٹی خوب اپنے میاں کی حمایت کر رہی ہو۔ میرے ساتھ جو بدتمیزی ہو رہی ہے اس کا تمہیں احساس تک نہیں ہے۔"

"میں اتنے عرصے میں جانی کو خوب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ امی وہ بیل کی طرح بالکل سیدھے ہیں۔ جب کوئی انہیں چھیڑتا ہے تو وہ سینگ مارتے ہیں ورنہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ ہم نے انہیں اتنی بری طرح چھیڑا ہے کہ ان کا سینگ مارنا فطری امر ہے۔ جب وہ کمرے سے نکل کر جا رہے تھے تو ہمارے درمیان پوری طرح سمجھوتا ہو چکا تھا اور وہ مطمئن تھے۔ کمرے سے باہر جاتے ہی یقیناً انہیں آپ کی کسی بات سے دکھ پہنچا ہوگا جب ہی تو انہوں نے آپ سے ایسی بات کہہ دی۔"

"لو بیٹی، تم تو مجھے ہی الزام دے رہی ہو۔ بھلا میں اسے کیا کہوں گی۔ اس نے کمرے سے نکلتے ہی مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے اتنا ہی کہا کہ مجھے اس طرح مت گھورو، نہیں تو آنکھیں پھوڑ دوں گی۔"

"بس یہی بات ہوئی نا، کیا اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی کہ جو کھیل ان کے ساتھ کھیلا گیا ہے، اس کے نتیجے میں وہ ذرا سا گھور کر دیکھتے ہیں تو اسے برداشت کرنا چاہیے۔ میں آہستہ آہستہ انہیں راہ پر لا رہی ہوں لیکن آپ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

بچہ رونے لگا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بچے کے پاس آئیں "اچھا میں ہی بری ہوں۔ اولاد کے لیے جان دو پھر بھی کوئی صلہ نہیں ملتا۔"

وہ بچے کو اٹھا کر اسے چپ کرانے لگیں۔ رخسانہ بھی چپ تھی، وہ جانتی تھی کہ اس کی امی باتوں سے قائل ہو جاتی ہیں لیکن اپنی ہار نہیں مانتیں۔ وہ بحث کو آگے بڑھانا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی امی نے پوچھا "جانی سے کیا باتیں ہوئیں؟"

"میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

وہ حیرانی سے بولیں "کیا سب کچھ بتا دیا ہے؟"

"جی ہاں، اب چھپانے سے بات اور بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ فرزانہ کو دیکھ چکے ہیں۔ فرزانہ بھی ایک رکشے میں بیٹھی انہیں دیکھتی رہی تھی یعنی اپنی حرکتوں سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ انہیں پہچان رہی ہے اور وہی رخسانہ ہے جو شادی سے پہلے مل چکی تھی۔"

اس کی امی نے کہا "بیٹی، میں اس لڑکی کو خوب جانتی ہوں۔ اس کی نیت میں پہلے ہی کھوٹ تھا۔ اگر تمہارا چہرہ بگڑنے میں اس کا ہاتھ نہ ہوتا تو وہ کبھی جانی کو تمہارے ہاتھ نہ لگنے دیتی۔ میں یقین سے کہتی ہوں، وہ جان بوجھ کر جانی کے سامنے آئی ہوگی۔"

رخسانہ نے انکار میں سر ہلا کر کہا "نہیں، اتفاقاً ایسا ہو گیا۔ ویسے فرزانہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جانی سے سامنا ہوگا تو اجنبی بن جائے گی۔ وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی۔ شاید آپ درست کہتی ہوں۔ وہ بہت چالاک ہے، بظاہر اس کے سامنے آ کر اس سے باتیں نہیں کیں، اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ یوں اس نے اجنبیت کو قائم رکھا لیکن پلٹ کر مسلسل دیکھتے رہنے کے انداز سے بادشاہ جانی کو اشارہ دے گئی کہ وہ اجنبی نہیں ہے، اسے پہچانتی ہے۔"

"اگر وہ ایسی ہی چالیں چلتی رہی تو تمہارا گھر تباہ ہو جائے گا۔"

"میں اس سے جا کر ملوں گی اسے پھر سمجھاؤں گی کہ وہ ایسی حرکتیں نہ کرے۔"

"تمہارے سمجھانے سے وہ نہیں سمجھے گی۔ وہ تم سے جلتی ہے۔"

"اس کے جلنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی جانی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اب کبھی فرزانہ کا ذکر نہیں کرے گا اور نہ ہی اس کا نام زبان پر لائے گا۔ آپ دیکھتی رہیے، میں رفتہ رفتہ جانی کے دماغ سے اس کا نام مٹا دوں گی۔"

"جب تمہیں اعتماد ہے تو پھر اس چڑیل سے جا کر کیوں ملنا چاہتی ہو؟"

"ایک کوشش ادھر سے بھی ہونی چاہیے۔ کیا حرج ہے اگر دشمن کو بھی سمجھایا جائے۔"

"اس سے کب ملو گی؟ چھٹی کا غسل کیے بغیر تم باہر نہیں نکل سکتیں۔"

"چھ دن بہت ہوتے ہیں، ان چھ دنوں میں اس نے کوئی دوسری چال چل دی تو؟"

"امی میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ میں جانی کی طرف سے اپنا محاذ مضبوط کر رہی ہوں۔ جانی میرے قابو میں رہیں گے۔ میری بات مانتے رہیں گے، وہ بہت اچھے ہیں امی۔ آپ انہیں

نہیں سمجھ سکتیں۔ یہ باتیں مجھ پر چھوڑ دیں۔ اب مجھے نیند آرہی ہے۔ آپ ذرا بچے کا خیال رکھیں۔"

وہ بستر پر آرام سے لیٹ گئی۔

ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بادشاہ جانی بھی آرام سے لیٹا ہوا تھا مگر بے آرام تھا۔ اندر وہی ہل چل مچی ہوئی تھی کہ فرزانہ کہاں ہے؟ وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟ کراچی شہر شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا ہے اور دن بہ دن پھیلتا ہی جارہا ہے۔ وہ اسے ایک طرف سے ڈھونڈنا شروع کرے گا' دوسری طرف سے یہ شہر اور آگے پھیلتا چلا جائے گا۔ تلاش جاری رہے گی' کبھی ختم نہ ہوگی۔

وہ سوچ رہا تھا' دنیا کہتی ہے کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے مگر عقل والوں کو ملتا ہے اور میرے پاس عقل نہیں ہے۔ میں کیسے ڈھونڈوں؟ پھر وہ اچانک ہی اٹھ بیٹھا۔ ہاں' مستری چاچا۔ میرے مستری چاچا عقل مند ہیں۔ وہ مجھے راستہ دکھا سکتے ہیں کہ کس طرح فرزانہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ مجھے ابھی ان سے ملنا چاہیے۔

وہ فوراً ہی پچھلی سیٹ سے اٹھ کر اگلی سیٹ پر آبیٹھا پھر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ انجن ٹھنڈا ہوگیا تھا اس لیے اسٹارٹ ہونے میں دیر ہو رہی تھی۔ انجن کی گھرر گھرر کی آواز کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ رخسانہ اس وقت تک گہری نیند میں ڈوب گئی تھی۔ اس کی ای کھڑکی کے پاس آکر دیکھا۔ اس وقت بادشاہ جانی نے بھی سر گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا پھر گاڑی سے اتر کر بولا "اے' تم میری گاڑی کو کیوں دیکھ رہی ہو اسی لیے تو... بے چاری سہمی ہوئی ہے۔ اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔ دیکھو' میں بولتا ہوں ایک وقت میں کسی ایک کو آنکھیں دکھاؤ۔ اپنے داماد کو ڈراؤ یا گاڑی کو۔"

بڑی بی کو بڑا غصہ آیا پھر بیٹی کی بات یاد آئی کہ جانی کو محبت سے سمجھایا جائے تو وہ سمجھ لیتا ہے' وہ اچانک ہی مسکرا کر جانی کو دیکھنے لگیں۔ جانی نے حیرانی سے ان کی مسکراہٹ کو دیکھا پھر پوچھا "اے کیا تو نے اپنے دانت مانجھ لیے ہیں؟"

"ابھی نہیں۔"

"کیا کلی کرلی ہے؟"

"ابھی کروں گی لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"دانت بھی نہیں مانجھے' کلی بھی نہیں کی' تمہیں باسی منہ مسکراتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ جب ساس مسکراتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ داماد کو چبانے سے پہلے اپنے دانت تیز کررہی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ فوراً ہی اسٹارٹ ہوگئی۔ وہ اپنے پلاٹ کے احاطے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا۔ ادھر رخسانہ کی ای کھڑکی کے پاس کھڑی تلملا رہی تھیں۔ مٹھیاں بھینچ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح جانی کی بوٹیاں نوچ لیں یا اپنا ہی سر دیوار سے ٹکرانا شروع کردیں۔ انہوں نے کھڑکی کے پٹ بند کردیے پھر پلٹ کر غصے سے رخسانہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

وہ بیٹی کو کچھ باتیں سنانا چاہتی تھیں لیکن وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ آدھا حسین چہرہ جسے سب قبول کرنے کے لیے تیار تھے اور آدھا چہرہ جو داغ داغ تھا جسے صرف جانی قبول کررہا تھا۔ وہ کتنی خوش تھی' مطمئن تھی۔ اس کی ازدواجی زندگی میں مسائل پیدا ہوگئے تھے مگر وہ بڑے حوصلے سے' ہمت سے جانی کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے تھی۔ بیٹی کے عزم اور اس کی ذہانت سے پتا چلتا تھا کہ جانی ہاتھ سے بے ہاتھ نہیں ہوگا۔

جانی گیراج کے سامنے پہنچ گیا۔ لڑکے گیراج کھولنے کے بعد اب کام سے لگنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ مستری چاچا ابھی نہیں آئے تھے' جانی کو وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑا۔ انتظار کرتے کرتے وہ ایک بینچ پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اسے نیند آگئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ پریشان بھی تھا۔ جسمانی تھکن بھی تھی اور ذہنی الجھن بھی۔ ان سب نے مل کر اسے گہری نیند سلا دیا تھا۔

پھر مستری چاچا نے اسے جھنجوڑ کر اٹھایا "اٹھو جانی' دو بج رہے ہیں کیا بھوکے سوتے رہوگے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے مستری چاچا کو دیکھ کر بولا "چاچا' میں بہت دیر سے انتظار کررہا تھا۔ تم سے بہت ضروری کام ہے۔"

"میں بھی بہت دیر سے آیا ہوا ہوں۔ تمہیں اس لیے نہیں اٹھایا کہ رات بھر شاید جاگتے رہے ہو اس لیے سونے دیا اور تمہارے ضروری کام کو میں جانتا ہوں۔ تمہاری

کھوپڑی میں وہی کیڑا کلبلا رہا ہو گا کہ دوسری لڑکی کون ہے اور کہاں ہے؟"

وہ مستری چاچا کا ہاتھ تھام کر بولا "چاچا! تمہارا جواب نہیں ہے۔ تم بہت عقل مند ہو۔ ایک دم سے دل کی بات سمجھ لیتے ہو۔ بتاؤ نا وہ کہاں ملے گی؟"

"ارے‘ میں کیا اس کا رشتے دار ہوں کہ اس کا پتا بتا دوں۔ جا حمام سے غسل کر کے آ۔ میں نے گھر سے کھانا منگوایا ہے میرے ساتھ کھانا کھا لینا۔"

"چاچا! غسل کس لیے کروں؟ تم ایک بار یقین دلا دو کہ مجھے فرزانہ تک پہنچا دو گے تو میں اپنی ٹیکسی کو بھی غسل کرا دوں گا۔"

مستری چاچا نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے "دیکھو جانی‘ تمہاری بیوی میری بہو‘ بہت اچھی ہے۔ میں اسے بیٹی مانتا ہوں۔ تم اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری لڑکی کا ذکر کرتے ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے میری اپنی بیٹی پر ظلم کر رہے ہو۔"

اس نے چاچا کی داڑھی کو عاجزی سے چھوتے ہوئے کہا "دیکھو اسے بیٹی نہ بناؤ‘ اگر بنا رہے ہو تو جواب دو کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا؟ اور دھوکا کیا ہے تو اس کی سزا انہیں کیا ملنی چاہیے؟ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ جھوٹ بھی بولیں اور دھوکا بھی دیں اور تم اسے بیٹی بنا کر‘ ان کے رشتے دار بن کر‘ ان کے سارے گناہوں پر پردہ ڈال دو۔ کوئی انصاف تو کرو۔"

"میں کیا انصاف کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ قسمت سے تمہیں بہت اچھا گھر مل گیا ہے‘ لڑکی اچھی مل گئی ہے۔ وہ کتنی سگھڑ ہے‘ کتنی ذہین ہے کیا تم اس کی قدر نہیں کر سکتے؟ تم اس کے دھوکے اور جھوٹ کو بھلا نہیں سکتے؟"

"چاچا‘ یہ بات تو وہ بھی کہتی ہے کہ میں اس کے فریب کو بھلا دوں۔ چلو بھلا دیا۔ میں نے اس سے وعدہ بھی کیا ہے کہ اب میں اسے طعنے نہیں دوں گا اور اس کے سامنے فرازنہ کا نام بھی نہیں لوں گا۔"

"جب تم نے وعدہ کیا ہے تو پھر وعدہ خلافی کیوں کر رہے ہو؟ ایک بات مجھے بتا دے۔ کیا تجھے رخسانہ پسند نہیں ہے؟ کیا تجھے اپنے بیٹے سے محبت نہیں ہے؟"

"بیٹے سے محبت ہے‘ رخسانہ کو بھی چاہتا ہوں۔ اس کی عزت کرتا ہوں۔ اسے کبھی چھوڑ نہیں سکتا مگر فرزانہ کی بات اور ہے۔"

"اس کی بات اور کیوں ہے؟"

"بس کیا بتاؤں؟ مجھے ٹھیک سے بولنا نہیں آتا۔ سمجھ لو کہ یہ رخسانہ‘ یہ بچہ یہ ساری کی ساری دنیا اور ہے اور وہ فرزانہ اور ہے۔ نہیں سمجھے؟ دیکھو میں سمجھاتا ہوں۔ یہ جو ایک برس دو مہینے کی راتیں میں نے گزاری ہیں تو ایسے گزاری ہیں کہ میں رخسانہ سے باتیں کرتا تھا اور آواز فرزانہ کی سنتا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ رخسانہ میری بیوی ہے اور وہ ساری عمر میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھے گی لیکن میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ پچھلی سیٹ سے آنے والی آواز کو سنتا ہوں کہ وہ فرزانہ ہے اور پہچانتا ہوں کہ وہ فرزانہ ہے۔ میں کیا کروں‘ اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ میرے پیچھے جو کچھ بھی ہوتا ہے‘ اسے میرا دماغ محسوس کرتا ہے اور میں ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے رہنے کے باوجود اپنی پچھلی سیٹ والی کو نہیں بھلا سکتا۔ اس کی بات اور ہے۔"

مستری چاچا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے سمجھایا "یہ دیوانگی ہے‘ اس سے بسا بسایا گھر برباد ہو جائے گا۔ دیکھ اللہ تعالیٰ نے تجھے کتنا خوب صورت سا بیٹا دیا ہے‘ کیسی محبت کرنے والی بیوی دی ہے۔ تو اللہ کے دین کو ٹھکرا رہا ہے۔ ناشکری کر رہا ہے اور اب دوسری لڑکی کے لیے بھٹکنا چاہتا ہے۔"

"چاچا! اسے دوسری لڑکی نہ کہو‘ وہی میری زندگی کی پہلی محبت ہے‘ دوسری تو رخسانہ ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے‘ اب رخسانہ ہی سب کچھ ہے۔ اگر تو فرزانہ کے پیچھے بھاگے گا تو بڑی تباہی آئے گی۔ بادشاہ جانی کچھ میرے تجربے سے سیکھنے کی کوشش کر‘ تیری سمجھ میں نہیں آتا جو میں کہتا ہوں‘ اس پر آنکھ بند کر کے عمل کر اور میں یہ کہتا ہوں کہ فرزانہ کا ذکر چھوڑ دے۔ اس کا نام تک بھلا دے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر وہاں سے اٹھ گیا۔ مستری چاچا کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ انہوں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں‘ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس کا ذکر نہیں کروں گا اس کا نام بھی اپنی

زبان پر نہیں لاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا "ارے کہاں جارہا ہے۔ کیا میرے ساتھ کھانا نہیں کھائے گا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا' اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ مستری چاچا اسے ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ فکر مند بھی تھے پھر وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے وہاں سے چلا گیا تو انہوں نے بے بسی سے کہا "میں کیا کروں' سمجھ میں نہیں آتا یہ لڑکا واقعی مظلوم ہے۔ اتنا مظلوم کہ ظلم کرنے والے کا محاسبہ نہیں کرسکتا۔ کرے گا تو محاسبے کے نتیجے میں بیوی کی محبت' وفاداری اور ایک معصوم بچے کی محبت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ان خوبیوں کے پیچھے ظلم چھپ جاتا ہے اور جب کوئی برائی چھپ جاتی ہے تو اسے بے نقاب کرنے سے اس برائی میں پھلنے اور پھولنے کی ضد پیدا ہوجاتی ہے' افسوس میں جانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

○☆○

جانی جیسے اچانک ہی بدل گیا۔ وہ رخسانہ کے ساتھ اچھی طرح ہنستا بولتا تھا۔ بچے کو گود میں لے کر خوب پیار کرتا تھا۔ جب تک گھر میں رہتا' بچے اور رخسانہ کے ساتھ خوش رہتا۔ مستری چاچا سے سامنا ہوتا' تب بھی ایسا لگتا جیسے وہ فرزانہ کو بالکل بھول چکا ہے اور اب اس کا نام بھی اسے یاد نہ رہا ہو۔

لیکن دیوانہ اس کے صحرا میں بھٹکتا جاتا ہے۔ داستانوں میں ہے کہ چار دیواری میں قید رہنے والی لیلیٰ کو اپنے مجنوں کی خبر نہیں ملتی تھی اس کے باوجود وہ جانتی تھی اور پورے یقین سے پوچھنے والوں سے کہتی تھی کہ اس کا دیوانہ صحرا میں ملے گا۔ وہ دیوانہ بھی جانتا تھا کہ اس کی لیلیٰ لیڈی ڈاکٹر ہے' کسی اسپتال ہی میں ملے گی۔ وہ صبح سے شام تک ٹیکسی چلانے کے دوران جب بھی کسی اسپتال کے سامنے سے گزرتا تھا تو گاڑی روک کر پیچھے بیٹھی ہوئی سواری سے کہتا تھا "بس جی' ایک منٹ میرا ایک رشتے دار بیمار ہے' ابھی اسے دیکھ کر آتا ہوں۔"

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اکثر مسافر اعتراض کرتے تھے "واہ' یہ بھی کوئی مریضوں کو دیکھنے کا وقت ہے' جانتے ہو جب تک تم اسپتال کے اندر جاکر واپس آؤ گے اس وقت

تک تمہارا میٹر کتنی رقم بنادے گا؟"

وہ ان کے جواب میں میٹر کی طرف اشارہ کرکے کہتا تھا "دیکھ لو جی' کتنے پیسے بنے ہیں سات روپے پچاس پیسے' بس یاد رکھنا۔"

وہ میٹر کو بند کردیتا تھا اس کے بعد ٹیکسی سے نکل کر کہتا تھا "میں جب دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کروں گا تو میٹر آن کردوں گا۔ اب تو راضی خوشی ہونا؟"

اکثر مسافر جلدی میں رہتے تھے' وہ اعتراض کرتے تھے "نہیں بھئی پہلے ہمیں پہنچا کر آؤ پھر اپنے بیمار رشتے دار کو دیکھتے رہنا۔"

ایسے وقت بادشاہ جانی کہتا تھا "میٹر پڑھ لو۔ جتنے پیسے بنے وہ دے کر ٹیکسی سے اتر جاؤ۔ اگر میرے واپس آنے تک تم کو دوسری ٹیکسی نہیں ملے گی تو میں لے چلوں گا مگر ابھی تو آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

بہرحال وہ فرزانہ کو تلاش کرنے کی خاطر روز ہی صبح سے شام تک مسافروں سے الجھتا رہتا تھا۔ ان سے لڑائی جھگڑے کرتا رہتا تھا لیکن جس اسپتال کے سامنے سے گزرتا تھا' وہاں ایک بار ضرور جاتا تھا۔ کسی نرس یا وارڈ بوائے کو پکڑ کر پوچھتا تھا "کیا اس اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر فرزانہ ہیں۔"

اسے نہیں میں جواب ملتا تھا۔ چار دنوں میں وہ شہر کے چھوٹے بڑے دس اسپتالوں میں جاکر معلوم کرچکا تھا۔ پانچویں دن ایک اسپتال میں بتایا گیا کہ وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر فرزانہ ابھی نئی نئی آئی ہے۔

بادشاہ جانی نے خوش ہوکر کہا "جی ہاں' وہ بھی ابھی نئی نئی کالج سے پاس ہوکر آئی ہے۔ گورا رنگ ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ کاجل سے زیادہ کالی ہیں اور..... اور کیا بتاؤں جی بس....."

وہ شرمانے لگا۔ سامنے کھڑی ہوئی نرس نے اسے مسکرا کر دیکھا پھر سرہلا کر بولی "میں سمجھ گئی کہ یہ فرزانہ صاحبہ کیسی یادوں میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ بتایئے میں آپ کا نام کیا بتاؤں؟"

بادشاہ جانی نام بتانے جارہا تھا پھر ایک دم سے عقل آگئی۔ وہ بولا "دیکھئے جی' میں نام بتاؤں گا تو وہ نہیں آئیں گی۔ دراصل ہمارے درمیان کچھ میٹھی میٹھی سی لڑائی ہے۔ وہ

ناراض ہیں اس لیے نہیں آئیں گی۔ آپ جا کر یہ کہہ دیں کہ ان کی امی آئی ہیں۔ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ بس وہ دوڑی چلی آئیں گی۔"

نرس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ڈاکٹر صاحبہ کا کمرا ہے۔ آپ یہاں تشریف رکھیں۔ وہ وارڈ میں مریضوں کو دیکھ رہی ہیں۔ میں جا کر خبر کرتی ہوں۔"

نرس چلی گئی۔ وہ کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے خوشی بھی تھی اور وہ محتاط بھی تھا۔ سنبھل کر بیٹھا ہوا تھا کہ اس بار فرزانہ کو بھاگنے کا موقع نہیں دے گا۔ اگر وہ اسپتال کے اندر کہیں چھپنے جائے گی تو وہ بھی اس کے پیچھے جائے گا۔ اس کا کوئی بہانہ نہیں سنے گا۔ اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔

وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ کبھی کبھی دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھتا تھا پھر وہاں سے منہ پھیر کر سیدھا کرسی پر بیٹھ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی اونچی ایڑی کی سینڈل پہن کر چل رہی ہو۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دروازے کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے پیچھے سے دیکھ کر پہچانتی ہے یا نہیں۔

کھٹ کھٹ کی آواز کمرے میں آکر تھم گئی۔ اونچی ایڑی چپ ہو گئی۔ وہ بھی چپ چاپ سیدھا بیٹھا رہا۔ انتظار کرتا رہا۔ وہ خاموشی ایک دو لمحے کی تھی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں بیت رہے ہیں پھر اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔ "ایک برس پہلے میری امی کا انتقال ہو چکا ہے، تم نے سسٹر سے جھوٹ کہہ کر مجھے یہاں کیوں بلایا؟ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔ یہ میری ڈیوٹی کی جگہ ہے تمہیں یہاں تک میرا پیچھا کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

بادشاہ جانی چپ چاپ بیٹھا دیدے پھیلائے اپنے پیچھے سے آنے والی آواز کو سن رہا تھا اور بار بار اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال رہا تھا جیسے پیچھے سے آنے والی آواز میں کچھ گڑبڑ ہو۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ ہمیشہ پچھلی سیٹ کی آوازیں سنتا تھا۔ اسے اتنی مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ ان آوازوں کو سن کر ان کے خاکے تیار کر سکتا تھا۔ اس وقت جو

آواز آرہی تھی، وہ کچھ گڑبڑ تھی۔ وہ پھر غور سے سننے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی "کیا سانس روک کر بیٹھ گئے ہو یا تمہاری زندگی کی سانسیں ختم ہو گئی ہیں۔ میں تمہاری ایکٹنگ کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں تمہارے جیسے جھوٹے اور فریبی کی باتوں میں نہیں آؤں گی۔"

وہ یک بیک اٹھ کر کھڑا ہو گیا، کہنے لگا "اوہ کیا نخرا ہے پہلے تو محبت بدل دی، اپنی جگہ دوسری دلہن پیش کر دی اور اب آواز بدل کر بول رہی ہو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا پھر ایک دم سے چونک گیا۔ اس کے سامنے ایک اتنی موٹی تگڑی فرزانہ کھڑی تھی کہ جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں چھوٹی پڑ جاتی تھیں۔ وہ یوں ہانپتے ہوئے سانس لے رہی تھی، جیسے اپنے اندر ہوا بھر کر خود کو اور پھیلا رہی ہو حالانکہ مزید پھولنے کی گنجائش نہیں تھی۔ بادشاہ جانی نے آنکھیں میچ کر اسے دیکھا پھر پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں لیڈی ڈاکٹر فرزانہ ہوں۔"

بادشاہ جانی نے ہاتھ نچا کر کہا "ارے واہ! بڑی آئی لیڈی ڈاکٹر فرزانہ۔ پہلی ملاقات میں اپنے آپ کو رخسانہ بولتی تھی، میں نے یقین کر لیا کہ تمہارا نام رخسانہ ہو گا۔ شادی کے بعد دیکھا تو صورت بدل گئی۔ آدھا چہرہ رہ گیا۔ میں نے پوچھا "اے، تم کون ہو تو پھر بولی وہی رخسانہ۔ میں نہیں مانتا تھا میں کہتا تھا وہی میری پہلے والی رخسانہ لے کر آؤ، مگر وہ بولتی تھی، میں وہی پہلے والی رخسانہ ہوں۔ چلو ایک برس دو مہینے مانتا رہا کہ وہ وہی رخسانہ ہے پھر ایک نیا شوشہ چھوڑا گیا کہ جسے میں چاہتا ہوں، اس کا نام فرزانہ ہے۔ اب میں پانچ دن سے اپنی فرزانہ کو تلاش کر رہا ہوں تو اب دوسری صورت والی فرزانہ سامنے آگئی۔ دیکھو میں اتنا الو نہیں ہوں، بار بار دھوکا نہیں کھا سکتا۔ ایک رخسانہ کے بعد ڈبل رخسانہ، ایک فرزانہ کے بعد ڈبل فرزانہ، کیا میں اتنا ہی گدھا نظر آتا ہوں۔"

موٹی فرزانہ اس کی باتیں سنتی رہی اور غصے میں زور زور سے سانسیں لیتی رہی پھر وہ زور سے چیخ کر بولی "اے کیا بکواس کر رہے ہو۔ کون ہو تم؟"

"بس بس، زیادہ چکر بازی نہ کرو، میں خوب سمجھتا ہوں۔ فرزانہ نے مجھے دور سے دیکھ لیا ہے کہ میں اسے یہاں تک تلاش کرتا آگیا ہوں۔ بس مجھے دیکھتے ہی اس نے وہی پہلے والی چال چلی۔ پہلے دوسری رخسانہ کو بھیجا تھا، اب تمہیں فرزانہ بنا کر میرے پاس

بھیج رہا ہے۔ وہ اسی اسپتال میں کہیں چھپی ہوگی۔ میں اسے ڈھونڈ کر رہوں گا۔"

وہ ایک دم سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ موٹی فرزانہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر دیدے پھیلائے خالی خالی دروازے کو تکتی رہ گئی۔ وہ باہر نکل کر کوریڈور میں آیا تو اس نرس سے سامنا ہو گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "کیوں اپنی فرزانہ سے ملاقات ہو گئی؟"

وہ گھونسا دکھا کر بولا "اے، مسکراتی کیوں ہو۔ دانت اندر کرو۔ میں تم لوگوں کی چال بازی سمجھتا ہوں۔ سچ سچ بتاؤ' وہ اصلی فرزانہ کہاں چھپی ہوئی ہے؟"

نرس سہم کر پیچھے ہٹ گئی پھر کہنے لگی "کیا تم پاگل ہو؟"

"ابھی تو نہیں ہوں مگر ہو جاؤں گا اسی لیے کہتا ہوں کہ مجھے پاگل ہونے سے بچاؤ اور فرزانہ تک پہنچا دو۔"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "میں نے لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کو تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔"

"موٹی فرزانہ کو بھیج دیا اور دبلی فرزانہ کو غائب کر دیا۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

اس نے لپک کر نرس کی کلائی پکڑی۔ وہ مارے دہشت کے چیخنے لگی "بچاؤ' بچاؤ' یہ آدمی پاگل ہے۔ پلیز..... ہیلپ..... ہیلپ۔"

کتنے ہی وارڈ بوائے اور دوسرے لوگ ادھر ادھر سے دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ وہ لیڈی ڈاکٹر فرزانہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر چیخنے لگی تھی۔ وہ بھی کہہ رہی تھی کہ یہ آدمی پاگل ہے' اسے پولیس کے حوالے کر دو یا پاگل خانے بھیج دو۔ تھوڑی دیر میں اسے چاروں طرف سے لوگوں نے جکڑ لیا۔ وہ تلملا رہا تھا اور ہاتھ پاؤں جھٹک کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "مجھے چھوڑ دو۔ مجھ سے دھوکا ہو رہا ہے' میں لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کو ڈھونڈ کر رہوں گا۔"

محبت بڑی ظالم ہوتی ہے' آدمی کو الو بنا دیتی ہے۔ اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ وہ دیوانہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ اسپتال میں ہے' اپنے گھر میں ہے' ٹیکسی میں ہے' اس دنیا میں ہے یا دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ بادشاہ جانی کی حیثیت سے مر چکا تھا اور جب دیوانہ اپنے اندر پہلی شخصیت کو مار دیتا ہے' اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے تب اس کے اندر صرف محبت سانس لیتی ہے۔

محبت کے منہ پر ایک گھونسا پڑا۔ وہ لڑکھڑا گیا "عشق کا سودا سر میں سمایا ہے؟" کسی نے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک طرف جھٹکا دیا پھر وہ لڑکھڑایا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہونے لگا۔ گویا کہ محبت کے حضور جھکنے لگا۔ کسی نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری وہ اچھل کر سیدھا ہو گیا جیسے پیار کے سامنے اٹینشن ہو رہا ہے۔ کسی نے اس کے سر پر لکڑی سے ایک ضرب لگائی اس نے کراہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے زخموں کی سلامی پیش کرنے لگا۔ محبت زخموں کی سوغات اور درد کا نذرانہ چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کے سامنے تعظیم سے جھکا جائے اور اس کے سامنے اٹینشن ہو کر مستعد رہنے کا ثبوت دیا جائے۔ محبت ایک مکمل کورس ہوتا ہے جو بدرجہ مجبوری وقت کے ساتھ پڑھنا پڑتا ہے۔ دنیا میں جتنے سبق ہیں' وہ سب ایک ہی وقت میں ایک ہی استاد سے پڑھے جاتے ہیں لیکن محبت کا سبق بیک وقت کتنے ہی ہاتھوں اور کتنی ہی زبانوں کتنی ہی گالیوں اور کتنے ہی پتھروں کی زبان سے پڑھایا جاتا ہے اور دیوانہ پڑھتا رہتا ہے۔

وہ ہوش میں نہیں تھا۔ جب ہوش میں آیا تو خود کو آہنی سلاخوں کے پیچھے حوالات میں پایا۔ تھانے دار اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بید سے کھیل رہا تھا۔ آہنی دروازے پر بید کو آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہہ رہا تھا "کیوں بے گدھے' مجنوں کی اولاد' کیا اور پٹائی کرنی ہوگی یا ہوش میں آگیا ہے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا تمام بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو ہاتھ لگایا تو وہاں بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ چھونے سے پتا چل رہا تھا کہ چہرہ سوج گیا ہے۔ آنکھیں بھی کچھ موٹی موٹی سی' بھاری بھاری سی لگ رہی تھیں۔ ٹھیک سے کھولی نہیں جاتی تھیں۔ تھانے دار نے اسے ایک گندی سی گالی دی پھر سپاہی سے کہا کہ اسے دروازہ کھول کر باہر نکالا جائے۔

بادشاہ جانی گالی سن کر تلملا گیا مگر برداشت کر گیا۔ آئے دن پولیس والوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چپ چاپ ایک گالی سن لو تو پولیس والے آگے گالی نہیں دیتے جواب میں کچھ بولو تو پھر گالیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور جو گالی کھاتا ہے' وہ ان کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتا۔

وہ حوالات سے باہر آگیا۔ تھانے دار اپنی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا اسے گھور کر دیکھ رہا تھا' وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے' کیا تجھے جیل بھیج دیا جائے؟"

اس قسم کی دھمکی ایک اشارہ ہوتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کہ جیل نہیں بھیجا جائے گا' کچھ نہ کچھ پیش کردو۔ بادشاہ جانی میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں اس کی جیب سے بہت کچھ نکال کر رکھا گیا تھا۔ اس کی گاڑی کی چابی تھی' ایک رومال تھا ایک اس کی تصویر تھی۔ سگریٹ کا پاکٹ اور ماچس وغیرہ کے ساتھ ساڑھے چار سو روپے بھی رکھے ہوئے تھے۔ بادشاہ جانی نے میز پر جھک کر اپنی تمام چیزیں اپنی طرف سمیٹ لیں۔ ساڑھے چار سو روپے میں سے پچاس روپے اپنے پرس میں رکھے باقی نوٹ تھانے دار کی طرف سرکا دیے پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

تھانے دار نے سرہلا کر کہا "ٹھیک ہے' اب تم جاسکتے ہو مگر یاد رکھنا ادھر اسپتال کی طرف ابھی دو چار روز نہ جانا' میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

بادشاہ جانی اپنی چیزوں کو جیب میں رکھتے ہوئے تھانے سے باہر آگیا۔ باہر اس کی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ مار کھانے کے بعد بے ہوش ہو گیا تھا۔ ٹیکسی کو دیکھ کر پتا چلا کہ تھانے دار اپنے سپاہیوں کے ساتھ اسے اسی کی ٹیکسی میں یہاں تک لایا تھا۔ اس نے اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اندر کی لائٹ آن کی پھر عقب نما آئینے کو اپنی طرف جھکا کر دیکھنے لگا۔ آئینے پر نظر پڑتے ہی وہ حیرانی سے چند لمحوں تک اپنے آپ کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ اتنا سوج گیا تھا کہ پہچانا نہیں جارہا تھا۔ جابجا زخموں کے نشان تھے کہیں خون بہنے کے بعد جم گیا تھا۔ اس نے اندر کی لائٹ بجھا دی۔ گاڑی کو اسٹارٹ کیا پھر وہاں سے ڈرائیو کرتا ہوا ایک بار کے پاس پہنچا۔ اندھیری گلی میں گاڑی کو روک کر چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ باہر مال سپلائی کرنے والے چھوکرے نے آکر پوچھا "کیا چاہیے؟"

اس نے اپنے بائیں پاؤں کا جوتا کھولا۔ اس جوتے کے اندر سو سو کے دو نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نوٹ نکال کر چھوکرے کو دیتے ہوئے کہا "ایک ادھا سوڈا' اور پانی لے آؤ۔"

چھوکرا چلا گیا۔ وہ اکیلے تاریکی میں بیٹھا ونڈ اسکرین کے پار گھورنے لگا۔ وہاں کچھ

نظر نہیں آرہا تھا ہر طرف سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے صرف اس کے چہرے کو نہیں بدلا گیا ہے بلکہ پوری دنیا کے منہ پر کالک پھیر دی گئی ہے۔

اس نے اپنے چہرے کو چھو کر سوچا۔ یہ لوگ دیوانے کو مارتے کیوں ہیں؟ شاید اس لیے کہ دیوانہ ہوش سے بے گانہ ہوتا ہے۔ دیوانہ تہذیب کے خلاف بولتا ہے اور حرکتیں کرتا ہے اور جو لوگ مارتے ہیں' وہ ہوش مند ہوتے ہیں مگر وہ بھی تو تہذیب کے خلاف گالیاں دیتے ہیں اور مار پیٹ کرتے ہیں۔ دیوانے کو مار کر خود پاگل ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ فرزانہ کو کیوں تلاش کررہا ہے۔ وہ فرزانہ کون ہے۔ وہ اس موٹی فرزانہ اور نرس کی حمایت میں بغیر کچھ پوچھے ہوئے اس کی پٹائی کررہے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جوان عورت کو کون نہیں چھیڑتا' کچھ لوگ اپنا دل ہتھیلی پر رکھ کر سرعام چھیڑتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو شرافت اتنا بزدل بنادیتی ہے کہ وہ صرف تنہائی میں چھیڑ سکتے ہیں لیکن کوئی دوسرا چھیڑے تو مشتعل ہوجاتے ہیں۔ دوسروں کو مارتے ہیں اور خود عورت پر مرتے ہیں۔ اگر مار پیٹ کا دستور نہ ہوتا' محاسبے کا عمل ہوتا تو لوگوں کو پتا چلتا کہ بادشاہ جانی کی نیت بری نہیں تھی۔ وہ کسی کو چھیڑ نہیں رہا تھا۔ صرف اپنی محبت کا پتا پوچھ رہا تھا۔ پتا پوچھنے میں دیوانگی تھی لیکن اس میں بھی اس کا قصور نہیں تھا۔ اس کے آگے بار بار محبت کے چہرے بدلے گئے تھے۔ وہ اپنی محبت کی تکمیل کے لیے بھٹکتا تھا اور ہر بار اسے محبت کا آدھا چہرہ ملتا تھا۔

چھوکرا وسکی سوڈا اور پانی لے آیا۔ جانی نے وسکی اور سوڈے کی آمیزش سے ایک بڑے گلاس کو بھرلیا۔ وہ جیسے برسوں کا پیاسا تھا۔ غٹاغٹ پیتا چلا گیا۔ ایک گلاس خالی کرنے میں اسے صرف چند سیکنڈ لگے۔ اس کے بعد اس کا سر آہستہ آہستہ گھومنے لگا۔ اب اسے اپنے بدن کی اور چہرے کی تکلیف کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ دوسری بار اس نے گلاس میں وسکی کے ساتھ پانی ڈالا اور پھر دروازے کو کھول کر شراب سے منہ دھونے لگا۔ چلو میں شراب لے کر اپنے چہرے کو تھپتھپانے لگا۔ عام شراب خانوں میں جو شراب سپلائی کی جاتی ہے' اس میں اسپرٹ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے اب اس کے چہرے کے زخم کھل رہے تھے۔ اسپرٹ سے جیسے آگ لگ رہی تھی جیسے منہ پر تیزاب پھینکا جارہا تھا اور اس کا چہرہ گلتے گلتے آدھا ہورہا تھا۔ تکلیف کی شدت کو برداشت

کرنے کے باوجود کراہتا جا رہا تھا۔ "آہ.. آہ.. فر.ز..ا..نہ.. جا..نا.. آ..نا.. فرزانہ۔ جاناں۔ آنا۔ جاناں آجانا۔"

○☆○

فرزانہ مسکرا رہی تھی۔ ایک بوڑھی مریضہ کی نبض تھام کر کہہ رہی تھی۔ "ماں جی' دیکھئے میں کیسے مسکراتی رہتی ہوں' اسی طرح آپ کو بھی مسکرانا چاہیے۔ خوشی سے بہترین اور زوداثر دوا کوئی نہیں ہوتی۔ انسان کا آدھا مرض اس سے دور ہو جاتا ہے۔ دوائیں تو میں لکھ دوں گی لیکن میرے نسخے میں مسکراہٹ لازمی ہوگی۔"

بوڑھی مریضہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "معاف کرنا بیٹی' تم مسکرا رہی ہو مگر تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ان کے پیچھے بلائیں منڈلا رہی ہیں اور تمہیں کرب میں مبتلا کر رہی ہیں۔"

"اوہ' نہیں تو۔" وہ گڑبڑا گئی۔ جلدی سے مریضہ کا ہاتھ چھوڑ کر کرسی پر سیدھی طرح بیٹھتے ہوئے بولی "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ بھلا مجھے کیا کرب ہو سکتا ہے۔ میرے پیچھے کوئی بلا نہیں ہے۔"

بوڑھی مریضہ نے سرہلا کر کہا "مشکل تو یہی ہے کہ ہم اپنے اپنے دکھوں کو اپنے اندر چھپائے رکھتے ہیں اور دوسروں کو بتاتے ہیں کہ ہم بہت خوش حال ہیں۔ ہمیں کوئی دکھ کوئی مصیبت چھو کر نہیں گزرتی۔ کیا گھر میں ٹی وی ہو' صوفے ہوں' فرش پر قالین بچھا ہوا ہو' دیوار پر رنگا رنگ تصویریں ہوں۔ گلدان سجے ہوں تو کیا ان کے پیچھے دکھ چھپ جاتے ہیں؟ بیٹی نہیں چھپتے۔ ہم لاکھ چھپائیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہوتی ہے کہ ہر انسان اپنی اپنی زندگی کی کربلا سے گزرتا رہتا ہے۔"

فرزانہ نے سرجھکالیا۔ ایک کاغذ پر نسخہ لکھتے ہوئے بولی "آپ نے دنیا دیکھی ہے' آپ کے تجربات کو جھٹلا نہیں سکتی۔ یہ لیجئے' یہ دوائیں کسی کیمسٹ کے یہاں سے خرید لیں۔"

بڑھیا نے وہ پرچی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا "کیا کسی دکان پر وہ مسکراہٹ مل سکتی ہے جس کے پیچھے کوئی کرب نہ چھپا ہوا ہو۔ اگر نہیں مل سکتی تو بیٹی نسخے میں مسکراہٹ کو شامل نہ کرو۔ یہ دوا بہت مہنگی ہے کسی بازار میں نہیں ملتی۔ کسی قیمت پر

نہیں ملتی۔"

فرزانہ نے اپنی دونوں کہنیاں ٹیک دیں پھر سرجھکا کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی انگلیاں گھنی زلفوں میں دھنس گئیں پھر وہ انکار میں سرہلا کر بولی "کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہاں امی کہتی ہیں کہ یہ اتنی بڑی دنیا اللہ کی نگری ہے۔ یہاں سب کچھ ملتا ہے' کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اللہ ان لوگوں کو سکون نہیں دیتا جو دوسروں کی خوشی چھین لیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے بادشاہ جانی نظر آنے لگا۔ "ہائے جانی میں نے اپنا سکون اپنے ہاتھوں سے برباد کیا ہے۔ بچپن میں لڑکیاں کتنی نادان ہوتی ہیں۔ محبت کے مارے اپنے سارے کھلونے اپنی سہیلیوں کو دے دیتی ہیں مگر کچھ قدرتی طور پر اتنی سمجھدار ہوتی ہیں کہ اپنا گڈا کسی کو نہیں دیتیں۔ میں بچی نہیں تھی' نادان نہیں تھی پھر بھی میں نے تمہیں دوسری کے حوالے کر دیا۔ اب پچھتا رہی ہوں۔ اب سوچتی ہوں کہ رخسانہ کا جو نقصان میں نے کیا تھا اس کی تلافی کسی دوسرے طریقے سے ممکن ہوسکتی تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ کما کر اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کراسکتی تھی مگر میں نے تمہیں ہاتھ سے بے ہاتھ کرکے اپنے جینے کی صورت بگاڑ لی ہے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو بوڑھی مریضہ جاچکی تھی اور ڈسپنسری خالی ہوگئی تھی۔ جتنی مریض عورتیں اور بچے آئے تھے' وہ سب جاچکے تھے۔ اب ڈسپنسری بند کرنے کے بعد وہ کمرے میں جاکر آرام کرنا چاہتی تھی مگر اس کو تو جانی کی یاد میں لذت مل رہی تھی۔ اس طرح بھی آرام آرہا تھا۔ کہنیاں میز پر ٹیک کر' سر کو تھام کر' آنکھیں بند کرکے اس کی یاد میں ڈوبنے سے اور اسے بند آنکھوں کے پیچھے دیکھنے سے ایک طرح کا سکون ملتا تھا۔ پریشانی بھی بڑھتی تھی' آرام بھی ملتا تھا۔ یہ محبت عجیب چیز ہوتی ہے کہ جو تڑپاتی بھی ہے اور قرار بھی دیتی ہے۔ اس نے پھر سر کو جھکالیا۔ میز پر شام کا اخبار رکھا ہوا تھا اس پر دونوں کہنیاں ٹکی ہوئی تھیں۔ جب اس نے سرجھکایا تو اس کی نظر اخبار کے پچھلے صفحے پر پڑی جو تہہ کیا ہوا نگاہوں کے سامنے ہی رکھا ہوا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس خبر کی سرخی بھی ننھی سی تھی لیکن وہاں ٹیکسی ڈرائیور کے الفاظ دیکھتے ہی

نظریں ادھر جم گئیں۔ اس نے پڑھا' لکھا تھا "ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اسپتال میں ہنگامہ کھڑا کردیا۔"

وہ چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور تو کوئی بھی ہو سکتا تھا لیکن جب بھی ٹیکسی نظر آتی تھی' کوئی ڈرائیور دکھائی دیتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا کہیں ذکر ہوتا تھا تو اس کا دھیان بادشاہ جانی کی طرف جاتا تھا۔ "ایک ٹیکسی ڈرائیور' لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کو پوچھنے آیا۔ جب ڈاکٹر فرزانہ اس کے سامنے آئیں تو اس نے اسے فرزانہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور پاگلوں کے انداز میں کہنے لگا کہ اصلی لیڈی ڈاکٹر فرازنہ کو کہیں چھپادیا گیا ہے اس پر بات بڑھ گئی۔ وہ تشدد پر آمادہ نظر آرہا تھا۔ اس نے نرس کی کلائی بھی پکڑلی۔ لیڈی ڈاکٹر فرزانہ بری طرح دہشت زدہ ہوگئی تھیں۔ تب اسپتال کے وارڈ بوائے اور دوسرے لوگوں نے اس نیم پاگل ٹیکسی ڈرائیور کو قابو میں کیا اور اسے پولیس کے حوالے کردیا۔"

وہ مختصر سی خبر تھی۔ فرزانہ نے اسے پڑھ لیا لیکن اس کی نظریں وہیں جمی رہیں۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہورہی تھی۔ اس کے سینے میں دھڑکنوں کے دھماکے ہورہے تھے۔ اس خبر میں بادشاہ جانی کا نام نہیں لکھا تھا لیکن وہ سمجھ گئی کہ یہ اسی دیوانے کی داستان ہے۔ اس خبر سے یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ کتنی شدت سے' کتنی دیوانگی سے اسے تلاش کررہا ہے۔ اس کے لیے اسپتالوں میں جھانکتا رہتا ہے۔ اس کے لیے ہنگامے کرتا ہے اس کی خاطر تھانے میں اور حوالات میں جاتا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے' اس کی ہنگامہ پروری سے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ غصے میں ہے' جنون میں ہے' یہ انتقام کا جنون بھی ہوسکتا ہے اور محبت کی دیوانگی بھی۔

فرزانہ کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی بادشاہ جانی ڈسپنسری میں پہنچ جائے گا اور اس کی گردن دبوچ لے گا اور اس کی خوب پٹائی کرے گا' اتنا مارے گا کہ لہولہان کردے گا۔

وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ آہستہ آہستہ کراہنے لگی جیسے پٹائی ہورہی ہو اور بدن دکھ رہا ہو۔ جیسے وہ کلائی مروڑ رہا ہو اور منہ سے ہائے نکل رہی ہو جیسے وہ اسے اٹھا رہا ہو اور گرا رہا ہو۔ اپنے بھاری بھاری پنجوں سے دبوچ رہا ہو' اسے کھسوٹ رہا ہو' اسے توڑ

رہا ہو۔ مروڑ رہا ہو اپنے خنجر سے اس کے وجود کو چھلنی کرتا جارہا ہو۔

وہ لرزنے لگی۔ ظلم کے خیال سے ڈر لگتا ہے مگر ظلم سہتے وقت اپنے ظالم پر پیار بھی آتا ہے۔ اچھا ہے آجاؤ' مجھے چھلنی کردو۔ سوچ سوچ کر اور سہم سہم کر مرتے رہنے سے بہتر ہے کہ تم ایک بار ہی مجھے مار ڈالو۔ میری جان لے لو۔ یہ جان تو تمہارے ہی لیے ہے تم نہیں لوگے تو اور کون لے گا۔

اس نے میز پر رکھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کے گھیرے میں اپنا منہ چھپالیا اپنی آنکھیں بند کرلیں پھر خود کو اور جانی کو دیکھنے لگی۔ یہ دیکھنے لگی کہ وہ بری طرح مار کھانے کے بعد لہولہان ہوگئی ہے۔ جابجا زخم آئے ہیں اور اب جانی اس کے زخموں کو سہلا رہا ہے۔ اس کے زخموں کو چوم رہا ہے' اسے سینے سے لگا کر تھپک رہا ہے اور اسے اتنا پیار دے رہا ہے کہ وہ مار سے نہیں مری تھی' پیار سے مرگئی ہے۔

ڈسپنسری کی خاموشی میں اسے امی کی آواز سنائی دی "فری تین بج رہے ہیں' کیا آج دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤ گی؟"

وہ ایسے پیارے پیارے تصور میں گم تھی کہ چہرہ آپ ہی آپ کھل اٹھا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے میز پر سے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا تو ماں نے حیرانی سے پوچھا "کیا بات ہے تم توقع کے خلاف مسکرا رہی ہو۔"

"ہاں امی' بس ایسے ہی۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ آپ اندر جاکر کھانا نکالیں' میں ابھی دروازہ بند کرکے آتی ہوں۔"

اس کی امی اندر چلی گئیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈسپنسری کی کھڑکیاں بند کرنے لگی۔ اس کے بیرونی دروازے کو بند کرنے کے لیے آئی تو ٹھٹک گئی۔ دروازے پر رخسانہ کھڑی تھی' وہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے آدھے چہرے کو سفید دوپٹے سے چھپا رکھا تھا' وہ جب گھر سے باہر نکلتی تھی تو اپنے دوپٹے کو گھونگٹ بنالیتی تھی اس نے ڈسپنسری کے اندر آتے ہوئے دوپٹے کو سر پر سے گرالیا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی "جانی کہاں ہے؟"

فرزانہ نے اس کے سامنے آکر پوچھا "تم جانی کو یہاں آکر کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ وہ کل سے گھر نہیں آئے ہیں۔"

اس بار فرزانہ نے گھور کر کہا "اچھا تو یہاں یہ سن کر آئی ہو کہ میں اسے بھگا کر لے آئی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے، تم نہ لائی ہو۔ وہ خود آ گیا ہو۔"

"اور میں نے اسے چھپا کر رکھ لیا ہے۔ تم یہی سوچ رہی ہو نا؟"

"اور کیا سوچوں گی۔ میں نے مستری چاچا سے بھی پوچھ لیا۔ وہ بھی پریشان ہو کر صبح سے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں جہاں جہاں وہ اپنی ٹیکسی لے جا کر کھڑی کرتے ہیں، وہ تمام جگہیں دیکھ لی گئی ہیں پھر تم ہی بتاؤ کہ اب کہاں دیکھنے جاتی۔ یہی ایک جگہ رہ گئی تھی۔"

"رخسانہ تمہاری وجہ سے میں قصوروار بن گئی۔ وہ اپنی شادی کی رات سے مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور میں چھپتی پھر رہی ہوں۔ اس سے منہ چھپانے کے لیے میں نے اپنا ناظم آباد والا مکان فروخت کر دیا اور یہاں اورنگی کے اس علاقے میں آ کر رہنے لگی۔ وہ نہیں جانتا کہ میں یہاں ہوں۔ ایک بات میرے دماغ میں آئی تھی کہ کبھی وہ میری ڈسپنسری کا بورڈ پڑھے گا اور یہاں لیڈی ڈاکٹر فرزانہ واسطی لکھا ہوا نظر آئے گا تو وہ ادھر چلا آئے گا اسی لیے میں نے اپنے سائن بورڈ پر لیڈی ڈاکٹر ایف واسطی لکھوایا ہے۔ یقین نہ ہو تو باہر جا کر دیکھ لو۔ اس طرح وہ کبھی ادھر سے گزرتے وقت بھی میرا نام نہیں پڑھ سکے گا۔ میں چھپنے کے لیے طرح طرح کے جتن کر رہی ہوں اور تم پھر بھی مجھ کو الزام دینے آئی ہو۔"

"اس لیے کہ آج سے پانچ دن پہلے تمہارا اس سے سامنا ہو چکا ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟"

"یہ سچ ہے لیکن میں جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آئی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا۔ تم جانی سے پوچھ سکتی ہو کہ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ضرور ہے لیکن میں رکشے میں تھی اور اس سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس انداز میں دور ہوتی گئی تھیں کہ رکشے کی پچھلی کھڑکی سے گھوم گھوم کر تم اسے دیکھتی رہی تھیں۔ تم نے زبان سے شناسائی ظاہر نہیں کرائی لیکن اپنی آنکھوں سے جتا دیا کہ تم وہی شادی سے پہلے والی رخسانہ ہو۔"

فرزانہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا "کیا تم لڑائی کرنے آئی ہو؟"

"نہیں میں یہاں جانی...."

وہ کہتے کہتے رک گئی پھر اچانک ہی مسکرا کر بولی "میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ ہمارے درمیان لاکھ اختلافات سہی لیکن ہم کبھی بہت اچھی سہیلیاں تھیں۔ کیا تم مجھے گھر کے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی۔"

"ہوں، میں تمہیں گھر کے اندر بلاؤں تاکہ تم وہاں تلاشی لے سکو۔ اپنے جانی کو ڈھونڈ کر نکال سکو۔ ٹھیک ہے، گھر کے اندر آ جاؤ اور اگر وہ نہ ملا تب تم اپنی آنکھیں ندامت سے جھکا لو گی یا ڈھیٹ بن کر باتیں کرتی رہو گی اور جھوٹی محبت جتاتی رہو گی۔"

رخسانہ نے اپنی نظریں جھکا لیں، کچھ دیر سوچتی رہی پھر نظریں اٹھا کر فرزانہ کو دیکھا اس کے بازو کو تھام کر کہا "میں تو تمہارے پاس باتیں کرنے آئی تھی مگر آتے ہی لڑنے لگی۔ فری جس عورت کی دنیا لٹ رہی ہو، اس کے دل میں بیٹھ کر دیکھو تو تمہیں میری حالت کا اندازہ ہو گا اور میرے چڑچڑے پن کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔ میں جانتی ہوں تم جانی کو مجھ سے نہیں چھپاؤ گی لیکن میں اپنے دل کی بات کیسے بتاؤں۔ جب تک میں تمہارے گھر میں جھانک کر نہیں دیکھوں گی، اس وقت تک یہاں سے مطمئن ہو کر نہیں جا سکوں گی۔ جاؤں گی تو دل ادھر ہی اٹکا رہے گا۔"

فری نے اسے ہمدردی سے دیکھا پھر ایک طرف ہٹ کر بولی "آؤ دروازہ کھلا ہے۔ اندر دو کمرے اور ایک باورچی خانہ ہے۔ امی وہاں موجود ہوں گی۔ جاؤ دیکھو اور اپنی تسلی کر لو۔"

رخسانہ تیزی سے چلتے ہوئے اندرونی دروازے سے گزرتی ہوئی مکان کے رہائشی حصے میں چلی گئی۔ فرزانہ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس لمحے دماغ میں سوال پیدا ہوا کہ ایسا کب تک ہو گا؟ وہ چھپتی پھرے گی، جانی اسے ڈھونڈتا رہے گا اور رخسانہ، جانی کے پیچھے بھاگتی رہے گی۔ ایسا کب تک ہو گا؟

اس کے ذہن میں جواب ابھرا جب تک وہ چھپتی رہے گی، ایسا ہوتا رہے گا۔ اگر جانی کے سامنے آ جائے گی تو یہ کھیل ختم ہو جائے گا، کوئی ایک فیصلہ ہو گا۔ اس پار یا اس پار۔ وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچے گا کہ اب اسے حالات سے سمجھوتا کر کے رخسانہ کے ساتھ ہی زندگی گزارنا چاہیے یا دیوانگی ستائے تو رخسانہ کو چھوڑ کر اسے اپنا لینا چاہیے؟ کوئی

ایک فیصلہ تو ہو گا یہ بھاگ دوڑ والا کھیل اور ہر لمحے اس کے بارے میں سوچ سوچ کر سہم جانے والی بات تو ختم ہو جائے گی۔

اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ رخسانہ اندرونی کمروں سے نکل کر آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر پوچھا "کیا تسلی ہو گئی؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ فرزانہ نے کہا "دیکھو میں نے شادی سے پہلے ہی تمہیں سمجھا دیا تھا کہ شادی کی پہلی رات ہی یہ راز کھول دینا۔ اسے صاف صاف بتا دینا کہ تم پر کس طرح ہسٹیریا کا دورہ پڑتا تھا۔ کس طرح تمہارے آدھے چہرے کو دیکھ کر کوئی تمہیں شریک حیات بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تمہاری شادی ضروری تھی لہٰذا جانی کے ساتھ یہ کھیل کھیلا گیا اگر اس میں ذرا بھی انسانیت ہے تو وہ تمہیں قبول کر لے پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ پلاسٹک سرجری کے بعد تم مکمل ہو جاؤ گی۔ تمہارے مکمل حسن و جمال کو دیکھ کر وہ مجھے بھلا دے گا لیکن تم نے میرا مشورہ نہیں مانا۔ اب شادی کی رات سے آج تک تم اس کے پیچھے بھاگ رہی ہو اور وہ میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ تمہارا بھاگنا ایک بیوی کا المیہ ہے۔ ہمارے ہاں ہزاروں لاکھوں بیویاں' اپنے شوہروں کے پیچھے بھاگتی ہیں ایک دوسرے سے اختلافات ہوتے ہیں' لڑتے ہیں' جھگڑتے ہیں' دور ہوتے ہیں پھر مل جاتے ہیں۔ یہ بھی تمہاری ازدواجی زندگی کا ایک کھیل ہے۔ اس میں بدنام میں ہو رہی ہوں اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتیں۔ میں کس طرح ایک مجرم کے مانند چھپی بیٹھی ہوں اس کا بھی تمہیں احساس نہیں ہے۔ میں دن کے وقت کسی بھی اسپتال میں ملازمت کر سکتی ہوں لیکن جانی کے ڈر سے نہیں کرتی۔ میں فرزانہ واسطی کے بجائے ایف واسطی بن گئی۔ رخسانہ تمہارا چہرہ آدھا ہے تو میرا نام آدھا ہو گیا۔ میری زندگی آدھی ہو رہی ہے۔ میری نیند آدھی ہو گئی۔ میری بھوک آدھی ہو گئی۔ میں سوچتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میرا ذہن آدھا ہو گیا ہے اور میں کوئی کام کی بات نہیں سوچ سکتی۔ تمہارا کیا بگڑتا ہے' تم شاید ایک بچے کی ماں بن چکی ہو۔ تمہیں بچہ ملا' شوہر ملا' گھر ملا' مستقبل ملا۔ تم اپنی ازدواجی الجھنوں کو آج نہیں تو کل سلجھا لو گی لیکن میں تمہیں جانی کی دلہن بنانے کی سزا کب تک پاتی رہوں گی۔"

رخسانہ نے سر جھکا لیا پھر تائید میں سر ہلا کر بولی "میں جانتی ہوں کہ تم نقصان میں

رہی ہو' ویسے جانی کو تو اب یہ معلوم ہو ہی چکا ہے کہ تمہارا نام فرزانہ ہے۔ میں نے انہیں ساری باتیں بتا دی ہیں۔ میں نے اس انداز میں اپنی داستان سنائی ہے کہ وہ متاثر ہو گئے ہیں لیکن تم سے ملنے کی ضد کر رہے تھے اس پر بھی میں نے انہیں سمجھایا تو وہ راضی ہو گئے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اب تمہارے پیچھے نہیں بھاگیں گے اور نہ ہی تمہارا نام اپنی زبان پر لائیں گے۔ فری مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ وہ تمہیں بالکل بھلا دیں گے۔ تمہارا نام تک نہیں لیں گے۔ تمہاری یہ پریشانیاں جلد ہی دور ہو جائیں گی۔"

فرزانہ نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا "اگر یہ بات ہے تو تم جانی کو ڈھونڈنے یہاں کیوں آئی ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "وہ کل رات سے گھر نہیں آئے۔ میں نے انہیں ہر جگہ ڈھونڈ لیا۔ آخر میں خیال آیا کہ شاید وہ یہاں پہنچ گئے ہوں' انہوں نے مجھ سے جھوٹا وعدہ کیا ہو اور تمہیں تلاش کر لیا ہو۔"

"جانی کو تھوڑا سا میں بھی سمجھتی ہوں۔ وہ ہزار بار تم سے وعدے کرے گا اور ہزار بار میرے پیچھے بھاگے گا اور میں بار بار بدنام ہوتی رہوں گی۔ اب میں نے سوچ لیا ہے۔ یہ کھیل ختم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ میں اس کے سامنے آجاؤں۔"

رخسانہ ایک دم سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی پھر بولی "نہیں تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ تم سامنے آؤ گی تو ان کی دیوانگی بڑھ جائے گی۔"

"اس کی دیوانگی سے تمہیں نہیں مجھے خطرہ ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی قتل بھی کر سکتا ہے۔ مجھے سربازار رسوا بھی کر سکتا ہے۔"

"نہیں فری' وہ ایسا نہیں کریں گے۔"

"تم کیا جانتی ہو؟ وہ مجھے یہاں کے تمام اسپتالوں میں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ کل اس نے سوسائٹی کے ایک اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر فرزانہ سے بدتمیزی کی' اسے دہشت زدہ کیا۔ ایک نرس کی کلائی پکڑ لی۔ تشدد پر اتر آیا۔ اسپتال والوں نے اسے تھانے پہنچا دیا۔"

رخسانہ نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا پھر پوچھا "تم یہ سب باتیں

کیسے جانتی ہو؟"

فرزانہ نے اخبار کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس کا چوتھا کالم دیکھو۔"

وہ دیکھنے لگی، پڑھنے لگی۔ فرزانہ نے کہا "اس خبر میں کوئی خاص تفصیل نہیں ہے لیکن اس مختصر سی خبر کے پیچھے ہماری زندگی میں کھیلا جانے والا پورا ڈراما چھپا ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں، تم جانتی ہو کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور صرف بادشاہ جانی ہے، وہ لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور اس کے لیے اب حوالات تک پہنچ گیا ہے۔"

رخسانہ اخبار کو میز پر پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی پھر بولی "میں ابھی جاتی ہوں، انہیں حوالات سے چھڑا کر لاتی ہوں۔"

وہ جانے لگی تو فرزانہ نے آواز دی "جانی مرد ہے۔ دو چار گھنٹے اور حوالات میں رہ سکتا ہے۔ پہلے تم مجھے اپنی خود غرضی کی حوالات سے نکالو۔ میرا فیصلہ کر کے جاؤ۔"

وہ پلٹ کر بولی "تمہارا کیا فیصلہ کروں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ جانی میرے قابو میں آ رہے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، اب وہ تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔"

فرزانہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی پھر بولی "کیسی بے تکی باتیں کرتی ہو، میں نے تمہیں ثبوت دے دیا کہ وہ تم سے وعدے کرنے اور قسمیں کھانے کے باوجود میرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اخبار تک دکھا دیا کہ وہ کس طرح میرے لیے ہنگامے کر رہا ہے پھر بھی تم مجھے جھوٹی تسلیاں دے کر یہاں سے جانا چاہتی ہو۔ یاد رکھو کہ تمہارے جانے سے میں بہل نہیں جاؤں گی۔ میں جانی کے سامنے ضرور آؤں گی۔ ایک آخری فیصلہ مجھے بھی اپنے طور پر کرنا ہوگا۔"

رخسانہ کا چہرہ بجھ گیا۔ اس کی آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے اب دم بھر میں رونے والی ہو۔ وہ آہستگی سے بولی "تم میرے خلاف محاذ بناؤ گی تو میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گی کیونکہ میرا شوہر ہی میرے قابو میں نہیں ہے۔ وہ میرے ہاتھ آتا ہے پھر گیلے صابن کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔ میں اسے پوری طرح قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ ابھی پانچ دن ہوئے کہ میں نے ساری باتیں اسے سچ سچ بتا دیں۔ تمہارا ذکر بھی کر دیا۔ اب مجھے امید ہو چلی تھی کہ وہ تمہارا خیال چھوڑ دے گا مگر ایسا نہیں ہوا لیکن میں ہمت ہارنے والی عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے خدا کی

ذات پر بھروسا ہے۔ میری پوزیشن اب ذرا مضبوط ہو گئی ہے۔ میرا بچہ ایک ایسی مضبوط زنجیر ہے جو میرے جانی کو مجھ سے باندھ کر رکھے گا۔ میں تم سے تھوڑی سی مہلت چاہتی ہوں۔ فرزانہ جہاں تم نے میرے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں کچھ دن اور صبر کر لو۔ اس کے سامنے نہ جاؤ، میری خاطر اپنے آپ کو چھپا لو۔"

"کب تک؟ میں کب تک منہ چھپا کر بیٹھی رہوں، آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے۔"

"ہاں ایک حد ہوتی ہے۔ میں تم سے چھ مہینے تک مہلت مانگتی ہوں۔"

فرزانہ نے چیخ کر کہا "چھ مہینے، یہاں ایک ایک لمحہ، ایک ایک صدی کی طرح گزر رہا ہے۔ میں کس کرب میں مبتلا ہوں تم نہیں سمجھ سکتیں۔ میں چھ مہینے منہ چھپا کر نہیں بیٹھ سکتی۔ مجھے اسپتال میں بھی ملازمت کرنی ہے۔ مجھے آزادی سے باہر نکلنا ہے۔"

"میری بہن یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تم چاہو تو برقع پہن کر سارے کام کر سکتی ہو۔ چھ مہینے کے لیے برقع پہن لو اور اس کے بعد پھر بے شک بے پردہ گھومتی رہنا۔"

"کیا اسپتال میں برقع پہن کر مریضوں کا علاج کروں گی۔"

"اسپتال کی بات اور ہے۔ جب اسپتال کے اندر پہنچ جاؤ تو ڈیوٹی کے وقت برقع اتار دینا۔ ایسے وقت اگر اتفاقاً بادشاہ جانی کا سامنا ہو گیا تو یہ میری بد قسمتی ہوگی، تمہارا کوئی قصور نہیں ہوگا لیکن جہاں تک احتیاط برت سکتی ہو، میری خاطر ایسا کر لو۔ میں پھر تم سے کوئی دوسری التجا نہیں کروں گی۔"

فرزانہ کو اپنے پیچھے اپنی امی کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی کہہ رہی تھیں "ہاں بیٹی رخسانہ کی بات مان لو۔ ابھی بادشاہ جانی کے سامنے جانے کی نہ سوچو، بے شک وہ تمہارے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ یہ بات ہمارے لیے تشویش ناک ہے لیکن یہ بھی دیکھو کہ اسے دوسری طرف بیوی اور نوزائیدہ بچے کی محبت مل رہی ہے۔ ازدواجی زندگی کی اپنی کشش ہوتی ہے۔ بیوی اور بچے کی محبت کا پلڑا اتنا بھاری ہوگا کہ وہ تمہیں رفتہ رفتہ بھولتا جائے گا۔ رخسانہ چھ مہینے کی بات کہہ رہی ہے تو چلو کوئی بات نہیں۔ برقعے میں وہ تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔ تم بھی اس کی نظروں سے محفوظ رہو گی۔ مان لو بیٹی۔"

فرزانہ نے ایک گہری سانس لے کر رخسانہ کو دیکھتے ہوئے کہا "آئندہ تقدیر کا مذاق

کیا ہوگا' یہ میں نہیں جانتی۔ میری اپنی کوشش یہی ہوگی کہ چھ ماہ تک بادشاہ جانی مجھے نہ دیکھ سکے اور تم فریادی بن کر میرے پاس دوبارہ نہ آؤ۔ تم جاسکتی ہو۔"

رخسانہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے محبت اور احسان مندی سے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ فرزانہ کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس نے بھی اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کچھ بھی ہو' ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بڑا وقت گزارا ہے۔ میں تمہارے دکھ سمجھتی ہوں۔ جس عورت کا سہاگ لٹ رہا ہو' وہ پاگل ہوجاتی ہے۔ تم تو پھر بھی حوصلے سے کام لے رہی ہو۔ میں تمہاری دوست ہوں' تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں جینے کا پورا موقع دوں گی۔ تم بھی اپنے طور پر کوشش کرو کہ بادشاہ جانی کے دماغ سے وہ جنون نکل جائے جس کی وجہ سے ہم سب پر تباہی آرہی ہے۔"

"فری تمہاری باتوں نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔ میں جارہی ہوں۔ پوری کوشش کروں گی کہ وہ تمہاری طرف نہ آئیں۔"

وہ جانے لگی۔ فرزانہ کی امی نے کہا "بیٹی' منے کو ہماری طرف سے پیار کرلینا۔"

"اچھی بات ہے خالہ جان۔"

وہ ان کو سلام کرکے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی فرزانہ کی امی نے کہا "یہ خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہے۔ ازدواجی زندگی میں اکثر ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مرد عورت سے منہ پھیر کر دوسری طرف بھاگتا ہے مگر کھونٹے سے بندھے ہوئے بیل کی طرح رسے کی لمبائی تک بھاگنے کے بعد واپس آجاتا ہے۔ رخسانہ کو اتنا اعتماد ہونا چاہیے کہ اس کی اور بچے کی محبت جانی کو کہیں نہیں جانے دے گی۔"

فرزانہ نے دل ہی دل میں کہا۔ صبح کے بھولے شام کو گھر آسکتے ہیں لیکن جانی کو تو ضدی بنادیا گیا ہے۔ محبت تو پہلے ہی ضدی ہوتی ہے۔ اوپر سے جانی کی ضد۔ اسے کوئی نہیں سمجھ سکے گا۔ صرف میں سمجھتی ہوں کیونکہ میں اس کی طلب ہوں۔

یہ سوچتے ہوئے وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی۔ باہر رخسانہ سڑک کے کنارے رکشا یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی۔ یوں تو فری منہ دیکھی باتیں کرتی ہے' وعدے کرلیتی ہے مگر کام بگاڑنے کے بعد وعدہ پورا کرتی ہے۔ میں نے شادی کے بعد کہا تھا کہ وہ برقع پہن کر رہا کرے لیکن اس نے میری بات نہیں مانی اب کہا

تو برقع پہننے کے لیے تیار ہوگئی۔ بہت چالاک ہے۔ پہلے جانی کو اپنی صورت دکھادی تاکہ وہ اسے ڈھونڈتا رہے۔ میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنا ہی مرد کمزور ہے اور مجھے کمزور بنارہا ہے۔

اس نے ایک رکشے کو روکا پھر اس میں بیٹھ کر جہانگیر روڈ کی طرف جانے لگی۔ راستے میں اس کے دماغ نے کہا اتنا ہی کافی ہے کہ فرزانہ چھ ماہ تک تعاون کررہی ہے اور برقع پہننے کے لیے راضی ہوگئی ہے پھر دل نے کہا اونہہ یہ بھی کوئی تعاون ہے۔ یہ تو آگ لگا کر بجھانے والی بات ہے۔ اگر وہ میری اتنی ہی ہمدرد ہے' اسے مجھ سے اتنی ہی محبت ہے تو پھر یہ ایک سیدھی سی بات ہے کہ شادی کرلے۔ جب وہ کسی کی ہوجائے گی تو بادشاہ جانی اس کے مطالبے سے دست بردار ہوجائے گا' اس کے پیچھے جائے گا ضرور' اس سے ملے گا' اسے دو چار کھری باتیں سنائے گا' شکایتیں کرے گا لیکن جب یہ دیکھے گا کہ وہ کسی کی بیوی بن چکی ہے تو بات ختم ہوجائے گی۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ فری شادی نہیں کرے گی۔ چونچلے دکھاتی رہے گی۔

وہ جہانگیر روڈ کے گیراج میں پہنچی' وہاں مستری چاچا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے رخسانہ کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا "بیٹی' جانی یہاں آیا تھا اور کہہ کر گیا ہے کہ وہ گھر جارہا ہے تم سے ملنے کے لیے۔ کیا اس سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں' میں انہیں تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ اب پتا چلا کہ وہ سوسائٹی کے ایک پولیس اسٹیشن میں ہیں یا شاید حوالات میں ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔ وہ ابھی میرے پاس آیا تھا۔ ایک سواری کو کہیں لے جارہا تھا۔"

"آپ نے ان سے پوچھا کہ وہ کل رات سے کہاں تھے؟"

"پوچھنا کیا ہے بیٹی' اس کا حلیہ دیکھ کر بہت سی باتیں سمجھ میں آگئی ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل چار بدمعاشوں سے اس کی لڑائی ہوگئی۔ اس نے انہیں خوب مارا۔ ان لوگوں نے بھی اس کی خوب پٹائی کی اس کا چہرہ سوج گیا ہے۔ چہرے پر اتنے زخم آئے ہیں کہ اچھی طرح پہچانا نہیں جاتا۔ ویسے اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہوچکی ہے اور اب وہ ٹیکسی چلارہا ہے۔"

رخسانہ نے پوچھا "لیکن وہ رات کو گھر کیوں نہیں آئے؟"

"آتا بھی کیسے، جانتی ہو ناکہ پینے کا عادی ہے۔ زخمی ہونے کے بعد اس نے شراب پی تھی پھر اولڈ کلفٹن کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے رات گزاری پھر صبح سے ٹیکسی چلانے لگا۔"

"چاچا، آج کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی ہے۔ لکھا ہے کہ کل ایک ٹیکسی ڈرائیور نے سوسائٹی کے ایک اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کے ساتھ بدتمیزی کی، اسپتال میں ہنگامہ برپا کیا جس کے نتیجے میں اسے پولیس کے حوالے کردیا گیا۔ بات مختصر سی شائع کی گئی ہے لیکن اس کے پیچھے کیا ہے، یہ آپ بھی سمجھ سکتے ہیں۔"

"ہاں سمجھ گیا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر فرزانہ تک پہنچ گیا ہے۔"

"نہیں چاچا، وہ لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کوئی دوسری عورت ہے۔ جانی دراصل فرزانہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ انہوں نے آپ سے بھی جھوٹ کہا ہے کہ غنڈوں سے لڑائی ہوگئی تھی۔ یقیناً اسپتال والوں نے ان کو مارا پیٹا ہے اور ان کی یہ حالت کی ہے۔ یا اللہ میں کیسے انہیں سمجھاؤں، کیسے انہیں عقل آئے گی۔"

"بیٹی، تم اسے کچھ سمجھانا چاہتی ہو، میں بھی تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔"

"آپ ضرور سمجھائیں، آپ بزرگ ہیں۔"

"یہاں نہیں بیٹی، تم اپنے گھر چلو، وہاں تمہاری والدہ اور والد ہوں گے۔ ان کی موجودگی میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"اگر آپ ابھی چل سکتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ بادشاہ جانی سے تو اب شام ہی کو ملاقات ہوگی۔"

"ہاں وہ شام کو گاڑی بند کرے گا۔"

وہ دونوں اسی رکشے میں بیٹھ کر ناظم آباد کی طرف جانے لگے۔ راستے میں مستری چاچا نے دو ایک بار کچھ بولنے کی کوشش کی پھر خاموش ہوگئے۔ آٹو رکشا اتنا شور مچاتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ باتیں کرنے والے ایک دوسرے کی بات آوازوں سے نہیں بلکہ اندازے سے سمجھتے ہیں۔ ہاں میں سرہلاتے رہتے ہیں۔ رکشے میں بیٹھ کر لاکھ اپنی تعریف کرے یا کسی کے خلاف لاکھ فریاد کرے۔ اس کی آواز محض نقار خانے

میں طوطی کی آواز بن کر رہ جاتی ہے۔ بادشاہ جانی بھی شور مچاتا جارہا تھا۔ فریاد کرتا جارہا تھا، مجھے لوٹا گیا ہے۔ مجھ سے میری محبت چھینی گئی ہے۔ میری محبت مجھے واپس کرو۔ مجھے اس کا پتا بتاؤ۔ وہ جہاں فریاد کرنے کے لیے جاتا تھا، وہاں ہر ہاں میں سرہلا دیا جاتا تھا جیسے اس کی بات کو سمجھا جارہا ہو۔ رخسانہ اسے تسلیاں دیتی تھی اور اپنی محبت کا سکہ جمانا چاہتی تھی۔ مستری چاچا بھی اس کی بات سن کر یوں جواب دیتے جیسے اس کی باتیں سمجھ رہے ہوں لیکن وہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل یہ سارے لوگ اپنے اپنے حالات کے آٹو رکشا میں سوار تھے اور بے حسی کا انجن اتنی اونچی آواز میں چنگھاڑ رہا تھا کہ بادشاہ جانی کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

رخسانہ کی امی نے مسکرا کر مستری چاچا کا استقبال کیا۔ انہیں عزت سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہاں فرید احمد تاش کے پتوں سے کھیل رہے تھے۔ ان سے مصافحہ کیا پھر پوچھا "آپ سارا دن تاش کھیلتے رہتے ہیں؟"

رخسانہ کی امی نے ناگواری سے کہا "کیا بتائیں بھائی صاحب، میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔ بس ان کا یہی مشغلہ ہے۔ محنت ان سے نہیں ہوتی۔ گھر کا کام ان سے نہیں ہوتا۔ گھر ہو یا باہر ہو، ہر جگہ مجھے ہی دوڑنا پڑتا ہے۔"

مستری چاچا نے گہری سنجیدگی سے فرید احمد کو دیکھا پھر کہا "جہاں مرد اپنے گھریلو مسائل میں دلچسپی نہیں لیتے اور تمام ذمے داریاں عورتوں پر چھوڑ دیتے ہیں تو وہ عورت تھک ہار کر بعض اوقات غلط فیصلے کرنے لگتی ہے۔ ایسے گھروں میں ایک مسئلے کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے مسائل پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

رخسانہ کی امی نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "بھائی صاحب، میں یہ نہیں مانتی کہ عورت تھک ہار کر غلط فیصلے کرتی ہے۔ میرا گھر دیکھئے، میں نے کبھی گھریلو معاملات میں کوئی غلطی نہیں کی۔"

"یہی تو بات ہے بہن، اپنی غلطی اگر سمجھ میں آجائے تو آدمی غلطی کیوں کرے کیا آپ نے جانی کی دلہن بدل کر دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ کیا یہ غلطی نہیں ہے۔"

ان کی باتیں سن کر سب کو چپ لگ گئی۔ انہوں نے کہا "میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ جانی کے ساتھ ایسا کیوں کیا گیا۔ میرے پاس بھی تھوڑی سی عقل ہے۔ رخسانہ بیٹی کے

چہرے کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہوں کہ ایسے میں کہیں سے رشتے نہیں آتے۔ ایسے میں جانی جیسے لوگ ہی ملتے ہیں۔"

رخسانہ نے تلملا کر کہا "چاچا' آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ اس سے جانی کی توہین ہوتی ہے۔ جیسے جیسے لوگ ملنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ جانی گرے ہوئے شخص تھے' نہیں وہ بہت اچھے ہیں۔ ان میں کوئی کمی نہیں تھی۔ کوئی عیب نہیں تھا۔ کوئی چھوٹا پن نہیں تھا۔ میں نے انہیں بہت سوچ سمجھ کر قبول کیا ہے۔"

مستری چاچا نے خوش ہو کر کہا "جیتی رہو بیٹی' عورت کو ایسا ہی شوہر پرست ہونا چاہیے اور کہیں بھی کسی سے بھی اپنے شوہر کے خلاف ذرا سی بھی بات نہیں سننی چاہیے۔ میں تمہارے پیٹھ پیچھے بھی جانی کے سامنے تمہاری تعریف کرتا رہتا ہوں مگر بیٹی' یہ جو کچھ بھی ہوا' یہ بہت برا ہوا۔"

رخسانہ کی امی نے ہاتھ نچا کر کہا "بھائی صاحب' یہ جو رخسانہ کے ابو بیٹھے ہوئے ہیں نا۔ یہ انہی کی کارستانی ہے۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ یہ غلط مشورہ انہوں نے ہی دیا تھا کہ صورت کسی کی دکھائی جائے اور دلہن ہماری بیٹی کو بنایا جائے۔ ہمارے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے ان کی بات مان لی۔"

فرید نے تاش کے پتوں کو میز پر پھینکتے ہوئے مستری چاچا سے کہا "بھائی صاحب آپ میری بھی کچھ سن لیں۔ ہمارا سارا گھر پریشان تھا۔ میری بیٹی کے چہرے کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ساری عمر کا داغ تھا۔ ہماری دنیا میں گناہ کے جو داغ ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے اور پارسائی بڑی آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے لیکن چہرہ تو سائن بورڈ ہوتا ہے وہاں اگر ذرا سا بھی دھبا پڑ جائے تو وہ مٹایا نہیں جا سکتا ہے البتہ اسے چھوٹی چھوٹی پٹیوں سے چھپایا جا سکتا ہے جیسے میری بیٹی نے چھپا رکھا ہے لیکن پھر بھی معلوم تو ہوتا ہی ہے کہ اس کے پیچھے بدنما داغ ہے۔ تو ہم چہرے کو نہیں چھپا سکتے تھے اس لیے ہم نے اس کے چہرے پر اپنی ایک پڑوسن لڑکی فرزانہ کا چہرہ لگا دیا سائن بورڈ کے طور پر اسے استعمال کیا اور دلہن اسے بنا دیا۔ میں تاش کا کھلاڑی ہوں۔ جب دیکھتا ہوں کہ بازی ہار رہا ہوں تو آنکھ بچا کر پتے بدل دیتا ہوں۔ بس یہی بات میرے دماغ میں آئی کہ پتہ بدل دینا چاہیے۔"

"اس کے بعد ہار مقدر بن جائے تو آپ کیا کریں گے؟ بادشاہ جانی کو سب کچھ معلوم

ہو چکا ہے۔ آپ کی بیٹی اس وقت بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہوئی ہے اور وہ کسی وقت بھی دھماکے سے اڑ سکتی ہے ازدواجی زندگی ابھی برباد تو نہیں ہوئی مگر خوش حال بھی نہیں رہی۔ اب آپ اس کا کیا علاج کریں گے؟ کس طرح بادشاہ جانی کو قابو میں کریں گے؟ کس طرح اسے سمجھائیں گے کہ وہ فرزانہ کے پیچھے نہ بھاگے؟ اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔ وہ تو اسی صورت کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ جو آپ نے دکھائی تھی۔"

رخسانہ کی امی نے کہا "بھائی صاحب اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے جو سہارا ہاتھ آتا ہے اسی کو تھام لیا جاتا ہے۔ ہم اندھیرے میں بھٹک رہے تھے سہارے کے لیے جانی ملا تو ہم نے اسے پکڑ لیا۔ یہ تو روشنی ہونے کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ سہارا مستحکم ہے یا نہیں؟"

رخسانہ نے کہا "چاچا' وہ برے نہیں ہیں۔ ہمارے جھوٹ اور دھوکے بازی نے انہیں جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔ آپ چاہیں تو میری بگڑی بنا سکتے ہیں وہ آپ کی بے حد عزت کرتے ہیں اور آپ کی بات مانتے ہیں۔"

"کون کسی کی بات سمجھتا ہے بیٹی۔ ابتدائے تہذیب سے آج تک کتنے ہی پیغمبر' کتنے ہی اولیاء اور کتنے ہی داناؤں نے انسانوں کو سمجھایا جتنا وہ سمجھاتے ہیں انسان اتنا ہی بگڑ جاتا ہے شاید اس لیے کہ انسان کی فطرت میں ضد ہے جس بات سے روکا ٹوکا جاتا ہے وہ وہی کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ جانی کو فرزانہ کے قرب سے روکا جا رہا ہے یہ تو اسے ضد دلانے والی بات ہے۔ بہرحال میں یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ تم لوگوں کی غلطیوں کی نشان دہی کروں اور جانی کی وکالت کروں۔ میں کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ تمہاری ازدواجی زندگی برباد ہو لیکن بیٹی میں آج ایک بہت ہی تلخ بات کہنے کے لیے آیا ہوں۔ تمہیں اور تمہارے والدین کو میری باتیں بہت ہی بری لگیں گی۔ میں اپنی بات کہنے کے بعد چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا جو کچھ کہوں گا اس پر تم لوگ عمل کرو گے یا نہیں کرو گے اس پر غور کرنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا تم لوگوں کا کام ہے۔ میں تو راستے کی نشان دہی کروں گا۔"

رخسانہ کی امی نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "ہاں بھائی صاحب' ہم یہ جانتے ہیں کہ آپ کوئی اچھا راستہ دکھائیں گے۔"

"اچھے راستے کی نشان دہی کون نہیں چاہتا ہے۔ میرے بتانے سے آپ اس پر چل سکیں گی؟"

"ہاں، ہم ضرور اس پر چلیں گے۔"

"تو پھر حوصلہ رکھ کر یہ بات سن لیں کہ آپ لوگوں نے اپنی بیٹی کا جو نکاح جانی سے پڑھایا ہے وہ شاید جائز نہیں ہے اور آپ کی بیٹی ایک برس دو مہینے سے شاید ناجائز رشتے میں الجھی ہوئی ہے۔"

رخسانہ کی امی نے ناگواری سے کہا "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"میں درست کہہ رہا ہوں۔ میرا اور آپ لوگوں کا فرض ہے کہ کسی اچھے عالم دین سے رجوع کریں انہیں اپنے حالات بتائیں اور سچ سچ کہہ دیں کہ لڑکے کو اندھیرے میں رکھ کر، دھوکا دے کر، کسی دوسری لڑکی کو دکھا کر آپ کی اس لڑکی کے ساتھ نکاح پڑھایا گیا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟"

رخسانہ کی امی نے کہا "جائز کیوں نہیں ہے ہم نے باقاعدہ ان کا نکاح پڑھایا ہے۔"

"بے شک آپ نے ایسا کیا ہے لیکن مذہبی اصول و ضوابط کے مطابق اور شریعت کی رو سے یہ نکاح ہوا یا نہیں اس کا فیصلہ کوئی عالم ہی کر سکتا ہے۔ آپ جلد از جلد کسی عالم سے رجوع کریں ورنہ یہ سمجھ لیں کہ آپ بہت بڑے گناہ کی مرتکب ہو رہی ہیں۔"

رخسانہ کی امی اچھل کر کھڑی ہو گئیں "آپ اس بڑھاپے میں کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہیں۔ جب مولوی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ نکاح نامہ ہمارے پاس موجود ہے۔ سارا محلہ اس بات کا گواہ ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں تو آپ اس رشتے کو ناجائز کہنے والے کون ہوتے ہیں؟"

"میں تو کوئی نہیں ہوتا۔ ایک عقل کی بات میرے دماغ میں آئی۔ وہ میں نے کہہ دی۔ آپ کو مشورہ دے رہا ہوں اور بار بار کہہ رہا ہوں کہ کسی عالم دین سے جا کر رجوع کریں۔"

رخسانہ نے کہا "چاچا کیا آپ نے یہ بات بادشاہ جانی کے سامنے کہہ دی ہے؟"

"نہیں۔ پہلے میں تم سے اور تمہارے والدین سے ہی یہ بات کرنے آیا ہوں۔"

رخسانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آئی پھر قدموں میں گر پڑی۔ ان کے پاؤں پکڑ کر بولی "آپ کو خدا رسول کا واسطہ، آپ کو میری مجبوریوں اور میرے اس بگڑے چہرے کا واسطہ، جانی سے یہ بات نہ کہیں ورنہ میں کہیں کی نہیں رہوں گی ابھی تو وہ میرے رشتے میں اور بچے کی محبت میں بندھے ہوئے ہیں جب رشتے کے جائز یا ناجائز ہونے کی بات ان کے کانوں تک پہنچے گی تو وہ بے لگام ہو جائیں گے پھر کسی کے قابو میں نہ رہیں گے۔"

مستری چاچا نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا "بیٹی مجھے خدا کو منہ دکھانا ہے۔ میں کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں کہ تمہاری زندگی بھی برباد نہ ہو اور ازدواجی رشتہ بھی جائز ہو۔ اگر تم سے بھلائی مقصود نہ ہوتی تو یہ باتیں پہلے جانی سے کہتا۔ میں جانتا ہوں، وہ سر پھرا ہے۔ اسے تمہیں چھوڑنے اور فرزانہ کو اپنانے کا ایک بہانہ مل جائے گا۔ میں اس کی محبت کے خلاف نہیں ہوں کیونکہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ میں تمہارے خلاف بھی نہیں ہوں جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد تم ایسی لڑکی ہو جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ تمہاری وفاداری، خدمت گزاری، محبت، سلیقہ سب کچھ ایسا ہے کہ مجھ جیسا آدمی تمہارے خلاف کوئی قدم اٹھا ہی نہیں سکتا ہے۔ تم اطمینان رکھو، بیٹی، میں یہاں مشورے کے لیے آیا ہوں، سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔ کسی عالم دین سے رجوع کرو گی تو تمہاری بھلائی ہوگی۔ جب ہم سارے مسلمان سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں اور دعا مانگتے وقت اپنے خدا سے کہتے ہیں کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا تو تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تم نے یا تمہارے والدین نے جو غلطی کی ہے کوئی عالم ہی ایسا راستہ دکھا سکتا ہے جس سے اس غلطی کی تلافی ہو جائے گی۔"

رخسانہ کی امی نے پریشان ہو کر پوچھا "بھائی صاحب آپ بڑی عقل کی باتیں کرتے ہیں آپ کی سمجھ میں آتا ہو تو بتائیں اس کی بھلائی اب کیسے ہوگی۔ اگر کسی عالم دین نے یہ کہہ دیا کہ نکاح ناجائز ہے تو پھر میری بیٹی کہیں کی نہیں رہے گی۔"

"بس ایک موٹی سی بات میری عقل میں آتی ہے اور وہ یہ کہ جب یہ نکاح ناجائز ثابت ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رخسانہ اور جانی کے درمیان نکاح ہوا ہی نہیں، نکاح نہیں ہوا تو دوسری بار نکاح پڑھایا جا سکتا ہے پھر سے ایک بار نکاح ہو جائے گا تو

رخسانہ جانی کو اچھی طرح سمجھ کر اور جانی رخسانہ کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر قبول کریں گے۔"

"بھائی صاحب! یہی تو مصیبت ہے' جانی کو جب یہ معلوم ہوگا کہ نکاح ناجائز ہے اور دوسری بار پڑھایا جائے گا تو پھر وہ فرزانہ سے نکاح پڑھانے کے لیے دوڑتا چلا جائے گا۔ ہم تو اسے پکارتے ہی رہ جائیں گے۔"

"بس اسی لیے تو میں نے جانی کے کانوں میں یہ بات نہیں ڈالی ہے ہم سب چپ چاپ کسی عالم دین سے ملیں گے ان سے مشورہ کریں گے پھر ہم فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے لیکن پہلے تصدیق تو ہو کہ موجودہ نکاح جائز ہے یا نہیں' اگر ناجائز ہے تو یہ بڑی بری بات ہے اسے تہذیب گوارا نہیں کرتی اور مذہب برداشت نہیں کرتا۔ جب ہم خود کو مسلمان کہتے ہیں تو کیا ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ ہم مذہب کی آڑ میں ناجائز رشتوں کا کھیل کھیلتے رہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میری باتوں پر غور کریں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ گئے۔ فرید احمد نے اٹھتے ہوئے کہا "بھائی صاحب کہاں جارہے ہیں۔ کچھ ٹھنڈا گرم تو پیتے جائیں۔"

"پھر کسی وقت سہی۔ میں کل صبح آؤں گا اور آپ لوگوں کو کسی عالم دین کے پاس لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ چلنا منظور ہو تو اچھی بات ہے ورنہ میں تنہا ہی جاکر اس بات کی تصدیق کروں گا۔ میرے دماغ میں جو کانٹا کھٹک رہا ہے اسے نکالے بغیر مجھے سکون نہیں ملے گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے باہر جانے کے بعد تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ رخسانہ کی امی کھلے ہوئے دروازے سے باہر کی طرف دیکھتی رہیں جب انہیں یقین ہوگیا کہ مستری چاچا دور جاچکے ہیں تو انہوں نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے کہا "بوڑھا' خبیث' اب مذہبی مسئلہ نکال لایا ہے۔ میری بیٹی کی زندگی اچھی گزر رہی ہے۔ یہ ایک بچے کی ماں بن گئی ہے تو اب جائز اور ناجائز کا مسئلہ اٹھا رہا ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس بڈھے کے منہ سے سارے دانت نکال لوں اور زبان کھینچ لوں تاکہ بولنے کے قابل ہی نہ رہے۔"

فرید احمد نے کہا "غصہ تو مجھے بھی آرہا تھا لیکن بیچ میں مذہب آجائے تو غصہ نہیں دکھایا جاسکتا۔ دکھائیں تو جوتے پڑتے ہیں لیکن ہوتا یہی ہے ہمارے شہر میں' ہمارے ملک میں' ہماری دنیا میں' کہاں ناجائز کام نہیں ہوتے' ہر جگہ ہوتے ہیں مگر چھپا کر ہوتے ہیں اس لیے جائز ہوتے ہیں۔"

رخسانہ کی امی نے کہا "چھپا کر کہاں' کھل کر ناجائز کام ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کو پکڑنے والا نہیں ہے۔ یہ جو شہر شہر حسن کے بازار لگے ہوئے ہیں' شراب خانے ہیں' جوئے کے اڈے قائم کیے گئے ہیں' رشوت لی جاتی ہے' اسمگلنگ کی جاتی ہے' چور بازاری ہوتی ہے' ناجائز منافع خوری ہوتی ہے تو ان باتوں کو کون نہیں جانتا مگر کون پکڑتا ہے' صرف ہم جیسے چھوٹے اور مجبور لوگ پکڑے جاتے ہیں کیونکہ ہم اپنی بیٹیوں کے سر پر سہاگ کا آنچل رکھتے ہیں' کوئی بھی مذہبی' اخلاقی' تہذیبی' سماجی ذرائع سے یہ نہیں بتا سکتا کہ کسی کو ہسٹریا کا مرض ہوجائے اور وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر' ننگی ہوکر گھر سے باہر نکل جائے تو یہ تماشا بہتر ہوگا یا یہ تھوڑا سا فریب مناسب ہے کہ دھوکا دے کر کسی طرح اس کی شادی کردی جائے۔ یہی ایک علاج ہوتا ہے۔ میری بیٹی جیسی لڑکیاں جن کا کوئی چارہ نہیں ہوتا ان کے پاس دھوکے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہوتا مگر ان باتوں کو کون سمجھے گا۔ یہ مستری صاحب تو ہمارے پاس محض دین ایمان کی باتیں کرنے آگئے ہیں۔ دیکھ لینا یہ ہمیں کسی مولوی کے پاس لے جاکر پھنسا دیں گے اور ہمیں گناہگار ثابت کردیں گے لیکن یہ گناہ بھی ہوا تو اس گناہ کو دھونے اور میری بیٹی کا گھر آباد کرنے کا کوئی راستہ..... تک نہیں ہے ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

○☆○

رخسانہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی "میں کیا کروں؟ ہائے میں کیا کروں؟ میں مرجاؤں گی مگر اپنے بچے کی ماں کو کیسے ماروں؟ اب اکیلی تو نہیں رہی' میرا جینا مرنا صرف میرے لیے نہیں رہا میری زندگی میرے بچے کے لیے ہے' میرے شوہر کے لیے ہے۔ میں اپنے شوہر کو کیسے سمجھاؤں' میں دنیا کو کیسے سمجھاؤں کہ رشتے اگر دل سے قبول کیے جائیں اور خدمت گزاری سے جیت لیے جائیں تو پھر ناجائز نہیں رہتے لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی اور میرا گھر اجاڑ دیا جائے گا۔ مستری چاچا نے جو بات

آگے بڑھائی ہے اس کے بعد نہ میں بیوی رہوں گی نہ بیوہ۔ نہ سہاگن رہوں گی نہ ستر
میرا کوئی چہرہ نہیں رہے گا۔ کوئی نام نہیں ہوگا۔ جانی سے کوئی رشتہ نہیں ہوگا۔"

یہ کہتے ہی وہ دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر سے ہٹا کر ایک دم سے تن کر کھڑی ہو گئی پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولی "کیوں نہیں ہوگا۔ میں ضرور عالم کے پاس جاؤں گی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں دیکھوں گی کہ دنیا والے میرے تمام رشتوں کو ناجائز کہنے کے بعد ایک ماں کو اس کے بیٹے کے ساتھ ناجائز کیسے کہہ سکتے ہیں۔ میں ماں ہوں۔ میں اس بچے کو گود میں لے کر ساری دنیا سے جانی کے لیے لڑ جاؤں گی۔"

اس کے دانت پر دانت جمے ہوئے تھے۔ دیدے پھیلے ہوئے تھے چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کی بھنچی ہوئی مٹھی جیسے ساری دنیا کو گھونسا دکھا کر کہہ رہی تھی' آؤ اور ایک بچے کی ماں سے اس کے شوہر کو چھین کر دکھاؤ۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ کس میں کتنا حوصلہ ہے۔

○☆○

بادشاہ جانی کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ چہرے پر جا بجا چھوٹی چھوٹی پٹیاں چپکی ہوئی تھیں۔ سوجن کم ہو گئی تھی۔ پچھلی شام بدن میں بڑا درد تھا۔ چلنے پھرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن اولڈ کلفٹن میں پہنچ کر اس نے چمپی والے سے اپنے پورے بدن کی مالش کرائی تھی پھر نشے میں سو گیا تھا۔ صبح اٹھ کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا ایک بار دل نے کہا۔ گھر جانا چاہیے۔ دوسری بار دل نے کہا' نہیں جانا چاہیے امید نے اسے ترغیب دی تمام دن گاڑی چلاتے رہو۔ کہیں نہ کہیں اسے پا لو گے۔

وہ گاڑی چلاتا رہا۔ دوپہر سے پہلے مستری چاچا سے ملاقات ہوئی اس نے انہیں بتایا کہ چند بدمعاشوں سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس لیے چہرہ ذرا بگڑ گیا ہے اس نے کہا تھا کہ وہ دوپہر کو گھر جا کر آرام کرے گا لیکن دوپہر کو امید نے پھر بھڑکایا۔ اسے سواری ملتی رہی وہ ٹیکسی چلاتا رہا۔ پہلے اس کی نظریں ونڈ اسکرین کے پار جمی رہتی تھیں اور دھیان آس پاس رہتا تھا۔ اب دھیان ونڈ اسکرین کے پار ہوتا تھا تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو اور نظریں آس پاس فٹ پاتھوں پر ہوتی تھیں۔ کوئی فرزانہ جیسی قد و قامت کی لڑکی گزرتی ہوئی نظر آتی تو

وہ گاڑی کی رفتار دھیمی کر لیتا۔ اسے توجہ سے دیکھتا پھر مایوس ہو کر گاڑی آگے بڑھا دیتا تھا۔

شام کو وہ ایک سواری لے کر مینا بازار کی طرف آیا۔ وہاں جھورے پینٹر سے سامنا ہو گیا۔ جھورے نے قریب آ کر کہا "استاد اب سے ایک ڈیڑھ برس پہلے تم نے مجھ سے بڑی سخت بات کہہ دی تھی۔ تمہاری یہ بات اب تک میرے دل میں چبھ رہی ہے کہ شعر لکھنے کے بعد میں اپنے گھر کی کسی عورت کو تمہاری ٹیکسی میں بٹھا دوں۔ اس وقت تمہاری بات بری لگی تھی مگر پھر میں نے توبہ کر لی۔ اب میں کسی گاڑی میں سستے جذبات والا شعر نہیں لکھتا ہوں۔"

بادشاہ جانی نے ٹیکسی سے باہر آ کر اس کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھا پھر کہا "ہماری گاڑی میں دوسروں کی مائیں بہنیں بیٹھتی ہیں اس لیے ہمیں اوچھے قسم کے شعر نہیں لکھنے چاہئیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جب ان شعروں کا حملہ ہماری ماں بہن بیٹی پر ہوتا ہے تو پھر ہم تلملانے لگتے ہیں۔"

جھورے نے کہا "میں نے ایک شاعر سے پوچھا تھا۔ بھائی شاعری کیوں کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ شاعر کسی کو شکار نہیں کرتا بلکہ وہ نازک احساسات کو زبان دیتا ہے۔ خوشبو کو کسی نے نہیں دیکھا لیکن شاعر خوشبو کی تصویر اتار لیتا ہے۔ ایسا کون ہے جو دکھی نہیں ہوتا مگر ہر شخص اپنے دکھ کو بیان نہیں کر سکتا۔ جب شاعر اس کی تڑپ کو' اس کی کسک کو بیان کرتا ہے تو پڑھنے والا بے اختیار کہہ دیتا ہے۔ ہاں یہی ہمارے دل کی بات ہے اور اسی کو شاعری کہتے ہیں۔"

جانی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "میرے دل میں بھی اتنا درد ہے' اتنی تڑپ ہے کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی شاعر ہو جو میرے دل میں اتر کر میری تلاش کو وہاں سے نکالے اور شہر کی تمام سڑکوں پر پھیلا دے پھر وہ جہاں جہاں سے گزرے گی اسے میرے پاؤں کے چھالے نظر آتے رہیں گے۔"

"مگر استاد تم تو ٹیکسی میں بیٹھ کر سواری ڈھونڈتے رہتے ہو تمہارے پاؤں میں چھالے کیسے پڑیں گے؟"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ چھالے پاؤں میں پڑیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے اس کے

متعلق سوچتے سوچتے میرے دماغ میں چھالے پڑنے لگے ہیں۔"

جھورے نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری حالت پر ترس آتا ہے میں جہاں بیٹھتا ہوں وہاں یار دوستوں سے یہی سنتا ہوں کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی۔ ایک تم ہی ہو جو اس دھوکے کو برداشت کر رہے ہو بلکہ گلے لگا رکھا ہے کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک اسے ٹھوکر مار چکا ہوتا۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا "نہیں جھورے' ایسے مت بول۔ اب وہ میری شریک حیات ہے۔ میری عزت ہے' میرے بچے کی ماں ہے اس کے لیے ایسی باتیں زبان پر مت لانا' نہیں تو مجھ کو غصہ آجائے گا۔"

"استاد' تم سمجھ میں نہیں آتے۔ بیوی سے اتنا پیار کرتے ہو۔ اس کی عزت کرتے ہو اور دوسری کو تلاش کرتے رہتے ہو۔ مستری چاچا بھی یہی کہہ رہے تھے کہ تم آدھے پاگل ہو چکے ہو۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "مستری چاچا بہت سمجھ دار ہیں۔ شاید انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ میں واقعی پاگل ہو رہا ہوں۔ ان کی بات کو میں جھٹلا نہیں سکتا۔"

"استاد ایک بات بتاؤ۔ تم اپنی گھر والی کو بہت چاہتے ہو۔ بہت محبت کرتے ہو پھر دوسری کو کیوں ڈھونڈ رہے ہو۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے بھی محبت ہو اور اس سے بھی محبت ہو۔"

جانی نے دل ہی دل میں سوچا! ہاں میں اسے کیوں ڈھونڈتا ہوں؟ کیا ایسا ہوتا ہے کہ دونوں ہی سے محبت ہو؟ اس نے جھورے سے کہا "ایسا تو ہو رہا ہے۔ میرے ساتھ ہو رہا ہے اور میں نے کتنے ہی لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ گھر میں بیوی سے محبت کرتے ہیں بہت زیادہ محبت کرتے ہیں مگر باہر ایک محبوبہ ضرور پالتے ہیں۔ محبوبہ نہ ملے تو آنے جانے والیوں پر نظریں ڈالتے ہیں کہ شاید کوئی محبوبہ بن جائے اور جب بن جاتی ہے تو اس سے بھی اسی طرح محبت کرنے لگتے ہیں جیسے بیوی سے کرتے ہیں۔"

جھورے نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "استاد' مگر یہ اچھی بات نہیں ہوتی ہے۔ جب ہم اپنی گھر والیوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ صرف ہمیں چاہیں تو پھر ہم کسی دوسری کو کیوں چاہتے ہیں۔ دیکھو نا' تم نادان نہیں ہو' سمجھ دار ہو۔ خود اپنے دل سے فیصلہ کرو کہ

محبت کسی ایک سے ہوتی ہے یا نہیں؟ دل کی گہرائیوں سے جو محبت ہوتی ہے وہ دوسری کو نہیں دی جاتی۔ اب تم فیصلہ کر کے بتاؤ کہ وہ جو دل کی گہرائیوں سے محبت ہوتی ہے تو وہ کس سے ہے۔ گھر والی سے یا دوسری سے؟"

"میں بہت سوچتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر ٹھیک طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ میری بیوی بہت اچھی ہے۔ بہت پیاری ہے۔ وہ اتنی اچھی باتیں کرتی ہے' مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے' میرے لیے اتنے پیارے پیارے سے بیٹے کو جنم دیا ہے کہ میں اس سے نفرت کرنے یا اسے چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"ہاں' اسی کو محبت کہتے ہیں کہ جسے چھوڑا نہ جا سکے' جس کی قدر کی جائے اور جسے وفاداری' خدمت گزاری کا صلہ دیا جائے اور باہر دوسرے لوگوں میں اس کی تعریفیں کی جائیں جیسا کہ تم میرے سامنے کر رہے ہو۔ تم اپنی گھر والی سے بے شک محبت کرتے ہو' مگر وہ دوسری؟"

جانی نے ایک حسرت بھری سانس لی "آہ' وہ دوسری سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں اسے غصے سے ڈھونڈ رہا ہوں' اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں مگر رات کی تنہائی میں بستر پر لیٹ کر اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو اندر سے کمزور پڑ جاتا ہوں۔ میں اس سے انتقام نہیں لے سکتا۔ دل کہتا ہے میں اس کی محبت کو تلاش کر رہا ہوں۔ میرے اندر یہ جاننے کی بے چینی ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں کرتی تھی تو آخری بار مجھ سے بچھڑتے وقت کیوں رو رہی تھی۔ کیوں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہماری آج کی ملاقات اتنی طویل ہو کہ ختم نہ ہو سکے۔ اس کی باتیں' اس کی چاہت اس کا انداز' یہ سب کچھ ایسا ہے کہ مجھے اس کی طرف کھینچ کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اس کھینچنے کے انداز کو کیا کہتے ہیں۔ اس کشش کو محبت ہی کہا جاتا ہے نا؟"

"استاد' تم کام سے گئے۔ ادھر بھی محبت' ادھر بھی محبت۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ تمہیں کسی ایک نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔ کوئی ایک فیصلہ کرنا چاہیے۔ دیکھو نا' جب تم اتنی شرافت سے سوچتے ہو کہ پرائی بہو بیٹیوں کی عزت کرنا چاہیے۔ ان کے سامنے کوئی بھی اوچھے قسم کا شعر نہیں پڑھنا چاہیے نہ لکھنا چاہیے تو پھر اسی شرافت سے یہ بھی سوچو

کہ وہ جو دوسری ہے' وہ بھی تو کسی کی بہن یا بیٹی ہے' کیوں اسے ڈھونڈ رہے ہو؟ استاد اگر اس پہلو سے سوچو گے تو شاید کوئی بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا "جب تک وہ مجھے نہیں ملے گی۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہاں ایک بات ہے ہم کسی کو چاہتے ہیں۔ اگر وہ ہمیں نہ چاہے تو ہم اس سے زبردستی نہیں کرسکتے۔ اسی طرح میں جس کو تلاش کررہا ہوں وہ مل جائے اور مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ مجھے نہیں چاہتی ہے۔ وہ مجھ سے بچ بچ کترا رہی ہے۔ تو میں کتنے دنوں تک اس کا پیچھا کروں گا؟ آخر تھک ہار کر اس کا خیال چھوڑ دوں گا۔ اس سے زبردستی تو نہیں کروں گا مگر وہ ملے تو سہی۔ یہ دل کے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔ یہ تو ختم ہوجائے مگر وہ ملتی ہی نہیں ہے۔"

جھورے نے تائید میں سر ہلا کر کہا "ٹھیک کہتے ہو استاد' اگر وہ مل جائے اور تم سے صاف صاف کہہ دے کہ اس نے غلطی کی تھی اور وہ اس پر شرمندہ ہے اور تم اب اس کا پیچھا نہ کرو۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم اس کا پیچھا نہیں کروگے مگر اس کا ملنا بہت ضروری ہے استاد اسے کسی طرح ڈھونڈ نکالو۔"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا کیسے ڈھونڈوں؟ صبح سے شام تک ٹیکسی چلاتا ہوں۔ شہر کی تمام لڑکیاں نظر آتی ہیں لیکن وہ نظر نہیں آتی۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظر کیوں نہیں آتی۔ کیا وہ گھر کی چار دیواری میں چھپی رہتی ہے۔ ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ کسی نہ کسی کام سے نکلتی تو ہوگی۔"

"ہاں نکلتی ہے اسی لیے تو ایک بار ایمپریس مارکیٹ کے سامنے نظر آگئی تھی۔"

"کب نظر آئی تھی؟"

"یہی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔"

"پھر تو استاد اب بھی نظر آئے گی۔ وہ تم سے ڈر گئی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس نے دھوکا دیا ہے تو تم سے مار کھائے گی۔؟"

جانی نے خلا میں دیکھا' اپنی آنکھوں کے سامنے وہ اسے رکشے میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔ اسے رکنے کے لیے کہہ رہا تھا پھر اس نے جھورے سے کہا "نہیں جھورے اسے مجھ سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ جب وہ مجھے نظر آئی تھی تو میں اسے محبت

سے پکار رہا تھا۔ دیوانہ وار اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ نادان نہیں ہے۔ اسے میری محبت اور دیوانگی کو سمجھ لینا چاہیے۔ مجھ سے ڈرنا نہیں چاہیے۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ وہ ڈر رہی ہے اور چھپ رہی ہے۔ ہاں ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ تم سے چھپنے کے لیے اب شاید وہ برقع پہننے لگی ہو۔"

بادشاہ جانی نے چونک کر دیکھا۔ کچھ سوچا پھر انکار میں سر ہلا کر کہا "نہیں وہ برقع نہیں پہن سکتی۔"

"برقع پہننے میں اس کا نقصان بھی کیا ہے بلکہ اس کا فائدہ ہے' وہ تم سے چھپی رہے گی۔ تمہارے سامنے سے بھی گزرے گی تو تمہیں معلوم نہیں ہوگا۔"

وہ مایوس ہوکر بولا "ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔ جھورے میری گاڑی کے ڈیش بورڈ پر کوئی شعر لکھ دے۔ میں اسے نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ نقاب کے پیچھے سے وہ شعر پڑھ سکے گی۔ میری بے چینی اور میری تلاش کو سمجھے گی۔"

"تم تو شعر کے خلاف ہو۔"

"ہاں خلاف تو ہوں مگر تم جو بھی شعر لکھو اس میں فرزانہ کا نام لکھ دینا۔ اس طرح یہ معلوم ہوجائے گا کہ وہ شعر صرف فرزانہ کے لیے ہے۔ کسی دوسری بہو بیٹی کے لیے نہیں ہے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا "ہاں اس طرح لکھ دینے سے دوسروں کے لیے بے ہودگی نہیں ہوگی۔ استاد جس طرح تم اسے تلاش کررہے ہو۔ بستی بستی جاتے ہو' شاہراہوں پر ڈھونڈتے ہو۔ کبھی گلیوں میں جاکر تلاش کرتے ہو اس کی مناسبت سے ایک بہت ہی اچھا سا مگر بڑا ہی مختصر سا شعر ہے سنو۔

تو نگر نگر ہوگی
میں ڈگر ڈگر ڈھونڈوں

جانی نے شعر کو سنا تو بالکل اپنے دل کی بات لگی۔ واقعی وہ کسی نگر میں ہوگی؟ خود کو چھپانے کے لیے ایک نگر سے دوسرے نگر چلی جاتی ہوگی اور وہ ڈگر ڈگر ایک ایک سڑک' ایک ایک گلی میں ڈھونڈ رہا تھا۔

"استاد اس شعر کے آگے میں فرزانہ کا نام لکھ دوں گا۔"

اس نے کہا "شعر تو بہت اچھا ہے۔ میرے دل کی بات کہتا ہے مگر کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔ دیکھو نا' وہ پتا نہیں کہاں ہوگی اور میں ہوں کہ کہاں کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں جہاں وہ ہوگی' وہاں ڈھونڈتا تو شاید وہ مل جاتی مگر یہی پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے اور میں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں۔ اس طرح کی کوئی بات لکھ دو۔

فرزانہ تم کہاں ہو۔
جانی کہاں ڈھونڈے۔

"استاد یہ شعر تو نہ ہوا مگر ہاں دل کی بات ہوگی بولو تو یہی لکھ دیتا ہوں۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ شعر میں فرزانہ کا نام بھی آجائے گا اور تمہارا بھی۔"

"بس ٹھیک ہے' یہی لکھ دے۔"

جھورا ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا۔ جانی نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے جھورے پینٹر کی دکان کے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ جب جھورا اپنی دکان سے سفید رنگ اور برش لے کر آیا تو جانی نے کہا "یار' میں نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی فرزانہ کا نام نہیں لوں گا اور کبھی اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ اگر اس نے یہاں اس کا نام پڑھ لیا تو بے چاری کو دکھ پہنچے گا۔ میں اسے دکھ دینا نہیں چاہتا۔"

جھورے نے کہا "تو بتاؤ میں کیا کروں؟"

"ایسا کرو کہ شعر میں کسی لڑکی کا ذکر نہ ہو۔ اس طرح سے دوسری لڑکیاں جو بیٹھیں گی وہ نہ تو اس شعر کا برا مانیں گی اور نہ کوئی برا اثر لیں گی۔ جیسے ابھی میرے دماغ میں بات آئی ہے' تم لکھو۔"

"تم کہاں کہاں ہوگے   میں کہاں کہاں ڈھونڈوں"

جھورے نے تعریف کرتے ہوئے کہا "واہ' واہ استاد' کیا شعر بنایا ہے۔ ارے تم تو شاعر ہوگئے ہو۔"

اس نے تعریف کرتے ہوئے وہ شعر ڈیش بورڈ پر لکھ دیا اور پانچ روپے وصول کرلیے۔ اسی وقت ایک جوان جوڑا وہاں آیا۔ مرد نے پوچھا "عزیز بھٹی پارک چلوگے؟"

جانی انکار کرنا چاہتا تھا لیکن اسے امید نے پھر بھڑکایا کہ جانا چاہیے شاید پارک ہی میں وہ نظر آجائے۔ اس نے ٹیکسی کے پچھلے دروازے کو کھول دیا پھر پارک کی طرف

جاتے ہوئے راستے میں دعائیں مانگنے لگا کہ وہ نظر آہی جائے۔ اگر برقعے میں ہو تو پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ جائے اور اس شعر کو پڑھ لے۔ اس کے دل کے درد کو اور اس کی تلاش کو سمجھ لے۔ شاید اس کے دل میں رحم آئے تو وہ نقاب الٹ کر اس کے سامنے آجائے۔

تلاش کے دوران انتظار کی گھڑیوں میں بڑی خوش فہمیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ اس نے سواری کو عزیز بھٹی پارک پہنچادیا پھر وہیں کچھ دیر ٹیکسی میں بیٹھا رہا۔ اس خوش فہمی میں کہ شاید وہ برقع پہن کر ادھر چلی آئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ ٹیکسی کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کے پاس بیٹھتا ہوا بولا "ذرا آگے چلو۔"

بادشاہ جانی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ابھی میں نہیں جاؤں گا۔ یہاں مجھے کسی کا انتظار ہے۔"

دوسرے ہی لمحے اس شخص نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ریوالور نکال لیا پھر اس کی پسلی سے لگاتے ہوئے کہا "شور نہ مچانا جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔ گاڑی اسٹارٹ کرو اور جہاں میں چلنے کے لیے کہہ رہا ہوں چلتے رہو۔"

جانی نے نظریں جھکا کر ریوالور کی طرف دیکھا۔ اس شخص کی انگلی ٹریگر پر تھی اور سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ انگلی کے دباؤ سے گولی چل سکتی تھی۔ وہ انکار نہ کرسکا۔ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا "معاملہ کیا ہے' دیکھ' کوئی اسمگلنگ کا چکر ہے یا چرس کا چکر ہے یا چوری کا مال ادھر سے ادھر لے جانا ہے تو مجھے معاف کردو۔ میں یہ سب دھندے نہیں کرتا ہوں۔"

اس شخص نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم چلو' جو معاملہ ہے وہ تمہارے سامنے آجائے گا۔"

معاملے کو سمجھنے کے لیے زیادہ دور جانا نہیں پڑا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک سفید کار کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس شخص نے کہا "دیکھو' وہ جو ایک کار کھڑی ہوئی ہے' جس کا بونٹ اٹھا ہوا ہے۔ وہیں لے جاکر ٹیکسی روک دو۔"

اس نے یہی کیا۔ بونٹ اٹھا کر کوئی شخص گاڑی کو ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گاڑی خراب ہوگئی تھی اس لیے اس کی سواری اتر کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ کی طرف

آنے لگی۔ ان میں دو مرد تھے اور ایک برقع پوش عورت یا لڑکی تھی۔ وہ تینوں اس طرح پچھلی سیٹ کی طرف آئے کہ دو مردوں کے درمیان وہ بیٹھ گئی۔ اس کے آنے اور بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے اس سے زبردستی کی جا رہی ہو اور اسے آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے پر دھکا دے کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پہنچایا گیا ہو۔ جب وہ بیٹھ گئی تو جانی نے اپنے پیچھے سسکیوں کی آواز سنی۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

وہ سب اپنے لباس سے اور اپنے انداز سے بڑے گھر کے لوگ معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے کھڑکی کے شیشے چڑھا لیے۔ ریوالور کی نالی جانی کی پسلی میں ذرا اور چبھنے لگی۔ سخت لہجے میں کہا گیا "گاڑی اسٹارٹ کرو اور سہولت سے ڈرائیو کرو۔ راستے میں چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہمیں رحم نہیں آئے۔"

گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ جانی نے پوچھا "بھائی صاحب' یہ کیا معاملہ ہے؟ مجھ غریب کو کسی مصیبت میں کیوں پھنسا رہے ہو۔"

ریوالور والے نے کہا "فکر نہ کرو' تم پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

پھر اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے ساتھیوں سے کہا "اسے چپ کراؤ۔"

پیچھے سے ایک نے کہا "بھائی جان' اسے رونے دیجئے۔ آخر کب تک روئے گی' خود ہی چپ ہو جائے گی۔"

دوسرے نے کہا "بڑی مصیبت ہو گئی۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ عین وقت پر ہماری گاڑی خراب ہو جائے گی۔ آخر ہم یہ ٹیکسی لے کر کہاں کہاں جائیں گے' قاضی کو بھی تو بلانا ہو گا۔"

ریوالور والے نے کہا "پہلے ہم اسے اپنی کوٹھی میں پہنچائیں گے پھر میں اس ڈرائیور کو ساتھ لے کر قاضی کو پکڑ لاؤں گا۔ اس کے بعد تمہارا نکاح اس سے پڑھا دیا جائے گا۔"

جانی نے پوچھا "کدھر جانا ہے؟"

"محمد علی سوسائٹی کی طرف۔"

کچھ دیر خاموشی رہی گاڑی چلتی رہی۔ آہستہ آہستہ سسکیوں کی آواز سنائی دیتی رہی

پھر پیچھے سے ایک آواز آئی۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا "اب کیوں رو رہی ہو۔ مجھے محبت کا دھوکا دیتے وقت تمہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں کتنا ضدی ہوں۔"

دوسرے نے کہا "ظفر بھائی' یہ دھوکا دینے کے لیے ناظم آباد کے مکان کو چھوڑ کر چلی گئی اور اب برقع پہننا شروع کر دیا تاکہ ہم اسے دیکھ ہی نہ سکیں۔"

ظفر کی آواز آئی "ہم تو لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ بے وقوف یہ نہیں سمجھتی تھی کہ میں اسے اس کی آواز سے پہچان لوں گا۔"

جانی ان کی باتیں سن رہا تھا اور ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے فرزانہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے بھی محبت کا دھوکا دیا تھا اور اس کے ڈر سے ناظم آباد والا مکان چھوڑ دیا تھا اور شاید اب برقع پہننے لگی تھی۔ اس نے ناگواری سے سوچا "آج کل کی لڑکیاں محبت کے سبز باغ کیوں دکھاتی ہیں؟ آخر انہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟"

ٹیکسی کے اندر پھر خاموشی رہی۔ تھوڑی دیر بعد جانی نے خود ہی پوچھا "بھائی صاحب' آپ کے معاملے میں بولنا تو نہیں چاہیے مگر ایک بات پوچھتا ہوں کیا اس لڑکی سے زبردستی شادی کرنے سے نکاح جائز ہو جائے گا۔"

ریوالور والے نے حقارت سے کہا "اونہہ جائز اور ناجائز بعد میں دیکھا جائے گا۔ یہ ہمارا خاندانی جھگڑا ہے۔ ہماری آن کی بات ہے۔ اس لڑکی کو میں نے اگر اپنے گھر کی بہو نہ بنایا اس کی اپنے چھوٹے بھائی ظفر سے شادی نہ کی تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔"

جانی نے کہا "لیکن نکاح پڑھا دینے سے تو یہ زنجیر میں نہیں بندھ جائے گی۔ کسی وقت بھی فرار ہو جائے گی۔"

"نہیں نہیں' اس کے بعد پھر کہیں نہیں جا سکے گی۔ جب میرے بھائی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے گی تو پھر کس کو منہ دکھانے جائے گی؟ اس کے گھر والے بھی مجبوراً اس رشتے پر راضی ہو جائیں گے اور اگر راضی نہ ہوئے تو ہم اس وقت تک چھپا کر رکھیں گے جب تک یہ میرے بھائی کے بچے کی ماں نہ بن جائے۔ عورت پہلے تو بیوی بن کر مجبور ہو جاتی ہے اور اگر اس مجبوری کو بھی خاطر میں نہ لائے تو بچے کی ماں بن کر بالکل کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہی حال مرد کا بھی ہے۔ مرد بھی ان حالات میں اپنی بیوی اور بچے کو

قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور جانی کی نگاہوں کے سامنے رخسانہ کا چہرہ گھوم رہا تھا' وہ اس کے بچے کو گود میں لیے مسکرا رہی تھی۔ واقعی وہ بھی زنجیروں میں جکڑ گیا تھا' کیا وہ رخسانہ سے فرار حاصل کر سکتا تھا۔ نہیں' کبھی نہیں۔

لوگوں نے مذہب کے نام پر کیسا گورکھ دھندا پھیلا رکھا ہے۔ نکاح شرعی ہوتا اور مقصد شیطانی ہوتا ہے۔ دنیا والوں کو خبر نہیں ہوتی کہ اللہ رسولؐ کا نام لے کر جو نکاح پڑھایا جا رہا ہے' اس کے پیچھے کیسی چالبازیاں ہیں۔ اب اس برقعے والی کو ریوالور کی زد پر رکھ کر نکاح قبول کرایا جائے گا۔ وہ زبردستی بیوی بنے گی اور پھر زبردستی ماں بن جائے گی اور حالات سے سمجھوتا کر کے اسی مرد کے ساتھ زندگی گزارنے لگے گی۔ اس طرح وہ نکاح رفتہ رفتہ جائز کر لیا جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ریوالور اور چاقو دکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنایا جاتا ہے جیسے کہ جانی بن چکا تھا۔

پیچھے سے پھر سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ جانی کے دل نے کہا۔ بے چاری کی زندگی برباد ہونے والی ہے مگر میں کیا کروں؟ میں کوئی ہیرو تو نہیں ہوں کہ ہر ایک کے معاملے میں ٹانگ اڑانا شروع کر دوں اور اگر ایسا کیا بھی تو اپنی جان سے جاؤں گا۔ ریوالور میری پسلی سے لگا ہوا ہے۔ ذرا سی حرکت مجھے موت کے منہ میں پہنچا دے گی۔

اب وہ لوگ خاموش ہو گئے تھے۔ ٹیکسی کے اندر کبھی کبھی سسکیاں ابھرتی تھیں پھر ڈوب جاتی تھیں۔ ٹھیک تو ہے کراچی جیسے شہر میں روزانہ ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہیرو بن کر کتنوں کو بچا سکتا ہے؟ اور خود کو قانون کے بکھیڑوں میں الجھا سکتا ہے؟ ایسے حالات میں دانش مندی یہی ہوتی کہ چشم پوشی کی جائے اور اپنے کام سے کام رکھا جائے۔

جانی نے سوچا۔ اچھی بات ہے اس لڑکی کو یوں بھی سزا ملنی چاہیے کیونکہ اس نے اس ظفر کو دھوکا دیا تھا جو ابھی اسے گھر لے جا رہا تھا۔ اس بے چارے کو بے وقوف بنایا تھا۔ فرزانہ نے بھی یہی کیا تھا۔ وہ بھی اسے ملے گی تو وہ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گا۔ اس سے ایسا انتقام لے گا کہ دوسری لڑکیاں عبرت حاصل کریں گی۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس نے عقب نما آئینے میں اس برقعے والی کو دیکھا۔ اب وہ پچھلی سیٹ پر تلملا رہی تھی۔ ایک نے اس کے بازو کو پکڑا ہوا تھا اور وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری طرف سے ظفر نے چاقو کھول کر کہا "دیکھو فرزانہ' اگر تم نے کوئی حرکت کی تو میں...."

اس کے آگے جانی کچھ نہ سن سکا۔ اس کے دماغ میں سیٹیاں سی گونجنے لگیں۔ فرزانہ کا نام اس کے اندر گونجنے لگا "فرزانہ.... فرزانہ.... فرزانہ...."

وہ ایسا نام تھا جسے سن کر دل کی دھڑکنیں رک جاتیں۔ وہ ایسا نام تھا جس کے لیے جانی کا بھاگتا ہوا وقت اور بہتی ہوئی عمر رک جاتی پھر ٹیکسی کیوں نہ رکتی؟ ایک جھٹکے سے ٹیکسی کو یوں بریک لگا کہ ادھر بریک لگا ادھر دوسرے ہاتھ سے جانی نے ریوالور والے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر ایک جھٹکے سے دوسری طرف ہٹایا۔ ٹھائیں سے فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی فائر کرنے والا ڈیش بورڈ سے بری طرح ٹکرایا۔ پچھلی سیٹ والے اگلی سیٹ سے ٹکرائے۔ اتنی دیر میں جانی کے ہاتھ میں ریوالور آ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر چاقو والے سے کہا "لڑکی کو یہاں چھوڑ دو اور تم تینوں باہر نکلو۔ چلو دیر نہ کرو۔ چوٹ لگی ہے تو باہر نکل کر سہلا لینا۔"

اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا "دیکھیے بھائی صاحب! یہ ہمارا خاندانی جھگڑا ہے' آپ اس جھگڑے میں...."

جانی نے بات کاٹ کر کہا "بکواس مت کرو۔ تھوڑی دیر پہلے میں ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اب تم نے مجھے بھائی صاحب بنا لیا۔ اگر میں گدھا ہوتا تو تم مجھے باپ بھی بنا لیتے۔ میں کہتا ہوں دیر نہ کرو ورنہ میں کسی کا خون کر دوں گا' چلو باہر نکلو۔"

لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے کہا "چلو بھائی نہ سہی' ٹیکسی ڈرائیور ہی سہی مگر ہم سے سودا تو کر سکتے ہو۔ ہمارے پاس پانچ ہزار روپے ہیں۔ ہم ابھی یہ رقم دے دیں گے۔ تم اس جھگڑے میں نہ پڑو۔ ہم جہاں چاہتے ہیں ہمیں پہنچا دو۔"

"بکواس مت کرو' مجھے لالچ نہ دو۔ میں تم میں سے کسی کو گولی مار دوں گا یا پھر پولیس والوں کے حوالے کر دوں گا۔ میں خود پولیس والوں کے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا اس لیے تم لوگوں کو چپ چاپ جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ جاتے ہو یا نہیں۔"

ان تینوں نے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا پھر آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگے۔ لڑکی وہیں بیٹھی رہی۔ جانی بھی ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ دور دور تک لوگ سہمے ہوئے کھڑے تھے اور ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فائر کی آواز سنی تھی لیکن کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ان کے قریب آکر ان کے معاملات کے متعلق دریافت کرتا۔ وہ تینوں ذرا دور جاکر کھڑے ہوگئے اور جانی کی خوشامدیں کرنے لگے لیکن وہ ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا اس لیے اسے دوبارہ اسٹارٹ کیا پھر ذرا بیک کرنے کے بعد اسے موڑ کر دوسرے راستے پر تیزی سے جانے لگا۔ وہ اتنی سی دیر میں کتنے خطرناک مراحل سے گزر چکا تھا پہلے تو وہ ریوالور کی زد میں تھا۔ اس سے نکلنے والی گولی اسے ہلاک کر سکتی تھی لیکن اس نے کمال ہوشیاری سے خود کو بچالیا۔ ونڈ اسکرین سے یا ڈیش بورڈ سے بھی وہ ٹکرا سکتا تھا۔ اچانک بریک لگانے سے پہلے ہی اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا جس کے نتیجے میں وہ اس وقت اپنی فرزانہ کو جیت چکا تھا۔ دشمنوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتا جارہا تھا۔

وہ پچھلی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد جانی نے کہا "میں اچھا بھی ہوں اور بدمعاش بھی۔ مجھے جھوٹ اور فریب سے نفرت ہے۔ اب تم سچ سچ بتاؤ کہ تم نے دھوکا کیوں دیا تھا؟ جب محبت نہیں تھی تو محبت کیوں جتارہی تھیں؟"

جواب میں رونے کی آواز آئی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر نقاب تھی اور نقاب کے اوپر وہ دونوں ہاتھوں کو رکھے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ جانی نے کہا "میرا جواب آنسو نہیں ہیں جواب دو۔"

وہ روتے ہوئے اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولنے لگی "میں کیا بتاؤں، مجھے ظفر سے کبھی محبت نہیں تھی، وہ مجھے ڈراتا دھمکاتا رہتا تھا اور میں اس کے ڈر سے محبت کا اقرار کرتی رہتی تھی، میں کبھی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

وہ ٹیکسی ڈرائیور پچھلی سیٹ سے آنے والی آواز کو ہزاروں، لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس وقت جو آواز سنائی دی وہ اس کی اپنی فرزانہ کی آواز نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی ٹیکسی کو سڑک کے کنارے روک دیا پھر پلٹ کر اس برقعے کو حسرت سے دیکھنے لگا اس برقعے کے پیچھے فرزانہ تھی یا نہیں تھی لیکن وہ آواز فرزانہ کی نہیں تھی۔ اس نے صرف

دو دنوں تک اس کی آواز سنی تھی۔ دو دن کی دوستی، دو دن کی بہار تھی، اس کے بعد سے اب تک وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرف اڑتا پھر رہا تھا لیکن اس کی آواز اپنے دماغ میں ہر دم گونجتی ہوئی محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ اب بھی اسے آواز سے پہچان سکتا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "ان آدمیوں کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ تم پہلے برقع نہیں پہنتی تھیں۔ بے پردہ گھومتی تھیں۔ کیا تم اپنا نقاب الٹ کر اپنا چہرہ دکھا سکتی ہو؟"

برقعے والی نے چونک کر سر اٹھایا جیسے اسے گھبرا کر دیکھ رہی ہو۔ جانی نے کہا "گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔ دراصل مجھے بھی ایک فرزانہ کی تلاش ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہیں وہ تم تو نہیں ہو۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنا نقاب الٹ دیا۔ چہرہ سامنے آگیا۔ وہ ایک اچھی صورت شکل کی لڑکی تھی مگر فرزانہ نہیں تھی۔ جانی نے حسرت بھری ایک سانس لی پھر اس کی طرف سے پلٹ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "بتاؤ کہاں رہتی ہو؟ تمہیں کہاں پہنچاؤں؟"

○☆○

رخسانہ وضو کرنے جارہی تھی۔ اس کے پاس ہی چھوٹے سے اسٹول پر ایک چھوٹی سی کتاب کھلی ہوئی رکھی تھی۔ اس کتاب میں وضو کرنے کے طریقے بتائے گئے تھے۔ وہ کتاب پڑھتی جارہی تھی اور اس کے مطابق وضو کے عمل سے گزرتی جارہی تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس وقت سے مذہبی جوش میں آکر شاید ایک آدھ وقت کی نماز پڑھی ہو تو پڑھی ہو، اسے یاد نہیں رہا تھا۔ خدا یاد بھی کب رہتا ہے۔ جب آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگتے ہیں، تب ہی وہ یاد آتا ہے۔

وہ وضو کرنے کے بعد اٹھ گئی۔ اس کتاب کو وہاں سے اٹھایا پھر کمرے میں آگئی۔ اس کی امی بچے کو گود میں لیے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھیں۔ رخسانہ نے جائے نماز بچھائی پھر کتاب کھول کر دیکھا کہ عشا کی نماز میں کتنی رکعت ہوتی ہیں اور پہلے کتنی رکعت پڑھی جائے۔ اس کے مطابق اس نے کتاب جائے نماز کے ایک طرف رکھ کر نماز شروع کی۔

شروع کرتی ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اسے اتنی عمر تک صرف سورہ فاتحہ اور تین قل یاد تھے۔ وہ ہر رکعت میں انہیں

پڑھنے لگی۔ جو کچھ وہ پڑھ رہی تھی اس کا ترجمہ اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کہہ رہی ہے مگر اتنا جانتی تھی کہ اپنے رب کریم کے سامنے باادب کھڑی ہوئی عبادت کا فرض ادا کر رہی ہے۔ خشوع و خضوع سے اور دل کی گہرائیوں سے اگر عبادت کی جائے تو چاہے عبادت کا مفہوم زیادہ واضح نہ ہو تب بھی اللہ تعالیٰ نیت دیکھتا ہے اور نماز کو قبول کرتا ہے لیکن یہ بہتر ہے کہ نماز سمجھ کر پڑھی جائے۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ "میرے معبود، مجھ پر رحم کر۔ میری بگڑی بنادے۔ میں ہمیشہ نماز پڑھوں گی اور قرآن پاک کی بہت سی آیتیں ان کے ترجمے کے ساتھ سمجھ کر یاد کروں گی مگر تو میری بگڑی بنادے۔"

یہ ایک طرح کا سودا ہے کہ ہم ایسا کریں گے تو ہمارا معبود ویسا کرے گا۔ ہم اس کے سامنے جھکنے سے پہلے یہ دل میں سوچ لیتے ہیں کہ اپنے لیے کچھ وصول کرنے کی غرض سے اس کے سامنے جھکنے جارہے ہیں جب وہ بات پوری ہو جائے گی، اور وہ چیز وصول ہو جائے گی، جب بگڑی بن جائے گی تو پھر کیا ہوگا؟ پھر خدا یاد نہیں آئے گا۔ اگر خدا یاد نہیں آئے گا تو پھر یہ سودے بازی ہے۔

نماز کے بعد وہ دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑانے لگی "میرے معبود، میں سودا کرنے نہیں آئی ہوں۔ سودا وہ کرتے ہیں جو تجھے پہچانتے نہیں ہیں۔ میں تجھے پہچان کر آئی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ آئی ہوں کہ ڈوب جانے کے بعد صرف تو ابھارتا ہے۔ دنیا میں اور کسی کی طاقت نہیں ہے کہ کوئی میرے سہاگ کو بچا سکے۔ میری عزت، میری ازدواجی زندگی، میرے بچے کا مستقبل، میرے بچے کی سلامتی اور اس کے سر پر باپ کا سایہ سب کچھ تیرے دم سے ہوگا۔ یہ آج میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میں تجھ کو ہی پکاروں گی، تو تو ہی سنے گا ورنہ میں تو اپنے مجازی خدا کو پکارتے پکارتے تھک گئی ہوں۔ اب مستری چاچا نے ایک نئی بات چھیڑ دی ہے۔ میرے پیار کے رشتے کو ناجائز کہہ رہے ہیں۔ اسے بھی اگر کوئی جائز بنا سکتا ہے تو وہ تیری ہی ذات ہے۔ میرے مالک مجھ پر رحم کر۔ رحم نہیں کرتا تو مجھے ابھی اسی وقت اٹھالے تاکہ وہ الفاظ نہ سنوں جو مجھ کو میرے جانی سے جدا کردیں اور میرے بچے کو ناجائز بنادیں۔ ایسا سننے سے پہلے میں مرجاؤں گی۔ میرے مالک۔ ایک عورت کی شرم رکھ لے اور ایسا تو ہی کرسکتا ہے۔"

وہ دعا مانگتے مانگتے رونے لگی۔ روتے روتے ہچکیاں لینے لگی۔ ہچکیاں لیتے لیتے سجدے میں گر پڑی۔ جہاں سجدے میں سر گیا، وہاں زمین پر سر پٹخنے لگی "میرے اللہ، کل صبح کیا ہوگا۔ کل اگر کسی عالم نے میرے خلاف کوئی فیصلہ سنایا تو میرا انجام کیا ہوگا میرے بچے کا مستقبل کیا ہوگا؟ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ سکوں گی۔ میں ایک مشرقی عورت ہوں۔ ایک مرد کے بعد کسی دوسرے کا سہارا لینا کبھی گوارا نہیں کروں گی۔ میری شرم رکھ لے میرے مالک۔"

وہ گڑگڑا رہی تھی۔ رو رہی تھی، سر پٹخ رہی تھی۔ اس کی امی اس کے بچے کو لے کر اس کے پاس آئیں پھر اس کے بازوؤں کو جھنجوڑ کر کہا "بیٹی کیا کر رہی ہو۔ پاگل ہو گئی ہو۔ خدا پر بھروسا رکھو۔ اس طرح ہمت نہیں ہارتے۔ اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے۔ تمہاری بھی سنے گا۔ بچے کو دیکھو یہ بھی تمہارے ساتھ ساتھ رو رہا ہے۔"

اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ بچہ بھی رو رہا تھا، مچل رہا تھا رخسانہ نے اسے ماں کی گود سے لے کر اپنے سینے سے لگالیا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کبھی رونے لگتی، کبھی بچے کو چوم کر کہنے لگتی "بیٹے" اپنے ننھے ہاتھ اٹھاؤ۔ اللہ میاں کو رحم آجائے گا۔ تم پر ضرور رحم کریں گے بیٹے، اللہ میاں سے بولو کہ تمہارے ابو کو تم سے نہ چھینیں جب تم سے نہیں چھینیں گے تو تمہارے ابو ہمارے سر کا تاج بھی رہیں گے۔ دعا مانگو میرے بیٹے۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھاؤ۔"

اس نے بچے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دعا کے انداز میں اٹھادیے "میرے لال! اللہ میاں سے بولو ہمارے ابو کل سے گھر نہیں آئے ہیں انہیں گھر بھیج دو اللہ میاں۔ ان کو سلامت رکھو، ان کو حادثے سے بچاؤ اللہ میاں۔ ان کو سیدھے راستے پر لے آؤ اللہ میاں۔"

بچے کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے اور رخسانہ کی زبان بول رہی تھی۔ اسی وقت ٹیکسی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ خوشی سے کھل گئی۔ جلدی سے اٹھ کر بچے کو لے کر دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی پھر اس کے پٹ کو کھول کر دیکھا۔ بادشاہ جانی مکان کے احاطے میں ٹیکسی کو روک کر باہر نکل رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پاس رخسانہ اور بچے کو دیکھا پھر وہاں سے ایک ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "میں کل سے نہیں آیا مگر گھبرانے کی کوئی

بات نہیں ہے میں یہاں خیریت سے ہوں اور تم لوگوں کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔یعنی تمہاری اور بچے کی خیریت مطلوب ہے۔ساس کی نہیں۔"

اس کی آخری بات رخسانہ سن نہ سکی۔اس سے پہلے ہی وہ کھڑکی سے پلٹ کر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر جانے لگی۔ساس نے سن لیا تھا۔دانت پیس کر بڑبڑانے لگی "آگیا میرا دشمن۔"

رخسانہ برآمدے میں آئی پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے برآمدے کے زینے پر پہنچی۔جانی وہاں پہنچ چکا تھا۔اس نے رخسانہ سمیت بچے کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر کہا "واہ میرا بیٹا ابھی تک جاگ رہا ہے۔اپنے باپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

رخسانہ نے کہا "یہ تو کل رات سے انتظار کر رہا ہے۔کہاں رہ گئے تھے؟"

"بس کچھ نہ پوچھو' بڑی مصیبت میں پڑ گیا تھا۔اطمینان سے سناؤں گا۔آؤ اندر چلو۔"

وہ بازوؤں سے نکل جانا چاہتی تھی جانی نے پھر اسے کھینچ کر پوچھا "یہ کیا' تمہاری آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں۔چہرہ بھی کچھ بھیگا ہوا سا لگتا ہے۔کیا رو رہی تھیں؟ کسی نے تم سے کچھ کہا ہے؟ بتاؤ کس نے رلایا ہے؟ میں اس کی ایسی کی تیسی....."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔رخسانہ اسے بڑے پیار سے' بڑی شکایت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔وہ سر جھکا کر بولا "اوہ' سمجھ گیا۔وہ میں ہی الو کا پٹھا ہوں۔میں نے ہی تمہیں رلایا ہے لعنت ہے مجھ پر۔"

رخسانہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "دشمنوں پر لعنت ہے تم مجھے کبھی نہیں رلاتے ہو جانی۔"

"تو پھر کس نے رلایا ہے مجھے بتاؤ۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "تقدیر رلا رہی ہے۔بس اندر چلو۔"

وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے میں پہنچا پھر اپنی ساس کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔اس کی ساس سر پر آنچل رکھ کر' اسے گھونگھٹ بناتی ہوئی اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھی ہوئی تھی۔جانی کو تاؤ آگیا۔اس نے کہا "کیا میں اتنا برا ہوں کہ آپ مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہیں۔"

رخسانہ نے محبت سے سمجھایا "نہیں جانی' یہ منہ نہیں پھیر رہی ہیں لحاظ' شرم بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔"

جانی نے "اونہہ" کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا پھر ریوالور نکال لیا۔اسے دیکھتے ہی رخسانہ نے حیرانی سے پوچھا "یہ ریوالور تمہارے پاس کیسے آیا۔تم ایسے خطرناک ہتھیار کیوں رکھتے ہو؟"

ریوالور کی بات سنتے ہی اس کی ساس نے چونک کر ادھر دیکھا۔جانی نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا "اب لحاظ شرم کہاں گئی؟ اب میری طرف کیوں دیکھ رہی ہو؟"

رخسانہ نے کہا "اوہ جانی! تم دونوں تو آگ اور پانی بن گئے ہو۔ایک جگہ رہ ہی نہیں سکتے تم ادھر دھیان کیوں دیتے ہو۔میری طرف دیکھو۔آؤ یہاں جوتے اتار کر بستر پر آرام سے لیٹ جاؤ میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔"

وہ ریوالور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "اسے الماری میں کہیں چھپا کر رکھ دو۔یہ بغیر لائسنس کا ہے۔"

"تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

"بس کیا بتاؤں بدمعاشوں سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ان سے چھین کر لایا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بستر پر بیٹھ گیا اور جوتے اتارنے لگا۔رخسانہ اس کے پاس بیٹھ کر بولی "اب تم جھوٹی کہانی سناؤ گے کہ بدمعاشوں سے لڑنے کی وجہ سے تمہارے چہرے پر ایسے زخم آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے چہرے کو چھو کر دیکھنا شروع کیا پھر چونک کر بولی "تمہیں تو بخار ہے' تمہارا بدن جل رہا ہے۔"

"ہاں کچھ طبیعت اچھی نہیں لگ رہی ہے میں ابھی ایک اسپرین کی ٹکیا کھا کر سو جاؤں گا۔صبح تک سارا بخار دور ہو جائے گا۔"

"بڑے آئے اسپرین کی ٹکیا کھانے والے' میں ڈاکٹر ہوں۔میں جانتی ہوں کہ تمہیں کون سی دوا دینا چاہیے۔اب میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ مجھے یہاں ایک ڈسپنسری کھولنا چاہیے۔وہ فرزانہ....."

وہ کہتے کہتے ایک دم سے رک گئی۔ دراصل باتوں کی روانی میں وہ یہ کہنے جارہی تھی کہ فرزانہ اپنی ڈسپنسری کھول چکی ہے اور اپنی آمدنی کا ذریعہ بنا چکی ہے پھر وہ کیوں پیچھے رہے گی لیکن فرزانہ کا نام لیتے ہی ایک دم سے ہوش میں آگئی۔ گھبرا کر جانی کو دیکھنے لگی۔ جانی نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کو محسوس کیا تھا پھر اس نے پوچھا "تم فرزانہ کا نام لیتے لیتے رک گئیں۔ تم کچھ کہنے جارہی تھیں۔"

وہ جلدی سے سنبھل کر بولی "آں۔ ہاں۔ میں یہ کہنے جارہی تھی کہ تم نے مجھ سے فرزانہ کا نام اپنی زبان پر نہ لانے اور اس کا ذکر نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے بھول جانے کا بھی وعدہ کیا تھا مگر کل سے تم اس کے لیے ہنگامے کرتے پھر رہے ہو۔"

"دیکھو یہ بات نہیں ہے۔ تم فرزانہ کے بارے میں کچھ اور کہنے جارہی تھیں۔"

"میں یہی کہہ رہی تھی۔ یہ خبر اخبار میں شائع ہو چکی ہے کہ کل تم اسپتال میں فرزانہ کی تلاش کرتے ہوئے ہنگامے کررہے تھے اور پولیس والے تمہیں پکڑ کر تھانے لے گئے کیا یہ جھوٹ ہے؟"

"ہاں جھوٹ ہے۔"

وہ بچے کو بستر پر ڈال کر تیزی سے چلتی ہوئی میز کے پاس آئی وہاں سے اخبار اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں نے یہ اخبار رکھا ہوا ہے۔ میں جانتی تھی کہ تم اقرار نہیں کرو گے۔"

اس نے اخبار کے اس حصے کو دکھایا جہاں وہ خبر شائع ہوئی تھی۔ جانی اسے پڑھنے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا' جھکا ہی رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اخبار کو ایک طرف رکھ دیا پھر چپ چاپ بچے کے پاس بستر پر لیٹ گیا۔ رخسانہ اس کے پاس آئی پھر اس کے سر کو سہلاتے ہوئے پوچھا "تم نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ سے تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اپنی زبان کے پابند رہو گے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش رہا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ تمہارے منع کرنے سے' مستری چاچا کے روکنے سے' ساری دنیا کے دیوار بن جانے سے کیا ہوتا ہے۔ کیا تلاش ختم ہوجاتی ہے۔ آرزوئیں دم توڑ دیتی ہیں۔ جتنی بھی سختی کرو۔ جتنے بھی پہرے بٹھاؤ کہنے والے کہنے سے باز نہیں آتے اور

دیوانے صحرا میں بھٹکنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں اس کی تلاش سے باز نہیں آسکتا۔ تم منع کرتی ہو تو تمہارے سامنے ہونٹوں کو سی لوں گا مگر میرے اندر کا کرب اسے پکارتا رہے گا۔"

رخسانہ نے پیار سے پوچھا "جانی میری بات کا جواب نہیں دو گے؟"

"کیا جواب دوں۔ کہنے کے لیے بہت کچھ ہے مگر تم سمجھ دار ہو کہے بغیر سمجھ لو تو اچھا ہے۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو تمہارے سامنے مجھے شرم آتی ہے۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ تم میری شریک حیات ہو اور تمہارے سامنے مجھے کسی دوسری لڑکی کا ذکر نہیں کرنا چاہیے اور میں کبھی اس کا ذکر تمہارے سامنے نہیں کروں گا۔ ہاں اسے تلاش کرتا ہوں۔ شاید تلاش کرلینے کے بعد وہ تلاش ختم ہوجائے۔ شاید میں ہمیشہ کے لیے اسے بھول جاؤں۔ اس سے نفرت کرنے لگوں' لیکن جب تک وہ سامنے نہیں آئے گی' میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ میں سچ کہتا ہوں رخسانہ' کبھی کبھی میں خود نہیں سمجھ سکتا کہ میں اسے کیوں ڈھونڈ رہا ہوں۔"

رخسانہ نے اسے محبت اور ہمدردی سے دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جانی دماغی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ وہ دھوکا کھا چکا ہے اور دھوکا دینے والی سے جب تک نہیں ملے گا اسے قرار نہیں آئے گا۔ اس سے ملنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ انتقام لے گا یا نفرت کرنے لگے گا یا اس کی محبت کے آگے ہتھیار ڈال دے گا۔ یہ بات خود وہ بھی نہیں جانتا تھا اور رخسانہ ایسا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ فرزانہ سے ملے اور انتقام لینے کے بجائے اس کا ہوجائے۔

اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا "بس اب زیادہ نہ بولو بخار تیز ہورہا ہے۔ نسخہ لکھ کر ابھی دوا منگواتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ میز کے پاس آئی پھر کاغذ قلم لے کر اس کے لیے نسخہ لکھنے کے بعد بولی "تمہیں جو چوٹیں آئی ہیں اس کی تکلیف سے بخار ہوگیا ہے۔ تکلیف بھی جلد ہی اتر جائے گی۔"

اس نے نسخے والا کاغذ اپنی ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "امی آپ کو زحمت دے رہی ہوں' مگر کیا کیا جائے یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کسی کیمسٹ سے یہ دوائیں لے

آئیں اور ڈبل روٹی بھی لے آئیے گا گھر میں دودھ رکھا ہوا ہے۔ جانی کو فی الحال دودھ اور ڈبل روٹی ہی دی جائے گی۔"

اس کی امی نسخہ اور روپے لے کر وہاں سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد رخسانہ نے الماری میں سے دو بڑی بڑی چادریں نکال کر انہیں کمرے کے درمیانی حصے میں اس طرح باندھ دیا کہ دروازے سے دوسری دیوار تک کمرے کا ایک حصہ ہو گیا۔ باقی چادر کی دوسری طرف اس کا بستر رہا جہاں جانی بچے کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ اب اس کی امی آکر چادر کے اس پار رات گزار سکتی تھیں۔ ایک کمرے کے دو کمرے ہو گئے تھے اس نے امی ای کے لیے چارپائی پر بستر بچھایا پھر وہاں بچے کو لا کر سلا دیا۔ اس کے بعد جانی کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

پہاڑ جیسا مرد اپنے پاس ہو تو اپنے اندر ایک چٹانی حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ دشمن آندھی چلتی ہے تو چلے' پہاڑ سے ٹکراتی ہے تو ٹکرائے مگر آندھی کو کترا کر گزرنا ہو گا اپنے پہاڑ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

میں اپنے پہاڑ تلے ایک ایسی زمین ہوں جس پر بڑے اعتماد سے' بالکل آرام اور سکون سے رہ سکتی ہوں۔ پہاڑ قائم و دائم رہے گا۔ میرے مالک' میری دشمن کو زمین نہ سمجھتی تھیں تو وہ زلزلہ بن کر پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے گی۔

میں جانتی ہوں کہ میرا جانی کبھی نہیں بہک سکتا مگر میں ڈرتی ہوں کہ وہ بہکایا جا رہا ہے۔ ہر عورت نگاہوں کا پہرہ بٹھانے کے لیے ننگی تلوار کی طرح اپنے مرد کے سر پر لٹکتی رہتی ہے لیکن میں تلوار نہیں ایک دعا ہوں اور اپنے مرد کے ساتھ امام ضامن کی طرح بندھی رہنا چاہتی ہوں۔

جو میرے اختیار میں ہے وہ میں کر سکتی ہوں۔ دوا کر سکتی ہوں' دعا کر سکتی ہوں۔ جب تک میرے بس میں ہے اپنے جانی کا سر اپنے بازو پر رکھ کر تھپک سکتی ہوں' مگر کب تک؟ آخر کب تک؟ لگتا ہے جیسے آج میری زندگی کی آخری رات ہے کل صبح مستری چاچا میاں آکر مجھے سزائے موت سنائیں گے۔

جانی آنکھیں بند کیے' اپنا سر رخسانہ کے بازو پر رکھے سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا' بہرحال وہ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا تھا۔ تب اچانک ہی اس کی بند آنکھیں جھپک گئیں۔

اس کے بخار زدہ گرم چہرے پر ٹھنڈے پانی کے جیسے چھینٹے پڑے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر بوند بوند پانی محسوس کیا پھر رخسانہ کی طرف دیکھا اور چونک کر بولا "ارے تم رو رہی ہو کیا بات ہے؟"

تب رخسانہ کو پتا چلا کہ وہ رو رہی تھی اور اسے خبر نہیں تھی۔ جلدی سے دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر آنسو پونچھنے لگی۔ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی "کچھ نہیں' کوئی بات نہیں ہے۔"

جانی نے بڑی محبت سے اسے سمیٹ کر پوچھا "بولو جان' تمہیں کیا غم ہے جب میں باہر سے آیا تھا تب بھی تم رو رہی تھیں۔ کیا اس لیے کہ میں کل سے نہیں آیا تھا؟"

رخسانہ نے پھر انکار میں سر ہلا کر کہا "نہیں' یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"اپنا دکھ تمہیں نہیں بتاؤں گی تو پھر اور کون سننے والا ہے' مگر تم سن کر سمجھ نہیں پاتے۔ جب سمجھ لوگے تو پھر کوئی دکھ نہیں رہے گا۔"

جانی نے ایک گہری سانس لی۔ چپ چاپ رخسانہ کا ایک ہاتھ تھام لیا۔ جب زبان بولنے کے قابل نہیں رہتی' لفظوں کی بھکاری بن جاتی ہے تو آدمی کی حرکتیں کچھ سمجھاتی ہیں۔ سمجھنے والا ہی انہیں سمجھ سکتا ہے۔ اس نے رخسانہ کی ہتھیلی کو اپنے ہونٹوں پر رکھ دیا اور ہتھیلی کو بوسہ دے کر اسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ وہ ڈوب رہا تھا۔ یوں ڈوب رہا تھا کہ مدد کے لیے فرزانہ کو پکارتا تھا اور پار لگنے کے لیے رخسانہ کا ہاتھ تھام لیتا تھا۔

آدمی سیدھی سادی زندگی کبھی نہیں گزارتا۔ خود اپنے لیے الجھنیں اور کشمکش پیدا کر لیتا ہے۔ دو طرفہ محبت میں گھر جاتا ہے۔ ایک طرف کفر اسے کھینچتا ہے۔ دوسری طرف ایمان روکتا ہے۔ اگر تاریخ کا غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ مرد ابتدا سے حاکم بن کر عورت کے معاملے میں اپنی عادت بگاڑ چکا ہے وہ ایک عورت کو بیوی بنا کر گھر میں ڈالتا ہے۔ دوسری عورت کو محبوبہ بنانے کے لیے شکار کرتا پھرتا ہے۔ اسے بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے اور محبوبہ سے بھی محبت ہوتی ہے۔ کوئی اس کی بیوی کی طرف نگاہ بھی اٹھا کر دیکھے تو اس کی غیرت جوش میں آجاتی ہے۔ اپنی بیوی کی عزت آبرو کی خاطر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی محبوبہ کے خلاف بھی کوئی بات سن نہیں

سکتا۔ یہ آدھا چہرہ جو اِدھر ہوتا ہے اور آدھا چہرہ جو اُدھر ہوتا ہے وہ آدمی کو دو نصف حصوں میں بے پناہ بنا دیتا ہے۔

بے چارہ جانی اپنے دماغ میں چھپی ہوئی ایسی باتوں کی تشریح نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس نہ الفاظ تھے' نہ بولنے کا سلیقہ تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک رخسانہ کی ہتھیلی کو اپنے چہرے پر اِدھر اُدھر رکھتا رہا اور اس کی ہتھیلی کی گلابی رنگت اور ملائمت کو محسوس کرتا رہا پھر اس نے پوچھا "رخسانہ' تمہارا چہرہ پورا کب ہوگا؟"

رخسانہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "یہی تو مجھ میں کمی رہ گئی ہے' اگر میں مکمل ہوتی تو مجھے تمہاری مکمل محبت ملتی۔"

"رخسانہ' میں تم سے پوری طرح محبت کرتا ہوں۔"

"نہیں جانی! میں نادان نہیں ہوں۔ محبت حسن سے ہوتی ہے۔ میں جب سے تمہاری بن کر آئی ہوں تب سے میں نے یہی دیکھا ہے کہ تم میرے بگڑے ہوئے چہرے کو بھی چاہتے ہو لیکن یوں جیسے کوئی ڈاکٹر مرہم رکھ رہا ہو۔ چہرہ خوب صورت ہو یا بد صورت ہمدردی کا مرہم ہر چہرے پر رکھا جاتا ہے مگر محبت صرف اچھے سے کی جاتی ہے۔"

"تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ تمہاری بات میرے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ محبت خوب صورتی سے ہوتی ہے۔ تمہیں بھی یہ ماننا ہوگا کہ تمہارا آدھا چہرہ کس قدر حسین ہے تو پھر میں آدھی محبت تو ضرور ہی کرتا رہوں گا۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہیں' دنیا کی ہر چیز آدھی ٹوٹ کر آدھی رہ سکتی ہے لیکن محبت کبھی نہیں ٹوٹتی اور محبت کبھی نہیں مرتی اور محبت کبھی شیرینی کی طرح تھوڑی تقسیم نہیں ہوتی۔ یہ جب بھی تقسیم ہوتی ہے تو پوری کی پوری تقسیم ہوتی ہے' اگر اسے توڑ کر تقسیم کیا جائے تو پھر یہ ہمدردی ہو جاتی ہے۔"

جانی نے اس کے چہرے کو چھو کر اسے دیکھا پھر بہت ہی متاثر ہو کر بولا "قسم سے جب تم بولتی ہوتا تو میں اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنے لگتا ہوں۔ تم کتنی اچھی اچھی اور کتنی گہری گہری باتیں کرتی ہو۔ میں اپنے دوستوں کے سامنے ہمیشہ سینہ تان کر بولتا ہوں کہ میری بیوی فلسفر ہے۔"

رخسانہ نے اسے حیرانی سے دیکھا پھر بولی "فلسفر نہیں فلاسفر۔ تم اردو میں بولو فلسفی مگر میں فلسفی نہیں ہوں' زندگی جو مجھے پڑھا رہی ہے۔ وہ میں تمہیں سنا رہی ہوں۔"

"رخسانہ اب دیر نہ کرو۔ جلدی سے اپنے چہرے کی وہ پلاسٹک والی سرجری کرالو۔"

اس نے پوچھا "کیا تم مجھے حسین دیکھنے کے لیے بہت بے تاب ہو۔"

"کیوں' مجھے بے تاب نہیں ہونا چاہیے۔ تم میری بیوی ہو' میری زندگی ہو۔ میرے ساتھ ساری عمر رہو گی تو میں تمہارا اچھے سے اچھا چہرہ دیکھنے کا حق نہیں رکھتا۔"

"ہاں جانی' تمہیں اس بات کا حق ہے۔"

"اسی لیے تو میں نے کہا تھا۔ جب تک چہرہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس وقت تک اپنی پہلی والی تصویر دکھاؤ مگر تم کہتی ہو کہ اسے جلا کر پھینک دیا ہے۔"

"ہاں ایک بار میرا رشتہ مانگنے والی عورتیں آئی تھیں۔ انہوں نے میری تصویر کو تو پسند کیا لیکن میرے چہرے کو ناپسند کر کے چلی گئیں۔ تب مجھے بہت غصہ آیا تھا میں نے اپنی پہلے کی تمام تصویریں جلا ڈالی تھیں۔ اب میں پچھتا رہی ہوں۔ وہ تصویریں ہوتیں تو تم کتنی محبت سے اور کتنے شوق سے انہیں فریم کر کے یہاں دیوار پر لگاتے۔ ہے نا؟"

"ہاں رخسانہ' مگر اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ کتنی جلدی تمہارا چہرہ خوب صورت ہو سکتا ہے۔"

"ہم جتنی بھی جلدی کریں دو چار برس تو ضرور لگیں گے۔ ہمیں یہاں ڈسپنسری قائم کرنی ہے۔ اپنی آمدنی بڑھانا ہے۔ پیسے جمع کرنے ہیں۔"

"تو پھر جلدی کرو۔ دیر کیوں کرتی ہو ہم کل ہی سے ڈسپنسری کی چار دیواری اٹھانا شروع کر دیں گے۔ تھوڑا تھوڑا کام ہوتا رہے گا تو کام آگے بڑھتا رہے گا۔ آمدنی کی صورت نکلتی جائے گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

رخسانہ نے اس پر جھک کر اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا' اس کا بدن جل رہا تھا "جانی تمہارا بخار تیز ہو رہا ہے۔ امی دوائیں لاتی ہی ہوں گی جب تک تم آنکھیں بند کر کے چپ چاپ لیٹے رہو۔"

وہ اور قریب ہوتے ہوئے بولا "نہ میں تم سے دور ہونا چاہتا ہوں' نہ تم سے آنکھیں بند کرنا چاہتا ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ جب تم بولتی ہو تو میں ساری دنیا کو بھول جاتا

ہوں۔"

رخسانہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ دنیا کو بھولنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی باتوں میں فرزانہ کو بھول جاتا ہے۔ اس نے پوچھا "جانی ایک بات بتاؤ' اگر تقدیر یہ فیصلہ سنا دے کہ مجھے تم چھوڑ دو' مجھ سے الگ ہو جاؤ' میرے ساتھ زندگی نہ گزارو' تب تم کیا کرو گے؟"

"تم ایسی ہی فضول باتیں سوچتی جاؤ۔ بھلا تقدیر کیوں ایسا فیصلہ سنائے گی۔ تقدیر نے ہمیں ایک کیا ہے۔"

"نہیں جانی' تم ڈرائیور ہو' یہ تو جانتے ہو کہ کہیں کی بھی' کوئی بھی سڑک جتنی دور ہو جاتی ہے۔ اتنی ہی دور سے پھر اپنی جگہ واپس آتی ہے۔ آتی ہے نا؟"

"ہاں' یہ بات تو ہے؟"

"تقدیر ہی ہمیں ہنساتی ہے' وہ رلاتی بھی ہے۔ یہی تقدیر جس نے ہمیں ایک کیا ہے۔ وہ الگ بھی کر سکتی ہے پھر تم کیا کرو گے؟"

جانی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا "سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے دماغ میں ایسی بات کیوں آ رہی ہے ہم کیوں الگ ہوں گے۔ ویسے میں ایک بات بول دیتا ہوں کہ تقدیر تو کیا فرزانہ بھی اگر بولے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں تو خدا کی قسم تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔"

رخسانہ ایک دم سے چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ مارے خوشی کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

بات ابھی سمجھنے کے لیے رہ گئی تھی۔ رخسانہ خوشی کے مارے سمجھ نہ سکی۔ جانی نے یہ تو کہا تھا کہ وہ فرزانہ کے کہنے پر بھی اپنی رخسانہ کو نہیں چھوڑے گا لیکن اس نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ رخسانہ کے کہنے پر وہ اپنی فرزانہ کو چھوڑ دے گا۔

اتنی سی بات رخسانہ کو بہلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ بہل گئی۔ صبح نماز پڑھنے کے لیے اٹھی تو پہلے جانی کا ٹمپریچر دیکھا۔ بخار میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ رات کو اسے دوا پلائی گئی تھی۔ اس نے نماز پڑھتے وقت پھر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر جانی کی صحت یابی اور اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو اس کی امی ناظم آباد والے مکان میں جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ مستری چاچا سے یہ طے پایا تھا

وہ ناظم آباد والے مکان میں آ کر اس کی امی کو کسی عالم دین کے پاس لے جائیں گے۔

جب اس کی امی جانے لگیں تو ان کا دل ڈوبنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بیٹی کو گڑھے میں گرانے سے پہلے گڑھا کھودنے جا رہی ہیں۔ مستری چاچا نے ایک ماں کو اپنی بیٹی کے لیے قبر کھودنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رخسانہ نے تعجب سے سوچا کہ وہ رات کو جانی کی باتوں سے کیسے بہل گئی تھی۔ کیسے خوش ہو گئی تھی اور کیسی گہری نیند سو گئی تھی۔ اب غور کرنے پر پتا چل رہا تھا کہ بے شک جانی اسے نہیں چھوڑے گا لیکن یہ جانی کے فیصلے پر منحصر نہیں تھا۔ جانی بے شک ضدی ہے۔ وہ تقدیر کا فیصلہ نہ مانتا' فرزانہ کی بات کو بھی ٹھکرا دیتا لیکن جب شرعی احکامات ہوں اور قانوناً الگ ہونا پڑے تب وہ کیا کر سکتا تھا۔ نہ جانی کی بات چلتی اور نہ ہی رخسانہ کے آنسو کام آتے' نہ ہی ننھے سے بچے کی معصومیت کا کوئی خیال کرتا۔ قانون آخر قانون ہوتا ہے۔ مذہبی احکامات اٹل ہوتے ہیں کہ جو بات غلط ہے تو وہ غلط ہے۔ جو گناہ ہے تو وہ گناہ ہے۔ گناہ کو کسی بھی پہلو سے جائز قرار دینے کے لیے کہیں سے بھی کوئی لچک پیدا نہیں کی جا سکتی۔

وہ سوچ سوچ کر آدھی ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر مکان کے باہر دیکھتی تھی کہ اس کی امی آ کر عالم کا فیصلہ سنائیں گی۔ کبھی وہ جانی کی تیمارداری میں اپنا دھیان بٹاتی تھی کبھی بچے کو سینے سے لگا کر خدا سے دعائیں مانگنے لگتی تھی۔ اسے کسی طرح چین نہیں آ رہا تھا۔ ایک بار جھوٹ بول کر اور فریب دے کر پھر چاہے ساری عمر سچی اور شریفانہ زندگی گزارو۔ تب بھی وہ ایک جھوٹ اور فریب پیچھا نہیں چھوڑتا۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر سامنے آ کر سولی پر چڑھا دیتا ہے۔

صبح سے دوپہر ہو گئی اس کی امی واپس نہیں آئیں۔ اس نے جانی کو دوپہر کا کھانا کھلایا۔ اسے پینے کے لیے دوا دی پھر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "اگر شام تک بخار کم نہیں ہو گا تو میں کسی ڈاکٹر کو لے آؤں گی۔"

اس نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ میں ایسا کمزور بھی نہیں ہوں۔ اگر شام تک بخار رہا تو ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر کسی ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔"

"تم اس حالت میں گاڑی چلاؤ گے؟"

"تو کیا ہوا۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھادیں گے۔ ہوا نہیں لگے گی۔ تم میرے پاس رہو گی تو ساری بیماریاں دور بھاگ جائیں گی۔"

اس کی باتیں سن کر رخسانہ کو جیسے گرتے گرتے سنبھلنے کا سہارا مل جاتا تھا۔ وہ مسکرا کر بولی "جانی! آج میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ بولو مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرو گے؟"

"ایک نہیں ہزار وعدے کروں گا کیونکہ میرا جو بھی وعدہ ہو گا' وہ تمہارے اور بچے کی بھلائی کے لیے ہو گا۔"

"ہاں جانی! اسی لیے میں تم سے وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"

"بھئی بتاؤ تو آخر کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"بات یہ ہے جانی کہ میرا دل بہت ڈر رہا ہے جیسے کوئی ان دیکھی طاقت ہم دونوں کو ایک دوسرے سے دور کردے گی۔"

"یہ تمہارا وہم ہے رخسانہ! کل سے تم یہی بات بولتی جارہی ہو' تمہیں آخر کس بات کا ڈر ہے؟"

"میرے ڈر کو رہنے دو' بس میری بات سن لو اور وعدہ کرو۔ میں چاہتی ہوں اگر کبھی ایسی منحوس گھڑی آئے تو تم مجھ سے الگ ہونے کے بعد کم سے کم پانچ برس تک شادی نہیں کرو گے۔ کسی بھی دوسری لڑکی سے شادی نہیں کرو گے۔"

"صاف بولو نا' تم سے کسی وجہ سے الگ ہو گیا تو فرزانہ سے شادی نہیں کروں گا' یہ نا یہی بات؟"

"میں فرزانہ کی بات نہیں کرتی۔ فرزانہ ہو یا کوئی اور ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم پانچ برس تک میرا انتظار کرو۔ اگر کوئی طاقت ہمیں الگ کردے گی تو مجھے خداوند کریم پر بھروسا ہے۔ میں اسی بھروسے پر تم سے آج یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"

"اگر تم اسی خیال سے سہمی جارہی ہو اور کل سے رو رہی ہو تو میں تمہارا ہاتھ تھام کر تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

اس نے رخسانہ کے ہاتھ کو تھام لیا پھر کہا "میں ایک مرد کی زبان دے رہا ہوں۔ اوّل تو میں تمہیں اپنے سے کبھی الگ نہیں کروں گا۔ اگر میری طاقت سے باہر کوئی بات

ہو گئی اور تم مجھ سے جدا ہو گئیں تب بھی میں پانچ برس تک تمہارا انتظار کروں گا اور تم کو اپنانے کی ضد کرتا رہوں گا۔ اب تو خوش ہو نا؟"

وہ جھک کر اس کے قدموں میں پہنچ گئی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر پانچ برس کا وعدہ لیا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات آئی تھی کہ اگر مذہبی احکامات کے مطابق انہیں الگ ہونا پڑے تو دوبارہ نکاح پڑھانے کی اجازت بھی ضرور ملے گی لیکن دوبارہ نکاح کی نوبت آنے سے پہلے فرزانہ راستے میں حائل ہو جائے گی پھر وہاں آدھے چہرے اور مکمل چہرے کا فرق پیدا ہو گا۔ اگر جانی پانچ برس تک انتظار کرتا رہا تو اتنے عرصے میں وہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرالے گی پھر وہ بھی فرزانہ کے مقابلے میں مکمل ہو کر جانی کے سامنے پہنچے گی اس وقت جانی کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ کس کا پلہ بھاری ہے۔ فرزانہ کا یا رخسانہ کا؟ فرزانہ اگر حسین ہے تو رخسانہ اس سے کم نہیں' فرزانہ اگر محبت سے اپنی طرف کھینچتی ہے تو رخسانہ اس کے بچے کو گود میں لے کر اپنی طرف آنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس وقت جو سچویشن ہو گی' اسے جانی ہی سمجھ سکے گا اور اپنے طور پر فیصلہ کر سکے گا۔

رخسانہ نے اس کے قدموں میں پہنچنے کے بعد اطمینان کی سانس لی۔ اس نے پانچ برس کے لیے اس کے قدموں میں وعدے کی زنجیر پہنادی تھی۔ شام کے چار بجے باہر ایک رکشے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا اس کی امی رکشے سے اتر رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے بچے کو جانی کی گود میں دیا اور کہا "تم یہاں بیٹھے رہو۔ باہر نہ آنا ہوا لگ جائے گی' بخار ابھی تک ہے۔ امی آئی ہیں' میں ان سے مل کر آرہی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر جانے لگی۔ جانی نے کہا "امی ادھر ہی آرہی ہیں۔ تمہارا باہر جانا کیا ضروری ہے؟"

وہ دروازے کے پاس سے پلٹتے ہوئے بولی "تم سمجھتے نہیں ہو۔ امی بہت سی باتیں تمہارے سامنے کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ اپنے سر کو خفیف سی حرکت یوں دی جیسے اشارے سے پوچھ رہی ہو "جاؤں؟"

جانی مسکرایا۔ رخسانہ دروازے سے گھوم کر کمرے سے باہر آئی۔ باہر آتے ہی اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے باہر آئی تھی۔ اس وقت

تک اس کی ای برآمدے میں پہنچ گئی تھیں۔ اس نے آہستگی سے پوچھا "کیا ہوا ای؟"

وہ تھکے ہوئے انداز میں چہرے کو چادر سے پونچھتے ہوئے بولیں "بس سب ٹھیک ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"گھبرا تو آپ رہی ہیں۔ مجھ میں سننے کا حوصلہ ہے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں جلدی سے بتادیں۔"

"بیٹی تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ مولانا صاحب نے میرا مطلب ہے عالم صاحب نے کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ انہوں نے پندرہ دن کا وقت دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسرے علمائے دین سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیں گے۔"

"لیکن آپ جن کے پاس گئی تھیں' انہوں نے اپنے علم کے مطابق کچھ کہا ہوگا؟"

"وہ کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ پیچیدہ ہے۔ وہ تنہا اس بات کا جواب دیں گے تو کوئی دوسرے عالم صاحب اس پر کوئی نکتہ نکال کر اعتراض کریں گے۔ دو چار علما کے اتفاق سے اس مسئلے کا کوئی حل پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا ای کہ مسئلے میں کیا پیچیدگی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہم نے جانی کو شادی سے پہلے دھوکے میں رکھا تھا۔"

"دیکھو بیٹی' بات اتنی سی نہیں ہے۔ بات کے اندر سے بات نکلتی گئی ہے' میں اطمینان سے بیٹھ کر بتاتی ہوں' یہاں کھڑے کھڑے کیا بتاؤں۔"

رخسانہ نے کمرے کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے بولی "وہاں جانی بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے تو بات نہیں ہوسکے گی۔ ابھی وہ تھوڑی دیر میں مجھے آواز نہ دینے لگیں۔ آپ مختصر طور پر یہیں سب کچھ بتادیجیے۔"

وہ بولیں "بیٹی' میرا حلق خشک ہورہا ہے۔ تم نے تو مجھے اور بھی بدحواس کردیا ہے۔ ذرا پانی تو پی لینے دو۔"

دونوں ماں بیٹی برآمدے سے چلتے ہوئے دروازے کے سامنے گزرتے وقت ذرا رک گئیں۔ رخسانہ کمرے کے اندر جانی کو دیکھ کر مسکرائی پھر وہیں برآمدے سے بولی "ای کو پیاس لگی ہے' میں انہیں پانی پلاکر آتی ہوں۔"

اس نے اپنی ساس کو تعجب سے دیکھا' اتنی دیر میں وہ دونوں دروازے کے سامنے

سے گزر گئیں۔ اس نے بلند آواز سے کہا "پانی پلانے سے پہلے ان کی عمر پوچھ لینا' شاید بوتل کی ضرورت پڑجائے۔ کمال ہے یہ عورت تو میرے بچے سے چھوٹی بچی بن گئی ہے۔"

دونوں ماں بیٹی باورچی خانے میں داخل ہورہی تھیں۔ جانی کی بات سن کر رخسانہ کی ای نے کہا "دیکھو دیکھو یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ آخر میرے پیچھے کیوں پڑگیا ہے۔"

"ای چھوڑیے بھی۔ جلدی سے پانی پیجیے اور کام کی بات بتائیے۔"

انہوں نے برتنوں کے پاس سے ایک گلاس اٹھایا پھر مٹکے سے پانی نکالتے ہوئے بولیں "عالم صاحب کہتے ہیں کہ ایک طرح سے نکاح بالکل درست ہے۔"

رخسانہ خوش ہوگئی "سچ ای؟"

"ہاں' مگر کہتے ہیں کہ دوسری طرح سے نکاح میں گڑبڑ ہے۔ یعنی کہ درست نہیں ہے۔"

رخسانہ مایوس ہوکر بولی "درست کیوں نہیں ہے' مجھے بتائیے۔"

اس وقت وہ پانی نکال کر پینے لگی تھیں۔ اس سے برداشت نہیں ہوا۔ گلاس کو آہستگی سے چھین کر بولی "توبہ ہے امی! سارا پانی آج ہی پی لیں گی۔"

وہ پانی کا گھونٹ نگلتے ہوئے اپنی سانس بحال کرتے ہوئے بولیں "اے لڑکی' کیا یزید کے خاندان سے آئی ہے۔ منہ کا پانی چھین رہی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ آپ باہر سے آئی ہیں۔ اتنی دور سے آکر ذرا ٹھہر کر پینا چاہیے۔ اطمینان سے سانسیں درست کرلیجیے' باتیں کرلیجیے پھر پانی پیجیے گا۔ تو عالم صاحب نے کیا کہا؟"

"وہ کہتے ہیں کہ نکاح لڑکی کے نام سے اور اس کی صحیح ولدیت سے بیان کرنے سے ہوجاتا ہے اور تمہارا نام اور تمہاری ولدیت بالکل درست تھی اور اسی نام کو جانی نے قبول کیا ہے۔ اب رہی دھوکے والی بات کہ شادی سے پہلے جانی کو دھوکا دیا گیا تھا تو اس سلسلے میں دھوکا دینے والوں کا محاسبہ کیا جائے گا اور جانی سے پوچھا جائے گا کہ اس نے رخسانہ نام کے ساتھ نکاح قبول کیا ہے تو اسے قبول ہے یا اعتراض ہے' اگر وہ اعتراض کرتا ہے تو اس دھوکا دہی کے خلاف قانونی چارہ جائی بھی کرسکتا ہے اور علمائے دین کی حمایت بھی حاصل کرسکتا ہے۔"

رخسانہ نے بڑے اعتماد سے کہا "امی مجھے پورا یقین ہے' جانی میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔"

"بیٹی! اس لڑکے کی بات نہ کرو۔ وہ آدھا پاگل ہے۔ جب بات آگے بڑھے گی تو عالم لوگ جانی سے سوال کریں گے' جب لڑکی بدل گئی تھی اور اس نے اس کی صورت بھی دیکھی تھی تب اس نے اس لڑکی کے خلاف کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟ اعتراض کیوں نہیں کیا؟"

کمرے سے جانی کی آواز سنائی دی "رخسانہ اپنی امی سے بولو کہ کراچی میں پانی کی قلت ہے۔ آخر وہ کب تک پانی پیتی رہیں گی۔"

"میں آرہی ہوں۔ بس ابھی آرہی ہوں۔"

یہ کہہ کر رخسانہ نے امی سے کہا "جلدی بتایئے نا' آخر بات کہاں تک پہنچی ہے؟"

"بیٹی میں جلدی کیا بتاؤں تم مجھے بدحواس کئے دے رہی ہو۔ عالم صاحب کہتے ہیں کہ اسلام میں عمل کی اہمیت ہے لیکن اللہ تعالیٰ عمل کے بعد نیت کو دیکھتا ہے۔ اگر شرعی طور پر ہم نے عمل کرتے ہوئے نکاح پڑھالیا تو وہ نکاح جائز ہوگا لیکن ہماری نیت کو ہمارے جھوٹ سچ کو دیکھنے والا اللہ ہے اور اس کے ہاں یہ نکاح قبول نہ ہوگا۔"

رخسانہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اسی وقت بچے کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر بولی "امی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آپ بچے کو سنبھال لیں۔ جانی سے کہئے کہ میں ابھی آرہی ہوں۔ میں ابھی ان کا سامنا نہیں کرسکوں گی۔"

اس کی امی جانے لگیں پھر پلٹ کر بولیں "بیٹی' گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ عالم صاحب نے ایک اور بات کہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ بے شک نیت کو دیکھتا ہے۔ اگر جانی کی نیت یہ ہو کہ جس کے ساتھ بھی نکاح پڑھادیا گیا ہے' اسے وہ قبول کررہا ہے یعنی ہماری طرف سے جھوٹ اور فریب جاننے کے بعد بھی تمہیں قبول کررہا ہے تو پھر یہ نکاح جائز ہوجائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئیں۔ رخسانہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی پھر دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ اسے کمزوری سی محسوس ہورہی تھی۔ سر بھاری

ہورہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات جانی تک پہنچے۔ کوئی بھی عالم جانی سے یہ سوال کرے گا کہ اسے رخسانہ قبول ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں ہے تو اس نے اتنے عرصے ازدواجی زندگی کیوں گزاری؟ طرح طرح کے سوالات اس سے کئے جائیں گے۔ یہ معاملہ اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ علمائے دین تک پہنچ گیا ہے۔ یہ بات جانی کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ بے شک اس نے پانچ برس تک وعدے کا پابند رہنے کی زبان دی ہے پھر بھی کیا ضروری ہے کہ جانی کو سب کچھ معلوم ہو اور فرزانہ اسے نہ بہکائے۔

وہ جانی سے اسی لیے یہ ساری باتیں چھپا رہی تھی۔ اتنے میں اس کی امی بچے کو لے کر پھر باورچی خانے میں آگئیں اور کہنے لگیں۔ "بیٹی ایک ضروری بات تو میں بھول گئی۔ عالم صاحب نے کہا ہے کہ جب تک دو چار علما سے بحث کرکے مشورہ کرکے کسی نتیجے پر نہ پہنچیں اس وقت تک احتیاطاً تمہیں اور جانی کو ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے اور ازدواجی زندگی اس وقت تک نہیں گزارنا چاہیے۔"

رخسانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ رشتہ توڑنے اور الگ کرنے کی بات چل نکلی تھی۔ جانی اگر صرف ایک رشتہ ہوتا تو محض کسی کے کہنے سے یا کسی مجبوری سے یا کسی کے زور دینے سے ٹوٹ جاتا کیونکہ خون کے رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں لیکن جانی تو ایک چادر تھا جسے ایک شریف عورت مرتے دم تک اپنے سر سے نہیں اتار سکتی۔ وہ ایک شرم تھی جو جانی کی مٹھی میں بند تھی۔ جانی کی مٹھی سے نکل کر کسی دوسرے کی مٹھی میں جاتی تو شرم کی وہ اہمیت' وہ وقعت' وہ قدر نہیں ہوتی۔ وہ شریف عورت ہونے کے باوجود جانی کے بعد کہیں بھی سیکنڈ ہینڈ کہلاتی پھر بچے کا کیا ہوگا؟ اگر وہ جائز نہیں ہے تو جانی باپ کیسے ہے؟ جب وہ ناجائز ہے تو رخسانہ ماں کیسے ہوئی؟ جب وہ کسی کا نہیں ہے تو پھر وہ کس کی اولاد ہے؟ اگر ان کی اولاد ہے تو ماں باپ اپنا منہ پورے سماج کو دکھا سکتے ہیں مگر گالی بن کر۔

وہ روتے ہوئے بولی "نہیں' نہیں امی' اس سے پہلے کہ مجھ سے جانی کا رشتہ اور میرے بیٹے کا رشتہ گالی ہوجائے' میں مرجاؤں گی۔ میں جانی سے کبھی الگ نہیں ہوسکتی۔"

بچہ رو رہا تھا' ماں رو رہی تھی۔ بچے کو کسی کا ڈر نہیں تھا۔ وہ ساری دنیا کو اپنے آنسو دکھا سکتا تھا۔ ماں کو جانی کا ڈر تھا۔ وہ اپنے آنسو چھپا رہی تھی اس لیے بچہ چیخ چیخ کر رو رہا

تھا اور ماں چھپ چھپ کر رو رہی تھی۔

دوسرے دن جانی کا بخار اتر گیا۔ اس نے ناشتا کرنے کے بعد لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا "اب میں ٹیکسی لے کر جاؤں گا۔"

رخسانہ نے کہا "کوئی ضروری نہیں ہے۔ آج آرام کر لو کل سے ٹیکسی چلانا۔"

"آج آرام کروں گا تو ایک دن کی دہاڑی ماری جائے گی۔ یاد رکھو ہمیں زیادہ سے زیادہ کمانا ہے۔ یہاں ڈسپنسری کھولنا ہے اور تمہیں پلاسٹک والی سرجری کے لیے باہر جانا ہے۔ اب ہمارا مقصد یہی ہوگا۔"

رخسانہ خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی پھر اس کی قمیص کا کالر درست کرتے ہوئے بولی "تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں بھی خوب محنت کروں گی اور جلد سے جلد رقم جمع کر کے تمہاری آنکھوں کے سامنے پوری طرح حسین بن کر آؤں گی۔"

جانی نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر پوچھا "رخسانہ کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارے آدھے چہرے سے گھبراتا ہوں۔"

"نہیں جانی، میں ایسی نادان نہیں ہوں، مگر اتنا تو سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھی صورت دی ہے تو مجھے تمہارے سامنے اپنی اصل صورت ہی پیش کرنا چاہیے۔ یہ تو تمہارا حق ہے کہ تم مجھ سے اچھائی طلب کرو اور میں تمہاری طلب پوری کروں۔"

وہ پلنگ کے سرہانے بیٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ رخسانہ نے اس کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھ کر جوتے کے فیتے باندھتے ہوئے کہا "میرا جی چاہتا ہے جیسے میں یہ فیتہ باندھ رہی ہوں اسی طرح تمہارے پاؤں میں زنجیر باندھ کر رکھ دوں تاکہ میرے پاس سے کہیں بھاگ نہ سکو یا تمہیں کوئی بھگا کر نہ لے جائے۔"

وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر بولا "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ دنیا کی کسی بھی چیز کو کہیں سے بھی باندھو تو جہاں سے باندھو گے وہیں سے کھلنے کی بھی جگہ بن جاتی ہے تو پھر باندھنا بیکار ہوا نا؟"

فیتہ باندھنے کے بعد وہ گھٹنوں کے بل اٹھ گئی۔ جانی کے دونوں گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر پھر اپنے ہاتھ پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم

نے بڑی اچھی بات کہی، واقعی باندھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کو اس کی مرضی اور اس کے فیصلے پر چھوڑ دینا چاہیے مگر یہ جو عورت کا دل ہوتا ہے نا، یہ بڑا کمزور ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ سمجھ کر بھی اپنے مرد کو اپنے آنچل سے باندھ کر رکھنا چاہتی ہے۔"

وہ اس پر جھک کر بولا "میں دروازہ بند کر دیتا ہوں، تم مجھے آنچل سے باندھنا شروع کر دو۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر پرے ہٹتے ہوئے بولی "اونہہ، امی باورچی خانے میں ہیں، فضول باتیں نہ کرو۔"

وہ پھر اس کے قریب آگیا اسے اپنے بازوؤں کی محبت بھری قید میں لے کر بولا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے بیچ میں اتنی محبت ہونے کے بعد بھی کوئی بات رہ گئی ہے، کیا تمہیں بھی ایسا لگتا ہے؟"

"ہاں جانی، مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔ دیکھو جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، ہم بہت خوش رہتے ہیں۔ تم نے مجھے اتنا خوش رکھا ہے جس کی میں توقع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مثلاً تم مجھ سے کبھی کسی بات پر ناراض نہیں ہوتے۔ کبھی ہمارے درمیان جھگڑا نہیں ہوتا، کوئی ایسی ویسی بات ہوتی بھی ہے تو کبھی تم خاموش رہ کر اسے ٹال دیتے ہو اور کبھی میں خاموش رہ کر بات کو نظر انداز کر دیتی ہوں۔"

"میں کچھ اور پوچھ رہا تھا، تم کچھ اور کہہ رہی ہو۔"

"میں سمجھ گئی ہوں۔ تم نے یہی کہا ہے کہ ہمارے درمیان کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے یا ہمیں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

"میں یہی سمجھتا ہوں، دیکھو نا چہرے کی کوئی بات نہیں ہے، مجھے امید ہے بلکہ یقین ہے کہ تمہارا چہرہ کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو جائے گا، اصل بات کچھ اور ہے؟"

رخسانہ نے کہا "اب ہمارے درمیان فرزانہ کا مسئلہ بھی نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے تم کمی محسوس کرتے ہو۔"

"نہیں رخسانہ، جب میں تمہارے پاس اور بچے کے پاس آتا ہوں تو ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہوتا۔ صرف تم ہوتی ہو اور میرا بیٹا ہوتا ہے۔"

"میں بتاؤں کیا کمی رہ گئی ہے؟"

"ہاں یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ اگر تم نے سمجھ لیا ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"دیکھو' آج تک میں نے تمہیں کوئی ایسا موقع نہیں دیا جس پر تم مجھے بری طرح ڈانٹ سکو' جھڑک سکو یا مار سکو۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"اور آج بھی تم کسی بھی بات پر ناراض نہیں ہوئے' غصہ نہیں دکھایا' کبھی مجھے ڈانٹا تک نہیں۔"

"ہاں یہ بات بھی ہے۔"

"یہی وہ کمی ہے' میاں بیوی کے درمیان کبھی کبھی تھوڑا سا جھگڑا ہونا چاہیے نا اور ہم کبھی جھگڑتے ہی نہیں ہیں۔"

وہ سوچتے ہوئے بولا "ہاں میرے دوست بھی کہتے ہیں کہ آدمی کو عورت کے سامنے مرد بن کر رہنا چاہیے۔ مرد بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کبھی کبھی دو چار ہاتھ اپنی عورت پر جھاڑ دیا کرے۔ کسی بات پر غصہ دکھائے' کبھی کھانے کا برتن پھینک دیا کرے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "تو پھر کیا خیال ہے۔ ہم کیوں نہ جھگڑے کا پروگرام بنائیں۔"

"ہاں' ایسا کر کے دیکھتے ہیں شاید یہ کمی دور ہو جائے۔"

"ضرور دور ہو گی' دیکھو ایسا کرتے ہیں جب تم رات کو ٹیکسی چلا کر واپس آؤ گے تو میں تم سے جھگڑا کروں گی کہ تم روز دیر سے گھر کیوں آتے ہو۔ گھر کو ہوٹل بنا رکھا ہے بس کھانے اور سونے کے وقت آ گئے اور اس کے بعد چلے گئے۔"

وہ خوش ہو کر بولا "ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ اگر تم زیادہ بولو گی تو مجھے غصہ آ جائے گا پھر میں تڑاخ سے ایک طمانچہ رسید کر دوں گا اور تم رونا شروع کر دو گی۔"

"ہائے جانی' تم مارو گے تو میں واویلا نہ کروں گی' خوشی سے مر جاؤں گی۔"

"کیا مارنا ضروری ہے؟" اچانک جانی نے سنجیدگی سے پوچھا "کیا تم ابھی نہیں رو رہی ہو۔"

رخسانہ اسے چونک کر دیکھنے لگی۔ پہلے چند لمحوں تک سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر

ہچکچاتے ہوئے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو تمہارے اندر ہے۔ کیا تم نہیں رو رہی ہو؟"

"نہیں جانی' تمہیں خواہ مخواہ شبہ کیوں ہے۔ میں بھلا کیوں روؤں گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تڑاخ کی ایک آواز کے ساتھ جانی کا ایک طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ دوسری طرف گھوم کر دیوار سے ٹکرا گئی پھر جانی نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا "تم جانی کو بے وقوف سمجھتی ہو۔ میں دو دن سے دیکھ رہا ہوں' تم اندر ہی اندر رو رہی ہو بلکہ اندر ہی اندر مر رہی ہو۔ کیوں روتی ہو؟ کیوں مرتی ہو؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ کیا مجھ کو مردہ سمجھ کر ماتم کرتی ہو؟"

وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انکار میں سرہلاتے ہوئے بولی "نہیں جانی' ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔ تم لمبی عمر تک سلامت رہو گے۔ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے مروں گی' ایسی بات مت کرو۔ میں نہیں روتی ہوں۔"

"دیکھو مجھ سے جھوٹ مت بولو' مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میں نے تمہارا ایک شادی والا جھوٹ برداشت کیا اس کے بعد اب برداشت نہیں کروں گا۔ بری طرح تمہیں مارنا پیٹنا شروع کر دوں گا۔ اگر اپنی خیریت چاہتی ہو تو بتاؤ' تم دو دنوں سے چپکے چپکے کیوں رو رہی ہو؟"

"جانی یہ تمہارا وہم ہے۔"

وہ گلے کا ہار بننے لگی۔ جانی نے اس کے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے الگ کر کے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا "میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔"

"جانی' آج تک تم نے مجھے کسی بات سے نہیں رلایا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔ کسی بات کی کمی نہیں ہونے دی پھر بتاؤ تو سہی میں آخر کیوں روؤں گی؟"

پھر ایک تڑاخ کی آواز کمرے میں گونجی اور رخسانہ کا منہ گھوم گیا۔ بے اختیار اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ باورچی خانے سے اس کی امی چیختے ہوئے' دوڑتے ہوئے آنے لگیں "ہائے' میری بچی کو کیا ہو گیا۔ ارے' یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ کمرے کے دروازے پر پہنچیں پھر بچے کو اٹھائے اندر آنا چاہتی تھیں کہ جانی نے

انہیں روک کر کہا "خبردار' کمرے میں مت آنا۔ چلی جاؤ یہاں سے۔"

"اے منہ سنبھال کر بات کر۔ تم میری بچی کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو؟"

"میں آج تمہاری بچی کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔ تم دونوں مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ جھوٹ پر جھوٹ بولتی جارہی ہو۔ سمجھتی ہو کہ ایک آدمی سیدھا اور شریف بن کر زندگی گزاردے گا۔ اس کو کبھی غصہ نہیں آئے گا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

یہ کہتے ہی اس نے انہیں ایک زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے برآمدے میں جاگریں۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ باہر بچہ رو رہا تھا' اندر رخسانہ روتے ہوئے' جانی کے قریب آتے ہوئے بولی "جانی خدا کی قسم میں نے آج تک تم سے کوئی ایسا جھوٹ نہیں کہا جس سے تمہیں نقصان پہنچے' اگر کبھی کچھ چھپاتی ہوں تو اس میں ہماری تمہاری بھلائی ہوتی ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی اس نے اس کو دونوں بازوؤں سے جکڑ کر پوچھا "تم مجھے رونے کی وجہ بتاؤ گی یا نہیں؟"

"نہیں جانی' مجھ سے کچھ مت پوچھو۔"

اس نے پھر ایک دو ہاتھ اسے جمادیئے پھر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا۔ وہاں سے اٹھا کر پلنگ کے پاس لایا اور بستر کے اوپر پٹخ دیا۔ رخسانہ کے حلق سے پھر ایک بار چیخ نکل گئی۔

باہر وہ چیخ سن کر اس کی امی لرز گئیں۔ وہ بچے کو فرش پر چھوڑ کر دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس گئیں پھر دروازے کو پیٹتے ہوئے بولیں "جانی' دروازہ کھولو۔ میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ نہیں تو بہت برا ہوگا۔ ارے کوئی میری بچی کو بچائے' یہ قصائی تو اسے مار ڈالے گا۔"

اندر سے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ وہاں سے دوڑتے ہوئے برآمدے سے گزرتے ہوئے باہر آئیں پھر دوسری طرف کھڑکی کے پاس پہنچیں' وہاں سے بھی انہیں کچھ نظر نہیں آیا کیونکہ کھڑکی کے پٹ اندر سے بند تھے۔ وہ کھڑکی سے کان لگا کر سننے لگیں۔ کچھ چیزوں کے گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ پھر وہاں سے پلٹ کر دوڑتے ہوئے برآمدے کی طرف جانے لگیں۔ بچہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ انہوں نے بچے کو

اٹھالیا پھر تھپکتے ہوئے غصے سے بولیں "چپ ہوجا' نہیں تو' وہ ادھر میری بیٹی کو مار رہا ہے' ادھر میں تجھے مارنے لگوں گی۔"

یہ کہتے ہی انہیں کچھ عقل آئی۔ وہ دروازے کو پیٹ کر کہنے لگیں "جانی' میری بیٹی کو چھوڑ دے نہیں تو میں تیرے بیٹے کا گلا دبادوں گی۔"

دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے' بچہ بھی چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ کبھی بچے کو تھپکتی تھیں' کبھی اسے سمجھاتی تھیں مگر بچہ کہاں سمجھتا ہے۔ وہ تو ماں کی گود کی گرمی یا اپنی نانی کی محبت کو سمجھ سکتا تھا۔ گھبراہٹ پریشانی اور بدحواسی میں نانی محبت کرنا بھول گئی تھیں۔ وہ پھر دروازے کے پاس آئیں اور کان لگا کر سننے لگیں۔

اندر کی آواز سنائی بھی کیسے دیتی۔ گود میں بچہ رو رہا تھا۔ رونے والی آواز قریب تھی اور جو آواز وہ سننا چاہتی تھیں' وہ بہت دور تھی اور تجسس پیدا کر رہی تھی۔ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ بیٹی کو مار کھاتے دیکھ چکی تھیں اس لیے اسی مناسبت سے سوچ رہی تھیں کہ وہ اس وقت کیسے مار رہا ہے اور تقدیر دھکے دے رہی ہے۔ قصاب ذبح کر رہا ہے اور بکری جھٹپٹا رہی ہے اور باہر بکری کی ماں خیر منا رہی تھی۔

بچے کو چپ کرانے میں تھوڑا وقت گزر گیا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ بچہ چپ ہوگا تو وہ پھر دروازے کو پیٹ پیٹ کر فریاد کریں گی اور جانی کو دروازہ کھولنے پر مجبور کریں گی لیکن بچہ چپ ہو کر سونے لگا۔ وہ اس کے سونے کا انتظار کرنے لگیں' جب وہ سو گیا تو وہ اسے باورچی خانے میں لے گئیں' وہاں فرش پر چھوٹا سا بستر بچھایا اور اسے اس پر ڈال دیا۔ وہ پھر ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔ انہوں نے فوراً ہی دودھ کی بوتل منہ سے لگادی' بچے کو بہلانے اور سلانے میں کافی وقت گزر گیا۔

وقت جب گزرتا ہے تو اپنے ساتھ بہت سی اونچ نیچ لے کر گزرتا ہے۔ گزرتے گزرتے کبھی پتھر مارتا ہے اور کبھی پھول مارتا ہے۔ کبھی رلاتا ہے اور کبھی گدگدی کردیتا ہے۔ جب اماں جان بچے کو سلا کر دروازے پر آئیں' تو اندر سے رخسانہ کے ہولے ہولے' ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اماں جان کے تو حیرانی سے دیدے پھیل گئے۔

رخسانہ' جانی کے بازو میں منہ چھپائے ہنس رہی تھی اور اپنے نازک ہاتھ سے اسے

ہولے ہولے مار رہی تھی۔ جانی نے اس کے ہاتھ کو پکڑلیا پھر اس ہاتھ کو چوم کر ایک گہری سانس لی اور شکست خوردہ انداز میں کہا ”چلو میں ہار گیا‘ اب تم سے نہیں پوچھوں گا کہ دو دن سے کیوں چھپ چھپ کر رو رہی ہو مگر میں انتظار کروں گا۔ تم خود ہی مجھے بتاؤ گی۔ نہیں بتاؤ گی تو میں اوپر سے مسکراؤں گا اور چھپ چھپ کر تم سے ناراض رہوں گا۔“

اماں جان نے باہر سے دروازے پر کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہ دروازے سے ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہو گئیں پھر آہستگی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولیں ”لعنت ہے آج کل کی لڑکیوں پر مردوں کے جوتے کھا کر بھی ہنستی رہتی ہیں۔ ارے ہم نے بھی تو شادی کی تھی۔ مجال ہے جو ہمارا مرد ہم پر انگلی بھی رکھ دیتا۔ ہم انگلی ہی توڑ کر رکھ دیتے۔“

رخسانہ اس کے بازوؤں میں منہ چھپائے چپ چاپ پڑی رہی۔ ویسے اسے کہنا چاہیے تھا کہ جانی میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی اور نہ اپنے رونے کی وجہ بتا دوں گی لیکن وہ بتانا نہیں چاہتی تھی اور اس لیے جانی سے وعدہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اسے جانی نے دھمکی دی تھی کہ وہ نہیں بتائے گی تو وہ چھپ کر ناراض رہے گا۔ کوئی بات نہیں‘ وہ بھی تو اتنے عرصے سے یہی چاہتی تھی کہ جانی کبھی ناراض ہو‘ کبھی غصہ دکھائے۔ آج جیسا ہاتھ اٹھایا ہے‘ ایسا روپ تو اس نے پہلے کبھی نہیں دکھایا تھا۔ یہ روپ بھی اتنا اچھا تھا کہ وہ ایک نہیں ہزار بار اس کے ہاتھوں سے مار کھا سکتی تھی اور اس کے ہاتھوں سے مر سکتی تھی۔

جانی تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ بولے گی پھر اس نے خود ہی کہا ”معلوم ہوتا ہے مجھ سے ناراض ہو۔ میرا ہاتھ ذرا بھاری پڑ گیا تھا۔“

وہ منہ چھپانے کے لیے اور گھسنے لگی۔ جانی نے کہا ”دیکھو نا“ تم لڑائی جھگڑے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ تم دو دن سے رو رہی ہو اور مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ مجھے اپنا نہیں سمجھ رہی ہو۔ مجھ سے جھوٹ بولتی جا رہی ہو۔ بس پھر تو مجھے غصہ آ گیا۔ پروگرام کی ایسی تیسی ہو گئی اور میں نے سچ مچ میں تمہاری پٹائی کر دی۔“

وہ کچھ نہیں بول رہی تھی‘ صرف سن رہی تھی۔ اس کا منہ چھپا ہوا تھا۔ وہ جانی کو

نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ آہستگی سے اٹھا پھر کسی اندھے کی طرح ٹٹولتا ہوا جانی کے چہرے پر پہنچ گیا۔ وہ اپنی ملائم انگلیوں سے اس کے چہرے کو سہلانے لگی۔ جانی کو اس کی اس ادا پر بڑا پیار آیا اس نے کہا ”رخسانہ‘ آج نہیں تو کل تم اپنا دکھ مجھے بتاؤ گی نا؟“

اس نے انکار میں سر ہلایا پھر آہستگی سے بولی ”نہیں بتاؤں گی‘ پوچھو کہ کیوں نہیں بتاؤں گی؟“

”پوچھنے سے پہلے ہی بتا دو۔“

وہ ذرا اور قریب ہو کر سمٹ کر بولی ”اس لیے کہ میں نہیں بتاؤں گی تو تمہیں غصہ آتا رہے گا۔ تم مجھ سے جھگڑا کرتے رہو گے‘ روز یہی ہو گا۔ میں اپنی ضد پر قائم رہوں گی اور تم روز میری پٹائی کرتے رہو گے۔“

”ایسی بھی کیا ضد ہے جان‘ بتا دو؟“

”میں نے کہہ دیا نا کہ نہیں بتاؤں گی۔“

اس وقت دروازے کے باہر مستری چاچا کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید اس کی امی سے کہہ رہے تھے۔ ”میں نے تمہیں عالم صاحب کا حکم سنا دیا تھا اس کے باوجود وہ دونوں ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“

یہ کہتے ہی دروازے پر دستک دینے کی آواز سنائی دی پھر مستری چاچا نے کہا ”جانی‘ دروازہ کھولو‘ میں کچھ ضروری باتیں کہنے کے لیے آیا ہوں۔“

مستری چاچا کی آواز سنتے ہی رخسانہ کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ پہلے ہی جانی سے الگ ہو کر دور چلی گئی تھی۔ جانی بھی اٹھنے لگا۔ رخسانہ نے کہا ”دیکھو جانی‘ میری ایک بات مانو گے۔“

جانی نے کہا ”تم میری کون سی بات مان لیتی ہو۔ ابھی اس بات کا جواب دے دو میں تمہاری بات مان لوں گا۔“

”ابھی وہ بات نہ اٹھاؤ‘ میں اس وقت تم سے ایک بہت ضروری التجا کر رہی ہوں۔“

”کیا بات ہے؟“

”تم ابھی مستری چاچا سے کوئی بات نہ کرو۔ ان سے کہہ دو کہ تم دو دن سے بیمار ہو۔ اور اس قابل نہیں ہو کہ ان سے کسی مسئلے پر گفتگو کر سکو۔ تم یہاں لیٹ جاؤ۔ میں چادر

اوڑھا دیتی ہوں۔ مستری چاچا سے میں نمٹ لوں گی۔"

ایسی کیا بات ہے کہ میں مستری چاچا سے بات نہ کروں)۔ وہ آخر کس مسئلے پر بات کریں گے؟"

"جو بھی مسئلہ ہو' جو بھی بات ہو تم بیماری سے اٹھے ہو تمہیں زیادہ بات نہیں کرنا چاہیے۔ تم لیٹ جاؤ۔"

"واہ اچھی زبردستی ہے۔ ابھی تو میں ٹیکسی لے کر باہر جارہا تھا اور اتنی جلدی پھر میری طبیعت خراب ہوگئی۔ تم کیسی ڈاکٹرنی ہو۔ صحت مند کو مریض بنائے دے رہی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف جانے لگا۔ دروازے پر پھر دستک ہورہی تھی۔ رخسانہ دوڑتے ہوئے آئی اور اس کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔ "جانی' تم میری اتنی سی بات نہیں مانو گے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج تم مجھے مستری چاچا سے باتیں کرنے سے کیوں روک رہی ہو؟"

"بس روک رہی ہوں۔ میرا تم پر حق ہے اس لیے میری بات مان لو۔"

"معلوم ہوتا ہے دو دن سے جو راز تم مجھ سے چھپا رہی ہو' اس کا تعلق یا تو مستری چاچا سے ہے یا پھر مستری چاچا تمہارے رونے کی وجہ جانتے ہیں اور مجھے بتانے آئے ہیں۔ چلو ہٹو' میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔"

وہ اسے ہٹا کر جانا چاہتا تھا مگر وہ پہلے دیوار تھی اب دیوانہ وار ہوگئی۔ بڑی محبت سے دار کیا اور خودداری واری ہونے لگی۔ جانی نے ایک گہری سانس لی۔ شکست خوردہ انداز میں اسے دیکھا پھر کہا "اچھی بات ہے' میں بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ مجھے چادر اوڑھا دو اور مستری چاچا سے جو کہنا چاہو جا کر کہہ دو۔"

وہ پلنگ پر آکر لیٹ گیا۔ رخسانہ نے اس پر ایک چادر ڈال دی۔ بے چاری اندر سے گھبرائی ہوئی تھی۔ باہر مستری چاچا بار بار دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ اسی گھبراہٹ اور پریشانی میں اس نے یہ خیال نہیں کیا کہ جانی جوتوں سمیت بستر پر لیٹا ہوا ہے پھر وہ دروازہ کھول کر باہر جانا چاہتی تھی کہ مستری چاچا دروازے کے آگے دیوار بن

گئے۔ رخسانہ نے کہا "ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آپ باہر چلیں۔ میں آپ سے بات کرلیتی ہوں۔"

مستری چاچا کمرے کے اندر گھستے ہوئے بولے "طبیعت کیسے ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی میں دروازے کے باہر کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ اس گدھے کی آواز دروازے کے باہر آرہی تھی اور اب چادر اوڑھ کر لیٹا ہوا ہے۔ یہ کیسی طبیعت خراب ہے۔ تم لیڈی ڈاکٹر ہو نا۔ اس بیماری کی حالت میں کیا مریض جوتے پہن کر سوتا ہے؟"

جانی نے فوراً اٹھ کر چادر پھینک کر کہا "واہ مستری چاچا' کیا سوال مارا ہے۔ چلو رخسانہ اب جواب دو۔ میرے پیچھے پڑگئی تھیں کہ میں بیمار بن جاؤں' ارے یہ مستری چاچا ہیں۔ ان کو کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا' آؤ' چاچا بیٹھو۔ بولو کیا بات کرنے آئے ہو۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھنے لگا۔ رخسانہ کی امی بھی بچے کو گود میں لیے کمرے میں آگئیں۔ مستری چاچا نے کچھ کہنے سے پہلے رخسانہ کو دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور وہ آنکھیں بڑی خاموشی سے التجا کررہی تھیں۔ مستری چاچا نے اسے دیکھ کر سر جھکالیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر جانی کی طرف دیکھ کر کہا "جانی تو مانتا ہے ناکہ میں سمجھ داری کی باتیں کرتا ہوں اور جو مشورہ دیتا ہوں وہ اچھائی کے لیے دیتا ہوں۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے چاچا' تم مشورہ دو۔ میں اسے مان لوں گا۔"

"تو پھر سنو' شادی کرنے کے بعد میاں بیوی کو ایک دوسرے سے کچھ عرصے کے لیے الگ بھی رہنا چاہیے۔ تم دونوں کی شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ میں نے سنا ہے تم دونوں کبھی ایک دن کے لیے بھی علیحدہ نہیں ہوئے۔ دن کو الگ ہوئے تو رات کو مل گئے۔ رات کو الگ ہوئے تو دن کو مل گئے۔"

جانی نے پوچھا "کیا اس میں کچھ برائی ہے؟"

"برائی نہیں ہے۔ میں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ تم کچھ روز کے لیے رخسانہ کو اس کے میکے بھیج دو۔ یہ اپنی امی کے پاس رہے گی۔ کم از کم پندرہ دن تک اس سے نہ ملو۔"

جانی نے کہا "رخسانہ اپنے میکے میں کیوں رہے گی۔ ان کی اماں جان تو میرے گھر میں رہ رہی ہیں۔ اسی گھر کو انہوں نے بیٹی کا میکہ بنایا ہوا ہے اور کون سا میکہ ہوگا؟"

اس کی ساس نے کہا "اے جانی خبردار! میرے بارے میں کوئی بات نہ بولنا۔"
رخسانہ نے کہا "امی! خدا کے لیے خاموش رہیں۔ مستری چاچا کو بات کر لینے دیں۔"

"ارے یہ کیا بات کریں گے۔ تم سب لوگوں نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے' میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ گاڑی چلاتے وقت ہر طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ ہر بات کا خیال رکھتا ہوں۔ اس وقت بھی میں نے دائیں بائیں دیکھا ہے۔ مستری چاچا کچھ اور کہنے جارہے تھے لیکن تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر انہوں نے بات بدل دی۔ اب میں یہ پوچھ کر رہوں گا کہ تم مجھ سے پندرہ دن کے لیے کیوں دور رہوگی؟ کیوں اپنی ماں کے گھر جاکر رہوگی؟ میں تو تمہیں اپنے سے دور نہیں کروں گا اور نہ ہی جانے کی اجازت دوں گا۔"

مستری چاچا نے کہا "جانی' میں تجھ سے کہتا ہوں۔ کیا میرا حکم نہیں مانے گا؟"

"چاچا' اس حکم کے پیچھے جو بات ہے وہ مجھ سے نہ چھپاؤ' چھپاؤ گے تو میں نہیں مانوں گا۔"

مستری چاچا نے رخسانہ کی طرف دیکھا۔ رخسانہ نے نظریں جھکالیں۔ جانی نے غصے سے کہا "رخسانہ تمہاری یہ خاموشی مجھے زہر لگ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی تمہارا گلا دبادوں۔ تم مجھے کیوں غصہ دلا رہی ہو؟"

رخسانہ کی امی نے کہا "بھائی صاحب' یہ آپ کے آنے سے پہلے میری بیٹی کو مار رہا تھا۔ یہ انسان سے درندہ بن گیا ہے۔ خدا کے لیے آپ اسے سمجھائیں' عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں ہے۔"

جانی کچھ کہنے جارہا تھا۔ مستری چاچا نے ہاتھ اٹھا کر کہا "تم بالکل خاموش رہو' میں بول رہا ہوں۔ دیکھو بہن' بات جب ایک جھوٹ سے شروع ہوتی ہے تو اس کے بعد ہزار جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو شریفوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ رخسانہ کے ساتھ مارپیٹ کی نوبت بھی شاید اسی سلسلے میں آئی ہو۔ بہرحال اب میں بات چھپانا نہیں چاہتا اس لیے جانی تم سن لو۔"

اچانک ہی رخسانہ ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ جانی نے اس کی طرف

دیکھا تو وہ دوسری طرف گھوم گئی۔ اس نے مستری چاچا سے کہا "یہ ایسے ہی روتی رہتی ہے' اس کی پروا نہ کرو۔ جو بول رہے تھے' بولتے رہو۔ میں سن رہا ہوں۔"

مستری چاچا نے رخسانہ کی طرف ہمدردی سے دیکھا' نظریں جھکا کر تھوڑی دیر تک کچھ سوچا پھر کہنے لگے "بات اصل یہ ہے کہ میں اور رخسانہ کی امی ایک عالم دین کے پاس گئے تھے۔ تمہاری اور رخسانہ کی جو شادی ہوئی ہے' اس کے بارے میں مجھے شک ہے' وہ شک میں دور کرنا چاہتا تھا۔"

جانی نے پوچھا "کیسا شک؟ ذرا صاف صاف بولو۔"

"یہی کہ شادی سے پہلے تم سے جھوٹ بولا گیا فرزانہ کو دکھایا گیا اور رخسانہ سے نکاح پڑھایا گیا۔ ایسے جھوٹ اور فریب کے ساتھ تم لوگوں کا نکاح درست ہے یا نہیں۔ ہم یہی معلوم کرنے گئے تھے۔"

"پھر؟ جانی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

مستری چاچا نے کہا "دراصل ہم جن کے پاس گئے تھے' وہ عالم دین نہیں مولوی صاحب ہیں۔ وہ اپنی طرف سے کوئی فیصلہ سنانا نہیں چاہتے۔ وہ چار علمائے دین سے مشورہ کرنے کے بعد ہمیں فیصلہ سنائیں گے۔ اس وقت تک کے لیے انہوں نے کہا ہے کہ احتیاطاً ایسے میاں بیوی کو ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے۔"

تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ مستری چاچا اور رخسانہ کی امی' جانی کو دیکھنے لگے۔ خاموشی بڑھ گئی تو رخسانہ نے بھی چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے گھوم کر جانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اب وہ جواباً کیا کہے گا؟ کیا فیصلہ سنائے گا۔ کیا اس فیصلے کو مان لے گا کہ میاں بیوی کو الگ رہنا چاہیے؟

جانی نے رخسانہ کی طرف دیکھا پھر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا "ہوں تو تم اس لیے دو دنوں سے چھپ چھپ کر رو رہی تھیں۔ تمہاری جیسی جھوٹی اور فریبی عورت کا یہی انجام ہونا چاہیے جو عورت اپنے مرد سے باتیں چھپاتی ہو اسے اپنے مرد سے الگ ہی رہنا چاہیے؟"

"نہیں نہیں۔" کہتے ہوئے دوڑ کر جانی کے پاس آئی پھر اس کے قدموں سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ "میں نہیں جاؤں گی' میں تم سے الگ نہیں ہو سکتی' تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں

گی۔"

"کوئی بات نہیں' تم یہاں رہو۔ یہ مکان اور پلاٹ سب کچھ میں نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی "یہ مکان تمہارے دم سے ہے۔ تم نہیں رہو گے تو میں یہ مکان لے کر کیا کروں گی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم جاؤ گے تو میں تمہارے پیچھے یہاں سے نکل جاؤں گی۔ جہاں تم بھٹکو گے' وہاں میں بھی تمہارے ساتھ سائے کی طرح رہوں گی۔ جانی تم نے تو زبان دی ہے کہ مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے۔"

"ہاں' میں نے ضرور زبان دی ہے لیکن جب قانونی طور پر اور مذہبی طور پر ہمیں الگ کرنے کا فیصلہ سنایا جائے گا تو اس کے آگے میں یا تم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمیں تو حکم ماننا پڑے گا۔ جو غلطی تم نے یا تمہارے ماں باپ نے کی ہے' اس کی سزا صرف تمہیں ہی نہیں مجھے بھی ملے گی۔ میں تم سے اور بچے سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ یہ علیحدگی جو ہو رہی ہے' اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے پیچھے کس کی مکاریاں' کس کا جھوٹ اور فریب ہے یہ بولنے کی اب ضرورت تو نہیں رہی پھر مجھے الزام دیتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

مستری چاچا نے کہا "مذہبی' قانونی اور تہذیبی پابندیوں کے بغیر ازدواجی زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ جو ان پابندیوں کے خلاف ایسی زندگی گزارتے ہیں' وہ ناجائز ہوتی ہے۔"

رخسانہ غصے سے تلملا کر کھڑی ہو گئی۔ مستری چاچا کی طرف دیکھ کر اور مٹھیاں بھینچ کر بولی "مستری چاچا' آپ میری زندگی برباد کر رہے ہیں۔ میرے بسے بسائے گھر کو اجاڑ رہے ہیں۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ آپ گڑے مردے اکھاڑتے؟ ہم سکون سے ہنستے بولتے زندگی گزار رہے تھے لیکن آپ کو یہ اچھا نہیں لگا۔ آخر آپ کی بھی تو بیاہی ہوئی بیٹیاں ہیں' ان کے ساتھ کوئی ایسی زیادتی کرے گا' ان کی زندگی برباد کرے گا' ان سے ان کے شوہروں کو چھینے گا تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟"

"بیٹی' ہمارے یہاں اللہ نہ کرے ایسی نوبت آئے۔ ہم نے شریعت کے مطابق خوب سوچ سمجھ کر' چھان بین کرنے کے بعد لڑکے والوں نے ہمیں سمجھنے کے بعد' ہم نے لڑکے والوں کو سمجھنے کے بعد شادیاں کی ہیں۔ میری جو بیٹیاں بیاہی گئی ہیں ان پر کوئی آنچ

نہیں آئے گی کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں لگتی۔ یہ آنچ تمہیں لگ رہی ہے میں پھر سمجھاتا ہوں' زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم دونوں پھر ازدواجی زندگی گزارو گے۔ صرف پندرہ دن کی بات ہے' پندرہ دنوں کے لیے تم اپنے میکے چلی جاؤ۔ جانی کو یہاں چھوڑ دو۔ انشاء اللہ جب یہ پندرہ دن گزر جائیں گے تو کوئی اچھا ہی فیصلہ سننے میں آئے گا۔"

"نہیں چاچا' مجھے بہلایا نہیں جا سکتا۔ ایک بات میں جانتی ہوں کہ مذہبی پابندیاں بہت سخت ہوتی ہیں۔ پہلے ہی سے سمجھایا جاتا ہے کہ جھوٹ مت بولو' دھوکا مت دو' مذہب کو پردہ نہ بناؤ اور اس پردے کے پیچھے مکاریاں نہ کرو۔ جب سمجھائے جانے کے باوجود بھی ہم ایسا کرتے ہیں تو پھر معافی کی گنجائش نہیں نکلتی۔ مذہبی قانون میں کوئی لچک نہیں ہوتی' اگر لچک ہو جائے تو آئندہ بھی غلطیوں کے لیے خطاؤں کے لیے راستے ہموار ہوتے ہیں' یہ سوچ کر کہ آگے چل کر معافی مل جائے گی۔"

"جب تم ایسا سمجھتی ہو تو پھر تم اور تمہارا والدین نے غلطی کیوں کی؟"

رخسانہ نے اپنے چہرے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "چاچا' اس چہرے کو دیکھیے' اگر آپ کی بیٹی کا چہرہ اس طرح بگڑ جاتا تو میں اس وقت پوچھتی کہ آپ اپنی بیٹی کو کس طرح سہاگن بناتے۔ جب آپ کے گھر میں رشتہ مانگنے والے آتے اور آپ کی بیٹی کو نفرت سے دیکھ کر واپس چلے جاتے اور آپ کی بیٹی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جاتی جس کے لیے ڈاکٹر یہ فیصلہ سنا دیتے کہ اس کا علاج شادی ہے تب آپ کیا کرتے۔ مستری چاچا' آپ گیراج کے مالک ہیں۔ بگڑی ہوئی گاڑیوں کو بناتے ہیں لیکن آپ اپنی بیٹی کے بگڑے ہوئے چہرے کو کیسے بناتے؟ کیا آپ کا کام پوری ایمانداری سے چلتا ہے؟ کیا گاڑیوں کے پرزے گیرج میں بدلے نہیں جاتے؟ معمولی پرزے لگا کر اچھی کوالٹی کی قیمت وصول نہیں کی جاتی؟ کیا گاڑی کو اس انداز میں ٹھیک نہیں کیا جاتا کہ وہ دوبارہ جلد ہی مرمت کے لیے آئے اور آپ پھر سے پیسے بنائیں؟ بے ایمانی زندگی کے کس شعبے میں نہیں ہوتی۔ جہاں اپنی گاڑی رکتی ہے' وہاں لوگ بے ایمانی سے دھکا دے کر اس گاڑی کو آگے بڑھا دیتے ہیں۔"

"بیٹی' اپنا غصہ اتارنے کے لیے مجھے جو بھی الزام چاہو دو لیکن میں جانتا ہوں اور

میرا خدا جانتا ہے کہ میں اپنے کاموں میں بے ایمانی نہیں کرتا۔"

جانی نے کہا "ارے' ارے چاچا' کیوں جھوٹ بولتے ہو' میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔ کیا میں گیراج کا دھندا نہیں جانتا۔ یہ رخسانہ تو بہت حد تک صحیح بول رہی ہے۔ کیا تم میرے سامنے چھوٹو سے کبھی وھیل کیپ کبھی گاڑی کے دوسرے پرزے سستے داموں نہیں خریدتے؟"

"خریدنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مال لاکر بیچتا ہے اور میں خرید لیتا ہوں۔"

"حالانکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ چھوٹو گاڑی کے پرزے چرایا کرتا ہے۔"

"وہ چوری کرے' بے ایمانی کرے' مجھے اس سے کیا۔ میں تو قیمت دے کر اس سے مال خریدتا ہوں۔"

رخسانہ نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا "آپ چھوٹو کی بے ایمانی اور چوری کو اس لیے نظرانداز کرتے ہیں کہ آپ کو اس کے ذریعے سستا مال ملتا ہے اور آپ میری ایک چھوٹی سی بے ایمانی کو' جھوٹ کو نظرانداز نہیں کر رہے ہیں کیونکہ آپ کو مجھ سے یا میرے خاندان والوں کی طرف سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ بتائیے چھوٹو کے مال کو آپ کتنے میں خریدتے ہیں اور میرے جھوٹ کو چھپانے کے لیے آپ کتنی رقم چاہتے ہیں؟"

مستری چاچا اچھل کر کھڑے ہو گئے "کیا تم مجھے ایمان فروش سمجھتی ہو۔"

جانی نے کہا "ارے چاچا' اپنی باری آئی تو غصے میں کیوں اچھل رہے ہو۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کرو۔ کچھ تو میں بھی تمہارے کاروبار کے بارے میں جانتا ہوں۔ خواہ مخواہ قسم کھانے سے اور اپنے آپ کو پورا ایمان دار بولنے سے تو بات نہیں بنے گی۔ رخسانہ کی بات مان لو۔ یہ ٹھیک کہتی ہے کہ بے ایمانی سب کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت جھوٹ ہر آدمی اپنی زندگی میں بولتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بہت سے لوگ جھوٹ بول کر بھول جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی معاملے میں جھوٹ نہیں بولا۔"

رخسانہ نے کہا "ہم سب لوگوں میں یہ کمزوری ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تھوڑی سی بے ایمانی کرکے اور زیادہ ایمانداری دکھا کر اس بے ایمانی پر مٹی ڈال سکتے ہیں۔ اسے دنیا والوں سے چھپا سکتے ہیں بلکہ آپ جیسے لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے اس بے ایمانی کو خدا سے چھپا لیا ہے۔ اسی لیے آپ نمازیں پڑھتے ہیں' دوسری نیکیاں کرتے ہیں' محتاجوں

کو خیرات دیتے ہیں' دوسروں کے کام آتے ہیں اور اس طرح سمجھتے رہتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو خوش کر دیا ہے۔ یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ میری بھی یہی خوش فہمی ہے کہ میں نے جانی سے جو جھوٹ کہا جس طرح دھوکا دیا' اس کے بعد میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتی رہی۔ میں نے نماز پڑھنا بھی شروع کر دیا اور میں منتیں مانگتی ہوں کہ فلاں مزار پر جا کر چادر چڑھاؤں گی۔ بہرحال بات یہاں آکر ٹھہرتی ہے کہ اگر میرا نکاح ناجائز ہے تو آپ کی آمدنی بھی حلال نہیں ہے۔ آپ برسوں سے اپنے بیوی بچوں کو حرام کی کمائی کھلا رہے ہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" مستری چاچا نے تن کر کہا "کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ میں بے ایمانی کرتا ہوں۔ میں صاف ستھرا کاروبار کرتا ہوں۔ میرے گاہک مجھ سے خوش رہتے ہیں۔ مجھ پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے مگر تم لوگوں پر ناظم آباد والا پورا محلہ انگلی اٹھا سکتا ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم لوگوں نے جانی کے ساتھ بے ایمانی کی ہے۔ جھوٹا نکاح پڑھایا ہے اور جانی خود اس بات کا گواہ ہے۔"

جانی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انکار کے انداز میں کہا "دیکھو چاچا' مجھ کو بیچ میں نہ ڈالو۔ اگر میری بات پوچھو گے تو میں کسی کی طرف داری نہیں کروں گا۔ اگر میں یہ کہوں گا کہ رخسانہ نے واقعی مجھ سے جھوٹ کہا اور دھوکا دیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی کہوں گا کہ تم اپنے کاروبار میں بے ایمانی کرتے ہو۔ میں خود ٹیکسی کا میٹر تیز کرتا ہوں اور دوسری بے ایمانیاں کرتا ہوں۔ چاچا مان لو کہ ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

مستری چاچا نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر رخسانہ کو دیکھا پھر ان دونوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کمرے سے باہر جانے لگے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر انہوں نے کہا "دیکھو' میں تم دونوں کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ جتنی تم لوگوں کی عقل ہے ویسی ہی باتیں کرتے ہو۔ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے مجھے بھی مجرم ثابت کرنا چاہتے ہو۔ بہرحال جانے سے پہلے میں اتنا کہہ دوں کہ ابھی پندرہ دن کا وقت ہے۔ تم لوگ غور کرو اور کسی اچھے نتیجے پر پہنچو۔ میں رخسانہ کا دشمن نہیں ہوں۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ اگر یہ ناجائز ازدواجی زندگی ہے تو اسے جائز بنایا جائے' اگر یہ نکاح غلط ہے تو دوبارہ نکاح پڑھانے کی گنجائش پیدا کی جائے۔ ہم مذہب کو زیادہ نہیں سمجھتے' ہمارے علما سمجھتے ہیں اور ہم انہی

سے مشورہ لے کر اپنی بگڑی بنا سکتے ہیں۔ بہر حال میں اب پندرہ دن کے بعد تم لوگوں سے ملوں گا۔"

وہ چلے گئے۔ رخسانہ جانی کا منہ تکنے لگی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا پھر اطمینان سے اس کے کش لگانے لگا۔ رفتہ رفتہ وقت گزر رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی انتظار کر رہی تھی۔ اس کی طرف سے کچھ سننا چاہتی تھی۔ اس کی امی بچے کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں پھر اس نے کہا "تمہاری خاموشی سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ کچھ بولو؟"

"کیا بولوں؟"

"اس کے متعلق جو مستری چاچا بول کر گئے ہیں۔"

"کیا بول کر گئے ہیں؟"

"تم انجان کیوں بن رہے ہو۔ کیا ابھی سن نہیں رہے تھے خود جواب بھی دے رہے تھے۔ مجھے بتاؤ کہ ہمارا کیا ہوگا؟ کیا ہم پندرہ دنوں کے لیے الگ ہو جائیں گے؟ نہیں جانی، کبھی ایسا فیصلہ نہ کرنا۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ اگر تم مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی ہو، پندرہ دن کے لیے بھی الگ نہیں ہونا چاہتیں تو میں الگ کیوں کروں گا۔ ٹھیک ہے ہم یہاں رہیں گے۔"

وہ جلدی سے پاس آکر بولی "سچ کہو تم مستری چاچا کی باتوں کی پروا نہیں کرو گے نا؟"

"دیکھو رخسانہ، میں بہت زیادہ پڑھا لکھا اور بہت زیادہ سمجھ دار نہیں ہوں۔ میری چھوٹی سی بات سمجھ میں یہی آتی ہے کہ مجھے تمہیں نہیں رلانا چاہیے۔ اگر کسی کے آنسو پونچھنا نیکی ہے تو میں یہ نیکی ضرور کروں گا اور تم سے دور نہیں جاؤں گا۔"

رخسانہ کی آنکھوں سے اس بار خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ جانی نے اٹھ کر اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا "اب آنسو پونچھنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم بات بات پر رونا شروع کر دو۔"

وہ نڈھال سی ہو کر اس پر اپنا سارا بوجھ ڈالتے ہوئے بولی "جانی یہ تقدیر بھی عجیب ہے۔ ادھر کئی دنوں سے تھوڑی دیر کے لیے رلاتی ہے پھر ہنساتی ہے پھر رلاتی ہے پھر ہنساتی ہے۔ مستری چاچا یہ مسئلہ اٹھا کر مجھے رلاتے رہے ہیں اور جب تمہارے پاس آتی

ہوں تو تم اپنے وعدوں سے، اپنی باتوں سے، اپنی محبتوں سے مجھے ہنسا دیتے ہو۔ ایمان سے کہتی ہوں کہ تمہارے جیسا شوہر بہت کم خوش نصیب عورتوں کو ملتا ہے۔ مرد کی شان یہی ہے کہ وہ اپنی عورت کے نہ صرف آنسو ہی پونچھے بلکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی لے آئے اور تم ایسے ہی ہو۔"

"تم نے مرد کی شان بتا دی۔ عورت کی شان کیا ہے؟ یہی کہ مرد سے بار بار جھوٹ بولے، اسے دھوکا دے، مرد کے دکھ سکھ میں شریک ہو اور اپنے دکھ میں اسے شریک نہ کرے، جس مسئلے کو میاں بیوی مل جل کر سلجھاتے ہیں۔ اسے خود ہی چھپ چھپ کر، رو رو کر سلجھانے کی کوشش کرے۔"

"جانی مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔"

"تم شرمندہ ہو۔ جب پہلی بار دلہن بن کر آئیں، مجھ سے جھوٹ بولا۔ تب بھی شرمندہ تھیں اور اب جو باتیں چھپا رہی تھیں تو اب بھی شرمندہ ہو اور آئندہ بھی شرمندہ ہوتی رہو گی۔"

"نہیں نہیں، میں وعدہ کرتی ہوں، قسم کھاتی ہوں۔ اب آئندہ تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کوئی بات تم سے نہیں چھپاؤں گی۔ میں نے تمہیں بہت اچھی طرح سمجھ لیا ہے جانی، تم تمام دنیا کی مخالفت کر سکتے ہو مگر میرے خلاف کچھ سننا تک نہیں چاہتے۔ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اب اس یقین کی جڑیں میرے اندر دور تک پھیل گئی ہیں۔"

جانی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میں صبح اٹھ کر ٹیکسی لے کر جانے والا تھا اور اب بارہ بجنے والے ہیں، کیا خاک دہاڑی بنے گی۔"

"میری مانو تو آج نہ جاؤ۔ آج ہم خوب جی بھر کر باتیں کریں گے۔ تم اگر چاہو تو کہیں گھومنے پھرنے جائیں گے۔"

○☆○

وہ دو دنوں سے رخسانہ کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ خاصی تفریح ہو چکی تھی۔ دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ اسے ٹیکسی چلانا چاہیے۔ کراچی شہر کی شاہراہوں اور گلیوں میں گھومنا چاہیے۔ یہی دماغ نے بھی سوال کیا، ہائے کیوں گھومنا چاہیے۔

اس نے دل کے سوال کو دل میں چھپا لیا۔ دماغ کے سوال کو جواب دیا کہ آمدنی کے

لیے باہر جانا چاہیے' ٹیکسی چلانا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی اس نے رخسانہ سے کہا "دیکھو' تم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب یہاں ڈسپنسری کی چار دیواری اٹھے گی' اس لیے آمدنی بڑھانا چاہیے۔ میں اور تم تفریح کریں گے تو آمدنی رک جائے گی۔ اب بولو کیا ارادہ ہے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "نہیں' اب میں آئینہ دیکھتی ہوں تو اپنی صورت نہیں دیکھی جاتی۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں بہت اچھی صورت دکھاؤں اور اس کے لیے واقعی اب ہمیں مستقل مزاجی سے کام کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے تم جاؤ' شام کو جلدی آنا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ رخسانہ نے کہا "جانی' تمہارے ساتھ چلتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے میرے سامنے فولاد کی ڈھال ہے۔ اب کہیں سے بھی حملہ ہو' میں اپنے بچے کے ساتھ محفوظ رہوں گی۔"

جانی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالتے ہوئے کہا "اس رومال کو اپنے پاس رکھ لو۔ میں ڈھال تو ہوں' رومال بھی ہوں۔ جب باہر ٹیکسی چلاتا رہوں گا تو یہ رومال تمہارے آنسو پونچھتا رہے گا۔"

وہ ناراض ہو کر بولی "تم نے پھر طعنے دیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب نہیں روؤں گی۔ اب تو میں خود ہنستی رہوں گی۔ اصل بات یہ ہے جانی کہ عورت کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہوتا۔ اپنے اندر یقین نہیں ہوتا کہ اس کا مرد اچھا ہے اور وہ اسے اور اچھا بنا سکتی ہے چونکہ یقین کمزور ہوتا ہے اس لیے مرد کو اچھا بنانے کے بجائے اور بگاڑ دیتی ہے۔ اب میں تم پر کسی قسم کا شبہ نہیں کروں گی اور یقین رکھوں گی کہ مصیبت کی گھڑی میں خدا کے بعد صرف تم ہی میرے رہو گے۔"

وہ ٹیکسی کے پاس آکر رک گئے۔ جانی نے اگلا دروازہ کھول کر ایک صافی نکالی اور ٹیکسی کو باہر سے صاف کرنے لگا۔ رخسانہ نے کہا "یہ میرا کام ہے' لاؤ میں صفائی کرتی ہوں۔"

"نہیں' عورت کا کام گھر کے اندر صفائی کرنا ہے۔ چلو دوسری صافی اندر رکھی ہوئی ہے۔ تم ٹیکسی کو اندر سے اچھی طرح صاف کر دو۔"

وہ دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے لیکن رخسانہ نے جب اندر پہنچ کر صافی نکالی تو ڈیش بورڈ کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔

تم کہاں کہاں ہو گے۔
میں کہاں کہاں ڈھونڈوں

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ٹیکسی کے باہر جانی صفائی میں مگن تھا۔ وہ گاڑی کو چاروں طرف سے اچھی طرح پونچھنے کے بعد دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا۔ اسے دیکھ کر بولا "ارے تم تو ویسے ہی بیٹھی ہو' اندر صفائی نہیں کی؟"

وہ کچھ نہیں بولی' چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جانی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر اس کی نظروں کا سہارا لیتا ہوا' ڈیش بورڈ تک پہنچ گیا۔ بات سمجھ میں آتے ہی وہ ایک دم سے سٹپٹا گیا۔ رخسانہ کو دیکھ کر ذرا ہچکچایا پھر جلدی سے بولا "وہ اپنا جھورا پینٹر ہے نا' وہ بڑا زبردست شاعر ہے جس کی گاڑی میں دیکھو کچھ نہ کچھ لکھ دیتا ہے۔ میں نے اس کو منع کیا تھا ایسی ویسی بات نہ لکھنا' وہ کہتا ہے کہ شاعری بہت اچھی چیز ہے۔ شاعری میں ایک ہوتا ہے عشق مجازی اور ایک ہوتا ہے عشق حقیقی۔ اب کوئی اس شعر کو پڑھ کر یہ سمجھے گا کہ میں اپنی محبوبہ کو ڈھونڈ رہا ہوں مگر اس کا مطلب اصل میں یہ ہے کہ خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ دیکھو نا' اس میں اوپر لکھا ہے۔ تم کہاں کہاں ہو گے' ہو گے لکھا ہوا ہے نا۔ ہو گی تو نہیں لکھا ہوا تو اس کا مطلب ہو گا کہ خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں اور پوچھ رہا ہوں کہ میں کہاں کہاں ڈھونڈوں۔ تم کچھ اور نہ سمجھ لینا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

رخسانہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی نظروں سے ایسا کرب جھانک رہا تھا کہ جانی اس سے آنکھیں نہ ملا سکا' نظریں جھکا کر کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گاڑی سے باہر آکر ڈگی کھولی وہاں ایک پیٹرول سے بھرا ہوا ٹین پڑا ہوا تھا۔ اس نے رومال کے ایک حصے کو پیٹرول میں بھگوا دیا۔ اس ڈبے کو بند کرکے ڈگی کو بند کیا پھر واپس آکر اسٹیئرنگ سیٹ پر رخسانہ کے پاس بیٹھ گیا اور پیٹرول سے بھیگے ہوئے رومال کے اس حصے کو ڈیش بورڈ پر رگڑنے لگا۔

رخسانہ چپ چاپ بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ وہ شعر آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا تھا۔ ڈیش بورڈ کا وہ حصہ بالکل صاف ہو گیا۔ ایک لفظ بھی وہاں نہ رہا۔ اس کے بعد جانی رخسانہ کی طرف گھوم کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "کیا اب بھی ناراض ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "ڈیش بورڈ سے تو یہ مٹ گیا' تمہارے دماغ سے وہ کیسے مٹے گی؟"

"ایں؟" وہ ذرا ہچکچایا پھر بولا "دیکھو' ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ عورت کا یقین کمزور ہوتا ہے۔ اگر وہ پورا یقین رکھے اور اپنے مرد کو سنبھالنے کی کوشش کرے تو مرد اچھا بن کر رہے گا۔ بگڑنے سے بچا رہے گا۔"

وہ تائید میں سرہلا کر بولی "ہاں' میں ایسے وقت بھول جاتی ہوں۔ میں ہی کیا' تم دنیا کی کسی بھی عورت کے سامنے کسی دوسری عورت کو ترجیح دو گے تو وہ عورت بدحواسی میں ساری دانش مندی بھول جائے گی اور اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارنے والی بدنصیب عورت کی طرح صرف اپنے مرد کو پکڑنے کی کوشش کرے گی اور دوسری عورت کو گالیاں دے گی۔ اس سے زیادہ سمجھ میں اور کچھ نہیں آتا یا اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تم ٹھیک کہتے ہو' میں تم پر پورا یقین رکھوں گی۔"

"دیکھو رخسانہ' میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں' ٹیکسی چلاتا ہوں مگر ہر چوراہے پر رک جاتا ہوں۔ ٹریفک سگنل ہمیں بتاتا ہے کہ کہاں سے مڑنا ہے' کہاں جانا ہے' کون سا صحیح راستہ ہے' کون سا ون وے ٹریفک ہے۔ اسی طرح تم میری زندگی میں ایک محبت کا سگنل ہو۔ جب بھی میں بھٹکتا ہوں' رکتا ہوں' سمجھ نہیں سکتا کہ کہاں جانا ہے تو تم مجھے سگنل دے کر محبت کے ون وے ٹریفک پر چلا دیتی ہو' اگر ہمارے درمیان ایسی ہی سمجھ داری رہی تو پھر تمہیں میری طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ کیا میں غلط کہتا ہوں؟"

اس نے مسکرا کر جانی کو دیکھا پھر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ رخسانہ سے رخصت ہو کر شہر کی شاہراہوں پر آگیا۔ گاڑی چلانے کے دوران میں اس کی نظریں کبھی کبھی ڈیش بورڈ پر جاتی تھیں جہاں اب کچھ نہیں تھا۔ اب آنکھیں وہاں کچھ نہیں پڑھ سکتی تھی مگر انسان بڑا ضدی ہوتا ہے' جو بات اس سے چھپاؤ وہ اسے دماغی آنکھوں سے پڑھنے لگتا ہے۔

اس نے گاڑی چلانے کے دوران عقب نما آئینے میں دیکھا۔ اس آئینے میں پوزیشن ایسی تھی کہ اس میں اسے اپنا آدھا چہرہ نظر آرہا تھا۔ آدھا چہرہ جو اپنی بیوی کے لیے تھا' وہ اسے دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے یہ کہہ کر سزا نہیں دینا چاہتا تھا کہ تم نے جھوٹ کہا'

فریب دیا اور اس لیے فرزانہ کو تلاش کرتا ہوں' اسے چاہتا ہوں اور اس کی محبت کو اپنے دل سے نہیں مٹا سکتا۔

وہ چاہتا تو رخسانہ سے بے دھڑک کہہ سکتا تھا وہ اس سے ڈرتا نہیں تھا۔ ایک مرد کی طرح مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتا لیکن اس کا مزاج ایسا نہیں تھا پھر بیوی بچے سے محبت اور مروت کے ساتھ پیش آنا پڑتا ہے تب ہی گھر کے اندر کا ماحول ٹھیک رہتا ہے۔ جانی میں اتنی سوجھ بوجھ تھی اور ایسی سوجھ بوجھ تقریباً ہر انسان میں ہوتی ہے۔ ہر شخص محبت اور مروت کے ساتھ پیش آتا ہے لیکن اس کے لیے اسے اپنے اندر کے آدھے آدمی کو چھپا کر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ وہ جو آدھا آدمی ہوتا ہے' وہ خود غرض ہوتا ہے اور اپنے دل کی بات پر چلتا ہے۔

اب وہ رخسانہ سے رخصت ہو کر دل کی شاہراہوں پر چل رہا تھا۔ مختلف سواریوں کو ان کی منزلوں پر پہنچا رہا تھا۔ اس دوران میں اسے ایک پرانی فلم کا ایک منظر یاد آیا۔ اس منظر میں چور ایک محل میں گھس کر چوری کر رہا تھا' اس وقت صبح کی اذان ہوئی۔ چور نے مال کو ایک طرف رکھ کر صبح کی نماز پڑھنا شروع کی۔ شہزادی کی آنکھ کھل گئی اس نے حیرانی سے اسے نماز پڑھتے دیکھا پھر نماز پوری ہونے کے بعد سوال کیا۔ تم چوری بھی کرتے ہو اور نماز بھی پڑھتے ہو تب چور نے جواب دیا "چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض۔"

چور کی بات بڑی مضحکہ خیز تھی۔ نماز پڑھنے والوں کو بھی یہ بات بری محسوس ہوئی۔ کتنے ہی لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ ایک عام خیال کے مطابق چور کی یہ بات محض بکواس تھی لیکن یہ ایک بات انسانی فطرت کو آئینہ دکھاتی ہے کہ آدمی آدھا اِدھر ہوتا ہے' آدھا اُدھر ہوتا ہے۔ آدھا ایمان دار ہوتا ہے' آدھا بے ایمان ہوتا ہے۔ آدھا اپنی بیوی کا فرمانبردار شوہر ہوتا ہے' آدھا اپنی محبوبہ کا سچا عاشق ہوتا ہے۔

سہ پہر کو کریم آباد سے گزرتے ہوئے وہ جھورا پینٹر کے پاس پہنچ گیا۔ جھورے نے ڈیش بورڈ دیکھ کر پوچھا "یہ کیا ہوا؟"

"بس کچھ نہ پوچھو' اب ایک ہی تدبیر سمجھ میں آتی ہے ایک اچھے سے سفید کاغذ پر وہی شعر لکھ دو۔ میں جب صبح ٹیکسی لے کر باہر نکلوں گا تو اس کاغذ کو ٹیپ سے یہاں ڈیش

بورڈ پر چپکادوں گا اور جب شام کو گھر جاؤں گا تو اسے پلیٹ کرکے ڈگی میں چھپا دیا کروں گا۔"

فرزانہ کی امی مہمان عورتوں کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھیں' وہ بہت خوش تھیں۔ وہ عورتیں فرزانہ کے لیے بہت ہی اچھا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ لڑکا امریکا میں تھا اور بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ ہارٹ سرجری کا ماہر تھا۔ فرزانہ کے ساتھ خوب جوڑی رہتی۔

فرزانہ اس وقت موجود نہیں تھی' کہیں گئی ہوئی تھی۔ اس کی امی سوچ رہی تھیں جیسے بھی ہوگا' وہ اب اپنی بیٹی کو شادی کے لیے ضرور راضی کرلیں گی۔ وہ اپنی محبت کا' اپنی ممتا کا' اپنے بڑھاپے کا اور اس کے مرحوم والد کی عزت کا اور ان کی روح کی بے قراری کا واسطہ دے کر بیٹی کو کسی نہ کسی طرح شادی کرنے پر مجبور کردیں گی۔ سر سے ایک بڑا بوجھ اتر جائے گا۔ زندگی میں پیش آنے والا المیہ ختم ہوجائے گا پھر جانی جو اس گھر پر آسیب کی طرح چھایا ہوا ہے' ہمیشہ کے لیے غائب ہوجائے گا۔

ایک مہمان خاتون نے کہا "فرزانہ کو دیکھے ہوئے کتنے ہی برس گزر گئے۔ اب تو اچھی اونچی پوری ہوگئی ہوگی۔"

فرزانہ کی امی نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں! بہن' اللہ کا کرم ہے۔ اچھی صورت بھی ہے اور اچھی سیرت بھی۔ میں تو اسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔"

وہ سب ناشتا کرنے میں مصروف تھیں۔ کوئی نمکین کھا رہی تھی' کوئی مٹھائی چکھ رہی تھی اور کوئی چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے اپنے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے اپنی امی سے کہا "امی' اس وقت تو میں بہت چھوٹی تھی۔ فرزانہ باجی کو دیکھا ہو تو اب یاد نہیں آرہا ہے۔ آئیں گی تو دیکھوں گی ضرور۔"

فرزانہ کی امی نے کہا "وہ آتی ہی ہوگی۔"

دوسری لڑکی نے اپنی بہن سے کہا "باجی' فرزانہ باجی کا نام سن کر مجھے اخبار کی وہ خبر یاد آگئی۔ ایک نیم پاگل ڈرائیور نے اسپتال میں بڑا ہنگامہ کیا تھا۔ کسی لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کو پریشان کررہا تھا۔ پولیس والے اسے پکڑ کر لے گئے۔ جب امی نے ہماری اس باجی فرزانہ کا ذکر کیا تو میں سمجھی' کہیں یہی باجی نہ ہوں۔ یہ بھی لیڈی ڈاکٹر ہیں نا؟"

دروازے پر فرزانہ کی آواز سنائی دی "تم نے ٹھیک ہی سمجھا تھا۔ میں وہی لیڈی

ڈاکٹر فرزانہ ہوں جس کے لیے ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہنگامہ کیا تھا۔"

وہ سب ناشتا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔ اس کی امی بھی پریشان ہوگئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ فرزانہ آتے ہی بات بگاڑ دے گی۔ وہ جلدی سے زبردستی مسکراتے ہوئے بولیں "یہ میری بیٹی ہے۔ اسے مذاق کرنے کی عادت ہے۔ آؤ بیٹی' ان سے ملو۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھ کر فرزانہ کے قریب پہنچتے ہی آنکھوں سے اشارے کرنے لگیں' التجا کرنے لگیں' ان کی آنکھیں زبان بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے مہمانوں کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے بیٹی کی طرف خاموشی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ فرزانہ نے آگے بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے تھام لیا پھر انہیں چوم کر کہا "امی! جھوٹ اور فریب کبھی راس نہیں آتا۔ اس کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو بات ہو وہ صاف اور کھری ہو۔ میں اپنے مہمانوں سے جو سچ ہے وہ کہتی ہوں اور سچ یہ ہے کہ میں وہی لیڈی ڈاکٹر فرزانہ ہوں جس کے لیے ایک شخص دیوانہ وار اسپتال میں ہنگامہ کرتا رہا اور پھر تھانے پہنچ گیا۔"

وہ عورتیں پہلے تو اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں پھر ایک نے اٹھ کر پوچھا "تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ اگر جھوٹ بولوں گی تو بعد میں یہ بات کھل جائے گی۔ اس وقت جو بات بگڑے گی' ہم اسے بنا نہیں سکیں گے اور ابھی بگڑ جائے تو آپ کا کچھ بگڑے گا نہ میرا۔"

دوسری خاتون نے پوچھا "بیٹی' قصہ کیا ہے۔ وہ شخص تمہیں اسپتال میں پریشان کیوں کررہا تھا۔"

فرزانہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان عورتوں کے قریب آئی اور پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "ایک دوسرے سے حالات کو سمجھنے کے بعد جو رشتہ ہوتا ہے' وہ مستحکم ہوتا ہے۔ اگر ہمارے حالات آپ کی سمجھ میں نہ آئے اور رشتہ نہ ہو تو دونوں صورتوں میں دونوں کا بھلا ہوگا۔ اس لیے میں بتا دیتی ہوں' سننا اور سمجھنا آپ کا کام ہے۔ میری ایک سہیلی رخسانہ تھی جو ہمارے پڑوس میں رہا کرتی تھی۔"

ایک لڑکی نے کہا "میں جانتی ہوں' اس کا آدھا چہرہ بگڑ گیا ہے۔"

فرزانہ نے کہا "ہاں وہی' اس کے بگڑے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی رشتہ مانگنے نہیں آتا تھا۔ وہ بن بیاہی بیٹھی ہوئی تھی اور دماغی مریضہ بن گئی تھی۔ اس کا علاج ایک ہی تھا کہ کسی طرح اس کی شادی ہو جائے۔ جب ایمانداری سے اور شرافت سے وہ دلہن نہ بن سکی تو اسے دلہن بنانے کے لیے میں نے بے ایمانی کی۔ شادی سے پہلے میں لڑکے سامنے رخسانہ بن کر گئی اور شادی کے وقت رخسانہ دلہن بن کر اس کے گھر پہنچ گئی۔ اس دن سے اس کا شوہر مجھے تلاش کر رہا ہے' شاید وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے یا شاید اسے میری ہی صورت پسند آگئی ہے' میں نے جو کیا' اچھا کیا یا برا کیا۔ اس کا فیصلہ آپ سب کر سکتی ہیں اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ یہاں بیٹھے بیٹھے کوئی فیصلہ سنا دیں۔ آپ اطمینان سے اپنے گھر جائیں۔ میری امی ایک مناسب وقت تک آپ کے فیصلے کا انتظار کریں گی۔"

وہ وہاں سے اٹھ گئی پھر ان لوگوں کو سلام کرنے کے بعد دوسرے کمرے میں آگئی۔ اس نے برقع اتارتے ہوئے سوچا' اب کیا کرے' کیا لباس تبدیل کرے یا بستر پر تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کرے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ڈسپنسری کھولنے کے وقت میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ اس وقت تک وہ آرام کر سکتی تھی۔ برقع اتارنے کے بعد وہ ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گئی اور اس کی پشت سے سر ٹکا کر چھت کی طرف تکنے لگی۔

دوسرے کمرے سے عورتوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ رخصت ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد گہری خاموشی چھا گئی پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس کی امی نے آتے ہی پوچھا "کیا بات چھپائی نہیں جاتی؟ کیا دنیا والے اپنے عیب' اپنی غلطیاں نہیں چھپاتے؟"

"چھپاتے ہیں' رخسانہ اور اس کے والدین نے جانی کے ساتھ جو کچھ کیا' اس کا نتیجہ انہیں کیا مل رہا ہے؟ جھوٹ اور فریب کی سزا رخسانہ کو مل رہی ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں بھی جھوٹ بول کر اپنے سسرال جاؤں پھر ساری زندگی طعنے سنتی رہوں اور اپنے مجازی خدا کی نظروں میں مشکوک رہوں؟"

"تم محض ایک رخسانہ کی مثال نہ لو۔ انہوں نے کھلا فریب کیا تھا۔ وہ تو ظاہر ہونا ہی تھا ورنہ دنیا میں اور بھی لڑکیاں ہیں جو اپنی عمر چھپاتی ہیں۔ اپنے عیب چھپاتی ہیں۔ ماضی

کی غلطیاں بھی چھپالیتی ہیں۔ اپنے مرد کو اور اپنے سسرال والوں کو کبھی ان باتوں کی ہوا لگنے نہیں دیتیں۔ بڑے عیش و آرام سے اپنی زندگی گزار لیتی ہیں۔"

"امی! آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ حقیقت اپنی جگہ رہے گی۔ جھوٹ ایک بیماری ہے اور میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ کسی بھی مرض کی پہلے تشخیص کرتی ہوں۔ دوسروں کو کبھی غلط دوا نہیں دیتی پھر اپنے لیے کوئی غلط نسخہ کیسے لکھ سکتی ہوں؟"

انہوں نے گہری سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹی کو دیکھا پھر کہا "تم نے ٹھیک کہا ہے کہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تم جانی کو بھلانا نہیں چاہتیں۔"

"یہ غلط ہے۔" وہ کرسی سے جیسے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پاؤں پٹختے ہوئے ماں سے ذرا دور چلی گئی پھر واپس آتے ہوئے بولی "میں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا۔ میں ایسا راستہ تلاش کر رہی ہوں جہاں رخسانہ اور جانی سے کبھی سامنا نہ ہو۔ یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر چلی جاؤں۔ ہو سکے تو اس ملک سے بھی باہر چلی جاؤں۔"

"جب لڑکی اپنے بابل کا انگنا چھوڑ دیتی ہے تو پھر وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے۔ تمہیں کوئی راستہ کیا تلاش کرنا ہے۔ سیدھے سادے انداز میں فیصلہ کر لو کہ شادی کر کے کسی کا گھر آباد کرو گی' یہ ساری الجھنیں خود بہ خود ختم ہو جائیں گی۔"

"بات اتنی سیدھی سادی ہوتی تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ میں نے رخسانہ کے لیے ہمدردی کر کے' اس کی زندگی بنا کر' سچ مچ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ اس کے لیے نیکی کروں گی تو خود بدنام ہو جاؤں گی۔ ادھر ناظم آباد میں جہاں ہم رہتے تھے۔ یہ بات پھیل چکی ہے کہ جانی کو میرا چہرہ دکھایا گیا ہے اور شادی رخسانہ سے کی گئی ہے۔ میں ایک تماشا بن گئی ہوں۔ دوسروں کی گفتگو کا مرکز بن گئی ہوں۔ ہم اس گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بات آئی گئی ہو چکی ہے لیکن یہ بات جتنی دور تک پھیل گئی ہے' ہم اتنی دور تک سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیا آپ سوچ سکتی تھیں کہ میرا نام اخبارات تک پہنچ جائے گا؟ ابھی آپ خود ہی ان عورتوں کی زبان سن چکی ہیں پھر آپ کہتی ہیں کہ میں سیدھے سادے انداز میں شادی کا فیصلہ کر لوں' کیسے کر لوں؟"

وہ الماری کے پاس گئی پھر اسے کھول کر اپنے لیے ایک لباس نکالنے لگی۔ اس کے بعد وہاں سے پلٹ کر بولی "میں اگر شادی نہ کروں تب بھی رخسانہ کے سامنے ایک مجرم

سمجھی جاؤں گی۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں جانی کے لیے ابھی تک بن بیاہی بیٹھی ہوں۔ میں تو چاروں طرف سے ماری گئی۔ میری نیکی بھی برباد ہوگئی۔ وہ جانی میرا دشمن بن کر مجھے تلاش کررہا ہے۔ اخبار والوں نے بھی بدنام کیا۔ محلے والے بھی بدنام کررہے ہیں۔ میں تو کہیں کی نہیں رہی۔"

وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر جانے لگی۔ اس کی امی نے کہا "بیٹی! ہم سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں اور ہمیں اس کا نتیجہ مل رہا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ جھوٹوں کے ساتھ 'فریب دینے والوں کے ساتھ اگر نیکی کی جائے تو وہ نیکی جرم بن جاتی ہے مگر کسی نہ کسی طرح' کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ہوگا۔ تم کب تک ایسی زندگی گزارو گی؟"

اس نے جواب دیا "امی! اگر میں ایسی کوئی کہانی لکھتی تو اس کہانی میں سے اپنے کردار کو آسانی کے ساتھ مٹا دیتی' جانی اور رخسانہ کی خوش گوار ازدواجی زندگی پر اس کہانی کو ختم کردیتی لیکن یہ کہانی نہیں جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ اگر کہانی ہے تو پھر میں ایک بہت ہی اہم سوال ہوں کہ میرا کیا بنے گا؟ میں گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ مجھے یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے یا میرا گھر بسا دیا جائے۔ یہ کہانی مجھے کون سے اختتام تک پہنچائے گی؟"

اس نے یہ سوال کیا اور باتھ روم کے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنی ڈسپنسری میں بیٹھی ہوئی تھی اور مریض عورتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے نسخے تجویز کررہی تھی۔ اس کے چہرے پر سختی اور سنجیدگی تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس عورت کے سینے میں دل نہیں ہے۔ دل ہے تو پتھر ہے جو نہ تو اپنے مریضوں کی تکلیف پر پگھل سکتا ہے اور نہ ہی جانی کے لیے موم ہوسکتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک گاڑی آکر ڈسپنسری کے سامنے رکی۔ آواز سنتے ہی اس نے کمپاؤنڈر سے کہا۔ "دیکھو کون آیا ہے؟"

کمپاؤنڈر نے اپنے کیبن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا پھر کہا۔ "ایک کار آئی ہے۔ شاید کوئی مریضہ ہے۔"

فرزانہ مطمئن ہو کر پھر مریضوں کی طرف متوجہ ہوگئی تھوڑی دیر بعد ایک عورت ایک مرد کے ساتھ ڈسپنسری میں آئی۔ مرد وہیں ویٹنگ روم میں ٹھہر گیا۔ عورت نے اندر آ

کر پوچھا۔

"ہیلو فرزانہ! کیا تم مجھے پہچان رہی ہو؟"

فرزانہ نے آنے والی عورت کو دیکھا۔ تھوڑی دیر تک غور کیا پھر جلدی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم وہی ہو نا جو ایک بار جمشید علی کے ساتھ ہمارے کالج کے ایک فنکشن میں شریک ہوئی تھیں"

وہ سرہلا کر بولی۔ "ہاں میرا نام شہلا ہے اور میں جمشید علی کی کزن ہوں۔ میری ایک سہیلی نے ذکر کیا تھا کہ آج کل تم اورنگی کے اس علاقے میں ڈسپنسری چلا رہی ہو۔ باہر ڈاکٹر ف واسطی کا بورڈ پڑھ کر خیال گزرا کہیں "ف" واسطی سے' فرزانہ واسطی نہ ہو۔ میں یہ سوچ کر اندر چلی آئی۔"

"اچھا کیا' آؤ یہاں بیٹھو۔"

اس نے کہا۔ "میرے میاں بھی آئے ہیں۔ وہاں ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔ تمہارے میاں کو بھی دیکھ لوں۔"

وہ دونوں وہاں سے ویٹنگ روم میں آئیں۔ شہلا نے اپنے شوہر سے اس کا تعارف کرایا۔ اس کے شوہر نے کہا۔ "ڈاکٹر فرزانہ! مجھے رسمی طور پر یہ کہنا چاہئے کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے لیکن بیویاں یہ برداشت نہیں کرتیں۔"

فرزانہ اور شہلا ہنسنے لگیں۔ اس کے شوہر نے کہا۔ "میرے والد کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ اس خوشی میں ہم نے آپس میں مل بیٹھنے اور کچھ کھانے پینے کا انتظام کیا ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ کل آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ میرے والد آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

فرزانہ نے کہا۔ "مجھے بھی آپ سے اور آپ کے گھر والوں سے مل کر خوشی ہوگی۔ اگر میں مصروف نہ رہی تو ضرور آؤں گی۔"

شہلا نے کہا۔ "تمہیں تو بہرحال آنا ہی ہوگا۔ جانتی ہو کیوں؟ میرے بھیا جمشید علی کا خط لندن سے آیا ہے جو انہوں نے رخسانہ کو لکھا ہے۔ بہت ہی اہم خط ہے۔ رخسانہ کے چہرے کی پلاسٹک سرجری ہوسکتی ہے۔ میں اس کا ایڈریس نہیں جانتی' کل تم آؤ گی تو وہ خط تمہیں دے دوں گی۔ تم اسے رخسانہ تک پہنچا دینا۔ اتنا تو کرسکتی ہو' نا؟"

فرزانہ کے جی میں آیا' کوئی بہانہ کردے۔ یہی کہہ دے کہ وہ رخسانہ کا پتا نہیں جانتی ہے لیکن وہ انکار نہ کر سکی۔ وہ خط واقعی اہم تھا۔ رخسانہ اپنے چہرے کی سرجری کرا سکتی تھی پھر فرزانہ کے دماغ سے یہ بوجھ بالکل ہی اتر جاتا اور رخسانہ مکمل ہو جاتی۔

شہلا کے شوہر نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارا ایڈریس ہے۔ ہمیں امید ہے کل آپ ایک بجے سے پہلے ہمارے ہاں پہنچ جائیں گی۔"

فرزانہ نے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں آؤں گی مگر آپ بھی تو گھر کے اندر چل کر بیٹھیں کچھ ٹھنڈا گرم وغیرہ پئیں۔"

شہلا نے کہا۔ "اس وقت تمہارا کوئی تکلف نہیں چلے گا ہم بہت مصروف ہیں۔ ابھی ہمیں دوسرے رشتہ داروں کے ہاں بھی جانا ہے۔ تم پر چائے ادھار رہی۔ ہم کسی اور دن آکر پی لیں گے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے باہر آئے۔ فرزانہ نے انہیں رخصت کیا پھر ڈسپنسری میں آ گئی۔ تمام مریضوں سے نمٹنے کے بعد اس نے اپنی امی کو بتایا کہ جمشید علی نے لندن سے رخسانہ کو خط لکھا ہے اور اس خط کو رخسانہ تک پہنچانا ہو گا۔

اس کی امی نے پوچھا "یہ جمشید علی کون ہے؟"

"وہی ہے جس کی شرارت کے نتیجہ میں میرے ہاتھ سے تیزاب کی بوتل چھوٹ گئی تھی اور رخسانہ کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا تھا۔ اس نے لندن جانے سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ اس کے لئے پلاسٹک سرجری کا کورس مکمل کرے گا اور اس کے چہرے کی سرجری کرے گا۔ اس بات کو تقریباً دو برس گزر چکے ہیں۔ اتنے کم عرصے میں وہ پلاسٹک سرجری کا ماہر نہیں بن سکتا مگر اس نے سرجری کے متعلق رخسانہ کو کیا لکھا ہے۔ یہ خط کے ذریعے معلوم ہو گا۔"

"تم وہ خط رخسانہ تک کیسے پہنچاؤ گی؟"

"جانی نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں ہے۔ آپ اجنبی عورت بن کر وہاں جائیں گی اور وہ خط رخسانہ کو دیں گی۔"

وہ ناگواری سے بولیں۔ "کیا مصیبت ہے میں جب بھی چاہتی ہوں کہ جانی اور

رخسانہ تم سے دور رہیں۔ تب ہی کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی ہے کہ جانی پھر ہمارے راستے میں آ جاتا ہے۔ اب یہ خط کہاں سے ٹپک پڑا۔ اس کے لیے پھر ان سے ملنا ہو گا۔"

"امی! ہم نے جہاں اتنی نیکی کی ہے وہاں یہ بھی سہی۔ خط کو پہنچا دینا ہمارا فرض ہے۔"

ان فرائض نے ہمیں ڈبو دیا مگر کیا کریں' دل بھی تو نہیں مانتا یہ فرض بھی ادا کرنا ہو گا۔"

رات کو کھانے کے دوران ریڈیو آن تھا۔ دینی تعلیمات کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹی کھانے میں مصروف تھیں اور برائے نام وہ پروگرام سن رہی تھیں۔ اسی وقت ایک مولوی صاحب نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جو جھوٹ بولتا ہے۔ وہ میری امت میں سے نہیں ہو سکتا۔ وہ میری شریعت سے خارج رہے گا۔"

فرزانہ نے کہا۔ "دیکھئے امی! جھوٹ کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے؟"

"ہاں۔ سن رہی ہوں۔ یہ جو دینی معلومات کے پروگرام ہوتے ہیں۔ انہیں سنو تو بات ایک کان میں آتی ہے اور دوسرے سے نکل جاتی ہے لیکن ہم انہی حالات سے گزر رہے ہوں تو بات دل میں اتر جاتی ہے۔ یہ جھوٹ والی بات اس وقت میرے دل میں اتر گئی ہے۔ تمہارے مخاطب کرنے سے پہلے میرا دھیان رخسانہ کی طرف چلا گیا تھا۔"

"رخسانہ کی طرف کیوں؟"

"اس لئے کہ اگر جھوٹے لوگ شریعت سے خارج ہو جاتے ہیں تو پھر رخسانہ اور جانی کا جو نکاح پڑھایا گیا ہے وہ شرعی نکاح نہیں ہو سکتا۔"

فرزانہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا پھر کہا۔ "امی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ رخسانہ اور جانی نے ایک دوسرے کو قبول کیا ہے۔ اب وہ ایک بچے کے والدین بن گئے ہیں۔ بات پرانی ہو چکی ہے۔ اب وہ نکاح جائز ہے یا نہیں ہے۔ اس بحث کو اٹھانا فضول ہے۔ وہ ایک اچھی ازدواجی گھریلو زندگی گزار رہے ہیں اور ایک بچے کی ذمہ داری ان پر عائد ہو گئی ہے۔"

اس کی امی جواباً کچھ کہنا چاہتی تھیں پھر خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے دل میں سوچا ٹھیک ہے۔ اس بحث پر مٹی ڈال دینی چاہئے اگر کہیں اس بحث کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ نکاح جائز نہیں ہے۔ رخسانہ جانی کی جائز منکوحہ نہیں ہے تو پھر فرزانہ کا دل ڈانوا ڈول ہو جائے گا۔ وہ جو آہستہ آہستہ پتھر بن رہی ہے پھر موم کی طرح پگھلنے لگے گی لہٰذا خاموشی بہتر ہے۔

رات کو سوتے وقت فرزانہ نے محسوس کیا کہ بہت دنوں کے بعد نیند پھر اڑ گئی ہے۔ کوئی بات اسے جگا رہی ہے کون سی بات؟

اس سوال کے جواب میں اسے اپنی امی کی بات یاد آئی جو لوگ جھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ شریعت سے خارج ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں رخسانہ جانی کی شرعی منکوحہ نہیں ہے۔

فرزانہ کا دل دھڑکنے لگا۔ دھک 'دھک' دھک' منکوحہ نہیں ہے۔ دھک' دھک دھک وہ جانی کی بیوی نہیں ہے۔ نہیں ہے' ہاں کوئی نہیں ہے۔ وہ شادی ایک اسٹیج ڈراما تھا جس کے تمام مناظر یکے بعد دیگرے ختم ہو چکے ہیں۔ اب آخری منظر میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ رخسانہ جانی کے ساتھ جو ازدواجی زندگی گزار رہی تھی وہ محض ایک ناٹک ہے۔ مذہبی اور قانونی طور پر وہ جانی کی کوئی نہیں لگتی۔

اس نے جلدی سے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ جیسے ان خیالوں سے منہ پھیر رہی ہو پھر دل ہی دل میں بولی۔ "رخسانہ! جانی کی کوئی لگتی ہے یا نہیں' مجھے اس سے کیا لینا ہے؟ میں جانی کی کون لگتی ہوں کہ ان کے متعلق ایسا سوچوں۔"

پھر اس کے اندر سے ایک گہری سانس یوں نکلی جیسے ہائے نکل رہی ہو۔ ہائے' میں اس کی کوئی نہیں لگتی' میرا اور اس کا محض آنکھ مچولی کا رشتہ ہے میں چھپتی ہوں' وہ ڈھونڈتا ہے۔ میں اس کی طرف سے منہ پھیر کر سوتی ہوں وہ میری آنکھوں میں جاگتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے کچھ نہیں لگتے لیکن تقدیر ہماری دو دن کی شناسائی اور ہمیشہ کی نارسائی کا قصہ لکھ رہی ہے۔ پیار کو کون پتھر نہیں مارتا۔ ساری دنیا مارتی اور ستاتی ہے۔ پیار اور پتھر کا فسانہ یہ ہے کہ جو میرا کوئی نہیں لگتا وہی مجھے پتھر مارنے کے لئے ڈھونڈ رہا ہے کیا پھر بھی وہ میرا کوئی نہیں لگتا۔

وہ سوچتے سوچتے سوتی رہی اور سوتے سوتے سوچتی رہی۔ صبح اٹھ کر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے وہ سو رہی تھی۔ ساری رات جانی اور رخسانہ اس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ اس حساب سے وہ جاگتی رہی تھی۔

وہ دن کے دس بجے سے لے کر بارہ بجے تک مریضوں کو اٹینڈ کرتی رہی۔ اس کے بعد اپنے کمرے میں آئی اور شہلا کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگی اگر رخسانہ کے نام آنے والے خط کو وصول کرنے کی بات نہ ہوتی تو وہ شہلا سے کوئی بہانہ کر دیتی۔ باہر نکلنے سے اب اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔ حالانکہ برقع پہننا شروع کر دیا تھا۔ دیکھنے والے پہچان نہیں سکتے تھے لیکن وہ اندر سے باہر والوں کو دیکھتی تھی۔ یہی سمجھ میں آتا تھا کہ دوسرے بھی اسے دیکھ رہے ہیں جو اندر کچھ چھپا کر رکھتے ہیں' وہ ہمیشہ باہر والوں سے ڈرتے ہیں۔

جب وہ برقع پہن کر جانے لگی تو اس کی امی نے کہا۔ "بیٹی! ان کے والد حج بیت اللہ سے واپس آئے ہیں اس لیے راستے میں کسی پھول والے کی دکان سے ایک بڑا سا ہار خرید لینا اور اپنے ہاتھوں سے انہیں پہنا دینا۔ بزرگ آدمی ہیں' خوش ہو جائیں گے اور یہ دستور بھی ہے۔"

وہ گھر سے باہر آئی۔ اسے محمد علی سوسائٹی کی طرف جانا تھا شہلا وہیں ایک کوٹھی میں رہتی تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے اسے ایک بس میں صدر تک جانا تھا پھر صدر سے دوسری بس میں محمد علی سوسائٹی کی طرف جا سکتی تھی۔ پہلے تو وہ پیدل چلتی ہوئی بنارس کے بس اسٹاپ تک آئی۔ وہاں سے گل فروش کی دکان سے تازہ گلاب کے پھولوں کا ایک ہار خریدا۔ پہلے تو ارادہ ہوا کہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی جائے۔ کافی وقت بچے گا لیکن ٹیکسی کے خیال سے ہی ڈر لگتا تھا۔ رکشے میں بیٹھنا پسند نہیں تھا کیونکہ رکشا بہت شور مچاتا تھا وہ ایک بس میں سوار ہو گئی۔

لیکن وہ بس اسے زیادہ دور تک نہ لے جا سکی۔ بڑا بورڈ کے اسٹاپ پر رک گئی۔ اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ سارے مسافر اتر گئے اور دوسری بس کا انتظار کرنے لگے۔ اب دوسری بس آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھتی تھی پھر پیچھے مڑ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف دیکھنے لگتی۔ وہاں دو ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے دور ہی سے یہ اچھی طرح یقین کر لیا کہ ان کا ڈرائیور وہ نہیں ہے جس

سے وہ ڈرتی ہے۔

جب بیس منٹ تک صدر جانے والی دوسری بس نہیں آئی تو وہ پلٹ کر ایک ٹیکسی کے قریب گئی۔ "محمد علی سوسائٹی چلو گے؟"

ڈرائیور نے فوراً ہی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ دروازہ بند ہو گیا ڈرائیور نے اسٹیئرنگ سیٹ پر پہنچ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے آگے بڑھا دیا۔ فرزانہ بیٹھنے کے بعد کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی جب ٹیکسی چل پڑی تو اس کی نظر سامنے ڈیش بورڈ پر گئی۔ وہاں چھوٹے سے ٹیپ کے ذریعے ایک کاغذ چپکا ہوا تھا اور اس کاغذ پر لکھا تھا۔

تم کہاں کہاں ہو گئے؟
میں کہاں کہاں ڈھونڈوں؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جانی پوچھ رہا ہو۔ "جان تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں ہوں۔" ٹیکسی تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس ہوا تیزی سے گزرتے ہوئے شور مچا رہی تھی جیسے کچھ کہہ رہی ہو۔ ایک قیامت آ گئی ہو۔ "وہ آ گئی ہے جسے تم پوچھ رہے ہو۔"

مگر وہ پوچھنے والا اسٹیئرنگ پر نہیں تھا کوئی اور گاڑی چلا رہا تھا۔ وہاں جو شعر لکھا ہوا تھا۔ فرزانہ کی نظروں میں اس کی اتنی اہمیت نہیں تھی کیونکہ کتنے ہی ٹیکسی والوں کی گاڑیوں میں ایسے عشقیہ شعر لکھے رہتے ہیں۔ وہ شعر بھی کسی اور کے لئے ہو گا۔

فرزانہ نے تھوڑی دیر کے لئے جانی کے متعلق سوچا تھا پھر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے دوسری سوچ میں الجھ گئی تھی۔ گاڑی مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے جہانگیر روڈ پر پہنچ گئی تب اس نے چونک کر پوچھا۔ "تم ادھر سے کیوں جا رہے ہو؟"

"بات یہ ہے جی کہ میری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔ اب یہ گاڑی ٹیکسی کے مالک کو دینا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو اسی ٹیکسی میں سوسائٹی تک پہنچا دیا جائے گا۔ صرف ڈرائیور بدل جائے گا۔"

وہ ذرا پریشان ہوئی۔ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ذرا ڈر سا لگا کیونکہ جس گیراج کو وہ

بھول نہیں سکتی تھی وہ ونڈ اسکرین کے پار قریب آتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہاں پہنچنے پر ایک دم سے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہاں گیراج کے سامنے جانی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مستری چاچا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ٹیکسی ٹھیک اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

فرزانہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تقدیر اپنی ہتھیلی پر اٹھا کر اسے اچانک ہی جانی کے پاس پہنچا دے گی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اسے کیا کرنا چاہئے اگر وہ ٹیکسی سے اتر کر جانا چاہتی تو ڈرائیور اس سے پوچھتا۔ کسی دوسری گاڑی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو ابھی پہنچا دیا جائے گا۔

اب وہ زبان سے ڈرائیور کو جواب نہیں دے سکتی تھی۔ گونگی بن کر رہتی یا انکار میں سر ہلا کر اور خاموشی سے میٹر کے مطابق رقم دے کر جانا چاہتی تو شاید مستری چاچا بھی یہی سمجھاتے کہ بیٹی گاڑی میں بیٹھی رہو۔ صرف ڈرائیور بدل رہا ہے۔ وہ خاموشی سے جانا چاہتی تو جانی کو شبہ ہو سکتا تھا۔ وہ اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اس پہلو سے بھی سوچ سکتا تھا کہ وہ چھپنے کے لئے برقع پہن سکتی ہے۔

اسے اپنی خیریت اسی میں نظر آئی کہ چپ چاپ بیٹھی رہے۔ بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جانی اگر کچھ پوچھتا تو وہ پردہ دار عورتوں کی طرح خاموش رہتی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے بہت سی تدبیریں سوچ لیں۔ ادھر ٹیکسی کا ڈرائیور جانی کے پاس پہنچ کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جانی نے ذرا جھک کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا تو فرزانہ ایک دم سے سمٹنے لگی۔ سیٹ کی پشت سے یوں لگ گئی جیسے چھپنے کے لئے اور پیچھے چلی جانا چاہتی ہو۔ تب دماغ نے سمجھایا۔ یہ تو خود کو ظاہر کرنے والی بات ہے۔ اس طرح وہ شبہے میں مبتلا ہو گا اسے اطمینان سے بیٹھنا چاہئے۔ برقعے کے اندر وہ پہچانی نہیں جائے گی۔

جانی نے برقعے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بی بی جی! بس ذرا ایک منٹ میں چلتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں میں آپ کو جلدی پہنچا دوں گا۔"

پھر وہ پلٹ کر مستری چاچا سے کہنے لگا۔ "دیکھو چاچا! یہ تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں کہ تم بہت عقل والے آدمی ہو۔ بہت سمجھداری کی باتیں کرتے ہو مگر اس عورت کے ساتھ میں نے ایک برس تین مہینے گزار دیئے۔ اب ایک بچہ بھی ہو گیا ہے۔ اگر تم عالم صاحب سے اس کے خلاف فتوے لو گے تو سارے رشتے ٹوٹ جائیں گے گھر تباہ ہو جائے

گا اور..."

مستری چاچا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اور بہت کچھ ہو گا۔ جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے پہلے انسان کو سوچنا چاہئے کہ آگے چل کر کتنی مصیبتیں نازل ہوں گی۔ مجھے رخسانہ سے بہت ہمدردی ہے لیکن میری اور تیری ہمدردی کسی کام نہیں آئے گی۔ آج جو فیصلہ سنایا جائے گا۔ اس کے آگے ہم لوگوں کو سر جھکا دینا ہو گا۔ بہر حال مجھے عالمگیر روڈ تک پہنچا دے۔ عالم صاحب وہیں رہتے ہیں۔ وہاں سے تو اپنی سواری کو لے کر آگے بڑھ جانا۔"

یہ کہہ کر مستری چاچا ٹیکسی کی پچھلی کھڑکی کے پاس آئے فرزانہ نے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔ مستری چاچا دوسری طرف سے گھوم کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب جانی دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا تو فرزانہ کو یوں لگا۔ جیسے پہاڑ سر پر آ رہا ہے۔ وہ سکڑ رہی تھی۔ مختصر ہو رہی تھی۔ پربت کے آگے رائی بن رہی تھی۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی مستری چاچا نے ڈیش بورڈ پر چپکے ہوئے کاغذ کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کیا لکھ رکھا ہے؟ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ تو ابھی تک اس لڑکی کا دیوانہ ہے۔"

جانی ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو رہا۔

مستری چاچا نے کہا۔ "دیکھ جانی! اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ تیرے خلاف نہیں رخسانہ کے خلاف ہو رہا ہے۔ وہ اپنی غلطی کی سزا پانے والی ہے۔ تقدیر کو شاید تجھ پر پیار آگیا ہے اور وہ تجھے پیار کی طرف لوٹانا چاہتی ہے۔ قدرت کے کھیل کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ہونے والا ہے مگر مجھے کچھ نظر آ رہا ہے۔"

"چاچا! کیا نظر آ رہا ہے؟"

"یہی کہ تو رخسانہ کے ساتھ جو لگاوٹ ظاہر کرتا ہے' دراصل وہ لگاوٹ محبت کی نہیں' ہمدردی کی ہے کہ بے چاری کا انجام کیا ہو گا؟ محبت تجھے فرزانہ سے ہے۔ یہ کاغذ بتا رہا ہے' تیری دیوانگی بتاتی ہے کہ تو نے جو ہسپتال میں ہنگامے کیے اور یہ جو ٹیکسی چلانے کے دوران اسے صبح سے شام تک تلاش کرتا رہتا ہے کیا یہ باتیں مجھے معلوم نہیں ہیں۔ میں نادان نہیں ہوں۔"

"چاچا! تمہی بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"آج مجھے عالم صاحب کی طرف سے فیصلہ سن لینے دو۔ میں یہ معلوم کروں گا کہ تمہاری اور رخسانہ کی شادی جائز نہیں ہے تو یہ جائز کس طرح ہو سکتی ہے۔ کیا ایسی گنجائش ہے کہ نکاح دوبارہ پڑھایا جا سکے اور رخسانہ پھر تمہاری بیوی بن کر رہے ایسا ہو گیا تو رخسانہ کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ وہ تمہارے بچے کی ماں ہے۔"

جانی نے کہا۔ "ہاں۔ شادی کے وقت ان لوگوں نے مجھ پر زیادتی کی لیکن اب رخسانہ سے زیادتی ہو یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آخر انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے۔"

"رخسانہ کا انجام سوچتا ہوں تو مجھے بھی دکھ پہنچتا ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تم ساری عمر اس سے ہمدردی کر سکتے ہو مگر ایک لمحے کے لیے بھی اس سے مل کر نہیں رہ سکتے۔ وہ تمہارے لیے حرام ہو جائے گی۔"

جانی نے بڑے دکھ سے کہا۔ "پھر میں تنہا رہ جاؤں گا۔"

فرزانہ تنہائی کا دکھ جانتی تھی۔ اس لیے جانی کا دکھ لہو بن کر اس کے دل میں ٹپکنے لگا۔ وہ رخسانہ کی دشمن نہیں تھی لیکن تقدیر رخسانہ سے دشمنی کرے تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ اسے رخسانہ سے انسانی ہمدردی تھی اور جانی سے دلی ہمدردی تھی' وہ اعلیٰ ظرف تھی۔ اس نے خود رخسانہ کو جانی کی دلہن بنایا تھا۔ آج بھی وہ کم ظرف نہیں تھی۔ آج بھی وہ اسے سہاگن بنائے رکھنے کے لیے خود مجرم بنی ہوئی تھی۔ منہ چھپاتی پھر رہی تھی۔ اب صورت حال بدلنے والی تھی۔ رخسانہ خود اپنی سزا کو پہنچ رہی تھی۔ فیصلہ فرزانہ کا نہیں تھا۔ فیصلہ حالات کا تھا۔ اگرچہ انسان حالات کو بدل دیتا ہے تاہم کبھی کبھی حالات موت کی طرح اٹل ہوتے ہیں بدلے نہیں جا سکتے وہ حالات انسان کو توڑ مروڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں لہٰذا ان حالات میں فرزانہ کیا کر سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ رخسانہ سے ہمدردی کر سکتی تھی اور جانی سے؟

ہاں اور جانی سے؟

جانی سے جان تھی۔ منہ چھپانے والی آرزوؤں کی جان پہچان تھی۔

رخسانہ اگر دلہن تھی تو وہ جانی کے سامنے رخسانہ کا پہلا تعارف تھی۔ جانی کی آنکھوں میں فرسٹ امپریشن تھی اور جانی کے دل میں لاسٹ امپریشن رہے گی۔

وہ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔

رخسانہ جانی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا کرتی تھی۔ اب وہ سیٹ خالی ہونے والی تھی دنیا کے دستور کے مطابق کوئی جگہ خالی نہیں رہتی جو اپنی جگہ چھوڑتا ہے اس کی جگہ کوئی دوسرا چلا آتا ہے۔ ایک مرتا ہے' دوسرا پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی کرسی خالی نہیں رہتی۔ ایک اٹھ کر جاتا ہے تو دوسرا آکر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ دوسرا نہ بیٹھے تو کوئی تیسرا آکر بیٹھ جاتا ہے لہٰذا اگلی سیٹ خالی ہو تو کیا وہ اسے پر نہیں کرے گی؟

عالمگیر روڈ پر ٹیکسی رک گئی۔ مستری چاچا اتر گئے اور اگلی سیٹ خالی ہو گئی۔ جانی نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ فرزانہ گھبرا کر سمٹنے لگی۔ وہ جلدی سے منہ پھیر کر بولا۔ "معاف کیجئے میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والی عورتوں کو کبھی گھوم کر نہیں دیکھتا پتا نہیں' ابھی کیسے آپ ہی آپ گھوم گیا تھا۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں۔"

چند لمحے تک خاموشی رہی پھر اس نے میٹر کو بند کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے جب آپ جہانگیر روڈ کے گیراج تک پہنچی تھیں اس وقت سات روپے بنے تھے ڈرائیور کو جہانگیر روڈ کی طرف نہیں آنا چاہئے تھا۔ آپ کا راستہ دوسرا ہے سمجھ لیجئے کہ پانچ روپے بنے تھے۔ اب میں پھر میٹر کو آن کرتا ہوں۔ اس کے مطابق جتنی رقم بنے گی وہ آپ مجھے دے دیجئے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے میٹر کو آن کیا پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ٹیکسی کی محدود فضا میں بڑی پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ فرزانہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے اب تب میں کچھ ہونے ہی والا ہے۔ دوسری طرف جانی چپ چاپ سوچ رہا تھا۔ "یا اللہ! ہم پر کرم کر' مستری چاچا آکر ہمیں کوئی خیر خیریت کی خبر سنائیں۔ رخسانہ کی زندگی برباد نہ ہو میرے مالک! میں بڑی آزمائش میں پڑ جاؤں گا۔ اسے مجھ سے الگ کر دیا جائے گا تو کیا ہو گا؟ ہوتا تو یہی ہے کہ مرد کی زندگی سے ایک عورت نکل جاتی ہے تو دوسری دلہن بن کر آ جاتی ہے اور دوسری تو بہت پہلے ہی میرے خیالوں میں دلہن بنی بیٹھی ہے۔ ایسے وقت میں' میں بڑا ہرجائی' بڑا بے مروت سمجھا جاؤں گا۔ رخسانہ اپنی تباہی کا ماتم کرتی رہے گی اور میں نئی دلہن کے ساتھ مگن ہو جاؤں گا یہ مجھ پر کیسا وقت آ رہا ہے۔ مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ رخسانہ برباد ہو۔ مجھے یہ بھی اچھا لگتا ہے کہ فرزانہ مجھے مل جائے۔

ملنے کی بات اور ہے اور جو مل جائے اسے پالینے کی بات اور ہے۔ میں جو اپنی بیوی

کے ہوتے ہوئے بھی اسے ڈھونڈتا رہا تو اس تلاش کے پیچھے میرا کیا مقصد تھا؟ کیا میں رخسانہ کو ٹھکرا کر فرزانہ کو دلہن بنانا چاہتا ہوں؟ آج یہ بات صاف ہو جائے' کھل جائے کیونکہ عالم صاحب فیصلہ سنانے والے ہیں اگر میں فرزانہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں تو اب کس بات کی رکاوٹ ہو گی۔ میرے لیے راستہ بالکل صاف ہے۔

لیکن نہیں۔ فرزانہ سے مجھے محبت ہے میں انسانیت سے گر کر فرزانہ کی محبت کی توہین نہیں کروں گا۔ مجھے رخسانہ سے ناانصافی کرنے کے بعد فرزانہ کے ساتھ کبھی سکون نہیں ملے گا۔ مستری چاچا غلط کہتے ہیں کہ مجھے رخسانہ سے محبت نہیں' ہمدردی ہے۔ واہ یہ کوئی بات ہے۔ ہمارے گھر میں بچہ ہمدردی سے نہیں محبت سے پیدا ہوا ہے میں اپنے بچے کو جان سے بڑھ کر چاہتا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بچے سے تو اتنی محبت کروں اور اس کی ماں سے صرف ہمدردی کروں۔ محبت کا سلسلہ تو بچے کی ماں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں' جو عورت کو بچہ پیدا کرنے کی مشین سمجھتے ہیں۔ اللہ' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اپنی محبت سے نہیں مشین سے نکاح پڑھتے ہیں۔

فرزانہ کو بیٹھے بیٹھے پتا نہیں کیا ہوا۔ گلا کھنکنے لگا۔ وہ بے اختیار گلا صاف کرنے لگی۔ اس کے حلق سے آواز نکلنے لگی۔ تب اچانک ہی جانی نے گاڑی کی رفتار ذرا دھیمی کر دی توجہ سے اس آواز کو سننے لگا جو پچھلی سیٹ سے آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آواز کہیں دور' بہت دور سے اسے پکار رہی ہو اور ایک پہیلی بوجھنے کے لئے کہہ رہی ہو۔

لیکن کھنکھارنے یا کھانسنے کی آواز سے کوئی کسی کو پہچان نہیں سکتا۔ ایسی آواز ایک اشارے کی طرح سنائی دیتی ہے پھر گم ہو جاتی ہے۔ جانی نے سوچا۔ "میں سچ مچ اس کا دیوانہ ہو گیا ہوں۔ کسی دوسری لڑکی کو دیکھتا ہوں تو دور سے وہی نظر آتی ہے۔ کسی کی آواز سنتا ہوں تو مجھے اس کا شبہ ہوتا ہے۔ میں بہت جلدی پاگل ہو جاؤں گا۔"

ایک دوراہے پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ کدھر جائے۔ رخسانہ کی طرف یا فرزانہ کی طرف۔ کس راستے پر جائے؟

لیاقت ہسپتال سے یا بہادر آباد کے راستے سے جانا چاہئے۔ وہ رات دن ٹیکسی چلاتا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ بہادر آباد کے راستے سے آسانی ہو گی لیکن اس وقت وہ ذہنی طور پر الجھ گیا تھا۔ ٹیکسی کسی اور دوراہے پر رکی تھی۔ دماغ کسی اور دوراہے پر ٹھہر گیا

تھا۔

اس نے دوبارہ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے سوچا' میں کیا ہوں؟ میں تھالی کا بینگن ہوں۔ اِدھر بھی لڑھکتا ہوں اُدھر بھی لڑھکتا ہوں۔ جتنی دیانتداری سے رخسانہ کو چاہتا ہوں۔ اتنی ہی شدت سے فرزانہ کو طلب کرتا ہوں۔ میرا جسم' میری توجہ' میری محنت' میری کمائی سب رخسانہ کے لیے ہے۔ میری تڑپ' میری بے چینی' میری جستجو' میری دیوانگی یہ سب کچھ فرزانہ سے منسوب ہے۔

میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں چھپ گئی ہے؟ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں؟ اس کے دماغ میں کبھی میری سوچ پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟ کبھی وہ نیند سے چونکتی ہو گی تو کیا پہلا خیال میرا آتا ہو گا؟ کبھی وہ کسی کو گڑھے میں گرتے دیکھتی ہو گی تو کیا تڑپ کر سوچتی ہو گی کہ اس نے مجھے گرایا تھا۔ کیا اسے پتا ہو گا کہ میں اس کے لئے کتنا تڑپ رہا ہوں؟

خدایا! مجھے درد دیتا ہے تو اسے احساس دے' مجھے زخم دیتا ہے تو اسے بینائی دے۔ جب کوئی دیکھنے والا' کوئی محسوس کرنے والا نہیں ہو گا تو مجھے بخشے ہوئے درد کا مصرف کیا ہو گا؟

تو نے ہر ذرے کو کسی نہ کسی ذرے کے لیے پیدا کیا ہے درد کو بے مقصد نہ بنا۔ میرے مالک! اِدھر مجھے چھلنی کر دیا ہے تو اُدھر اسے بھی تڑپا دے۔ اتنا تڑپا دے کہ وہ میرے لیے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دے۔

فرزانہ نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ سنا دے اپنی آواز۔ آواز سنا دے۔ چپ رہے گی تو گیلی لکڑی کی طرح جلتی رہے گی۔ شعلہ بن کر بھڑک جا' پہلے حالات نے مجبور کیا تو رخسانہ کا تعارف بن گئی۔ اب حالات کا تقاضا ہے' اپنا تعارف پیش کر دے۔ چھاتی پیٹ کر کہہ دے جانی! میں تیری غم خوار ہوں۔ آج میں تیرے تمام دکھوں کو سمیٹ لوں گی۔

گاڑی یک بیک رک گئی۔ سامنے ایک ٹریفک کانسٹیبل ہاتھ دکھا کر رکنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ وہاں اور بھی کئی ٹیکسیاں ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ٹریفک پولیس کا ایک آفیسر چھوٹی سی میز سامنے رکھے ایک کرسی پر بیٹھا ٹیکسی والوں کے کاغذات چیک کر رہا

تھا۔ جانی کو بھی ٹیکسیوں کی قطار میں گاڑی کھڑی کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی پھر ڈیش بورڈ سے ضروری کاغذات نکال کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر چلا گیا۔ فرزانہ نے ایک گہری سانس لی اور نظریں جھکا کر اپنی گود میں رکھے گلاب کے ہار کو دیکھنے لگی۔ جانے کس سوچ میں آہستہ آہستہ گلاب کی پتیوں کو سہلانے لگی۔

جانی ٹیکسی ڈرائیوروں کی قطار میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب سے پیچھے تھا۔ اس کے آگے پانچ ڈرائیور تھے۔ کاغذات چیک کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن آفیسر کے ساتھ ہی کوئی اس کا شناسا بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا اور وہ کاغذات بڑے اطمینان سے دیکھتا جا رہا تھا جب آگے کا ایک ڈرائیور فارغ ہو کر چلا گیا تو دوسرے کی باری آئی۔ اس کے ساتھ ہی آفیسر کے سامنے ٹھنڈی بوتل آ گئی۔ اس نے کام چھوڑ کر بوتل پینا شروع کر دی۔ بوتل پینے میں جو بھی وقت لگا' اس کے بعد سگریٹ سلگایا گیا۔ کچھ ہنسنے بولنے کی باتوں میں کاغذات لے کر دیکھے گئے۔ کسی میں کوئی خامی نکالی گئی۔ کسی کو پاس کر دیا گیا پون گھنٹے کے بعد جانی کی باری آئی۔ اس کے تمام کاغذات بالکل درست تھے اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

وہ بڑبڑاتا ہوا اپنی ٹیکسی کے پاس آیا پھر اگلا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کاغذات کو ڈیش بورڈ میں رکھتے ہوئے بولا۔ "معاف کیجئے گا! ان پولیس والوں نے اتنی دیر لگا دی۔ میں ابھی آپ کو پہنچا دوں گا۔ آپ میٹر کی پروا نہ کریں بہت ہی مناسب کرایہ لوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ ذرا آگے بڑھتے ہی پیچھے سے دروازہ کھٹ کھٹ کی آواز سے بجنے لگا تو اس نے کہا۔ "بی بی جی! دروازہ بند کر لو۔ یہ اچھی طرح بند نہیں ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا مگر دروازہ اسی طرح بجنے لگا۔ اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے میں بند کر دیتا ہوں۔"

اس نے گاڑی سے اتر کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا تو سیٹ خالی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے کھلے ہوئے دروازے کے پاس آیا۔ وہ نہیں تھی لیکن وہاں جو منظر نظر آیا اسے دیکھ کر پہلے تو وہ ساکت رہ گیا۔ حیرانی سے دیدے پھیل گئے پھر وہ ایک دم سے تڑپ

کر دروازے کو پوری طرح کھولتے ہوئے پچھلی سیٹ کی طرف پہنچ گیا۔ پچھلی سیٹ پر یہاں سے وہاں تک گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھی۔ بالکل اسی طرح ایک بار اس نے فرزانہ کے لیے کبھی ان پتیوں کی سیج بچھائی تھی۔ اس کے لئے اپنی ٹیکسی کو خوشبوؤں کی جنت بنا دیا تھا۔ آج وہی برقعے والی اسی جنت کا اشارہ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

"کیا وہ برقعے والی فرزانہ تھی؟" وہ سوچنے لگا۔ پچھلی سیٹ پر دس دس کے تین نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ وہ کرائے سے زیادہ رقم چھوڑ گئی تھی۔ "آخر وہ کون تھی؟"

اگر وہ فرزانہ نہ ہوتی تو وہ اس کے پاس آ کر اسے کرایہ دے کر معذرت کر کے کسی دوسری گاڑی میں چلی جاتی جیسا کہ وہ چلی گئی تھی لیکن اس نے آ کر کرایہ نہیں دیا تھا بلکہ چپ چاپ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ چپ چاپ بھاگنے والی سے اس کا تعاقب کا رشتہ ہے۔

"لوگو! کیا تم نے ایسا دشمن دیکھا ہے جو پتھر نہ مارتا ہو۔ پھول مارتا ہو۔ کیا تم نے ایسی محبت دیکھی ہے جو راستے میں کانٹے نہ بچھاتی ہو پھولوں کی پتیاں بچھا کر دیوانے کے پاؤں کو لہولہان کرتی ہو۔"

اس نے پچھلی سیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوچا۔ وہ یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے اسی جگہ اپنا سر رکھ دیا۔ اب وہ محبت کی گود میں سر رکھ کر پوچھ رہا تھا۔ "کیوں چلی گئیں؟ کہاں چلی گئی ہو؟"

پہلی بار تم نے اپنا چہرہ دکھا کر رخسانہ کو میری دلہن بنا دیا تو میری سمجھ میں آیا کہ تم مجھے نہیں چاہتی تھیں۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں غصے میں تمہیں تلاش کرتا رہا۔ دوسری بار تم صدر میں ایمپریس مارکیٹ کے سامنے نظر آئیں۔ ایک رکشہ تمہیں دور لے جا رہا تھا اور میں تمہیں پکار رہا تھا۔ تم میرے پاس نہیں آئیں۔ دور ہوتی چلی گئیں۔ تب مجھے اور غصہ آیا کہ تم مجھ سے چھپتی پھر رہی ہو۔ تم ایک مجرم ہو۔ مجھے تم سے شدید نفرت کرنا چاہئے میں محبت اور نفرت کے درمیان تمہیں تلاش کرتا رہا۔ آج تیسری بار تم پھولوں کی یہ سیج بچھا کر گئی ہو تو میرے سارے شکوے دور ہو گئے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مجھے چاہتی ہو' مجھے یاد کرتی ہو۔ میرا سایہ بن کر پیچھے رہتی ہو اور میں نادان تمہیں آگے ڈھونڈتا ہوں۔ مگر کیوں ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہو۔ مجھے آواز کیوں نہیں دیتیں مجھے اپنی طرف کیوں

نہیں بلا لیتیں۔ اپنا پتا کیوں نہیں بتاتیں؟ مجھ سے منہ کیوں چھپاتی ہو' بولو؟

اس نے فرزانہ کی گود سے سر اٹھا کر پوچھا۔ "بولو؟"

لیکن اس کا سوال کھٹک گیا فرزانہ وہاں نہیں تھی پھر غائب ہو گئی تھی۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر خالی سیٹ کو دیکھنے لگا پھر مجھے دھوکا دے گئیں پھر چلی گئی ہو۔ اس نے پھولوں کی کو سمیٹ کر مٹھی میں بھینچ لیا۔ کیا تم نے محبت کو مذاق سمجھ لیا ہے؟ تم مجھ پر یہ پھول کی پتیاں اناتی ہو یا محبت کے جوتے مارتی ہو' بولو؟

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بڑا بورڈ چلا گیا۔ ایسی جگہ گاڑی کھڑی کی جہاں دو شامیانے نظر آ رہے تھے۔ وہاں آنے والی عورتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں لیکن وہ کہاں کہاں جا کر اسے تلاش کر سکتا تھا۔ وہ کس محفل میں آئی ہو گی۔ اسے کس طرح تلاش کرے وہ جھنجلا گیا۔ اسٹیئرنگ پر مکے مارنے لگا۔ اس وقت وہ سامنے ہوتی تو وہ اسے کچا چبا جاتا۔

وہ شام کے چار بجے تک وہاں بھٹکتا رہا لیکن وہ بادامی رنگ کا برقع نظر نہیں آیا جو پچھلی سیٹ سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ مایوس ہو کر وہاں سے چل پڑا۔ اب اس کے دماغ میں دوسری بات آئی کہ جو ڈرائیور فرزانہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر لایا تھا اس سے پوچھنا چاہئے کہ فرزانہ گاڑی میں کہاں سے سوار ہوئی تھی۔ یقیناً وہ اسی جگہ رہتی ہو گی۔

اس ٹیکسی کو چلانے والا ڈرائیور اورنگی نمبر ایک میں رہتا تھا۔ اس کے گھر کا پتا بھی معلوم تھا۔ جانی نے اس کے گھر پہنچ کر پوچھا۔ "تم اس برقعے والی کو کہاں سے بٹھا کر لائے تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "بڑا بورڈ کے ٹیکسی اسٹینڈ سے۔"

"ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑا بورڈ میں ہی رہتی ہے۔"

"کیا بات ہے استاد! کیا کوئی گھپلا ہو گیا ہے؟"

جانی نے کہا۔ "ارے! یہ وہی لڑکی تھی جسے میں تلاش کرتا پھرتا ہوں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "اچھا۔ کیا وہ ڈاکٹرنی فرزانہ تھی؟"

"ہاں۔ وہی تھی۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے آگے بڑھا دیا۔ ذرا دور جا کر حاجی ہوٹل کی طرف سے گھوم کر دوسری سڑک پر آیا۔ وہاں بسوں' منی بسوں اور رکشہ ٹیکسیوں نے ایک دوسرے کو اوور ٹیک کرنے کے نتیجے میں راستے کو بلاک کر دیا

تھا۔ اس نے گاڑی کو سڑک سے اتار کر ایک کنارے روک دیا تاکہ ٹریفک کا ہجوم ختم ہو تو وہ اطمینان سے آگے بڑھے۔ اس نے گاڑی سے اتر کر پان کی دکان سے ایک پیکٹ خریدا۔ پھر سگریٹ منہ میں دبا کر اسے سلگانے لگا۔ اسی وقت اس کی نظر سڑک کی دوسری طرف گئی۔ وہاں وہ بادامی برقع نظر آرہا تھا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھ کر سڑک کو پار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ گاڑیوں اور انسانوں کا ایسا ہجوم تھا جیسے سمندر کی لہریں راستہ روک رہی ہوں پھر بھی وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے فرزانہ چلی آرہی تھی۔ سڑک کے کنارے پیدل چلنے والوں کی بھی بھیڑ تھی۔ اسی لیے وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتی تھی۔ اسی بھیڑ میں کچھ من چلے بھی تھے جو موقع سے فائدہ اٹھا کر ذرا ٹکر مارنے سے نہیں چوکتے تھے ایسے ہی وقت وہ ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ سامنے سے جانی آتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پہلے تو گھبرائی پھر دماغ نے سمجھایا۔ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے 'چہرے پر نقاب ہے جانی اسے پہچان نہیں سکے گا۔ اسے چپ چاپ سر جھکا کر اس کے قریب سے گزر جانا چاہیے۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ ادھر سے وہ تیزی سے بڑھتا آرہا تھا۔ ایک جگہ دونوں آمنے سامنے آئے۔ وہ کترا کر جانے لگی جانی چپ چاپ کھڑا برقعے کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جرات نہیں ہو رہی تھی۔ صرف بادامی برقعے کو پہچان کر وہ کسی غیر عورت کو مخاطب نہیں کر سکتا تھا۔ اگر برقعے والی بھڑک جاتی 'اعتراض کرتی تو آس پاس کے لوگ اس کی پٹائی بھی شروع کر دیتے۔ وہ ہچکچاتا رہ گیا۔ فرزانہ آگے بڑھ گئی۔ جب وہ کچھ دور نکل گئی تو وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ فرزانہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا اگر ایک بار بھی دیکھ لیتی تو اس کے شبہ کو تقویت پہنچتی اس لیے وہ سیدھی چلتی ہوئی اپنی ڈسپنسری کے دروازے پر پہنچی پھر اسے کھول کر اندر آگئی۔ جانی نے سر اٹھا کر بڑے سے سائن بورڈ کو پڑھا لکھا تھا۔ "لیڈی ڈاکٹر نفے واسطی"

اس نے سوچتے ہوئے سر جھکا لیا۔ دوسرے ہی لمحے پھر چونک کر بورڈ کی طرف دیکھا۔ لیڈی ڈاکٹر نفے واسطی کا نام پڑھ کر اس کے دماغ نے کہا۔ نفے سے فرزانہ بھی ہو سکتا ہے۔

فرزانہ نے اندر پہنچتے ہی دروازے کو بند کر دیا۔ تیزی سے چلتے ہوئے ڈسپنسری کے

حصے سے گزرتی ہوئی دوسرے کمرے میں پہنچی۔ وہاں اس کی امی بیٹھی ہوئی آلو چھیل رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہوا بیٹی تم آگئیں۔ میں فکر مند تھی کہ دیر کیوں ہو رہی ہے۔"

وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "امی غضب ہو گیا۔ جانی یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہاں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔"

اس کی امی نے کہا۔ "تعجب ہے۔ تم نے تو برقع پہنا ہوا ہے۔ اس نے تمہیں کیسے پہچانا؟"

"میں آپ کو بعد میں بتا دوں گی۔ ابھی وقت نہیں ہے۔ یہ سوچنا ہے کہ جانی کو کیسے ٹالا جا سکتا ہے؟ اس نے میرا چہرا نہیں دیکھا ہے لیکن یہاں آئے گا تو دیکھ لے گا۔"

اس کی امی نے اسے غور سے دیکھا پھر اس کے برقعے کو چھو کر بولیں۔ "اگر اس نے برقعے کے اندر تمہیں نہیں دیکھا ہے تو فوراً اسے اتارو۔"

"اسے تو اتارنا ہی ہے۔ وہ برقع اتارتے ہوئے بولی۔ "مگر جانی....."

اس کی امی نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ تم کمرے سے باہر نہ آنا میں اس سے نمٹ لوں گی۔"

فرزانہ نے برقع اتار کر ایک طرف رکھا تو اس کی امی نے جلدی سے وہ برقع پہن لیا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ کیا؟"

"بس دیکھتی جاؤ۔ میں اسے ٹال کر آتی ہوں۔"

"برقع پہننے کے دوران باہر والے دروازے پر دستک سنائی دی۔ فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔ "امی! وہی ہے۔"

"تم نے تو اسے آسیب بنا کر اپنے دماغ میں بٹھا لیا ہے! تم چپ چاپ یہاں بیٹھی رہو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ وہ برقع پہنتے ہوئے اس کمرے سے نکل کر ڈسپنسری میں آئیں پھر وہاں سے گزرتے ہوئے انہوں نے بیرونی دروازے کو کھول دیا۔ سامنے جانی کھڑا تھا اور جانی کے سامنے وہ بادامی برقعہ تھا۔ برقعے کا نقاب اب الٹ گیا تھا۔ چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور یہ چہرہ وہ نہیں تھا جس کی تلاش میں وہ بھٹک رہا تھا۔

انہوں نے پوچھا۔ "فرمائیے! کیا آپ بیمار ہیں؟ اگر بیمار ہیں تو ہمیں افسوس ہے

یہاں صرف عورتوں اور بچوں کا علاج ہوتا ہے۔ میں کسی مرد کا علاج نہیں کرتی۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ کا نام.....؟"

"میرا نام باہر سائن بورڈ پر لکھا ہوا ہے اگر آپ پڑھنا نہ جانتے ہوں تو میرا نام لیڈی ڈاکٹر ف۔ واسطی ہے۔ پورا نام معلوم کرنا چاہو تو فرزانہ واسطی۔"

ایسا کہتے وقت وہ جانی کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے جبڑے سخت ہو گئے تھے جیسے وہ اپنے جوش اور جذبے کو اور غصے کو اندر ہی اندر کچل رہا ہو۔ دانتوں تلے پیس رہا ہو۔ اس کی آنکھیں ایسی اداس تھیں جیسے وہ دنیا کے اتنے بڑے صحرا میں اپنی محبت کو تلاش کرتا پھر رہا ہو اور مایوس ہو کر چپ چاپ صدمہ برداشت کر رہا ہو۔ رونا چاہتا ہو مگر مردانگی اسے رونے سے روکتی ہو۔

انہوں نے سوال کیا۔ "کچھ اور پوچھنا ہے یا دروازہ بند کر دوں؟"

جانی نے ان سے نظریں ملائیں پھر بڑے کرب سے بولا۔ "آپ بوڑھی خاتون ہیں میں آپ کو ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ ماں جی! یہ تو بتایئے اتنے بڑے کراچی شہر میں کتنی ہی فرزانائیں ہیں۔ مجھے ہر فرزانہ ملتی ہے مگر وہ نہیں ملتی؟"

اس کی وہ بات ایک سوال ہی نہیں تھی اس کا لہجہ بھی ایسا سوالی تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک دروازے پر کھڑا ہوا بھکاری لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی صحیح دروازے پر بھیک اور صحیح راستے پر منزل نہیں ملتی۔

انہوں نے کہا تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تم کسی فرزانہ کو تلاش کر رہے ہو۔ بیٹے! کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو بہت عام ہوتے ہیں۔ ایک شہر میں ایک ہی نام والے سیکڑوں' ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔"

"یہی تو مشکل ہے کہ جسے ہم پانا چاہتے ہیں' اسے پا نہیں سکتے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟ اب جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کرنے لگیں۔ جانی نے بند ہونے والے دروازے کو دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے کہا۔ "بس ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ کیا آپ اصلی فرزانہ ہیں؟"

وہ ایک دم سے گھبرا گئیں پھر جلدی سے سنبھل کر بولیں۔ "کیا مطلب؟ تم ایسی بات

کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا میں فرزانہ نہیں ہوں؟"

"آپ فرزانہ ہو سکتی ہیں لیکن کوئی دوسری صورت والی فرزانہ بن کر آتی ہے تو میرے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ فرزانہ کے نام پر دھوکا دے کر مجھے ایک دوسری عورت سے منسوب کر دیا گیا۔ اب کوئی دوسری عورت میرے سامنے آکر کہتی ہے کہ وہ فرزانہ ہے تو مجھے شبہ ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے پیچھے میری اپنی فرزانہ چھپی ہوئی ہے۔"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے تمہاری کسی فرزانہ کو چھپا رکھا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں....."

"انہوں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم جو بھی کہنا چاہتے ہو اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کر کے اندر کی چٹخنی چڑھا دی لیکن وہاں سے ہل نہیں سکیں۔ پتا نہیں کیسی زنجیر تھی کہ ان کے پاؤں میں پڑ گئی تھی۔ وہ ایسے وقت فرزانہ کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ بیٹی کے سامنے جائیں گی تو وہ محسوس کر لے گی کہ ماں نے بھی اس کے درد کو سمجھ لیا ہے۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ دروازے سے لگی کھڑی رہیں۔ دوسری طرف جانی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے قدم بھی اس دروازے کے سامنے جم گئے تھے۔

ڈسپنسری کے اندرونی دروازے پر جو پردہ تھا اس کے پیچھے فرزانہ بہت دیر سے کھڑی ہوئی جانی کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی آوازیں اس کے چہرے کو روشن کر رہی تھیں۔ ہائے کیسا دیوانہ ہے؟ کیسے اس کے پیچھے اتنے عرصے سے بھاگتا چلا آ رہا ہے۔ وہ تو سمجھی تھی کہ پچھلی سیٹ پر پھولوں کی پتیاں بکھیر کر آ جائے گی تو وہ اس کے لئے تڑپے گا مگر اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے دروازے تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن وہ پہنچ گیا تھا۔

اس کی تلاش پر کتنا پیار آ رہا تھا۔ پردے سے نکل کر اس کے آگے مرجانے کو جی چاہتا تھا اور اس کی دیوانگی سے کتنا خوف آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اگر وہ بھاگ کر کسی کمرے کے کونے میں جا کر نہیں چھپے گی تو وہ آکر اسے دبوچ لے گا اس نے ایک تصویر دیکھی تھی۔ اس تصویر میں ایک شیر چھلانگ مار کر ایک بکری کو دبوچ رہا تھا۔ وہ ایسا منظر

تھا کہ اس سے خوف آتا تھا لیکن جیسی درندگی سے شیر بکری کو دبوچ لیتا ہے وہ شاید اچھا لگتا ہے اگر اچھا نہ لگتا تو اس کی تصویر جگہ جگہ لگی ہوئی نظر نہ آتی کہ جب درندگی اچھی لگتی ہے تو پھر اس سے خوف کیوں آتا ہے؟

وہ خیالات سے چونک گئی۔ اس کی امی پردہ ہٹا کر اندر آئیں۔ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ "شاید وہ چلا گیا ہے۔"

جانے کیوں فرزانہ کو یقین نہیں آیا کہ وہ چلا گیا ہے۔ دیوانہ کیسے جائے گا۔ وہ یقین کرنے کے لئے تیزی سے چلتے ہوئے کمرے کی اس کھڑکی کے پاس آئی جو باہر سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی پر آہنی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کھول کر پردے کو ذرا سا ہٹا کر باہر کی طرف دیکھا۔ سڑک پر بہت بھیڑ تھی۔ ابھی تک ٹریفک کا ہجوم تھا۔ گاڑیوں کے مسلسل ہارن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ٹریفک کانسٹیبل سیٹی پر سیٹی بجا رہا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ ان میں جانی کہیں نظر نہیں آیا اگر وہ ابھی تک بیرونی دروازے کے پاس کھڑا ہوگا تو دروازے کا وہ حصہ کھڑکی کی طرف سے نظر نہیں آتا تھا۔

باہر کھڑے ہوئے جانی نے بند دروازے کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی پھر وہاں سے پلٹ کر بوجھل قدموں سے جانے لگا۔ جب وہ اس دروازے سے چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ ٹھہر گیا تو کھڑکی کے پاس پردے کے پیچھے کھڑی فرزانہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب وہ نظر آرہا تھا۔ وہ سر اٹھا کر اس سائن بورڈ کو پڑھ رہا تھا۔

دیوانہ وہاں سے جانا چاہتا تھا مگر وہ فریب اسے روک رہا تھا دل کہتا تھا کہ جو بھی اجنبی فرزانہ آتی ہے اس کے پیچھے اس کی فرزانہ چھپی ہوتی ہے۔ وہ کیا کرے؟ تقدیر اس کے گلے میں محبت کا پھندا ڈال کر اسے محبوب کی گلیوں میں گھسیٹتی پھر رہی تھی۔

وہ کیا کرے؟ محبت ایک چڑیل بن گئی تھی اور یادوں کے تیز ناخنوں سے اسے نوچ کھسوٹ رہی تھی۔

وہ وہاں سے جانے کے لئے آگے بڑھا پھر رک گیا۔ اس گلی کی ہوا اس کے کانوں میں منتر پڑھ رہی تھی۔

اس نے پھر سائن بورڈ کی طرف دیکھا۔ ایک گہری سانس کھینچی۔ وہ سانس لیتا تھا تو

سینے میں اس کے نام کی خوشبو بھر جاتی تھی' اور اس کا سینہ جلنے لگتا تھا۔ وہ دودھ کا جلا تھا' اب خوشبو سے بھی جل جاتا تھا۔

فرزانہ کو یوں لگا جیسے وہ اندھی ہو رہی ہے۔ کھڑکی کے باہر کا منظر دھندلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مٹ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے کے آنچل کو آنکھوں پر رکھ لیا۔ آنچل آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ آنکھیں پونچھنے کے بعد پھر اس نے دیکھا تو منظر صاف تھا۔ اب وہ وہاں سے واپس جا رہا تھا اور سڑک کو پار کر رہا تھا۔ بھیڑ میں گم ہو رہا تھا اور گم ہوتے ہوئے بالکل مٹ گیا تھا۔ تب فرزانہ کی آنکھیں ڈھیر سارے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ کو چھپا لیا۔ اور بے اختیار سسک سسک کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنے شانے پر ماں کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ وہ اپنی امی سے لپٹ گئی۔ اس کی امی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اپنے ہاتھ سے ہولے ہولے اس کی پیٹھ کو تھپکنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔ "امی اندھیرا کیوں کر دیا؟"

"بیٹا! تم کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں باہر سے نظر نہ آجاؤ۔ وہ چلا گیا ہے نا؟"

اس کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی۔ بات نہیں نکلی۔ جواب تو نکل ہی گیا۔ اس کی امی نے آگے بڑھ کر پہلے کھڑکی کے پٹ بند کیے' پردے کو درست کیا۔ اس کے بعد لائٹ آن کر دی۔ روشنی ہوتے ہی انہوں نے پوچھا۔ "کیا رخسانہ کا خط لے آئی ہو؟"

فرزانہ نے سینٹر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں نیلے رنگ کا ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اس کی امی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ لفافے پر خوش خطی سے رخسانہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا' کسی نے بڑے پیار سے اس نام کو لکھا ہے۔ اسی لفافے کے ایک گوشے میں جمشید کا نام تھا۔ اس کی امی نے پوچھا۔ "اس خط میں کیا لکھا ہے؟"

فرزانہ نے کہا۔ "میں کیا بتاؤں۔ لفافہ بند ہے جو کچھ مجھے زبانی بتایا گیا ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ جمشید اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانا چاہتا ہے۔ کب کرانا چاہتا ہے اس میں کیا اخراجات ہوں گے اور رخسانہ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا یہ تو اس

خط کو پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ اور ہمیں کسی کا خط نہیں پڑھنا چاہیے۔"
"میں یہ لفافہ لے جا کر رخسانہ کو دوں گی اور اسے پوچھ لوں گی۔"
فرزانہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اب آپ یہ لفافہ لے کر رخسانہ کے پاس کیسے جائیں گی؟ جانی نے ابھی آپ کو برقعے میں بے نقاب دیکھا ہے۔"
اس کی امی نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہائے بیٹی! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ میں نے تو اپنا چہرہ دکھا دیا ہے۔ اب وہاں سامنا ہو گا تو...." وہ کہتے کہتے رک گئیں۔ پھر سوچ کر بولیں۔ "میں اسلم آباد والے مکان میں جاؤں گی۔ پہلے کسی پڑوسی کے ہاں جا کر بیٹھوں گی۔ وہاں دیکھوں گی کہ جانی نہیں ہے اس کی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی ہے تو چپ چاپ رخسانہ کے والدین کے پاس جاؤں گی اور یہ لفافہ انہیں دے دوں گی اور انہی سے معلوم کروں گی کہ اس میں کیا لکھا ہے؟"

جانی سڑک کو پار کر کے لوگوں کی بھیڑ سے گزرتا ہوا اپنی ٹیکسی کے پاس پہنچا وہاں بھی بہت سی گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ ٹیکسی کے پاس ٹریفک پولیس کا ایک سارجنٹ اور دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنی ٹیکسی کا دروازہ کھولنے لگا تو سپاہی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "یہ تمہاری ٹیکسی ہے؟ چلو اپنے کاغذات نکالو۔"

وہ اپنے کاغذات نکالنے لگا۔ دور کھڑے ہوئے سارجنٹ نے غصے سے چیخ کر کہا۔ "ابے نواب صاحب کے بچے! یہ ٹیکسی کھڑی کرنے کی جگہ ہے۔ سالے جہاں دیکھتے ہیں ٹیکسی کھڑی کر دیتے ہیں۔"
جانی سالے کا لفظ سن کر تلملا گیا۔ اس نے دانت پیس کر سارجنٹ کی طرف دیکھا پھر بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "جناب! میں نے گاڑی کنارے پر کھڑی کی ہے۔ ایک ضروری کام سے ادھر گیا تھا۔"
"یہ گاڑی پارک کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں گاڑی کھڑی نہ کرتے تو کتنی ہی گاڑیاں ادھر سڑک کے کنارے سے ہو کر گزر جاتیں۔"
وہ ادب سے بولا۔ "جناب! اگر یہاں گاڑی کھڑی نہیں ہو سکتی تو دوسری گاڑیاں

بھی یہاں سے نہیں گزر سکتیں۔ کیونکہ یہ تو پیدل چلنے والوں کی جگہ ہے۔"
"ابے سالے! ہم سے بحث کرتا ہے۔"
یہ کہہ کر سارجنٹ نے ایک ایسی گالی دی کہ جانی سے برداشت نہ ہو سکا بے اختیار اس کا ہاتھ گھوم گیا۔ سارجنٹ کے منہ پر ایک گھونسا پڑا پھر دو چار گھونسے پڑتے چلے گئے۔ سپاہی دوڑتے ہوئے آئے اور جانی کو دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ اس وقت تک اچھی خاصی بھیڑ لگ چکی تھی۔ دو گاڑیاں رکی ہوئی تھیں ان کے ڈرائیور دھر آنے لگے۔ اچھی خاصی بحث ہو رہی تھی۔ شور ہو رہا تھا۔ جانی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ہم گاڑیاں چلاتے ہیں۔ اپنی عزت نہیں بیچتے۔ تم قانون کو سمجھاتے ہو مگر منہ سے گالیاں نکالتے ہو کیا ہم اتنے گرے ہوئے ہیں کہ تمہاری گالیاں سنیں گے؟ تم شریف آدمی ہو۔ کیا گالی کے بغیر بات نہیں کر سکتے؟"

اس کی چیخ پکار کا مطلب دوسرے ڈرائیور بھی سمجھ رہے تھے اور اس کی حمایت میں بول رہے تھے۔ وہاں پندرہ اور پولیس والے بھی آ گئے لیکن ڈرائیوروں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ اس سارجنٹ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور دھمکیاں دے رہے تھے کہ اگر اس نے جانی سے معافی نہ مانگی تو وہ سب ہڑتال کر دیں گے اور اپنی یونین کے ذریعے مطالبہ پیش کریں گے کہ پولیس والوں کو ڈرائیوروں سے مہذب رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر کوئی گالی دیتا ہے تو اس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ وہاں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ پولیس سارجنٹ کی پوزیشن کمزور ہو چکی تھی۔ دوسرے پولیس والے بیچ بچاؤ اور سمجھوتے پر اتر آئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سمجھوتا ہو گیا۔ سارجنٹ نے دبی زبان سے معافی مانگی پھر آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹنے لگی۔ گاڑیاں گزرنے لگیں۔ راستہ صاف ہونے لگا۔
جانی اپنی ٹیکسی کے اسٹیئرنگ پر آ کر بیٹھا تو اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔
جہاں اس کی ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ڈاکٹر فرزانہ کا کلینک نظر آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے آہستگی سے آگے بڑھایا پھر ایک جھٹکے سے روک دیا۔ انجن کو بند کر دیا۔ کیونکہ کلینک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے کوئی عورت باہر آ رہی تھی۔ جانی نے بڑی توجہ سے بڑی حیرانی سے دیکھا اگرچہ وہاں کافی فاصلہ تھا مگر جانی کی نظریں تیز تھیں۔ وہ اچھی طرح پہچان سکتا تھا۔ وہ وہی عورت

ہوں۔

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی اور سوچتا گیا کہ اگر میں شام ہی کو بڑا بورڈ کے ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ جاتا تو شاید وہ نظر آجاتی اب تو اتنی رات ہوگئی ہے وہ گھر سے نہیں نکلے گی۔ اب ادھر جانا بے کار ہے۔

وہ ڈرائیو کرتا ہوا گھر کی طرف جانے لگا۔ اب وہ جیسے جیسے فرزانہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کیسا دھوکا دیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی رہی تھی۔ اسے مخاطب نہیں کیا تھا اور جانے سے پہلے پھولوں کی پتیاں بکھیر کر چلی گئی تھی اسے ایک اور چرکا لگایا تھا۔ اس کا مذاق اڑایا تھا اسے بے وقوف بنایا تھا۔ اسے چیلنج کیا تھا کہ آؤ مجھے ڈھونڈ لو' مجھے پکڑ لو۔ میں چھپتی رہوں گی' تم بے وقوف بنتے رہو گے اور میں بے وقوف بناتی رہوں گی۔

جب وہ اپنے مکان کے احاطے میں پہنچا تو غصے سے تلملا رہا تھا۔ اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے چہرے سے رخسانہ اس کے اندرونی جذبوں کو پڑھ لے۔ اسے بیوی کی ذہانت سے ڈر لگتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک ٹیکسی کے اندر بیٹھا رہا۔ اپنے غصے کو ضبط کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کی کھڑکی کھلی۔ رخسانہ کا آدھا چہرہ نظر آیا۔ آدھا چہرہ سفید پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے آواز دی۔ "جانی! کیا ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ تمہاری گاڑی کی آواز سن کر میں یہی سمجھ رہی ہوں کہ تم آکر دروازہ کھٹکھٹانے والے ہو۔ کہاں ہو تم؟"

باہر اندھیرا تھا۔ کھڑکی سے باہر جانے والی روشنی ٹیکسی تک نہیں پہنچ رہی تھی اور ٹیکسی کے اندر بھی تاریکی تھی۔ اس لیے جانی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا پھر غصے سے بند کر لیا اس بار غصہ اس لیے آیا کہ رخسانہ کے ساتھ اس کی ساس کا چہرہ بھی نظر آرہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "بیٹی! ٹیکسی کا سامنے والا دروازہ کھلا ہوا لگتا ہے۔ شاید وہ ٹیکسی یہاں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"نہیں امی! وہ ٹیکسی روکتے ہی پہلے میرے پاس آتے ہیں اپنے بیٹے کو پیار کرتے ہیں وہ ایسے کہیں نہیں جائیں گے۔"

"تم تو میری بات جھوٹ سمجھتی ہو اگر وہ ہوتا تو جواب بھی دیتا۔ وہاں تو خاموشی

تھی جو بادامی برقعے میں اس کے سامنے دروازہ کھول کر کھڑی ہوئی تھی اور خود کو لیڈی ڈاکٹر نے واسطی بتایا تھا۔ یقیناً وہ لیڈی ڈاکٹر ہوگی اور فرزانہ واسطی بھی ہوگی لیکن گھر میں تو وہ برقع پہن کر لی تھی اور اب برقعے کے بغیر باہر نکلی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھی سی بالٹی تھی جس میں اکثر لوگ چائے یا دودھ خرید کر لاتے ہیں اور وہ سامنے ہی ایک دودھ والے کی دکان پر جا رہی تھی۔

جانی اسٹیئرنگ سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا تعجب سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ جو عورت بادامی برقع پہن کر باہر سے آئی تھی اس کلینک کے دروازے سے اندر گئی تھی وہی عورت دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اس کے سامنے برقع میں بے نقاب آئی تھی' اور اب وہی عورت برقع گھر میں اتار کر بے پردہ دودھ خریدنے کے لیے سامنے ایک دکان پر گئی تھی یہ کیسا پردہ تھا؟

وہ سوچتا رہا اور ونڈ اسکرین کے پار اس خاتون کو دیکھتا رہا۔ اب وہ دودھ خریدنے کے بعد واپس جا رہی تھی پھر وہ کلینک کے دروازے کو کھول کر اندر چلی گئی۔ اب دروازہ بند ہو گیا۔

وہ اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔ ایک بات تو یہ سمجھ میں آرہی تھی کہ جو عورتیں غلط قسم کی ہوتی ہیں وہ محلے سے باہر برقع پہن کر جاتی ہیں اور جب برقعے کی ضرورت نہیں ہوتی تو بے پردہ محلے کے اندر گھومتی ہیں یا کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو [illegible] پردہ کرتی ہیں لیکن گھر کے آس پاس والی دوکانوں میں ایسے ہی سر پر چادر ڈال [illegible] نے کے لئے نکل جاتی ہیں اگرچہ ان خاتون نے سر پر چادر بھی نہیں ڈالی تھی مگر [illegible] پتہ تھا اور وہ سر جھکائے دودھ خریدنے گئی تھیں اور اسی طرح واپس چلی گئی تھیں۔ [illegible] خواہ مخواہ ان کے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہاں بیٹھا سوچتا رہا کہ خاتون ایک بار پردہ کرتی ہیں اور دوسری بار پردہ نہیں کرتیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے خود پر لعنت بھیجتے ہوئے سوچا' میں گدھا ہوں خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہا ہوں۔ فرزانہ اس بادامی برقعے میں بڑا بورڈ کے ٹیکسی اسٹینڈ سے سوار ہوئی تھی وہ یقیناً وہیں آس پاس کہیں رہتی ہے' یہاں وہ کیسے آجائے گی۔ یہاں دوسری لیڈی ڈاکٹر ہے جس کی صورت میں دیکھ چکا ہوں۔ میں کیوں اپنا وقت برباد کر رہا

ہے۔"

رخسانہ نے کہا۔ "میں جا کر دیکھتی ہوں۔"

وہ کھڑکی کے پاس سے پلٹ کر جانا چاہتی تھی اتنے میں بچہ رونے لگا وہ بچے کے پاس گئی پھر اسے اٹھا کر تھپکنے لگی۔ "امی! آپ جا کر ذرا دیکھیں۔"

"بیٹی! مجھے تو معاف کرو۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ "اب میں دودھ چھڑا کر کیسے جاؤں؟ آپ کچھ تو خیال کریں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے وہ آپ کو کھا تو نہیں جائیں گے۔ پلیز، امی جائیے۔ شاید وہ نشے میں ہوں گے اس لیے جواب نہیں دے رہے ہیں۔ اگر نشے میں ہوں۔ آپ کو ڈر لگے تو آپ واپس آ جائیے گا۔ میں اسے سلانے کے بعد انہیں لے آؤں گی۔"

اس کی امی انکار نہ کر سکیں۔ کھڑکی کے پاس سے پلٹ کر دروازے کی طرف جانے لگیں۔ ادھر جانی نے جب دیکھا کہ اس کی ساس کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی ہے۔ اب نظر نہیں آ رہی ہے تو اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔ وہ ٹیکسی سے باہر آنا چاہتا تھا۔ اتنے میں برآمدے کی لائٹ آن ہو گئی۔ وہ رک کر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ رخسانہ اس کے پاس آ رہی ہے۔ اچھا ہے یہاں تنہائی ہے۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ ان کے درمیان ساس نہیں ہو گی۔

لیکن برآمدے کی روشنی میں ساس کا وجود نظر آیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے قدم بڑھاتے ہوئے اس کی طرف آ رہی تھی۔ جانی نے دانت پیس کر انہیں دیکھا پھر سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ اپنے دیدے پھیلا لیے منہ کو تھوڑا سا کھول لیا۔ یوں ساکت ہو گیا جیسے دم سے ساکت ہو گیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ سہمے ہوئے انداز میں ٹیکسی کے قریب آ کر رک گئیں۔ دور ہی سے آواز دی۔ "جانی' بیٹے جانی.....!"

آواز دے کر وہ چپ ہو گئیں۔ جواب کا انتظار کرنے لگیں۔ اب جانی قریب سے نظر آ رہا تھا کہ اس کا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا ہوا ہے اور وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ شاید نشے میں ہے وہ اور قریب آئیں۔ دروازے کے پاس پہنچ کر آواز دی۔ "بیٹا! کیا آج پھر کوئی نشہ کیا ہے؟ دیکھو! یہ بری عادتیں ہیں۔ میں تمہاری ماں کے برابر ہوں۔ تمہیں سمجھاتی ہوں کہ ایسی عادتیں چھوڑ دو۔"

جانی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا وہ ذرا انتظار کرنے کے بعد اور آگے بڑھ آئیں' بالکل قریب آ گئیں۔ اب وہ اسے ہاتھ لگا کر دیکھ سکتی تھیں لیکن ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ وہ اس کے قریب جھک گئیں۔ گہری سانس لے کر سونگھنے لگیں کہ شراب کی بو آ رہی ہے یا نہیں؟

بو نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شراب نہیں پی ہے۔ انہوں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا پھر ایک دم سے سہم کر اور توجہ سے اسے دیکھنے لگیں۔ دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بالکل ساکت نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں پریشان ہو کر پوچھا۔ "جانی! کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم بولتے کیوں نہیں تم حرکت کیوں نہیں کرتے؟"

وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا تب ان کے دماغ نے سمجھایا کہ وہ مر چکا ہے ان کا داماد اب اس دنیا سے اٹھ گیا ہے ان کی بیٹی بیوہ ہو گئی ہے۔ وہ ایک دم سے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "ہائے! کیا تم... مم..... تم... مر گئے ہو؟"

ایسا کہنے کے بعد انہیں اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ جو مر گیا ہے اس سے اس کی موت کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔ وہ وہاں سے پلٹ گئیں اور چیخ مار کر کہا۔ "ہائے! میری بچی کا سہاگ....."

لیکن بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ پیچھے سے مردے نے اس کی قمیص کے دامن کو پکڑ لیا تھا۔ ان کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے ذرا سا سر گھما کر دیکھنے لگیں۔ مردہ دانت پیس کر کہہ رہا تھا۔ "تم کیا سمجھتی ہو' میں مرنے کے بعد تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا' ہرگز نہیں۔ تمام زندگی نفرت کرتا رہوں گا اور مرنے کے بعد تم سے اتنی محبت کروں گا کہ میری روح تمہارا پیچھا کرتی رہے گی۔ دنیا کے کسی داماد نے اپنی ساس سے اتنی محبت نہیں کی ہو گی۔"

انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنے دامن کو چھڑایا پھر وہاں سے دوڑتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے جانے لگیں۔ "لعنت ہے ایسے آدمی پر۔ خدا دشمن کو بھی ایسا داماد نہ دے۔ یہ تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔"

جب وہ دروازے پر پہنچیں تو رخسانہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا امی؟"

"ہو گا کیا۔ وہ تو زندہ ہے۔"

"کیا؟" رخسانہ نے پہلے تو حیرانی سے انہیں دیکھا پھر غصے سے بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ہوش میں تو ہیں۔"

"وہ ہوش میں کب رہنے دیتا ہے مردے کی طرح گاڑی میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے قریب جا کر اتنا ہی پوچھا کیا مر گئے ہو۔ بس اس نے مجھے پکڑ لیا اور کہنے لگا مرنے کے بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

رخسانہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر پاؤں پٹختے ہوئے قریب آ کر بولی۔ "آپ نے ان سے کہا کہ وہ مر گئے ہیں۔ کیا آپ میری دشمن ہیں۔ کیا آپ یہی سوچتی رہتی ہیں کہ میرا سہاگ اجڑ جائے اگر آپ کی جگہ کوئی دوسری ہوتی تو میں کیا بتاؤں کہ میں کیا کرتی۔ آپ میرے سامنے سے چلی جائیں۔"

وہ غصے سے بولیں۔ "ہائے بیٹی تم بھی میری دشمن بن گئی ہو کیا مردیا پایا ہے کہ اس کے لیے ماں کی ممتا کو بھی بھلا رہی ہو۔ میں کیا پاگل ہوں کہ تمہارے پاس آ کر رہتی ہوں۔ تمہاری تنہائی کا خیال کرتی ہوں بچے کے لیے سوچتی ہوں کہ کہیں تمہیں پریشان نہ کرے۔ دن رات تم لوگوں کی خدمت کرتی ہوں۔ اس کا صلہ مجھے یہ ملتا ہے۔ یا اللہ مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔ میں مر جاؤں گی تو میری بیٹی کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچے گی۔"

جانی کی آواز سنائی دی۔ "کیسے ٹھنڈک پہنچے گی۔ کیا مرنے کے بعد آپ ایئر کنڈیشنڈ بن جائیں گی۔"

اس کی آواز سنتے ہی وہ منہ پھیر کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں وہ اندر آ گیا۔ رخسانہ نے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ امی نے تمہارے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کیے۔ وہ کبھی کبھی ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتی ہیں مگر جانی یہ تمہاری کیا حرکت تھی۔ میں کھڑکی سے آوازیں دے رہی تھی اور تم جواب نہیں دے رہے تھے۔"

وہ بچے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "بس میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ تم جانتی ہو کہ ایسے وقت میں جواب نہیں دیتا۔ خاموش رہتا ہوں۔"

اس نے بچے کو بستر سے اٹھا لیا اور اسے پیار کرنے لگا۔ رخسانہ خوش ہو کر اسے دیکھ

رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ موڈ خراب کیوں تھا؟"

"پولیس والوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ کیا مستری چاچا یہاں آئے تھے؟"

مستری چاچا کا نام سنتے ہی رخسانہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر اس نے پوچھا۔ "کیا وہ یہاں آنے والے تھے؟"

"ہاں، آج دن کے وقت وہ عالم صاحب سے ملنے گئے تھے۔ میں نے کہا جانے کی ضرورت نہیں ہے وہ مجھے سمجھانے لگے کہ جھوٹ ہو، سچ ہو، فریب ہو یا نہ ہو۔ اس کے متعلق انسان کو پورا علم رکھنا چاہیے۔ آدمی جھوٹ سے گزر رہا ہے یا سچ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا چاہیے۔"

وہ بچے سے کھیلتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا۔ رخسانہ نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ "جانی اس روز تم نے مستری چاچا کے سامنے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کسی حال میں بھی مجھے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہے پھر کیا رہ گیا؟"

"دیکھا جائے تو کچھ نہیں رہا مگر دیکھو میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا کیونکہ تم مجھ سے زیادہ سمجھدار ہو۔ ہم چرائے ہوئے گاڑی کے پرزے کو بہت سستے داموں خرید کر اپنی گاڑی کو چلنے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ گاڑی چلتی رہتی ہے لیکن اس چل چلاؤ میں وہ جو چوری اور بے ایمانی کا پرزہ لگا ہوتا ہے وہ تو اپنی جگہ موجود رہتا ہے نا۔ اسی طرح ہماری تمہاری زندگی پیار و محبت سے چلتی رہے گی لیکن جس جھوٹ اور فریب سے نکاح پڑھایا گیا تھا وہ فریب ہمیشہ ہماری ازدواجی زندگی کے پیچھے قائم رہے گا۔ وہ مٹ نہیں سکتا۔"

"کیا تم بھول نہیں سکتے؟"

"کیا تم بھول سکتی ہو؟ کیا تنہائی میں کبھی یہ یاد نہیں آتا ہو گا کہ ہمارا نکاح کیسے پڑھایا گیا تھا جب تم ہم زندہ ہیں جب تک ہماری اولاد اللہ کے کرم سے سلامت رہے گی تب تک کیا ہمارے نکاح کی بات جاری نہیں رہے گی؟ کیا وہ بھلا دی جائے گی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا جانی کہ تم مجھے قبول تو کر رہے ہو مگر اس غلطی کو معاف نہیں کر رہے ہو۔"

تم میرے دل کو نہیں سمجھ سکتیں میں تمہاری غلطیوں کا کبھی حساب نہیں کرتا۔ میں

تمہیں سچے دل سے قبول کرتا ہوں۔ میں تو ایک قاعدے کی بات کر رہا ہوں۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ مجھ سے زیادہ سمجھتی ہو۔ وہ جو ایک قاعدہ ہوتا ہے ایک اصول ہوتا ہے۔ وہ اپنی جگہ اٹل رہتا ہے نا؟ اس کو ہم تم کیسے مٹا سکتے ہیں؟"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بچہ جانی کی گود میں مسکرا رہا تھا۔ محبت ان دونوں کے درمیان ایک شگوفے کی طرح کھل رہی تھی مگر اس کے پیچھے کہیں سے کانٹا چبھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے وہاں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی پھر باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ وہاں اس کی امی چٹائی بچھا کر سونا چاہتی تھیں۔ اسے دیکھ کر بڑبڑانے لگیں۔ "یہ جو مرد ہوتے ہیں یہ آسمان کی طرح ہمارے سروں پر قائم نہیں رہتے۔ بادل کی طرح سایہ کرتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ جب وہ ٹھکرائے گا تب پتا چلے گا کہ ماں کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔"

وہ دوڑتی ہوئی آ کر چٹائی پر بیٹھ گئی اور ماں کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔ انہوں نے سب بھول کر بیٹی کے سر کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا میری جان کو؟ کیا ہوا بیٹے؟"

"وہ امی۔ وہ مستری چاچا....."

"ارے اس بڈھے کا نام نہ لو۔ مجھے تو آگ لگ جاتی ہے۔"

"امی ابھی یہ بتا رہے تھے کہ مستری چاچا عالم صاحب سے ملنے گئے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پتا نہیں کیا ہوا۔ وہ ضروری فتویٰ لے کر آئے ہوں گے۔"

"بیٹی اگر فتویٰ تمہارے خلاف ہوتا تو وہ اب تک تمہارا گھر اجاڑنے کے لیے یہاں پہنچ چکے ہوتے اس وقت رات کے ڈیڑھ بج رہے ہیں۔ وہ گھر میں آرام سے نہیں ہوں گے۔ ان کے دل کی مراد پوری نہیں ہوئی ہے۔ مرجائے وہ بڈھا....."

اپنی اماں کی باتیں سن کر اسے تسلی ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مستری چاچا دن کے وقت عالم صاحب سے ملنے گئے تھے اور اب یہ وقت ہو گیا ہے میرے خلاف کوئی بات ہوتی تو وہ یہاں ضرور آتے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی باہر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ کلیجا دھک سے رہ گیا۔ اس

کی امی نے کہا۔ "شیطان کا نام لو تو وہ فوراً پہنچ جاتا ہے اللہ کرے وہ مرجائے۔ اس کا جنازہ اٹھے۔"

وہ دونوں چٹائی پر سے اٹھ گئیں۔ تیزی سے چلتے ہوئے برآمدے سے گزرتے ہوئے باہر آئیں۔

اس وقت تک جانی بھی بچے کو گود میں لے کر باہر آ گیا تھا۔ تب انہوں نے دیکھا۔ وہ ان کی دوسری ٹیکسی تھی۔ ڈرائیور گاڑی سے نکل کر تیزی سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ قریب آتے ہوئے جانی سے کہہ رہا تھا۔ "استاد بہت بری خبر ہے۔ ہمارے مستری چاچا فوت ہو گئے۔"

یہ بات سنتے ہی رخسانہ کی امی نے خوشی سے چیخ مار کر پوچھا۔ "سچ کیا وہ مر گئے۔"

جانی نے انہیں گھور کر دیکھا۔ وہ ایک دم سے سٹپٹا کر بولیں۔ "ہائے بے چارے کیسے مر گئے۔ کتنے نیک انسان تھے 'ابھی تو ان کے ہنسنے' بولنے 'کھانے پینے کے دن تھے۔ میرا دل تو باغ باغ میرا مطلب ہے میرا دل گھبرا رہا ہے۔ موت بھی کیا چیز ہے۔ ٹھیک وقت پر آتی ہے۔"

جانی نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "تم نشے میں تو نہیں ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں دن کے وقت انہیں ایک عالم صاحب کی طرف چھوڑ کر گیا تھا۔"

"استاد میں نشے میں نہیں ہوں۔ چھوٹو نے مجھے بتایا ہے وہ پیر کالونی کی طرف سے آ رہے تھے۔ ایک ٹرک انہیں دھکا مار کر چلا گیا۔ کچھ لوگ انہیں اٹھا کر اسپتال لے گئے تھے جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے اپنا نام اور پتا بتایا اس کے بعد وہ ہوش میں نہیں آ سکے۔"

جانی نے سوچنے کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ادھر عالم صاحب کے پاس سے واپس آ رہے تھے جبھی ٹرک سے ٹکرا گئے۔ آہ میرے چاچا۔ مجھے ابھی جانا ہوگا۔"

وہ بچے کو رخسانہ کی گود میں دے کر تیزی سے چلتا ہوا اپنی ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی اور مکان کے احاطے سے نکل کر دور چلی گئی۔ دونوں ماں بیٹی کمرے میں آ گئیں پھر ماں نے آہستگی سے کہا۔ "دیکھا عالم صاحب کے پاس سے واپس آ رہے

تھے۔ ہمارے لیے گڑھا کھودنے گئے تھے۔ خود گر گئے۔"

یوں تو رخسانہ کو بھی اندر ہی اندر اطمینان ہو گیا تھا مگر وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"امی' ایسی باتیں نہ کریں۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔"

"مرنا تو ضرور ہے مگر جو کسی کے لئے برائی کرتے ہوئے مرتا ہے اس کے لئے افسوس نہیں ہوتا۔"

رخسانہ سوچنے لگی۔ اس کی امی نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"سوچ رہی ہوں۔ پتا نہیں عالم صاحب نے انہیں کیا کہا ہو گا اور وہ ہمیں کیا بتانے آرہے تھے کہ آنہ سکے۔"

اللہ جو کرتا ہے اچھے کے لیے ہی کرتا ہے۔ عالم صاحب نے جو بھی فتویٰ دیا ہو گا وہ بڑے میاں کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اب ہمارے خلاف کوئی یہ بات نہیں چھیڑے گا۔"

رخسانہ دیوار کو تکتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ "کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے وقت پر سمجھ میں نہیں آتیں۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو عقل آتی ہے۔ بیشک مستری چاچا اب اس دنیا میں نہیں رہے اور یہ بھی اطمینان ہے کہ جانی کو شادی کے جائز ہونے یا ناجائز ہونے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں پھر بھی میں روتی رہتی ہوں۔"

"بیٹی' اب تو رونا ختم ہو چکا ہے۔ کوئی تمہیں نہیں رلائے گا۔"

"نہیں جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں تو ضمیر کی زبان کھل جاتی ہے' مجھے میرا ضمیر ستائے گا۔ میرے اندر جو ایک بے چینی ہو گی میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکوں گی' آپ صرف اتنا سمجھ لیں کہ مستری چاچا حادثے کا شکار ہو کر مر سکتے ہیں مگر ضمیر کو کوئی حادثہ نہیں مار سکتا۔"

دوسرے دن گیارہ بجے جانی واپس آیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے سرخ ہو رہی تھیں۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اب تک اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے آتے ہی تصدیق کر دی کہ مستری چاچا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں' ان کے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ ان سے محبت کرنے والوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ شہر کے کتنے ہی ڈرائیور اور گیرج والے ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے تھے۔

جانی جب تک جاگتا رہا مستری چاچا کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ اسے ان کی بے وقت موت کا بہت صدمہ تھا پھر رخسانہ نے اس کے سر کو آہستہ آہستہ سہلا کر اسے سلا دیا۔

اس کی امی صبح ناظم آباد چلی گئی تھیں۔ دوپہر کو آئیں تو خوش نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی ایک نیلا لفافہ رخسانہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹی اللہ تم پر بڑا مہربان ہے۔ ایک تو مستری چاچا راستے سے ہٹ گئے دوسرے یہ خط لندن سے آیا ہے۔"

رخسانہ نے اس لفافے کو لے کر دیکھا۔ اس کے اوپر کی تحریر پڑھی پھر اس نے پوچھا۔ "یہ تو جمشید نے لکھا ہے۔ آپ کو کیسے ملا؟ اس میں ہمارے گھر کا پتا نہیں ہے۔"

"یہ فرزانہ کے پاس آیا تھا۔ تم دونوں کی کوئی سہیلی ہے اس نے یہ خط فرزانہ کو دیا۔ فرزانہ کی امی اسے لے کر ناظم آباد آئی تھیں۔ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے؟ اگر ہماری کوئی پرائیوٹ بات ہو گی تو ہم انہیں کیوں بتائیں۔ ذرا اسے کھول کر پڑھو تو سہی۔"

رخسانہ نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا اور پڑھنے لگی۔

رخسانہ! میں بہت دیر سے یہ کاغذ سامنے رکھ کر سوچ رہا ہوں کہ تمہیں کس انداز سے مخاطب کروں۔ میرے دل میں تمہارے لیے جو محبت کے جذبات ہیں وہ مجھے اکسا رہے ہیں کہ کوئی محبت بھرا انداز تخاطب ہو پھر ڈرتا ہوں کہ تمہیں برا نہ لگے۔ ایک بار مذاق ہی مذاق میں' میں نے تمہارا چہرہ بگاڑ دیا۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ یہ بات میں کبھی نہیں بھولتا۔

تم اور فرزانہ ایسی ریزرو رہنے والی لڑکیاں تھیں کہ کالج میں کوئی بھی منچلا نوجوان تم دونوں کو چھیڑنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ میں نے چپ چاپ خطوں کے ذریعے چھیڑنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اب میں تمہارے کسی کام آکر تمہارا دل جیت لینا چاہتا ہوں تمہارا جو نقصان کیا ہے اس کی تلافی کر کے تم سے معافی مانگ کر تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم پرائی نہ ہو گئی ہو۔ کہیں تمہارے والدین نے تمہاری شادی نہ کر دی ہو اگر تمہیں ایک اچھا جیون ساتھی مل چکا ہے تو میرے اس خط سے ظاہر ہونے والی بے تکلفی کو معاف کر دینا اگر اب تک بن بیاہی ہو تو تمہاری تمنا کرتا رہوں گا۔

دیکھو میں کام کی بات چھوڑ کر فضول باتیں کیے جا رہا ہوں۔ اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ یہاں لندن میں ڈاکٹر بننے کے لیے آیا تھا۔ تمہاری خاطر پلاسٹک سرجری کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہتا تھا لیکن میرا سارا خاندان کاروباری ذہنیت رکھنے والا ہے۔ میرے والد مجھے پہلے بھی ڈاکٹر نہیں بنانا چاہتے تھے وہ مجھے ایک بہت بڑے کاروباری کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں آ کر میں نے کاروبار شروع کر دیا اس کے باوجود تمہاری صورت ہر دم نگاہوں کے سامنے رہتی ہے۔ میں نے ایک بہت بڑے پلاسٹک سرجری کے ماہر سے رابطہ قائم کیا ہے۔ اس سے باتیں کی ہیں۔ معاملات طے کیے ہیں اب تم کسی وقت بھی یہاں آ جاؤ تو تمہارے چہرے کی سرجری ہو جائے گی۔ تمہارا خوبصورت چہرہ تمہیں واپس مل جائے گا۔

اگر تم برا نہ مانو تو میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ تمہارے لندن تک آنے اور واپس جانے' یہاں رہنے اور علاج کرانے کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔ اس سلسلے میں تمہاری خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچنا چاہئے کیونکہ میں تمہارا علاج کرانے کا حق رکھتا ہوں جو غلطی میں نے کی ہے اس کی تلافی کا موقع مجھے ملنا چاہئے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں اپنے والدین کو یا پھر شادی ہو چکی ہے تو اپنے مجازی خدا کو راضی کر لو۔ ان سے میرا غائبانہ تعارف کراؤ۔ میرے خلوص کا انہیں یقین دلاؤ۔ میرا پتا لکھا ہوا ہے۔ یہ خط پڑھتے ہی اپنے مکمل حالات سے آگاہ کرو اور لکھو کہ کب آ رہی ہو۔ میں تمہارے متعلق بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوں۔ امید ہے خط پڑھتے ہی جواب لکھنے بیٹھ جاؤ گی۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔

فقط

"تمہارا مجرم جمشید علی!"

اس کی امی نے پوچھا۔ "بیٹی کیا لکھا ہے؟ چہرہ ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

رخسانہ خوشی سے کھل رہی تھی۔ وہ خط اپنی ماں کی طرف بڑھا کر خیالوں میں کھو گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ابھی اڑ کر لندن پہنچ جائے اور دوسرے دن صبح ہونے تک جانی کے سامنے مکمل چہرے کے ساتھ پہنچ جائے پھر اسے پتا چلے گا کہ اس کی بیوی کتنی حسین ہے۔

اس کی امی نے خط پڑھنے کے بعد آہستگی سے کہا۔ "بیٹی! تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا

کہ یہ لڑکا جمشید تمہیں اتنا چاہتا ہے اور تم سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا۔"

"جب میرا چہرہ بگڑ گیا تب پتا چلا کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ اس وقت بھی میں خوش فہمی میں مبتلا تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آدھے چہرے والی بن کر رہ جاؤں گی۔ اسی لیے میں نے جمشید کو کوئی لفٹ نہیں دی بعد میں حالات جیسے جیسے بگڑتے گئے اور رشتے لانے والے منہ پھیر کر جاتے رہے تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے خوامخواہ جمشید کو ٹھکرا دیا۔ مگر وہ تو لندن جا چکا تھا۔ اس کا پتا بھی میرے پاس نہیں تھا اس لیے میں رابطہ قائم نہ کر سکی اور یہ اچھا ہی ہوا امی' اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بھی اچھا شوہر دے دیا۔"

اس کی امی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہائے بیٹی! یہ کیا کہہ رہی ہو کہاں جمشید اور کہاں جانی۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ وہ اتنا بڑا مالدار لڑکا' اس کے خط سے پتا چلتا ہے کہ اس کا سارا خاندان پیسے والا ہے۔ وہ اتنا امیر کبیر ہے کہ تمہارے پورے اخراجات برداشت کرنا چاہتا ہے۔ یہاں سے لندن جانا' وہاں رہنا' وہاں کے اخراجات پھر واپس آنا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے' لاکھوں روپے خرچ ہو جائیں گے۔"

رخسانہ ان کی باتیں سن رہی تھی اور انہیں غصے سے دیکھ رہی تھی۔ جب بات ختم ہو گئی تو غصے سے بولی۔ "امی! جانی آپ کے ساتھ بد تمیزی کرتے ہیں تو کچھ برا نہیں کرتے جب آپ انہیں دوسروں سے کمتر سمجھتی ہیں تو وہ بھلا آپ کو برتر کیوں سمجھیں گے' آپ کو اتنا بھی خیال نہیں ہے کہ میرے سامنے میرے ہی شوہر کو دوسرے کے مقابلے میں کمتر کہہ رہی ہیں۔ اب میں آپ کو کیا کہوں۔ کہوں گی تو گستاخی ہو گی۔"

"لو بھلا سونے کو سونا اور پیتل کو پیتل کہا تو کیا غلط کہہ دیا؟ چلو تمہیں برا لگتا ہے تو نہیں کہوں گی۔ جانی لاکھوں میں ایک ہے وہی تمہیں لندن جانے اور علاج کرانے کے لیے لاکھوں روپے دے گا۔"

"آپ طعنے نہ دیں' ہم میاں بیوی محنت کریں گے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے جمع ہو جائیں گے تو میں یہاں سے تنہا جاؤں گی۔ آپ بچے کو سنبھالیں گی پلاسٹک سرجری کے بعد میں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

"بیٹی! کچھ عقل کے ناخن لو۔ ایک لڑکا وہاں لندن میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تمہارا مفت علاج کرانا چاہتا ہے۔ تمہارے کام آنا چاہتا ہے۔ تمہیں تو فوراً ہی یہاں سے جانے کی

تیاری کرنا چاہیے کیا تم اپنے چہرے کو مکمل نہیں کرنا چاہتیں؟"

"کیوں نہیں چاہتی۔ میرا دل چاہتا ہے ابھی' اسی وقت یہاں کھڑے کھڑے مکمل ہو جاؤں۔"

"میں دنیا دیکھ چکی ہوں اور ابھی تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ میری عقل سے کام لو۔ اپنا کام نکالنے کے لئے اپنا فائدہ حاصل کرنے کے لئے' اپنی بگڑی بنانے کے لیے اگر تھوڑا سا جھوٹ بول کر ایک ذرا سا دھوکا دے کر اپنا کام نکل سکتا ہے تو ضرور نکالنا چاہیے۔"

رخسانہ نے انہیں گہری اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"تم میری بات مانو تو یہ راز میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔ جانی کو اس کی خبر نہیں ہو گی۔ تم جمشید کو لکھ دو کہ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے اور تم علاج کے لئے وہاں پہنچنے والی ہو۔ بس پاسپورٹ وغیرہ بننے کی دیر ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا میں اپنے اور جانی کے رشتے سے انکار کر دوں؟"

"مصلحت یہی ہے۔ دیکھو وہ جو لندن میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تمہارے حالات سے واقف نہیں ہے' تمہیں کنواری' بن بیاہی سمجھ رہا ہے۔ اس نے اپنے دل و دماغ میں تمہارے متعلق جانے کیسی کیسی باتیں سوچ رکھی ہوں گی۔ کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے اگر تم اسے لکھ دو گی کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے اور تم ایک بچے کی ماں بن گئی ہو تو اس کے تمام خواب چکنا چور ہو جائیں گے۔ وہ جس جذبے سے تمہارے کام آنا چاہتا ہے وہ جذبہ سکڑ سمٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا پھر وہ تمہارے ایسے کام نہیں آئے گا جیسا کہ اب آنا چاہتا ہے۔"

"امی! آپ کی تقریر ختم ہو گئی ہو تو زبان بند کر لیں۔ ایک بار جھوٹ بول کر جانی کو دھوکا دے کر شادی کرائی تو اس کا نتیجہ میں اب تک بھگت رہی ہوں۔ آپ مجھے پھر وہی جھوٹ اور دھوکا سکھا رہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیسی کیسی باتیں سوچتی رہتی ہیں۔ خدا کے لیے اپنی زبان بند رکھیں اگر بولنے کا اتنا ہی شوق ہے تو گھر جا کر ابا سے بولتی رہیے۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک ان کا ہی حوصلہ ہے کہ آپ کی باتوں پر چلتے آ رہے ہیں۔"

"میں تو تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ دیکھ لینا لاکھ' ڈیڑھ لاکھ جمع کرتے کرتے تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔ باقی آدھے چہرے پر بھی جھریاں پڑ جائیں گی۔ تمہارا بچہ جوان ہو جائے گا۔ وہ اپنے دوستوں میں' اپنی سوسائٹی میں تمہیں اپنی ماں کہتے ہوئے ہچکچائے گا۔ اس وقت تمہیں میری باتیں سمجھ میں آئیں گی۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔

رخسانہ کمرے کے اندر آ کر بستر کی طرف دیکھنے لگی۔ جانی اپنے بیٹے کو ایک ہاتھ سے سمیٹے گہری نیند سو رہا تھا۔ باپ بیٹے کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرانے لگی۔ وہاں سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی وہاں آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی پٹیوں نے باقی آدھے چہرے کے عیب کو چھپا لیا تھا۔ اگر وہ پٹیاں نہ ہوتی تو چہرہ بہت ہی بھیانک لگتا۔ اس کے کانوں میں اپنی امی کی آواز گونجنے لگی۔ "جب تمہارا بیٹا جوان ہو گا تو اپنے دوستوں میں اور سوسائٹی میں تمہیں اپنی ماں کہتے ہوئے ہچکچائے گا۔ تم پیسے جمع کرتے کرتے بوڑھی ہو جاؤ گی مگر اپنے بگڑے ہوئے چہرے کو نہیں بنا سکو گی۔"

اس نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تاکہ ماں کی آواز سنائی نہ دے حالانکہ وہ اب بول نہیں رہی تھیں۔ رخسانہ نے اپنے کانوں سے ہاتھ ہٹا کر اپنے آدھے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔ آدھے چہرے کو آئینے سے بھی چھپا لیا مگر وہ ساری زندگی آدھے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اپنے عیب کو نہیں چھپا سکتی تھی۔ اس نے بہت ہی فکر مند ہو کر سوچا' اس سرجری کے سلسلے میں کیا اخراجات ہوں گے؟ جتنی بھی رقم لگے گی میں کتنے عرصے میں جمع کر سکوں گی؟

پھر اس کی امی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ "تم نادان ہو۔ وہاں تمہارے لیے لاکھوں روپے رکھے ہوئے ہیں۔ جمشید تمہارے کام آنا چاہتا ہے اور تم یہاں پیسے جمع کرنے کی فکر کر رہی ہو۔ بس ایک ذرا سا جھوٹ' ایک ذرا سا دھوکا پھر تمہارا چہرہ مکمل ہو جائے گا تم حسن کو جیت لو گی اور حسن کے ساتھ جانی کو بھی ہمیشہ کے لیے اپنا لو گی۔ یہ دھڑکا نہیں رہے گا کہ فرزانہ کبھی اسے چھین کر لے جائے گی۔ تمہارے سامنے فرزانہ بھی پھیکی پڑ جائے گی بشرطیکہ تم میٹھی بننے کی کوشش کرو اور اس کے لیے تھوڑا سا' تھوڑا سا..... تھوڑا سا دھوکا....."

وہ پریشان ہو کر آئینے کے پاس سے ہٹ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر

آئی پھر برآمدے سے گزرتے ہوئے اماں کے پاس آ کر زینے پر بیٹھ گئی۔ ان کے گھٹنوں کو تھام کر کہا۔ "امی! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں' مجھے جلد سے جلد پیسے جمع کرنے چاہئیں۔ آپ سچ کہتی ہیں۔ عمر گزرتی جائے گی تو بڑھاپے میں چہرے کی پلاسٹک سرجری کیا کراؤں گی؟ اس وقت آج جیسی تازگی نہیں رہے گی۔"

"تم تازگی کی بات کر رہی ہو۔ ایک مرد کی نظروں سے دیکھو۔ تم سے زیادہ فرزانہ میں تازگی نظر آئے گی اس لیے کہ وہ ابھی کنواری ہے۔ کمینی شادی بھی نہیں کرتی۔ کر لیتی تو ایک دو بچوں کی ماں بن جاتی تو سارا قصہ ختم ہو جاتا۔"

"میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ رقم جمع کرنے میں دو چار سال لگ جائیں گے۔ اس عرصے میں فرزانہ نے جانی کو اپنے پیچھے دوڑانا شروع کر دیا یا اس کی نیت خراب ہو گئی اور وہ جانی کو مجھ سے چھین لینے پر آمادہ ہو گئی' تب کیا ہوگا؟ میں تو آدھی ہوں' آدھی ہی رہ جاؤں گی۔ جب وہ مجھ سے چھن جائیں گے تو میں کس کے لیے چہرے کو مکمل کروں گی۔"

"یہی عقلمندی سے سوچنے کی بات ہے جو کام آج ہو سکتا ہے اسے کل پر نہیں ٹالنا چاہئے۔ میں نے جو تمہیں مشورہ دیا ہے۔ وہ ایک محبت کرنے والی ماں کا مشورہ ہے۔ کسی دشمن کا نہیں ہے۔ میں تو تمہارا گھر آباد کرنے کے لئے' تمہارے شوہر کو مضبوطی سے باندھ کر رکھنے کے لئے جھوٹ بولنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ کسی کو ذرا چھپ کر دھوکا دے دو گی تو ادھر جانی کو پتا نہیں چلے گا ادھر وہ جمشید علی خوش فہمی میں مبتلا رہے گا۔"

"میں اسے کب تک خوش فہمی میں مبتلا رکھ سکتی ہوں؟"

"جب تک وہ رہے۔ تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہاری شادی ہوئی ہے۔ تم اسے خط میں لکھ دو کہ جلد سے جلد آنا چاہتی ہو۔ پاسپورٹ وغیرہ بننے کی دیر ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ تم سے تمہارے حالات زندگی نہ پوچھے اور نہ ہی تمہارے ماضی کے متعلق کچھ کریدنے کی کوشش کرے۔ تم اس کے پاس پراسرار بن کر رہنا جو لڑکیاں ریزرو رہتی ہیں۔ اپنے ماضی کو دوسروں سے چھپا کر رکھتی ہیں اپنے گھریلو حالات بھی کسی پر ظاہر نہیں کرتیں اور اپنے ذاتی معاملات کی ہوا بھی کسی کو لگنے نہیں دیتیں وہ لڑکیاں ایک دلچسپ راز بن کر رہتی ہیں اور مرد ایسی لڑکی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے رہتے ہیں اور بڑی دلچسپی سے ان کے حالات معلوم کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔"

"میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ صرف جانی میری ذات سے دلچسپی لیتے رہیں۔ جمشید یا کوئی اور مجھ میں دلچسپی لے تو یہ میرے لیے کوئی فخر کی بات نہیں بلکہ شرم کی بات ہے۔"

"تم پھر جذباتی بن کر سوچ رہی ہو۔ میں کب کہتی ہوں کہ کوئی دوسرا تم میں دلچسپی لے۔ کیا میں تمہیں کسی غلط راستے پر لگا رہی ہوں۔ کیا میں یہ کہتی ہوں کہ تم جانی کو چھوڑ کر جمشید سے شادی کر لو؟"

"آپ جانی سے ہٹا کر جمشید کے راستے پر چلانا چاہتی ہیں۔"

"صرف چند دنوں کے لیے' چند مہینوں کے لیے' جب تک تمہارے چہرے کی سرجری ہو جائے گی۔ تمہارا چہرہ تمہیں واپس مل جائے گا تو تم واپس چلی آنا۔ میں تمہیں جانی سے نہیں چھڑا رہی ہوں یہ تو معاملہ فہمی کی بات ہے۔ مصلحت اندیشی بھی کوئی چیز ہوتی ہے تم میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ پہلے جانی سے بات کرو لیکن اس سے خط کا ذکر نہ کرو۔ ہم اس سے کہیں گے کہ تمہارے رشتے کے چچا نے تمہارے چہرے کی سرجری کرانے کی پیش کش کی ہے جانی سے معلوم کرو کہ وہ تمہارے لندن جانے' آنے اور علاج کے اخراجات کس حد تک برداشت کر سکتا ہے' ادھر تم میرے مشورے پر غور کرتی رہنا۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد چونک کر بولی۔ "یہ خط فرزانہ کی امی آپ کے پاس لے کر آئی تھیں۔"

"ہاں' وہ کہہ رہی تھیں کہ تم دونوں کی کوئی سہیلی ہے جو جمشید کی کزن لگتی ہے اس کے پاس یہ خط آیا تھا۔ فرزانہ وہیں سے یہ لفافہ لے کر آئی ہے۔"

"امی' فرزانہ نے جمشید کی کزن کو ضرور بتایا ہوگا کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میں ایک بچے کی ماں بن چکی ہوں۔"

اس کی امی نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایسا ہو سکتا ہے میں ابھی جاتی ہوں اور معلوم کرتی ہوں اگر ان لوگوں نے نہیں بتایا ہے تو میں انہیں سختی سے منع کر دوں گی کہ ہمارے معاملات دوسروں کو نہ بتائیں نہ ہی ہمارے سلسلے میں کسی سے ذکر کریں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ فرزانہ کے گھر چلی گئیں۔ رخسانہ کمرے میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ

گئی۔ شام کو جانی کی آنکھ کھلی تو وہ کھلی آنکھوں سے چھت کو تکتا رہا اور فرزانہ کے متعلق سوچتا رہا۔ اسی کو یاد کرتے کرتے آنکھ لگتی تھی اور اسی کے خیال سے آنکھ کھلتی تھی۔ دیوانگی تھی کہ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں کہنا چاہئے کہ فرزانہ بھی اس کی دیوانگی کو ہوا دے رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر پھولوں کی تر و تازہ پتیاں بکھیر کر پیغام دیا تھا کہ میں تمہاری محبت میں ابھی تک تازہ دم ہوں۔ مجھے کہیں سے ڈھونڈ نکالو۔ ہوش مندی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ اپنے بالوں کو نوچ کر کپڑے پھاڑتے ہوئے چیختے چلاتے اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ ہائے فرزانہ ہائے فرزانہ۔

ادھر وہ بستر پر پڑا آنکھیں کھولے سوچ رہا تھا۔ ادھر رخسانہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی۔ نہ اس کو پتا چلا کہ وہ بیدار ہو چکا ہے اور نہ اس بیدار ہونے والے کو دنیا کی خبر تھی دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے انسان واقعی پورا پورا ایماندار نہیں ہوتا۔ یہ انسانوں کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔

وہ دونوں' محبت کرنے والا دل رکھتے تھے۔ رخسانہ جانی کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ کبھی آزمائش کی گھڑی میں اس کے لئے جان بھی قربان کر سکتی تھی یہی بات جانی پر صادق آتی تھی۔ وہ رخسانہ اور بچے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانیاں دے سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ رخسانہ سے چھپ کر فرزانہ کے متعلق سوچتا تھا اور اب رخسانہ جانی سے چھپ کر جمشید کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ جانی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے لیے نہیں صرف اپنی بگڑی بنانے کے لئے ذرا سے دھوکے کی بات سوچ رہی تھی ادھر جانی بھی رخسانہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا مگر اپنے عشق کے جنون کو سرد کرنے کے لئے فرزانہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ دونوں ایماندار تھے اور دونوں بے ایمان تھے۔

اچانک ہی بچہ رونے لگا۔ زنجیر کی دو کڑیاں ایک دوسرے سے دور رہنے کے باوجود بیچ کی ایک کڑی سے منسلک رہتی ہیں۔ بیچ کی کڑی ہلتی ہے تو پوری زنجیر ہلنے لگتی ہے وہ دونوں ہی چونک گئے۔ جانی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رخسانہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر جانی کو دیکھ کر بولی۔ "ارے آپ جاگ رہے ہیں۔"

جانی نے بھی حیرانی سے پوچھا۔ "اچھا تم کمرے ہی میں موجود تھیں۔"

وہ بچے کو اٹھا کر بہلانے لگی۔ جانی نے کہا۔ "ہم پاس پاس تھے مگر ایک دوسرے

کو دیکھ نہیں سکے۔ میں تو سوچ میں گم تھا۔ تم کیا سوچ رہی تھیں؟"

"ایں؟" وہ بچے کو سنبھالنے کی مصروفیت کا بہانہ کرتے ہوئے اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی پھر پلٹ کر سوال کیا۔ "یہی میں پوچھتی ہوں تم کس کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے؟"

اس بار وہ گڑبڑا گیا پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ "میں بے چارے مستری چاچا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ان کی بیوی بہت رو رہی تھی۔ کل دن کے وقت جب وہ گھر سے نکلے تو ان کی بیگم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں میدان جنگ ایسی جگہ ہے جہاں سب سے زیادہ موتیں ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کراچی کی سڑکوں پر سب سے زیادہ موت کی چہل پہل ہوتی ہے۔ اس شہر کی کوئی عورت یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس کا مرد جو صبح جا رہا ہے وہ شام کو لوٹ آئے گا۔"

رخسانہ نے جلدی سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ "جانی' ایسا مت کہو' مجھے ڈر لگتا ہے۔ خدا تمہیں ہمارے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے تم سے پہلے میری آنکھیں بند ہوں۔ چلو اب منہ ہاتھ دھو لو۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ میں چائے تیار کرتی ہوں۔"

"یہ کوئی کھانے کا وقت نہیں ہے۔ رات کو میں چنا جور لے کر آیا تھا۔ وہ گاڑی میں رکھا ہوا ہے۔ بس وہ کھا کر چائے پی لوں گا۔"

"تو پھر بچے کو سنبھالو۔ میں چائے تیار کرتی ہوں۔"

اس وقت مغرب کی اذان ہونے لگی۔ جانی نے مسکرا کر کہا۔ "اب چائے کیسے بناؤ گی تمہیں تو نماز پڑھنا ہے۔"

"تھوڑی دیر صبر کر لو۔ مغرب کی نماز بہت مختصر ہوتی ہے۔"

"ضرور صبر کروں گا۔ تم نماز پڑھنے لگی ہو۔ یہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے میں ابھی تمہیں انعام دوں گا۔ چلو اٹھو۔"

وہ بچے کو لے کر اٹھ گیا۔ رخسانہ بھی مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ باورچی خانے کی طرف چلتے ہوئے بولی۔ "کیا انعام دو گے؟"

"آج میں تمہارے لیے چائے تیار کروں گا۔ جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ گی تو تمہارے سامنے چنا جور اور چائے حاضر ہو گی۔"

وہ خوشی سے کھل گئی۔ جانی کے بازو کو تھام کر باورچی خانے تک آئی پھر ایک جگ میں پانی لے کر باورچی خانے کی موری کے پاس وضو کرنے بیٹھ گئی۔ وضو کے دوران وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کس قدر محبت کرنے والا شوہر ملا ہے وہ ابھی آدھی ہے تو اتنی محبت مل رہی ہے جب پوری ہو جائے گی تو جانی اس کا دیوانہ بن کر رہے گا۔

اپنے آپ کو مکمل کرنے کا خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی جمشید کا خیال آیا اس کے اندر ایک بے چینی پیدا ہو گئی۔ وہ ہرگز ہرگز جانی کو دھوکا دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر حالات مجبور کر رہے تھے اور حالات سے زیادہ اس کی امی، مجبور کر رہی تھیں اسے مصلحت اندیشی سکھا رہی تھیں اسے یہ اہم نکتہ سمجھا رہی تھیں کہ پلاسٹک سرجری جیسا مہنگا علاج صرف جمشید ہی کرا سکتا ہے اور جمشید سے اپنا کام نکالنے کے لئے جانی سے کچھ عرصے تک کچھ باتیں چھپانی ہوں گی۔ بات چھپانے کا مطلب یہ تو نہیں ہو تا کہ شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیا جا رہا ہے دھوکا اس وقت ہو تا ہے جب عورت مرد سے سچی محبت نہ کرے، اس کی وفادار نہ رہے۔ وہ تو وفادار بھی تھی اور اس کے سوا کسی اور کو دل میں جگہ نہیں دے سکتی تھی پھر ذرا سی بات چھپا لینے میں حرج کیا تھا؟

وضو کس طرح ہوا اسے پتا ہی نہ چلا وہ خیالوں میں گم ہو کر کمرے کے اندر آئی پھر جاء نماز بچھا کر نماز کے لیے باادب کھڑی ہو گئی' انسان اپنے ماحول کا اسیر ہو تا ہے جس ماحول میں نماز پڑھتا ہے۔ اسی کے مطابق باتیں سوچتا ہے' اگر وہ عربی زبان جانتا ہے۔ آیتوں کے ترجمے کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور یاد رکھتا ہے تو نماز پڑھنے کے دوران اس کا دھیان پوری طرح عبادت کی طرف ہو تا ہے جب وہ کہتا ہے ایاک نعبدو ایاک نستعین یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ اور پھر کہتا ہے اھدنا الصراط المستقیم۔ ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ تو یہ باتیں سمجھ کر بولی جاتی ہیں لہٰذا ان پر عمل کرنے کی بھی توفیق حاصل ہوتی ہے لیکن رخسانہ پڑھ رہی تھی۔ سمجھ نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے کہہ رہی تھی۔ "اے معبود' سیدھے راستے پر چلا" اور اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ جانی کی طرف جاتا تھا دوسرا جمشید کی طرف۔ ایک سیدھا راستہ تھا اور ایک ٹیڑھا اور اللہ سے دعا مانگنے اور التجا کرنے کے باوجود وہ سیدھا راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کیوں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا؟ اس لیے کہ جب اپنی بات اچھی لگتی ہے' اپنی خواہش سب سے زیادہ اہم لگتی ہے تو اس اہمیت کے آگے تمام سیدھے راستے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق آسمانی ہدایات بھی بے معنی اور غیر ضروری لگتی ہیں۔ یہ ہماری نفسیات بن گئی ہے کہ ہم خدا سے پہلے اپنی ضرورت پوری کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد سیدھے رستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ پہلے وہ جمشید سے اپنی بگڑی بنانا چاہتی تھی پھر واپس آ کر جانی کے ساتھ سیدھے راستے پر چلنا چاہتی تھی۔

نماز کس طرح ادا ہوئی یہ پتا نہ چلا۔ وہ پاکستان اور لندن کے درمیان اٹکی ہوئی تھی۔ آخر میں دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو گڑگڑا کر دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے شرط پیش کی۔ خدایا میری اور جانی کی محنتوں کے ذریعے میرے چہرے کی سرجری ہو جائے تو تیرا بڑا کرم ہو گا اگر ایسا نہ ہوا تو میں بھٹک رہی ہوں۔ میرے آگے اور کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ مجھے مجبوراً جمشید کا سہارا لینا ہو گا اور جمشید کا سہارا جانی برداشت نہیں کریں گے اس لیے جانی سے یہ بات چھپانی ہو گی۔ کبھی کبھی مجھے امی کی بات درست لگتی ہے۔ اگرچہ ان باتوں کے پیچھے کھوٹ ہو تا ہے مگر بگڑی بن جاتی ہے۔ جانی کو دھوکا دے کر میں ان کی شریک حیات بن گئی۔ کچھ نقصان اٹھا رہی ہوں اس کے باوجود مجھے ایک اچھی ازدواجی زندگی نصیب ہوئی ہے۔ دوسری بار پھر ایسا ہی راستہ دکھا رہی ہیں اور میں جانتی ہوں' اس بار بھی میری بگڑی بن جائے گی۔ تجھ سے اتنی التجا کرتی ہوں کہ میں جمشید کی پیش کش کو قبول کروں تو جانی پر یہ بھید نہ کھلے۔ میں عہد کرتی ہوں کہ جانی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گی۔ کبھی جمشید کو اتنا موقع نہیں دوں گی کہ وہ میری انگلی بھی پکڑ سکے۔ تو جانتا ہے میں شرم والی ہوں اور تو بھی تو اپنے بندوں کی شرم رکھنے والا ہے۔"

دعا مانگنے کے دوران اسے اپنے پیچھے جانی کی آواز سنائی دی۔ "بھئی تم نے تو کہا تھا کہ مغرب کی نماز مختصر ہوتی ہے۔ یہاں چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ آ بھی جاؤ۔"

اس نے منہ پھیر کا جاء نماز کو ایک طرف تھوڑا سا الٹ دیا پھر مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ میز پر چنا جور کی پلیٹ اور چائے کی دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے تو کمال کر دیا۔ مجھے شرمندہ بھی کیا۔ آج پہلی بار میرے لیے چائے بنائی ہے۔"

"یہ بتاؤ دنا کیا مانگ رہی تھیں؟"

اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا "اپنے چہرے کو مکمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے آگے گڑگڑا رہی تھی کہ عزت و آبرو سے چہرہ واپس مل جائے۔"

"یہ عزت و آبرو والی بات سمجھ میں نہیں آئی ابھی ہم پیسے جمع کریں گے اور ڈاکٹرز کو اس کی فیس دیں گے وہ چہرہ بنائے گا۔ بے عزتی تو نہیں کرے گا۔"

"اپنے پیسوں سے چہرہ بن جائے تو اچھی بات ہے ورنہ کسی کی امداد حاصل کرنی پڑے تو عزت ہلکی ہو گی۔"

وہ بولا۔ "بھلا ہم کیوں کسی کی امداد حاصل کریں گے؟ میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔ تم بھی ماشاء اللہ ذہین ہو۔ لیڈی ڈاکٹر ہو۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر پیسے جمع کرنے میں کتنے ہی سال گزر جائیں گے۔ ابھی ای کہہ رہی تھیں کہ ہمارے رشتے کے ایک چچا لندن میں رہتے ہیں۔ انہوں نے کسی سے کہلا بھیجا ہے کہ وہ پلاسٹک سرجری کرا سکتے ہیں بشرطیکہ میں لندن پہنچ جاؤں وہ آنے جانے کے بھی اخراجات برداشت کرنا چاہتے ہیں۔"

جانی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ نہیں' یہ کچھ اچھا نہیں لگتا جب میں کماتا ہوں تو میری بیوی کو کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہونا چاہئے۔ تم ذرا حساب لگا کر دیکھو بینک میں تمہاری رقم کتنی ہے۔ ہماری دو ٹیکسیاں ہیں ایک کو بیچ کر رقم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے بھی پورا نہ پڑے تو میں کچھ زیادہ ہی ٹیکسی چلالیا کروں گا۔ تم اپنی ڈاکٹری شروع کر دو' ویسے یہ چہرہ بنانے کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"میرے اندازے کے مطابق یہاں سے لندن جانے' وہاں رہنے' علاج کرانے اور پھر وہاں سے واپس آنے میں کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔"

"ڈیڑھ لاکھ روپے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے سوچتے ہوئے بچے کو بستر پر لٹا دیا پھر میز کے پاس آ کر چنا جور پھانکتے ہوئے بولا۔ "ہماری دونوں گاڑیاں بہت چل چکی ہیں۔ ان میں سے ایک چالیس ہزار تک بک جائے گی۔ تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟"

"بینک میں شاید سات ہزار پڑے ہوں گے۔"

"تو اگلے ایک مہینے تک تین ہزار اور ہو جائیں گے یعنی ایک مہینے میں ہمارے پاس

پچاس ہزار روپے نقد ہوں گے۔ میں ہر ماہ تمہیں تین ہزار روپے لا کر دیتا ہوں تم دو ہزار روپے بچاتی ہو اگر ڈسپنسری کھول لی تو تمہاری آمدنی سے گھر چلے گا اور پورے تین ہزار روپے ہر ماہ بچا کریں گے۔"

"یوں سوچنا آسان ہے مگر یہ بھی سوچو کہ ڈسپنسری کی چار دیواری تعمیر کرنے' دوائیں لانے فرنیچر بنوانے اور دوسرے اخراجات ایسے ہیں کہ کم سے کم پچیس ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے پھر ڈسپنسری میں ہماری توقع کے مطابق مریض آیا کریں گے یا نہیں یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا اور جو پچیس ہزار روپے ہم خرچ کر چکے ہوں گے انہیں واپس کمانے کے لئے پھر سال بھر لگ جائے گا یعنی ایک سال کے بعد ہمارے پاس پچاس ہزار روپے جمع ہوں گے باقی ایک لاکھ روپے کا کیا ہو گا؟"

"ہم دونوں محنت کرتے رہیں گے تو انشاء اللہ چار یا پانچ سال کے عرصے میں ایک لاکھ روپے جمع ہو جائیں گے۔"

"جانی سوچنا بہت آسان ہے مگر اتنی بڑی رقم جمع کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ہمارا بچہ بڑا ہوتا جائے گا۔ اس کے اخراجات بھی بڑھتے جائیں گے پھر دکھ بیماریاں ہیں انجانے حادثات ہیں۔ جمع ہونے والے پیسے کس طرح خرچ ہونے لگتے ہیں۔ یہ خرچ ہونے کے دوران سمجھ میں نہیں آتا' جمع پونجی ختم ہو جاتی ہے۔ تب سوچتے ہیں کہ پونجی کہاں گئی اور ہمیں اس کا حساب نہیں ملتا۔"

وہ چائے پیتے ہوئے اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا پھر پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تعجب ہے تم خود کہا کرتی تھیں کہ ہم چار پانچ سال میں اچھی خاصی رقم جمع کر لیں گے۔ اب خود ہی مایوس ہو رہی ہو۔ چلو' پانچ سال میں نہ سہی' دس سال میں تو جمع کر لیں گے۔"

"کیا کہتے ہو جانی! دس سال میں میری عمر کیا ہو گی۔ دس سال میں ہمارا بچہ اتنا بڑا ہو گا کہ وہ اپنے دوستوں میں اپنے اسکول میں فخر سے میرا ذکر نہیں کر سکے گا۔ وہ مجھے چھپانے کی کوشش کرے گا۔ جیسے ابھی میں تمہارے ساتھ کہیں نکلتی ہوں تو اپنا چہرہ چھپا کر نکلتی ہوں۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میں دوسری عورتوں کی طرح دنیا والوں کے سامنے تمہارے ساتھ فخر سے چلوں؟"

وہ مسکرا کر بولا۔ "برقع پہننے والیاں اپنا چہرہ چھپا کر اپنے مرد کے ساتھ چلتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہیں۔ وہ بھی تو عورتیں ہوتی ہیں۔"

وہ لاجواب سی ہو کر اس کا منہ تکنے لگی پھر بولی۔ "میں برقع پہننے والی عورت نہیں ہوں میرا کیا ہو گا؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اس کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں نے کبھی یہ حساب نہیں کیا کہ تمہارا چہرہ کہاں سے بگڑا ہے اور کیوں بگڑا ہے اور اگر بگڑا ہے تو یہ بنا کیوں نہیں ہے۔ میں نے کبھی ضد نہیں کہ اس چہرے کو مکمل ہونا چاہئے۔ کیا اس سے تم نے اندازہ نہیں لگایا کہ میں تمہاری صورت سے نہیں تمہاری سیرت سے پیار کرتا ہوں۔"

"میں تمہاری بات نہیں کرتی زمانے کی بات کرتی ہوں۔ میں زمانے کو منہ نہیں دکھا سکتی۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ بات صورت دکھانے کی نہیں۔ دنیا کو منہ دکھانے کی ہے۔"

"اگر نہیں دکھا سکتیں تو برقع پہننا شروع کر دو۔ منہ چھپ جائے گا۔ بات ختم ہو جائے گی۔"

"بات اس طرح کبھی ختم نہیں ہو گی میں بغیر چہرے کے نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی بتا دو جو اپنی شکل و صورت کے بغیر رہ سکتی ہو خواہ وہ انسان ہو یا حیوان یا کوئی بے جان چیز ہو۔ یہ پلیٹ ہے' یہ پیالی ہے' یہ میز ہے' یہ بستر ہے' یہ الماری ہے' یہ دیواریں اور یہ دروازے ہیں ہر ایک کی ایک صورت ہے بغیر صورت کے' بغیر شکل کے کوئی چیز پہچانی نہیں جاتی۔ بغیر صورت شکل کے کسی چیز کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ اتنی بڑی دنیا میں اگر کوئی بے چہرہ اور بے تصور ہے تو وہ خدا کی ذات ہے وہ نامعلوم ہو کر بے چہرہ ہو کر بھی بے نام نہیں رہتا اس کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بے چہرہ ہو تو وہ بے نام بھی ہوتا ہے اور ناقابل شناخت بھی۔ یہ قدرتی نظام ہے اور فطری تقاضا ہے۔ اس لیے میں بھی تقاضا کرتی ہوں کہ میرا ایک مکمل چہرہ ہونا چاہئے اور ضرور ہونا چاہئے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہاں سے پلٹ کر کھونٹی کے پاس گیا پھر ٹنگے ہوئے کپڑوں کو اتار کر لباس تبدیل کرنے لگا۔ رخسانہ نے پوچھا۔ "کیا تم باہر جا رہے ہو؟"

"ہاں' سارا دن یونہی ضائع ہو گیا۔ کچھ کمائی کی فکر بھی کرنی ہو گی۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"تم نے اپنی باتوں سے خود ہی جواب دے دیا۔ تم ہر حال میں اپنا چہرہ کمل کرنا چاہتی ہو۔ شاید اپنے کسی چچا کی امداد قبول کرنا چاہتی ہو۔ اب تم سے کیا کہوں۔ میں تمہیں اپنے سے زیادہ سمجھدار سمجھتا ہوں پھر بھی اتنا سمجھانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی کرو اس سے میری غیرت کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اس کے بعد تمہیں ہر طرح کی آزادی ہے۔"

○☆○

جاری

زندگی کے نشیب و فراز کا آئینہ، انسانوں کے ظاہر و باطن کی عکاسی
آدھا چہرہ
الدین نواب

بہترین معاشرتی ناول

معاشرے کے جراح محی الدین نواب کے نشتر قلم سے ایک نوکیلی، کٹیلی آب دار کہانی

(حصہ دوم)

محی الدین نواب

یوں تو وہ کبھی تفریح کے لیے باہر نہیں نکلتی تھی لیکن کبھی کبھی ضرورت' باہر قدم نکالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسان اپنی ضرورتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی امی سے کہا۔ "اس برقعے کو بدل دیجئے۔ اب میں کالے رنگ کا برقع پہن کر جاؤں گی۔"

اس کی امی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں بیٹا' بادامی برقعے میں وہ ہم دونوں کو ہی دیکھ چکا ہے۔ رنگ بدل لینا دانشمندی ہے مگر یہ تبدیلیاں آخر کب تک ہوتی رہیں گی۔ جالی کی وجہ سے ہم نے ناظم آباد والا مکان بدل دیا۔ اس کی وجہ سے تم فرزانہ واسطی کے بجائے نفے واسطی بن گئیں۔ اس کے ڈر سے برقع بدل رہی ہو۔ تم خود کتنی بدلتی جا رہی ہو۔ پہلے شوخ اور چنچل تھیں۔ اب بوڑھوں جیسی سنجیدگی اختیار کر لی ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "سوچتی ہوں ملک بھی بدل جائے۔ یہ شہر' یہ ملک چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلی جاؤں۔"

پہلے تو اس کی امی نے اسے چونک کر دیکھا کچھ سوچا' پھر کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے جگہ بدلے گی تو تمہارا من مزاج بھی بدلے گا۔ سنا ہے باہر ڈاکٹروں کی اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے ابھی ابھی میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"کیوں نہ تم جمشید سے خط و کتابت کرو اسے لکھو کہ وہ لندن کے کسی اسپتال میں تمہارے لیے ملازمت کا بندوبست کرے۔"

"آپ کی تجویز مناسب ہے۔ ملک سے باہر ملازمت حاصل کرنے کے لیے کسی نہ

کسی کو ذریعہ بنانا پڑے گا لیکن جمشید کا پتا ہمارے پاس نہیں ہے۔"

اس لفافے پر جمشید کا پتا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے عقل نہیں آئی کہ وہ پتا نوٹ کر لیتی اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے میں رخسانہ کی امی سے مل کر کسی نہ کسی طرح اس کا پتا حاصل کر لوں گی۔"

فرزانہ نے کہا۔ "رخسانہ یا اس کی امی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شہلا سوسائٹی میں رہتی ہے۔ میں اس کے پاس جا کر جمشید کا پتا لے آؤں گی۔"

"اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی کسی وقت شہلا کے پاس چلی جاؤ میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ملک چھوڑنے کے بعد تم اپنے متعلق سنجیدگی سے غور کرو گی۔ تمہارے دل سے جانی کا ڈر نکل جائے گا۔ میں کسی اچھے لڑکے سے تمہاری شادی کر دوں گی۔"

"امی شادی کی بات نہ کریں۔ میں ملک چھوڑ کر اس لیے جا رہی ہوں کہ جانی مجھے کبھی نہ پا سکے اور رخسانہ کے لیے جو میں نے قربانی دی ہے وہ ادھوری نہ رہے۔"

"ٹھیک ہے مگر شادی تو کرنی ہوگی۔ ساری زندگی یونہی تو نہیں گزار دو گی۔"

"شادی خوشی کو کہتے ہیں۔ جب دل میں کوئی خوشی نہ ہو تو شادی کیسی؟"

"اگر کوئی خوشی دل میں پیدا ہو گئی تو؟"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اگر ہوا تو میں آپ کی آرزو پوری کر دوں گی۔"

○☆○

دوسرے دن رخسانہ کی امی ڈسپنسری میں داخل ہوئیں۔ کپاؤنڈر نے انہیں دیکھ کر کہا۔ "بی بی جی' مریضوں کے دیکھنے کا ٹائم ختم ہو چکا ہے۔ آپ شام کو آئیں۔ ڈاکٹر صاحبہ آرام کر رہی ہیں۔"

انہوں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اے تمہاری آنکھیں نہیں ہیں۔ میں کوئی مریضہ لگتی ہوں؟ کیا خاک کپاؤنڈری کرتے ہو؟"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے مکان کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئیں۔ وہاں فرزانہ اپنی امی کے ساتھ کھانے میں مصروف تھی۔ انہیں دیکھتے ہی دونوں ماں بیٹی اٹھ گئیں۔ رخسانہ کی امی نے کہا۔ "بیٹھو بہن' بیٹھو بیٹی' میں ادھر سے گزر رہی تھی سوچا خیریت

پوچھتی چلوں۔"

فرزانہ نے کہا۔ "خالہ جان ہم تو خیریت سے ہیں۔ آپ کی خیریت نظر نہیں آتی۔ اصل بات بتا دیجئے؟"

"اے بیٹی! تم تو اپنے دماغ سے ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سمجھ لیتی ہو۔ میرے دل میں تم لوگوں کے لئے کوئی محبت' کوئی جذبہ نہیں ہے کیا؟"

فرزانہ کی امی نے کہا۔ "بہن یقیناً آپ کے دل میں جذبہ ہے۔ آیئے کھانا کھائیے۔"

"میں ابھی کھا کر آ رہی ہوں۔ بس ایک گلاس پانی پیوں گی۔"

انہوں نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر پینا شروع کیا۔ گلاس جیسے ایک ہی سانس میں خالی ہونے لگا۔ جب وہ گلاس کو میز پر رکھنے لگیں تو فرزانہ نے کہا۔ "ہاں' تو شروع ہو جایئے۔"

انہوں نے ذرا ناراضگی سے اسے دیکھا پھر جلدی سے مسکرا کر بولیں۔ "بیٹی وہ جو جمشید کا خط آیا ہے۔ وہ تم کسی سہیلی کے پاس سے لے کر آئی ہو؟"

جمشید کی ایک کزن شہلا سوسائٹی میں رہتی ہے۔ وہیں سے وہ خط لائی تھی۔"

"اچھا کیا' بیٹی' تم میری رخسانہ کے بہت کام آتی ہو۔ ہاں میں یہ پوچھ رہی تھی کہ کیا تم نے شہلا کو یہ بتا دیا ہے کہ رخسانہ کی شادی ہو گئی ہے۔"

فرزانہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "جہاں تک یاد پڑتا ہے' میں نے رخسانہ کا ذکر زیادہ نہیں کیا۔ شہلا یہاں اپنے میاں کے ساتھ آئی تھی۔ بڑی جلدی میں تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جب میں وہاں گئی تو مہمانوں کا ہجوم تھا۔ وہ اتنی مصروف تھی کہ میں اس سے زیادہ باتیں نہ کر سکی۔ وہ خط لے کر آ گئی۔ بات کیا ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔ بس یونہی' میں سوچ رہی تھی کہ دوسروں کو رخسانہ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بتانے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ آئندہ جمشید کا کوئی خط تمہارے ذریعے آئے یا شہلا سے ملاقات ہو تو اس سے رخسانہ کی شادی کا ذکر نہ کرنا۔"

فرزانہ اور اس کی امی نے حیرانی سے انہیں دیکھا پھر فرزانہ نے پوچھا۔ "تعجب ہے آپ رخسانہ کی شادی کی بات چھپانا چاہتی ہیں؟ بھلا کیوں کیا اس لیے کہ آپ کے داماد

ٹیکسی ڈرائیور ہیں یا طبقاتی لحاظ سے آپ انہیں کمتر سمجھتی ہیں۔"

"نہیں، بھلا ہمارا داماد کسی سے کمتر کیوں ہو گا۔ تم تو وہ باتیں بھی سوچ لیتی ہو جو ہم بھی نہیں سوچتے۔ سچ پوچھو تو میں اپنے گھر کی باتیں دوسروں کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔ اب کبھی شہلا سے یا کسی سے بھی ملاقات ہو تو تم رخسانہ کے متعلق انجان بن جایا کرو، ان سے یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ رخسانہ نے اپنا مکان بدل دیا ہے، پتا نہیں وہ کہاں رہتی ہے اس سے ملاقات نہیں ہوتی اور نہ ہی تم اس کے ذاتی معاملات کے متعلق کچھ جانتی ہو۔"

ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ رخسانہ کے متعلق اتنی ساری باتیں چھپانے خصوصاً اس کے سہاگن ہونے کی بات کو چھپانے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا فرزانہ نے کہا۔ "شہلا مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جمشید نے رخسانہ کی پلاسٹک سرجری کے لئے کہیں معاملات طے کئے ہیں وہ رخسانہ کو بلا رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں بیٹی یہ جمشید کی مہربانی ہے۔ اس نے ڈاکٹر سے معاملات طے کیے ہیں لیکن وہاں جانے، آنے، علاج کرانے کے سارے اخراجات تو ہمیں ہی برداشت کرنے ہوں گے۔ میں نے ڈیڑھ لاکھ روپے کا بندوبست کر لیا ہے۔ بس پاسپورٹ بننے کی دیر ہے۔ میں رخسانہ کو بھیج دوں گی۔"

فرزانہ نے پوچھا۔ "رخسانہ جب لندن جائے گی اور جمشید سے علاج کے سلسلے میں ملاقات ہوتی رہے گی تو وہ یقیناً اپنے شوہر اور بچے کا ذکر کرے گی؟"

پہلے تو وہ ذرا ہچکچائیں۔ کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا پھر وہ بولیں۔ "نہیں وہ غیر ضروری باتیں وہاں نہیں کرے گی۔ بس یہاں سے جائے گی اپنے چہرے کی سرجری کرائے گی اور واپس آ جائے گی۔ جمشید کون سا اپنا ہے کہ اسے گھر کے حالات بتائے جائیں۔"

"کوئی اپنا ہو یا نہ ہو لیکن عورت کے لئے اس کا سہاگ، اس کا شوہر اور اس کا بچہ یہ سب اتنے اہم ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پرائے سب کے سامنے ان کا ذکر کرتی ہے اور رخسانہ تو جانی کو بہت زیادہ چاہتی ہے۔ وہ اس کا ذکر ضرور کرے گی۔"

"بیٹی یہ باتیں ہم پر چھوڑ دو۔ میں تم ماں بیٹی سے اتنا چاہتی ہوں کہ تم کسی سے اس کی شادی اور اس کے بچے کا ذکر نہ کرو۔"

فرزانہ کی امی نے ایک گہری سانس لے کر بیٹی سے کہا۔ "تم کیوں اس بحث میں الجھ رہی ہو۔ بہن اطمینان رکھو کہ اس سلسلے میں ہماری زبان بند رہے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولیں۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ، تم ماں بیٹی ہم سے بڑا تعاون کرتی ہو۔ بس اب میں چلوں۔"

"اے بہن ابھی آئی ہو اور بھاگی جا رہی ہو۔ ذرا بیٹھو۔ ایک کپ چائے تو پیتی جاؤ۔ مجھے بھی کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "چائے کی خواہش نہیں چلو تمہاری کوئی ضروری بات ہے تو سن لوں گی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور تمہارے کام آؤں گی۔ بولو کیا بات ہے؟"

"بہن! تم تو سمجھتی ہو کہ جوان بیٹی کی فکر مجھے کھائے جاتی ہے اور یہ ہے کہ شادی سے انکار کرتی رہتی ہے۔ اب میں تھک ہار کر اسے ملک سے باہر لے جانا چاہتی ہوں۔"

رخسانہ کی امی یہ سنتے ہی خوشی سے کھل گئیں۔ ایک کانٹا ان کی بیٹی کی ازدواجی زندگی سے خود ہی دور ہونا چاہتا تھا۔ "یہ تو تمہارا بہت ہی دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ فرزانہ باہر جائے گی۔ ماحول بدلے گا تو اس کے ارادے بھی بدل جائیں گے۔ یہ یقیناً شادی کے لئے راضی ہو جائے گی۔"

"خالہ جان، میں شادی کے لئے باہر نہیں جانا چاہتی۔ ملازمت کے لئے باہر جانا چاہتی ہوں۔ اگر آپ جمشید کا پتا دینا پسند کریں تو میں خط و کتابت کے ذریعے ملازمت کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

رخسانہ کی امی بجھ گئیں۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ جہاں رخسانہ پلاسٹک سرجری کے لئے جا رہی ہے وہیں فرزانہ بھی جائے اور بھانڈا پھوٹ جائے۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹی! غیر لڑکوں سے خط و کتابت نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ وہ بھی یہاں سے ہزاروں میل دور رہ کر، میری رخسانہ جب وہاں جا رہی ہے تو وہ خود ہی تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دے گی۔ وہ خود جمشید سے کہے گی۔ خط لکھنے کی

بات اور ہے اور جمشید کے پاس پہنچ کر کہنے والی بات کچھ اور ہوگی۔ زیادہ اثر ہوگا۔ آخر یہ دونوں بہنیں ہیں۔ دیکھنا فوراً ہی اس کی ملازمت کا بندوبست ہو جائے گا۔"

فرزانہ چائے تیار کرنے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی تھوڑی دیر بعد وہ تین پیالیاں لے کر آئی پھر وہ باتیں کرتی رہیں اور چائے پیتی رہیں۔ چائے کی پیالی خالی کرنے کے بعد رخسانہ کی امی نے کہا۔ "اب میں چلتی ہوں۔ میری تسلی کے لئے ایک بار اور وعدہ کرلو کہ رخسانہ کے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہوگی۔"

"خالہ جان! ہم نے تو کہہ دیا ہے۔ آپ کہیں تو پکے کاغذ پر لکھ دیں۔"

"شریر کہیں کی۔ بس مجھے یقین آگیا ہے۔"

فرزانہ کی امی نے کہا۔ "تم ماضی میں دیکھ چکی ہو۔ ہم نے جو زبان دی اس پر قائم رہے۔ آئندہ بھی تمہارے کام آتے رہیں گے۔ یہاں سے مطمئن ہو کر جاؤ۔"

وہ چلی گئیں۔ فرزانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "امی خالہ جان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ رخسانہ بھی اپنی شادی کی بات چھپانا چاہتی ہے۔ وہ جمشید کے سامنے جانی اور بچے کا ذکر نہیں کرے گی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ماں بیٹی کیا کر رہی ہیں۔ آخر اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ مطلب سوچو تو شرم آنے والی بات ہے مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ رخسانہ چھچھوری نہیں ہے۔ بے شک وہ حسد کرنے اور جلنے کڑھنے والی لڑکی ہے۔ اس کی یہ خرابی اپنی جگہ ہے۔ جہاں تک کردار اور چال چلن کی بات آتی ہے تو وہ بہت ہی ٹھوس کردار کی مالک ہے۔ میں اس کے پیٹھ پیچھے بھی تعریفیں کرتی ہوں۔"

اس کی امی سنتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔ "رخسانہ اور اس کے والدین نے جانی کے ساتھ دھوکا کر کے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی لیکن وہ غلطی کسی طرح نبھ گئی۔ خدا انہیں عقل دے کہ آئندہ یہ دنیا والوں کے سامنے دوسرا جھوٹ بول کر دوسری طرح دھوکے دے کر پھر کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوں۔"

○☆○

ٹھیک ہے' انسان پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں اکثر حالات میں انسان خود مصیبتوں کو دعوت دیتا ہے۔ رخسانہ نے کئی بار اس موضوع پر غور کیا کہ جانی سے بات چھپانا کیا ضروری ہے اور خود کو بن بیاہی ظاہر کرنا مناسب ہے یا نہیں لیکن اس کی امی رہ رہ کر

سمجھاتی تھیں۔ "دیکھو بیٹی! جمشید کاروباری ذہنیت رکھنے والا جوان ہے۔ وہ تم پر یونہی لاکھ' ڈیڑھ لاکھ روپے برباد نہیں کرے گا۔ اس کے اپنے خواب ہوں گے اس نے تمہارے متعلق بہت کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ تمہیں اس وقت تک اسے خواب دکھاتے رہنا چاہئے جب تک تمہارا چہرہ مکمل نہ ہو جائے۔ اگر تم نے اس سے پہلے اپنے متعلق سچ سچ بتا دیا تو ہمیشہ کے لئے ادھوری رہ جاؤگی۔ اتنے اخراجات نہ تو جانی برداشت کر سکے گا نہ ہی تم سالہا سال کی محنت سے اتنی رقم کما سکوگی۔ اپنا اچھا برا خود ہی سوچنے کی کوشش کیا کرو۔ میں کب تک تمہیں سمجھاتی رہوں گی' لندن میں تمہاری کون سی ماں سمجھانے آیا کرے گی۔ ابھی سے ایک مصمم ارادہ کرلو۔ اسی ارادے کے ساتھ یہاں سے جاؤ اور کامیاب واپس آؤ۔"

ماں سمجھاتی رہی۔ بیٹی کش مکش میں مبتلا رہ کر ماں کی ہدایات پر عمل کرتی رہی۔ اس نے جمشید کو خط لکھا اور ناظم آباد کے مکان کا پتا دیا۔ اب جمشید کے پاس سے جو خط آتا تھا' رخسانہ کی امی اس لفافے کو بڑی مہارت سے کھولتی رہتی تھیں پھر اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا خط اس لفافے میں بند کر دیتی تھیں۔ وہ خط ایک فرضی چچا کی طرف سے ہوتا تھا اور اس چچا کا نام انکل جمشید علی تھا کیونکہ لندن سے جمشید جو لفافہ روانہ کرتا تھا۔ اس کے گوشے میں اس کا نام دیا ہوا کرتا تھا بڑی کامیابی سے جانی کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ لندن سے انکل سے خط و کتابت جاری ہے۔

جانی نے پہلا خط پڑھ کر کہا۔ "رخسانہ تمہارے یہ انکل کبھی پاکستان آئیں گے تو میں ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ فی الحال میری طرف سے انہیں یہ لکھ دو کہ وہ جو رقم خرچ کر رہے ہیں۔ اسے ہم قسطوں میں ادا کر دیں گے پہلے ہم ایک گاڑی فروخت کر دیں گے تم یہاں سے پچاس ہزار روپے لے کر جاؤگی اور انہیں پہلی قسط ادا کر دوگی پھر ہم جیسے جیسے قدم جماتے رہیں گے۔ ان کی رقم ادا کرتے رہیں گے۔"

رخسانہ نے اس کے سامنے بیٹھ کر ایسا ہی ایک خط لکھا جانی نے کہا۔ "تم لفافے پر ایڈریس لکھ کر مجھے دے دو۔ میں لے جا کر پوسٹ کر دوں گا۔"

رخسانہ کی امی نے کہا۔ "نہیں بیٹے' میں بھی اپنے دیور کو' یعنی رخسانہ کے چچا کو کچھ لکھوں گی پھر خود ہی جا کر پوسٹ کر دوں گی۔ ابھی مجھے لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔"

اس طرح بات بنتی گئی۔ جمشید کے نام اس طرح خط پوسٹ ہوتا رہا کہ رخسانہ جانی کی غیر موجودگی میں جمشید کو دوسرا خط لکھتی تھی پھر وہی خط پوسٹ کیا جاتا تھا۔ اس نے خط و کتابت کے دوران اپنی شادی کا ذکر نہیں چھیڑا تھا۔ جب شادی کا ذکر نہ ہو تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے جمشید نے پھر اس کے متعلق ذاتی قسم کے سوالات نہیں کیے۔ ان خطوط میں آنے جانے' وہاں رہنے اور علاج کرنے کے سلسلے میں باتیں ہوا کرتیں تھیں۔ وہ جانی سے چھپ چھپ کر ڈرتے ڈرتے ایسا کر رہی تھی اور نماز کے دوران دعائیں مانگتی تھی کہ اس کی بات بن جائے۔ ایک بار چہرہ مکمل ہو جائے اس کے بعد پھر کیسی بھی آزمائش کی گھڑی آئے وہ مرجائے گی مگر کبھی جانی کو دھوکا نہیں دے گی۔ جھوٹ نہیں بولے گی۔

اکثر لوگ اپنی بگڑی بنانے کے لیے ایک بار جھوٹ کی کوئی گنجائش پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے بھی توقع کرتے ہیں کہ وہ ایک بار ان کے جھوٹ اور دھوکے کو جائز کر دے۔ اس کے بعد وہ ناجائز حرکتیں کبھی نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ایسوں کی رسی دراز کرتا ہے۔ بندوں کے لیے راستوں کا تعین ہو چکا ہے کہ کس راستے کے آخر میں انعامی منزل ہے اور کس راستے کے آخر میں گڑھا ہے پھر ایک عقل دے دی ہے کہ آگے بڑھتے بڑھتے' قدم اٹھاتے ہوئے سمجھو کہ کدھر جا رہے ہو جب راستہ بھی معلوم ہو راستے کا انجام بھی معلوم ہو اور عقل بھی ساتھ ہو تو پھر دعا مانگنے' التجا کرنے اور مزاروں پر منتیں مانگنے سے ایک غلط راستے کو صحیح کر دینے کی گنجائش کیسے نکلے گی؟

رخسانہ اور اس کی امی کے لئے ایک پریشانی یہ بڑھ گئی تھی کہ فرزانہ لندن میں ملازمت کرنا چاہتی تھی۔ یہ نیا مسئلہ آن پڑا تھا۔ اب لندن میں رہ کر جب تک پلاسٹک سرجری کا کام مکمل نہ ہو جاتا اس وقت تک فرزانہ کو جھوٹے بہلاوے دینے تھے۔ وہاں سے خط و کتابت کے ذریعے اسے خوش فہمی میں مبتلا رکھنا تھا کہ اس کے لیے ملازمت کا انتظام ہو رہا ہے۔ ایک سچ کو چھپانے کے لیے کتنے ہی جھوٹ کا سہارا لینا ہوتا ہے' کتنوں کو بہلانا ہوتا ہے اور کتنوں کی خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں۔ رخسانہ کبھی کبھی فرزانہ کی خوشامد کرنے کے لئے اس کے پاس پہنچ جایا کرتی تھی۔

آخری بار وہ فرزانہ سے ملنے گئی۔ بڑی محبت سے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "فری!

میں کل کی فلائٹ سے لندن جا رہی ہوں۔ ساری تیاریاں ہو چکی ہیں' جانے سے پہلے میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

فرزانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کس بات کی معافی؟"

"یہی کہ تم نے میرے ساتھ بہت کیا ہے میں کبھی کبھی تم پر شبہ کرتی رہی کہ تم میری ازدواجی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو۔ میں غلطی پر تھی۔ جانے سے پہلے معافی مانگتی ہوں بہت لمبا سفر ہے کیا پتا جو راستہ مجھے لندن کی طرف لے جا رہا ہے وہ واپس لائے گا یا نہیں۔"

فرزانہ نے محبت سے اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔ "ہم سب کا اگلا پل موت کا ہوتا ہے۔ تم اتنی دور لندن جانے کی بات کر رہی ہو۔ ہو سکتا ہے میں یہاں بیٹھے بیٹھے ہی اگلے پل مر جاؤں زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں دعا کروں گی کہ تم اپنے شوہر کے لیے اور اپنے بچے کے لیے بخیریت واپس آؤ اور ہاں تمہارا بیٹا چھ مہینے کا ہو گیا اور تم نے اب تک اس کا نام نہیں بتایا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "کامران! ہم پیار سے کامی کہتے ہیں۔"

"بہت ہی پیارا نام ہے ویسے انسان زرا خود غرض ہوتا ہے نا میں اپنے لیے بھی تمہاری سلامتی کی دعا مانگوں گی کہ تم وہاں بخیریت رہو اور میرے لیے ملازمت کا انتظام کرو۔"

رخسانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں بھی انسان ہوں نا۔ اس لیے میں بھی خود غرض ہوں۔ جانتی ہو میں تمہاری ملازمت کا انتظام کیوں کروں گی' اس لیے کہ تم پاکستان چھوڑ کر دور چلی جاؤ۔ ماحول بدلنے سے تمہارا شادی کا موڈ ہو گا۔ جب شادی ہو جائے گی تو میرے دل میں جو ایک شبہ پیدا ہوتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔"

فرزانہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں اپنے مطلب کے لئے تمہاری سلامتی کی دعا مانگوں گی۔ تم اپنے مطلب کے لئے مجھے ملازمت کے بہانے اس ملک سے بھگا دینا۔ ہم سب مطلب پرست ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اپنا کام نکالنے کے لئے دوسروں کے کام آ جاتے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب نیکی برائے نیکی کی جاتی تھی اب نیکی صرف باہمی مفاد کے لئے کی جاتی ہے۔"

رخسانہ نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم باتیں کرتے کرتے زہر میں بجھنے لگتی

ہو۔"

"میں ابھی زہریلی لگتی ہوں مگر تم یہاں سے جانے کے بعد زہر اگلنے لگو گی۔ ہم سب اندر سے زہریلے ہیں۔ کسی ایک کو الزام نہ دو۔ بائی دے وے' تم بتانا چاہو تو میں ایک بات ضرور پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور پوچھو۔"

"سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم جمشید کو کالج کے زمانے سے چاہتی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا تک نہیں۔ تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟"

"اس لیے کہ تم اپنی شادی کی بات چھپا رہی ہو۔ لندن میں ایک جمشید ہی تو ہے جس سے یہ بات چھپا سکو مگر کیوں چھپا رہی ہو؟"

"بس یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ جمشید کو معلوم ہو گا کہ میں شادی شدہ ہوں تو وہ جانی کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرے گا۔ پوچھے گا کہ میں اس کے ساتھ کیوں نہیں آئی بچے کو کہاں چھوڑ دیا ہے۔ کون اتنے سارے سوالوں کے جواب دے اس سے اچھا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔"

"عورتیں تو اپنے شوہر اور بچوں پر فخر کرتی ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں اپنے مرد کے گن گاتی ہیں۔ اپنے بچوں کی شرارتیں بیان کرتی ہیں۔ کیا تمہارے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تعلیم یافتہ ہوں اور یہ سمجھتی ہوں کہ کس موقع پر کس کا ذکر ہونا چاہئے۔ میں بحیثیت ڈاکٹر مریضوں کو اٹینڈ کرتی رہوں اور ان کے سامنے اپنے شوہر اور بچے کا ذکر کرتی رہوں تو یہ بات بے موقع بھی ہو گی اور مضحکہ خیز بھی میں لندن میں رہ کر ہسپتال اور ڈاکٹروں کے ماحول میں رہوں گی جہاں میرے چہرے کی سرجری ہوتی رہے گی۔ ایسی جگہ اپنے شوہر اور بچوں کا ذکر کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ کیا اس بات کو تم سمجھ نہیں سکتیں تم بھی تو تعلیم یافتہ ہو۔"

"ہوں۔ مگر دل کے رشتوں کو چھپانے کی تعلیم نہیں پائی ہے۔"

"فری یہی مناسب ہے کہ میں تمہارے مطلب کی بات کروں۔ تم میرے مطلب کی

بات کرو۔ میں تمہاری ملازمت کے لئے پوری کوشش کروں گی۔ تم یہاں کسی کے سامنے میرا ذکر نہ کرنا یہ ہمارے درمیان زبانی معاہدہ ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

وہ جانے کے لئے اٹھ گئی۔ فرزانہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈسپنسری میں آئی پھر ڈسپنسری کا بیرونی دروازہ کھول کر ایک طرف آڑ میں کھڑی ہو گئی اور اسے خدا حافظ کہا۔ رخسانہ نے اس کی اس حرکت کو توجہ سے دیکھا پھر چونک کر بولی۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آج کل تم برقع پہننے لگی ہو۔ اسی لیے ادھر آڑ میں کھڑی ہو گئی ہو۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "جانی کو میں نے بھی دھوکا دیا تم نے بھی دھوکا دیا مگر تم اس سے آنکھیں ملا کر زندگی گزارتی ہو اور میں منہ چھپاتی پھرتی ہوں۔ جانے کب تک مجرموں کی طرح زندگی گزارتی رہوں گی۔"

رخسانہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ میری وجہ سے تم ایسی زندگی گزار رہی ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں جلد ہی وہاں بلا لوں گی۔ بس ایک آخری التجا اور کرنا چاہتی ہوں۔ برقع پہنتی رہنا۔"

"میں اسے برقع سمجھ کر نہیں' ڈھال سمجھ کر پہنتی ہوں اس لیے پہنتی رہوں گی۔"

رخسانہ نے بڑے محبت سے اسے دیکھا پھر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"فری! میں ہزاروں میل دور جا رہی ہوں۔ اتنی دور جاتے وقت احساس ہو رہا ہے اگر مجھے کچھ ہو گیا۔ میں واپس نہ آسکی تو ہماری خود غرضی' ہماری کمینگی' ایک دوسرے سے کی جانے والی مکاریاں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ اس وقت پچھتاوا ہو گا کہ ہم نے ایک ذرا سی دیر کے لئے ایک دوسرے سے محبت کیوں نہیں کی۔ ایک دوسرے سے مصافحہ کیوں نہیں کیا ایک دوسرے کے گلے کیوں نہیں لگ گئیں۔"

وہ قریب آئی۔ فرزانہ نے اسے ایک دم سے چمٹا لیا پھر دونوں گلے لگ کر رونے لگیں۔ "فری! تم بہت اچھی ہو۔ تم نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ اب بھی کر رہی ہو۔"

"رخسانہ! آدمی جب اچھی بات کرتا ہے تو کیا ان اچھی باتوں پر عمل بھی کرتا ہے؟"

"اچھی بات ہو تو میں ضرور عمل کرتی ہوں۔"

"تمہارا یہ دعویٰ سلامت رہے۔ بقول تمہارے تم خدانخواستہ واپس نہ آسکو تو یہ پچھتاوا ہم سب کو ہو گا کہ ہم نے اپنی زندگی میں اپنی قربت میں ایک دوسرے سے محبت کیوں نہیں کی' ایک دوسرے کو دھوکا کیوں دیا۔ رخسانہ! جب یہ اچھی بات ہے تو اس پر عمل کرو اور جانی کو دھوکا نہ دو۔ اسے بتا دو کہ تم ملک سے باہر جا کر کنواری کہلاؤ گی۔"

رخسانہ ایک دم سے ساکت ہو گئی۔ اس کے دماغ میں یک بیک آندھی سی چلنے لگی۔ فرزانہ نے بڑے صحیح وقت پر اچھی باتوں کا حوالہ دے کر اسے عمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خود جانی کو دھوکا دینے کے دوران اندر سے سہمی ہوئی تھی اور چھپ چھپ کر پچھتاتی تھی۔ پچھتانے کے باوجود ایسا کرتی جا رہی تھی۔ اس کی ای اسے سہارا دیتی جا رہی تھیں۔ اب فرزانہ نے ایک بات کہہ دی تو وہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی۔

"فری تم جانتی ہو کہ میں دنیا کے کسی مرد کو جانی پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ انہیں دھوکا دینے کی بات سوچتی ہوں تو اندر سے کانپنے لگتی ہوں اللہ! کہیں کسی شبہ کی بنا پر ان کی محبت مجھ سے چھن نہ جائے۔ تم نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ میں اس پر عمل کروں گی۔"

دونوں سہیلیوں نے خوش ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا ایک دوسرے کو پیار کیا۔ پھر رخسانہ اس سے رخصت ہو کر باہر آ گئی۔ فرزانہ نے دروازے کو بند کر لیا۔ جب وہ رکشہ میں بیٹھ کر ناگن چورنگی کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

محبت کے جذبے سر اٹھا رہے تھے اسے سمجھا رہے تھے کہ فرزانہ ٹھیک کہتی ہے۔ جانی کو دھوکا نہیں دینا چاہئے۔ ایسا اعتماد کرنے والا شوہر خوش نصیب عورتوں کو ملتا ہے۔ اس لیے اپنے نصیب کو نہیں بگاڑنا چاہئے۔ فرزانہ ٹھیک کہتی ہے۔

اچانک اس کے اندر سے ایک چڑیل بولنے لگی۔ چڑیل کی آواز ٹھیک اس کی ای جیسی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "فرزانہ کیا خاک ٹھیک کہتی ہے؟ دشمن نے کبھی کوئی صحیح مشورہ دیا ہے؟ بیوقوف نہیں بننا چاہیے جانے کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ کل کی فلائٹ سے روانگی ہے اب جانی کو صحیح بات بتا دی گئی تو جانا منسوخ ہو جائے گا اور آدھا [illegible] موجود رہے گا۔

اگر چہرے میں تھوڑی سی خرابی ہو جائے تو آئینہ عورت کو سمجھا [illegible] خرابی نہیں ہے' عورت نہ مانے تو پھر سمجھا جاتا ہے کہ یہ چاند کا داغ ہے جو حسن [illegible] ہے۔

آئینہ عورت کا سب سے بڑا دوست ہوتا ہے جو سامنے آتی ہے اسے ناراض نہیں کرتا۔ اسے مایوس نہیں کرتا۔ دیکھنے والی آنکھوں میں روپ رنگ کے اتنے جلوے بھر دیتا ہے کہ وہ اندھی ہو جاتی ہیں۔ صرف اپنے آپ کو دیکھ سکتی ہیں اور دیکھنے والی دنیا کو بھول جاتی ہیں۔

لیکن رخسانہ کا چہرہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ وہ آئینے کے سامنے خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دس بیس برس تک اپنی کمائی کے بھروسے پر صبر نہیں کر سکتی تھی پھر بڑھاپے میں چہرہ بنتا تو کیا بنتا؟ کس کے لئے بنتا؟ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے مکمل چہرے کو دیکھتی یا سفید بالوں کو گنتی؟

رخسانہ کو جیسے عقل آ گئی۔ "میں بھی کتنی نادان ہوں۔ فری کی باتوں میں آ رہی تھی اور جانی کو سچ سچ بتانے والی تھی۔ بتا دیتی تو وہ مجھے کبھی لندن نہ جانے دیتے میں ایسی ہی رہ جاتی اور وہ فری کے پیچھے بھاگتے پھرتے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ فری کی چال کیا تھی۔ وہ مجھے ادھوری رکھنا چاہتی ہے تاکہ جانی اسی کے پیچھے لگا رہے۔ برقع پہننے سے کیا ہوتا ہے یہ تو شوق کو اور بڑھانے والی بات ہوتی ہے کہ آؤ ڈھونڈ لو اور مرد تو ایسوں کے پیچھے ہی بھاگتا ہے جو ہاتھ نہیں آتیں۔

رکشہ شور مچاتا ہوا ایک شاہراہ سے گزر رہا تھا اب رخسانہ کے اندر بھی آندھی تھم گئی تھی۔ اس نے جیسے فرزانہ کا اصلی چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اب نفرت سے سوچ رہی تھی۔ توبہ توبہ کیسی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جسے سہیلی بنائیں میٹھی چھری سے اسی کا گلا کاٹتی ہیں۔ ابھی رخصتی کے وقت گلے لگ رہی تھی اور چپ چاپ مجھے گڑھے میں گرا رہی تھی وہ کون ہوتی ہے میرے شوہر کا نام لینے والی۔ میں اپنے شوہر کی وفادار ہوں یا نہیں یہ میرا خدا جانتا ہے۔ اس کے دل میں تو چور ہے۔ کسی نہ کسی بہانے جانی کا ذکر ضرور کرے گی' بڑی ہمدردی جتا رہی تھی کہ میں اس سے دھوکا نہ کروں۔ اس سے جھوٹ نہ بولوں۔ اری میں کچھ بھی کروں تیرے دل میں درد کیوں اٹھتا ہے؟ ابھی تک تیری نیت کیوں

خراب ہے۔" ملک سے باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی ہے مگر شادی کے لئے تیار نہیں
ہوتی۔ جانتی ہے کہ شادی کے بعد دوسرے کی ہو جائے گی تو جانی کا چانس ہاتھ سے نکل
جائے گا۔ بے حیا' بے غیرت....."
دوسروں کی بے غیرتی اور بے حسی کا حساب کرتے رہنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے
کہ اپنا محاسبہ کرنے کی باری کبھی نہیں آتی۔

○☆○

جانی بستر پر پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں کامران ننھے ننھے ہاتھ پاؤں جھٹک
کر کھیل رہا تھا۔ ایک بار کامران نے منہ بنایا۔ رونے کی دھمکی دی۔ جانی نے پچکارتے
ہوئے کہا۔ "بیٹے! یہ رونے والی بات اچھی نہیں لگتی۔ اب ماں کی گود تلاش نہ کرو۔ وہ
پرائی ہو رہی ہے۔"
رخسانہ نے استری کا پلگ نکال کر پتلون کو تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ایسا کیوں کہتے
ہو؟ کیا ہزاروں میل دور جانے سے میں تمہارے اور کامی کے لئے پرائی ہو جاؤں گی۔"
جانی نے اسے پیار بھری اداسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کل تم سمندر پار چلی جاؤ گی۔
جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی تمہیں چھین کر لے جا رہا ہو۔"
رخسانہ نے چونک کر سر اٹھایا' جانی کی نظریں تیز نہیں تھیں' لیکن اس کے دل میں
ترازو ہو رہی تھیں۔ دل کے چور نے پوچھا۔ "کیا جمشید اسے جانی سے چھین رہا ہے؟"
"کبھی نہیں۔" اس نے عزم سے سوچا۔ "جمشید جیسے خوبرو اور دولت مند جوانوں کی
بھیڑ میں بھی میں اپنے جانی کا ہاتھ نہیں چھوڑوں گی۔"
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جانی کا ہاتھ پکڑنے کے لئے تیزی سے جانے لگی لیکن ضمیر کی
رفتار اس سے تیز تھی' وہ اندر سے بول رہا تھا۔ رخسانہ تیرا جھوٹ تجھے جانی سے چھین رہا
ہے جو تجھ پر اعتماد کر رہا ہے' اس سے صاف کہہ دے کہ جمشید کے تعاون سے' مہربانی یا
محبت سے باقی آدھا چہرہ ملنے والا ہے۔
وہ اپنے کانوں میں مصلحت کی انگلیاں ٹھونس کر جانی کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ
کو تھام کر بولی۔ "ایسا کیوں سوچتے ہو؟ میں کمزور نہیں ہوں' اتنی تقدیر بھی نہ مجھے تم سے نہیں

ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جانی نے کہا۔ "دیکھو پھر رونے لگی
ہو۔ شام سے اب تک کتنی بار آنسو پونچھ چکا ہوں۔ کل ایئرپورٹ پر رونے کے لئے کچھ
بچا کر رکھو۔"
اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے رخصت کرتے وقت تم بھی روؤ گے
نا؟"
اسی وقت اس کی امی کمرے میں داخل ہوئیں' جانی سے نگاہیں چار ہوئیں وہ سرد آہ
بھر کر بولا۔ "تم اپنے پیچھے رونے کا سامان چھوڑ کر جا رہی ہو۔ روتا ہی رہوں گا۔"
"میں اپنے پیچھے اپنی یادیں چھوڑ کر جاؤں گی۔ تم یادوں کو رونے کا سامان کہہ رہے
ہو' ہائے کتنا خوبصورت استعارہ ہے۔ بھلا کون تمہیں ٹیکسی ڈرائیور کہے گا؟"
اس کی امی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اے بٹی! ذرا سمجھا کرو۔ یہ لڑکا مجھے دیکھ کر کہہ رہا
ہے۔ یہ مجھے دیکھ دیکھ کر روتا رہے گا۔"
رخسانہ نے پلٹ کر ماں کو دیکھا' پھر وہاں سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں
نہیں آتا' آپ جانی کی باتوں کو اپنے اوپر کیوں لے لیتی ہیں۔ ابھی ہم اپنی باتیں کر رہے
تھے اور بیچ میں آپ ٹپک پڑیں۔"
جانی نے کہا۔ "تم مجھے سمجھاتی ہو کہ تمہارے جانے کے بعد امی کا خیال رکھوں؟
تمہارے جہیز میں آنے والی چیزوں میں یہی ایک ایسی چیز ہیں جو میرے خیال سے نہیں
ملتیں۔"
وہ جانی کی طرف انگلی اٹھا کر بولیں۔ "سنو بٹی! یہ کیا کہہ رہا ہے' کیا میں تمہارے جہیز
میں آئی ہوں؟"
"امی! یہ غصے سے کہہ رہے ہیں اور غصہ آپ نے دلایا ہے۔"
وہ جھنجلا کر جانی کے پاس آئیں اس کی گود سے بچے کو چھیننے کے انداز میں لیتے
ہوئے بولیں۔ "یہ تو میں خوب جانتی ہوں کہ تم اپنے شوہر کا قصور کبھی نہیں مانو گی۔ میں
تمہاری کوئی نہیں لگتی۔ میں تو دشمن ہوں۔ کیا کروں نواسے کی محبت کھینچ لاتی ہے نہیں تو
کبھی جھانکنے بھی نہ آؤں۔"
وہ بچے کو لے کر بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔ جانی نے کہا۔ "کامی میرا بیٹا

ہے مگر دیکھو کس طرح مجھ سے چھین کرلے کر گئی ہیں۔"

"مجھے تو چھوڑ دیا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ "پھر تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ وہ ہنسنے لگا۔ ان کی ہنسی کی آواز بند کمرے میں پرواز کرتی ہوئی باورچی خانے میں پہنچ رہی تھی۔ فرید احمد فرشی بستر پر لیٹے ہوئے تھے رخسانہ کی امی نے نواسے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں اس لڑکی کو جانی میں کیا مل گیا ہے۔ کتنی خوش رہتی ہے۔ اس کے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مجھے تو لفنگا لگتا ہے۔"

فرید احمد نے کہا۔ "میں تو شریف آدمی ہوں کیا تم مجھ سے کبھی خوش رہی ہو؟"

"اے اپنی بات نہ کرو۔ کبھی تم نے مجھے دل کھول کر ہنسایا ہے؟"

"چھوڑو بیگم! اب میں اس بڑھاپے میں لفنگا نہیں بن سکتا۔"

بچہ رونے لگا۔ وہ فرید احمد کے پاس اسے لٹا کر بولیں۔ "ذرا چپ کراؤ میں دودھ تیار کرتی ہوں میرا لال بھوکا ہے۔"

فرید احمد نے اسے گود میں لیا پھر اسے پچکارتے ہوئے بولے۔ "یہ ماں کے بغیر کیسے رہے گا؟ بہت پریشان کرے گا۔"

وہ ناگواری سے بولیں۔ "جتنا تم نے پریشان کیا ہے اتنا نہیں کرے گا۔"

بند کمرے کی نیم تاریکی میں رخسانہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ بیٹا اس کی ممتا کو پکار رہا تھا۔ جانی اسے شوہر کی محبت سے زنجیر کر رہا تھا۔ ایک ماں کے لئے ایک بیوی کے لیے آج آخری رات تھی پھر سال چھ مہینے کی بات تھی۔ جانے ایسی رات پھر کب نصیب ہوتی۔ وہ چاہتی تھی اس کے ایک طرف کامی ہو' دوسری طرف جانی ہو۔ سمندر پار جانے سے پہلے وہ سمندر بن کر دونوں کو اپنے اندر ڈبو لینا چاہتی تھی۔ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ سیپیاں چننے کے لئے فرزانہ ساحل پر کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ڈوبتے ہوئے دل سے بولی۔ "میرے جانی! مجھے یاد کرتے رہو گے نا؟"

وہ ڈوب کر بولا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟!"

"اس کے پیچھے نہیں جاؤ گے نا؟"

وہ جیسے تلاش کے صحرا میں تھک کر گر پڑا۔ "رخسانہ! تم بہت دور جا رہی ہو۔ میں اتنی دور تمہیں تسلیاں دینے نہیں آ سکوں گا۔ اپنے دل سے اندیشے کو نکال کر جاؤ۔"

"تم ایک بار کامی کی قسم کھا کر یقین دلاؤ مجھے اطمینان ہو جائے گا۔"

وہ ذرا ہچکچایا پھر اس نے بات بنائی۔ "کتنے مہینے ہو گئے۔ ایک بار وہ صدر میں نظر آئی تھی۔ میں اس کا پتا ٹھکانا نہیں جانتا۔ اس کے پیچھے کیسے بھاگ سکتا ہوں' جو موجود نہ ہو۔"

آدمی سائے کے پیچھے بھاگتا ہے' بیٹے کی قسم کھا کر کہو۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میں اپنے بیٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ فرزانہ سے نہیں ملوں گا۔" پھر اس نے اپنے دل میں کہا۔ "وہ ملے تو دوسری بات ہے۔"

وہ خوش ہو گئی۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگی' اس کا جانی اسے کبھی مایوس نہیں کرتا تھا۔ اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔ باہر ٹھوکر کھاتا تھا مگر گھر میں آ کر سنبھل جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک خوبصورت بیٹا دیا تھا۔ گھر اپنا تھا۔ ٹیکسی کی آمدنی اپنی تھی۔ کسی کی محتاجی نہیں تھی۔ ایسی آسودہ ازدواجی اور گھریلو زندگی بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتی تھی۔

رات کے پچھلے پہر جانی سو گیا۔ اپنی عورت پر اعتماد ہو تو بڑی گہری نیند آتی ہے۔ ایک تکیے پر اس کا سر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے تکیے پر رخسانہ سر رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔ ندامت سے خود کو سمجھا رہی تھی۔ بے شک میں جانی سے بات چھپا رہی ہوں مگر بے وفا نہیں ہوں۔ جاتے ہی جمشید سے کہہ دوں گی کہ پلاسٹک ... ی کے اخراجات کا باقاعدہ تحریری حساب ہو گا جو بھی رقم بنے گی میں اس کا ایک ایک ... یا ایک ایک پنس ادا کروں گی۔ کسی کا احسان نہیں ... وں گی۔ کبھی کسی کے آگے جانی کا سر جھکنے نہیں دوں گی۔ بے شک میں بات چھپا رہی ہوں مگر میری نیت کو میرا خدا ہی جانتا ہے۔

وہ آگے سرک کر اپنے مجازی خدا کی پناہ میں سو گئی۔

O☆O
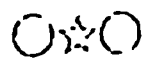
جدائی کی گھڑیاں آ گئیں۔ اپنے گھر پر تالا لگاتے وقت روتا آ رہا تھا کہ پتا نہیں پھر اس

دروازے پر کب آتا ہو۔ اس نے بچے کو امی کی گود سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر جانی کے برابر بیٹھ گئی۔ پچھلی سیٹ پر اس کی امی اور ابو بیٹھ گئے۔ سفر کا تمام سامان چھت کے کیریئر پر باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے ابو نے کہا۔ "بیٹے! اچھی طرح گن لینا چاہئے کہ کوئی سامان چھوٹ نہ گیا ہو۔"

وہ پھر رونے لگی۔ "میں تو اپنا سب ہی کچھ چھوڑ کر جا رہی ہوں۔"

جانی نے ٹیکسی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "رخسانہ! بری بات ہے۔ ہنستے بولتے چلو۔"

اس نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا۔ دوسرے ہاتھ سے جانی کے بازو کو پکڑ کر کہا۔ "اپنی صحت کا خیال رکھنا' دن رات ٹیکسی نہ چلانا۔"

"ایک ٹائم چلاؤں گا۔ دوسرے ٹائم کسی ڈرائیور کو دے دوں گا۔"

"امی! جانی تینوں ٹائم آپ کے ہاں کھانا کھانے آئیں گے۔ جس دن نہ آئیں تو مجھے خط لکھئے گا' میں خوب روؤں گی۔"

جانی نے بڑے پیار سے کہا۔ "میں تمہیں نہیں رلاؤں گا جب تینوں وقت بیٹے کو پیار کرنے جایا کروں گا تو کھانا بھی کھایا کروں گا۔"

"میں نے تمہارے کپڑے استری کر دیے ہیں۔ کپڑے میلے ہوں تو دھوبی کو نہ دینا۔ امی دھو کر استری کر دیا کریں گی۔"

"تم یہ ساری باتیں کل سے سمجھا رہی ہو۔"

"تم بے پروا ہو' بھول جاتے ہو۔ میں خط لکھ کر یاد دلایا کروں گی۔"

وہ ہنس پڑا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "میں بہت خوش نصیب ہوں کہ تم نے مجھے اتنی محبت دی ہے' اتنی توجہ دی ہے کہ اب تمہارے بغیر رہنا مشکل ہو جائے گا۔ وہاں پہنچتے ہی خط لکھنا۔ دیر کرو گی یا نہیں لکھو گی تو مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"ایں؟" وہ ذرا گھبرا گئی۔ اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی کوئی بات ہو گی تو جانی پھرا ہے' اسے ڈھونڈنے لندن تک جا سکتا ہے' اگر ایسا ہوا تو مصیبت بن ہی جائے گی اور تقدیر بگڑ جائے گی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "دیکھو جانی! میں ہر ہفتے خط لکھا کروں گی مگر

ڈاک کے نظام میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میرا کوئی خط غلط پتے پر پہنچ سکتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے میری کوئی خبر نہ ملے تو صبر سے کام لینا۔ وہاں بھاگے آؤ گے تو بے تحاشا اخراجات بڑھیں گے پھر میرا چہرہ نہیں بن سکے گا۔"

وہ تمام راستے اسے سمجھاتی رہی۔ ایئرپورٹ پر پہنچتے ہی آنسوؤں کا سیلاب آگیا۔ جانی کے سوا سب رو رہے تھے۔ رخسانہ خود تو رو رہی تھی مگر بچے کو چپ کرا رہی تھی۔ کبھی اسے چوم رہی تھی' کبھی سینے سے لگا کر آہیں بھر رہی تھی۔ جانی نے بے بسی سے کہا۔ "مجھے رونا نہیں آرہا تم میرے دل کی حالت سمجھ سکتی ہو۔ بچپن میں ماں کی گود سے بچھڑا تھا آج سے تمہاری محبت نہیں ملے گی۔"

"ملے گی جانی! میں جلد آؤں گی۔ جس دن میرا چہرہ مجھے واپس ملے گا۔ اسی دن وہاں سے چل پڑوں گی۔"

اس نے متعلقہ کاؤنٹر کے پاس پہنچ کر پاسپورٹ اور ضروری کاغذات پیش کیے' ان پر روانگی کی مہر لگوائی۔ ٹی وی سے اعلان کیا جا رہا تھا کہ مسافر طیارے میں پہنچ جائیں۔ اس کی امی نے اسے گلے لگا کر خوب دعائیں دیں۔ اس کے ابو نے پیشانی چوم کر کہا۔ "میری بیٹی خوبصورت گڑیا بن کر آئے گی' جاؤ بیٹی تمہیں خدا کے حوالے کیا۔ خود کو کبھی اکیلے نہ سمجھنا ہماری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

رخسانہ نے بچے کو خوب چوم کر ماں کے حوالے کیا پھر سفری بیگ شانے سے لٹکا کر جانی کے ساتھ اس ریلنگ تک آئی' جہاں سے جانی کا ساتھ بھی چھوٹنے والا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو تھام کر کچھ بولنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز آنسوؤں میں بہہ گئی۔ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ جانی نے مسکرا کر کہا "مسکراؤ' جب زبان سے بولا نہ آئے تو حوصلے سے مسکرانا چاہیے۔"

وہ جبراً مسکرانے کی کوشش کرنے لگی پھر بولی "جب سے لندن جانے کی بات چلی ہے' میں تمہارے آگے دن رات بولتی جا رہی ہوں مگر لگتا ہے وہ بات کہیں گم ہو گئی ہے جو میں کہنا چاہتی ہوں۔"

"وہ بات گم نہیں ہوئی۔ میرے دل پر لکھی ہوئی ہے۔ ایک بار تم نے کہا تھا۔ جانی! وعدہ کرو' اگر کبھی ایسی منحوس گھڑی آئی کہ ہمیں مجبوراً الگ ہونا پڑے تو الگ ہونے کے

بعد میں کم از کم پانچ برس تک شادی نہیں کروں گا۔"

"ہاں جانی! تمہیں وہ وعدہ یاد ہے؟"

"یاد ہے۔ میں نے اس روز بھی کہا تھا۔ آج بھی کہتا ہوں۔ مجھے عورتیں بہت ملیں گی' شاید فرزانہ بھی ملے مگر میرے مزاج کو' میری رگ رگ کو سمجھنے والی تمہاری جیسی بیوی نہیں ملے گی۔"

"مشکل تو یہی ہے جانی! میری جیسی بیوی بھی نہیں ملے گی اور فرزانہ جیسی آنکھ مچولی کھیلنے والی بھی نہیں ملے گی۔"

"رخسانہ! تمہارے رخصت ہونے سے پہلے میں تمہارے دل میں سے فرزانہ کا کانٹا نکال دینا چاہتا ہوں۔ تم نے پانچ برس کا وعدہ لیا ہے' میں تمہاری آخری سانس تک کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ جب تک تم میری شریک حیات رہو گی' کوئی دوسری عورت تمہاری جگہ نہیں لے گی۔"

وہ یک بہ یک خوشی سے کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سورج اتر آیا۔ آنسو کرن کرن چمکنے لگے۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی "اور ایک بار میری قسم کھا کر بولو۔"

"جب مرد اپنی زبان دیتا ہے تو وہ زبان کسی قسم کی محتاج نہیں رہتی۔ میری جان! ہنستے ہوئے جاؤ' ہنستے ہوئے آؤ۔ میں تمہارے انتظار میں اکیلا رہوں گا۔"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ تھامے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے رہے پھر وقت نے منادی کی۔ یہ ملاقات مسافرانہ ہے۔ کسی کو رہنا ہے کسی کو جانا ہے۔ ہاتھوں سے ہاتھ چھوڑ دو نگاہوں کے رشتے توڑ دو۔ رخسانہ کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ وہ دور ہونے لگی۔ جاتے جاتے پلٹ کر کبھی نگاہوں کے رشتے جوڑنے اور کبھی توڑنے لگی۔ زمین کو چھوڑ کر آسمان پر چلنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پھر دیو قامت طیارے نے اسے اپنے اندر چھپا لیا۔

اب وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ جانی نے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ کبھی طیارے کی طرف دیکھنے لگا' کبھی بیٹے کو چومنے لگا' اسے یقین تھا کہ رخسانہ دیکھ رہی ہو گی اور جو پیار بیٹے کو مل رہا تھا' اسے اپنے لیے سمجھ رہی ہو گی۔ زندگی کی مسافت میں ہم ایک دوسرے کے لیے جو کچھ کرتے ہیں' وہ محض یادوں کی مار مارنے کے لیے کرتے ہیں۔ جب طیارے نے

پرواز کی اور نظروں سے اوجھل ہوا تو اُدھر رخسانہ کو اِدھر جانی کو یادوں کی مار پڑ رہی تھی۔

○☆○

فرزانہ اپنے ہاتھ میں پھول لیے سیاہ برقعے میں چھپی یوں کھڑی تھی جیسے انار کلی کو چار دیواری میں چن دیا گیا ہو۔ شہزادہ سلیم اسے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن فرزانہ اسے دیکھنے ائرپورٹ تک چلی آئی تھی۔

جب چھپنا لازم ہو گیا تھا تو پھر چھپ کر دیکھنے کیوں آئی تھی؟ کیا سہیلی پر الوداعی نظر ڈالنے آئی تھی؟ یا دل میں چور تھا کہ رخسانہ کے جاتے ہی جانی کسی طرح اس کی راہ پر لگ جائے۔ اگر رخسانہ اور اس کی امی اسے برقعے میں پہچان لیتیں تو ذہن میں ایسے ہی سوالات کلبلانے لگتے۔ ادھر فرزانہ یہ طے کر کے آئی تھی کہ پہچان لی گئی تو دو ٹوک باتیں کرے گی۔ ان کے سوال کے جواب میں سوال کرے گی "بتاؤ جانی کو پھر ایک بار دھوکا کیوں دے رہی ہو؟ سہاگن ہوتے ہوئے کنواری بن کر کیوں جا رہی ہو؟"

بے شک یہ رخسانہ اور جانی کے ذاتی معاملات تھے۔ فرزانہ کو ان کے بیچ میں بولنے کا حق نہیں تھا لیکن یہ کہنے کا تو حق تھا کہ جب وہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں تو برقعہ پہننا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم ہاتھ جوڑ کر مجھے جانی سے چھپنے کے لیے کیوں کہتی ہو؟

رخسانہ کی حرکتوں نے یہ تجسس پیدا کر دیا تھا کہ آخر وہ جانی اور جمشید کے درمیان کون سا کھیل کھیل رہی ہے؟ اگر وہ یہاں سے کنواری بن کر جا رہی ہے تو پاسپورٹ میں رخسانہ بیگم بنت فرید احمد لکھا ہو گا۔ کیا جانی نے پاسپورٹ نہیں دیکھا ہو گا؟ وہ اس حد تک تو انگریزی جانتا ہے کہ اپنا اور رخسانہ کا نام پڑھ سکے۔ وہ پوچھ سکتا ہے کہ رخسانہ بیگم زوجہ جانی کیوں نہیں لکھا گیا؟

اور اگر پاسپورٹ میں بادشاہ جانی کی شریک حیات کی حیثیت سے نام درج ہے تو ادھر جمشید پر بھید کھلے گا کہ وہ کنواری نہیں ہے۔ فرزانہ اس پاسپورٹ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی لیکن رخسانہ نے اسے اپنے کسی راز کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔

جب ایک عورت دوسری عورت کے سامنے ذرا پراسرار بن جائے تو دوسری عورت کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ وہ پہلی عورت کے اسرار جاننے کے لیے کھانا پینا اور سونا چھوڑ دیتی ہے۔ یہی فرزانہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ سوتے جاگتے یہ بات دماغ میں پکتی

رہتی تھی کہ جب ایک سہاگن کسی غیر مرد کے سامنے اپنے مرد کو چھپائے، اپنے طرز عمل
سے بن بیاہی بنی رہے تو اپنے آپ کو اچھوتی، بے داغ اور تر و تازہ بنا کر پیش کرنے والی
نیت ظاہر ہوتی ہے۔ رخسانہ ایسی ہی نیت لے کر گئی تھی تو اسے جانی کے سلسلے میں فرزانہ
کی نیت پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے شوہر کو کھوٹے سکے کی طرح پھینک
کر گئی تھی اور کہیں پڑے ہوئے سکے کو کوئی بھی اٹھا سکتا ہے۔

فرزانہ کا دعویٰ تھا کہ جانی میری دریافت ہے۔ پہلے میں نے اسے دیکھا، پہلے میں
نے اسے چاہا۔ یہ میرا حوصلہ ہے کہ میں نے اپنی محبت رخسانہ کے حوالے کر دی۔ اپنے
دل کو پتھر کر لیا۔ رخسانہ کی ازدواجی زندگی کو قائم اور خوش حال رکھنے کے لیے جانی کی
نظروں سے دور چلی گئی، سات پردوں میں چھپ گئی۔ محلہ چھوڑ دیا، ملک بھی چھوڑ دینا
چاہتی ہوں۔ آخر یہ سب کس لیے؟ اور کس کے لیے۔

پہلا سوال ہے کس لیے؟ تو جواب ہے، اس کے لیے کہ رخسانہ کے حالات نے جانی
کو اس کا شوہر بنا دیا تھا اس لیے میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ سوچا کہ وہ جانی کو ایک
عورت کا اعتماد دے گی۔ اس کی قدر کرے گی مگر وہ اپنے آدھے بے مروت چہرے
پر کنوارے پن کا لیبل لگا کر اس کی توہین کر رہی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ میں نے اتنی ساری قربانیاں کس لیے دی ہیں؟ اب اس کا
جواب میری سمجھ میں آتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ رخسانہ کے لیے نہیں، جانی کے لیے
کیا ہے اور اب رخسانہ جانی کی قدر نہیں کر رہی ہے۔ اسے شوہر کا صحیح مقام نہیں دے
رہی ہے تو میں اپنی محبت واپس لے لوں گی۔

یہ دستور ہے، کسی سے کوئی چیز لیتے ہو تو اسے سنبھال کر رکھو نہیں رکھ سکتے تو واپس
کر دو۔ تم جس کی قدر نہیں کرتے، دوسرے کو اس کی قدر کرنے دو۔ ایسا نہیں کرو گے تو
دینے والا جھلا کر اپنی چیز چھین لے گا۔

اور وہ جھلا کر ائرپورٹ پر آئی تھی۔ اس کی امی کو معلوم ہوتا تو وہ کبھی ادھر کا رخ نہ
کرنے دیتیں لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس کی امی موجود نہیں تھیں، دو دن کے لیے
سکھر گئی ہوئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اب وہ بے لگام ہو گئی
ہے، اپنی من مانی کر سکتی ہے، اپنے طور پر معلوم کر سکتی ہے کہ جانی کو اپنی بے قدری کا علم

ہوا ہے یا نہیں؟

وہاں کتنے مرد، عورتیں اور بچے اپنے اپنے عزیز و اقارب کو الوداع کہنے آئے تھے۔
فرزانہ نے اس بھیڑ میں ایک طرف کھڑے ہو کر جانی اور رخسانہ کو دیکھا۔ وہ ریلنگ کے
پاس ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوب رہے تھے۔ انہیں
آس پاس کا ہوش نہیں تھا۔ خصوصاً جانی سحرزدہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ رخسانہ کا جادو سر
چڑھ کر بول رہا تھا۔

فرزانہ مان گئی کہ وہ مرد کو اُلّو بنانا جانتی ہے۔ ادھر لندن والے کو بھی بنائے گی۔ جب
وہ طیارے کے اندر چلی گئی۔ تب بھی جانی بیٹے کو گود میں لیے محبت سے طیارے کی طرف
دیکھتا رہا۔ طیارے نے پرواز کی، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اسی طرح کچھ دیر تک بچے
کو سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ ایک بیوی کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ رخسانہ کے بدن کے
ایک ٹکڑے کو دل کی دھڑکنوں سے لگائے ہوئے تھا۔ فرزانہ کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ
کھلونا دے کر بہلایا گیا تھا۔

الوداع کہنے والوں کی بھیڑ چھٹ رہی تھی۔ وہ برقع میں لپٹی ہوئی عمارت کے اس
حصے میں آگئی جہاں سے سب لوگ گزر کر پارکنگ ایریا اور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہے
تھے۔ اب بچہ اپنی نانی کی گود میں تھا۔ نانا بھی ساتھ چلے آ رہے تھے۔ جانی سب سے پیچھے
تھا۔ سر جھکائے سوچ میں گم، بوجھل قدموں سے آ رہا تھا۔ جیسے سب کچھ لٹا کر آ رہا ہو جیسے
اپنے لٹنے کی خبر نہ ہو لیکن کسی اطلاع نے اسے چور چور کر دیا ہو۔

وہ تڑپ گئی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کے لیے، وہ اپنا دل، اپنی دنیا نچھاور
کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس لمحے خوف نے اسے جکڑ لیا۔ خبردار! وہ دیوانہ ہے۔ سرعام
رسوا کر کے رکھ دے گا۔ اس کی فطرت وحشیانہ ہے، دیکھتے ہی پٹائی شروع کر دے گا۔ وہ
محبت کے جنون میں بولے گا تو دنیا سنے گی۔ نفرت سے چیخے گا تو پھر ایک بار حوالات میں
پہنچ جائے گا۔

وہ سہم کر کھڑی رہی۔ اس کے سامنے سے رخسانہ کی امی ابو گزر رہے تھے۔ فرید
احمد ٹھوڑی کے نیچے کھجا رہے تھے اس لیے سر اٹھائے گزر گئے۔ رخسانہ کی امی بچے کو
سنبھالتے ہوئے گزر گئیں۔ کسی نے برقعے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اب جانی آ رہا تھا۔

اب جان جا رہی تھی۔ اب وہ گھڑی آ رہی تھی۔ جب سوہنی کچا گھڑا بن جاتی ہے۔ وہ فیصلے کا وقت تھا کہ عورت کی حیا برقعے میں ہوتی ہے یا زبان میں۔

برقعے میں ہوتی تو وہ اس کے سامنے نہ آتی جس کے لیے پہنا تھا۔

حیا کے مارے زبان نہیں کھلتی' اس لیے نہیں کھلی۔

جانی دھڑکتے ہوئے لمحوں میں ایک ایک قدم چلتا ہوا بالکل قریب آگیا۔ وہ دو گز کے فاصلے پر تھا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھا تو برقعے کے نقاب کے عین سامنے تھا۔ اب اگلا قدم اسے سامنے سے گزار دیتا مگر وہ خلاف توقع ٹھہر گیا۔

ادھر اس کے قدم رکے' ادھر اس کی سانس رکی۔

وہ کیسے رک گیا۔ محبت نے پکارا تو نہیں تھا۔ اگر وہ ٹریفک سگنل ہوتی تو آگے بڑھنے والا بادامی برقعے کو دیکھ کر رک جاتا۔ اگر وہ کالے برقعے میں تھی۔ پھر جانے والے کے پیروں میں زنجیر کیسے پڑ گئی۔

پردے کا بھرم تھا' وہ برقعے سے باہر نہیں آئی۔ حیا کا پاس تھا۔ اس نے زبان نہیں کھولی۔ ویسے ٹریفک سگنل کی زبان نہیں ہوتی۔ سگنل کا اشارہ بڑھنے والوں کو روکتا ہے اور جانی نظریں جھکائے برقعے والی کے قدموں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فرزانہ کے ہاتھ سے پھول چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ کوئی اور پھول ہوتا تو جانی گزر جاتا مگر وہ گلاب کا پھول تھا۔ جس کی مخملی پتیاں ہمیشہ اس کے دماغ کی پچھلی سیٹ پر خوشبو لٹاتی رہتی تھیں۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اس نے چور نظروں سے برقعے والی کو دیکھا' وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ جانی کے اندر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ اسے مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایک غیر عورت کو کسی بہانے سے کیا کہے؟ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا دماغ سمجھا رہا تھا۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جہاں گلاب ہو وہاں اس کی گلابوں والی بھی ہو۔ کسی عزت دار عورت سے بولو گے یا اسے بولنے پر مجبور کرو گے تو چاروں طرف سے جوتے پڑیں گے۔

اسے اسپتال کے اندر کتنے ہی جوتے' لاتیں اور گھونسے یاد آئے۔ حوالات کی آہنی سلاخیں نگاہوں کے سامنے آئیں۔ اس وقت اس نے سیاہ برقعے کے پیچھے ذرا دور

دیکھا۔ وہاں ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ ویسے محبت کا جنون تھانے تو کیا تختہ دار تک بھی پہنچا دیتا ہے۔ وہ بولے بغیر نہ رہ سکا "آ... آپ برا نہ مانیں ... یہ پھول.. پھول آپ کا ہے؟"

وہ انگلی سے فرش پر پڑے ہوئے پھول کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد وہ جانی کو مخاطب ہوتے دیکھ کر' اس کی آواز سن کر کتنے ہی جذبوں میں گرفتار ہو گئی۔ دل میں خوشی تھی' لبوں پر تبسم تھا۔ اور فطرت میں حیا تھی۔ وہ شرماتے لجاتے ہوئے دوسری طرف گھوم گئی۔

دوسری طرف کئی قدم کے فاصلے پر پولیس انسپکٹر تھا۔ جانی اس خوشی کو' لبوں کے تبسم کو اور شرمیلی محبوبہ کو برقعے کے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ قانون کے محافظوں کو دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ برقعے والی پولیس والوں کو بلانا چاہتی ہو۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا ٹیکسی کی طرف جانے لگا۔ فرزانہ نے گھوم کر حیرانی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نہ سمجھ سکی کہ جانی نے بات چھیڑی مگر پھر چھیڑ کر کیوں چلا گیا؟

بعض باتیں آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں مگر دکھائی نہیں دیتیں۔ جانی اس کی شرمیلی اداؤں کو نہ دیکھ سکا' نہ سمجھ سکا اور فرزانہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کیا غلطی کی تھی' وہ تعجب سے سوچتی ہی رہ گئی۔

وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھنے لگا۔ اس کی ساس نے کہا "بیٹا کہاں رہ گئے تھے؟ ہم کب سے انتظار کر رہے ہیں؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گاڑی کو اسٹارٹ کیا پھر اسے آگے بڑھانے سے پہلے عقب نما آئینے کو درست کرتے ہوئے ایک طرف ذرا گھمایا۔ اسی وقت آئینے میں برقعے والی کا عکس اتر آیا۔ اب وہ پارکنگ ایریے کے قریب کھڑی ہوئی جانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کا ہاتھ آئینے پر سختی سے جم گیا۔ دل نے دھڑک دھڑک کر کہا "وہ فرزانہ ہے' مجھے دیکھ رہی ہے' مجھے اس کے پاس جانا چاہیے۔"

پچھلی سیٹ کی طرف سے عقب نما آئینے کا زاویہ کچھ اور تھا۔ وہاں سے برقع نظر نہیں آ رہا تھا۔ ساس نے بڑے پیار سے پوچھا "بیٹا' آئینے میں کب تک دیکھتے رہو گے؟

گاڑی چلاؤ۔"

وہ ناگواری سے بولا "کیا بیٹی کے جاتے ہی آپ نے جاسوسی شروع کردی۔ میں آئینے میں کسی کو بھی دیکھوں' آپ پوچھنے والی کون ہوتی ہیں؟"

فرید احمد نے کہا "بیگم! جب تم دونوں کی بنتی نہیں ہے تو اپنی زبان بند رکھا کرو۔" پھر اس نے داماد کو پچکارتے ہوئے کہا "بیٹے آئینہ دیکھ رہے ہو تو کنگھی بھی کرلو۔"

جانی انجن بند کرکے گاڑی سے باہر آگیا۔ برقعے والی کے پاس جانے کا ارادہ تھا۔ اتنی دیر میں وہ پولیس انسپکٹر پھر دیوار بن گیا۔ وہ برقعے والی سے باتیں کر رہا تھا۔ جانی بے بسی سے ادھر دیکھنے لگا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ انسپکٹر کے ساتھ جانے لگی۔

انسپکٹر نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "آپ درست کہتی ہیں۔ یہ رکشے ٹیکسی والے ایئرپورٹ میں تگڑی سواریوں کے لیے آتے ہیں۔ غیر ملکیوں کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ان سے منہ مانگا کرایہ ملتا ہے۔"

فرزانہ نے کہا "میں اسی لیے اتنی دیر سے کھڑی ہوں۔ میٹر سے کچھ [illegible] تیار ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ رکشے والے کا تو باپ بھی جائے گا۔ اے ادھر آؤ۔"

اس نے ایک رکشے والے کو آواز دی۔ آٹو رکشا فوراً قریب آگیا۔ انسپکٹر نے حکم دیا "خاتون کو لے جاؤ اور میٹر آن کرو۔ ایک پیسہ زیادہ نہ لینا۔"

فرزانہ انسپکٹر کی نظروں میں مشکوک بننا نہیں چاہتی تھی۔ مجبوراً اسے رکشے میں بیٹھنا پڑا۔ ادھر جانی نے فوراً بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ گیئر بدل کر اسے آگے بڑھایا۔ آٹو رکشا اس کے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے جانے کے لیے ٹیکسی کو انسپکٹر کے پاس سے گزرنا پڑا اس نے ہاتھ اٹھا کر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔

جانی نے دانت پیس کر سوچا کم بخت ایسے وقت کیوں روک رہا ہے؟ کیوں نہ اس کی پروا کیے بغیر گاڑی کو بھگانا شروع کردوں۔

لیکن برسوں سے گاڑی چلانے کا یہ تجربہ تھا کہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے طوعاً و کرہاً گاڑی روک دی۔ انسپکٹر نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے پوچھا "کیا تم لوگ یہاں مسافروں کو لوٹنے آتے ہو؟"

جانی نے حیرانی سے پوچھا "جناب! میرا کیا قصور ہے؟"

"قصور کے بچے! میٹر آن کیوں نہیں کیا؟ کیا سواری سے ڈبل کرایہ لوگے؟"

فرید احمد نے جلدی سے کہا "انسپکٹر! یہ ہماری اپنی گاڑی ہے۔ میٹر آن کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اوہ اچھا جائیے۔"

جانی نے کہا "سوچے سمجھے بغیر قصور کا بچہ کہنے کے بعد پھر سوچتے کہ بچہ کون ہے؟"

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ سمجھتا' کچھ بولتا جانی نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی پھر رفتار تیز کرتا چلا گیا۔ اسٹار گیٹ کے دوراہے پر رک کر دیکھنے لگا۔ ایک راستہ لانڈھی کی طرف اور دوسرا سوسائٹی اور صدر کی طرف جاتا ہے۔ دونوں طرف دور تک کئی آٹو رکشا نظر آئے۔ وہ ڈرگ روڈ پر چل پڑا۔ ٹیکسی کی رفتار بڑھاتا گیا۔ کتنے ہی رکشوں کو اوورٹیک کرتے وقت پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتا گیا۔ وہ برقعے والی کسی رکشے میں نظر نہیں آرہی تھی۔

وہ جھلا کر بڑبڑایا "کمبخت چلی گئی۔ لعنت ہے۔"

ساس نے کہا "اے وہ گئی ہے تو جلدی واپس آئے گی۔ خود ہی رخصت کرکے آرہے ہو۔ خود ہی لعنت بھیج رہے ہو۔"

وہ چیخ کر بولا "بکواس مت کرو۔"

گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی۔ اس نے پیچھے گھوم کر کہا "چلو گاڑی سے اترو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے تمہاری جیسی عورت کو تمہارا میاں ہی برداشت کرسکتا ہے۔"

فرید احمد نے کہا "میں برداشت کرہی رہا ہوں مگر ہمیں گاڑی سے نہ اتارو۔ ذرا اپنے بیٹے کو دیکھو ہم اس ننھے کو لے کر کب تک کسی دوسری گاڑی کے انتظار میں کھڑے رہیں گے۔"

جانی نے اپنے بیٹے کو دیکھا کچھ سوچا پھر انجن کو بند کردیا۔ فرید احمد نے پوچھا "گاڑی کیوں بند کردی؟"

"خراب ہوگئی ہے دھکا لگانا ہوگا۔"

دھکا لگاؤ۔"

ساس نے کہا "میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس رات کی طرح تم ہمیں چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔"

"تم سے شیطان بھی نہیں بھاگ سکتا۔ میں کہاں بھاگ کر جاؤں گا۔ چلو اترو۔"

"جانی، ہمیں گھر پہنچا دو۔ نہیں تو میں بچے کو لے کر اتر جاؤں گی۔"

فرید احمد خوشامدیں کرنے لگا۔ اسی وقت بچے نے رونا شروع کر دیا۔ محترمہ کو ایک تدبیر سوجھی، انہوں نے کہا "کیا مصیبت ہے۔ فیڈر کا سارا دودھ ختم ہو گیا ہے۔ گھر جلدی نہ پہنچے تو یہ بھوک سے بلکتا ہی رہے گا۔"

جانی نے بے بسی سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ شکست خوردہ انداز سے ایک گہری سانس لی پھر انجن کو اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دل سے آہ نکل رہی تھی۔ آہ! بجلی بھی بادلوں میں یوں نہ چھپتی ہو گی۔ جیسے تم جھلک دکھا کر چھپ جاتی ہو۔ فرزانہ نہ چھپو میری ہائے تم پر پڑے گی آ جاؤ۔

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے کھڑکی کے باہر گزرنے والے کسی رکشے کو دیکھ لیتا تھا۔ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ بے چینی سے سیٹ پر پہلو بدلنے لگا۔ "دراصل میں اُلو کا پٹھا ہوں۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہی ہے۔ برقع بدل گیا ہے۔ ٹھیک ہے اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا، مجھ سے منہ پھیر لیا۔ شاید ناراض ہو گی۔ شاید ادا ہو گی مگر میرے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ میں سچ مچ ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ راستے کو پہچانتا ہوں مسافروں کو پہچاننا نہیں آتا۔"

اس کے اندر بے چینی تھی۔ اسے چھپنے والی سے شکایت تھی۔ اپنی بدقسمتی اور محرومی پر غصہ آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کسی رکشے سے ٹیکسی کو ٹکرا دے۔ دنیا والوں کو کیا معلوم کہ یہ ڈرائیور لوگ محرومیوں کے کچے راستوں سے گزرتے ہیں۔ جھنجلاہٹوں کے کچے راستوں پر چلے جاتے ہیں۔ وہ گیئر بدل کر احساس برتری کے اونچے راستے پر آتے ہیں پھر وہ راستہ انہیں احساس کمتری کے نشیب میں اتار دیتا ہے۔ یہ لوگ انسان کی حیثیت سے پہچانے نہیں جاتے۔ ہر اسٹاپ، ہر راستے اور ہر گلی کے لوگ انہیں گاڑی کھینچنے والی کوئی مخلوق سمجھتے ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ ڈرائیور کہیں باہر

سے نہیں آتے۔ ہمارے ہی درمیان ہمارے معاشرے اور ماحول میں رہ کر نفسیاتی مریض بنتے ہیں اور اپنے پرائے کو حادثوں تک پہنچاتے ہیں۔

وہ انتقاماً کسی رکشے سے ٹیکسی کو ٹکرا دینا چاہتا تھا۔ اپنے نقصان کی پروا نہیں تھی۔ پیچھے بیٹھا ہوا سسر مر جائے، وہ عورت بھی مر جائے جو کبھی ماں نہ بن سکی۔ ہمیشہ ساس کی طرح سازشی رہی۔ بچہ بھوک سے رونے لگا۔ وہ پچھلی سیٹ پر نانی کی گود میں رو رہا تھا لیکن اس کی آواز جانی کے اندر سے اٹھ رہی تھی۔ وہ پھر بے چین ہو گیا کیونکہ وہ باہر سے کسی حادثے کا ملزم ہو سکتا تھا۔ اندر اپنی محبت کو کسی سے ٹکرا نہیں سکتا تھا۔

انتقامی جذبہ دھواں بن کر اڑ گیا۔ بچے کو جلد سے جلد گھر پہنچانا تھا۔ بچہ ہو یا بوڑھا زندگی کو دودھ پلانا تھا۔ ہر آدمی اپنے اندر ایک ضدی بچہ رکھتا ہے۔ کامران کی آنسو بھری آواز نے محبت کا جھنجنا بجایا تو جانی ایک بچے کی طرح ضد بھول کر بہل گیا۔

ویسے یہ اندر کی تبدیلی تھی۔ ایک نفسیاتی مریض کو صرف اپنے اندر سے اور اپنے گھر سے ہی نہیں بلکہ باہر سے بھی محبت ملنی چاہیے۔ ابھی جانی کی بے چینی نہیں گئی تھی۔ باہر سے انسپکٹر اسے قصور کا بچہ کہہ رہا تھا۔ ساس اس پر بھونک رہی تھی۔ بیوی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ محبوبہ چرکے لگا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اسے رخسانہ کی ایک بات یاد آ گئی۔

ایک بار رخسانہ نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا تھا "جانی! جانی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجلایا نہ کرو۔ یہ سوچو کہ تم راستوں کی چھوٹی چھوٹی سی ٹوٹ پھوٹ سے کس طرح کترا کر اپنی گاڑی کو حفاظت سے نکال لے جاتے ہو۔ اسے اچھے راستے پر چلاتے ہو۔ اسی طرح الجھانے والی باتوں سے کترا جایا کرو۔ اپنے دماغ کو سوچنے کے لیے کسی اچھے راستے پر لگا دو۔"

جانی! انسان ہو، کسی انسان کو معاف کرنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ یہ سب سے بڑی انسانی دلیری ہے۔

ڈرائیور ہو سواری کو حادثے سے بچا کر منزل تک پہنچاؤ۔ سمجھو کہ سواری محترم ہوتی ہے۔

تم صاحب بصیرت ہو گے تو جھنجلاہٹ کبھی قریب نہیں آئے گی اور اگر صاحب

بصارت ہو تو اپنی آنکھ کے سامنے کسی بھی معمولی پھیکے سے نظارے میں حسن تلاش کرو۔ پتا چلے گا کہ حسن ہر جگہ ہے صرف حسن نظر چاہیے۔

اپنی جھنجلاہٹ کو ختم کرنے کی ایک اور تدبیر ہے۔ تم کسی بھی خوب صورت چیز کا تصور کرو اور اس خوب صورتی سے خود کو منسوب کرتے رہو' ہاں کرو۔ کسی خوب صورتی کا تصور کرو اور خود کو اس سے وابستہ کر دو جانی!

رخسانہ کی باتیں یاد آتے ہی جانی نے اس کا تصور کیا مگر آدھا چہرہ تھا۔ خوب صورتی کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔

پھر ایک تصور میں فرزانہ کو دیکھا مگر اس کی صورت ذرا دھندلا گئی تھی۔ اسے دیکھے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ رخسانہ کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں جھانکتے رہنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ اب کوئی عکس مکمل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ فرزانہ کا تصور ٹوٹتا نہیں تھا۔ دھندلا جاتا تھا۔

تب اسے گلاب کا پھول یاد آیا۔ دور تک دماغ کی سیج پر پنکھڑیاں بکھر گئیں۔ پھول کی خوب صورتی سے جیسے اس کا ازلی رشتہ تھا۔ اس کی بے چینی اور جھنجلاہٹ ختم ہونے لگی۔ گلاب کی پتیاں معطر معطر یادوں کو ڈھونڈ کر لانے لگیں۔ وہ بے اختیار مسکراتا اور گنگناتا ہوا ناظم آباد والے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔

ساس اور سسر گاڑی سے اتر گئے۔ اس نے باہر آ کر بیٹے کو گود میں لیا' اسے پیار کیا۔ فرید احمد نے کہا "اندر چلو' اب رات کا کھانا کھا کر جانا۔"

وہ نرمی سے بولا "آج نہیں' کل سے تینوں وقت کھایا کروں گا۔"

پھر اس نے بچے کو چوم کر ساس کی گود میں دیتے ہوئے کہا "امی میں بہت نالائق ہوں۔ میں نے راستے میں بدتمیزی کی ہے' مجھے معاف کر دیجئے۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پھر جبراً مسکراتے ہوئے بولیں "میں نے معاف کیا' میرے خدا نے معاف کیا۔ تم بہت اچھے ہو۔"

وہ پھر بچے کو چومنے کے لیے جھکا تو ساس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں اور پھر دعائیں دیتی چلی گئیں۔ جانی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ پھر بھی وہ کچھ پڑھ پڑھ کر ادھر پھونکتی رہیں۔ فرید احمد نے کہا "بس کرو' محلے والے جمع ہو جائیں گے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں "یہ لڑکا سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک منٹ میں گاڑی سے اتار رہا تھا' ایک منٹ میں مسکراتے گنگناتے ہوئے یہاں پہنچا دیا۔ کبھی آنکھیں دکھاتا ہے' کبھی سر جھکا کر دعائیں لیتا ہے۔ کبھی تم کہتا ہے' کبھی آپ کہتا ہے' ضرور اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔"

"ضرور۔" فرید احمد نے اپنی بیگم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا "میرا تجربہ بھی یہی کہتا ہے' اندر چلو۔"

وہ پلٹ کر مکان کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

جانی نے ایک سواری کو کریم آباد پہنچایا۔ دوسری سواری کو صدر لے گیا۔ آج وہ گاڑی نہیں چلانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف فرزانہ پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے سوچا' کوئی سواری سخی حسن کی طرف جانے والی ہوگی تو اسی بہانے گھر پہنچ کر گاڑی بند کر دے گا لیکن صدر میں نثار ڈرائیور مل گیا۔ اس نے پوچھا "کیا اپنی گھر والی کو رخصت کر دیا؟"

"ہاں یار! اس کے جانے کے بعد کچھ خالی خالی سا لگ رہا ہوں۔"

"چلو میرے ساتھ' آج ہم تنہائی کا غم غلط کریں گے۔"

وہ گرومندر کے شراب خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ نثار نے دو گلاس اور ایک اَدھا لانے کو کہا۔ جانی نے پوچھا "سنا ہے تیری بیوی چلی گئی ہے؟"

نثار نے پوچھا "تم یہ بتاؤ عورت کو کیا سمجھتے ہو؟"

جانی نے کچھ سوچ کر کہا "عورت مل جائے تو اسے اپنے پیچھے بھگاتے ہیں۔ نہ ملے تو ہم اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔"

"یہ تو ہم مردوں کی بات ہوئی' میں عورت کی بات پوچھ رہا ہوں۔"

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' دو ہی عورتوں کو دیکھا ہے۔ ایک وہ جسے اب تک نہ پا سکا اور دوسری وہ جسے پا چکا ہوں۔"

گلاس آ گئے' بوتلیں کھل گئیں۔ شراب اور سوڈے کی آمیزش سے گلاس بھر گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی' وہ اپنی اپنی جگہ سوچتے ہوئے پیتے رہے۔ پھر نثار نے کہا "میں سیدھی سی بات پوچھتا ہوں' کیا اپنی گھر والی پر بھروسا کرنا چاہیے؟"

جانی نے گلاس خالی کیا پھر دوبارہ اسے بھرتے ہوئے کہا "بے شک! میری بیوی اتنی

سمجھ دار' اتنی وفادار ہے کہ میں آنکھ بند کر کے اس پر بھروسا کرتا ہوں۔"

"یہی تو ہماری حماقت ہے۔ ہم آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے ہیں۔ آخر میں ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

جانی کو یوں لگا جیسے یہ بات رخسانہ کے خلاف بولی جارہی ہو۔ اس نے ناگواری سے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

وہ سر جھکا کر بڑے دکھ سے بولا "جانی! تم نے ٹھیک سنا ہے' میری بیوی کہیں چلی گئی ہے۔"

"تمہارا قصور ہوگا۔"

"نہیں' میں اسے اچھا کھلاتا تھا' اچھا پہناتا تھا۔ اس کا ہر شوق پورا کرتا تھا مگر عورت ذات حسین ہو تو اپنے مرد سے تعریفیں سن کر مطمئن نہیں ہوتی۔ چاہتی ہے کہ دوسرے بھی تعریفیں کریں۔ کوئی اس کی تعریف کرتا کرتا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔"

"خدا کا شکر ہے' میری رخسانہ ایسی نہیں ہے۔"

اس نے گلاس کو منہ سے لگایا۔ نثار نے کہا "میں ایسی بیویوں کی بات کررہا ہوں جو حسین ہوتی ہیں۔"

جانی نے ایک جھٹکے سے گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے پوچھا "کیا میری رخسانہ حسین نہیں ہے؟ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

"چھوڑو یار' ہمیں لڑائی جھگڑے والی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"تم میری بیوی کی بے عزتی کرکے بولتے ہو کہ چھوڑو۔ کیوں چھوڑو کیا اس لیے کہ تم مجھے پلا رہے ہو؟"

اس نے جیب سے ایک دس اور پانچ کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا "یہ تمہارے اَدھے کی قیمت ہے۔ اب میری رخسانہ کے خلاف بول کر دکھاؤ۔"

اس کے دانت پر دانت جمے ہوئے تھے۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ جیسے گھونسا مارنے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ نثار نے اپنی پیشانی پر ہاتھ لے جاکر سلام کرتے ہوئے کہا "مجھے معاف کرو میرے باپ! میں کہنا کچھ چاہتا تھا کہہ کچھ اور گیا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"وہ.... یہ... یہ... کہ ہماری بھابی صاحبہ بے شک حسین ہیں مگر ابھی تو آدھی ہیں پوری بننے گئی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے' وہ مکمل حسین بن کر تیری حسین بیوی کی طرح بے وفائی کرے گی۔ کیا دنیا کی تمام حسین عورتیں بے وفا ہوتی ہیں؟"

"خدایا میں کہاں پھنس گیا؟ جانی! تجھے تیری بیوی سے سچا پیار ہے۔ تجھے تیری بیوی کی' تیرے پیار کی قسم مجھے معاف کردے۔ جھگڑا ختم کردے۔ ہم دوسری بات کریں گے۔"

جانی نے دوسرا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا "کوئی دوسری بات نہیں ہوگی۔ رخسانہ مجھے چھوڑ کر گئی ہے اور تم مجھے بہکا رہے ہو۔"

وہ تیسری بار گلاس بھرنے لگا۔ نثار نے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک دم سے چونک کر کہا "ارے میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ آج میں نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا تھا اس کی ایک ساتھی اسے فرزانہ کہہ رہی تھی۔"

"فرزانہ؟" وہ گھور کر بولا "اس کا نام مت لو میرے سامنے۔"

وہ غٹا غٹ پینے لگا۔ نثار نے پریشان ہو کر پوچھا "مگر تم تو اس کے پیچھے بھاگتے ہو؟"

"آج سے بھاگنا بند۔ اے موٹو ایک اَدھا اور لاؤ۔" وہ مکرانی سے بولا "اور وہ مسالے دار جھینگے بھی لاؤ۔ ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟"

نثار نے کہا "میں کہہ رہا تھا آج میں نے فرزانہ کو....

"دیکھا ہے۔" جانی نے بات پوری کی "میں نے بھی دیکھا ہے۔ میں جب بھی دیکھتا ہوں' وہ دن میں تارے دکھا کر چلی جاتی ہے۔ میں اس کو بہت تگڑی سی گالی دینا چاہتا ہوں مگر دیکھو گالی دینا بری بات ہے۔ ہم اس زبان سے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ شراب بھی نہیں پینا چاہیے۔ میں گھر جاکر کلی کرلوں گا۔"

ایک اَدھا اور آگیا۔ نثار نے بل ادا کرتے ہوئے کہا "جانی بس کر تجھے نشہ ہو رہا ہے۔"

جانی نے ہنستے ہوئے کہا "نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل۔ جب بوتل نہیں ناچتی

ہے تو کیا میں تجھے ناچتا ہوا نظر آرہا ہوں؟"

اس نے بوتل کھولی پھر میز پر جھک کر گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے نثار کو اشارہ کیا۔ اپنی طرف بلایا۔ نثار میز پر اس کی طرف جھک گیا۔ جانی نے کہا "مجھے فرزانہ سے نفرت ہے۔ میں نہیں پوچھوں گا کہ تم نے اسے کہاں دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" نثار سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ جانی نے کئی گھونٹ پینے کے بعد آستین سے منہ پونچھا پھر میز پر جھک کر "شش شش" کہتے ہوئے اشارے سے نثار کو قریب بلایا۔ نثار نے اس کی طرف جھک کر کہا "ہاں بولو۔"

"میں نہیں بولوں گا۔" جانی نے رازدارانہ انداز میں دھیرے سے کہا "تم بولتے جاؤ' اسے کہاں دیکھا تھا۔ میں بالکل نہیں سنوں گا' مجھے اس سے نفرت ہے مگر تم کو تو نفرت نہیں ہے' تم بول سکتے ہو۔ قسم سے میں نہیں سنوں گا۔"

"یار بس کرو۔ بوتل رکھ لو۔ گھر جا کے پی لینا۔"

اس نے چوتھا گلاس خالی کردیا۔ نثار نے گھبرا کر کہا "باپ رے' تم آدمی ہو یا کنستر؟ بھرتے چلے جا رہے ہو۔"

"میں نے نے کہا تا کہ اس کی بات کرو جو ستاتی ہے بھگاتی ہے تم بولو' میں کان بند کرلوں گا۔"

اس نے ایک ہاتھ سے ایک کان کو بند کرلیا۔ دوسرا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھایا۔ نثار نے جھپٹ کر بوتل کو اٹھالیا پھر اسے بند کرتے ہوئے کہا "یہاں سے چلو میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کی بات کروں گا۔"

"چلو۔" وہ جھومتے ہوئے اٹھ گیا۔ نثار کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈگمگاتے ہوئے باہر آیا۔ مکرانی جھینگے لے کر آرہا تھا۔ جانی نے بہکتے ہوئے ہاتھ سے پانچ کا نوٹ نکال کر مکرانی کے سر پر نچھاور کرتے ہوئے کہا "یہ پیسے لو اور جھینگے اپنے باپ کو کھلا دو۔"

نثار اسے کھینچتے ہوئے ٹیکسی کے دروازے تک لایا۔ "یار تھوڑا لیموں چوس لے نشہ اتر جائے گا۔"

جانی نے اس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اسے دھکا دیا۔ پھر دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نثار نے کہا "تم اس حالت میں گاڑی چلاؤ گے اور میں بیٹھوں گا۔ ابھی

مجھے مرنا نہیں ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میرے پیچھے بیٹھ کر اس کی بات کرو۔ میں نہیں سنوں گا گاڑی چلاتا رہوں گا۔"

نثار نے پہلے اگلے دروازے کو بند کیا۔ کچھ سوچتا ہوا پچھلے دروازے کے پاس آیا۔ اسے اپنی جان پیاری تھی۔ اس نے پچھلے دروازے کو کھولا پھر زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا۔ جانی نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی پھر دھیرے دھیرے رفتار بڑھانے لگا۔

ٹیکسی کے اندر خاموشی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ اس کے کان نثار کی زبان سے فرزانہ کا ذکر سننے کے منتظر تھے مگر ٹیکسی میں خاموشی طاری تھی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ بولا "تم اس قدر دھیمی آواز میں کیوں بول رہے ہو۔ زور سے بولو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نہیں سنوں گا۔"

گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اور اسے ونڈ اسکرین کے پار فرزانہ کا دھندلا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تصور سے بہلنے لگا تھا۔ نثار کو بھولنے لگا۔ جسے بھولنا چاہا تھا' اسے یاد کرنے لگا۔ محبت کبھی چڑیل بن جاتی ہے' یادوں کے تیز ناخنوں سے نوچنے کھسوٹنے لگتی ہے۔

وہ بڑبڑانے لگا "دیکھ فرزانہ! آجا بہت ہوگیا۔ موت ایک بار آتی ہے۔ تو بار بار آکے مارتی ہے۔ کیا دشمنی ہے مجھ سے؟ زندگی ایک بار ملتی ہے تو ایک بار بھی نہیں ملتی کیسی دوستی ہے مجھ سے؟"

اس کے کانوں میں فرزانہ کی ہنسی گنگنائی۔ پہلی بار جب وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ تب جانی نے وہ ہنسی سنی تھی۔ آج جیسے وہ صدیوں کے بعد پھر اپنی ہنسی کا ترنم سنا رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی گاڑی کو سڑک کے کنارے روک کے پیچھے دیکھا۔

پچھلی سیٹ انتظار بھری آنکھوں کی طرح اس کے جلوے سے خالی تھی۔ نہ پھولوں کی پتیاں تھیں' نہ ہنسی نہ خوشبو۔ بس ایک ستانے والا خیال تھا۔ اس نے بوتل کھول کر منہ کو لگالی۔

کتنا ہی وقت گزر گیا جب وہ اپنے گھر کے احاطے میں پہنچا تو ہوش میں نہیں تھا۔

شرابی خواہ کتنا ہی مدہوش ہو' وہ اپنے گھر تک ضرور پہنچتا ہے۔ دوسری صبح نشہ اترنے کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں کہاں سے گزرتا ہوا کیسے اپنے بستر تک پہنچ گیا تھا۔ جب وہ ٹیکسی سے باہر آیا تو زمین پر پاؤں جما کر کھڑے رہنے کے قابل نہیں تھا۔ تھوڑی دیر تک کھلے ہوئے دروازے کا سہارا لیے کھڑا رہا۔

مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ کئی بار گرتے گرتے سنبھلتا ہوا برآمدے کے زینے تک پہنچا۔ آگے راہداری کے ایک طرف کمرا تھا۔ دوسری طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ وہیں ایک دیوار کے ساتھ ایک پرچھائیں تھی اور جیسے اس پرچھائیں کے بدن سے گلاب کی خوشبو پھوٹ کر جانی کی طرف آرہی تھی۔

وہ برآمدے میں پہنچ گیا۔ شراب کی بدبو اتنی تیز تھی کہ وہ خوشبو کو سونگھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ دیوار کے سہارے آگے بڑھتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس کی زبان چپ نہیں تھی۔ وہ بول رہا تھا اور خود نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس نے چابی کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا' ذرا ڈگمگایا' ذرا بڑبڑایا پھر چابی نکال لی۔ تالا نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک ہاتھ سے ٹٹول کر کسی طرح تالے کو بھی پکڑ لیا مگر چابی والا ہاتھ بہکنے لگا۔

اس نے کئی بار کوشش کی' چابی تالے میں نہیں جارہی تھی۔ اس نے اندھیرے میں چابی کو گھورتے ہوئے کہا "الو کی پٹھی! نشہ ہو رہا ہے' بہک رہی ہے۔"

اچانک ہی دو ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ وہ نرم نرم گرم گرم ہاتھ تھے' دست گل کی طرح ملائم تھے۔ وہ بڑبڑایا "کون ہے؟ ایں؟"

ان ہاتھوں نے چابی لے لی۔ تاریکی میں اسے سہارا دے کر دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ تالا کھل گیا پھر دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ ہاتھ نچاتے ہوئے تاریکی کو دیکھتے ہوئے بولا "ارے تم بھی آگئی ہو اب میں الو نہیں بنوں گا۔ بھاگنے سے پہلے پکڑ لوں گا۔"

وہ پکڑنے سے پہلے دونوں ہاتھ بڑھا کر آگے آیا اور لڑکھڑاتا ہوا کھلے ہوئے دروازے سے اندر پہنچ گیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ کمرا روشن ہو گیا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اس نے پہلے آنکھیں بند کیں پھر پلٹ کر آدھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ فریب دینے والی نظر آرہی تھی اور وہ فریب نظر بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے سر کو جھٹکا۔ جیسے خیالوں میں آنے والی کو دماغ سے نکال رہا ہو۔ اس نے آنکھیں مل مل کر خواب اور حقیقت کو سمجھنا چاہا۔ نشے میں سمجھنے والی عقل کہاں ہوتی ہے؟ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "اے سچی بتاؤ' تم میرے سامنے ہو؟"

اس نے جواباً ہاں کے انداز میں سر کو ہلایا۔

وہ گھونسا دکھا کر بولا "جھوٹ بولتی ہو۔ اگر تم ہو تو برقع کہاں ہے؟"

"چاند بادل میں' خوشبو پھول میں اور محبت برقعے میں چھپ کر نہیں رہ سکتی۔"

وہ ڈگمگاتے ہوئے دروازے کے پاس آیا۔ ایک دھڑاکے سے اس کے دونوں پٹ بند کیے۔ بہکتے ہوئے ہاتھ سے چٹخنی چڑھائی پھر پلٹ کر دروازے سے لگ کر بولا "میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا۔"

وہ آگے بڑھ کر لڑکھڑایا "میں تمہیں چھو کر دیکھوں گا۔"

گورا گورا گلابی ہاتھ سوئچ بورڈ کی طرف گیا۔ یک بیک کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ وہ ہڑبڑا کر بولا "اے بھاگ رہی ہے خبردار' جانے نہ پائے۔"

وہ پلٹ کر دروازے کی طرف گیا۔ کچھ زیادہ ہی پلٹ گیا۔ اندھیرے میں دروازہ نہیں ملا' وہ مل گئی۔ جیسے چور کو پکڑتے ہیں' ویسے ہی جانی نے اسے جکڑ لیا۔ اسے دونوں ہاتھوں سے پا کر دونوں ہاتھوں سے ڈھونڈنے لگا۔ وہ بار بار اس کے ہاتھوں کو پکڑنے لگی۔ جو فراق نصیبی کا صور پھونکتی رہی تھی وہ سرگوشی کے سر پھونکنے لگی۔ "جانی! میں نہیں جاؤں گی۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں اندھیروں سے نکالنے آئی ہوں۔"

"اندھیرا کر کے بولتی ہو نکالنی آئی ہو۔ میں تم کو نکلنے نہیں دوں گا۔ تمہارا منہ کدھر ہے' ہاں یہ ادھر ہے۔ اس کو برقعے میں چھپاتی تھیں' اب بھی چھپا رہی ہو۔ یہ برقع کتنا کالا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اے منہ کھولو......"

وہ منہ کھولنا چاہتی تھی' کچھ بولنا چاہتی تھی۔ بول نہ سکی شراب کی بو اتنی تیز' اتنی سنگدل تھی کہ بولنے کی سکت مجروح ہو رہی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے کانپتے ہوئے بڑی مشکلوں سے سانسوں کو درست کرتے ہوئے بولی "میں تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اندھیرا بھی مصیبت بن گیا ہے۔"

"میں مصیبت نہیں ہوں' تم مصیبت ہو۔ مل کے بھی نظر نہیں آتی ہو۔ ابھی ہوتی

ہو' ابھی نہیں ہوتی ہو۔ کہاں ہو؟ پھر کہاں چلی گئیں؟"

وہ پھر گم ہوگئی۔ وہ تلاش میں بھٹکنے لگا۔ تاریکی میں در و دیوار ٹکرانے لگا۔ کیا وہ چھلاوا تھی؟ چھل دے گئی۔ کیا شعبدہ باز تھی۔ اندھی قربت کے شعبدے دکھا گئی یا چٹکی بھر وصال تھی اندھیرے میں جگنو کی طرح جل بجھی تھی۔

پھر کلک کی آواز ہوئی اور کمرا روشن ہوگیا۔ جانی نے آنکھیں میچ کر ذرا سا کھولیں' وہ سوئچ بورڈ کے پاس نظر آئی۔ نظارہ بہ ہوش و حواس تھا' یہ مدہوشی اسے جگہ جگہ دکھا رہی تھی۔ جانی کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ جھومتے ہوئے بولا "تم سمجھتی ہو' میں نشے میں ہوں' نہیں' ہرگز نہیں میں ہوش میں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ تم نہیں ہو۔ بجلی جاتی ہے تو اندھیرا' بجلی آتی ہے تو اجالا۔ تم اندھیرا بھی نہیں ہو' اجالا بھی نہیں ہو۔ آنکھ کا دھوکا بن کر آتی ہو۔ بھاگ جاؤ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا....."

وہ اس کی طرف سے پلٹ کر بری طرح لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ یوں گرا کہ آدھا بستر پر پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کبھی وہ کراہ رہا تھا' کبھی کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ قریب آگئی۔ بستر کے سرے پر جھک کر بولی "شراب تمہیں بہکا رہی ہے' بیوی تمہیں بھٹکا رہی ہے۔ تم کب ہوش میں آؤ گے۔ مجھے بتاؤ' یہ نشہ کتنی دیر میں اترے گا۔ میں صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔ جانے سے پہلے تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے تمہارے اس گھر کو رخسانہ کے ساتھ بسایا تھا۔ میں نے دھوکا دے کر بسایا۔ پھر بھی نیکی کی۔ مگر بسے ہوئے گھر کو گھر والی اجاڑ رہی ہے۔ اور میری نیکی برباد کر رہی ہے۔"

وہ پاس بیٹھ کر اسے جھنجوڑنے لگی "کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟ خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ مجھے ایسا چیلنج کر رہا ہے کہ میں لڑکی ہو کر تن تنہا اتنی رات کو آگئی ہوں۔ بلا سے میں بے حیا' بدچلن کہلاؤں۔ وہ تمہیں دھوکا دے کر جانی والی تم سے صرف رشتے کا بھرم رکھتی ہے۔ میں اپنے ضمیر کی شرم رکھنے آئی ہوں' میری بات سنو' ہوش میں آؤ۔"

اس کے جسم میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تیز روشنی میں دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ آنکھیں خمار سے بوجھل تھیں' بند ہونے لگیں۔ اس کے کانوں

میں آواز آئی "جانی! میں یہاں ہوں۔ ادھر دیکھو۔"

وہ کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھا' سر کو اوپر اٹھایا۔ جیسے آنے والی آواز کو آسمان سے اترتے سن رہا ہو۔ "اللہ! میرے اللہ وہ ملتی نہیں ہے تو اس کی آواز کیوں سنائی دیتی ہے؟ تو مجھے مار دے' اس کی آواز مر جائے گی۔"

اس کے لہجے میں ایسا کرب تھا' ایسی تڑپ تھی کہ وہ سن کر تڑپ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تم پر ظلم کیا ہے' مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ رخسانہ سے نیکی کروں گی تو تم سے برائی ہوگی' اٹھو جانی' مجھے سزا دو۔"

وہ کہنیوں کے بل اٹھا ہوا' رونے کی آواز سن رہا تھا۔ پھر سسکتے ہوئے بستر پر اوندھا ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر تک روتی رہی انتظار کرتی رہی کہ شاید وہ اٹھے گا پھر وہ آنسو پونچھتے ہوئے خود اٹھ گئی۔ اس کے پاؤں سے جوتے اتارنے لگی۔ تب اس نے سوچا "میں بھی عجیب ہوں۔ جانی کے سامنے بدحواس ہوگئی۔ ایک ڈاکٹر ہو کر یہ نہ سمجھ سکی کہ کھٹائی کھلانے یا پلانے سے نشہ اتر جاتا ہے۔"

اس نے فوراً ہی اٹھ کر جانی کی جیبیں ٹٹولیں' چابیوں کا گچھا نکالا پھر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔ راہداری کا سوئچ آن کیا۔ پہلے ایک چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ اسٹور روم ہے۔ دوسرا دروازہ کھولا تو وہ باورچی خانہ تھا۔ رخسانہ بڑی نفاست پسند تھی۔ رہائشی کمرے کی طرح باورچی خانہ بھی صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ وہاں رکھے ڈبے' شیشی اور بوتلوں کو کھول کر کوئی کھٹی چیز تلاش کرنے لگی۔ ذرا سی دیر میں باورچی خانے کا تمام سامان الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا مگر اچار' املی' لیمو یا سرکہ وغیرہ نہیں ملا۔ وہ تھک ہار کر ایک دیوار سے لگ کر سوچنے لگی۔

سوچنے سے کیا ہوتا ہے' آدھی رات گزر چکی ہے۔ شہر کی دکانیں بند ہو چکی تھیں' کھلی ہوتیں تب بھی وہ اتنی رات کو اکیلی نہیں جا سکتی تھی۔ تہذیب تمام ارتقا اور ارتفاع کے باوجود اتنی معتبر نہیں ہے کہ جوان لڑکی رات گئے گھر سے نکل سکے۔ اسی لیے وہ سرِشام ایئرپورٹ سے سیدھی وہاں آگئی تھی اور راہداری کے دور افتادہ حصے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ جانی نے بڑا انتظار کرایا تھا۔ آدھی رات کو آیا تھا اور نہ آنے کے برابر تھا۔

اس نے دروازے پر تالا لگا دیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے کی طرف آئی۔
رات کے سناٹے میں جانی کے خراٹے گونج رہے تھے' ہائے وہ تو سو گیا۔ وہ دہلیز پر پہنچ کر دروازے کے ایک پٹ سے لپٹ گئی۔ میری حسرتو! آؤ تم سے ہی لپٹ جاؤں اس مسافر کا نصیب کیا ہو گا جو آبلہ پا ہو کر پہنچے تو منزل مقصود کی آنکھ لگ چکی ہو۔

تو نہ ملے تو ترا آستاں ملے۔ وہ آستان سے لپٹی کھڑی رہی پھر خیال آیا کہ کھلے ہوئے دروازے سے روشنی باہر جا رہی ہے۔ اس کا سایہ بھی دور تک ہے۔ نائٹ چوکیدار نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟

اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ قید ہو گئی تھی۔ صبح سے پہلے واپس نہیں جا سکتی تھی۔ ایک امید تھی۔ شاید جانی کی آنکھ کھل جائے لیکن اسے معلوم تھا کہ نیند کبھی بے وقت ٹوٹ جاتی ہے' نشہ وقت سے پہلے نہیں ٹوٹتا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ وہاں صبح تک وقت گزارنا تھا۔ کچھ سوچنا تھا' کچھ سہم سہم کر رہنا تھا۔ وہ ڈرنے لگی کہ وہ اٹھ کر آئے گا' وہ دعا کرنے لگی کہ آ جائے۔

تب اس تاریکی اور خاموشی میں جانی کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟ وہ تجسس کے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی' اندازے سے وہاں تک پہنچی۔ خراٹے بند ہو گئے تھے کچھ اور طرح کی کراہتی ہوئی بڑبڑاہٹ تھی۔ وہ آواز کے قریب جھک گئی۔ اندھیرا بول رہا تھا "فر.... زا.... آں.... ہوں.... اوں...."

وہ خوش ہو کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی "ہاں ... میں ہوں۔ پھر مجھے پکارو۔ آنکھیں کھولو۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میری آواز سنو۔"

وہ بول رہا تھا۔ سن رہا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ لی۔ وہ کروٹ تلے آ گئی۔ چراغ تلے اندھیرا ہوتا گیا مگر روشنی تھی' چراغ کو نیند آ گئی تھی۔ عجیب نیند اور رت جگے کی ملاقات تھی وہ۔

آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی کے راستے کمرے میں دھوپ آ رہی تھی۔ وہ اوندھے منہ پڑا رہا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے آواز دی "رخسانہ!"

جواب نہیں ملا۔ اچانک یاد آیا کہ بیوی نہیں ہے۔ بچہ بھی نہیں ہے۔ سر پر رہنے والی ساس بھی نہیں ہے۔ کمرے میں دھوپ کو دیکھ کر سوال پیدا ہوا کھڑکی کس نے کھولی ہے؟

اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا' وہ بند تھا مگر اندر سے چٹخنی نہیں لگی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ "میں رات کو کب آیا؟ میں نے دروازہ کیسے کھولا؟ کوئی رات کو میرے ساتھ تھا۔ تھا نہیں تھی۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خالی کمرے کو دیکھنے لگا' اسے کچھ یاد آ رہا تھا' جوان لڑکی رات کو نہیں آ سکتی۔ مگر کان ابھی تک اس کی آواز سے بج رہے تھے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے آنکھ کھل جاتی ہے مگر خوابوں کی گونج رہ جاتی ہے۔ اس کا ذہن نیند اور نشے کی کارفرمائی کو سمجھنا چاہتا تھا مگر وہ نیند میں تھا تو فرزانہ خواب میں آئی تھی اور نشے میں تھا تو وہ نگاہوں کے سامنے آئی تھی۔

میں نشے میں تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پلنگ کے پاس جوتے نظر آئے۔ شادی سے پہلے وہ جوتوں سمیت سو جاتا تھا۔ شادی کے بعد رخسانہ اس کے جوتے اتارا کرتی تھی مگر پچھلی رات کس نے اتارے؟

اس کا سر دکھنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی پھر کمرے کی ایک ایک چیز کو توجہ سے دیکھنے لگا۔ شاید کوئی چیز شبہ کی تصدیق کر دے۔ بلب روشن نہیں تھا۔ اس نے سوچا' کیا میں اندھیرے میں دروازہ کھول کر بستر تک پہنچ گیا تھا؟

وہ دروازہ کھول کر راہداری میں آیا۔ اسٹور روم اور باورچی خانے کے دروازوں پر تالے تھے۔ رخسانہ کے جانے سے بھید کھلا کہ عورت کے بغیر گھر میں کیسی ویرانی ہوتی ہے۔ وہ ہوتی تو اس کے دھیمے لہجے سے گھر بھر جاتا۔ وہ نہیں تھی مگر لہجے کی شناسائی سے دل کا سناٹا گونج رہا تھا۔

باہر والی وادی وادی بھٹکاتی ہے۔ گھر والی بھرے گھر سے پکارتی ہے۔ وہ رہے نہ رہے' سارا گھر اس کی آواز میں بولتا ہے۔ "جانی اٹھ گئے؟ چائے لاؤں؟ آنکھ سے چیپڑ نکالو۔ غلیظ کہیں کے...."

وہ بے اختیار قمیص کا دامن اٹھا کر آنکھیں صاف کرنے لگا۔

○ "ہزار بار منع کیا ہے' نہ پیار کرو۔ توبہ کیسی بو آرہی ہے۔ چلو برش کرو۔ خوب کلیاں اور غرارے کرو۔ حلق میں انگلیاں ڈال کر منہ صاف کرو' یہ کیا؟ چھوڑو۔ جی نہیں جب تک شراب تمہارے اندر رہے گی۔ میں باہر رہوں گی۔ اپنے بازوؤں کے پٹ نہ کھولو۔ چوپٹ لگ رہے ہو۔"

وہ باورچی خانے کی موری کے پاس بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا کرتا تھا۔ وہاں کا دروازہ کھولنے کے لیے اس نے جیبوں کو ٹٹولا۔ چابیوں کا گچھا نہیں تھا۔ س نے کمرے میں آکر دیکھا۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے' وہ گھر کی چابیاں تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی ہیں۔ جانی کو تکیے کے نیچے وہ گچھا مل گیا۔ اس نے پھر حیرانی سے سوچا۔ رخسانہ نہیں ہے پھر یہ چابیاں میری جیب سے نکل کر تکیے کے نیچے کیسے پہنچ گئیں؟

اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ کسی دوسرے کے آنے اور آکر جانے کا گمان غالب تھا مگر ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ اس نے باورچی خانے کا دروازہ کھولا۔ تب ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہاں تمام سامان الٹ پلٹ نظر آیا۔ رخسانہ ہر چیز کو سلیقے سے رکھ کر گئی تھی لیکن جیسے کوئی چور آیا ہو۔ ہزار تلاش کے باوجود اسے روٹی نہیں ملی ہوگی مگر کمرے کی الماری سے کچھ روپے مل سکتے تھے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ ایک چابی سے الماری کو کھولا۔ وہاں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی۔ رخسانہ جس طرح کپڑے سینت کر گئی تھی' سب اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا۔ مگر کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ سونے کی ایک انگوٹھی اور پانچ سو روپے موجود تھے اس نے رخسانہ کی ڈائری اٹھا کر دیکھی' وہ بڑے اچھے انداز میں اپنے گھر' اپنے شوہر اور بچے کے متعلق دلی جذبات رقم کرتی تھی۔ جانی نے ایک بار چند صفحات پڑھے تھے۔ پھر کبھی پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ملتا تو اسے پڑھنے سے دلچسپی نہیں تھی۔

وہ الماری بند کرکے باورچی خانے میں آیا۔ پیسٹ اور برش کے ذریعے اس نے خوب اچھی طرح دانت مانجھے۔ موری کے پاس بیٹھ کر کلیاں اور غرارے کئے۔ اس دوران میں رخسانہ اس کے دماغ میں بولتی رہی تھی اور وہ اس کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ وہ تولیے سے منہ پونچھتا ہوا آئینے کے سامنے پہنچ گیا۔ ارادہ تھا کہ کنگھی کرنے کے بعد رخسانہ سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق ساس کے ہاں جاکر ناشتا کرے گا۔

لیکن بالوں میں کنگھی کرتے کرتے وہ ایک دم سے ساکت ہوگیا۔ آئینے میں اس دوسری کا سراغ مل رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار دھڑک رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی قمیص کے بٹن سے دو چار بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ بال مہین تھے' ریشمی تھے' کالے تھے' کالی گھٹا سے ٹوٹ کر برسے تھے۔

جانی نے سر جھکا کر دیکھا۔ وہ بال جانے انجانے پھانس کی طرح کلیجے میں گڑے تھے۔

ہائے' وہ بال کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تلاش کے گلے سے الجھ گئے تھے۔

واہ ثبوت مل گیا تھا۔ وہ بال چھاتی پر چڑھ کر اپنا پرچم لہرا رہے تھے۔

○☆○

اس نے غسل کرکے دوسرا لباس پہنا' پھر آئینے کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ گیلے بالوں کو کنگھی سے سلجھانے لگی۔ چہرے کے آس پاس سیاہ زلفوں کا ہجوم تھا۔ جیسے حسن ابھی تک کالے برقعے کے فریم میں ہو یا مقدر میں ابھی تک وہی کالی رات ہو جب تقدیر جگانے والا سو جاتا ہے۔ غسل کرنے کے باوجود اس کا گورا گلابی مکھڑا کچھ پھیکا سا تھا۔ ایک ایسے دیے کی لو کی طرح روشن مگر اداس ہو جو ساری رات قبر کے سرہانے جلتا رہا ہو۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ ایک دم سے چونک کر پلٹ گئی۔ کیا وہ خوشبو کے پیچھے پیچھے چلا آیا ہے۔ دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ وہ سوچنے کے انداز میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈسپنسری کے حصے میں پہنچی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہو رہی تھی اس نے قریب پہنچ کر پوچھا "کون؟"

دوسری طرف سے امی کی آواز سنائی دی "میں ہوں' دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "امی السلام علیکم۔"

انہوں نے جواب نہیں دیا۔ ان کی نگاہیں بیٹی پر جمی تھیں۔ بیٹی نے صاف دیکھا کہ ماں کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے پریشانی اور وحشت صاف عیاں تھیں۔ ان کے قریب زمین پر ایک سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔ فرزانہ نے آگے بڑھ کر بیگ اٹھاتے ہوئے پوچھا "آپ اس طرح کیوں کھڑی ہیں' اندر آئیے نا۔"

وہ اندر آگئیں۔ فرزانہ نے دروازے کو بند کرتے ہوئے پوچھا "اس وقت کوئی ٹرین

نہیں آتی' کیا آپ بس میں آئی ہیں؟"

وہ خاموشی سے کمرے میں آکر بیٹھ گئیں۔ فرزانہ نے محسوس کیا۔ اس کی امی زبان سے نہیں بول رہی ہیں' اسے آنکھوں سے پڑھ رہی ہیں اور وہ آنکھیں پڑھنے کے دوران میں بہت کچھ بول رہی ہیں' انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا "تم کہاں تھیں؟"

ماں کے سوال میں حکم نہیں تھا' آنسو تھے۔ یوں لگتا تھا' بیٹی سے سچی بات معلوم ہو گئی تو وہ رو پڑیں گی۔ فرزانہ انہیں رلانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں یہیں تھی۔ گھر میں تھی۔"

"اور باہر تالا لگا تھا؟"

"معلوم تو ہو کہ آپ کب آئی ہیں؟"

"کیا امی حساب سے جھوٹ بولو گی؟ بولو میں کل رات آٹھ بجے آئی۔ یہاں سے مریض عورتیں واپس جا رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بجے آئی۔ ایک بجے آئی۔ صبح چار بجے آئی' چھ بجے آئی اور اب نو بجے آئی ہوں۔"

فرزانہ گونگی مورت بن گئی۔ اس کی امی اب رو رہی تھیں۔ روتے روتے بول رہی تھیں "تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ کل سے میری کیا حالت ہوئی ہے۔ میں جان پہچان والوں کے ہاں گئی۔ تمہارے بارے میں پوچھ نہ سکی۔ دنیا پوچھتی تو میں جواب نہ دے سکتی۔ [illegible] سے اب تک ہر لمحہ میری آنکھوں نے تمہاری عزت کا جنازہ نکلتے دیکھا ہے مگر میں انتظار میں تھی کہ تم سے پوچھ لوں پھر ماتم کروں گی۔"

"امی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ ماں کے سامنے دوزانو ہو گئی۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی "میں گناہ گار نہیں ہوں۔ آپ سے آنکھیں ملا کر بات کر رہی ہوں۔"

"پھر تم کہاں تھیں؟ کتنی بار جانی کا خیال آیا کہ شاید وہ ادھر آ گیا ہو۔ شاید راستے میں پکڑ لیا ہو۔ کہیں اٹھا کر لے گیا ہو۔ آخر ٹیکسی ڈرائیور ہے بدمعاشیوں سے باز نہیں آئے گا۔ بولو کہاں گئی تھیں؟"

"جوان بیٹی کسی بھی شریف انسان کے پاس رہ کر آئے وہ ماں کی نظروں میں بدمعاش ہی ہو گا۔" پھر وہ سرد آہ بھر کر بولی "میں اسی بدمعاش کے گھر میں تھی۔"

انہوں نے چونک کر حیرانی اور بے یقینی سے بیٹی کو دیکھا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ کچھ

لوگ جو زبان سے اعتراف نہیں کرتے' ان کے ضمیر کے اعتراف سے خود بہ خود گردن جھک جاتی ہے۔

یکبارگی ماں کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ دل تھام کر آگے کو جھک گئیں۔ فرزانہ سامنے نہ ہوتی وہ جھکتے ہوئے فرش پر لڑھک جاتیں۔ فرزانہ نے انہیں سنبھال کر اسی صوفے پر لٹاتے ہوئے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا امی؟ کیا مجھ سے صدمہ پہنچ رہا ہے' خدا کے لیے آپ میرے بارے میں غلط رائے قائم نہ کریں۔"

وہ اپنی امی کا معائنہ کرنے لگی۔ اسٹیتھ اسکوپ لا کر دل کی دھڑکنوں کو ڈھونڈنے لگی۔ دھڑکنیں تو مل جاتی ہیں لیکن اس دردِ دل سے آگاہی نہیں ملتی جسے صاحب درد اپنے دل میں چھپا کر رکھ لے۔

بیٹی نے ایک زود اثر دوائی پلائی ذرا آرام ہو گیا۔ بیماری کوئی بھی ہو علاج ہو جاتا ہے لیکن صدمے کا علاج دواؤں سے کبھی نہیں ہوتا' اس نے ماں کو سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں اپنی پارسائی کا یقین کیسے دلائے؟

کسی طرح بھی یقین کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ساری دنیا تو ایک طرف رہی' وہ پیدا کرنے والی ماں بھی اس پر اعتماد نہیں کر رہی تھی۔ ایک جوان لڑکی غنڈے' بدمعاش شرابی ٹیکسی ڈرائیور کے پاس رات بھر رہے اور توبہ' توبہ۔ ماں نے شرم سے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سمجھی' امی کو نیند آ گئی ہے۔ وہاں سے چپ چاپ چلتے ہوئے ڈسپنسری میں آ گئی۔ کمپاؤنڈر آ گیا تھا' مریض عورتیں اور بچے بھی آ رہے تھے' وہ خود رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ سونا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر کے فرض نے اسے وہاں بٹھائے رکھا۔ اس دوران میں وہ ایک بار کمرے میں آ گئی۔ اس کی امی بستر پر نیم دراز تھیں۔ آنکھیں کھولے سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔ فرزانہ ان پر ایک نظر ڈال کر یہ کہتے ہوئے چلی آئی "آپ سونے کی کوشش کریں' میں ابھی آتی ہوں۔"

ڈسپنسری میں ایک پرانی مریضہ کو دیکھ کر اس نے کہا "تم ہر دوسرے تیسرے روز کسی نئی بیماری کے ساتھ آ جاتی ہو۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے' تم شکی ہو اور شک کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

کہنے کو وہ کہہ گئی لیکن دھیان اپنی امی کی طرف چلا گیا۔ وہ شبہ میں مبتلا ہو گئی تھیں۔
انہیں کسی طرح بھی سمجھایا جاتا تو ایک سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا۔ اور وہ یہ کہ ایک
شریف زادی اپنی شرم کو بالائے طاق رکھ کر پرائے مرد کے پاس کیوں گئی تھی؟ شرافت
کے طور سے ہٹ کر کوئی بھی لڑکی شرم کی حدود سے باہر قدم رکھے تو ہزار شرم رکھنے کے
باوجود دنیا والوں کو پارسائی کے آئینے میں بال نظر آتے ہے۔

بارہ بجے ڈسپنسری بند ہو گئی۔ وہ کمرے میں آ گئی۔ اس کی امی اسی طرح بستر پر نیم دراز
تھیں۔ سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔ وہ ماں کی طرف نہ دیکھ سکی۔ دوسری طرف منہ
پھیر کر بولی "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں شرمندہ ہوں جب
تک آپ معاف نہیں کریں گی' میں آپ سے نظریں نہیں ملاؤں گی۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولی "آپ یقین نہیں کریں گی۔ لیکن میں بتاؤں گی کہ
کل رات کیا ہوا؟ میرے پاس وہاں جانے کا جواز ہے' جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے
جانی کو صرف آدھا چہرہ نہیں بیوی بھی آدھی دی ہے اور وہ آدھی اپنے مرد سے بہت کچھ
چھپا کر اسے چھوڑ کر جا رہی ہے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں جانی کو تباہی کے دہانے تک لے
گئی۔ میں ہی انہیں مزید تباہی اور فریب خوردگی سے بچا سکتی تھی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے شوکیس کے پاس آئی۔ شیشے کے پیچھے کانچ کے برتن رکھے
تھے۔ وہ شوکیس سے ٹیک لگا کر بولی "مگر میں جانی کو رخسانہ کی چالوں سے آگاہ نہیں
کر سکی۔ وہ اس قدر نشے میں تھے کہ نہ مجھے پہچان سکے نہ میری باتیں سمجھ سکے۔ وہ سو گئے'
میں جاگتی رہی۔ رات کو اکیلی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ تب میں نے سوچا' الماری کی تلاشی
لینا چاہیے شاید رخسانہ کے کسی سامان سے اس کی چالبازی کا پتا چلے۔ میں نے الماری
کھولی تو اس کی ڈائری ہاتھ لگی۔ میں نے ادھر ادھر سے اسے پڑھا۔ پھر ۴ ستمبر کے صفحے پر
میری نظریں ٹھہر گئیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ شوکیس کے آئینے کے روبرو ہوئی۔ اس آئینے میں اس کی امی اپنے
پلنگ پر نیم دراز نظر آئیں۔ فرزانہ نے نظریں جھکا کر کہا "رخسانہ نے لکھا تھا۔ میرے
جانی! میں تمہیں جان سے بڑھ کر چاہتی ہوں۔ جو عورت جان سے چاہے' وہ تھوڑا جھوٹ
بولنے کا بھی حق رکھتی ہے کیونکہ اپنے مرد پر بڑا مان ہوتا ہے۔ وہ مارے گا' ظلم کرے گا

پھر اپنی ملکیت سمجھ کر معاف کر دے گا۔ جانی میں پرسوں بہت دور چلی جاؤں گی۔ اگر کبھی
تمہیں یہ بات معلوم ہو کہ میں نے تم سے کوئی بات چھپائی ہے تو میری رازداری کو فریب
نہ سمجھنا۔ میرا انتظار کرنا۔ میں واپس آ کر تمہیں سمجھاؤں گی۔ بعض حالات میں مصلحت
اندیشی لازمی ہو جاتی ہے۔ میں ایسے فریب کو وقتی طور پر جائز سمجھتی ہوں جس سے شوہر
کو' بچوں کو اور گھر کو نقصان نہ پہنچے۔ میں قسم کھا کر جا رہی ہوں کہ کبھی کسی مرحلے پر بھی
تمہاری خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گی۔ میرا ہاتھ صرف تمہارے ہاتھ میں رہنے
کے لیے ہے یہ کسی اور ہاتھ میں کبھی نہیں جائے گا۔ جائے گا تو میں مر جاؤں گی۔"

فرزانہ پھر تھوڑی دیر کے لیے چپ رہی سر جھکائے سوچتی رہی پھر بولی "رخسانہ نے
اور بہت کچھ لکھا تھا۔ لیکن یہ نہیں لکھا کہ جانی سے کیا بات چھپا رہی ہے؟ یہاں سے
کنواری لڑکی بن کر کیوں گئی ہے؟ لیکن امی! میں ایک بات مان گئی۔ رخسانہ جیسی بھی
ہے' بے حیا اور بے وفا نہیں ہے۔ یقیناً وہ مر جائے گی مگر جانی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر
کسی مرد کے سائے میں نہیں جائے گی۔

امی! اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں جانی کے سامنے کبھی نہیں جاؤں گی۔ اگر
رخسانہ نے اپنے شوہر کو اپنا رازدار نہیں بنایا ہے اور اس سے بات چھپائی ہے تو وہ اپنے
غلط طرز عمل کی سزا پائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ سزا نہ بھی پائے۔ ان میاں بیوی کے حالات
ان کے ساتھ ہیں۔ میں ان سے دور رہوں گی۔ آپ بھی دعا کریں کہ جانی کبھی مجھ تک نہ
پہنچ سکیں۔"

اس نے نظریں اٹھا کر آئینے میں اپنی امی کو دیکھا۔ اس بار اسے کچھ عجیب سا لگا۔
کتنی دیر ہو گئی تھی اور اس کی امی اسی طرح ساکت بیٹھی سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔
اس نے آواز دی "امی۔"

اس نے آئینے کی طرف سے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ "آپ چپ کیوں ہیں؟ بولتی
کیوں نہیں ہیں امی؟"

کوئی جواب نہیں ملا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ آگے بڑھی جھجک گئی پھر آگے بڑھی اور قریب پہنچ
گئی۔ جھک کر ماں کی کھلی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ڈاکٹر تھی۔ دور ہی سے سمجھ سکتی تھی مگر

اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے نبض ٹٹولنے کے لیے ان کے ایک ہاتھ کو پکڑ کر ذرا اٹھایا تو وہ ایک طرف ڈھلک گئیں۔

"امی۔ نہیں امی... نہیں... نہیں.... نہیں.... نہیں...."

کمرا اس کی دلدوز چیخوں سے گونجنے لگا۔

○☆○

لندن کی فضا میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کی خنکی میں رخسانہ نے بڑی شدت سے دھوپ کی کمی محسوس کی۔ ائرپورٹ کی عمارت میں مختلف نسل اور مختلف ممالک کے مسافر نظر آرہے تھے۔ انگریز عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ خوش لباس' خوش شکل اور اسمارٹ تھیں۔ رخسانہ نے اپنا آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ جلد از جلد چہرہ مکمل ہوجائے اور وہ فخر سے دنیا والوں کے سامنے منہ دکھا سکے۔

وہ بڑا ہی اجنبی ماحول تھا۔ اگر جمشید نہ ہوتا تو ایسے ماحول میں وہ گھبرا جاتی۔ جمشید نے ایک کیریئر میں اس کا تمام سامان لاد کر چلتے ہوئے کہا "کم آن' یہ لندن ہے۔ یہاں قلی نہیں ملتے۔ اپنا سامان خود لے جانا پڑتا ہے۔"

وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے کہا "اور کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ ایک ساتھ اتنا سامان لے جایا جائے۔ تم چاہو تو یہاں کے لاکر میں اپنا سامان رکھ سکتی ہو۔"

رخسانہ نے کہا "پہلے یہ تو معلوم ہو کہ مجھے کہاں رہنا ہے اور وہاں کتنے سامان کی گنجائش ہے۔"

وہ مسکرا کر بولا "گنجائش تو دل میں ہوتی ہے۔ بائی دی وے نیدر چیلسی میں ہم نے ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بہت ہی کشادہ فلیٹ ہے۔ سامان کی بڑی گنجائش ہے۔ ہم وہیں رہیں گے۔"

"تم بھی اسی فلیٹ میں رہو گے؟"

"آف کورس۔"

"لیکن میں نے خط میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ....."

"کہ تم تنہا کہیں رہنا چاہتی ہو مگر کیسے رہو گی۔ یہ بڑا مہنگا شہر ہے۔"

"مہنگائی کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی

میرے لیے ملازمت کا بندوبست کرو گے۔"

"کروں گا۔ ضرور کروں گا۔ آئی ہیو ٹو کیری آن۔ وہاٹ ایور یو لائیک۔"

"مگر جمشید میرا مزاج کچھ اور ہے۔ میں کسی کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتی۔"

"بھئی تم تو یہاں پہنچتے ہی لڑنے لگیں۔ پہلے میرے ساتھ فلیٹ تک چلو اور وہاں پاپا سے ملو۔"

"پاپا؟ کون پاپا؟"

"مائی فادر۔ میرے باپ' میرے والد' میرے ابا۔ میرے دادا کے صاحب زادے اور یہ سب ایک ہی صاحب ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کار میں جمشید کے برابر بیٹھی لندن کی شاہراہوں سے گزر رہی تھی۔ وہ ڈرائیو کررہا تھا۔ رخسانہ نے پوچھا "ہم ڈاکٹر سے کب ملاقات کریں گے؟"

"کل صبح دس بجے کا اپوائنٹ منٹ ہے۔ کام کی باتیں بعد میں کرلینا ابھی اس شہر کو دیکھو جسے کتابوں میں پڑھتی آئی ہو۔"

"مجھے لندن سے نہیں صرف اپنے چہرے سے دلچسپی ہے۔"

"ٹو بی ویری فرینک۔ اپنی ذات کی دلچسپیاں قائم رکھنے کے لیے دوسروں کی ذات سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھنی پڑتی ہے۔"

"میں ذرا کم سمجھتی ہوں۔ اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

"میرا مطلب ہے۔ آئی مین ٹو سے۔ یہاں میں تمہاری خوشیوں اور ضرورتوں کو اپنی تمام تر مصروفیات پر ترجیح دوں گا۔ تمہارا بھی فرض ہوگا کہ تم میری خوشیوں میں خوش رہو۔"

"تمہاری خوشیاں کیا ہیں؟"

"یہ کہ تمہاری جیسی ایک حسین ساتھی ہو۔"

وہ بات کاٹ کر بولی "تمہاری پہلی ہی خوشی غلط ہے۔ میں حسین نہیں ہوں۔"

"ہو۔ میں نے کالج میں تمہارے حسن کی چکاچوند دیکھی ہے۔ دیکھ لینا وہ حسن

تمہیں واپس ملے گا۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ جمشید! ایک شریف اور مہذب انسان کے دل میں جتنی خوشیاں ہوتی ہیں، میں وہ سب پوری کروں گی۔ بشرطیکہ کوئی مجبوری آڑے نہ آئے۔"

"واہ۔ تم نے مجھے خوش کردیا۔"

تقریباً پینتالیس منٹ تک فاصلے طے ہوتے رہے پھر جمشید نے کہا "اب ہم چیلسی کے علاقے میں ہیں۔ وہ دیکھو، وہ عمارت جو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ چیلسی رائل اسپتال ہے۔ تمہارے چہرے کے فوٹو گرافس اور ایکسرے رپورٹ وغیرہ اسی اسپتال میں ہیں۔ یہاں سے دس منٹ کے واکنگ ڈسٹینس پر ہمارا فلیٹ ہے کہو کیسی رہی۔ تمہیں ڈاکٹر سے ملنے کے لیے گاڑی کی ضرورت نہیں پڑے گی ٹہلتے ہوئے چلی آؤ گی۔"

"شکریہ تم بڑی سہولتیں فراہم کررہے ہو۔"

"ہاں اب شکریہ کہہ رہی ہو۔ ائرپورٹ پر لڑائی کررہی تھیں۔ ویسے تمہاری وہ کھلکھلاتی ہوئی ہنسی بڑی میوزیکل تھی۔ میں نے بہت عرصے سے سات سروں کی انگڑائی نہیں سنی، ذرا اپنی ہنسی تو سنادو۔"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ دراصل اسپتال کی وہ عمارت دیکھتے ہی اس کے دل میں خوشیاں بھر گئی تھیں۔ جمشید نے ایک بات چھیڑی تو ہنسنے کا بہانہ مل گیا۔ "اللہ! مجھے یہاں ایک نیا حسن، نئی زندگی ملے گی۔ ہائے کب ملے گی۔ مجھے کچھ بتاؤ۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں! سرجری کب سے شروع ہوگی۔"

"یہ کوئی معمولی آپریشن نہیں ہے کہ تمہاری صورت دیکھتے ہی شروع کردیا جائے گا۔ کافی وقت لگے گا۔"

کار فلیٹ کے سامنے رک گئی۔ رخسانہ نے مایوس ہوکر کہا "کیوں دل توڑنے والی بات کرتے ہو؟ کیا مجھے ہنستے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے؟"

وہ ڈگی کھول کر سامان نکالتے ہوئے بولا "جو تمہیں ہنستا نہ دیکھ سکے وہ کافر لیکن تھنک اے ڈاکٹر تمہیں سرجری کے پروسیس کو سمجھنا چاہیے۔ ابھی تو پتا نہیں کتنے دنوں تک تمہارے چہرے کی گرافٹنگ ہوتی رہے گی۔ ہاؤ ایور، بعد میں یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔

میں سامان سے لدا ہوا ہوں۔ تم آگے بڑھو، سامنے پانچ نمبر والے دروازے کے کال بیل کے بٹن کو پش کرو۔ اللہ مشکل آسان کردے گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ایک صحت مند بوڑھا منہ میں پائپ دبائے، تمباکو کا دھواں چھوڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے رخسانہ کو سر سے پاؤں تک بڑی گہری نظروں سے دیکھا پھر ہونٹوں کو بھینچ کر "ہوں" کے انداز میں سرہلاتے ہوئے پوچھا "تم مس رخسانہ فرید ہو؟"

"جی.... جی ہاں۔ آداب...." اس نے خالص مشرقی انداز میں سر جھکا کر ذرا ہاتھ اٹھاکر آداب کیا تو چوڑیاں کھنک گئیں۔

بوڑھے نے جمشید سے کہا "کتنا اچھا لگ رہا ہے، بہت عرصے کے بعد سلام اور احترام کا مشرقی انداز نظر آیا ہے۔ ہاں، وہ آداب کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے؟"

جمشید نے ذرا سوچ کر کہا "بس یہی کہ جیتی رہو، خوش رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔"

بوڑھے نے کہا "تم گدھے ہو۔ پوتوں پھلنے کی دعا بیٹے کو دیتے ہیں کیونکہ پوتا بیٹے کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہم تو رخسانہ کو سہاگن بننے کی دعائیں دیں گے۔"

رخسانہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ مرگئی۔ وہ جانی کے نام پر سہاگن تھی۔ کسی کی دعاؤں کی محتاج نہیں تھی۔ جمشید سامان اٹھائے فلیٹ کے دروازے سے اندر جاتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے بولا "پاپا! یہ شادی والی دعاؤں میں میرا نام بھی شامل کرلیجیے تھینک یو۔"

پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا "بیٹی! مجھے سید باقر علی کہتے ہیں۔ میں دلی مسرتوں کے ساتھ تمہیں ویلکم کہتا ہوں، آؤ اندر چلیں۔"

وہ باقر علی کے ساتھ فلیٹ کے اندر آگئی۔ پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہوگیا کہ دونوں باپ بیٹا اسے مہمان نہیں، اپنی ہونے والی رشتے دار سمجھ رہے ہیں۔ جمشید پہلے ہی اپنے خطوں میں کھل کر اظہارِ محبت کرچکا تھا۔ رخسانہ کو اس کی امی نے خوب زمانہ شناسی اور معاملہ فہمی سکھادی تھی۔ اگر وہ بن بیاہی بن کر نہ آتی تو شاید دلی گرمجوشی سے اس کا استقبال نہ کیا جاتا۔ شاید اس کی پلاسٹک سرجری کے لیے بھی اتنی بھاگ دوڑ نہ کی جاتی۔

کوئی مطلب کے بغیر کسی کو ہزاروں میل کی دوری سے بلا کر خوش آمدید نہیں کہتا۔

وہ فلیٹ دو بیڈ روم ایک سٹنگ روم' باتھ اور کچن پر مشتمل تھا۔ جمشید نے اس کے ساتھ گھوم پھر کر پورا فلیٹ دکھایا پھر کچن میں جاتے ہوئے بولا "تم پاپا سے باتیں کرو میں کافی تیار کر کے لاتا ہوں۔ یہاں ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرنا ہوتا ہے ملازم بڑے مہنگے ہیں' اب تم گھر سنبھالو گی' میں بزنس کی طرف دھیان دوں گا۔"

وہ بالکل گھر والے کی طرح جیسے گھر والی کو کہہ رہا تھا۔ رخسانہ کو برا لگ رہا تھا۔ وہ بڑے تحمل سے کام لے رہی تھی۔ سٹنگ روم میں باقر علی نے کہا "آؤ بیٹے! بیٹھو اور اپنے گھر والوں کے متعلق کچھ بتاؤ۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "کیا میں آپ کو پاپا کہہ کر مخاطب کروں؟"

"ضرور' مجھے اپنا باپ سمجھو۔ ویسے تمہارے فادر کیا کرتے ہیں؟"

"وہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ بہرحال وہاں کی باتیں پھر ہوتی رہیں گی' یہاں میری رہائش کا کیا ہوگا؟"

انہوں نے مسکرا کر کہا "تم نے اپنے ہر خط میں دو باتوں پر زور دیا۔ ایک تو یہ کہ تم علیحدہ رہو گی۔ دوسرے یہ کہ ملازمت کرو گی۔"

"ایک اور بات آپ بھول گئے۔ میں نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ اپنی رہائش' اپنی خوراک اور سرجری کے تمام اخراجات میں خود پورے کروں گی۔"

باقر علی نے کہا "سچ پوچھو تو تمہاری خوددارانہ ضد نے مجھے جیت لیا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا پھر صورت کو دیکھنا وہ تو یہاں ہمارے سامنے بنے گی۔ تمہارا کردار بڑی حد تک واضح ہو گیا ہے۔ ہاں ایک بات اور پوچھوں گا۔ جمشید کے خطوط کے جواب میں تمہارے خطوط بڑے سنجیدہ ہوتے تھے۔ وہ محبت اور شادی کی باتیں لکھتا تھا اور تم ان باتوں کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔ دیکھو بیٹے! یہاں کا ماحول مختلف ہے۔ یہاں بچوں کو دوست سمجھ کر دلی معاملات پر گفتگو کرنے کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ میں اوپن مائنڈڈ ہوں۔ تم بھی صاف گوئی سے کام لو۔ مجھے بتاؤ میرے بیٹے سے کس حد تک دوستی ہے۔ رومانس کی حد تک یا معاملات کی حد تک؟"

وہ سر جھکائے چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگی "آپ دوستی کی حد معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں جس معاشرے سے آئی ہوں وہاں لڑکی اور لڑکے کی دوستی کا تصور ہی نہیں ہے۔ یہ سوچنا ہی مضحکہ خیز ہے کہ پاکستانی والدین نے اپنی بیٹی کو رومانس کے لیے یہاں بھیجا ہے۔"

"یہ تو میں سمجھتا ہوں۔ والدین محبت کو نہیں معاملات کو اہمیت دیتے ہیں مگر انہوں نے یہ تو سمجھا ہے کہ تم تنہا ایک نوجوان کے پاس آئی ہو۔"

"یقیناً اسی لیے تو یہاں آنے سے پہلے ضد کرتی رہی کہ میری رہائش الگ ہو اور میں یہاں ملازمت کے ذریعے اپنے اخراجات پورے کروں۔ اس کے لیے میں نے آپ کے صاحب زادے کی پیش کش قبول کی۔ وہ میرے کام آنا چاہتے ہیں۔ میرے چہرے کے بگڑنے میں ان کا ہاتھ ہے لیکن اس کی تلافی ایسے نہ ہو کہ ان کی جیب پر بوجھ پڑے' جیب میری ہو اور کوشش ان کی رہے۔"

"یعنی تم ہم سے اتنی دست گیری چاہتی ہو جتنی سوسائٹی میں ایک دوسرے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ تم محض اخلاقی امداد چاہتی ہو۔"

"جی ہاں' صرف اخلاقی امداد۔"

جمشید ایک ٹرے میں کافی اور سینڈوچز لے آیا۔ اس نے ٹرے کو سینٹرل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا "رخسانہ! تم یہاں فلیٹ میں رہ کر' رہنے اور کھانے پینے کے سلسلے میں کافی رقم بچا سکتی ہو۔"

باقر علی نے سینڈوچ اٹھا کر کہا "نہیں بیٹے! رخسانہ سے ضد نہ کرو۔ میں چاہتا ہوں میری بیٹی کی خودداری قائم رہے۔" انہوں نے سینڈوچ بڑھاتے ہوئے کہا "لو بیٹی کھاؤ۔"

"شکریہ۔" اس نے ایک پیس لے کر کہا "آپ معاملہ فہم بھی ہیں اور مہربان بھی۔ میرا یقین مستحکم ہو رہا ہے کہ آپ کی سرپرستی میں میرا چہرہ مکمل ہو جائے گا۔"

"میری کوشش یہی ہو گی لیکن دوپہر کی فلائٹ سے میں فرینکفرٹ جا رہا ہوں۔ تین دن بعد آ جاؤں گا۔ میرے آنے تک تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تم جمشید کے ساتھ جا کر ڈاکٹر سے ملتی رہو۔ تمہارے پچپن ہزار روپے کی ہنڈی مجھے مل چکی ہے۔ یہاں کی کرنسی کے حساب سے تمہیں تین ہزار پاؤنڈ مل جائیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "لیکن میری رہائش کا کیا ہوگا؟"
باقر علی نے کافی کی چسکی لی اور کہا "تم لڑکی ہو' ہوسٹل یا ہوٹل میں نہیں رہو گی۔ جمشید اپنا ضروری سامان لے کر کسی ہوسٹل میں رہے گا۔"

وہ حیرانی سے بولی "یہ کیا بات ہوئی؟ جمشید اپنا فلیٹ چھوڑ کر ہوسٹل کے اخراجات برداشت کرے گا۔"

"بیٹی! جمشید کے ہوسٹل کا کرایہ تم ادا کرو گی۔ رقم کی صورت میں نہیں ملازمت کی صورت میں۔ یعنی تم اس فلیٹ کی دیکھ بھال اور صفائی کرو گی۔ ہمارے لیے تین وقت کا کھانا تیار کرو گی۔ جمشید صرف کھانے کے لیے آئے گا۔ رہ گئی میری بات تو میں ایک بیٹی کے پیار کا بھوکا ہوں اور تمہیں ایک بوڑھے سرپرست کی ضرورت ہے۔"

وہ بولی "پاپا' مجھے آپ کے ساتھ رہنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر آپ عجیب ہیں۔ آپ گریٹ ہیں۔ اپنی بیٹی کو ہوسٹل سے دور رکھنے اور ملازمانہ مصروفیات سے بچانے کے لیے مجھ پر گھریلو ذمے داریاں عائد کردی ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے رخسانہ بیٹی! اسے یوں سمجھو کہ تمہارا اس گھر سے گھر سنبھالنے والا رشتہ نہیں ہے۔ تمہاری حیثیت ایک گورنس کی ہے۔ ایک گورنس کی جو تنخواہ ہوتی ہے' وہی تمہاری ہوگی۔ تم اس تنخواہ سے یہاں کے کھانے کا بل اور رہنے کا کرایہ ادا کرو گی۔ یوں کہہ لو کہ تمہارے یہاں کے کرائے سے جمشید کے ہوسٹل کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔"

"مگر میری وجہ سے جمشید کو تکلیف ہوگی۔"

جمشید نے کہا "میری فکر نہ کرو۔ میں مرد ہوں کہیں بھی گزارہ کر سکتا ہوں۔ تم لڑکی ہو' یہاں اجنبی ہو' تمہیں پاپا کے سائے میں رہنا چاہیے۔"

"لیکن....."

"لیکن ویکن بھول جاؤ۔ بحث نہ کرو۔ تم مجھ سے الگ رہنا چاہتی تھیں یہ ہوگیا تمہیں ملازمت کی ضرورت تھی۔ تم گورنس بن گئی ہو اب زیادہ بولو گی تو مجھے غصہ آجائے گا۔"

رخسانہ نے ہنستے ہوئے پوچھا "تم غصے میں کیا کیا کرتے ہو؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا "غصہ اتارنے کے لیے گھروالی کا انتظار کرتا ہوں' جانے وہ کب آئے گی۔"

رخسانہ اور باقر علی ہنسنے لگے۔ لنچ کے بعد جمشید نے ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور ضروری سامان رکھا۔ اپنے پاپا کا سفری سامان کار کی ڈگی میں رکھا پھر رخسانہ بھی پاپا کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ جمشید نے پہلے انہیں ائرپورٹ پر پہنچایا۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد اس نے رخسانہ سے کہا "اگر تھک گئی ہو' آرام کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں فلیٹ میں چھوڑ دوں اور اگر تفریح کا موڈ ہے تو چلو لندن کی سیر کرادوں۔"

"میرا موڈ نہ پوچھو کیونکہ ملازمت کا معاملہ ہے۔ ابھی فلیٹ میں پہنچ کر وہاں کی صفائی کرنی ہے۔ تمہارے لیے رات کا کھانا تیار کرنا ہے۔ آخر تمہارے ہاں کی گورنس جو ٹھہری۔"

"گویا تم ہماری ملازمہ ہو۔ ویل اینڈ گڈ۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ مجھے لندن کی سیر کراؤ۔ میرے ساتھ رات کا کھانا کسی ہوٹل میں کھاؤ' اگر تم نے انکار کیا تو تمہیں ملازمت سے برخاست کردیا جائے گا۔"

رخسانہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ کار میں آکر بیٹھ گئی "جمشید! تم بہت زندہ دل ہو۔ میرا وقت بہت اچھا گزرے گا۔"

"نہ.... نہ یوں کہو زندگی اچھی گزرے گی۔"

رخسانہ کے لبوں سے تبسم کی تتلی اڑ گئی۔ جانی یاد آیا۔ یوں تو سفر کے آغاز سے یہاں تک وہ اور کامران یاد آتے رہے مگر اس وقت جانی ایک سوال بن کر دماغ میں آیا۔ کیا وہ ہوتا تو اسے جمشید کے ساتھ یوں گھومنے کی اجازت دیتا؟

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر سوچنے لگی۔ "جمشید کے ساتھ تفریح سے انکار کردے لیکن کب تک؟ یہاں جانے کتنے مہینوں تک رہوں گی۔ میں اپنی عزت اور شرم رکھتے ہوئے جس حد تک اپنے ان محسنوں کا ساتھ دے سکتی ہوں' دینا چاہیے۔ تبھی یہ باپ بیٹا میرا ساتھ دیں گے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

کار تیز رفتاری سے مختلف شاہراہوں پر دوڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جمشید نے پوچھا "تم لندن میں ہو یا پاکستان پہنچی ہوئی ہو۔"

"آں؟" وہ چونک گئی۔ جانی اب بھی خیالوں میں بسا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے مسکرا کر بولی "پاکستان میرے دل میں ہے جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لیا۔"

"گردن اٹھا کر مجھے دیکھتی رہا کرو۔"

رخسانہ نے سر گھما کر دیکھا پھر مسکرائی' وہ بولا "شاباش دنیا کے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں یہی سمجھائے گا کہ ہنستے بولتے رہنے سے آدھی بیماری دور ہو جاتی ہے۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحبہ؟"

"سچ بول رہے ہو مگر مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا "تمہیں سر جھکا کر سوچنے کی بیماری نہ لگے۔ لگے تو میرے لیے لگے۔"

کار ایک جگہ رک گئی۔ اس نے کہا "بس ایک منٹ' میں اپنا سامان رکھ کر آتا ہوں۔"

اس نے گاڑی سے اتر کر ڈگی سے اپنا سوٹ کیس نکالا پھر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس کا آخری فقرہ رخسانہ کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ انسان کی یہ ازل سے خواہش ہے کہ وہ اکیلا ہی ساری دنیا سے چاہا جائے۔ کوئی بھی اپنی ذات سے دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ دکھ درد میں بڑھ بڑھ کر شریک رہتا ہے تو اپنے لیے اس کی توجہ اور تعریف بڑی اچھی لگتی ہے اور جو بات اچھی لگتی ہے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دل میں جگہ بناتی رہتی ہے۔ پتا نہیں جمشید کی توجہ اور تعریفیں کیا رنگ دکھانے والی تھیں۔ ابھی تو رخسانہ سر سے پاؤں تک جانی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اس لیے فوراً ہی جمشید کی باتوں کو دماغ سے نکال دیتی تھی۔

کسی کی باتوں کو نظر انداز کرنا اور بات ہے لیکن بات بنا بنا کر بولنے والے کو نظر انداز نہ کرنا اور بات ہے۔ رخسانہ کے دماغ پر ایک بوجھ تھا کہ آخر وہ کب تک حیلوں بہانوں سے ٹالتی رہے گی؟ رات کو ایک ہوٹل کے کیبن میں کھانے کے دوران جمشید نے کہا "بہت ہو چکا رخسانہ! لڑکیوں کو اتنا ریزرو نہیں رہنا چاہیے۔"

"یہ مشرقی انداز ہے۔ ہمارا معاشرہ ہماری سوسائٹی یہی سکھاتی ہے۔"

"تمہیں کچھ زیادہ ہی سکھا دیا گیا ہے۔ ٹیوب میں سفر کے دوران میں نے ایک ذرا سا

ہاتھ پکڑا تو تم نے فوراً ہی چھڑا لیا۔"

"یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ خیال کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے قربت کے باوجود فاصلہ رکھنا چاہیے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا "تم محتاط اور محفوظ رہنا جانتی ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ چلو آج ہی اقرار کر لو کہ یہاں سے ہم جیون ساتھی بن کر پاکستان جائیں گے۔"

"میں یہاں شادی کے لیے نہیں آئی ہوں۔"

"جانتا ہوں' تمہارا چہرہ مکمل ہو گا پھر....."

"پھر میں واپس جاؤں گی' اپنے ملک اپنے شہر میں پریکٹس کروں گی' اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں سے بناؤں گی۔"

"اس کے بعد بوڑھی ہو جاؤ گی۔ شادی نہیں کرو گی۔"

"میرا مزاج دوسری لڑکیوں سے الگ ہے۔ میں کسی دوسرے کے متعلق کبھی نہیں سوچتی۔"

"یعنی میرے متعلق بھی سوچنے کی گنجائش نہیں ہے؟"

رخسانہ نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر نظریں جھکا کر کہا "نہیں ہے۔"

اس نے صاف انکار کیا تھا لیکن مسکرا کر انکار کے مفہوم کو الجھا دیا۔ صاف گوئی کا بھرم رکھا تھا لیکن امید کا آئینہ دکھایا تھا۔ ایک حادثہ تبسم سے کتنے ہی معنے نکل آئے ہیں۔ جمشید خوش ہو گیا۔

رات کے دس بجے اس نے رخسانہ کو فلیٹ کے دروازے پر پہنچا دیا۔ کہا "میں کل صبح آٹھ بجے آؤں گا۔ ہمیں نو بجے اسپتال پہنچنا ہے چونکہ دوپہر کے لیے پکانے کا وقت نہیں ملے گا اس لیے....."

"وقت مل جائے گا۔ تم دوپہر اور رات کو میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھاؤ گے۔"

وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ جمشید تھوڑی دیر اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ مکمل چہرے والی رخسانہ تھی جسے وہ کالج میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ جس سے چھپ کر محبت کرتا تھا۔ وہ اتنی مغرور تھی کہ اس کے سامنے حرفِ مدعا زبان تک نہیں آتا تھا۔ آج وہ اپنوں سے دور آ کر ایسی بے یارومددگار ہو گئی تھی کہ وہ جب چاہتا

ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیتا لیکن یہ بات اتنی آسان بھی نہیں تھی۔ اس بے سرو سامانی میں بھی اس لڑکی کے تیور بڑے حوصلہ شکن تھے۔

وہ حوصلہ پیدا کرنے کے لیے ایک بار میں آ گیا۔ جس ہوسٹل میں رہنے گیا تھا اس کے روم میٹ احمد فخری سے بار میں ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا تھا۔ فخری بار کاؤنٹر کی سیٹ پر بیٹھا بیئر سے شغل کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا "بیئر چلے گی؟"

جمشید نے بیٹھتے ہوئے کہا "وہسکی ول ڈو۔ ایک تو پاپا بیئر سے آگے بڑھنے نہیں دیتے دوسرے رخسانہ آ گئی ہے اس کے سامنے تمام دن پارسا بن کر رہنا پڑا ہے۔"

"یار تم لکی ہو۔ اپنے پاپا کے ساتھ بیئر پیتے ہو۔ ہمارے والدین یہاں برسوں رہ کر بھی مذہبی اور پاکستانی ہی رہتے ہیں۔ بہرحال آدھی محبوبہ کے متعلق بتاؤ بات آگے بڑھی؟"

"نہیں۔ بس امید ہے۔"

"یار جانے دو۔ کتنے برسوں سے امید کا روگ پال رکھا ہے امید کے ساتھ تدبیریں بھی کرتے رہے۔ اس کے لیے کتنے پاپڑ بیلے۔ اس کے لیے پلاسٹک سرجری کی راہیں ہموار کیں۔ جب تم ہوسٹل میں سامان رکھنے آئے تھے تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"پکڑا تھا۔ اس نے چھڑا لیا۔"

وہ جام اٹھا کر پینے لگا۔ فخری نے کہا "ہاتھ چھڑانے کا مطلب ہے دامن چھڑانا دور سے دامن کی ہوا دے کر اُلو بنانا اور تم بن رہے ہو۔"

"شٹ اپ' طعنے نہ دو۔ کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ وہ ایک دم سے میری محبت کا دم بھرنے لگے۔"

"ایک ہی تدبیر ہے۔ آنکھیں بند کر لو۔ وہ خواب میں آ کر سارے ارمان پورے کر دے گی۔"

"پلیز فخری! میں پریشان ہوں۔ تم نے اس کا مکمل حسن نہیں دیکھا۔ کالج کے زمانے میں اسے دیکھ لیتے تو اس کے لیے سب کچھ ہارنے کو تیار ہو جاتے۔ وہ یہاں پھر مکمل ہو گی تو میں اسے جانے نہیں دوں گا۔"

"جمشید! تم نے اس کے متعلق جتنی باتیں بتائی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ چالاک اور خود غرض ہے اپنا چہرہ بنوائے گی' اور تمہیں ٹھینگا دکھا کر چلی جائے گی۔"

"ایسا نہ کہو' اس نے میری محبت اور احسانات کا صلہ نہ دیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔"

"شاباش! یہ ہوئی نامردوں والی بات۔ جاؤ اسے مار ڈالو۔" اس نے قریب جھک کر کہا "عزت کی حرام موت۔"

جمشید نے دو گھونٹ پینے کے بعد کہا "مگر پھر۔ وہ۔ نفرت کرنے لگے گی۔"

"نہیں کرے گی۔ تمہیں تجربہ نہیں ہے۔ مجھے ہے۔ دیکھو جو ہارنا نہ جانتی ہو اسے ایک بار ہارنا سکھا دو۔ رخسانہ جیسی شریف اور شرم والیوں کو کوئی ایک ہی فتح کر سکتا ہے تم وہ ایک فاتح بن جاؤ۔ میرا دعویٰ ہے پھر وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گی۔"

وہ پینے اور سوچنے لگا۔ فخری نے کہا "تم نے سوچتے ہوئے اتنے برس گزار دیے اب اس لڑکی کی ٹال مٹول کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ابھی وہ ہاتھ آ کر ہتھے نہیں چڑھ رہی ہے۔ پلاسٹک سرجری کے بعد تو ایسی جائے گی جیسے تھوک کر گئی ہو۔"

اس نے تلملا کر کہا "تم میری توہین کر رہے ہو۔"

"وہ کر رہی ہے۔"

"میں اس کی ایسی کی تیسی کر دوں گا۔"

"کر دو۔ یہی تو سمجھا رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو اور پیو۔ بہت سی باتیں عقل سے نہیں' جنون سے سمجھ میں آتی ہیں۔ شراب عقل چھین لیتی ہے مگر جنون اور حوصلہ دیتی ہے۔"

شیشے کا دوسرا جام آ گیا۔ وہ پینے لگا۔ پہلے جام میں سرور پیدا ہوا تھا۔ دوسرے جام میں افق پر کالج والی ہری بھری رخسانہ للچانے لگی۔ فخری نے کہا "یہ اچھا موقع ہے تمہارے پاپا نہیں ہیں وہ فلیٹ میں اکیلی ہے۔"

"ہاں اکیلی ہے مگر رات کو دروازہ نہیں کھولے گی۔ شراب کی بو ملے گی تو اور بدک جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں' وہ کل بھی اکیلی رہے گی۔"

"ہاں مگر میں نشے میں ہی شیر بن سکتا ہوں اور وہ بو پاتے ہی بھڑک جائے گی۔"

"یار سیدھی سی بات ہے' وہسکی میں بو ہوتی ہے۔ فائن کوالٹی کی جن میں قریب سے بھی بو نہیں ملتی۔ کل تم وہائٹ پی لینا میرے شیر۔"

شیر کا سینہ تن گیا۔ اس نے تیسرے پیگ کا آرڈر دیا "کل' ہاں کل رات کو میں فلیٹ میں اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے جاؤں گا۔ میں دیکھوں گا کہ مجھے کچا سمجھنے والی کتنی پکی ہوئی ہے۔ ہاں' کل رات....."

اس نے شیشے کے نازک سے جام کی پتلی سی کمر کو دبوچ لیا۔

○☆○

جانی اب پاگل ہونے ہی والا تھا۔ بے چارہ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا لیکن وہ سیاہ ریشمی اور لمبے بال سمجھ میں نہیں آرہے تھے جو جانے کہاں سے آکر سینے سے لگ گئے تھے۔

جھورا پینٹر نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے پوچھا "استاد! ایک اور بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"کیا بات ہے؟" جانی نے بے چینی سے پوچھا "جلدی بولو۔"

"بولتا ہوں مگر پہلے اپنی ایک پرائیویٹ بات بتاؤ۔ دیکھو غصہ نہیں کرنا۔ بھابی کو رخصت کرنے سے پہلے تم نے انہیں گلے لگایا ہوگا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آگے بولو۔"

"اور کیا بولوں۔ صاف اور سیدھی بات ہے' وہ بال بھابی کے ہیں۔"

"نہیں ہیں۔ میری رخسانہ کے بال سنہری ہیں اور یہ بالکل کالے ہیں۔ یہ دیکھو۔"

اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا نکالی۔ جھورے سے کہا کہ وہ کار کے شیشے چڑھادے پھر اپنی طرف کے شیشے بھی چڑھا دیے۔ اس کے بعد اس ڈبیا کو احتیاط سے کھول کر کہا "یہ ہیں وہ بال۔ کہیں ہوا سے اڑ نہ جائیں۔ اس لیے کھڑکیاں بند کردیں۔"

جھورے نے انہیں غور سے دیکھا پھر تائید میں سرہلا کر بولا "ہاں یہ کالے ہیں۔ استاد! یہ کالا جادو تو نہیں ہیں؟"

جانی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا "کالا جادو؟ نہیں یہ بکواس ہے۔ میں جادو وادو کو نہیں مانتا۔"

"وہ تو ماننی ہوگی جو تمہیں زلفوں کی زنجیر سے باندھ رہی ہے۔"

"ارے میں تو خود بندھا ہوا ہوں۔ تم یہ سوچ کے جواب دو' وہ کل رات میرے پاس آئی تھی کہ نہیں آئی تھی؟؟"

"دو ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ آئی ہوگی' تم ہوش میں نہیں تھے۔ ہوش میں ہوتے تو اسے پکڑ لیتے اور اگر تمہارا یہ دعویٰ کہ تم زیادہ مدہوش نہیں تھے' اپنے سامنے والے کو پہچان سکتے تھے تو پھر وہ نہیں آئی ہوگی کیونکہ تم اسے پہچان لیتے۔"

"بال کا مسئلہ تو رہ گیا۔ یہ کہاں سے آئے؟؟"

جھورے نے چونک کر چٹکی بجائی' کہا "استاد! پکڑ لیا۔ دیکھو جب تک بھابی تمہارے پاس گھر میں تھیں' تمہاری وہ فرزانہ دور بھاگتی تھی' اب نہیں بھاگے گی۔ کل آئی ہوگی تو آج رات کو بھی آئے گی' ضرور آئے گی۔ آج تم بالکل نہ پینا۔"

"نہیں پیوں گا لیکن وہ نہ آئی تو؟"

"تو سمجھ لینا کہ وہ کل بھی نہیں آئی تھی۔ کہیں چھپی ہوئی سفلی عمل کرا رہی ہے۔ تمہیں بھابی سے پھیر دینے کے لیے اپنے بالوں سے باندھ رہی ہے۔ آج رات کو فیصلہ ہوجائے گا۔"

جانی نے ڈبیہ کو بند کرکے قمیص کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' آج تم بھی موجود رہنا۔ ویسے تو میں ہوش میں رہوں گا مگر میں ایک گواہ چاہتا ہوں وہ جو بار بار سامنے آکر گم ہوجاتی ہے' تو وہی ہوتی ہے یا میری آنکھیں دھوکا کھاتی ہیں۔ تم رہو گے تو تمہاری آنکھیں دھوکا نہیں کھائیں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ میں رات کو آٹھ یا نو بجے تمہارے ہاں آجاؤں گا۔"

وہ وہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر ناظم آباد پہنچا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ سسرال میں اپنے بیٹے کو گود میں لے کر چومتے وقت رخسانہ یاد آئی۔ شرم بھی آئی کہ سیاہ زلفوں میں الجھ کر ایک محبت کرنے والی شریک حیات کو بھلا دیا تھا۔ وہ کامی کو دل کی دھڑکنوں سے لگا کر دل ہی دل میں کہنے لگا "رخسانہ! کہاں ہو؟ کیا لندن پہنچ گئی ہو؟ میں

تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ بے شک کالے بال تمہاری یاد کو مٹائیں گے مگر ہماری اولاد ہم میں
سے کسی کو مٹنے نہیں دے گی۔"

ساس نے بڑے مزے کے کھانے پکائے تھے' خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد سستی
محسوس ہوئی۔ سونے کو دل چاہنے لگا پھر خیال آیا کہ رات کو جاگنا ہے اور آنے والی کا
انتظار کرنا ہے ابھی نیند پوری کر لینا چاہیے۔ وہ بیٹے کو گود میں لے کر ایک کمرے میں
گیا۔ وہاں پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک ننھے کھلونے سے کھیلتا رہا اور اسے دیکھ دیکھ
کر رخسانہ کے متعلق سوچتا رہا پھر سو گیا۔

آدھ گھنٹے بعد ساس کمرے میں آئیں۔ بچہ جاگ رہا تھا۔ جانی کی نیند میں خلل نہ ہو'
یہ سوچ کر وہ بچے کو وہاں سے اٹھانے لگیں۔ ایسے ہی وقت بستر پر وہ چھوٹی سی پلاسٹک کی
ڈبیہ نظر آئی۔ جو جانی کی جیب سے نکل پڑی تھی۔ شاید بیوی سے زیادہ ساس اپنے داماد کی
ٹوہ میں رہتی ہے' انہوں نے فوراً ہی ڈبیہ کو کھول کر دیکھا۔ دیکھتے ہی ہائے نکلی "ہائے! یہ
کس چڑیل کے بال ہیں؟"

انہوں نے کھڑکی کی طرف منہ کر کے ان بالوں کو چٹکی میں اٹھا کر دیکھا۔ یوں تو پہلی
ہی نظر میں خیال سیدھا فرزانہ کی طرف گیا تھا۔ ان بالوں کی لمبائی دیکھ کر تصدیق ہو گئی۔
وہ بچے کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئیں اور فرید احمد کو
اشارہ کیا کہ وہ پیچھے چلے آئیں۔ فرید احمد نے ان کے پیچھے بیٹھک میں پہنچ کر کہا "بیگم!
کتنی مدت کے بعد اشارے سے بلایا ہے۔ قسم سے بیس برس پیچھے چلی گئی ہو۔"

انہوں نے گھور کر دیکھا پھر اپنی چٹکی شوہر کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا "دیکھئے' یہ
کیا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولے "مجھ سے زیادہ کون دیکھے گا اور پہچانے گا۔ میں برسوں سے اس
چٹکی میں ہوں۔ بھئی یہ چٹکی ہے۔"

"آپ کا سر ہے۔ ذرا عینک لگا کر دیکھیں۔"

فرید احمد نے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں سے لگائی پہلے بال نظر آئے پھر بیگم
کے دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈبیہ نظر آئی "بھئی قصہ کیا ہے؟"

"وہی قصہ ہے جو میری بچی کی شادی سے چلا آ رہا ہے۔ ہماری جان پہچان کی عورتوں

میں صرف فرزانہ کے بال اتنے لانبے اور چمکیلے ہیں۔ جانی نے ان بالوں کو اس ڈبیہ میں
بڑی محبت سے رکھا ہے کیا رخسانہ کے جاتے ہی وہ جانی سے ملنے لگی ہے؟"

"بیگم! بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ جانی سے اس کا ملنا ایک الگ بات ہے لیکن وہ
ملنے کے بعد کیا اپنے بالوں کا تحفہ دے کر جاتی ہے؟"

"چولھے میں گیا اس کا تحفہ۔" وہ غصہ سے طنطناتے ہوئے کھڑکی کے پاس گئیں' پھر ان
بالوں کو ڈبیہ سمیت باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد پلٹ کر بولیں "میں اس حرافہ کو زندہ
نہیں چھوڑوں گی۔"

"جانی تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"کیا آپ ان بے شرموں کی حمایت کر رہے ہیں؟"

"میں اپنی بیٹی کا دشمن نہیں ہوں۔ تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ فرزانہ کو گالیاں دو گی کھلم
کھلا اس کی مخالفت کرو گی تو جانی تمہارا جینا دشوار کر دے گا۔"

"میں اس سے ڈرتی نہیں ہوں۔ کیا وہ مجھے قتل کر دے گا؟"

وہ چپ رہ کر منہ تکنے لگیں۔ فرید احمد نے کہا "ذرا تحمل سے کام لو۔ پہلے ہم چپ
چاپ معلوم کریں گے کہ فرزانہ جانی سے ملتی ہے یا نہیں؟"

"ملتی ہے وہ بال...."

"بال کی کھال نہ نکالو۔ ان پر نہ تو فرزانہ کا نام لکھا ہے نہ ہی وہ کوئی ٹھوس ثبوت
ہیں۔"

"یہ ثبوت کیا کم ہے کہ وہ انہیں ڈبیا میں حفاظت سے رکھتا ہے؟"

"اگر حفاظت سے رکھتا ہے تو وہ تمہارے ہاتھ کیسے آ گئے؟"

"وہ تو گہری نیند میں ڈبیہ اس کی جیب سے گر گئی تھی۔ میں نے دیکھا تو اٹھا کر لے
آئی۔"

فرید احمد نے پریشان ہو کر کہا "یہ تم نے کیا غضب کیا۔ وہ جاگتے ہی ڈبیہ کو تلاش
کرے گا۔ اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہو' وہ دیوانہ ہے۔ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر
اٹھا لے گا۔ محلے والے کیا کہیں گے؟"

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"غصے میں سوچنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔"

"میں غصے میں نہیں، ممتا میں اندھی ہو جاتی ہوں۔ میں اپنی بیٹی کی جگہ کسی چڑیل کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ابھی برداشت کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ جانتی ہو کیا ہوگا؟ جانی تم سے انتقام لینے کے لیے ایک تو فرزانہ سے شادی کر سکتا ہے دوسرے کامی کو یہاں سے لے جائے گا۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں "میں کامی کو نہیں لے جانے دوں گی۔"

"تم روکنے والی کون ہوتی ہو؟ وہ کامی کا باپ ہے۔ اپنے بیٹے کو تمہاری بیٹی کی سوتن کی گود میں ڈال دے گا۔ تم اس کے جاگنے سے پہلے وہ ڈبیہ بستر پر رکھ آؤ۔"

وہ دوڑنے کے انداز میں چلتے ہوئے باہر کھڑکی کے پاس آئیں اور ڈبیہ کو تلاش کرنے لگیں۔ ایک پودے کے پاس وہ ڈبیہ کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے مطمئن ہو کر کہا "مل گئی۔"

فرید احمد عینک لگائے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا "بال کہاں ہیں؟ کیا خالی ڈبیہ رکھو گی؟ وہ ہمارے سر کے بال نوچ لے گا۔"

دونوں میاں بیوی زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ مرغوں کی طرح گردن آگے بڑھائے دور دور تک دیکھنے لگے۔ بال ہوا میں اڑ گئے تھے۔ اب انہیں پانا ممکن نہیں تھا۔ فرید احمد نے زمین پر سے اٹھتے ہوئے کہا "مشکل ہے ادھر ہم ڈھونڈتے رہیں گے۔ ادھر وہ بیدار ہو جائے گا۔ اس ڈبیہ کو فوراً اس کے بستر پر پہنچانا ہوگا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولیں "میں خالی ڈبیہ رکھ آتی ہوں۔"

"وہ ہماری کھوپڑی خالی کر دے گا۔ اسے لاکھ سمجھایا جائے گا لیکن وہ یہی کہے گا کہ تم نے حسد اور جلن سے ان بالوں کو پھینک دیا ہے اور یہ درست ہے۔"

وہ جھنجلا کر بولیں "میں کیا کروں؟ کیا اپنے بال نوچ لوں؟"

"غصے کی حالت میں بال نوچے جاتے ہیں۔ تم آرام سے دو چار توڑ کر ڈبیہ میں بند کر دو۔"

"ایں؟" وہ سوچنے لگیں۔

"یہ سوچنے کا موقع نہیں ہے۔"

"مگر میرے بال اس چھوکری کی طرح لانبے نہیں ہیں۔"

"زیادہ چھوٹے بھی نہیں ہیں۔ وہ بالوں کی لمبائی نہیں دیکھے گا۔ ڈبیہ کھول کر دیکھے گا اور مطمئن ہوتا رہے گا۔"

وہ دونوں بیٹھک میں آ گئے۔ فرید احمد نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر عینک لگا کر بیگم کا سر ٹٹولنے لگے۔ کہیں سفید، کہیں سیاہ اور کہیں بھورے رنگ کے بال تھے۔ بہر حال چار عدد سیاہ بال توڑ کر ڈبیہ میں بند کر دیے گئے۔ بیگم نے ناگواری سے کہا "ایسا داماد ملا ہے کہ صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا، میری بیٹی کے جاتے ہی پر نکل آئے ہیں اس کے، پر کاٹ کے رکھ دوں گی۔ اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔"

ان کے بڑبڑانے کے دوران میں فرید احمد، جانی کے پاس اس ڈبیہ کو رکھنے چلے گئے۔

اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ دروازے کے پاس آئیں اور اسے کھولنے سے پہلے پوچھا "کون؟"

باہر سے آواز آئی "جی میں اورنگی ایک نمبر سے لیڈی ڈاکٹر فرزانہ کے گھر سے...."

بیگم کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ اندر جانی سو رہا تھا۔ باہر کوئی فرزانہ کا نام لینے والا آ گیا تھا۔ دروازے کے دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا، وہ پوری بات نہ سن سکیں۔ چند لمحوں کے بعد دوبارہ دستک سنائی دی پوچھا گیا "کیا آپ سن رہی ہیں؟"

وہ چونک کر بولیں "آں.... کیا کہہ رہے ہو بھائی؟"

"میں کہہ رہا ہوں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ان کا پڑوسی ہوں۔ مجھے آپ کا پتا بتایا گیا۔ میں خبر دینے...."

وہ خبر کیا سنتیں۔ ایک دم سے مارے خوشی کے اچھل پڑی تھیں۔ جھوم کر وہاں سے پلٹ گئی تھیں۔ پھر بھاگتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر پہلے اپنے شوہر کو خوش خبری سنانا چاہتی تھیں۔ اس کے بعد جانی کے دل پر بجلی گرانا چاہتی تھیں۔ اس سے پہلے فرید احمد بیٹھک میں آ گئے۔ بیگم اپنے آپ میں نہیں تھیں۔ ان پر ایسے لد گئیں جیسے وہ سہارا نہ بنتے تو گر پڑتیں۔ فرید احمد نے حیرانی سے کہا "یا حیرت! بڑھاپے میں لچھن دکھا رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

وہ خوشی سے انہیں جھنجوڑتے ہوئے بولیں "وہ مر گئی۔ میری بیٹی کی دشمن ہونے والی

سوتن مرگئی۔"

فرید احمد نے تعجب اور دکھ سے پوچھا "کون فرزانہ؟"

"ہاں۔ وہ باہر ایک آدمی اطلاع دینے آیا ہے۔"

وہ بیگم کو ایک طرف ہٹا کر تیزی سے چلتے ہوئے دروازے کے پاس آئے۔ اسے ایک جھٹکے سے کھولا۔ باہر ایک شخص سر جھکائے واپس جارہا تھا۔ انہوں نے آواز دی "سنئے صاحب کس کا انتقال ہوا ہے؟"

اس نے پلٹ کر کہا "ڈاکٹر فرزانہ واسطی کی والدہ چل بسی ہیں۔ مغرب کے بعد نماز جنازہ ہوگی۔"

فرید احمد نے پلٹ کر گھورتے ہوئے بیگم کو دیکھا وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ اب ان کا منہ لٹک گیا تھا۔ وہ بہت بلندی سے گری تھیں۔ فرید احمد نے قریب آکر پوچھا "کیا تمہارے کان بجتے رہتے ہیں؟"

وہ آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ "اس سے بڑا صدمہ کوئی نہ ہوگا کہ دشمن مر کر زندہ ہوجائے۔"

فرید احمد نے انہیں تھپکتے ہوئے کہا "وہ بن باپ کی بچی رو رہی ہوگی۔ چند لمحوں کے لیے فرزانہ کی ماں بن کر سوچو۔ وہ پے در پے حالات کی مار کھا رہی ہے۔ ذرا انصاف سے سوچو' وہ صرف اس بھول کی سزا پا رہی ہے کہ اس کے ہاتھوں سے رخسانہ کا چہرہ بگڑ گیا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو آج جانی اس کا ہوتا۔ ایک طرف اس نے شعوری طور پر قربانی دی ہے۔ دوسری طرف دل کے معاملات میں بھٹک رہی ہے۔ یہ انسانی کمزوری ہے۔ کوئی اور انسانی کمزوری ہمارے تمہارے اندر بھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہماری بیٹی کی سوتن بن جائے۔ ہاں اتنا کہتا ہوں کہ آج تم اس کی ماں بن جاؤ۔"

بیگم نے کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا۔ فرید احمد نے انگلی اٹھا کر کہا "کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچ لو۔ ادھر فرزانہ کے ماں باپ نہیں رہے' ادھر ہماری بیٹی ہماری جان بن ماں باپ کے جانے اکیلی کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ یہاں تم اس کے سر پر ہاتھ رکھو' وہاں کوئی اس کے سر پہ سایہ بنے گا۔"

بیگم نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے جان

سے پیاری' راج دلاری بیٹی کا آدھا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ ماں کے سینے سے ہائے نکلی۔ بند آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے تڑپ کر بولیں "رحم خدایا رحم' میں ابھی جا کر دشمن کو گلے لگاؤں گی۔ تو دشمنوں سے میری بچی محفوظ رکھ میرے مالک....."

وہ روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جانی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج کر چالیس منٹ ہوچکے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارادہ تھا کہ مغرب سے پہلے ہی اپنے گھر پہنچے گا۔ جانے وہ آنکھ مچولی کھیلنے والی کب آجائے۔ اس نے بستر پر پڑی ہوئی ڈبیہ کو کھول کر دیکھا۔ صرف ایک نظر ڈالی پھر اسے بند کرکے جیب میں رکھ لیا۔

بچہ چپ چاپ پڑا ہوا آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ بالکل رخسانہ جیسی بڑی بڑی سبز آنکھیں تھیں۔ جانی اسے اٹھا کر چومنے لگا پھر وہ اسے گود میں لیے دوسرے کمرے میں آیا۔ فرید احمد کو دیکھ کر بولا "بچے کو سنبھالیے۔ میں دیر تک سوتا رہ گیا۔ اب کمائی کی فکر کرنا ہے۔"

انہوں نے بچے کو لیتے ہوئے کہا "منہ ہاتھ دھو کر چائے پی لو پھر چلے جانا۔"

وہ جاتے ہوئے بولا "ٹائم نہیں ہے۔ میں باہر سے چائے پی لوں گا۔ رات کو کھانے نہیں آؤں گا۔"

وہ جواباً کچھ سنے بغیر باہر آکر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ دماغ میں وہ سمائی ہوئی تھی۔ اس کی دھن میں ٹیکسی چلاتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ وہاں بڑی ویرانی تھی اور ویرانی رہتی تھی وہ کیا جانتا تھا کہ جس کا انتظار ہو رہا ہے' وہ اپنی ماں کے سرہانے ماتم کررہی ہے۔

آٹھ بجے جُھورا پینٹر وعدے کے مطابق آگیا۔ رات کے بارہ بجے اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا "استاد! سوجاؤ۔"

جانی نے مایوس ہوکر کہا "اس نے میری نیند اڑادی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے تڑپا رہی ہے؟"

"اس کے نہ آنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کل بھی نہیں آئی تھی۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ تم یقین کرو' وہ اپنے بالوں سے تمہیں باندھ رہی ہے۔"

جانی نے بے یقینی سے پوچھا "کیا ایسا جادو ہوتا ہے؟"

"ضرور ہوتا ہے۔ ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں کہ کسی چڑیل کے بال اپنی مٹھی میں آجائیں تو وہ تابعدار بن جاتی ہے۔ اس کا بال جلاؤ تو وہ فوراً حاضر ہوجاتی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ سحرزدہ بالوں کو جلایا جائے تو بال والی کو تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ فوراً ہی گڑگڑاتے ہوئے حاضر ہوتی ہے اور ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے۔"

"کیسی باتیں کررہا ہے؟ فرزانہ چڑیل نہیں ہے۔"

"جو اپنے بالوں سے جنتر منتر کرے' وہ ایک طرح سے چڑیل ہوتی ہے۔ برا نہ ماننا' کیا تمہیں اس کی حرکتوں سے تکلیف نہیں ہورہی ہے۔"

"مت پوچھو۔ میں بڑے عذاب میں مبتلا ہوں۔"

"تو پھر آؤ۔ ہم ابھی آزمائیں گے کہ یہ جنتر منتر والے بال ہیں یا نہیں؟ انہیں جلاؤ اگر جادو ہوگا تو فوراً حاضر ہوجائے گی۔"

جانی نے ڈبیا کو سینے سے لگا کر کہا "نہیں جھورے! میں انہیں جلاؤں گا تو پھر میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔"

"جادو کا توڑ کرنا چاہیے۔ چلو سب نہ سہی ایک بال جلا کر دیکھ لو کچھ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کیا چکر ہے؟"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک بحث کرتے رہے پھر جانی راضی ہوگیا۔ جھورے نے ایک پرانے اخبار کے کئی ٹکڑے کیے انہیں دروازے کے سامنے ایک جگہ رکھ کر آگ لگائی۔ جانی نے ڈبیا کھول کر بڑی احتیاط سے ایک بال کو کھینچ کر نکالا۔ پہلے ڈبیا کو بند کرکے اسے جیب میں رکھا اور پھر دھڑکتے ہوئے دل سے اس بال کو آگ دکھانے لگا۔

ادھر آگ نے بال کو لپیٹ میں لیا۔ ادھر جادو نے اثر دکھایا۔ ایک رکشے کی آواز سنائی دی۔ آواز سے پتا چلا کہ رکشا مکان کے احاطے میں آکر رک گیا ہے۔ جانی اور جھورے نے شدید حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ جھورے نے دبی دبی آواز میں کہا "چچ.... چڑیل۔ بال جلانے سے وہی آتی ہے۔"

اب برآمدے میں قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں جلتی ہوئی آگ

کے سامنے اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے اٹھنا بھول گئے تھے۔ قدموں کی آواز دروازے کے پاس آگ کے سامنے آکر رک گئی۔ اب دھواں اٹھ رہا تھا دونوں نے آہستگی سے سر اٹھا کر دیکھا۔ دھوئیں کے پیچھے چڑیل مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹفن کیریئر تھا۔

جانی کے دیدے پھیل گئے تھے۔ حیرت سے منہ کھل گیا تھا۔ وہ بتیسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "بیٹے! ایک جگہ میت ہوگئی تھی۔ وہاں سے واپس آئی تو معلوم ہوا تم کھانا کھانے نہیں آئے۔ رخسانہ نے سختی سے تاکید کی تھی کہ تم نہ آؤ تو میں کھانا پہنچا دیا کروں۔ ہی ہی ہی۔"

جانی نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

○☆○

ڈاکٹر لوئیس مارکو ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا رخسانہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی عجیب حالت تھی وہ ڈاکٹر کی زبان سے خوش خبری سننا چاہتی تھی کہ چہرہ جلد ہی مکمل ہوجائے گا۔

قریب ہی ایک کرسی پر جمشید بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حالت بھی عجیب تھی۔ دل میں چور تھا۔ وہ چور نظروں سے رخسانہ کو دیکھتا تھا اور گھبرا کر سوچتا تھا' کب رات آئے گی؟ کب مراد بر آئے گی؟

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "مس! تمہیں مسٹر جمشید کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ تمہاری عدم موجودگی میں ہم ان کے تعاون سے تمہاری مکمل فیس اسٹڈی کرچکے ہیں۔ بلکہ ہم تمہارا چہرہ مکمل کرچکے ہیں۔"

رخسانہ نے چونک کر ڈاکٹر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ تو آدھی ہے' چہرہ کیسے مکمل ہوگیا؟ ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل کو کھولتے ہوئے کہا "تم نے پاکستان سے اپنی جتنی تصویریں مختلف زاویوں سے بھیجی تھیں' وہ سب آدھے اچھے اور آدھے بگڑے ہوئے چہرے کی رپورٹیں تھیں مگر یہ دیکھو ہم نے تمہاری ادھوری تصویر کو مکمل کردیا ہے۔"

اس نے ایک بڑی سی تصویر آگے بڑھائی۔ رخسانہ نے اس کو ہاتھ میں لے کر دیکھا

تو وہ حیران رہ گئی۔ تصویر میں چہرہ مکمل تھا۔ کہیں ایک تل برابر بھی عیب نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا "تم حیران ہو کہ یہ کیسے ہوا؟ سنو ہم نے تمہارے آدھے چہرے کے دو نیگیٹو تیار کیے پھر ایک نیگیٹو کو الٹ کر دوسرے نیگیٹو سے ملا دیا۔ اس طرح پرنٹ کے بعد یہ تصویر مکمل ہو گئی۔"

رخسانہ نے خوش ہو کر کہا "ڈاکٹر! میں نے ایک طویل عرصہ کے بعد خود کو مکمل دیکھا ہے۔ خواہ تصویر میں ہی سہی۔ پلیز یہ بتا دیں۔ میرا یہ عیب کب دور ہو گا؟"

وہ سوچتے ہوئے بولا "آئی سپوز... چھ ماہ سے دس ماہ کا عرصہ لگے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "یقیناً آپ اپنے طریقہ کار اور مختلف دشواریوں کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں لیکن میں ایک غریب الوطن ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں مگر ابھی تک پریکٹس شروع نہیں کی۔ یہاں میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ سرجری سے فائنل ٹچنگ تک جتنی دیر ہوتی رہے گی۔ میرے اخراجات اور میری پریشانیاں بڑھتی جائیں گی۔ اگر آپ ذاتی طور پر خصوصی توجہ دیں تو کم سے کم وقت میں میری مشکل آسان ہو جائے گی۔"

"میری کوشش یہی ہو گی۔ میں دوسرے ممالک سے آنے والوں کی پریشانیوں کو سمجھتا ہوں۔ میں کیا کروں' مجھے کتنے ہی ضرورت مندوں کو اٹینڈ کرنا پڑتا ہے۔ ہاؤ ایور میں کوشش کروں گا کہ تم جلد سے جلد اپنے وطن جا سکو۔"

"میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ یہاں میں فری رہتی ہوں اگر آپ کو اسسٹنٹ کی ضرورت ہو تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "ضرورت ہوئی تو ضرور یاد کروں گا۔"

ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا "پلیز رخسانہ فرید کا گراف اسکیچ اور رپورٹ لے آؤ۔"

وہ خاتون چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد مطلوبہ چیزیں آگئیں۔ ایک بہت بڑے گراف پیپر پر رخسانہ کے چہرے کے تفصیلی خطوط اسکیچ کیے گئے تھے۔ گراف کے چھوٹے سے چھوٹے خانے میں چہرے کا ایک ایک نقش نمبروار تھا۔ ان نمبروں کے مطابق دوسرے کاغذات میں مفصل رپورٹ درج تھی۔ ڈاکٹر لوئیس مار کو ان کی اسٹڈی کرتا رہا اور

رخسانہ سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرتا رہا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کی خوش اخلاقی نے بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ رخسانہ مطمئن ہو رہی تھی۔

پھر ڈاکٹر نے کہا "مسٹر جمشید! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو تھوڑا وقت ویٹنگ روم میں گزار لیں۔ ابھی ان کے چہرے کی جلد کی رنگت' خاصیت اور الرجسا کے رد عمل کا تجزیہ کیا جائے گا۔"

جمشید نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے آپ اندازہ بتا دیں کہ میں کب آجاؤں؟"

ڈاکٹر نے گھڑی دیکھ کر کہا "ابھی گیارہ بجے ہیں۔ بارہ تیس پر لنچ کا وقفہ ہے۔ آپ اس وقت مس کو لے جائیں۔ دو بجے پھر لے آئیں۔"

جمشید نے مسکرا کر رخسانہ کو دیکھا پھر ڈاکٹر کے چیمبر سے واپس آگیا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج کا دن نہیں گزرے گا۔ دل پر قیامت گزرتے گزرتے شاید رات آئے۔ وہ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ کاروبار کے سلسلے میں اپنے دفتر تک جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

وہ ایک پب میں آکر بیٹھ گیا۔ کار کی ڈگی میں آج شام کے لیے ایک بوتل محفوظ تھی۔ وہ بیئر پینے لگا۔ رخسانہ کی وہ تصویر نگاہوں کے سامنے تھی جس پر اس کا چہرہ مکمل تھا۔ کیا غضب کا حسن تھا ایک تو قد و قامت' پھر جسمانی صحت و جاذبیت بھی ایسی تھی جیسے قدرت نے بڑی فیاضی سے حسن کا سارا مال و متاع اسی کی ذات میں بھر دیا ہو۔ دوسرے وہ چہرہ مکمل ہو جاتا تو وہ کیا سے کیا ہو جاتی؟

وہ مغرور ہو جاتی اور غرور کمان نہیں ہوتا کہ خم کھا جائے تیر ہوتا ہے' ٹوٹ جاتا ہے یا نشانے کو چھید کر رکھ دیتا ہے۔

ابھی وہ آرزو تھی' پوری ہو سکتی تھی' صورت پوری ہو جاتی تو حسرت بن جاتی۔ ایسی حسرت جس پر دم نکلتا ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے ابھی سے دم نکل رہا ہو۔ سوا بارہ بجے کے قریب وہ پب سے نکل کر اسپتال پہنچا وہاں رخسانہ کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے بولا "کیا کھاؤ گی' انگریزی چینی یا ہندوستانی کھانا؟"

وہ بہت خوش تھی۔ چہکتے ہوئے بولی "پاکستانی کھانے کے لیے کیوں نہیں پوچھا؟"

"اس لیے کہ آج فلیٹ میں پکانے کے لیے دال چاول گرم مسالہ اور فریج میں گوشت وغیرہ کا اسٹاک نہیں ہے۔"

"پھر تو میں سینڈوچ کے دو پیس کھا کر چائے پی لوں گی اور بس۔"

"کیا ڈائٹنگ کا ارادہ ہے؟"

"آج میں اتنی خوش ہوں کہ مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔ ڈاکٹر انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے مجھ پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔"

جمشید نے ایک گہری سانس لے کر کہا "بے شک تم ایسی ہو۔ جس کے ساتھ دو گھڑی مل بیٹھوگی' وہ تمہارا ہو جائے گا۔"

انہوں نے ایک اوپن ریسٹورنٹ میں ہلکا سا لنچ کیا۔ جمشید نے ٹھیک دو بجے اسے دوبارہ اسپتال پہنچا دیا۔ وہاں سے وہ اپنے فلیٹ میں آیا۔ شکار کھیلنے سے پہلے کمین گاہ کا اچھی طرح جائزہ لینا پڑتا ہے کچھ ابتدائی تیاریاں ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً فلیٹ کے بیرونی دروازے کی چابی رخسانہ کے پاس تھی۔ وہ اس بہانے سے چابی لے آیا کہ فلیٹ اسپتال سے قریب ہے وہ وہاں جاکر آرام کرے گا۔ اب پلاننگ کے مطابق چابی اسی کے پاس رہے گی۔

وہ شام کو کچن میں پکانے میں مصروف رہے گی اور وہ چپ چاپ بیرونی دروازے کو مقفل کردے گا۔ جب پرواز کا راستہ مسدود ہو جائے گا۔ تو وہ بے بس پنچھی کی طرح پنجرے میں پھڑپھڑاتی رہ جائے گی۔

اس نے کار کی ڈگی سے شراب کی بوتل نکال کر اپنے پاپا کے بیڈ روم میں چھپا دی کچھ ایسے کیسٹوں کا انتخاب کیا' جن میں چیخنے والے آرکسٹرا کی دھنیں تھیں۔ تاکہ ہوس کے نقار خانے میں طوطی کی آواز سنائی نہ دے۔ مکمل انتظام کرنے کے بعد ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ فلیٹ سے باہر آیا۔ رخسانہ کو اسپتال سے پانچ بجے فرصت ملنے والی تھی۔ اس وقت تین بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے دروازے کو لاک کیا کار وہیں چھوڑ دی۔ اسپتال قریب ہی تھا۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں ادھر جانے لگا۔

اکثر گناہ یوں کیے جاتے ہیں' جیسے وہ گناہ نہیں' ہمارا حق ہو جمشید خود کو حق بجانب

سمجھ رہا تھا۔ پاکستان میں رخسانہ اس کے ہاتھوں بگڑی تھی۔ لندن میں اس کے ہاتھوں بن رہی تھی۔ آخر اپنی ہی تھی ہر مرد اپنی عورت کی تقدیر بگاڑتا اور بناتا ہے۔ جسے اپنا سمجھ لیتا ہے' اسے محبت سے' صبر سے یا جبر سے حاصل کر ہی لیتا ہے۔ رخسانہ کے رویے نے سمجھا دیا تھا کہ وہ صبر سے حاصل نہیں ہوگی۔ اس لیے جبر کا راستہ ہی رہ گیا تھا ایسی عورتیں پہلے پہل مانتی نہیں ہیں۔ منوانا پڑتا ہے۔ جانور کی طرح سدھانا پڑتا ہے پھر وہ سیدھی ہو جاتی ہیں۔

پانچ بجے وہ ڈاکٹر کے چیمبر سے باہر آئی۔ تمام دن کی تھکی ہوئی تھی مگر خوشی سے کھلی ہوئی تھی۔ اس نے جمشید کو اپنی تھکن کا علم ہونے نہیں دیا۔ ہوٹل کے اخراجات سے بچنے کے لیے خود پکانا چاہتی تھی۔ راستے کے کنارے چلتے ہوئے جمشید نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا "میں نے تمہارے متعلق بہت سوچا ہے۔ آخر ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی "مجھے یقین ہے۔ کسی اچھے نتیجے پر پہنچے ہوگے۔"

"ہاں میں نے سوچا ہے کہ مجھے تمہارے مزاج کے خلاف عشق و محبت کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہیے۔"

رخسانہ نے خوش ہو کر کہا "تم بہت سمجھ دار ہو جمشید۔"

جمشید نے دل ہی دل میں جل کر کہا "خود کتنی مکار ہے۔ اتنا بھی نہیں کہتی کہ چلو عشق نہ سہی محبت سے تو بولتے رہیں گے۔ مگر یہ نہیں بولے گی۔ اس نے ٹھیک کہا۔ میں سمجھ دار ہوں۔ اسے بھی سمجھا کر رکھ دوں گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "اگر تم میرے ایک سوال کا جواب دے دو تو میں کبھی شادی کا موضوع بھی نہ چھیڑوں گا۔"

"سوال کیا ہے؟"

"سوال آخری ہے۔ آخر مجھ سے ہی شادی کروگی نا؟"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر آہستہ آہستہ سانس چھوڑتے ہوئے کہا "تم نے پوچھا ہے تم سے شادی کروں گی یا نہیں؟ تمہیں پوچھنا چاہیے تھا کہ شادی کروں گی بھی یا نہیں۔"

وہ اندر ہی اندر تلملا گیا "اونہہ شادی نہیں کرے گی کیا میں نے صورت بنا کر صرف صورت دیکھنے کے لیے بلایا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا ہے' جو حسین عورت کو سامنے بٹھا کر ساری عمر دیکھتا رہا ہو' اور اسے ہاتھ لگائے بغیر مر گیا ہو۔ اگر کوئی ایسا شخص گزرا ہوا ہو تو ہو۔ میں ایسا نہیں ہوں۔"

وہ فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جمشید نے جیب سے چابی نکال کر دروازے کو کھولا۔ ایک طرف ہٹ کر رخسانہ کو اندر جانے کا راستہ دیا۔ وہ ایک کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی "میں ذرا لباس بدل لوں پھر کچن کا کام سنبھال لوں گی۔"

"اوکے میں باہر جا رہا ہوں ابھی آ جاؤں گا۔"

اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اندر سے گھبراہٹ شروع ہو گئی تھی۔ وہ کھلی فضا میں سانس لے کر اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ جو کچھ پیش آنے والا تھا۔ اس کے لیے ذہانت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ ذہانت اس وقت تک' جب تک کہ نشہ نہ ہو۔ نشے کے بعد حوصلہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

پندرہ منٹ کے بعد وہ دروازہ کھول کر اندر آیا۔ کچن سے رخسانہ کی آواز آئی "کون؟"

"ہاں میں ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کچن میں آیا "مے آئی ہیلپ یو؟"

"نو تھینک یو۔"

"کچھ اوپری کام لے لو۔"

وہ چولہے پر سالن کی ہانڈی چڑھاتے ہوئے بولی "مرد کچن کا کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔"

"اچھی بات ہے' میں پاپا کے بیڈ روم میں کتاب پڑھ رہا ہوں۔ ضرورت ہو تو بلا لینا۔"

وہ بیڈ روم میں آ گیا۔ فلیٹ کے اندر گہری خاموشی تھی وہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سن سکتا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ جلدی سے بوتل نکالی۔ کھڑکی کے پاس میز پر گلاس رکھا تھا۔ اس میں پہلا پیگ بنایا۔ باتھ روم میں جا کر اس میں پانی ملایا پھر غٹاغٹ پینے لگا۔ وہ عجلت میں پینے کا عادی نہیں تھا مگر اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے

کی جلدی تھی۔

گلاس خالی ہو گیا۔ وہ گہری گہری سانس لینے لگا۔ تھوڑی دیر تک واش بیسن کے سامنے جھکا رہا۔ آئینے میں خود کو دیکھتا رہا پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ گردن ذرا اکڑ گئی۔ اس نے آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنی خوب روئی کا یقین کیا۔ اس کے بعد آدھا گلاس پانی لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس بار اطمینان سے بیٹھ کر دوسرا پیگ تیار کیا اور ٹھہر ٹھہر کر پینے لگا۔

دوسرے گلاس کے ساتھ ساتھ کھوپڑی خالی ہونے لگی۔ سر کے خالی گنبد میں آواز گونجنے لگی۔ "آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ یہاں سے دھکے دے کر نکال دوں تو سڑکوں پر گشتی بن جائے گی۔ سوہو کے بدمعاش اٹھا کر لے جائیں گے۔ مگر نہیں' اپنی ہم وطن ہے۔ باہر بے عزت نہیں ہونے دوں گا۔ گھر میں عزت دوں گا لیکن یہ کم بخت میری نیکی کو سمجھتی نہیں ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا سا ڈگمگایا پھر سنبھل کر دروازے تک آیا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ کچن سے رخسانہ کے گنگنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا کمروں کے درمیانی کوریڈور میں آیا۔ وہاں ذرا رک کر معلوم کیا' کہیں وہ آ تو نہیں رہی ہے پھر مطمئن ہو کر بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ جیب سے چابیاں نکال کر اسے مقفل کر دیا۔ وہاں سے پلٹ کر سٹنگ روم کے دروازے کو پھر بیڈ روم کو لاک کیا۔ جائے پناہ تلاش کرنے والی کو کسی دروازے کے پیچھے پناہ نہیں مل سکتی تھی۔

اب اطمینان سے تیسرا پیگ حلق سے اتارا جا سکتا تھا۔ وہ کوریڈور سے گزرنے لگا پھر ٹھٹک گیا۔ سامنے سے رخسانہ آ رہی تھی۔ وہ بھی ٹھٹک گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ بولی "بہت دیر سے تمہاری آواز سنائی نہیں دی۔ میں دیکھنے نکلی ہوں کہ کیا کر رہے ہو۔"

وہ بدستور مسکراتے ہوئے نشیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا "میں تمہاری ہی گنگناہٹ سن رہا تھا۔ بڑی رس بھری آواز ہے' مجھے نشہ ہونے لگا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے کچن کی طرف جانے لگی۔ وہ اپنے پاپا کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ رخسانہ کچن کے دروازے پر رک کر اس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو دیکھ رہی تھی۔

جمشید نے بیڈ روم کے دروازے سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جلدی سے مسکراتے ہوئے کچن میں آگئی۔ جمشید کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کے لبوں سے مسکراہٹ ختم ہو گئی۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے خلا میں تکنے لگی۔ سامنے جانی کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم نظر آرہے تھے۔

اس نے کچن سے سر نکال کر دیکھا۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ کمرے میں بیٹھا پی رہا ہوگا۔ وہ جلدی سے باہر آئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے کوریڈور میں پہنچی۔ وہ کمرے میں جاکر اپنا ضروری سامان اٹھا کر فلیٹ سے باہر جانا چاہتی تھی لیکن وہ دروازہ مقفل تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بیرونی دروازے کے پاس آئی۔ اسے کھولنا چاہا۔ معلوم ہوا فرار کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ وہ پلٹ کر دانت پیستے ہوئے دور کوریڈور کے آخری حصے کو دیکھنے لگی۔

وہ غصے میں تھی اور خوف زدہ بھی تھی کیونکہ شیطان پھر شیطان ہوتا ہے۔ اگر غالب آجائے تو کیا ہوگا؟ وہ کس منہ سے جانی کے پاس جائے گی۔ اسے دھوکا دے کر آئی تھی اور کس بے حیائی سے دھوکا کھانے والی تھی۔ ایک عورت جو حسین اور جوان ہو کیا وہ مردوں کی دنیا میں کسی محافظ رشتے کے بغیر سلامت رہ سکتی ہے؟ اب ٹوٹنے اور بکھرنے کا وقت آگیا تھا تو یہ حقیقت سمجھ میں آرہی تھی۔

پہلے جی میں آیا کہ دروازے کو پیٹنا اور چیخنا شروع کردے پھر خیال آیا کہ بات قانون کے محافظوں تک پہنچے گی۔ معاملہ طویل ہوگا۔ پردیس میں رقم خرچ ہوگی جب کہ آمدنی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے کچن میں آئی پھر کانپتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ خوف سے اس کی جان نکلی جارہی تھی پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے چاقو کے دستے کو پکڑ لیا۔

اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے دانت پر دانت جمے ہوئے تھے۔ آنکھیں نفرت اور وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی مٹھی میں چاقو کانپ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی پھر دماغ نے روک دیا "کیا کررہی ہے۔ اگر شیطان کو قتل کرے گی تو سزائے موت تک پہنچے گی اور اگر وہ چاقو چھین کر غالب آگیا تو بے آبروئی کی سزا پائے گی۔ دونوں صورتوں میں بربادی ہے' ہائے کیا صورت بنانے آئی ہے؟"

چاقو پر سے گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ اب وہ جانی کو اپنے پاس دیکھ رہی

تھی۔ اس مدہوش کو سنبھال رہی تھی۔ وہ ڈگمگا رہی تھی۔ یہ سبق تو وہ برسوں سے پڑھتی آرہی تھی۔ گرنے والے کو سنبھالنا' بہکنے والے کو راہ پر لانا' بولنے والے کو چپ کرانا اور جاگنے والے کو سلا دینا اسے خوب آتا تھا۔

اس نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی "جمشید! میں آگئی ہوں۔"

کمرے کے اندر تیسرا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا۔ رخسانہ کی آواز سن کر خوش ہو گیا۔ جھوم کر بولا "آجاؤ میری جان! دل کا دروازہ کھلا ہے۔"

"پہلے یہ دروازہ تو کھولو۔" وہ غصے اور نفرت کو کچل کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

جمشید نے کہا "ایں' یہ بند ہے۔ کمال ہے پوچھتا بھی نہیں' بند ہو جاتا ہے۔"

اس نے جھومتے ہوئے آکر دروازے کو کھول دیا۔ سامنے رخسانہ بڑی دلربائی سے مسکرا رہی تھی۔ جمشید نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ وہ روٹھنے کے انداز میں بولی "بدمعاش کہیں کے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ پیتے ہو۔ جاؤ میں نہیں بولتی۔"

وہ غصہ دکھاتے ہوئے کمرے میں آگئی پھر بولی "تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ میں اپنے ہاتھوں سے پلاؤں۔"

"ایں؟" اس کی کھوپڑی ہواؤں میں اڑنے لگی "مم میں سمجھ رہا تھا۔ تم پینے والوں سے نرفت۔ آں نرفت۔ نہیں نفرت کرتی ہو۔"

"اب تو معلوم ہو گیا کہ نہیں کرتی مگر میں اس قابل کہاں ہوں۔ ابھی پلاؤں گی تو نہیں پیو گے۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "میں تمہارے ہاتھ سے زہر بھی پی سکتا ہوں۔ فلاؤ۔"

وہ میز کے پاس آئی اور بوتل کو کھول کر گلاس میں شراب انڈیلنے لگی۔ جمشید آگے بڑھا پھر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ ایک کرسی کا سہارا لے کر بولا "تم میری ہو۔"

"میں اس کی ہوں' جو پی کر بہکتا نہ ہو۔"

"میں نہیں بہکتا۔ لاؤ گلاس۔ ایں تم نے پانی نہیں ملایا۔ غلاس بھر دیا۔"

"مرد پانی ملا کر نہیں پیتے۔ وہ جو پاکستان میں ہے' وہ بوتل منہ سے لگا کر نیٹ پی لیتا

ہے۔"

اس نے گھور کر پوچھا "وہ کون؟"

"تم پیو' میں بتاتی ہوں۔"

اس نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پیا۔ دوسرا گھونٹ فوراً ہی پینے کا حوصلہ نہ ہوا۔ کیونکہ پانی کے بغیر شراب اتنی تیز اور ایسی آگ ہوتی ہے کہ حلق سے سینے تک جیسے پگھلی ہوئی آگ بہنے لگتی ہے۔ اس نے ہمت کرکے دوسرا گھونٹ حلق سے اتار لیا پھر پوچھا "وہ کون؟"

"وہ بہت زبردست پینے والا ہے۔ ایک روز اس نے میری کلائی پکڑلی۔"

اس نے گلاس کو ایک جھٹکے سے رکھتے ہوئے کہا "میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔"

"میں نے کلائی چھڑالی۔ صاف کہہ دیا کہ اس سے زیادہ پینے والا کوئی ملے گا تو میں شادی کروں گی۔"

"میں پیتا ہوں' اس سے زیادہ۔" اس نے گلاس اٹھایا آنکھیں بند کیں' ذرا سانس کو روکا اور چار گھونٹ پی گیا۔ اس کے بعد اس کی جو حالت ہوئی ہوگی' وہ خود جانتا ہوگا۔ رخسانہ نے فوراً ہی گلاس کو سنبھال لیا' اب وہ سنبھلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

آنکھیں بند کئے اپنے اندر جہنم کو دہکتا محسوس کر رہا تھا۔ اسے دور کہیں سے رخسانہ کی آواز سنائی دی "جمشید! بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھنے لگا۔ رخسانہ نے کرسی ہٹادی۔ گرنے کی کراہیں سنائی دیں۔ وہ فرش پر پڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے منظر واضح نہیں تھا۔ دھندلکے میں رخسانہ نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا اور وہ جھکی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

"تم مرد کیا ہوتے ہو؟ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑتے ہی عورتوں سے کمتر اور کمزور ہوجاتے ہو۔ تم میں اتنی سکت نہیں ہے کہ گلاس کو تھام سکو۔ میری کلائی کیا پکڑو گے۔"

اس نے گلاس کو اس کے منہ سے لگادیا۔ وہ پینا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بڑبڑا رہا تھا جیسے انکار کر رہا ہو۔ رخسانہ نے ایک ہاتھ سے اس کی ناک دبائی۔ اسے منہ سے سانس لینا پڑا۔ سانس کے ساتھ دو گھونٹ حلق سے اتر گئے۔ تیسرے گھونٹ میں زور کا ٹھسکا لگا۔ وہ اس سے دور جاکر کھڑی ہوگئی۔ جمشید بڑی نقاہت سے کبھی چاروں شانے چت ہوجاتا تھا۔

نشہ جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پینے والا اسی طرح کرب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

رخسانہ نے گلاس کو ایک طرف پھینک دیا پھر یک بیک دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی "ہائے' میں کہاں آکے پھنس گئی۔ امی! آپ کے مشورے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ آپ نے سکھایا تھا کہ جمشید کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہیے۔ ہم نے یہ نہیں سوچا کہ پرائے دیس میں' پرائے گھر میں اور پرائے لوگوں میں مجھ اکیلی کا کیا حشر ہوگا؟"

اس نے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا کر بھیگی آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "قصور جمشید کا نہیں' ہمارا ہے۔ اگر میں صاف اور سیدھی بات کہہ دیتی کہ میں شوہر اور بچے والی ہوں تو جمشید نارمل رہتا۔ شاید مجھ سے مایوس ہو کر پردیس میں میرا مددگار نہ بنتا۔ بلا سے' میں اپنے شوہر کی بھرپور امداد لے کر چار پانچ سال کے بعد آتی مگر یہاں آکر جمشید کے لیے کنوارا چیلنج تو نہ بنتی۔"

بہت سی باتیں وقت پر سمجھ نہیں آتیں۔ یہی رخسانہ پلاسٹک سرجری کے لیے اتنی بے چین تھی کہ چار پانچ برس تک انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ ماں کی باتوں میں آگئی۔ خود نادان نہیں تھی' چہرے کو جلد سے جلد مکمل کرانے کی نادانی کرچکی تھی اور اب؟

اب وہ تکمیل کیسے ہوگی؟ اس فلیٹ کی دیواریں تنگ ہوگئی تھیں۔ وہ جمشید کا ساتھ چھوڑ کر بے گھر ہورہی تھی۔ اس کے پاس کل تین ہزار پاؤنڈ تھے۔ اتنی رقم سے کہیں رہنے کھانے پینے اور پلاسٹک سرجری کے اخراجات پورے نہیں ہوسکتے تھے۔ اب ادھورے چہرے کی تکمیل کیسے ہوگی؟

اسے رونا آرہا تھا مگر وہ آنسوؤں کو ضبط کر رہی تھی۔ دانت پر دانت جمائے' ہونٹوں کو سختی سے بھینچے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ بروقت ذہانت سے عزت بچ گئی تھی مگر آگے ابھی کتنے ہی اندیشے تھے۔ فلیٹ کے باہر جانے کتنے جمشید ہاتھوں میں پتھر لیے کھڑے ہوں گے۔

ے سزا ملی یہ ثمر دار پیڑ بننے کی
کہ عمر بھر مری قسمت میں صرف پتھر تھے

وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ نشے کی انتہا میں گم تھا یا سوچکا تھا۔ رخسانہ نے

اس کے پاس بیٹھ کر جیبوں کی تلاشی لی اور چابیاں حاصل کرلیں پھر وہاں سے اٹھ کر دوسرے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی "پہلے چہرہ بگڑا تھا۔ اب حالات بھی بگڑ گئے۔ یہاں سے واپس جاؤں گی تو جانی سے کیا کہوں گی؟ وہ پوچھیں گے کہ انکل جمشید نے اتنی دور بلایا' اتنی رقم خرچ کرائی پھر ساتھ کیوں نہ دیا؟ میں ناکام واپس کیوں آئی؟"

وہ بیڈ روم میں آکر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ جمشید کے پاپا باقر علی نے وعدہ کیا تھا کہ پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں جتنی رقم کی ضرورت ہوگی' وہ قرض کے طور پر دیں گے۔ رخسانہ وہ تمام رقم قسطوں میں ادا کرے گی۔ قرض کا لین دین انسانی خلوص اور ہمدردی کی بنا پر تھا۔ خلوص کو جمشید نے مار ڈالا اور ہمدردی کوئی یونہی نہیں کرتا۔ باقر علی کا بھی ایک مقصد تھا۔ وہ اسے بہو بنانا چاہتے تھے لہٰذا اب ان سے قرض لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تمام سامان پیک ہوگیا پھر سے ایک نئے سفر کا آغاز تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا سا پہیہ دار سوٹ کیس، ایک اٹیچی' ایک باسکٹ اور ایک سفری بیگ تھا۔ اس نے بیگ کو شانے سے لٹکایا۔ ایک ہاتھ میں اٹیچی لی۔ باسکٹ وہیں چھوڑ دی پھر سوٹ کیس کو فرش پر چلاتی ہوئی باہر دروازے تک آئی۔ اسے چابی سے کھولا اور باہر نکل گئی۔

باہر رات کالی تھی۔ آسمان کالا تھا۔ اجنبی شہر تھا۔ راستے بہت تھے اور منزل ایک نہ تھی۔

میرے جانی' میرے سر کے تاج! میرے آسمان! آج انکشاف ہوا کہ جو عورت اپنے آسمان کے سائے سے نکل جاتی ہے' اس کے پاؤں تلے سے زمین بھی سرک جاتی ہے۔

مگر جانی! میں ابھی واپس نہیں آؤں گی۔ میں انسان ہوں۔ مجھے اپنی تکمیل کا حق پہنچتا ہے۔ میں یہاں مرجاؤں گی یا اپنا چہرہ مکمل کروں گی۔ زمانے کو دکھاؤں گی کہ ایک اکیلی عورت کا عزم کیا ہوتا ہے۔

خدایا میرے عزم اور حوصلے کی لاج رکھنا۔

ادھر تیری خدائی ہے اور تو ہے۔

ادھر شہر دشمناں ہے اور میں ہوں۔

○☆○

جانی نے الماری کھولی۔ اندر سے خارج ہونے والی دھیمی سی مہک نے اسے گھیر لیا۔ جب بھی وہ الماری کھولتا تھا' اپنی بیوی کی شناخت کا ایک جھونکا آتا تھا۔ وہ چند لمحوں تک گم صم کھڑا رہا۔ اس کے سامنے رخسانہ ہی رخسانہ تھی جو لباس وہ چھوڑ گئی تھی' وہ تہ بہ تہ رکھے ہوئے تھے۔ ہینگر سے پتلون کے ساتھ ساڑھیاں لٹک رہی تھیں۔ سائیڈ ہینگر میں دوپٹوں کے ساتھ ایک پراندہ نظر آرہا تھا۔

اس نے پراندے کو تھام لیا۔ وہ ہنسنے' کھلکھلانے لگی "چھوڑو اللہ! چھوڑو نا میری چوٹی....."

جب وہ ہنستی تھی تو پایلیاں بجتی تھیں۔ کانوں میں سر بولتے تھے اور سرور گھولتے تھے۔ ایک ایک پل کی ایک ایک سانس کی شریک رہ کر جاتی ہے' وہ جاتی مگر سانس کی طرح آتی ہے۔ کہیں سے صدا آتی ہے تو اس نا سرگوشی کا گمان ہوتا ہے۔ کسی کا آنچل لہراتا ہے تو وہ جھلکتی ہے۔ کہیں سے خوشبو آتی ہے تو وہ سانسوں میں بھر جاتی ہے۔ کوئی بے مروت لاکھ بھلاتا رہے' اسے یادوں کا ٹھکا ضرور لگتا ہے۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ جھورا پینٹر پوچھ رہا تھا۔ "تم کب تک الماری کے اندر جھانکتے رہو گے؟ کچھ سوچ رہے ہو کیا؟"

"ہاں۔" جانی کے منہ سے ہاں ایسے نکلی جیسے ہائے نکل رہی ہو "جھورے! وہ بہت یاد آرہی ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں عامل بابا کے پاس چلو۔ جب تک جادو کا توڑ نہیں ہوگا' وہ یاد آتی رہے گی۔"

"میں فرزانہ کی نہیں' اپنی جان کی بات کررہا ہوں۔"

"جان؟ یعنی کہ بھابی جان؟" اس نے حیرانی سے پوچھا "استاد! تم سمجھ میں نہیں آتے۔ محبوبہ کو یاد کرتے کرتے ایک دم سے اپنی گھروالی کے پاس پہنچ جاتے ہو۔"

"وہ بہت اچھی ہے۔ میں اس کی یاد دماغ سے نکالتا رہتا ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ اس کی یاد آنے سے گھبراہٹ شروع ہوجاتی ہے۔ یہ خیال بے چین کرتا ہے کہ وہ اکیلی جان پردیس میں ہے۔ وہ کہاں ہوگی؟ کیا کررہی ہوگی؟ اس پر کوئی مصیبت نہ آئے' اسے کوئی نہ ستائے۔ کوئی ستائے گا' وہ روئے گی تو میں غیرت سے مرجاؤں گا۔ میں اس کا

مرد ہوں۔ اس کی حفاظت میری ذمے داری ہے' میں اتنی دور سے اس کی حفاظت نہیں کر سکتا اس لیے گھبرا کر اس کی یاد سے پیچھا چھڑاتا رہتا ہوں۔"

جھورے نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ بھابی کو خوب یاد کرتے رہو۔ فرزانہ کے جادو کا توڑ عامل بابا کے پاس نہیں۔ بھابی کے پاس ہے۔ دیکھ لو' ان کی یاد کی آندھی چلی ہے تو فرزانہ کو بھول گئے ہو۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا "فرزانہ کے لیے عامل بابا سے ملنا ہی ہوگا۔ کوئی ایسا عمل ہو جائے کہ وہ مجھے مل جائے یا پھر اس کا خیال میرے دل سے نکل جائے۔"

وہ الماری سے کپڑے نکال کر پہننے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر عامل بابا کے پاس جا رہے تھے۔ جھورے نے کہا "میرا خیال ہے' تم بھابی کو زیادہ چاہتے ہو۔"

"بے شک چاہتا ہوں۔"

"فرزانہ کو کم چاہتے ہو؟"

"کم اور زیادہ کا پتا نہیں چلتا ہے۔ فرزانہ کی یاد محبت سے شروع ہوتی ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو نفرت ہوتی ہے۔ غصہ آتا ہے۔ ایسے وقت مل جائے تو میں اسے قتل کر دوں۔"

"مشکل یہ ہے کہ تم کسی ایک طرف نہیں سوچتے ہو۔ کوئی ایک بات بولو۔ اسے محبت سے پانا چاہتے ہو یا قتل کرنا چاہتے ہو؟"

اس نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا "سوچتا ہوں' اس نے مجھے دھوکا دیا ہے اور اپنے پیچھے دوڑا رہی ہے۔ ایسے ہی نہ جانے اور کتنے نوجوانوں کو دیوانہ بنا رکھا ہوگا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو اپنے پیچھے دوڑا رہی ہوگی۔ اسے تو قتل ہی کر دینا چاہیے۔"

"استاد! گاڑی روک دو۔ میں تمہارے ساتھ پھانسی کے تختے تک نہیں جانا چاہتا۔"

"تم بزدل ہو۔ نہ وہ ابھی مل رہی ہے نہ ابھی میں انتقام لے رہا ہوں۔"

"کیا پتا وہ ابھی مل جائے۔ عامل بابا اسے حاضر کر سکتے ہیں۔"

"دیکھ جھورے! محبت اس کو بولتے ہیں کہ وہ خود ملنے آ جائے۔ اگر عامل بابا اسے حاضر کریں یا میں اسے ڈھونڈ نکالوں تو یہ میری محبت اور اس کی بدمعاشی ہوگی۔ جی چاہتا

ہے وہ ملے تو پہلے اس کی ایک ٹانگ توڑ دوں پھر وہ بھاگ نہیں سکے گی۔ بھاگے گی تو لنگڑی ہزاروں میں پہچان لی جائے گی۔"

"ابھی وہ ملے گی۔ جیسے بھی ملے گی۔ تم دماغ ٹھنڈا رکھ کر سوچو۔ وہاں لندن میں بھابی اکیلی ہیں۔ خدا نہ کرے' ان پر کوئی مصیبت آئے تم یہاں فرزانہ کے ساتھ زیادتی کرو گے تو جیل میں جاؤ گے۔ بھابی کے کسی کام نہیں آسکو گے۔ یہاں تک کہ چار پیسے کما کر بھی یہاں سے نہیں بھیج سکو گے۔"

جانی نے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے ٹیکسی روک دی۔ اس مکان کے دروازے پر ایک زنگ آلود سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر عامل بابا کا نام جلی حروف سے لکھا ہوا تھا۔ نام کے اوپر نیچے لکھا گیا تھا۔ "محبوب قدموں میں جھکے گا۔ دشمن خون تھوکے گا' ملازمت شرطیہ ملے گی۔ ہر مراد پوری ہوگی۔ آزمائش شرط ہے۔"

دو شخص عامل بابا کے مکان سے باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے جانی سے پوچھا "لانڈھی چلو گے؟"

"ابھی نہیں' میں بابا سے ملنے آیا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ تم بھی کوئی مراد پوری کرانے آئے تھے؟"

دوسرے شخص نے مسکرا کر کہا "میرا یہ دوست ایک کافر حسینہ کے عشق میں گرفتار ہے۔ اسے اپنے قدموں میں جھکانے کے لیے تعویذ لے جا رہا ہے۔"

جانی نے اس عاشق کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے' آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں سگریٹ نوشی کی زیادتی سے ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ اس میں ایسی کوئی جاذبیت نہیں تھی کہ عورت اس کی طرف مائل ہو جاتی۔

جانی نے تعجب سے پوچھا "کیا وہ حسین عورت تمہارے تعویذ پر عاشق ہوگی؟"

ایک پسلی کے عاشق نے سینہ تان کر کہا "مجھ پر ہوگی۔"

"بھائی صاحب! کیسے ہوگی۔ کیا تم بیمار اور پچکے گالوں والی عورت سے شادی کر سکتے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر یہ کیوں سوچتے ہو کہ کوئی تمہارے پچکے گالوں کو طاق بنا کر بیٹھ جائے گی۔ بے

شک تم انسان ہو۔ تمہیں محبت کرنے کا حق ہے مگر آدمی کو پہلے تندرستی سے محبت کرنی چاہیے۔ کتنی عجیب سی بات ہے' ہم کسی کے دل میں اترنے کے لیے آنکھوں میں سُرمہ لگاتے ہیں' خوب اچھی طرح شیو کرتے ہیں' چہرے پر اسنو ملتے ہیں' اتنا نہیں سمجھتے کہ سنگار اور حسن صرف تندرستی ہے۔ صحت مند انسان ایک ایسا کھلا ہوا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا' کبھی اس پر خزاں نہیں آتی۔ ان پر آپ ہی آپ محبتوں کی بہار آتی رہتی ہے۔"

جھُورے نے کہا "استاد! جانوروں کو سدھاؤ۔ انسانوں کو نہ سمجھاؤ۔ ہم سب کو آئینہ دھوکا دیتا ہے۔ غلطی ہماری ہے۔ ہم نے کوئی ایسا آئینہ نہیں بنایا جو ہمیں انسانی حُسن کا راز بتا سکے۔"

دُبلا پتلا عاشق ناراض ہو کر اپنے ساتھی کے ساتھ چلا گیا۔ وہ دونوں مکان میں داخل ہوئے۔ ایک بڑے سے کمرے کے آخری حصے میں لکڑی کا تختہ بچھا ہوا تھا۔ اس پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ چادر پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ جھورے نے آگے بڑھ کر ادب سے کہا "بابا جی! یہ بادشاہ جانی ہے۔ کل میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"

بابا نے گھور کر اپنی سرخ آنکھوں سے جانی کو دیکھا۔ جس طرح دائی سے پیٹ نہیں چھپتا' اسی طرح ایک نشہ باز دوسرے نشہ باز سے چھپ نہیں سکتا۔ بابا کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہی جانی نے دل میں کہا۔ بابا جی نے ابھی چرس کا دم لگایا ہے۔

"بول بچہ کیا چاہتا ہے؟"

"میں جسے برسوں سے تلاش کر رہا ہوں' وہ نہیں ملتی۔"

"وہ مردہ ہے تو نہیں ملے گی۔ زندہ ہے تو مل جائے گی۔"

"زندہ ہے مگر لاپتا ہے۔"

"جو لاپتا ہے' وہ تمہارے پتے پر آئے گی۔"

"کب آئے گی؟"

"جب ایک بکرا آئے گا۔ اس کے گوشت پر پڑھ کر پھونکا جائے گا اور کراچی کے ہر محلے میں گوشت کی ایک ایک بوٹی پھینکی جائے گی مگر....."

"مگر کیا؟" جانی نے بے چینی سے پوچھا۔

"مگر وہ بکرا ہمارا آدمی خریدے گا۔ وہ ذبح کرے گا۔ وہی تمام محلوں میں بوٹیاں پھینک کر آئے گا۔ بکرے کی قیمت ہمارے آدمی کو دے دے۔"

کمرے کے گوشے میں بیٹھا ہوا ایک شخص اٹھ کر جانی کے پاس آیا پھر آہستگی سے بولا "موٹا بکرا سات سو روپے میں اور دبلا تین سو میں آتا ہے۔ گوشت جتنا ہوگا' اتنے ہی زیادہ محلوں میں پہنچے گا۔"

جانی نے جیب سے روپے نکال کر سو سو کے سات نوٹ دیتے ہوئے کہا "کراچی میں رہنے کا یہ نقصان بھی ہے۔ اگر بھائی پھیرو میں رہتا تو مرغی سے کام چل جاتا۔"

پھر اس نے بابا جی سے پوچھا "کیا وہ خود ہی میرے پاس آئے گی؟"

"ہاں' خود آئے گی مگر....."

"مگر کیا؟"

"تو جس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی کوئی نشانی تیرے پاس ہوگی۔ مثلاً محبوبہ کا رومال یا اس کی انگوٹھی وغیرہ۔"

"جی نہیں میرے پاس اس کی کوئی نشانی نہیں ہے۔"

جھُورے نے کہا "کیا کہہ رہے ہو استاد! اس کے بال تمہارے پاس ہیں۔ بابا جی! آپ بھی بھول گئے۔ کل میں نے بتایا تھا کہ محبوبہ نے غائب ہونے سے پہلے اپنے بال استاد کے پاس پہنچا دیے ہیں۔"

بابا نے جانی کو گھور کر کہا "ہوں سمجھ گیا بچہ تجھ پر جادو کیا جا رہا ہے۔ میں اس کا جادو اس پر لوٹا سکتا ہوں مگر....."

"مگر کیا؟"

"وہ بال مجھے دے دے۔ وہ جس محلے میں ہوگی' پہلے وہاں بکرے کی بوٹی پہنچے گی پھر میں ان بالوں پر عمل پڑھ کے انہیں ہوا میں اڑاؤں گا پھر وہ جیسے اڑتے ہوئے تیرے پاس آئے گی۔"

جانی نے جیب سے وہ ڈبیہ نکالی پھر ہچکچاتے ہوئے پوچھا "کیا ایک بال سے کام چل جائے گا؟ اس ڈبیہ میں چار بال تھے۔ پچھلی رات ایک بال کو جلایا تو ساس پہنچ گئی۔ ایک

آپ کو دوں گا۔ تو دو رہ جائیں گے۔"

"لا۔ ایک ہی دے دے۔"

اس نے بڑی احتیاط سے ایک بال ڈبیہ سے نکال کر دیتے ہوئے پوچھا "کیا وہ آج ہی میرے پاس نہیں آسکتی؟"

"آسکتی ہے مگر..... اتنے بڑے شہر میں ایک ہی دن کے اندر گوشت کی بوٹیاں پھینکنا ممکن نہیں ہے۔ اگر تجھے شبہ ہے کہ فلاں محلے میں رہتی ہے تو بتادے۔ پہلے اسی محلے کی طرف عمل کیا جائے گا۔"

"بابا جی! پہلے وہ عباسی شہید اسپتال کے پاس ناظم آباد میں رہتی تھی۔ وہاں سے کہیں چلی گئی۔ ہاں ایک بار اس بادامی برقعے کو اورنگی ایک نمبر میں دیکھا ہے مگر....."

"تو اپنی محبوبہ کے سر کا ایک بال اپنے گھر کے دروازے پر باندھ دے۔ وہ عورت بہت بری حالت میں گرتی پڑتی تیرے قدموں میں آگرے گی۔"

جانی تھوڑی دیر تک ہدایات سنتا رہا پھر جھورے کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔ باہر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا "چرس کا دم لگانے والے بھلا کیا عمل کرتے ہوں گے مگر دل کا معاملہ ہے۔ مجبوراً بابا جی کو سات سو روپے دیئے۔ اب بھی وہ نہ ملی تو۔"

اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ غصے سے ایک گہری سانس لی پھر کہا "تو صبر کروں گا۔ اس کی موت میرے ہاتھوں ہوگی۔ جب بھی وہ ملے گی۔"

جھورے نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر گھبرا کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ جانی نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا "استاد! ابھی تو مجھے معاف کردو۔ اگر کل تم جیل یا حوالات میں نہ رہے تو ضرور آکے ملوں گا۔"

وہ جواب سنے بغیر تیزی سے چلتا ہوا قریب ہی ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جانی چند لمحوں تک چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ اس نے سوچا دوپہر کو دو بجے تک ناگن چورنگی جانے والی کوئی سواری ملے گی تو وہ گھر جاکر دروازے پر ایک بال کو باندھ دے گا اور شام تک عامل بابا کی کرامت کا منتظر رہے گا۔

ایک جگہ تین برقع پوش عورتیں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھیں۔ وہ اورنگی ٹاؤن جارہی تھیں، جانی ادھر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ تین برقعے تین مختلف رنگ کے تھے۔ ایک کالا، ایک سفید اور ایک بادامی تھا۔ ایک بار بادامی برقع پچھلی سیٹ پر پھول کی پتیاں، بکھیر کر گیا تھا۔ دوسری بار ائرپورٹ پر کالے برقعے نے فرزانہ کا اشارہ دیا تھا۔ وہ دو برقعے والیاں، تیسری سفید برقعے والی کو فری کہہ کر مخاطب کررہی تھیں۔

کسی فریدہ یا فیروزہ کو بھی فری کہا جاسکتا ہے مگر جانی کے خیال میں فرزانہ کا مخفف زری تھا' یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ راستے میں سفید برقعے والی نے اپنے ہونٹوں کی سرخی کا جائزہ لینے کے لیے پرس سے آئینہ نکالا اور نقاب کو الٹ دیا۔ جانی نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ ورنہ ان تینوں برقعے والیوں کو گاڑی سے دھکا دے کر باہر پھینکنے کا جی چاہنے لگا تھا۔ صرف وہ کم بخت دھوکا نہیں دے رہی تھی، اس کا نام بھی چکرا دیتا تھا۔

وہ تینوں حاجی ہوٹل سے ذرا دور جاکر اتر گئیں۔ اب وہ سواری اٹھائے بغیر اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے گاڑی کو موڑ کے آگے بڑھایا۔ آگے لوگوں کی بھیڑ نظر آئی کتنے ہی جوانوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ اس نے ٹیکسی روک دی۔ ایک نے کہا "ایک بزرگ چکرا کر گر پڑے ہیں۔ انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

دوسرے جوان نے کہا "یہاں بالکل قریب ہی ڈاکٹر فے واسطی کا کلینک ہے۔ بڑے میاں کو پچھلی سیٹ پر لے آؤ۔"

جانی کی نگاہوں کے سامنے بادامی برقع پہنے وہ معمر خاتون نظر آئیں جنہیں وہ کلینک کے دروازے پر دیکھ چکا تھا۔ کچھ لوگ بڑے میاں کو پچھلی سیٹ پر لے آئے تھے اور خود بھی گاڑی میں گھس کر بیٹھ گئے تھے۔ کلینک زیادہ دور نہیں تھا۔ دو منٹ میں ٹیکسی وہاں پہنچ گئی۔ لوگ بڑے میاں کو اٹھا کر اندر لے گئے، جانی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا رہ گیا۔

اسے وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ گھر جاکر عامل بابا کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے تھا مگر کوئی چیز اسے اس کلینک سے باندھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جس معمر عورت کو اس نے کلینک کے اندر برقعے میں دیکھا تھا۔ اسی عورت کو تھوڑی دیر بعد بے پردہ کلینک سے دودھ والے کی دکان تک جاتے دیکھا تھا، کبھی پردہ اور کبھی بے پردگی کا طور سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ ٹیکسی سے نکل کر باہر آیا اور بڑے سے سائن بورڈ کو پڑھنے لگا۔

لیڈی ڈاکٹرنے۔ واسطی کے جلی حرفوں پر فرزانہ کا چہرہ طلوع ہونے لگا۔ اسی وقت کلینک سے باہر آنے والے ایک جوان نے باہر کھڑے ہوئے کچھ لوگوں سے کہا "ویسے تو آج کل کلینک بند ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا نا؟ بے چاری بہت اچھی ہے صدمے کے باوجود بڑے میاں کا معائنہ کر رہی ہے۔"

جانی نے بڑی توجہ سے یہ بات سنی۔ اس کے دماغ نے کہا "اس روز میں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ یہاں اس معمر خاتون کی بیٹی بھی رہتی ہوگی۔ والدہ کا انتقال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو بیٹی زندہ ہے' وہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ بے پردہ' دودھ دینے والے کی دکان تک گئی تھی اور برقعے والی اندر تھی۔"

یہ سوچتے ہی وہ تیزی سے چلتا ہوا کلینک میں داخل ہو گیا۔ وہاں کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے پاس مریضوں کے معائنے کے لیے چھوٹا سا بیڈ پڑا تھا۔ اس پر بڑے میاں لیٹے ہوئے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر فرزانہ واسطی پاس کھڑی انجکشن تیار کرنے میں مصروف تھی۔

جانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ فرزانہ واسطی جس سے آنکھ مچولی کا واسطہ تھا۔ آج وہ بالواسطہ نہیں بلاواسطہ نگاہوں کے سامنے تھی۔ جانی فوراً دو آدمیوں کے پیچھے ہو گیا۔ ابھی وہ نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ آج وہ اس کے بھاگنے کے راستے مسدود کرنا چاہتا تھا اس کی نظر اندرونی دروازے پر گئی۔ وہاں پردہ لٹک رہا تھا۔ فرزانہ نے کسی سے کہا "ذرا میرے کمرے میں جا کر تکیہ لے آیئے۔"

وہ شخص پردہ ہٹا کر اندر کمرے میں آگیا۔ جانی سمجھ گیا کہ فرزانہ کی رہائش گاہ بھی یہی ہے۔ اندر سے تکیہ آگیا۔ فرزانہ نے اسے بڑے میاں کے سر کے نیچے رکھا بازو میں انجکشن لگایا پھر گہرے صدمے اور سنجیدگی سے بوڑھے چہرے کو دیکھ کر اپنے ابو کو یاد کرنے لگی۔ پہلے ابو دنیا سے گئے پھر امی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ آج کہیں سے کسی رشتے دار یا اپنے پرائے کی محبت کی جھوٹی تسلی بھی نہیں تھی۔ تنہائی کے عذاب کو وہی سمجھتا ہے جو انسانوں کی محفل میں اکیلا اور اجنبی ہو۔ کوئی اسے پوچھتا نہ ہو۔

بڑے میاں کو ہوش آگیا۔ آنکھ کھولتے ہی انہوں نے فرزانہ کو توجہ سے دیکھا' وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلیاں دینے لگی۔ انہوں نے پوچھا "تمہاری شادی ہو چکی

ہے؟"

وہ ایسے غیر متوقع سوال سے ذرا پریشان ہوئی پھر انکار میں سر ہلایا۔ انہوں نے پوچھا "ابھی شادی نہیں ہوئی پھر زندہ کیوں ہو؟"

یہ کہتے ہی وہ رونے لگے۔ سب ہی ان کے قریب آگئے۔ ایک نے پوچھا "چچا میاں' آپ کو کیا دکھ ہے؟"

دوسرے نے پوچھا "آپ بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟"

تیسرے نے پوچھا "آپ اتنی دھوپ میں کہاں جا رہے تھے؟"

بڑے میاں کے اندر سے یوں سانس نکلی جیسے روح نکل رہی ہو پھر وہ بڑے کرب سے بولے "جوان بیٹی کا کفن لانے جا رہا تھا۔"

سب ہی کے سوالات نے دم توڑ دیا۔ وہ بستر سے آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ دو آدمیوں نے انہیں سہارا دیا۔ وہ تھرتھراتے ہوئے کہنے لگے۔ "وہ بڑی دل والی لڑکی ہے۔ اس نے اپنے منگیتر کو دھوکا دے کر ایک اپاہج بہن کو اس سے بیاہ دیا۔ یہ بیٹیاں کیوں دوسروں کے لیے اپنا من مارتی ہیں۔ اپنا تن راکھ کرتی ہیں' اپنی صورت اجاڑ دیتی ہیں' اپنی تقدیر بگاڑ لیتی ہیں اور بوڑھے باپ کو بیچ سڑک پر اوندھے منہ گرا دیتی ہیں۔ آہ خدایا! وہ کیوں مر گئی؟ مرجانا علاج نہیں ہے یہ علاج ہوتا تو ہر دوسرے گھر میں ایک بیٹی مرتی رہتی۔"

فرزانہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ جیسے بے جان مجسمہ بن گئی تھی۔ ویسے سر سے پاؤں تک مردہ تھی' صرف آنکھوں میں آنسو زندہ تھے۔ سچ تو ہے وہ رخسانہ کے لیے کیوں اپنا من مار رہی تھی؟ اور جب ایسا کر رہی تھی تو پھر روتی کیوں تھی؟ ٹھیک ہے کہ موت سے علاج نہیں ہوتا مگر سہاگ کا جوڑا پہن کر وہ جانی کی طرف سے مر سکتی تھی۔ سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا۔

وہ میز کے پیچھے اپنی کرسی پر تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔ یہی تو بات ہے کہ قصہ ختم نہیں ہوتا۔ حیات جاری رہتی ہے' قصے جاری رہتے ہیں۔ بلکہ حیات اپنے وقت پر ختم ہو جاتی ہے۔ قصے اس کے بعد بھی تاریخ کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

وہ لوگ بڑے میاں کو سہارا دے کر لے جانے لگے۔ ایک نے کہا "باہر جا کر دیکھو' وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے یا چلا گیا۔"

فرزانہ نے ایک دم سے چونک کر سر اٹھایا۔ وحشت زدہ نظروں سے ایک ایک کا منہ تکنے لگی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا "ٹیکسی کھڑی ہے' ڈرائیور نہیں ہے شاید کسی ہوٹل میں چائے پی رہا ہوگا۔"

دھیرے دھیرے سب چلے گئے۔ وہ تنہا رہ گئی۔ باہر سے آنے والی آوازوں کو توجہ سے سننے لگی۔ شاید اس کی آواز بھی سنائی دے پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ سوچ سوچ کر چلتے ہوئے دروازے تک آئی۔ سامنے ہی ایک ٹیکسی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی گھبراہٹ شروع ہوگئی۔

اس نے فوراً ہی دروازے کو بند کر دیا۔ چٹخنی چڑھا دی۔ وہ اس ٹیکسی کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ ایک بار جب وہ پچھلی سیٹ پر خوشبو بکھیر کر گئی تھی تو اس ٹیکسی کا نمبر ذہن نشین کر لیا تھا۔ اب اس یقین سے دل دھڑک رہا تھا کہ جانی دوسری بار دروازے تک آن پہنچا ہے۔

اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اوپر خوف و دہشت کے باعث تھرتھراہٹ تھی۔ اندر چور جذبوں کے زلزلے تھے' وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر ٹیکسی اور ٹیکسی والے کو دیکھنا چاہتی تھی۔

دل نہیں مانتا جس کا ہوجاتا ہے۔ اس کا ہوجاتا ہے۔

جب اس کا ہوجاتا ہے تو پھر ساری دنیا اپنا زور لگادے' دل کا زور نہیں ٹوٹتا۔ پہلے اخلاقی تقاضے نے فرزانہ کو توڑا کہ وہ سہیلی کے لیے قربانی دے لیکن دل کے تقاضے برقرار رہے جب ہم کسی کو ایک پھول دے دیتے ہیں تو اس کی تھوڑی سی خوشبو ہمارے پاس بھی رہ جاتی ہے۔

وہ کمرے میں آگئی۔ کمرا خالی تھا۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے پردے کو ہٹا کر آہنی جالی کے پار دیکھا۔ جانی کی آواز سنائی دی۔ "میں یہاں ہوں۔"

وہ ایک دم سے چیخ مار کر پلٹ گئی۔ کمرے کے آخری حصے میں وہ باتھ روم کے دروازے پر کھڑا تھا اور اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ کو چند لمحوں تک یوں محسوس ہوا جیسے دل کی دھڑکنیں رک گئی ہیں۔ جیسے سانس رک گئی ہے اور زبان پتھر ہوگئی ہے۔ اب وہ کچھ بول نہیں سکے گی۔

جانی نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا "میں نے تمہاری جیسی ذلیل لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔ ایک مرد اگر دوسرے مرد کو کسی عورت کے پاس پہنچا دے تو اسے دلال کہتے ہیں' جو لڑکی اپنا جلوہ دکھا کر کسی دوسری لڑکی کے پاس پہنچا دے' اسے دلالہ کہیں گے' حرافہ کہیں گے یا کیا کہیں گے؟ تمہیں جو بھی گالی دی جائے' وہ کم ہے۔"

وہ لرزتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے بولی "تم غصے میں ہو' میری بات نہیں سمجھو گے۔ بعد میں سمجھ سکو تو سن لو۔ جب پورا معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو ایک سے کی جانے والی نیکی دوسرے کے لیے بدی بن جاتی ہے۔"

وہ بپھر کر آیا پھر اس نے تڑاخ کی آواز کے ساتھ ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ جیسے اس کا منہ گھوم گیا ہو۔ وہ گھوم کر سینٹر ٹیبل پر جا گری۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ جانی نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "بلا سے تم نے نیکی کی۔ میرے ساتھ کیا کیا؟ میری محبت کا مذاق اڑایا مجھے بے وقوف بنایا۔ میں انسان ہوں۔ تم نے مجھے کتا سمجھا۔ میرے گلے میں محبت کا پٹا باندھ کر دوسرے کے دروازے پر پہنچا دیا....."

اس نے ایک جھٹکے سے بالوں کو کھینچ کر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا رہی تھی۔ اس نے چیخ کر پوچھا "بولو کیا میں کتا ہوں؟"

تڑاخ۔ تڑاخ وہ مسلسل طمانچے کھا کر لڑکھڑاتے ہوئے آگے آگئی اور شوکیس کے سہارے ٹھہر گئی۔ شوکیس کے شیشے لرزنے لگے۔ اس کی زلفیں بکھر گئی تھیں۔ گلابی مکھڑا طمانچوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ یک بیک تڑپ کر بولی "ہاں' ہم سب کتے ہیں۔ آگے سے کاٹتے ہیں' پیچھے سے دم ہلاتے ہیں۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھ گئی۔ "میں نے تمہیں کاٹا' تمہیں زخم دیئے مگر تمہارے زخم کی تکلیف پر رت جگے کرتی رہی۔ تم ابھی مجھے کاٹ رہے ہو مگر میرے پیچھے محبت سے بھاگتے ہو۔ ہم اپنے آپ کو کیا کہہ سکتے ہیں؟ فرشتے مکمل فرشتے ہوتے ہیں۔ شیطان اپنی شتانیت میں کامل ہوتا ہے۔ جانور اپنے ہر عمل میں مکمل جانور ہے مگر ہم انسان آدھے ہیں۔ میں اپنے ضمیر کی سچائی سے رخسانہ کے سہاگ کی سلامتی چاہتی ہوں مگر آدھی جھوٹی ہوں اس لیے تمہیں دل سے نہ نکال سکی۔ رخسانہ تم پر جان نچھاور کرنے والی ایک

مثالی وفادار بیوی ہے مگر آدمی بے ایمان ہے۔ مصلحت اندیشی کے نام پر کسی وقت بھی تمہیں دھوکا دے جاتی ہے۔ تم ایک مرد کی بھرپور محبت اور غیرت سے اپنی بیوی پر جان دیتے ہو مگر آدھے بے غیرت ہو۔ بیوی کو تنہا پردیس بھیج کر میری تنہائی میں آگئے ہو۔"

"مجھے بے غیرت کہتی ہے۔ کمینی۔ بدذات... دلالہ... آوارہ....."

وہ غصے سے بولتا جارہا تھا اور مار مار کر دل کی بھڑاس نکال رہا تھا مگر تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر اس نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے پھر شوکیس کی طرف گئی وہ اپنے اختیار میں نہیں تھی' دھکا اتنی زور سے دیا گیا تھا کہ وہ لڑکھڑانے کے دوران جھک گئی پھر وہ جھکا ہوا سر شوکیس کے شیشے سے ٹکرایا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔

دھماکا جیسے محبت کے آستاں پر سر پھوڑنے کی روایت دہرائی جارہی ہو۔

شیشے کا ایک زبردست چھناکا ہوا جیسے انسان آئینہ در آئینہ ریزہ ریزہ ہو رہا ہو۔

وہ اپنے سر اور دونوں ہاتھوں سمیت شیشے کے آرپار آدھی چلی گئی تھی۔ آدھی شوکیس میں گھس گئی تھی۔ اس کے آس پاس دور تک شیشے کے ننھے ننھے ٹکڑے بارش کی پھوار کی طرح اڑتے اور بکھرتے جارہے تھے۔

پھر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ فرزانہ ساکت ہو چکی تھی مگر اس کا لہو زندگی کی طرح رواں تھا۔ شوکیس کے باقی ماندہ شیشے پر خون کے چھینٹے تھے اور نیچے فرش پر وہ خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

جانی کا جنون سرد پڑ گیا۔ وہ گم صم حیران و پریشان نظروں سے فرزانہ کو تک رہا تھا۔ شاید اس انتظار میں تھا کہ وہ کوئی حرکت کرے گی' خود ہی شوکیس کے اندر سے نکل آئے لیکن وہ دیر تک اس طرح بے حس و حرکت پڑی رہی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک اندیشے نے سر اٹھایا۔ کیا وہ مر گئی ہے؟

اس خیال سے وہ لرز گیا۔ کہاں تو وہ غصے اور جنون میں اسے مار ڈالنا چاہتا تھا اور کہاں اس کے مرنے کے خیال سے لرز کر رہ گیا۔ نفرت سے محبت کو قتل کرنا آسان ہے مگر محبت سے محبت کی لاش نہیں دیکھی جا سکتی۔

وہ جھجکتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ اسے آواز دے پھر خیال آیا۔ اتنی جلدی نرم پڑ کر آواز دے گا تو غصے اور انتقام کا بھرم نہیں رہے گا اس لیے وہ کھنکار کر

گلا صاف کرتے ہوئے ذرا گرج کر بولا "اے! وہاں کیا کر رہی ہو' اٹھو۔"

اٹھنا تو دور کی بات ہے اس کے جسم نے ہلکی سی جنبش بھی نہ کی تب وہ اور پریشان ہو گیا اور قریب گیا۔ ذرا دور سے جھک کر شیشے کے پاس شوکیس کے اندر دیکھنے لگا۔ اندر کانچ کے برتن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ فرزانہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے شکستہ برتنوں پر جھکی ہوئی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔

وہ اتنی تیزی سے شیشے سے آکر ٹکرائی تھی کہ خود کو سنبھالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بڑی ذہانت اور حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس نے ٹکرانے سے پہلے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ جسم پر کئی جگہ خراشیں آئی تھیں کئی جگہ سے خون رس رہا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس نے اپنے چہرے کو زخمی ہونے سے بچا لیا تھا۔

جانی اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے اس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "فرزانہ! فرزانہ! تم چپ کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں ہو؟ فرزانہ!"

جانی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے فرزانہ کو ادھر ادھر سے دیکھا۔ وہ آدھی شوکیس کے اندر تھی اور آدھی باہر۔ وہ شیشے کے اندر شگاف بناتی ہوئی اندر چلی گئی تھی اور اب اسے باہر اس وقت تک نہیں نکالا جا سکتا تھا جب تک کہ آس پاس کے شیشے توڑے نہ جاتے۔

وہ ایک گلدان کو اٹھا کر شیشے توڑنے لگا۔ فرش پر قطرہ قطرہ ٹپکنے والا خون اپنی مقدار بڑھاتا جارہا تھا۔ ذرا سی دیر میں جانی نے آس پاس کے شیشوں کو اتنی دور تک توڑ دیا تھا کہ اب وہ آسانی سے نکالی جا سکتی تھی۔ اس نے اندر ہاتھ ڈال کر اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا پھر اسے آہستگی سے پکڑ کر باہر کی طرف لے آیا۔ جب وہ اس کے بازوؤں میں آئی تو گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

دھیمی دھیمی سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ زندہ ہے مگر بے ہوش ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا کرے؟ کیا اسپتال لے جائے مگر دنیا والوں کو کیا کہے گا؟ اسپتال والے ایک زخمی عورت کو دیکھ کر پہلے تھانے والوں کی پرچی طلب کریں گے اور وہ اقدام قتل کے کیس میں الجھتا چلا جائے گا۔ جھورے پینٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ آج کسی وقت جیل یا حوالات کے پیچھے بند ہونے والا ہے۔

وہ تیزی سے سوچنے لگا۔ فرزانہ کا سر اس کے بازوؤں پر رکھا ہوا تھا۔ بکھری ہوئی

زلفوں کے ہجوم میں اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے گہری تاریک رات میں گلاب کھل رہا ہو۔ اس کا چہرہ محفوظ تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ ایسی معصوم' ایسی آسودہ دکھائی دے رہی تھی جیسے منزل پر پہنچ کر سو رہی ہو۔ تھکن اتار رہی ہو۔

اس نے دونوں بازوؤں سے اسے اٹھالیا۔ اس کے جوتے تلے شیشے کے ٹکڑے کراہ رہے تھے۔ اس نے وہاں سے چلتے ہوئے پلنگ کے پاس آکر فرزانہ کو لٹادیا۔ اس کے زخموں کا معائنہ کرنے لگا پھر وہاں سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا ڈسپنسری میں آیا۔ وہ ابتدائی طبی امداد کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ پٹیاں باندھ سکتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ بہتے ہوئے خون کو بند کرنے کے لیے کون سی دوا لگائی جاتی ہے۔

جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ تیزی سے پلٹ کر ڈسپنسری سے باہر آگیا۔ دروازے کو باہر سے بند کر کے تقریباً دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ دوسری گلی میں ایک جراح کی دکان تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا "میری گھر والی بری طرح زخمی ہوگئی ہے۔ خون بہہ رہا ہے کوئی ایسی دوا دو کہ خون فوراً ہی بند ہوجائے۔"

جراح نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر پوچھا "کہاں رہتے ہو؟ کہو تو میں ساتھ چلتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ مرہم پٹی دینے سے کام چل جائے گا۔ میری گھر والی بہت پردہ کرتی ہے۔ بیمار ہوتی ہے تو کسی لیڈی ڈاکٹر سے علاج کراتی ہے' یہ مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری؟ یہاں قریب ہی تو لیڈی ڈاکٹر فرواسطی کی ڈسپنسری ہے' وہاں چلے جاؤ۔"

"بھائی! میں وہاں گیا تھا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی اچھا سا مرہم دے دیجیے۔"

جراح نے بوتلوں اور ڈبوں کے ڈھیر سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پانچ روپے۔"

جانی نے جلدی سے پانچ روپے نکال کر اسے دیے' ڈبیا لی اور وہاں سے جانے لگا۔ جراح نے کہا "ارے اسے لگانے کا طریقہ تو سن لو۔ اس کی مرہم پٹی کے لیے بھی کچھ لے جاؤ۔"

"میرے گھر میں سب کچھ ہے' بڑی مہربانی۔"

وہ وہاں سے بھاگتے ہوئے واپس آیا۔ دروازہ کھول کر ڈسپنسری میں داخل ہوا۔ دروازے کو اندر سے بند کیا پھر وہاں سے روئی اور پٹیوں کا بنڈل اٹھا کر کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ اسی طرح بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اگر ہوش میں ہوتی' اس سے شکایت کرتی یا لعنت ملامت کرتی یا اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی تو حساب برابر ہوجاتا لیکن اس کی خاموشی' اس کی بے ہوشی اور اس کی غفلت زدہ معصومیت نے جانی کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ وہ بہت ہی نادم ہو رہا تھا اور سر جھکائے مرہم پٹی میں مصروف تھا۔

وہ حکیم تھا' نہ ہی نیم حکیم تھا۔ ایسا اناڑی بھی نہیں تھا کہ مرہم پٹی لگا کر زخموں پر پٹیاں نہ باندھ سکے۔ جہاں خراشیں آئی تھیں' وہاں اس نے صرف مرہم لگادیا تھا اور جہاں زیادہ زخم آئے تھے اور خون رس رہا تھا وہاں اس نے مرہم لگا کر پٹیاں باندھ دیں۔

پھر ایک بار فرزانہ کے چہرے کو دیکھا۔ ذرا قریب آیا پھر جھجکتے ہوئے کان لگا کر اس کے دل کی دھڑکنیں سننے لگا۔

دل دھڑک رہا تھا جیسے سرگوشی میں کہہ رہا ہو "گھبراؤ نہیں' میں زندہ ہوں۔ محبت کو محبت سے مارنے سے وہ نہیں مرتی۔ ہاں ٹوٹ جاتی ہے اور یہ تو بچوں کو بھی سمجھایا جاتا ہے کہ کسی بھی چیز کو توڑنا نہیں چاہیے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سامنے سر جھکا کر اپنے ہاتھ ملتے ہوئے بڑبڑانے لگا "میں الّو کا پٹھا ہوں' اوپر سے مارتا ہوں' اندر سے پچھتاتا ہوں۔ اب میں تمہارے سامنے کس منہ سے بولوں کہ میں پچھتا رہا ہوں۔"

اس کے دماغ نے کہا "بعد میں پچھتاتے رہنا' کیوں احمقوں کی طرح کھڑے ہو' اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔"

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح ہوش میں لایا جاسکتا ہے پھر وہ جلدی سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا باتھ روم میں گیا۔ پلاسٹک کے ایک چھوٹے سے مگ میں پانی لے کر وہاں سے واپس آیا پھر اپنے ایک ہاتھ کے چلو میں تھوڑا تھوڑا سا پانی لے کر فرزانہ کے چہرے پر چھڑکنے لگا۔ ذرا سی دیر میں

فرزانہ نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ ذرا سا کسمسائی پھر ساکت ہو گئی۔

وہ تاریکی سے روشنی کی طرف آ رہی تھی۔ ذہن آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ کان کچھ سن رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر ٹریفک کا شور سنائی دے رہا تھا پھر وہ تکلیف محسوس کرنے لگی۔ جہاں جہاں زخم آئے تھے' وہاں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جہاں مار پڑی تھی' وہ حصہ دکھ رہا تھا لیکن وہ ابھی تک واضح طور سے نہیں سمجھ سکی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ کس قسم کی تکلیفیں برداشت کر رہی ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پہلے نگاہوں کے سامنے کا منظر دھندلا سا تھا۔ پھر صاف ہونے لگا۔ اس کے سامنے جانی سر جھکائے کھڑا تھا' اسے دیکھتے ہی ساری باتیں روشن ہونے لگیں۔ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ بڑے کرب سے یاد آنے لگا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے سوچنے لگی۔ کیا سچ مچ ایسا ہو چکا ہے؟ کیا سچ مچ وہ میرے سامنے کھڑا ہے؟ کیا میں زخموں سے چور ہوں؟

وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے' دونوں ہاتھ اٹھا کر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ٹٹولنے لگی۔ اس کا ہاتھ ہر اس مقام تک پہنچا جہاں جہاں زخم آئے تھے۔ کہیں اس کے ہاتھوں میں مرہم لگا' کہیں اس نے محسوس کیا کہ پٹیاں بندھی ہوئی ہیں پھر اس نے ایک دم سے حیران ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی لیکن اس کی آنکھوں میں سوال تھا "جس نے زخم دیئے اس نے مرہم رکھا ہے؟ جو سرکش بن کر آیا تھا' کیا وہی اس وقت سر جھکائے کھڑا ہوا ہے؟"

جانی نے ندامت سے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس ایک ساعت کے لیے دونوں کی نظریں ملیں پھر فرزانہ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس ایک ساعت میں پتا چلا کہ جو ظالم تھا وہ مجرم بنا کھڑا ہوا تھا اور اس سے نگاہیں ملاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے فرزانہ نے اس کی آواز سنی۔ وہ آواز لفظوں سے خالی تھی۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک رہا تھا۔ رکتے رکتے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں سکتا تھا۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ آدمی بچہ ہوتا۔ اس کے پاس زبان ہوتی' الفاظ نہ ہوتے۔ وہ

بولنے کی کوشش میں بچوں جیسی پیاری پیاری حرکتیں کرتا تو اس پر پیار آتا رہتا پھر کسی انسان کو کسی انسان پر غصہ نہ آتا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب وہ بے ہوش تھی تو وہ بول رہا تھا اور جب ہوش میں آئی تو کچھ بول نہ سکا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے' ہم ایسی جگہ بولتے ہیں جہاں کوئی سننے والا نہ ہو اور جہاں سننے والا ہو' وہاں بولنے کی صلاحیتیں جواب دے جاتی ہیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے' وقت گزرتا جا رہا تھا۔ وہ ایسے اجنبی بن گئے تھے جن کی شناسائی خاموشی کی وجہ سے بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر فرزانہ نے اپنے اندر اتنی توانائی محسوس کی کہ اٹھ سکے اور اپنا حلیہ درست کر سکے۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی طرف نہ دیکھا۔ اس کا دل و دماغ اس کے کان سب ادھر لگے تھے۔ ادھر یہ اپنے آپ میں سمٹی ہوئی بستر سے اٹھنے لگی۔ جانی نے جب اسے اٹھتے ہوئے دیکھا تو سہارا دینے کے لیے جھجکتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کی طرف ذرا جھکا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر پیچھے کی طرف کھسک گئی۔

زخمی ہرنی بھاگتی نہیں ہے' کتراتی ہے۔ جانی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے شوکیس کی طرف جھکی جھکی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے بے شمار ذرات فرش پر دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے کی کتنی چیزیں الٹ پلٹ کر یہ بتا رہی تھیں کہ تھوڑی دیر پہلے خوب تماشا ہوا تھا اور تماشا کرنے والا ابھی تک کھڑا تھا۔

کیوں کھڑا ہے؟ اب جاتا کیوں نہیں؟ فرزانہ نے دل میں سوچا مگر زبان سے نہیں پوچھا۔ وہ بستر پر آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے کنارے کی طرف آئی پھر بڑی مشکل سے کراہتے ہوئے فرش پر کھڑی ہو گئی' وہاں سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے "اسٹور روم" میں چلی گئی۔ جانی چپ چاپ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک جھاڑو لے کر آئی اور فرش پر بکھرے ہوئے کانچ کے ذروں کو جھاڑو سے سمیٹنے لگی۔

جانی نے تھوک نگل کر بڑی مشکل سے کہا "فرزانہ!...... تم۔ مجھے افسوس ہے۔"

وہ جھاڑو دیتے ہوئے رک گئی۔ سر اٹھا کر اسے گھور کر دیکھا پھر سر جھکا کر جھاڑو دینے میں مصروف ہو گئی۔ دو دشمن ایک چھت کے نیچے نہیں رہتے مگر وہ چھت تماشائی تھی۔ دیکھ رہی تھی کہ وقت کس طرح سمیٹ کر دو دشمنوں کو ایک مقام پر لے آتا ہے۔

جھاڑو کا آخری سرا فرش سے لگا ہوا تھا اور کانچ کے ذروں کو سمیٹتے سمیٹتے جانی کے قدموں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہاں فرزانہ کے ہاتھ رک گئے۔ جھاڑو رک گئی۔ وہ اسی طرح جھکی ہوئی تھی اور جھکی جھکی نظروں سے اس کے جوتوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انتظار کر رہی تھی کہ وہ ہٹے گا تو وہاں سے بھی کانچ کے ذروں کو سمیٹ کر ایک مقام پر پہنچائے گی۔

جانی اسی طرح کھڑا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فرزانہ ضرورت مند ہے' اسے وہاں سے ہٹنے کے لیے کہے گی لیکن وہ بھی ضدی تھی۔ جانی کے آس پاس فرش پر جھاڑو پھیرتی ہوئی وہاں سے گزر گئی پھر شوکیس کے پاس پہنچی جہاں اس کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا اور اب اس مقام پر جم رہا تھا۔ وہ پھر اسٹور روم میں گئی۔ وہاں سے فرش پر ٹاکی لگانے والا کپڑا لے کر آئی اور خون کو پونچھنے لگی۔

جانی کو بڑی شرم آئی۔ جس کا خون بہا تھا' وہی ظلم کے نشان مٹا رہی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ظلم کا جواز پیش کیا۔ "دیکھو میں تمہیں کبھی ہاتھ بھی نہ لگاتا مگر انصاف کی بات کرو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا میری نظروں سے چھپتی رہیں اور غصہ دلا دلا کر مجھے پاگل بناتی رہیں۔ اگر میں نے پاگل پن میں ایسی حرکت کی تو اس میں میرا کتنا قصور ہے اور تمہاری کتنی غلطیاں ہیں۔"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔ ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبے میں تمام کانچ کے ریزوں کو سمیٹ کر ڈال دیا۔ فرش کی صفائی ہو گئی پھر اس نے کمرے کے گرے پڑے سامان کو درست کیا۔ اس دوران میں اس کی نظر آئینے پر گئی تو اس نے ..... ذرا رک کر اپنے زخم کو آئینے میں دیکھا پھر گھوم کر جانی کو گھورنے لگی۔ جانی کی نظریں جھک گئیں۔ وہ ٹین کے ڈبے کو اٹھا کر وہاں سے ڈسپنسری کی طرف چلی گئی۔

یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ جانی نے جو کچھ کیا' اس کے نتیجے میں نفرت ہی مل سکتی تھی۔ وہ شاید اسے ایک چھت کے نیچے برداشت بھی نہیں کر پا رہی تھی مگر اس سے بولنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی۔ لہٰذا اسے چلے جانے کے لیے بھی نہیں کہہ رہی تھی۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا پھر اندرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ بیرونی دروازے کے باہر کوئی آیا تھا یا کوئی آئی تھی۔ اندرونی دروازے کے پیچھے جانی تھا۔ اس کی رسوائی تھی یا اس کی کمزوری تھی۔ دیکھا جائے تو رسوائی کی بات نہ تھی۔ وہ جانی کو ڈسپنسری میں بلا کر آنے والے کے سامنے یہ ظاہر کر سکتی تھی کہ وہ کوئی دوائی لینے ڈسپنسری آیا تھا لیکن وہ اس کی کمزوری تھا اور ہر انسان اپنی کمزوری کو چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ جلدی سے پلٹ کر اندرونی دروازے کے پاس آئی اس سے پہلے کہ جانی اس کی طرف آیا۔ اس نے دروازے کے پٹ کو جلدی سے بند کر کے اپنی طرف سے چٹخنی چڑھا دی۔

باہر سے دوسری بار دستک ہوئی پھر آواز سنائی دی۔ "باجی دروازہ کھولیے میں ارشد کمپاؤنڈر ہوں۔"

فرزانہ نے دروازہ کھول دیا۔ کمپاؤنڈر نے اسے دیکھتے ہی حیرانی سے پوچھا "باجی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسی حالت بنا رکھی ہے اور آپ کو تو جگہ جگہ زخم بھی آئے ہیں۔"

فرزانہ نے پوچھا "اندر آؤ گے یا باہر ہی سے بولتے رہو گے؟"

وہ اندر آ گیا۔ دروازے کو اس نے بند کر دیا۔ وہ سوچ رہی تھی' کمرے کی صفائی تو کر دی اپنا حلیہ درست نہیں کیا اور کمپاؤنڈر کے سامنے چلی آئی۔ بہرحال اس نے بات بنا دی "میں اپنے کمرے میں شوکیس کے پاس ٹھوکر کھا کر گر پڑی تھی۔ شیشے ٹوٹ گئے میں بری طرح زخمی ہو گئی۔ جاؤ مرہم پٹی کا سامان لے آؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے خود اپنے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں کیپسول اور ٹیبلٹس حلق سے اتار کر پانی پیا۔ اپنے لیے ایک انجکشن خود تیار کیا۔ کمپاؤنڈر نے مرہم پٹی کرنے کے بعد انجکشن لگایا۔ ساری چیزوں کو اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھا پھر کہا "باجی! آپ آرام کریں' میں آپ کے گھر کی صفائی کر دیتا ہوں۔ امی نے کہا ہے کہ آج بھی ہمارے ہاں سے آپ کا کھانا آئے گا۔"

وہ بولی "اپنی امی سے میرا سلام کہنا اور اب زحمت نہ کرو۔ میں خود پکا لیا کروں گی۔"

"نہیں باجی! کل آپ کی والدہ کا سوئم ہے کل تک آپ کو چولہا نہیں جلانا

چاہیے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں' میں نے چولہا جلالیا ہے۔ خود پکالوں گی' تم اب جاؤ۔"

کمپاؤنڈر نے جانے کے لیے دروازہ کھولا پھر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے کہا "پتا نہیں' کس نے یہاں ٹیکسی کھڑی کردی ہے آنے جانے کا راستہ روک دیا ہے۔"

فرزانہ نے ٹیکسی کو دیکھا ذرا سوچا پھر کہا "رہنے دو کلینک دو روز کے بعد کھلے گا۔ یہاں کسی کے آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ چلا گیا۔ فرزانہ نے دروازے کو پھر اندر سے بند کردیا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ جانی کے متعلق سوچتے ہوئے اندرونی دروازے کے پاس آئی۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا جانی کو یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ دل معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا' وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے دروازے کو کھول دیا۔ وہ سامنے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھتے ہی فرزانہ جل گئی۔ غصے سے منہ پھیرلیا۔ اسے اپنے پیچھے اس کی آواز سنائی دی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ اتنے قریب آکر بول رہا تھا کہ اسے اپنی گردن پر اس کے سانسوں کا بھبکا محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے ایک قدم آگے بڑھ کر دور ہوگئی وہ پھر قریب آکر بولا "میں نے جو غلطی کی ہے اس کی تلافی کروں گا جتنے زخم پہنچائے ہیں' وہ جب تک نہیں بھریں گے' میں یہیں رہوں گا۔ تمہاری تیمارداری کرتا رہوں گا۔"

وہ ایک دم سے پلٹ کر بے اختیار بولنے پر مجبور ہوگئی "تم یہاں رہو گے' کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے؟"

"دماغ تو اسی دن خراب ہوگیا تھا جب تم نے پہلی بار اپنی جھلک دکھائی اور آج تک چھپتی رہی تھیں۔"

"باتیں نہ بناؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"کیسے نہیں جاؤ گے؟ تم میرے کون لگتے ہو؟ یہاں کس رشتے سے رہو گے؟"

"جو رشتہ چاہے جوڑلو۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "چلے جاؤ یہاں سے تم میرے کوئی نہیں لگتے ہو۔"

"میں کوئی نہیں لگتا ہوں تو پھر چیخنا شروع کردو۔ میں نے تم پر ظلم کیا ہے تمہیں نقصان پہنچایا ہے' اتنے زخم دیے ہیں کہ دنیا والوں کو دکھا کر مجھے سزا دلوا سکتی ہو۔ مجھے جیل بھجوا سکتی ہو۔ خاموش کیوں ہو؟ چیختی کیوں نہیں ہو؟"

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی "میں بدنامی سے ڈرتی ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ کوئی کسی کے گھر میں گھس آئے تو گھر والی کو چیخنے چلانے اور قانونی تحفظ حاصل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ دنیا والے تمہیں بدنام نہیں کریں گے' مجھے سزا دیں گے۔"

"جو تماشا تم کرچکے ہو' وہ میں دنیا والوں کو دکھانا نہیں چاہتی تم سے التجا کرتی ہوں' چلے جاؤ۔"

"تمہیں زخمی حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"کیا تم مجھے بدنام کروگے؟"

"تم نیک نامی سے حاصل نہ ہوئیں تو صرف تمہیں بدنام نہیں کروں گا' خود بھی بدنام ہوجاؤں گا۔"

"مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم کیا سمجھ کر یہ کہہ رہے ہو' کیا تمہاری بیوی نہیں ہے؟ کیا تمہارا بچہ نہیں ہے؟ مجھے کس رشتے سے حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ میں نے کبھی نہیں سوچا۔ تم مجھے دوڑاتی رہیں۔ میں تمہارے پیچھے دوڑتا رہا۔ اب ہم مل گئے ہیں تو رشتہ بھی طے کرلیں گے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"تمہیں بحث نہیں کرنا چاہیے' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کمرے میں چل کر آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"میں تمہاری موجودگی میں......" وہ کہتے کہتے رک گئی پھر ایک دم نرم لہجے میں بولی "کیا تم چاہتے ہو' میں آرام کروں؟"

"بے شک میں یہی چاہتا ہوں۔"

"تو پھر چلے جاؤ۔ میں یہاں آرام سے لیٹی رہوں گی۔ تم رہو گے تو یہ ممکن نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے' میں باہر کھڑا رہوں گا۔"

وہ گھور کر بولی "یہ کیا بات ہوئی' تم باہر کیوں رہو گے؟"

"میری مرضی ہے۔ یہ تمہارا گھر ہے' تم مجھے نکال رہی ہو' ہر جگہ تمہاری مرضی نہیں چل سکتی۔ کیا تم مجھے دنیا سے بھی نکال دو گی؟"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف جانے لگا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی "ٹھہرو تم میرے گھر کے سامنے نہیں رہ سکتے' لوگ کیا کہیں گے؟"

"میں اس طرح رہوں گا کہ لوگ تمہارے اور میرے تعلق کو نہ سمجھ سکیں گے۔"

"نہیں جانی! یہاں آس پاس مت رہنا۔ دنیا والے سب سمجھتے ہیں۔"

"ایک شرط پر چلا جاتا ہوں' شام کو آؤں گا۔"

"کیوں آؤ گے؟"

"تمہاری خیریت پوچھنے۔ تمہارے زخموں پر مرہم رکھنے۔ تم سے ملنے' تم سے باتیں کرنے۔ تمہیں دیکھنے اور تمہیں چاہنے۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔ تم کون ہوتے ہو مجھے چاہنے والے؟"

"چاہنے والا ہوتا ہوں۔"

وہ بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا پھر چٹخنی نیچے گرانے سے پہلے بولا "میں جا رہا ہوں۔ رات کے آٹھ بجے میری ٹیکسی سڑک کے اس پار کھڑی ہوگی۔ تم چپ چاپ آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ جانا۔ اگر نہیں آؤ گی تو میں دروازے پر دستک دوں گا۔ تم دروازہ نہیں کھولو گی تو میں ٹیکسی میں ساری رات گزار دوں گا پھر سڑک کے اس پار یہ ٹیکسی میرا گھر بن جائے گی۔ میں اسی طرح رہوں گا' اسی میں کھاؤں گا' اسی میں سوؤں گا' تمہارے مہربان ہونے تک وہاں انتظار کرتا رہوں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ یہ کھلے ہوئے دروازے کو تکتی رہی پھر خیال آیا کہ یوں سوچ میں گم رہ کر اسے نہیں تکنا چاہیے۔ نہیں تو اس کا حوصلہ اور بڑھ جائے گا۔

یہ سوچتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

دروازہ بند ہو گیا۔ وہ نظروں سے گم ہو گیا مگر چاہت جس سے منسوب ہوتی ہے' وہ کبھی سرتاج بن کر اور کبھی بے تاج بن کر اتنا کچھ دے جاتا ہے کہ عورت اس کی تصویریں اپنی ذات میں دیکھتی ہے۔ وہ جہاں جہاں زخم دے گیا تھا' وہاں وہاں اپنے نقش قدم چھوڑ گیا تھا۔ جہاں جہاں بدن دکھ رہا تھا وہ دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ بند کر دو اور تصویروں پر پردہ ڈال دو تو تصور اور زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔

○☆○

فرید احمد' کامران کو فیڈر سے دودھ پلا رہے تھے اور مسکرا کر اپنی بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بیگم آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہا "بڑھاپے میں اللہ میاں نے ہمیں ایک بیٹا دے دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ ہمارا ہی بچہ ہے۔"

بیگم نے پلٹ کر کہا "یہ ہمارا ہی تو ہے' کیا آپ اسے پرایا سمجھتے ہیں؟"

"پرایا تو نہیں ہے مگر ہماری بیٹی کا بیٹا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ صرف ہمارا ہوتا۔"

وہ اونہہ کہہ کر آئینے کے سامنے ہو گئیں۔ فرید احمد نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے فخر سے کہا "اونہہ نہ کہو' رخسانہ تو ہماری ہے۔"

وہ چوٹی گوندھتے ہوئے قریب آئیں اور کامران کو گود میں لیتے ہوئے کہا "مزار کی مٹی کھائی' تب وہ ہوئی تھی زیادہ فخر نہ کرو۔"

فرید احمد نے ایک گہری سانس لی۔ بے بسی سے چھت کو تکنے لگے جیسے آسمان سے شکایت کر رہے ہوں۔ بیگم نے کامران کا لباس بدلتے ہوئے کہا "صبح سے شام ہو گئی مگر جانی کھانے کے لیے نہیں آیا۔ اب مجھے اس کے لیے کھانا لے جانا ہوگا۔"

"یہ تو اچھی ڈیوٹی لگ گئی ہے۔ وہ یہاں آتا نہیں ہے اور تم ٹفن کیریئر لے کر اس کے پاس چلی جاتی ہو اور بچے کو میں سنبھالتا رہتا ہوں۔"

"آپ سنبھالتے ہیں تو اپنے نواسے پر احسان نہیں کرتے ہیں۔"

"مگر یہ کیا تک ہے بیگم۔ وہ لڑکا یہاں کھانا کھانے کیوں نہیں آتا۔ کیا ضروری ہے کہ اس کا کھانا وہاں پہنچ جائے؟"

"آپ رخسانہ کی ذہانت کو نہیں سمجھیں گے۔ آخر وہ میری بیٹی ہے۔ مرد کو کنٹرول کرنا جانتی ہے۔ وہ مجھے سمجھا کر گئی ہے کہ جانی یہاں کھانے کے لیے نہ آئے تو میں اس کے لیے کھانا وہاں لے جایا کروں۔ کبھی نہ کبھی اسے شرمندگی ہوگی کہ میں بزرگ ہو کر اس کا کھانا اس کے پاس پہنچاتی ہوں۔"

"اس میں مصلحت کیا ہے؟"

"یہ ہے کہ جانی یہاں تین وقت آئے تو ہماری نظروں میں رہے گا۔ نہیں آئے گا تو میں وہاں کھانا لے کر جایا کروں گی اور اس کی نگرانی کرتی رہوں گی اور اسے بھٹکنے نہیں دوں گی۔ بھٹکنے لگے گا تو اس کی خبر مجھے ہوتی رہے گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ٹفن کیریئر میں جانی کے لیے کھانا لے کر گھر سے نکلیں۔ ناظم آباد سات نمبر کے اسٹاپ سے ایک بس میں سوار ہوئیں اور ناگن چورنگی کی طرف جانے لگیں۔ شام کا وقت تھا۔ بس میں مردوں اور عورتوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ خصوصاً عورتیں ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھیں۔ ایک دوسری پر چڑھی آرہی تھیں۔ اس پر کچھ عورتیں ایسی تھیں جو گھریلو ضروریات کا سامان اٹھائے ہوئے تھیں اور کچھ عورتیں بچوں کو اپنے اوپر لادے ہوئے تھیں۔ بس ڈرائیور بڑی ترنگ میں تھا۔ اونچی آواز میں کیسٹ ریکارڈر سے گانے سن رہا تھا اور بڑی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا جارہا تھا۔ ایک جگہ گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھتے چڑھتے رہ گئی۔ ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے سنبھال لیا۔ کتنی ہی عورتوں کی چیخیں نکلیں۔ بس کے مردانے حصے سے کتنے ہی لوگ ڈرائیور کو گالیاں دینے لگے۔

مشکل یہ ہے کہ ڈرائیوروں کو سمجھایا جائے تو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ گالیاں دی جائیں تو انہیں اور غصہ آتا ہے۔ وہ ضد میں آکر گاڑی کو اور بے لگام چھوڑ دیتے ہیں۔ ٹھیک ناگن چورنگی کے پاس پہنچتے ہی جہاں گاڑی کو رکنا تھا' وہاں ڈرائیور نے ایک گاڑی سے اوورٹیک کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گاڑیاں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے گزریں۔ دونوں ہی گاڑیاں ڈگمگائیں' ایک دوسری سڑک کے فٹ پاتھ پر چلی گئی۔ دوسری اپنی جگہ تھم گئی۔ اس وقت تک عورتیں اور بچے چیخ رہے تھے۔ کتنے ہی مسافر ایک دوسرے پر آپڑے تھے۔ کسی کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ کوئی چیخ رہا تھا' کوئی کراہ رہا تھا۔ عورتوں کی بھی یہی حالت تھی۔

رخسانہ کی امی نیچے دبی ہوئی تھیں۔ اوپر معلوم نہیں کتنی عورتیں آپڑی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ عورتیں رو رہی تھیں اور ڈرائیور کو گالیاں دے رہی تھیں۔ کوئی اپنے سامان کو رو رہی تھیں اور ڈرائیور کو گالیاں دے رہی تھیں۔ کوئی اپنے سامان کو سمیٹ رہی تھی۔ کسی عورت کی سبزی سے بھری ہوئی ٹوکری بیگم کے سر پر الٹ گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکلوں سے خود کو عورتوں کے درمیان سے نکالا۔ آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔ ان کا حلیہ عجیب تھا۔ ٹماٹر پچک کر ان کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ کھلے ہوئے منہ میں کچے گوشت کی ایک بوٹی آگئی تھی۔

تھو.... تھو۔ انہوں نے بوٹی منہ سے باہر تھوک دی۔ منہ بساندا ہو رہا تھا۔ بدن دکھ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں چوٹیں آئی تھیں۔ لباس بھی ایک آدھ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ انہوں نے عورتوں کی بھیڑ میں سے ڈھونڈ کر ٹفن کیریئر کو ہاتھ میں لیا پھر راستہ بناتے ہوئے بس سے باہر آگئیں۔ چاروں طرف عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ سب ڈرائیور کو پکڑے ہوئے گالیاں دے رہے تھے اور اسے مار رہے تھے۔ کچھ لوگ زخمی مسافروں کو طبی امداد پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیگم کراہتی ہوئی اس بھیڑ سے نکل گئیں۔ قریب ہی جانی کا مکان تھا۔ انہوں نے سوچا کہ وہاں پہنچ کر اپنے داماد کی ٹیکسی میں بیٹھ کر کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں گی۔

جانی گھر میں تھا۔ اس نے ایک بہترین پتلون اور بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ شیو کرنے کے بعد چہرے کو خوب جھاڑ پونچھ کر صاف کیا تھا اور اب آئینے کے سامنے کنگھا کر رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے فرزانہ کی صورت گھوم رہی تھی' وہ کہہ کر آیا تھا کہ آٹھ بجے تک اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ابھی پانچ بجنے والے تھے مگر بے چینی ایسی تھی کہ ابھی سے جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

وہ کنگھی کرنے کے بعد اسے آئینے کے سامنے رکھنے لگا۔ تب اچانک ہی اس کنگھی سے رخسانہ کی آواز سنائی دینے لگی "کتنی بار سمجھایا ہے' میری کنگھی استعمال نہ کیا کرو' تمہارے سر میں بھی جوئیں پڑ جائیں گی۔"

آئینے کی سطح پر اس کا عکس مٹ گیا۔ رخسانہ نظر آنے لگی۔ وہ بہت ہی نفاست پسند تھی۔ صفائی کا بڑا خیال رکھتی تھی لیکن جب کبھی اپنی امی کے پاس ہوتی تھی تو سر میں

جوئیں بھر کر آتی تھی۔ اس نے بڑے دکھ سے پوچھا "جانی۔ جانی بن سنور کر کہاں جارہے ہو؟"

وہ ہچکچانے لگا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رخسانہ کے عکس نے کہا "دیکھو، جھوٹ نہ بولنا تم نے وعدہ کیا تھا۔ جانی نے کہا "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس سے خود نہیں ملا۔ بس تقدیر ادھر لے گئی۔"

"دیکھو جانی، مرد اپنی عورت کی تقدیر بناتا ہے اور تم کسی عورت سے اپنی تقدیر بنانے جارہے ہو، کیا یہ اچھی بات ہے، کیا تم اسے میری جگہ دو گے؟"

وہ انکار میں سرہلا کر بولا "نہیں نہیں میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ تم اتنی اچھی ہو، اتنی پیاری ہو کہ میں تمہاری جگہ کسی کو نہیں دے سکتا۔"

"دیکھو پھر اپنی قسم اور اپنا وعدہ یاد کرو کہ تم میرے آنے تک کبھی دوسری شادی کا خیال تک دل میں نہیں لاؤ گے۔ کسی کو میری جگہ نہ دو گے۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میں پانچ برس تک کبھی دوسری شادی کا خیال بھی دماغ میں نہ لاؤں اور میں نے تم سے کہا تھا۔ جب تک تم میری شریک حیات رہو گی۔ اس وقت تک کوئی دوسری تمہاری جگہ نہیں لے گی۔"

"وہ جگہ لے رہی ہے۔ دیکھو جانی! تم آئینہ دیکھتے ہو تو اسے دیکھتے ہو مجھے نہیں دیکھتے۔"

"خدا کی قسم اس وقت میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ دنیا کا ہر تصور، ہر خواہش، ہر محبت، ہر رشتہ مٹ گیا ہے تم ہی تم نظر آرہی ہو۔"

اچانک ہی وہ آئینے کی سطح سے مٹ گئی اور اس کی ساس نظر آنے لگیں۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بہت ہی برے حلیے میں تھیں۔ ان کا منہ رونے جیسا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر جانی ایک دم سے چونک گیا۔ آہستہ آہستہ قریب آتے ہوئے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ اچانک ہی عامل بابا کی بات یاد آگئی۔ آج شام تک وہ بالوں والی تمہارے پاس بہت ہی بری حالت میں پہنچے گی۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولیں "بیٹا مجھے سخت چوٹیں آئی ہیں، وہاں بس کا حادثہ ہو گیا تھا مجھے فوراً ہی کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

جانی کی نظریں اس کے سر پر پہنچ کر اٹک گئیں۔ بیگم نے اپنے سر میں جہاں ایک ہیرپن لگائی تھی، وہاں ہیرپن سے گوشت کی ایک بوٹی اٹکی ہوئی تھی اور جانی کے دماغ میں عامل بابا کی بات گونج رہی تھی کہ وہ بالوں والی جس محلے میں ہوگی، وہاں گوشت کی بوٹی پھینکی جائے گی تو اس کے عمل سے وہ کھنچی چلی آئے گی اور ساس صاحبہ کھنچی آئی تھیں۔

انہوں نے پوچھا "بیٹے! تم اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو؟"

وہ خیالات سے چونک گیا پھر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا "میں آپ کے حال پر ترس کھا رہا ہوں، مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے، آیئے میں ابھی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔" وہ فوراً ہی پلٹ گئیں۔ جانی نے انہیں روکتے ہوئے کہا "ٹھہریئے آپ کو اتنی تیزی سے نہیں چلنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں چلنا چاہیے؟"

اس نے سر پر رکھی ہوئی کچے گوشت کی بوٹی کو دیکھتے ہوئے کہا "چلتے ہوئے جھٹکا لگے گا تو یہ گر جائے گی۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا "کیا گر جائے گا؟"

"میرا مطلب ہے، آپ کو چوٹیں آئی ہیں۔ آپ گر سکتی ہیں اس لیے سنبھل سنبھل کر چلنا چاہیے۔ ٹھہریئے، میں آپ کو سہارا دے کر لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازے کو بند کیا۔ تالا لگایا پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا "میرا ہاتھ تھام لیجئے، میں آپ کو آرام سے لے جاؤں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولیں "بیٹا! تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو، کتنی عزت کرتے ہو۔"

وہ اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل کر ٹیکسی تک آئیں۔ جانی نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر انہیں بٹھایا پھر دوسری طرف سے گھوم کر خود اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور بڑے آرام سے ڈرائیو کرنے لگا۔ اس نے عقب نما آئینے کو بالکل جھکا دیا تھا اور اس زاویے پر رکھا تھا کہ اپنی ساس کا سر نظر آرہا تھا اور سر پر وہ بوٹی رکھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بوٹی سر سے گرنے نہ پائے۔

انہوں نے پوچھا "تم اتنی آہستہ سے گاڑی کیوں چلا رہے ہو؟"

"میں آپ کو آرام سے ڈاکٹر کے پاس پہنچانا چاہتا ہوں۔ تیزی سے چلاؤں گا' گاڑی کو جھٹکے لگیں گے تو آپ کو تکلیف ہوگی۔"

وہ مسکرا کر دعائیں دینے لگیں پھر کہا "میری ڈاکٹر بیٹی ہوتی تو گھر ہی میں علاج ہوتا۔ اللہ جانے اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ اللہ اسے خیریت سے رکھے۔"

جانی نے پوچھا "رخسانہ کو گئے آج تیسرا دن ہے اس کا خط کب تک آسکتا ہے؟"

وہ کچھ سوچ کر بولیں "زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں خط آجانا چاہیے۔"

"اس کے جانے کے بعد آپ اس فکر میں مبتلا ہوگئی ہیں کہ میں کہیں بھٹک نہ جاؤں یا دوسری شادی نہ کرلوں۔"

وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولیں "نہیں' میں ایسا نہیں سوچتی تم ایسی باتیں کیوں کررہے ہو؟"

"بس یونہی' جب آنکھوں کے سامنے کوئی بات ہوتی ہے' کوئی تجربہ سامنے ہو تو ایسا بولنا پڑتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھی۔ کیسا تجربہ؟ تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میرے ایک دوست کی ساس ہے وہ اس پر جادو ٹونے کرتی رہتی ہے۔"

"کیا تم مجھ پر شبہ کررہے ہو؟"

"بالکل نہیں۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو کیا اس بات پر شبہ کیا جاسکتا ہے؟"

وہ سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولیں "یہ تم کدھر جارہے ہو؟ مجھے کس ڈاکٹر کے پاس لے جارہے ہو؟"

"ڈاکٹر ذرا دور رہتا ہے میری جان پہچان والا ہے۔ وہ سستا علاج کرے گا' اچھا علاج کرے گا۔"

وہ مطمئن ہوگئیں۔ تھوڑی دیر تک چپ چاپ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہیں پھر چونک کر بولیں "ابھی تم نے مجھ پر شبہ کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں' بس یونہی ایک انسان دوسرے انسان پر شبہ کرتا ہے پھر وہ شبہ دور ہوجاتا ہے۔ میرا شبہ دور ہوچکا ہے۔"

"آخر سنوں تو۔ تم میرے متعلق کیا رائے قائم کررہے ہو؟"

اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا "کامی کیسا ہے؟"

"اچھا ہے' تم کیسے باپ ہو' اسے صبح سے دیکھنے بھی نہیں آئے؟"

"میں مصروف تھا پھر آؤں گا۔"

"ابھی ڈاکٹر سے دوا لینے کے بعد تم میرے ساتھ گھر چلو گے اور کامی کو پیار کرو گے۔"

"ہاں کروں گا۔" وہ انہیں باتوں میں ٹالتا رہا اور فاصلے طے کرتا رہا پھر اس نے عامل بابا کے مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ گاڑی سے اتر کر دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "آئیے تشریف لائیے۔"

وہ باہر نکلتے ہوئے آس پاس دیکھتے ہوئے بولیں "یہ تم کہاں لے آئے ہو؟ یہ کس کا مکان؟"

یہ کہتے ہوئے ان کی نظر بڑے سے سائن بورڈ پر پڑی پھر وہ حیرانی سے بولیں "یہ تو کسی عامل کا مکان معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں' وہ جھاڑ پھونک کے ذریعے آپ کی ساری تکلیفیں دور کردیں گے۔ آئیے۔"

اس نے ہاتھ پکڑ لیا اور تقریباً کھینچتے ہوئے دروازے پر لے آیا۔

"کون ہے؟" اندر مسند پر بیٹھے ہوئے عامل بابا نے اپنے ماتحت سے پوچھا "کس کی گاڑی آئی ہے؟"

ان کے ماتحت نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا "استاد! وہی ٹیکسی ڈرائیور ہے جو سات سو روپے دے کر گیا تھا۔"

"تم بکرے کا سر اور پائے خرید کر لائے ہو؟"

"لے آیا ہوں۔ آخری کمرے میں رکھے ہیں۔"

"جاؤ انہیں لے آؤ اور دروازہ کھول دو۔"

اس نے دروازے کو کھول دیا۔ جانی اپنی ساس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے آیا۔ وہ کہہ رہی تھیں "ارے تم مجھے اس طرح کیوں کھینچ رہے ہو؟"

جانی نے انہیں نظرانداز کرتے ہوئے عامل بابا سے کہا "بابا جی آپنے بہت ہی اچھا عمل پڑھا ہے' چور پکڑا گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ میری محبوبہ نے مجھ پر جادو کیا ہے لیکن

جادوگرنی یہ ہے دیکھیے جو گوشت کی بوٹی آپ نے ناظم آباد کے اس محلے میں پھینکوائی ہوگی وہ بوٹی اس کے سر پر آکر چپک گئی ہے۔"

عامل بابا نے شدید حیرانی سے ان کے سر میں چپکی گوشت کی اکلوتی بوٹی کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا ہوجائے گا۔ سات سو روپے تو ان کی جیب میں پڑے تھے۔ صرف بیس روپے میں بکری کا سر اور پائے خریدے گئے تھے تاکہ ثبوت کے طور پر کبھی جانی کے سامنے پیش کیے جاسکیں اور اس وقت ان کے ماتحت نے وہ ثبوت بھی لاکر پیش کردیا۔

بیگم نے جانی کی بات سنتے ہی اپنے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ بوٹی ہاتھ میں آگئی۔ انہوں نے اسے ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا "یہ تو بس کا حادثہ ہوگیا تھا۔ ایک عورت کی گوشت کی ٹوکری مجھ پر الٹ گئی تھی۔ وہ گوشت سر پر چپک گیا۔"

اس کی بات سنتے ہی عامل بابا نے زوردار قہقہہ لگایا پھر کہا "چالاک جادوگرنی! اب تیری بات نہیں بنے گی۔ میں کوئی معمولی عامل نہیں ہوں۔ میں نے عمل پڑھا اور تو گرفتار ہوگئی۔"

جانی نے اپنی جیب سے وہ چھوٹی سی ڈبیا نکالی پھر اسے کھول کر چٹکی میں بالوں کو پکڑ کر باباجی کے سامنے لاتے ہوئے کہا "اب اس سے پوچھیے' کیا یہ بال اس کے نہیں ہیں؟"

عامل بابا نے سرہلا کر کہا "بے شک اسی کے بال ہیں اور یہ ابھی اقرار کرے گی۔"

بیگم نے پریشان ہوکر اپنے بالوں کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کے بالوں کا بھید یوں کھل جائے گا۔ انہوں نے ڈھیٹ بن کر انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا "نہیں! یہ میرے بال نہیں ہیں۔ بھلا میں اپنے داماد کے پاس کیوں چھوڑوں گی۔"

"جادو کرنے کے لیے اور اپنے داماد کو تسخیر کرنے کے لیے۔"

جانی نے کہا "ہاں تم مجھے اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتی تھیں تاکہ میں تمہاری بیٹی کی غیر موجودگی میں کسی دوسری طرف نہ بھٹک جاؤں مجھے گمراہی سے روکنے کے لیے تم نے یہ جادو ٹونے سے کام لیا ہے۔"

بیگم نے بڑی محبت سے پچکارتے ہوئے کہا "جانی تم میرے بیٹے ہو۔ میں بھلا تم پر کیوں جادو کروں گی۔"

"بس اب مجھے بیٹا نہ کہنا۔ کل رات کو جب میں نے تمہارا ایک بال جلایا تھا اور تم حاضر ہوگئی تھیں' اسی وقت مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا پھر بھی میں نہ سمجھ سکا مگر اب دھوکا نہیں کھاؤں گا۔"

عامل بابا نے کہا "یہ اس طرح اقرار نہیں کرے گی۔ ابھی میرے آدمی اسے رسیوں سے باندھیں گے' اسے فرش پر بٹھائیں گے اور اس کے سامنے ایک انگیٹھی سلگا کر اس میں مرچیں ڈالیں گے۔ جب مرچوں کا دھواں اس کی ناک میں جائے گا تو اس کے اندر سے وہ چڑیل نکل کر بولنے لگے گی۔"

"یااللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولیں "جانی مجھے معاف کردو۔ اب اگر مجھے کبھی دوسری زندگی ملی تو میں بیٹی پیدا نہیں کروں گی۔ اگر بیٹی ہوئی تو کسی ٹیکسی ڈرائیور کو داماد نہیں بناؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردو میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ بال میرے ہیں مگر میں نے کوئی جادو نہیں کیا ہے۔ اگر تم لوگ مرچوں کا دھواں میری ناک تک پہنچانا چاہتے ہو تو میں مجبوراً اقرار کرلیتی ہوں کہ میں نے جادو بھی کیا تھا۔ بس خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑدو' مجھے جانے دو۔"

عامل بابا نے کہا "تمہارا داماد ہی تمہیں معاف کرسکتا ہے ورنہ میں تو ابھی ایسا عمل پڑھوں گا کہ تم جل کر راکھ ہوجاؤ گی۔"

جانی نے آگے بڑھ کر خوشامدانہ انداز میں کہا "باباجی آپ کی بڑی مہربانی' آپ ایسا عمل پڑھیں کہ بیٹی کے جہیز میں آنے والی ہر ساس جل کر راکھ ہوجائے۔"

عامل بابا اٹھ کر بیٹھ گئے جیسے عمل پڑھنے والے ہوں۔ بیگم نے گھبرا کر پہلے تو باباجی کو دیکھا پھر فوراً ہی جیسے عقل آگئی۔ وہ جانی کی طرف گھوم کر چونکتے ہوئے بولیں "ہائے میں تو بھول ہی گئی کامران کے دودھ پینے کا وقت ہوگیا ہے اور اس کے نانا کو پتا نہیں ہے کہ کتنا دودھ اور کتنا پانی ملانا چاہیے۔"

جانی سوچنے کے انداز میں ان کا منہ تکنے لگا۔ اس کے تصور میں اس کا ننھا سا بیٹا رو رہا تھا اور دودھ کے لیے مچل رہا تھا۔ بیگم نے کہا "باباجی سے کہو' مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ میں بچے کو دودھ پلادوں اس کے بعد یہ مجھے جلا کر راکھ کردیں۔"

جانی نے چونک کر کہا "کس کی مجال ہے کہ آپ کو نقصان پہنچائے۔ آپ مرجائیں

گی تو میرے بیٹے کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اسے دودھ کون پلائے گا۔ میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

یہ کہتے ہی وہ اپنی ساس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گیا۔ بابا جی حیرانی سے دیکھتے رہ گئے۔ وہ گاڑی میں اپنی ساس کو بٹھانے کے بعد اسے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا "آپ کے ہاتھ میں میری بہت بڑی کمزوری ہے' میں آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر ایک بات کان کھول کر سن لیجئے۔ آئندہ میں آپ کے گھر کھانا کھانے نہیں آؤں گا۔ آپ کے گھر کا پانی بھی نہیں پیوں گا معلوم نہیں کیا پڑھ کر پھونک دیں اور میں مرجاؤں۔"

"جانی ایسا کیوں سوچتے ہو؟ تم میری بیٹی کے سہاگ ہو۔ میں تمہیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہوں؟"

"بس اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ آپ میرے گھر کی طرف بھی نہیں آئیں گی۔"

"واہ کیوں نہیں آؤں گی' وہ میری بیٹی کا بھی گھر ہے۔ اس نے جاتے وقت تاکید کی تھی کہ میں وہاں آتی جاتی رہوں اور تم پر نظر رکھوں۔"

"بس بس' اب جاسوسی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کریں۔ اگر آپ میرے گھر کی طرف آئیں گی تو میں اپنے بچے کو آپ کے گھر سے لے آؤں گا اور رخسانہ کے آنے تک تمام رشتے توڑ دوں گا۔ ہوسکا تو میں بچے کو لے کر کراچی سے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں جانی ایسا ظلم نہ کرنا۔ کامی میری بیٹی کی یاد دلاتا ہے۔ میں اس کو پیار کرتی ہوں تو وہ پیار میری بیٹی کو پہنچتا ہے خدا کے لیے مجھے کامی سے جدا نہ کرنا۔"

"میں آپ کی طرح ظالم نہیں ہوں اسی لیے کہتا ہوں آپ میرے گھر کی طرف نہ آئیں۔ میں آپ کے گھر میں صرف اپنے بیٹے کو پیار کرنے کے لیے آؤں گا پھر چلا جاؤں گا۔ اگر یہ منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ سمجھ لیں جس دن آپ میرے گھر کی طرف آئیں گی' اس دن کامی آپ کے گھر سے چلا جائے گا۔"

اس نے مکان کے سامنے ٹیکسی روک دی۔ بیگم سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جانی نے پوچھا "اب کیا سوچ رہی ہیں گھر آگیا ہے چلیئے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ جانی ٹیکسی سے باہر نکل کر ان کے پیچھے چلتا ہوا مکان میں داخل ہوا' وہاں فرید احمد نے اپنی بیگم کا حلیہ دیکھا تو حیران رہ گئے پریشان ہو کر جانی کی طرف دیکھا۔ یہ شبہ ہوا کہ ساس اور داماد میں جھگڑا ہوا ہے اور یقیناً جانی اپنی جہالت کی وجہ سے ہاتھاپائی پر اتر آیا ہوگا۔

اب فرید احمد میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ جانی سے ہاتھاپائی پر اتر آتے۔ تاہم انہوں نے غصہ دکھاتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے؟ کیا ہوا میری بیگم کو؟"

"بیگم آپ کے سامنے کھڑی ہیں' آپ ان سے پوچھیئے' مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں۔"

بیگم نے جھجکتے ہوئے کہا "میں جانی کے لیے کھانا لے جارہی تھی کہ بس کا حادثہ ہوگیا' وہاں میری یہ حالت ہوگئی۔"

جانی نے ہاتھ نچا کر کہا "دیکھو جھوٹ مت بولو۔ نہیں تو مجھ کو غصہ آجائے گا۔ بس کا حادثہ تو ایک بہانہ ہے۔ اصل میں عامل بابا کی کرامات نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے۔"

فرید احمد نے حیرانی سے پوچھا "کیسی کرامات؟"

"عامل بابا نے ان کے بالوں پر عمل کیا تھا۔ گوشت کی بوٹیاں پھینکی تھیں۔ ایک بوٹی ان کے بالوں سے جاکر چپک گئی اور ان کی یہ حالت ہوگئی۔"

بیگم کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ جانی نے ہاتھ بڑھا کر کہا "خبردار! ابھی کچھ نہ بولنا' مجھے بولنے دو۔" یہ کہہ کر اس نے فرید احمد کو مخاطب کیا "انہوں نے اپنے بال میرے پاس پہنچا دیے تھے۔ آپ کیسے شوہر ہیں؟ اپنی بیوی کو ان حرکتوں سے منع نہیں کرسکتے تھے؟ ایسی حرکتیں عورتیں نہیں کرتیں چڑیلیں کرتی ہیں۔ اب میں نے الٹا عمل کروادیا تو دیکھ لیجئے' نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ ایمان سے' رخسانہ کی قسم کھا کر' اپنے نواسے کی قسم کھا کر کہیں کہ آپ کی بیگم نے اپنے سر کے بال میرے پاس نہیں پہنچائے؟"

بیگم نے اس سے دور ہٹ کر ڈرتے ہوئے کہا "نہیں یہ جھوٹ ہے۔ وہ میرے بال نہیں تھے۔"

جانی نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہا "مجھے جھوٹ بولنے سے غصہ آتا ہے۔ ابھی تم نے عامل بابا کے سامنے اقرار کیا تھا۔"

"میں تمہاری ساس ہوں' مجھے تم نہ کہو۔"

"ساس صرف بولنے کے لیے ایک رشتہ ہے ورنہ عورت اپنے داماد کو بھی ماں کی محبت دے سکتی ہے میری کوئی اماں نہیں ہے تم چاہتیں تو میری ماں بن کر دکھا سکتی تھیں لیکن تم سچ مچ یہ ثابت کر رہی ہو کہ بیوی کی ماں آخر ساس ہی ہوتی ہے۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ گٹھ جوڑ کرتی رہتی ہے۔ جیسا کہ تم نے مجھ پر جادو ٹونے کروائے' اپنے بال میرے پاس رکھتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ کیا کسی شریف گھرانے کی معزز خاتون ایسا کر سکتی ہے؟"

وہ غصے سے پیر پٹختا دوسرے کمرے میں اپنے بیٹے کے پاس چلا گیا۔ بیگم کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں نڈھال سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ان کے قریب ہی فرید احمد نے بیٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا "میں ایسے ہی وقت کے لیے سمجھاتا ہوں مگر تم الٹی سیدھی حرکتوں سے باز نہیں آتیں۔"

"میں نے کیا کیا ہے' کیا میں اس پر جادو کر رہی تھی؟"

"نہیں کر رہی تھیں لیکن اپنے بال توڑ کر اس کی ڈبیا میں تو رکھے تھے' کیا ضرورت تھی اپنے بال توڑ کر اس کی ڈبیا میں رکھنے کی۔ آسان تو یہ تھا کہ ڈبیا میں جو بال تھے' ہوا میں اڑا دیے جاتے۔ ایک ذرا سی حماقت سے کیسی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔"

"آپ میرے پاس بیٹھے ہوئے بولے جا رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ داماد کی غلط فہمی دور کریں۔"

"میں کتنی غلط فہمیاں دور کر سکتا ہوں' ٹھیک ہے کہ وہ غلط سمجھ رہا ہے لیکن یہ بات سچ ہے کہ تم داماد کے خلاف گٹھ جوڑ کرتی رہتی ہو۔ اگر تم جانی کی ماں ہوتیں تو کبھی یہ برداشت نہ کرتیں کہ تمہاری بہو جھوٹ بول کر اور تمہارے بیٹے کو دھوکا دے کر لندن جائے چونکہ تم ساس ہو اس لیے تم نے اپنی بیٹی کے جھوٹ اور فریب کو برداشت کر لیا بلکہ فریب دینے کی تعلیم بھی تم نے ہی بیٹی کو دی۔"

وہ غصے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اپنا حلیہ بدل کر لباس تبدیل کر کے باہر آئیں۔ اسی وقت جانی بھی کامی کو گود میں لے کر کھلاتا ہوا' اس کو چومتا ہوا بیٹھک میں آیا پھر اس نے فرید احمد سے کہا "میں آپ کو بھی یہ بات سمجھا دوں کہ مجھے آپ دونوں پر بالکل بھروسا نہیں ہے' میں چاہوں تو کامران کو یہاں سے لے جا سکتا ہوں

لیکن اتنا سمجھتا ہوں کہ آپ دونوں مجھ سے تو دشمنی کر سکتے ہیں' اپنے نواسے سے نہیں کر سکتے لہٰذا یہ یہاں رہے گا۔ میں یہاں کبھی کھانے کے لیے یا ایک گلاس پانی پینے کے لیے بھی نہیں آؤں گا۔ دوسری بات یہ کہ آپ دونوں کبھی میرے گھر کی طرف نہ آئیں مجھے کیا معلوم آپ میرے گھر کے دروازے پر کون سا منتر پڑھ کر چلے جائیں اور میں نقصان اٹھاؤں۔ میں کسی صورت میں آپ لوگوں پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ کیا میری بات سمجھ میں آ رہی ہے؟"

فرید احمد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "بیٹے! یہ میں مانتا ہوں کہ تمہاری ساس نے تم سے بڑی زیادتی کی ہے۔ دیکھو بزرگ سمجھ کر معاف کر دو۔ اس طرح قطع تعلق نہ کرو۔ رخسانہ ہماری بیٹی ہے اور تمہاری بیوی ہے۔ وہ ہم سب کی محبتوں کا مرکز ہے تمہیں اس کا واسطہ ہے' غصہ تھوک دو۔"

"مجھے تھوکنا نہیں آتا۔ جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔ اگر آپ نے میرے گھر آنے کی ضد کی تو میں ابھی کامران کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ جب تک آپ کی بیٹی نہیں آئے گی' اس وقت تک میں نواسے کی شکل دیکھنے نہیں دوں گا۔"

بیگم جلدی سے چلتے ہوئے تقریباً دوڑتے ہوئے جانی کے سامنے آئیں پھر گڑگڑا کر بولیں "نہیں بیٹے' مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ قسم کھاتی ہوں کہ میں تمہارے گھر کی طرف نہیں آؤں گی۔ یہ بھی نہیں آئیں گے' بس تم آ کر کامران کو دیکھ لیا کرنا' لاؤ اسے مجھے دو' ہم سے جدا نہ کرو۔ تمہاری جو خوشی ہو گی' وہی ہماری خوشی ہو گی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کامران کو اس کی گود سے لے لیا۔ جانی نے انہیں دھمکی دینے والی نظروں سے دیکھا پھر وہاں سے باہر آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے سوچ رہا تھا چلو اسی بہانے ساس اور سسر کو اپنے گھر کی طرف آنے سے روک دیا ہے' یہ بات بڑی اچھی ہے۔ اگر فرزانہ آئندہ ملاقات کے لیے راضی ہو گئی اور اس سے ملنے ملانے کا سلسلہ رہے گا تو اس سلسلے میں کوئی ایسی جگہ ہو جہاں تنہائی ہو' کوئی تیسرا نہ ہو۔ چار دیواری ہو' کوئی دور سے دیکھنے والا نہ ہو۔ بجلی فیل ہو' دیواریں بھی اندھی ہو جائیں' اوپر چھت ہو' آسمان تک نہ دیکھ سکے۔ اس نے خوشی سے گنگناتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ

کی، گیئر بدلے پھر اطمینان سے ڈرائیو کرنے لگا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پولیس
اسٹیشن کے سامنے ایک سپاہی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا، اسے رکنا پڑا۔ ایک انسپکٹر
تھانے کی عمارت سے نکل کر ایک مولوی صاحب سے باتیں کرتا ہوا اس کی طرف آرہا
تھا۔ ان کے پیچھے ایک عورت چادر میں لپٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ تینوں
ٹیکسی کے پاس آکر رک گئے۔ انسپکٹر نے جانی سے کہا "انہیں دارالامان تک پہنچا دو اور
ان سے کرایہ نہ لینا۔"

مولوی صاحب اس عورت کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر نے ان سے کہا
"میں نے تمام کاغذات آپ کو دے دیے ہیں۔ انہیں دارالامان میں دکھایئے گا تو اس
لڑکی کو وہاں پناہ مل جائے گی۔"

پھر انسپکٹر نے ٹیکسی کی باڈی کو بید سے مارتے ہوئے جانی سے کہا "جاؤ۔"
جانی غصے سے کھول گیا۔ اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور دانت پیستے ہوئے اسے آگے
بڑھادیا۔ یہی انداز ڈرائیوروں کو احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے، کس طرح تھانے دار
نے بید مار کر جانے کے لیے کہا تھا۔ جیسے ٹیکسی پر نہیں، جانی کی پیٹھ پر چابک رسید کرتے
ہوئے ایک جانور کی طرح ہانک رہا تھا کہ چلو۔

ٹیکسی کی محدود فضا میں خاموشی تھی پھر اس خاموشی میں چادر والی کی سسکیاں سنائی
دینے لگیں۔ اب اس نے اپنے سر سے چادر ہٹادی تھی۔ جانی نے عقب نما آئینے میں
کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ لڑکی خوب صورت تھی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ آنسوؤں
سے بھیگ رہا تھا۔ مولوی صاحب کہہ رہے تھے "بیٹی صبر کرو۔ بزرگوں کے مشورے کے
بغیر کبھی کوئی بڑا اقدام نہیں اٹھانا چاہیے۔ دیکھ لو تمہارا کیا حال ہو رہا ہے خدا کسی نوجوان
لڑکی کو پردیس میں پہنچا کر یوں دربدر کی ٹھوکریں نہ کھلائے۔"

مولوی صاحب کی باتیں سنتے ہی جانی کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یکبارگی
اس کے خیالات اچھل کر اپنی رخسانہ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ بھی تو جوان تھی، خوب
صورت تھی، پردیس میں تھی۔ خدا نہ کرے کہ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہو۔ جانی کا
دل گھبرانے لگا تھا۔

جب اپنے دل میں درد اٹھتا ہے تو اس درد سے دوسروں کی پہچان ہوتی ہے۔ اس

نے مولوی صاحب سے پوچھا "کیا بات ہے؟ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے، کیوں
رو رہی ہے؟"

مولوی صاحب نے کہا "یہ نواب شاہ کی رہنے والی ہے، والدین کو دھوکا دے کر اپنے
عاشق کے ساتھ بھاگ کر چلی آئی۔ یہاں اس کے عاشق نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ وہ
اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ تب یہ انکار کرنے لگی۔ مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ
اس لڑکی نے اپنے بزرگوں کو دھوکا دیا اور عاشق کے ساتھ یہاں آئی لیکن اس لڑکی کی
شرم و حیا نے میری ہمدردیاں حاصل کرلی ہیں۔ اس نے اپنی عزت کو داؤ پر نہیں لگایا۔
اس لڑکے سے صاف صاف کہہ دیا کہ پہلے نکاح پڑھایا جائے گا پھر پتا چلا کہ اس لڑکے کی
پہلے ہی کہیں شادی ہو چکی ہے اور وہ ایک بچے کا باپ ہے۔ وہ دوسری شادی نہیں کرنا
چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ ہاتھ نہیں آرہی ہے تو وہ شادی کے لیے راضی
ہوگیا۔ ابھی تقریباً دو گھنٹے پہلے مجھے نکاح پڑھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔"

مولوی صاحب ایک لمحے کے لیے چپ ہوئے، پھر بولنے لگے۔ "وہاں صرف چار
نوجوان نظر آئے۔ پانچواں وہ لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے نکاح کا
رجسٹر سنبھالتے ہوئے پوچھا "لڑکی کے والد اور رشتے دار کہاں ہیں؟"

ان میں سے ایک نوجوان نے کہا "میں لڑکی کا سرپرست ہوں۔"

میں نے پوچھا "لڑکی کے والدین کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا "والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔"

مجھے شبہ ہوا، میں نے پوچھا "لڑکی کے خاندان میں دوسرے بزرگ تو یقیناً ہوں
گے۔"

اس نے جواب دیا "اتفاق سے کوئی بڑا بوڑھا نہیں ہے۔"

میں نے دولہا کو دیکھتے ہوئے پوچھا "ان صاحب زادے کے بزرگ کہاں ہیں؟"

صاحب زادے نے کہا "دیکھیے مولوی صاحب، اصل بات یہ ہے کہ میری ایک
شادی ہو چکی ہے میرے گھر والے کبھی دوسری شادی کے لیے راضی نہیں ہوں گے اس
لیے میں ان سے چھپ کر یہ نکاح کر رہا ہوں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر کھلے ہوئے دروازے تک آیا پھر وہاں سے میں نے کہا

"دیکھو مجھے کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے اگر یہاں لڑکی کا کوئی سگا رشتے دار ہے تو پھر وہ مجھے اپنا نام اور پتا بتائے' میں لڑکی کے متعلق تحقیقات کروں گا۔"

ایک نوجوان نے کہا "مولوی صاحب! آپ کو نکاح پڑھانے سے کام ہے' ہم آپ کو منہ مانگی فیس ادا کریں گے۔ ہم کوئی ناجائز کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"نکاح اس وقت جائز ہوتا ہے جب لڑکی کے والد یا معتبر سرپرست یا معتبر وکیل ہوں۔ تم نوجوانوں کی عمر ایسی معتبر نہیں ہے کہ کسی لڑکی کی طرف سے وکالت کر سکو۔ تم لوگ حماقت ہی کر سکتے ہو' لڑکی کو یہاں میرے سامنے لے آؤ۔"

ایک نے کہا "مولوی صاحب! آپ خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "بات تو اب بڑھنے والی ہے' دیکھو میں یہاں دروازے پر کھڑا ہوں میرے سامنے پورا محلہ نظر آ رہا ہے۔ میں چاہوں تو ایک چیخ مار کر سارے لوگوں کو جمع کر لوں لیکن میرا مذہب سکھاتا ہے کہ کسی نامحرم کی عزت رکھی جائے۔ پتا نہیں وہ لڑکی کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شرم وحیا کا تقاضا ہے کہ میں اس کی عزت رکھوں۔ جب بات بنے گی تو میں سچ مچ نکاح پڑھا دوں گا' کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور کوئی گڑبڑ ہوگی تو اس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤں گا۔"

مولوی صاحب کہہ رہے تھے اور جانی کا دماغ اپنے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا بھی نکاح جب رخسانہ سے پڑھایا گیا تھا اور اس خوشی اور مسرت کے موقع پر اس کا اپنا کوئی بزرگ نہیں تھا۔ مستری چاچا ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ جانی' تم زبردست دھوکا کھانے والے ہو۔ واقعی بزرگوں کی بات نہ ماننے سے اکثر دھوکا کھانا پڑتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا۔ اب تو کوئی شکایت بھی نہیں تھی' رخسانہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اتنی اچھی کہ اس سے اچھی اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔

مولوی صاحب کہہ رہے تھے "وہ لڑکے مکان کے اندرونی حصے میں گئے۔ میں تھوڑی دیر انتظار کرتا رہا پھر میں نے آواز دی تو یہ لڑکی روتے ہوئے میرے پاس آئی۔ اس نے بتایا کہ وہ سب پچھلے دروازے سے بھاگ گئے ہیں۔ میں اس لڑکی کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کے حوالے سے میں دوسرے تمام نوجوانوں کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ

ایسی محبت' ایسا عشق نہ کرو جو خاندان کو بدنام کرے اور ماں باپ کو منہ دکھانے کے قابل نہ رکھے۔ اپنے بسے بسائے گھر کو اجاڑ دے۔ وہ ایک بیوی اور ایک بچے والا تھا' اسے اپنی بیوی سے دھوکا کرتے ہوئے اپنے بچے کو چھوڑ کر کسی دوسری نوجوان لڑکی کی طرف مائل ہوتے ہوئے کیا ذرا بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا ہوگا کہ وہ عشق یا اپنی ہوس کے لیے اپنی محبت کرنے والی بیوی اور بچے کو....."

جانی آگے نہ سن سکا۔ اس کا دماغ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ کامران اس کی گود میں ہمک رہا تھا۔ رخسانہ آنسو بھری آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔ اس نے دارالامان کی عمارت کے سامنے گاڑی روک دی۔ مولوی صاحب نے اترتے ہوئے کہا "بیٹے! ذرا ٹیکسی روکے رکھنا۔ معلوم نہیں اس لڑکی کو یہاں پناہ ملتی ہے یا نہیں۔ سنا ہے دارالامان میں بڑی سختیاں ہوتی ہیں اور بڑی چھان بین کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لڑکی کو فوری طور پر نہ رکھیں' مجھے اسے پناہ دینے کے لیے کہیں اور لے جانا پڑے تو بیٹے ذرا انتظار کر لینا۔"

جانی نے اپنی گھڑی دیکھی' آٹھ بجنے والے تھے۔ اس نے فرزانہ سے کہا تھا کہ وہ آٹھ بجے اس کے کلینک کے سامنے سڑک کے دوسری طرف آ کر اپنی گاڑی میں رات گزارے گا۔ اس نے کہا۔

"مولوی صاحب! مجھے افسوس ہے آپ کسی دوسرے ٹیکسی یا رکشا میں آ جائیے گا' مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"بیٹا! نیکی سے زیادہ ضروری کام کوئی نہیں ہوتا۔ یہ لڑکی پردیس میں ہے۔ معلوم نہیں اس کی قسمت میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ اگر ہم اور تم اسے ٹھوکروں سے نہیں بچائیں گے' تو ذرا سوچو اگر ہماری کوئی عزیزہ پردیس میں جائے اور اس کے ساتھ...."

جانی پھر آگے نہ سن سکا۔ رخسانہ نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ لندن کی انجانی شاہراہوں پر بھٹک رہی تھی۔ کوئی اسے سہارا نہیں دے رہا تھا۔ لوگ اسے ہوس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اس نے گھبرا کر اس چادر والی کو دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ مولوی صاحب میں انتظار کروں گا' چاہے ساری رات گزر جائے۔ میں یہیں بیٹھا رہوں

گا۔"

مولوی صاحب اسے دعائیں دیتے ہوئے لڑکی کو اپنے ساتھ دارالامان کی عمارت میں لے گئے۔ جانی کو یوں لگا جیسے رخسانہ چادر میں لپٹی ہوئی پناہ کی تلاش میں گئی ہے۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا' وہ سوچ رہا تھا کب اس کا خط آئے گا۔ کب اس کی خیریت معلوم ہوگی۔ وہ دن گننے لگا۔ آج تیسرا دن تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ اس کے انکل جمشید وہاں مل گئے ہوں گے' اسے ٹھکانا مل گیا ہوگا۔ وہ وہاں خیریت سے ہوگی' آرام سے ہوگی۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

آدھے گھنٹے کے بعد مولوی صاحب واپس آئے لیکن انہوں نے کہا "بیٹے یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں اور یہ بھی بڑی اچھی بات ہے کہ بہت دور تک تحقیقات ہوتی ہے۔ یہاں کی جو بڑی بیگم صاحبہ ہیں' ان کا حکم ہے کہ اس علاقے کے تھانے دار کو بلایا جائے۔"

جانی نے کہا "لیکن ہمارے علاقے کے تھانے دار نے تمہاری کارروائی مکمل کر دی ہے۔"

"ہاں' وہ تو ہے لیکن یہاں یہ بیگم صاحبہ بڑی محتاط ہیں۔ کہتی ہیں کہ اس علاقے کے تھانے دار کی موجودگی میں لڑکی کو دارالامان میں داخل کیا جائے گا۔ کیا حرج ہے' چلو یہیں قریب ہی تھانہ ہے' وہاں کے انسپکٹر کو بلا کر لے آئیں گے۔"

مولوی صاحب اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک منٹ کے اندر ہی وہاں کے تھانے کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک سپاہی نے بتایا کہ تھانے دار نہیں ہے' کسی طرف گئے ہوئے ہیں' وہاں ان کی جیپ خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے جلد واپس نہیں آسکیں گے۔ اگر انہیں جلدی لانا چاہتے ہیں تو ٹیکسی لے کر چلے جائیں۔ یہ کہہ کر سپاہی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ "چلو میں بتاؤں گا کہ انسپکٹر صاحب کہاں ہیں۔"

مولوی صاحب نے جانی کا منہ دیکھا پھر بے بسی سے کہا "میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں اتنی دیر تک تمہاری ٹیکسی کو اپنے لیے رکھوں۔ میں نے ایک نیکی کرنے کے لیے تمہیں آمادہ کیا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ تم اس لڑکی کو دارالامان پہنچانے کے پیسے

نہیں لو گے لیکن تم پر بوجھ پڑ رہا ہے۔"

جانی نے مسکراتے ہوئے کہا "مولوی صاحب! کوئی بات نہیں آیئے ہم اس لڑکی کو کنارے لگا کر ہی واپس جائیں گے۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر سپاہی کے بتائے ہوئے پتے پر چلنے لگا۔ مولوی صاحب نے پوچھا "کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے۔"

"جی ہاں' میرا ایک بیٹا بھی ہے' میری بیوی بہت تعلیم یافتہ ہے لیڈی ڈاکٹر ہے' وہ لندن گئی ہوئی ہے۔"

"کیا اکیلی گئی ہے؟"

"جی ہاں' وہ بہت سمجھ دار ہے۔"

"بے شک سمجھ دار ہوگی لیکن عورت کو دور سمندر پار ملازمت کے لیے بھیجنا اچھی بات نہیں ہے اور وہ اکیلی۔"

"وہ ملازمت کے لیے نہیں بلکہ علاج کے لیے گئی ہے' اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرے کو ٹھیک کرا کے آئے گی۔"

مولوی صاحب چند لمحوں تک سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا "میری دعا ہے کہ تمہاری شریک حیات بخیریت وہاں سے واپس آئے۔"

جانی نے دل کی گہرائیوں سے کہا "آمین۔"

مولوی صاحب نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر پوچھا "اپنی شریک حیات کو بہت چاہتے ہو؟"

"جی ہاں' وہ بہت اچھی ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ بیوی نگاہوں سے دور ہو جائے' تو اسے یاد رکھا جائے ورنہ آج کل کے نوجوان بیوی کے میکے جاتے ہی دوسری لڑکیوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں' یہ محبت کا روگ اتنا پھیلتا کیوں جا رہا ہے۔ محبت اچھی چیز ہے لیکن اسے بیماری نہیں بنانا چاہیے اور اسے گھر کی تباہی کا سبب بھی نہیں بننا چاہیے۔"

جانی نے کہا "آپ نے تو محبت کو اچھی چیز کہا ہے مگر یہ اچھی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر میں دوسری لڑکی میں دلچسپی لوں تو یہ تباہی کا سبب بنے گی۔"

"جب تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ محبت تباہی لا سکتی ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا بیوی سے محبت پوری نہیں ہوتی؟"

وہ چپ ہو گیا پھر کچھ سوچ کر بولا "مولوی صاحب' اگر بیوی کے علاوہ کوئی دوسری بھی بہت زیادہ پسند آجائے اور دل اسی کی طرف لگا رہے تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

"پہلے تو اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جو دلچسپی' جو کشش تمہیں دوسری میں ملتی ہے' وہ بیوی میں تلاش کرو۔ اگر بیوی میں کسی بات کی کمی ہو' اولاد پیدا ہونے کی امید نہ رہی ہو... یا دائمی مریضہ ہو یا ایسی کوئی بات ہو جس کی وجہ سے مرد دوسری شادی پر مجبور ہو سکتا ہے تو دوسری شادی کر لینا چاہیے لیکن ایک شادی شدہ مرد کو عاشق نہیں بننا چاہیے۔ دیکھو نا' اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوب صورت چیزیں پیدا کی ہیں۔ خواہ عورت ہو یا پھول ہو یا کوئی بہت ہی خوب صورت منظر ہو۔ آدمی جتنا خوب صورتی میں دلچسپی لے گا' اتنا ہی خوب صورتی کو پسند کرتا چلا جائے گا۔ انہیں اپنانے کی کوشش کرتا جائے گا' انہیں اپنانے کا ڈھنگ ایسا ہونا چاہیے کہ اپنے گھر' اپنی شریک حیات پر' اپنے بچوں پر اس کا برا اثر نہ پڑے۔ اس کے بعد خوب صورتی سے محبت کرنا بہت اچھی بات ہے۔"

جانی کے دماغ میں ایک بات گونج رہی تھی۔ دوسری شادی کرنا جائز تو ہے لیکن اس کا صحیح جواز پیش کرنا ہو گا اور وہ کون سا ایسا جواز پیش کر سکتا ہے کہ فرزانہ اس کی ہو جائے۔

پھر اس کے دماغ نے سمجھایا' فرزانہ ایسی نہیں ہے کہ وہ کسی پر سوتن بن کر آئے گی۔ رخسانہ اور فرزانہ دونوں ہی تعلیم یافتہ عورتیں ہیں' وہ کسی کی سوتن بننا کبھی گوارا نہیں کریں گی۔

سپاہی کے کہنے پر اس نے ایک مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ سپاہی مکان کے اندر گیا پھر پانچ منٹ بعد واپس آیا اور مولوی صاحب کو اندر بلا کر لے گیا پھر پندرہ منٹ بعد وہ مولوی صاحب اور تھانے کا انچارج باہر آئے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ جانی نے انہیں دارالامان پہنچا دیا۔ مولوی صاحب تھانے کے انچارج کے ساتھ دارالامان میں

جانے لگے۔ جانی نے کہا "مولوی صاحب! آپ اطمینان رکھیے۔ جب تک اس لڑکی کا یہاں ٹھکانا نہیں بنے گا۔ میں آپ کے انتظار میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔"

مولوی صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر چلے گئے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے وہ تھانے کے انچارج کے ساتھ باہر آئے۔ اس پولیس انسپکٹر نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے جانی کے برابر بیٹھ کر کہا "مجھے کورنگی جانا ہے' ذرا لے چلو۔"

مولوی صاحب پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگے کہ لڑکی کو دارالامان میں رکھ لیا گیا ہے۔ صبح اس کے والدین کو اطلاع پہنچا دی جائے گی' یہ ایک نیکی کا کام ہو گیا۔

جانی نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ ناظم آباد کے قریب مولوی صاحب اسے دعائیں دیتے ہوئے اتر گئے۔ ٹیکسی پھر آگے بڑھ گئی۔ پولیس انسپکٹر نے کہا "یہ مولوی صاحب تمہاری بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ اگر تمہارے جیسے ڈرائیور اسی طرح نیکیاں کرتے رہے تو کوئی عورت غلط ہاتھوں میں نہیں جائے گی۔ کوئی مسافر راستے میں نہیں بھٹکے گا۔ ہر مسافر کو اپنی منزل ملتی رہے گی۔"

"آپ درست کہتے ہیں لیکن بہت سے لوگ ہمیں نیکیاں نہیں کرنے دیتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا نیکی کرنے سے کون روکے گا؟"

"کچھ تو حالات روکتے ہیں' کچھ آپ لوگ روکتے ہیں۔"

انسپکٹر نے چونک کر اور گھور کر اسے دیکھا۔ جانی نے کن انکھیوں سے اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا "آپ کو میری بات بری لگی ہو گی لیکن جب آپ نے میری نیکی کی تعریف کی ہے تو یہ سن لیجیے کہ ہم نیکیاں کیوں نہیں کر سکتے۔ میں دارالامان سے لیاری تقریباً بیس میل تک آپ کو لینے کے لیے گیا پھر بیس میل واپس آکر دارالامان تک پہنچایا' اب وہاں سے کورنگی لے جا رہا ہوں۔ اگر آپ کورنگی کے آخری سرے میں جائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تیس میل جاؤں گا اور تیس میل واپس آؤں گا۔ حساب لگا لیجیے۔ میں تقریباً پچاس روپے کا پیٹرول پھونک چکا ہوں۔ کوئی ٹیکسی ڈرائیور اس طرح نیکیاں کرکے جب اپنے گھر جائے گا تو وہ اپنی بیوی بچوں..... کو کیا کھلائے گا اور دوسرے دن اپنی گاڑی میں پیٹرول بھرنے کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا۔"

انسپکٹر نے سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا "تم اپنی جگہ درست کہتے ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ ٹیکسی ڈرائیور کتنی حرام کمائی حاصل کرتے ہیں۔ کس طرح مسافروں کو لوٹتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی پولیس والا ایک آدھ بار ان کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر تک پہنچ جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"جناب یہی تو بات ہے' آپ حرام کی کمائی کرنے والوں کا محاسبہ نہیں کرتے بلکہ ان کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ان کی کمائی میں شریک ہو جاتے ہیں۔"

"کیا بکواس کرتے ہو؟"

"اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو میں اپنی زبان بند رکھوں گا لیکن آپ نے نیکی کی بات چھیڑی ہے۔ اتنا کہہ دوں کہ بدی کی سزا اس دنیا میں فوراً قانون کے ہاتھوں مل جاتی ہے۔ لیکن نیکی کی جزا فوراً نہیں ملتی بلکہ اسے اللہ میاں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بے شک وہ صلہ دیتا ہے اور ضرور دیتا ہے لیکن بندے کا بھی تو کچھ فرض ہے۔ اگر ہر ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی نیکی کے بدلے سونے کا میڈل نہ دیا جائے اور اسے نقد روپے انعام کے طور پر نہ دیئے جائیں' اس کی تعریفیں نہ کی جائیں صرف اس کے پیٹرول کا خرچ دے دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ ہر ٹیکسی ڈرائیور نیکی کی طرف مائل ہوتا رہے گا۔"

انسپکٹر چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس انسپکٹر کی بھی ایک منی بس تھی جو جونا مارکیٹ سے اورنگی کے روٹ پر چلتی تھی۔ پچھلے دنوں اس کے ایک بہت بڑے افسر نے اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں اس کی منی بس اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس کا پیٹرول کا خرچ بھی انسپکٹر کی جیب سے گیا۔ دو دنوں میں تقریباً نو سو روپے کا نقصان ہو گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ نیکیاں عام کیوں نہیں ہوتیں؟ ہر بڑا افسر اپنے ماتحت کو نیکی سے روکتا ہے وہ ماتحت جھنجلا کر اپنے دائرہ اختیار میں رہنے والوں کو نیکیوں سے باز رکھتا ہے۔

انسپکٹر نے آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ سامنے والے بس اسٹاپ پر گاڑی روک دو۔"

جانی نے حیرانی سے پوچھا "کیا بات ہے آپ کورنگی نہیں جائیں گے؟"

"میں بس میں جاؤں گا۔"

جانی کو بڑی حیرانی ہوئی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جب لوگ اپنے درد کی دھوپ

میں جلتے ہیں تو دوسروں کی جلن کا احساس ہوتا ہے۔ اس نے گاڑی اسٹاپ پر روکی۔ انسپکٹر نے اترتے ہوئے پوچھا "کتنے پیسے ہوئے؟"

"جناب آپ شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔"

انسپکٹر نے دروازہ بند کر دیا پھر کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا "تم نے مجھے تھوڑی سی اچھائی دی ہے' میں اس اچھائی کو دوسروں میں تقسیم کروں گا۔ جاؤ میری دعا ہے نیکیاں کرو۔"

جانی نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔ گیئر بدل کر گاڑی آگے بڑھائی۔ اس وقت انسپکٹر نے جیب سے پچاس کا ایک نوٹ نکال کر چپکے سے اگلی سیٹ پر ڈال دیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اس وقت انسپکٹر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ سینہ پھولا ہوا تھا اور وردی میں وہ اتنا جچ رہا تھا کہ اپنے قد سے اونچا لگ رہا تھا۔

جانی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا فرزانہ کے گھر کی طرف جارہا تھا۔ گاڑی کی رفتار اتنی تیز تھی جیسے پیچھے سے آندھی چل رہی ہو اور اسے اڑائے لیے جارہی ہو۔ اس نے انسپکٹر سے درست کہا تھا کہ پولیس والے میٹر کے حساب سے نہ سہی' پیٹرول کے حساب سے بھی کبھی پیسے نہیں دیتے اسی بات کا دوسرا پہلو دیکھا جائے تو وہ خود کئی بہانوں سے پیٹرول ضائع کرتا تھا۔ جب سے فرزانہ کی تلاش شروع ہوئی تھی' تب سے وہ ہزاروں روپے کا پیٹرول پھونک چکا تھا۔ بیشک یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ وہ اپنی محبت میں اپنے گھر کو بھی پھونک سکتا تھا لیکن اسی بات کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ کسی کی تلاش میں پیٹرول ہر لمحے نہیں جلتا لیکن شادی کے بعد سے وہ اب تک ہر لمحہ اپنی محبت کرنے والی بیوی کا خون جلاتا آرہا تھا۔ ایک ہی بات کئی پہلوؤں سے سمجھی جاسکتی ہے مگر سمجھنا نہیں آتا ہے۔

وہ محبوب کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس وقت کلینک کے آس پاس دور دور تک رات کا سناٹا تھا۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی سامنے سڑک پر سے گزر جاتی تھی۔ جانی نے اپنی گاڑی کو اس طرح کھڑا کیا کہ اس کی ہیڈلائٹس کی روشنی پوری طرح کھڑکی پر پڑنے لگی گاڑی کو بند کرنے سے پہلے انجن کو ریس دینے لگا تاکہ اس کا شور دور دور تک سنائی دے محلے والے سمجھیں کہ کسی گاڑی میں خرابی ہے وہ درست کی جارہی ہے' فرزانہ سنے تو اس کا دل دھڑکنے لگے۔

فرزانہ کے کان شام ہی سے آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ دل رہ رہ کر دھڑک رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کیسے ضدی سے پالا پڑا ہے۔ اب اسے کھڑکی پر روشنی محسوس ہو رہی تھی۔ اوپر سے پردے پڑے ہوئے تھے پھر بھی روشنی کا احساس ہو رہا تھا پھر انجن کا شور سنائی دیا۔ اشارہ مل گیا کہ وہ نہ آئی تو دیوانہ اور شور مچائے گا۔

وہ بستر سے اٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی مگر کھڑکی نہیں کھولی۔ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ادھر یہ تھی' ادھر وہ تھا اور ان کے درمیان آدھی رات گزر رہی تھی۔

○☆○

ٹھیک اس وقت لندن میں سات بج رہے تھے۔ تقدیر نے رخسانہ کو ٹھوکر مار کر فلیٹ سے باہر نکال دیا تھا۔ اب وہ بھیگی آنکھوں سے اپنے آس پاس کے اجنبی ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بزدلی سے نہیں رو رہی تھی بلکہ یہ سوچ کر رونا آگیا تھا کہ ایسے وقت جانی ہوتا تو اسے بازوؤں میں چھپا لیتا۔ دل کی دھڑکنوں میں بٹھا لیتا پھر دنیا کا اتنا بڑا شہر ایک دیو کی طرح اسے ہڑپ کرنے کی دھمکیاں نہ دیتا۔

لندن میں تقریباً دو لاکھ افراد ایسے ہیں جنہیں سوسائٹی ٹھکرا دیتی ہے۔ یا وہ بے روزگار ....یا نیم دماغی مریض ہوتے ہیں۔ ان کے کھانے یا رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ ڈاؤن اینڈ آؤٹ کہلاتے ہیں۔ رخسانہ ڈاؤن تھی۔ فلیٹ کی بلندی سے فٹ پاتھ کی پستی پر آگئی تھی۔ وہ آؤٹ ہو چکی تھی۔ لندن کی کسی سوسائٹی میں ان ہونے کا کوئی ذریعہ یا کسی سے کوئی رشتہ نہ تھا۔

اس وقت وہ اسمتھ اسٹریٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر کنگسٹن کی شاہراہ تھی۔ اس شاہراہ سے کہیں جانے کے لیے ٹیکسی یا شاید کوئی بس مل سکتی تھی مگر وہ کہاں جائے؟

دور بینی کا سلیقہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ رخسانہ اس حد تک ذہین تھی کہ پاکستان چھوڑنے سے پہلے دور تک دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ وہ جمشید کو اس قدر ہوسناک نہیں سمجھتی تھی' تاہم اتنا سمجھ گئی تھی کہ گھر اور شوہر سے رخصت ہو کر جو عورت پانی کی سطح پر چلتی ہے کسی وقت بھی غڑاپ سے ڈوب سکتی ہے لہٰذا تیراکی کا سامان ساتھ رکھنا چاہیے۔

اس نے اپنے سفری بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں لندن کا ایک تفصیلی نقشہ تھا اور ایک ڈائری تھی جس میں اہم اداروں کے پتے درج تھے۔ زیرِ زمین ٹیوب کے ذریعے سفر کرنے کا پورا نقشہ اور تفصیلات موجود تھیں۔ یہ سب کچھ اس نے لندن گائیڈ بک اور مختلف سفرناموں سے حاصل کیا تھا۔

اس نے چھوٹی سی ڈائری کو کھول کر دیکھا۔ ایک صفحے پر لکھا تھا "اے ڈبلیو پی۔ یعنی اے وومنز پلیس۔"

اس کے نیچے لکھا تھا "۴۴۔ ارل ہام میں کئی زنانہ سینٹر ہیں جو پریشان حال عورتوں کو سستی رہائش' سستا کھانا اور ایسے پتے فراہم کرتے ہیں جہاں وہ آئندہ روزگار حاصل کر کے اپنے اعتماد پر زندگی گزار سکتی ہیں۔"

اس نے ڈائری کو بیگ کے اندر رکھا پھر اللہ کا نام لے کر سامان اٹھا لیا اور کنگسٹن روڈ کی طرف چلنے لگی۔ سامان بہت بھاری تھا۔ وہ چلتے چلتے سامان کو زمین پر رکھ دیتی تھی۔ کبھی سوٹ کیس کو پہیے پر چلاتی پھر اٹھا کر چلنے لگتی تھی۔ وہاں سے کنگسٹن روڈ زیادہ دور نہیں تھا۔

لندن کا نقشہ اس کے تصور میں تھا۔ وہاں کی خاص خاص باتیں اس کے ذہن میں تھیں۔ اگر وہ ٹیوب کے ذریعے سفر کرتے ہوئے ارل ہام تک جاتی تو جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی' وہاں سے سب سے پہلے ٹیوب کا اسٹیشن سلون اسکوائر تھا جو نقشے میں بہت قریب نظر آتا تھا لیکن اندازے کے مطابق میلوں دور ہوگا پھر یہ کہ وہ اتنا سامان اٹھا کر وہاں تک نہیں جا سکتی تھی۔

شاہراہوں پر گاڑیاں تیزی سے گزرتی جا رہی تھیں۔ ہیڈلائٹس کی روشنیاں کبھی اسے روشن کرتی تھیں' کبھی بجھا دیتی تھیں۔ وہ ایسی شمع کی مانند تھی جو بجھ رہی تھی اور بھڑک کر روشن ہو رہی تھی۔ موسم سرما کا آغاز تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑ رہی تھی۔ اس کے باوجود اتنا بوجھ اٹھانے کے باعث پسینا پسینا ہو گئی تھی۔ سامان فٹ پاتھ پر رکھا ہوا تھا اور وہ دوپٹے کے ایک سرے سے اپنے چہرے اور گردن کے پسینے کو خشک کرتی جا رہی تھی۔

اتنی دیر میں کتنی ہی ٹیکسیاں گزریں لیکن وہ خالی نہیں تھیں پھر ایک سفید رنگ کی

ویگن اس کے قریب آکر رکنے لگی۔ اس ویگن پر این اے بی لکھا ہوا تھا۔ اس گاڑی میں نیشنل اسسٹنسی (NATIONAL ASSISTANCY) بورڈ کے افراد تھے۔ وہ افراد ایسے لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے جو آوارہ نظر آتے تھے یا سڑک اور فٹ پاتھوں پر بے سہارا دکھائی دیتے تھے یا نشے کی حالت میں گھومتے تھے یا پلوں کے نیچے پارک میں جاکر بنچ پر نشے کی حالت میں سوجاتے تھے۔

ایک شخص نے اس کے قریب آکر کہا "تم اپنے لباس سے انڈین یا پاکستانی لگتی ہو؟"

"میں پاکستانی ہوں۔"

"مختصر طور پر اتنا بتادو کہ اتنے سامان کے ساتھ کہاں سے آرہی ہو اور کہاں جانا چاہتی ہو؟"

وہ تذبذب سے سوچنے لگی کہ سچ بول دے یا جھوٹ کی آمیزش کرے۔ اب تک جو جھوٹ بولتی آئی تھی اس کا نتیجہ بھگت رہی تھی۔ اس شخص نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اگر تم اس شہر میں اجنبی ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ این اے بی کا ادارہ کیا ہے اور ہماری ڈیوٹی کیا ہے۔ تم یہ کارڈ پڑھ سکتی ہو۔"

وہ پہلے ہی کتابوں میں اس ادارے کے متعلق پڑھ چکی تھی۔ اس نے کہا "میں پاکستان سے یہاں آئی ہوں۔ اسمتھ اسٹریٹ پر ایک فلیٹ ہے۔ وہاں میں اپنے میزبان کے پاس رہی تھی لیکن ابھی میرے میزبان نے نشے کی حالت میں بے حیائی کا مظاہرہ کیا۔ میں اپنی عزت بچاکر اپنے سامان کے ساتھ باہر آگئی۔"

"کیا وہ میزبان اتنا کمزور ہے کہ اس نے تمہیں بھاگنے کی مہلت دے دی؟"

"نشہ انسان کو کمزور کردیتا ہے' وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔"

"بے ہوش ہوگیا ہے یا تم نے کچھ کیا ہے؟ بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور وہاں تک ہماری رہنمائی کرو۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ لوگ رخسانہ کا سامان اٹھاکر گاڑی کے اندر لے گئے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئی۔ جب گاڑی اسمتھ اسٹریٹ کی طرف مڑنے لگی تو ایک شخص وائرلیس کے ذریعے پولیس والوں سے

رابطہ قائم کرنے لگا اور اسے اسمتھ اسٹریٹ کا پتا بتاتے ہوئے فوراً پہنچنے کی درخواست کی۔ رخسانہ چاہتی تھی کہ بات پولیس والوں تک نہ پہنچے اور وہ جمشید سے دامن بچاکر چپ چاپ نکل جائے لیکن اب معاملہ الجھتا جارہا تھا۔

وہ این اے بی کے افراد کے ساتھ فلیٹ کے اندر آئی۔ ان لوگوں نے باقر علی کے بیڈروم میں پہنچ کر جمشید کو دیکھا۔ وہ فرش پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے اتنی زیادہ قے کی تھی کہ اس کے آس پاس گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ بدبو سے دماغ پھٹا جارہا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لیے۔ ایک شخص نے رومال کے ذریعے بوتل کو پکڑ کر دیکھا پھر گلاس کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد اپنے ساتھی سے بولا "گلاس اور بوتل کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ پولیس والے آئیں گے تو انہیں ان پر اس لڑکی کی انگلیوں کے نشانات مل سکیں گے۔"

ایک شخص جمشید کی نبض ٹٹول رہا تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں محسوس کررہا تھا پھر اس نے کہا "ایمبولینس کے لیے فوراً کہا جائے' اسے اسپتال پہنچانا ہوگا۔ یہ زندہ ہے۔"

اتنے میں پولیس کی ٹیم وہاں آپہنچی۔ رخسانہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک پولیس افسر نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوالات شروع کردیے۔ وہ سنبھل سنبھل کر جواب دینے لگی پھر آفیسر نے کہا "تم مائنڈ نہ کرو میں اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں' اس لیے تمہارے سامان کی تلاشی لوں گا۔"

رخسانہ نے کہا "بے شک آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔ اس میں میرے تین ہزار پاؤنڈ ہیں۔"

آفیسر نے پوچھا "یہ تین ہزار پونڈ میزبان کے ہوں گے؟"

"جی نہیں' یہ میری رقم ہے۔"

"پاکستان سے اتنی رقم لانے کی اجازت نہیں ہے' تمہارے پاس تین ہزار پاؤنڈ کہاں سے آئے؟"

"میرے میزبان کے والد نے مجھے علاج کے سلسلے میں دیے ہیں۔"

"اس شخص کے ہوش میں آنے اور تمہاری حمایت میں بیان دینے تک تم ہماری

آدھ گھنٹے بعد وہ پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں بیٹھی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دل ہی دل میں خدا سے التجا کر رہی تھی۔ خدایا! میں کہاں آکر پھنس گئی۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس کو مدد کے لیے پکاروں؟ میرے مالک جہاں کوئی نہیں ہوتا' وہاں تو ہوتا ہے۔ میرے حال پر رحم فرما۔ مجھے اس مشکل سے نکال دے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ اپنے شوہر سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کبھی دھوکا دے کر یوں بے سہارا ہونے کے لیے گھر سے نہیں نکلوں گی۔"

وہ روتی رہی۔ آنسو پونچھتی رہی اور خدا سے دعا مانگتی رہی۔ اپنی غلطیوں کے سلسلے میں توبہ کرتی رہی۔ دس بج گئے لیکن اسپتال سے کوئی خبر نہیں آئی کہ جمشید ہوش میں آیا ہے یا نہیں۔ گیارہ بجے اس نے ایک سپاہی سے پوچھا "کیا اسپتال سے کوئی خبر نہیں آئی' مجھے کچھ معلوم تو ہونا چاہیے۔"

سپاہی نے اسے تسلی دی "اطمینان رکھو' اور سکون سے بیٹھی رہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جب بھی تمہاری بے گناہی کا ثبوت ملے گا تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔"

وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی اور سوچنے لگی۔ اگر جمشید مر گیا تو کیا ہوگا؟ اس کی خرابی آجائے گی' اسے شاید ساری عمر وہاں کے جیل خانے میں گزارنی پڑے معلوم نہیں کیا سزا ہوگی۔ وطن کا سفارت خانہ اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد کر سکے گا یا نہیں؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رات کا ایک بج گیا' دو بج گئے پھر تین بج گئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی' اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس اندھیرے میں کبھی جانی کی شکل نظر آتی تھی' کبھی اپنے ننھے سے کاشی کو دیکھتی تھی اور اس کا دل مچلنے لگتا تھا۔ میرے بچے! میں کہاں آگئی؟ تجھ سے دور ہوں اب شاید تجھے گود میں لے کر پیار نہیں کر سکوں گی۔ تیری زبان ہوتی تو اپنی ماں کے لیے دعا مانگتا۔ یااللہ میرا بچہ میرے لیے رو رہا ہوگا۔ وہ اپنے رونے کے انداز سے' اپنے آنسوؤں کی زبان سے مجھے بلا رہا ہوگا۔ تو اس کے معصوم بلاوے کی لاج رکھ لے میرے

چار بج گئے وہ پھر اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ "جانی! تم کہاں ہو؟ اس وقت پاکستان میں کیا وقت ہوا ہوگا؟ تم سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟ جاگ رہے ہو تو کیا کبھی سوچ بھی سکتے ہو کہ تمہاری شریک حیات کیسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ میں کیا کروں' کیا تمہیں اطلاع دوں؟ مگر نہیں تمہیں اطلاع دوں گی تو تم سب پریشان ہو جاؤ گے پھر یہ تو قانونی معاملات ہیں۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکو گے۔ اب جو کچھ ہوگا' وہ جمشید کے بیان کے بعد ہی ہوگا۔ مصیبتیں سب پر آتی ہیں لیکن مجھ پر جیسی مصیبت آئی ہے' شاید کسی پر نہ آئی ہو کیونکہ میں اس شخص کے بیان کی محتاج ہوں' جو میری عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔ کیا دشمن ہوش میں آنے کے بعد میرے حق میں بیان دے گا؟"

اس کا دل بری طرح ڈوبنے لگا۔ وہ بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سپاہی نے دروازے کے پاس آکر اسے دیکھا اور تعجب سے کہا "عجیب عورت ہو' ابھی تک جاگ رہی ہو۔"

تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی۔ چھ بج گئے پھر آٹھ بج گئے۔ دس بجے ایک پولیس افسر نے آکر کہا "مس! ہمیں افسوس ہے کہ تمہیں رات بھر پریشان ہونا پڑا لیکن ہم قانون کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ مسٹر جمشید نے تمہارے حق میں بیان دیا ہے۔ وہ تین ہزار پاؤنڈ تمہارے ہیں اور تمہارا دوسرا سامان بھی محفوظ ہے۔ تم چیک کر سکتی ہو۔ اب تم جہاں جانا چاہو گی ہم وہاں پہنچا دیں گے۔" وہ پولیس آفیسر کی پوری باتیں نہ سن سکی۔ صرف اتنا ہی سنا کہ جمشید نے اس کے حق میں بیان دیا ہے' وہ خوشی کے مارے چکرا کر گر پڑی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی' ایسی گری کہ بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلے سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے کون سا ماحول ہے کون سا دیس ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستگی سے پکارا "جانی!"

جانی کا نام لیتے ہی اچانک ہوش آگیا کہ وہ جانی کے دیس میں نہیں بلکہ پردیس میں ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ اسپتال کا ماحول تھا۔ وہ ایک صاف ستھرے اجلے سے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ شاید اسپیشل وارڈ میں تھی۔ لندن شہر کے اسپتال اور وہاں کا علاج بڑا مہنگا ہوتا ہے اس پر یہ کہ وہ اسپیشل وارڈ میں لیٹی ہوئی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر

بیٹھ گئی۔ حیرانی سے سوچنے لگی۔ پولیس والے اتنے دریا دل نہیں ہو سکتے کہ پہلے الزام عائد کریں۔ اس کے بعد کسی اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں پہنچادیں اور یہاں کا بل ادا کریں۔

اس نے پریشانی سے سوچا۔ مجھے یہاں کس نے پہنچایا ہے؟

اس وقت اس کمرے کا دروازہ کھلا۔ سید باقر علی نے جھانک کر کمرے میں دیکھا پھر رخسانہ کو دیکھ کر سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیوں بیٹے! میں اندر آسکتا ہوں؟"

رخسانہ نے انہیں دیکھا تو ایک دم سے رو پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی "آپ اکیلے ہیں تو آجائیں۔"

وہ قریب آتے ہوئے بولے "ہاں میں اکیلا ہوں۔ میرا بیٹا لاک اپ میں ہے۔"

اس نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے انہیں دیکھا۔ وہ سر جھکا کر بولے "اتنی بڑی دنیا میں سب ہی دشمن نہیں ہوتے، کچھ دوست بھی ہوتے ہیں۔ دوستوں کو سمجھنے اور دیکھنے کا ڈھنگ چاہیے۔ آنسو بھری آنکھوں سے دیکھو گی تو دنیا بھیگی بھیگی، دھندلی سی نظر آئے گی۔ جو دنیا کو صاف اور واضح طور پر دیکھنا چاہتے ہیں، وہ پہلے عینک کے شیشے صاف کرلیتے ہیں۔ بیٹی اپنی آنکھیں پونچھ لو۔"

وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اتنے میں پولیس آفیسر اجازت حاصل کرکے کمرے میں داخل ہوا پھر اس نے کہا "مس! ہم تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں لیکن تم بے ہوش ہوگئیں۔ مسٹر باقر کے مشورے اور اخراجات پر تمہیں یہاں پہنچایا گیا ہے۔ بہرحال تم بیان دینا چاہو تو پوری آزادی سے دے سکتی ہو۔"

"میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ میں کسی کے خلاف بیان نہیں دوں گی۔"

پولیس افسر نے کہا "لیکن پچھلی رات تم نے فلیٹ میں کہا تھا کہ مسٹر جمشید......"

رخسانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا "پچھلی رات میں غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ آفیسر! آپ خود ہی سوچیں جو شخص خود ہی اس قدر نشے میں دھت ہو کہ اپنا ہوش نہ رہے وہ مجھ پر کیا مجرمانہ حملہ کرے گا؟"

"تم فلیٹ سے نکل کر بھاگی کیوں تھیں؟ اپنا سامان لے کر کیوں نکل آئی تھیں۔"

"بات یہ ہے کہ ہم مشرقی لڑکیاں کسی غیر مرد کے ساتھ تنہا نہیں رہتیں۔ بصد مجبوری

رہنا بھی پڑے تو شراب سے نفرت کرتی ہیں اور شرابیوں سے ڈرتی بھی ہیں۔ میں مسٹر جمشید سے نہیں بلکہ ان کے نشے کی زیادتی سے ڈر کر فلیٹ سے چلی آئی تھی۔ دیٹس آل۔"

آفیسر نے ایک کلپ بورڈ اور کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے قلم لے کر ایک مختصر سا بیان تحریر کیا اور اپنے دستخط کرکے آفیسر کو دے دیا۔ آفیسر وہاں سے چلا گیا۔ سید باقر علی نے اسے احسان مندی سے دیکھتے ہوئے کہا "بیٹی، تم بہت اعلیٰ ظرف ہو۔ تم نے میرے بیٹے کو بچالیا۔"

"پاپا، یہ اعلیٰ ظرفی میں نے آپ سے سیکھی ہے۔ وہ تین ہزار پاؤنڈ میرے ہیں، آپ مجھ پر الزام عائد کرسکتے تھے کہ میں نے وہ رقم آپ کے فلیٹ سے چرائی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے مجھے اپنے بیٹے کی خاطر کسی الزام میں ملوث نہیں کیا۔ ہاں مگر میری رقم اور میرا سامان کہاں ہے؟"

"میں نے فلیٹ میں رکھوا دیا ہے۔"

وہ انکار میں سرہلا کر بولی "نہیں پاپا، اب میں اس فلیٹ میں قدم نہیں رکھوں گی۔"

"جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ میں نہیں تھا تو جمشید ایسی حماقت کر بیٹھا۔ دیکھو بیٹے! انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تہذیب کے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔"

وہ ناگواری سے بولی "کیوں بھٹک جاتا ہے؟ کیا انسانیت کا کوئی معیار نہیں ہے؟ جس کا جی چاہے، بھٹک جائے۔"

"بیٹے! انسانیت تو ایک انسان کی ذات سے اور ذات کی ذرہ ذرہ پاکیزگی سے اور تنکے تنکے شعور سے ایک آشیانے کی طرح تعمیر ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم ایک ایک ذرے کو پکار نہیں سکتے اور شعور کو تنکا تنکا چن نہیں سکتے۔ ہر انسان کو ایک مرکز پر لاکر ایک انسان کا معیار قائم نہیں کرسکتے۔ اسی لیے انسانی تاریخ ازل سے انسانیت کی نہیں، بربریت کی مظہر ہے۔"

"تو پھر جہاں بربریت کا مظاہرہ ہوچکا ہے، میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"مگر باپ کے سائے میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے، نہ ایسا ہوگا کیا تم میری بیٹی نہیں ہو؟"

"بیٹی ہوں مگر دودھ کی جلی ہوں۔"

"ایسی بات نہ کہو۔ میرا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے میرے بیٹے کی غلطیوں کی تلافی کا موقع دو۔"

"آپ تلافی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ یہی آپ کا سب سے بڑا احسان ہوگا۔ مہربانی فرما کر میرا سامان میرے پاس پہنچادیں۔ میں ابھی اسپتال سے جاؤں گی۔"

"کہاں جاؤ گی؟ کیوں ضد کر رہی ہو؟ یہ لندن شہر ہے۔ اتنی مہنگی جگہ ہے کہ نہ تم روزگار حاصل کر سکتی ہو' نہ کہیں ٹھکانا بنا سکتی ہو پھر یہ کہ پلاسٹک سرجری جیسا مہنگا علاج تمہارے بس کی بات نہیں۔"

"انسان کے بس میں سب کچھ ہے۔ میں یہ ثابت کردوں گی کہ مجھ میں کتنا حوصلہ ہے اور میں کیا کر سکتی ہوں۔ میرے پاس تین ہزار پاؤنڈ ہیں۔ میں اس میں سے اتنی رقم الگ نکال کر رکھوں گی کہ ناکامی کی صورت میں اپنے ملک واپس جا سکوں۔ باقی جو رقم میرے پاس ہوگی میں اس کے بل بوتے پر یہاں رہائش اختیار کروں گی۔ اپنے لیے روزگار تلاش کروں گی۔ دن رات محنت کروں گی اور پلاسٹک سرجری کے اخراجات برداشت کرنے کی کوشش کروں گی' آگے اللہ مالک ہے۔"

انہوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "تم بہت ضدی ہو۔ چلو میری ایک آخری بات مان لو۔ تم جہاں جانا چاہو گی میں تمہارے سامان کے ساتھ وہاں پہنچا دوں گا۔ میری اتنی سی بات مان لو۔"

"میں ارل ہام کی طرف جانا چاہتی ہوں' وہاں کئی زنانہ سینٹر ہیں۔ وہاں میری مشکل آسان ہو سکتی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم انتظار کرو۔ میں تمہارا سامان لے کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ جانے لگے تو رخسانہ نے آواز دی "پاپا ایک اور بات سن لیجیے۔ اپنے بیٹے سے کہہ دیجیے کہ میں شادی شدہ ہوں۔"

باقر علی نے پلٹ کر بے یقینی سے دیکھا۔ رخسانہ نے ہاں کے انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا "آپ یقین کرلیں' میں صرف کسی کی بیوی ہی نہیں بلکہ ایک بچے کی ماں بھی

ہوں اپنا ایک ننھا سا بیٹا پاکستان میں چھوڑ کر آئی ہوں۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا "تو پھر تم نے پاسپورٹ میں اپنے آپ کو مس کیوں ظاہر کیا ہے؟"

"یہی ایک غلطی ہوگئی۔ غلطی کیوں ہوئی؟ اس بات کو دہرا کر میں اپنی نظروں میں نہیں گرنا چاہتی۔"

باقر علی بڑی دیر تک اسے دیکھتے رہ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں سے جانا بھول گئے ہیں' رخسانہ نے پوچھا "آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

انہوں نے چونک کر کہا "آں۔ بس یونہی' کچھ نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد رخسانہ نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تقریباً سوا دس بجے سے اب تک بے ہوش تھی یا گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کا علم ہی نہیں ہوا۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ ڈاکٹر سے نہ مل سکی اور نہ ہی اسے اطلاع دے سکی کہ آج وہ اپنے علاج کے سلسلے میں نہیں آسکے گی۔

سید باقر علی نے کاؤنٹر پر اسپتال کا بل ادا کرنے کے بعد کہا "مس رخسانہ ایک گھنٹے کے اندر اسپتال چھوڑ دیں گی۔"

کاؤنٹر کلرک نے کہا "کوئی بات نہیں' میں ٹائم نوٹ کرلیتا ہوں۔"

باقر علی نے رخسانہ کو مس رخسانہ کہتے وقت جھجک سی محسوس کی۔ وہ جسے مس سمجھ رہے تھے' وہ کسی کی مسز تھی۔ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسپتال کی عمارت سے باہر آئے۔ پہلی بار جب بیٹے نے رخسانہ کا غائبانہ تعارف کرایا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ پہلے وہ رخسانہ کو دیکھیں گے' اس کے بعد اسے بہو بنانے کے متعلق فیصلہ کریں گے پھر پاکستان سے رخسانہ کے خطوط آتے رہے۔ وہ خطوط بیٹے کے نام تھے لیکن بیٹا انہیں پڑھنے کے لیے دے دیتا تھا۔ تحریر سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ رخسانہ بہت محتاط' سنجیدہ اور باوقار لڑکی ہے پھر وہ لندن آئی اور اس سے روبرو ملاقات کے بعد وہ بے حد متاثر ہوئے۔ فوراً ہی فیصلہ کرلیا کہ رخسانہ ہی بہو بنے گی۔

سید باقر علی سوچتے ہوئے عمارت کے اس حصے میں آئے جہاں ٹیلی فون بوتھ تھا۔ وہ ایک بوتھ کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت ان کے دماغ میں ایک پاکستانی خاتون سلمٰی قادر کا نام تھا۔

سلمٰی قادر نے پیشام پلیس میں ایک ذاتی اسپتال قائم کیا تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی باشندوں کو سستا علاج مہیا کیا جائے۔ اس کے لیے وہ پاکستانی اور ہندوستانی ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرتی تھیں۔ انہوں نے فون پر ان سے رابطہ قائم کیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے سلمٰی قادر کی آواز سنائی دی۔ باقر علی نے کہا "ہیلو سلمٰی! میں باقر بول رہا ہوں۔ کیا تمہارے اسپتال میں کسی لیڈی ڈاکٹر کے لیے ویکنسی ہے؟"

"ابھی تو نہیں ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میری ایک دور کی عزیزہ کی جوان لڑکی ہے۔ وہ ایک اچھی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ ابھی حال ہی میں کالج سے نکلی ہے۔ یہاں پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنے چہرے کے کچھ عیب دور کرانے آئی ہے۔ اس سلسلے میں اسے کافی رقم کی ضرورت ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں' وہ بہت خوددار ہے۔ براہ راست مجھ سے کوئی مدد حاصل نہیں کرے گی۔"

"میں سمجھ گئی۔ چلو تمہاری خاطر میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے لیے ویکنسی نکال لوں گی۔"

"تم ڈاکٹروں کو کیا دیتی ہو؟"

"تم جانتے ہو کہ چیریٹی اسپتال ہے۔ میں ایک ڈاکٹر کو ستر پاؤنڈ فی ہفتہ دیتی ہوں اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو چالیس پاؤنڈ فی ہفتہ....."

"یہ تو بہت کم ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے اخراجات پورے نہیں ہوں گے۔ بہرحال تم مس رخسانہ کو ستر پاؤنڈ فی ہفتہ دے سکتی ہو۔ یہ پے میری طرف سے ہوا کرے گی۔"

باقر علی نے مس رخسانہ کہتے وقت پھر ذرا دکھ محسوس کیا۔ سلمٰی قادر نے کہا "یہاں ڈاکٹر دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو اسپتال میں ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ مس رخسانہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں بھی مصروف رہا کریں گی۔ کیا یہ ڈیوٹی کے وقت

یہاں حاضر ہو سکیں گی۔"

"ہاں' یہ سوچنے کی بات ہے۔ تم کوئی مشورہ دو۔"

"میں کیا بتاؤں' مس رخسانہ میرے اسپتال میں برابر ڈیوٹی نہیں دیں گی اور انہیں ستر پاؤنڈ فی ہفتہ ادا کئے جائیں گے تو یہاں کی دوسری لیڈی ڈاکٹرز اور ڈاکٹر احتجاج کریں گے یا پھر اپنی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کریں گے۔ ویسے یہ بتاؤ کہ مس رخسانہ کی رہائش کہاں ہے؟"

"رہائش کا بھی مسئلہ ہے۔ وہ ابھی کسی وومن سینٹر میں جاکر معلوم کرنا چاہتی ہے کہ ایک اکیلی عورت کے رہنے کے لیے کون سی جگہ محفوظ ہو سکتی ہے۔"

"یہ پرابلم نہیں ہے۔ میرے اسپتال کے اسٹاف کے لیے جو ایک ایک کمرے کے اپارٹمنٹس ہیں' میں اس میں سے ایک اپارٹمنٹ اسے دے سکتی ہوں۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ وہیں اس کے کھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ چلو ایسا کرو کہ اسے پارٹ ٹائم ملازمت دے دو اور پچیس پاؤنڈ فی ہفتہ دیا کرو۔ اس سے دوسرے ڈاکٹروں کو اعتراض نہیں ہوگا۔ باقی میں سوچتا ہوں کہ اس کی امداد کس طرح کی جاسکتی ہے۔"

"باقر علی! ایک تدبیر ذہن میں ہے۔ دنیا کے کروڑ پتی اور ارب پتی ڈاکٹروں نے ایک امدادی بینک قائم کیا ہے۔ ان کے منشور کے مطابق وہ ایسے خستہ حال ڈاکٹروں کو مالی امداد دیتے ہیں جو کسی مہلک دائمی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا کسی میجر آپریشن سے گزرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی شرط یہ ہے کہ وہ جتنی رقم امداد کے طور پر دیتے ہیں اس کی نصف رقم قسطوں میں واپس لیتے ہیں۔ باقی نصف رقم کا تقاضا نہیں کرتے۔"

باقر علی نے خوش ہو کر کہا "واہ تم نے بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ اس سے رخسانہ کی مشکلات دور ہو جائیں گی اور اس کی خودداری بھی قائم رہے گی۔ کیا تم اس کے لیے یہ امداد حاصل کر سکو گی؟"

"ضرور تم اطمینان رکھو۔"

"اچھا تم ارل ہام کے کسی زنانہ سینٹر کا پتا یا فون نمبر جانتی ہو؟"

"میں ابھی ڈائریکٹری میں دیکھ کر فون نمبر معلوم کرلوں گی۔"

"تو فوراً ڈائریکٹری دیکھو اور کسی اچھے زنانہ سینٹر کا نام اور پتا بتاؤ تاکہ میں رخسانہ کو وہاں لے جاؤں۔ اس سے پہلے تم اس زنانہ سینٹر میں فون کے ذریعے اطلاع کردو تاکہ تمہیں اپنے اسپتال کے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ لیڈی ڈاکٹر ایشیا کے ملک سے تعلق رکھتی ہو۔ جب میں رخسانہ کو لے کر وہاں پہنچوں گا تو یقیناً وہ زنانہ سینٹر والے رخسانہ کو تمہارا ہی پتا بتائیں گے۔ تم سمجھ گئیں نا؟"

"ہاں، تم انتظار کرو۔ میں ابھی پتا بتاتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد سلمیٰ قادر نے انہیں ایک زنانہ سینٹر کا پتا بتادیا۔ وہ ریسیور رکھ کر بوتھ سے باہر آگئے پھر کار میں بیٹھ کر اپنے فلیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازے کے سامنے زینے پر جمشید سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کار سے اتر کر باہر آئے۔ زینے پر قدم رکھ کر بیٹے کو دیکھا۔ وہ بدستور نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ باپ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ انہوں نے جیب سے چابی نکالی پھر دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ ایک بیڈ روم میں رخسانہ کا سامان رکھا ہوا تھا وہ اس سامان کو اٹھانا چاہتے تھے۔ پیچھے سے جمشید کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ندامت سے سر جھکائے کہہ رہا تھا "پاپا! میں بہت شرمندہ ہوں۔"

انہوں نے ناراضگی سے دیکھتے ہوئے کہا "اس سے پہلے بھی تم شرمندگی ظاہر کرچکے ہو لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں جو میل آگیا ہے، اسے دھویا نہیں جاسکتا ہے۔ کیا اب وہ تم پر یا مجھ پر اعتماد کرے گی۔ کبھی نہیں۔ اس لیے تو اس نے اپنا سامان منگوایا ہے۔ اب وہ تنہا اس شہر میں رہنا چاہتی ہے اور اپنا علاج کرانا چاہتی ہے۔"

"میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ میری نہیں سنے گی۔ آپ سمجھائیں یہ بہت مہنگا شہر ہے بہت مہنگا علاج ہے۔"

"میں اسے سمجھا چکا ہوں، وہ بہت ضدی ہے۔"

وہ سامان اٹھانے لگے۔ جمشید نے جلدی سے آگے بڑھ کر بڑا سا سوٹ کیس اٹھایا پھر دوسرا سامان بھی اٹھائے ہوئے باہر جانے لگا۔ وہ اسے دیکھتے رہے۔ جب وہ سامان باہر ڈگی میں رکھ کر واپس آیا تو انہوں نے کہا "دیکھو، ابھی وہ بہت غصے میں ہے۔ تم اس کے سامنے نہ جانا۔ میں اس کی رہائش کا انتظام کررہا ہوں۔ ایک پارٹ ٹائم ملازمت بھی

اسے مل جائے گی لیکن یہ سب کچھ میں ان ڈائریکٹ وے میں کررہا ہوں۔ اسے معلوم ہوجائے گا تو وہ ہماری یہ اخلاقی امداد بھی قبول نہیں کرے گی۔"

وہ رخسانہ کے سفری بیگ کو اٹھا کر جانے لگے۔ جمشید نے کہا "آپ تو اس سے مل سکتے ہیں۔ آپ میری طرف سے کوشش کرسکتے ہیں کہ کسی طرح اس کا دل صاف ہوجائے۔"

وہ کاریڈور میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے پلٹ کر کہا "اب دل کے صاف ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمہیں یہ بری خبر سنادوں کہ وہ شادی شدہ ہے۔"

جمشید نے چونک کر اپنے باپ کی طرف دیکھا پھر بے یقینی سے بولا "نہیں پاپا، میں آپ کی چالاکی سمجھتا ہوں۔ آپ مجھے اس سے دور کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔"

"میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ وہ صرف شادی شدہ نہیں بلکہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔"

"بس کیجیے پاپا! جھوٹ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آپ صاف کہہ دیجیے کہ میں اسے دل سے نکال دوں۔"

"ہم جھوٹوں کی دنیا میں سچائی کبھی اچانک سامنے آتی ہے تو ہمیں یقین نہیں آتا جب تمہیں یقین آئے تو اسی وقت دل سے نکال دینا۔ ابھی مجھے جھوٹا ہی سمجھو۔"

"اتنا بتا دیجیے۔ اگر وہ شادی شدہ تھی تو اس نے یہ بات کیوں چھپائی؟"

"میں نے اس سے نہیں پوچھا کیونکہ وہ جھوٹ پر شرمندہ تھی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے ہمیں دھوکا کیوں دیا۔ آپ کو پوچھنا چاہیے تھا۔"

"اگر کوئی اپنے کیے پر شرمسار ہو تو اس سے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے پچھلی رات اتنی زیادہ کیوں پی تھی اور تم انسان سے شیطان کیوں بن گئے تھے؟"

جمشید کا سر جھک گیا۔ انہوں نے کہا "دیکھو بیٹے! اس وقت تم سر جھکائے میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ جب بھی کوئی خطاکار شرم سے سر جھکالیتا ہے وہ اپنے اندر اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ دوسروں کو چاہیے کہ پھر اس سے کچھ نہ کہیں اس کا محاسبہ نہ کریں۔ اسے اس کے حال پر سوچنے کے لیے چھوڑ دیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے خاموش نظروں سے بیٹے کو دیکھا پھر پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہاں سے جانے لگے۔ جب بیرونی دروازے کے پاس پہنچے تو جمشید نے آواز دی
"پاپا!"
وہ دروازے سے پلٹ گئے پھر پوچھا "اب کیا ہے؟"
"خواہ وہ شادی شدہ ہو۔ خواہ وہ ایک بچے کی ماں ہو۔ میں اسے چاہوں گا۔"
وہ غصے سے آگے بڑھتے ہوئے بولے "کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ کیا دنیا میں اس سے زیادہ حسین اور ذہین لڑکی کوئی نہیں ہے؟"
"ہوگی لیکن آپ نے اسے مکمل نہیں دیکھا ہے جب پلاسٹک سرجری کے بعد مکمل ہوگی تو...."
"تو کیا ہوگا؟ کیا وہ حسینۂ عالم کہلائے گی؟"
"وہ میری ضد ہے۔"
"کیسی ضد؟"
"میں اپنے دوستوں کو فیس نہیں کر سکوں گا۔ پاکستان میں اور یہاں انگلینڈ میں میرے کالج کے ایسے کتنے ہی ساتھی ہیں جن کے سامنے شرط لگ چکی ہے کہ میں رخسانہ کو حاصل کر کے رہوں گا۔ اسے اپنی شریک حیات بناؤں گا۔ اگر میں یہ شرط ہار گیا تو۔"
"تم اپنے دوستوں کو آسانی سے سمجھا سکتے ہو کہ تم نے یہ بازی شروع کرنے میں دیر کر دی۔ اس وقت تک رخسانہ کی شادی ہو چکی تھی اور اب وہ ایک بچے کی ماں ہے۔ دیکھو بیٹے یہ سب کالج کا کھلنڈرا پن ہے' اس سے باز آجاؤ۔ اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بناؤ۔"
جمشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازے سے ٹیک لگا کر سر کو جھکا لیا۔ باقر علی وہاں سے پلٹ کر جانے لگے۔ دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ پھر بیٹے نے پکارا "پاپا! ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟"
انہوں نے پلٹ کر پوچھا "کیسی کوشش؟"
"یہی کہ شاید وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے۔"
انہوں نے حیرانی اور پریشانی سے بیٹے کو دیکھا۔ بڑی دیر تک دیکھتے رہے پھر سر کو

جھٹک کر بڑے دکھ سے کہنے لگے۔ "ہم بوڑھوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی جوان نسل کو کس طرح سمجھائیں۔ اگر سختی کرتے ہیں تو الزام آتا ہے کہ ہم ظالم ہیں' سخت ہیں اور اپنے راستے پر چلانے کے لیے اپنی بات منواتے ہیں اور اگر پیار محبت سے سمجھایا جائے اپنی اولاد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں تو میرے بچے! تم لوگ اتنے ذہین ہو کہ ہمارے گھٹنے ٹیکنے کو بوڑھوں کی شکست سمجھ لیتے ہو۔ ہم کیا کریں' بتاؤ بیٹے ہم کیا کریں؟ کیا میں تمہارے سامنے سر پھوڑ لوں یا تمہاری غلطیوں کی تلافی کرنے کے لیے اس لڑکی کے پیچھے پریشان ہوتا رہوں جو پردیس میں آکر اپنی ضد کی وجہ سے تنہا بھٹکنا چاہتی ہے اور ہماری مدد لینا نہیں چاہتی۔ یہ ہمارے لیے کتنے شرم کی بات ہے' کیا تم اسے محسوس کر سکتے ہو۔ اگر کر سکتے ہو تو اس گھر سے باہر نہ نکلنا۔ اس لڑکی سے نہ ملنا میری یہ آخری التجا ہے۔"
یہ کہہ کر انہوں نے دروازے کو کھولا پھر باہر جاتے ہوئے اسے ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔ وہ چپ چاپ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا سوچتا رہا۔ کوئی چیز آسانی سے مل جائے تو اس کی وہ قدر نہیں ہوتی۔ ذرا کوشش سے ملے تو قدر بڑھ جاتی ہے اور جب وہ نہ ملے تو ضد پیدا کر دیتی ہے۔ ایک چیلنج بن جاتی ہے۔ التجا سے نہیں مل سکتی تو دولت سے حاصل کرو۔ دولت سے نہیں مل سکتی تو زور بازو سے چھین لو۔ زور بازو سے بھی چھینی نہیں جا سکتی تو پھر قدموں میں سر پھوڑ دو۔ کوئی بات نہیں سر جائے مگر سودائی کی روایت رہ جائے۔
وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باتھ روم کے سامنے آیا پھر وہاں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے چہرے کو انگلیوں سے چھو کر دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا مجھ میں کس بات کی کمی ہے' میں خوبرو ہوں' دولت مند ہوں' عزت دار ہوں پھر وہ میری طرف مائل کیوں نہیں ہوتی۔ اس کا شوہر کون ہے؟ مجھ سے زیادہ عزت دار ہے؟ مجھ سے زیادہ دولت مند ہے' مجھ سے زیادہ خوبرو ہے' آخر کون ہے وہ؟
اس کے دماغ نے سمجھایا۔ وہ جو کوئی بھی ہوگا' ایسا ہوگا کہ جس کے سامنے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی ہے۔ وہ کنواری بن کر آئی۔ اپنے شوہر کو مجھ سے چھپایا مگر اپنے شوہر کے اعتماد کو اتنا قائم رکھا کہ ایک بار میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ گویا کہ وہ سر سے پاؤں تک صرف اور صرف اپنے مرد کے لیے ہے' کون ہے وہ شخص؟

اس نے دانت پیستے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ ایک بات سمجھ میں آئی۔ وہ جو بھی ہے، غریب ہے، پلاسٹک سرجری کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ حد تو یہ ہے کہ رخسانہ اس کی غریبی سے بھی پیار کرتی ہے۔ اس قدر محبت کرتی ہے کہ اس کی خاطر یہاں ٹھوکریں کھانے پر تیار ہے لیکن اب مجھ سے، پاپا سے مالی امداد لینا بھی گوارا نہیں کرتی ہے۔ آخر اس شخص میں کیا خوبی ہوگی؟

آخر وہ انسان کا بچہ ہے، اس میں کوئی کمزوری ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لالچی ہو اور میں اسے خرید سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عیاش ہو۔ کتنے ہی مرد اپنی بیویوں کو میکے بھیج کر دوسری عورتوں سے عشق کرتے ہیں۔ اس نے تو رخسانہ کو ہزاروں میل دور بھیج دیا ہے۔ معلوم نہیں وہاں کیا کر رہا ہوگا۔ مجھے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔ لیکن کیسے معلومات حاصل کی جائیں؟

اس نے غصے سے آئینے کی طرف دیکھا پھر گھونسا دکھاتے ہوئے پوچھا "ابے کون ہے تو؟"

○☆○

وہ ٹیکسی کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھا کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ ہیڈلائٹس کی پوری روشنی کھڑکی پر پڑ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید کھڑکی کھل جائے پھر اس نے ہیڈلائٹس کو بجھا دیا۔ ٹیکسی کو اسٹارٹ کرکے ذرا پیچھے کیا پھر اسے گھما کر سڑک کی دوسری طرف لے گیا تاکہ دوسرے یہ شبہ نہ کریں کہ وہ لیڈی ڈاکٹر سے عشق کرنے آیا ہے۔

فرزانہ دیوار کے ساتھ کھڑکی کے پاس دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ عجیب مشکل میں گرفتار تھی۔ کھڑکی کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ دعا کر رہی تھی کہ جانی کو عقل آجائے اور وہ وہاں سے چلا جائے۔

پھر اس نے گاڑی کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اب وہ گاڑی دور جا رہی تھی۔ اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی، وہ جا رہا تھا۔ جب اس بات کا یقین ہوا کہ وہ جا رہا ہے تو دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوئی۔ نہ اس کروٹ چین تھا، نہ اس کروٹ۔

اس نے آہستگی سے پردے کو ذرا سا سرکایا پھر کھڑکی کو تھوڑا سا کھول کر دیکھا، کھڑکی کی جالی کے اس پار ویران سڑک کے دوسری طرف ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رات وہیں گزارنے والا تھا۔ اپنی ضد پوری کرنے والا تھا۔ اس نے جلدی سے کھڑکی کو بند کر دیا۔ پردے کو برابر کیا پھر گھبرائے ہوئے انداز میں اپنی دھڑکنوں پر ہاتھ رکھے بستر پر آکر بیٹھ گئی۔

پچھلی رات اس کی امی کی تجہیز و تکفین کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد وہ روتی ہوئی ساری رات اپنی امی کے بغیر جاگتی رہی۔ آج ایک مدت کی آنکھ مچولی کے بعد جانی سے سامنا ہو گیا تھا۔ اس نے ایسے زخم پہنچائے تھے، ایسی کاری ضربیں لگائی تھیں کہ آدھی جان نکل گئی تھی۔ دوپہر کو دواؤں کے اثر سے کچھ دیر سوتی رہی مگر دو تین بار چونک کر اٹھ گئی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ آ رہا ہو۔

اور وہ آ ہی گیا۔ رات بھر جگانے کے لیے، اسے ستانے کے لیے اور تڑپانے کے لیے۔ حالانکہ وہ سامنے نہیں تھا۔ گھر کے اندر نہیں آیا تھا، دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ نہ وہ اسے دیکھ سکتا تھا، نہ آکر ظلم کر سکتا تھا۔ نہ اپنی ضد منوا سکتا تھا۔ وہ خود کو تسلیاں دینے لگی۔

سونے سے پہلے وہ اپنے دوپٹے کو کھونٹی سے لٹکا دیتی تھی۔ اس وقت وہ دوپٹے سے سر کو اور سینے کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی۔ رہ رہ کر دوپٹہ درست کر رہی تھی۔ کبھی تصور اتنا سچا اور ناقابل انکار ہوتا ہے کہ نامعلوم آنکھیں چاروں طرف سے دیکھتی رہتی ہیں۔

کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ باورچی خانے سے تھوڑی سی روشنی آ رہی تھی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پہلے تو وہ بیرونی دروازہ بند تھا۔ اسکے بعد کمرے کا یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ دونوں دروازے ڈھال کی طرح مضبوط تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ڈری ڈری سہمی سہمی لیٹ گئی۔

رات الجھے الجھے جذبوں کی طرح پیچیدہ اور گہری تھی۔ وہ آنکھیں کھولے نیم تاریکی میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے کمرے کے ایک گوشے میں دیکھا تو وہاں اندھیرے میں جانی کے دانت چمک رہے تھے۔ وہ محبت سے مسکرا بھی رہے تھے اور اسے کچا بھی چبا رہے

تھے۔ اس نے پریشان ہو کر وہاں سے نظریں ہٹالیں۔ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ادھر چند لمحوں تک دیکھتی رہی پھر جانے کیا محسوس ہوا کہ لیٹے ہی لیٹے اپنے پاؤں اپنی طرف سمیٹ لیے اور آپ ہی آپ سکڑنے لگی۔

کیسا بادل تھا، برستا بھی نہیں تھا، چھٹتا بھی نہیں تھا۔

وہ یوں تڑپ کر اٹھ گئی جیسے بھاپ بن کر اڑنے والی ہو۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہوگئی اسے باہر آنے کی پروا نہیں تھی۔ گھر کا آسیب سونے نہیں دے رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک ٹہلتی رہی پھر اس نے گلدان کو میز پر صحیح جگہ رکھا۔ ایک صافی لے کر سینٹر ٹیبل کو پونچھنے لگی پھر صوفوں کو بھی کپڑے سے جھاڑنا شروع کیا۔

دوسری صبح مرحوم ماں کا سوئم تھا۔ محلے کی عورتیں قرآن خوانی کے لیے آنے والی تھیں، اسی بہانے پورے گھر کی صفائی ہو جاتی تو بہتر ہی ہو جاتا۔ یہ سوچ کر اس نے سوئچ کو آن کیا اور کمرا روشن ہو گیا۔

سوئچ کے آن ہوتے ہی کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ وہ کھڑکی بھی روشن ہو گئی تھی۔ کچھ روشنی باہر کی طرف جھلک رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اب کیا ہو سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر گم صم کھڑی رہی پھر کمرے کی صفائی میں مصروف ہو گئی۔ ایک ایک چیز کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور انہیں سلیقے سے رکھا۔ فرش کو بھی صاف کیا اور صوفوں کو گھسیٹ کر ایک دیوار کی طرف لے گئی۔ بیچ کا حصہ خالی کر دیا پھر اسٹور روم سے بڑی سی دری لا کر بچھائی۔ اس کے اوپر سفید چادر بچھا دی پھر ایک تکیے پر سفید غلاف چڑھا کر اسے چادر کے درمیان رکھا تاکہ صبح کلام پاک کے سپارے اس پر رکھے جائیں۔

اتنی محنت کے بعد بھی وقت نہیں گزرا۔ اس وقت ڈھائی بجے تھے۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر ڈسپنسری میں آئی۔ وہاں کی لائٹ بھی آن کی۔ اب تو شب بیداری کا بھید کھل ہی چکا تھا۔ وہ ڈسپنسری کی صفائی کرنے لگی۔ دواؤں کو ترتیب سے رکھنے لگی۔ کافی وقت گزر گیا پھر وہ وہاں سے باورچی خانے میں آئی اور وہاں کی صفائی کرنے لگی۔ تب بڑی دیر بعد اذان کی آواز سنائی دی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

موذن مرحبا۔

تو صبح کی آواز ہے۔

جو رات میری عمر سے زیادہ تھی۔

تو نے اس کے گزرنے کی نوید دی۔

موذن شکریہ۔ صد شکریہ۔

تیری آواز کے اور مدینے۔

وہ باورچی خانے سے نکل کر کمرے میں آگئی۔ باہر سڑک پر گاڑیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں تھیں۔ وہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی۔ پردے کو ذرا سا سرکایا اور کھڑکی کو تھوڑا سا کھول کر دیکھا۔ باہر صبح کی ملگجی روشنی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف وہ ٹیکسی نظر آئی۔ اس کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی پھر اس نے کھڑکی کو بند کر دیا۔ پردے کو برابر کیا۔ کچھ سوچتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈسپنسری میں آئی۔ وہاں سے چلتے ہوئے بیرونی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ جانی کے سامنے جا کر اس کا حوصلہ نہیں بڑھانا چاہتی تھی مگر دوسرے انداز میں جانا چاہتی تھی تاکہ اس کا حوصلہ پست ہو جائے۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ جانی سے سخت لہجے میں یہ کہنے کا ارادہ تھا کہ ساری رات برباد کر کے کیا فائدہ ہوا۔ میری بھی نیند خراب کی اور خود بھی جاگتے رہے۔

وہ سوچتے ہوئے سڑک کو پار کر کے جب ٹیکسی کے پاس پہنچی تو پچھلی سیٹ پر وہ خراٹے لیتا ہوا نظر آیا۔ اسے گہری نیند میں سوتے دیکھ کر وہ جھنجلا گئی۔ جی میں آیا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے، کیسا ظالم ہے۔ کیسی سنگ دلی ہے کہ رات بھر اسے جگاتا رہا اور خود گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔

اس نے کھڑکی کے شیشے پر زور سے دستک دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا جیسے خواب دیکھ رہا ہو پھر اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ دوبارہ شیشے پر دستک ہوئی وہ باہر نکلتے ہوئے بولا "مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ ابھی میرے ہاں قرآن خوانی ہے۔"

"میں کیا کروں۔ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔"

"میں تمہیں پڑھنے کے لیے نہیں' یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ابھی تمہاری ساس بھی قرآن خوانی میں شریک ہونے کے لیے آئیں گی' انہوں نے تمہاری ٹیکسی یہاں دیکھ لی تو کیا ہو گا؟"

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "ہاں' یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا ٹھیک ہے' قرآن خوانی کب ختم ہو گی؟"

"جب بھی ختم ہو۔ تم سے کیا مطلب؟"

"مطلب ہے۔ اگر نہ ہوتا تو تم مجھے یہ کہنے نہ آتیں کہ میں ابھی چلا جاؤں یعنی تم مجھے میری ساس کی نظروں سے چھپا رہی ہو۔ نہیں چاہتیں کہ وہ ہم دونوں کو ایک جگہ دیکھے ٹھیک ہے میں قرآن خوانی کے بعد آجاؤں گا۔"

وہ حیران حیران سی اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی "کیا واقعی میں جانی کو رخسانہ کی امی سے چھپانے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ مجھ سے پھر کیسی غلطی ہو گئی ہے۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا "میں جا رہا ہوں تمہیں بدنام نہیں کروں گا۔"

وہ کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولی "جانی! کچھ تو سوچو کہ رخسانہ پردیس میں ہے' اسے تمہارے ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ تم اس طرح وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیا کما رہے ہو اسے کیا بھیجنے والے ہو۔ کبھی تم نے سوچا ہے؟"

جانی کی نظریں جھک گئیں۔ فرزانہ نے اس کی دکھتی رگ پکڑلی تھی۔ وہ ذرا دیر تک سوچتا رہا پھر فرزانہ نے کہا "دیکھو مجھے میری بات کا جواب دو۔ میں یہاں کھڑی رہوں گی تو آس پاس کے لوگ شبے میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

اس نے کہا "اچھی بات ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ دن بھر ٹیکسی چلاؤں گا۔ رخسانہ کے لیے کماؤں گا لیکن رات کے آٹھ بجے تک پھر یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ فرزانہ کو شام تک کے لیے اطمینان ہو گیا۔ وہ وہاں سے گھوم کر اپنے کلینک کے اندر چلی گئی۔

جانی شام کو آیا تو رات بھر اسی جگہ ٹیکسی میں سوتا رہا۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لاہور سے فرزانہ کے چچا اور رشتے دار تعزیت کے لیے آئے ہیں۔ لہٰذا دال نہیں گلے گی لیکن

ضد کا پکا تھا۔ روز رات کو آتا تھا اور صبح گاڑی لے کر چلا جاتا تھا۔ فرزانہ ابھی دیکھ رہی تھی۔ آخر پانچویں دن صبح کے وقت وہ بال بکھرائے پریشان حال اس کے پاس آئی وہ بیدار ہو چکا تھا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ جانی ایک دم سے خوش ہو کر باہر آیا پھر پچھلے دروازے کو بند کر کے اسٹیئرنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ نہ وہ بولی نہ یہ بولا۔ کچھ کہے سنے بغیر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ وہ اورنگی کے علاقے سے نکل کر بنارس پہنچے اس وقت تک خاموشی رہی۔ جانی نے اس کی طرف دیکھے بغیر خوش ہو کر کہا "میں جانتا ہوں تم مجھے دل سے چاہتی ہو مگر اوپر سے غصہ دکھاتی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ جواب کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ جب بہت دیر تک جواب نہ ملا تو اس نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے سر جھکائے اونگھ رہی تھی۔

یک بارگی جانی کو ندامت کا احساس ہوا' کیا وہ تمام رات جاگتی رہی تھی؟ اس نے پھر آہستگی سے مخاطب کیا "فرزانہ! کیا تم سو رہی ہو؟"

وہ ایک دم چونک گئی پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولی "یہ تم کہاں لے جا رہے ہو؟ میں تمہارے گھر جانے کے لیے نہیں آئی ہوں تم سے دوٹوک فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہا' پھر بولا "تمہیں نیند آرہی ہے فیصلہ کیا کرو گی؟"

"نیند تو آتی رہے گی اور میں اسے کچلتی رہوں گی۔ تمہیں کچھ خیال ہے چھ دنوں سے میں کبھی رات کو پوری نیند سو نہیں سکی۔ ہمیشہ چونک چونک کر اٹھ جاتی ہوں کبھی دن کو سونے کا موقع ملتا ہے تب بھی تم میرے حواس پر چھائے رہتے ہو۔"

"اسے محبت کہتے ہیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو اسے خوف اور دہشت بھی کہتے ہیں۔ میں تمہارے ڈر سے سو نہیں سکتی۔ کبھی بدنامی کا خیال آتا ہے کبھی تمہاری درندگی یاد آتی ہے تو رونے لگتی ہوں اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے مار ڈالو گے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ اسی لیے آگئی ہوں' کہیں دور لے جاؤ اور مجھے قتل کردو۔ جتنا انتقام لے سکتے ہو لے لو۔ مرنے

کے بعد تو میں بے خوف ہو کر سو سکوں گی۔"

"میں جانتا ہوں تمہارے غصے کے پیچھے پیار ہے۔"

"تم جانتے ہی رہو۔"

"انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں چھ راتوں سے تمہارے دروازے کے پاس دھرنا دیے بیٹھا ہوں۔ تم چاہتیں تو محلے والوں سے میری پٹائی کرا سکتی تھیں، پولیس والوں کو لا سکتی تھیں۔ میرے خلاف رپورٹ لکھا سکتی تھیں، قانونی کارروائی کر سکتی تھیں مگر تم نے نفرت ظاہر کرنے والا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

"جانی! مشکل یہ ہے کہ تم صرف اپنے نقطۂ نظر سے سوچتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ میں اکیلی لڑکی ہوں۔ اگر ایسے اقدامات کروں گی تو بدنام ہو جاؤں گی لوگوں کی زبانیں ایک نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے اپنے طور پر بولنا شروع کر دیں گے۔ کچھ لوگ مجھے بے گناہ سمجھیں گے کچھ لوگ مجھے بدکار کہیں گے۔ کچھ لوگ طرح طرح کے قصے گھڑنا شروع کر دیں گے۔

پھر میں امی کی وفات کے بعد تنہا رہ کر جتنی پریشان ہوں وہ پریشانی میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری پریشانیوں کا خیال کرو مجھ اکیلی کو بدنام نہ کرو۔ تم میرے گھر کے پاس رہو گے تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ اگر تم یہ سب کچھ انتقام لینے کے لیے کر رہے ہو تو سیدھی سی بات ہے مجھے مار ڈالو۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا "اگر میں بدمعاش اور قاتل ہوتا تو سب سے پہلے رخسانہ کو قتل کر دیتا۔ کیونکہ وہ جھوٹ کے راستے میری شریک حیات بن کر آئی تھی لیکن میں کیا بتاؤں کہ میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے پاربتی پور، سنتاہار اور ڈھاکا میں اپنی ماؤں کی لاشیں دیکھی ہیں۔ اپنی بہنوں کے برہنہ جسم پر چادر ڈالی ہے بچوں کو نیزوں پر دیکھا ہے۔ میں جب بھی غصے میں آتا ہوں۔ کسی سے انتقام لینا چاہتا ہوں تو وہ تمام منظر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار یوں دیکھنے لگا جیسے وہ منظر اب بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہو پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"اب کوئی مجھ سے جھوٹ بولتا ہے، مجھے دھوکا دیتا ہے تو میں جلدی معاف کر دیتا ہوں۔ غصے میں آتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ نہیں دھوکا دینے والوں کو زندہ رہنے کا موقع دینا

چاہیے۔ معلوم نہیں، پھر کوئی ایسا ظالم وقت کب لوٹ آئے۔ کوئی درندہ تمہیں یا رخسانہ کو مار ڈالے تو زندگی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جائے گی پھر کچھ نہیں رہے گا۔ کیا فائدہ ہے ایسی درندگی سے۔ غصے میں معاف کرنا اور صبر کرنا بہت مشکل ہے اور یہ مشکل کام میں کر رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ نیند سے بوجھل آواز میں بولی "کیا تم مجھے چاہتے ہو؟"

"یہ پوچھنے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ ویسے تمہیں نیند آ رہی ہے یہ باتیں بعد میں کر لینا۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ وہاں تم سکون سے سو سکتی ہو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"تم جاؤ گی۔ دیکھو، اگر اپنے گھر میں سونا چاہو گی تو مریض آ کر پریشان کریں گے۔ یہاں تم میرے گھر چلو اور میرے کمرے میں جا کر دروازے کو اندر سے بند کر کے آرام سے سو جاؤ۔ جب دروازہ بند رہے گا تو میرا بھی ڈر نہیں رہے گا اور جب تم میری پناہ میں رہو گی تو نیند سے چونک چونک کر نہیں اٹھو گی۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے گھر میں سونا چاہتی تو آنے والی مریض عورتیں اسے سونے نہ دیتیں۔ کیونکہ دس بجے سے کلینک کا وقت شروع ہوتا تھا لیکن یہ بات بھی غلط ہے کہ وہ تنہا کسی کے مکان میں جائے۔ خواہ وہ انسان فرشتہ ہی کیوں نہ بن گیا ہو۔ وہاں تو صرف تنہا جانے کی نہیں نیند پوری کرنے کی بھی بات تھی، اس نے کہا "میں نہیں جاؤں گی مجھے واپس پہنچا دو۔"

"یہ راستہ میرے گھر کی طرف جا رہا ہے اگر تمہیں انکار ہو اور احتجاج کرنا چاہو تو چیخنا چلانا شروع کر دو۔ لوگ میرے پیچھے آئیں گے اور مجھے پکڑ کر قانون کے حوالے کر دیں گے۔"

"تم جانتے ہو میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتیں؟"

"لوگ مجھ سے بھی طرح طرح کے سوالات کریں گے کہ میں تمہارے ساتھ گاڑی میں کیوں بیٹھی تھی۔"

"گاڑی میں کتنی ہی لڑکیاں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہیں۔"

"وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر جاتی ہیں۔ میں اگلی سیٹ پر ہوں۔ پچھلی اور اگلی سیٹ کا فرق کیا ہوتا ہے' لوگ خوب سمجھتے ہیں۔"

"تم بھی سمجھتی ہو اور سوچ سمجھ کر میرے پاس بیٹھی ہوئی ہو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اس نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ اس کا جواب نہ بن پڑا۔ اس نے ایک جگہ گاڑی کو روکتے ہوئے کہا "ادھر دور ایک حلوائی کی دکان ہے۔ گرما گرم بھاجی' پوریاں ملیں گی۔ میں تمہیں بھوکا نہیں سونے دوں گا۔ یہاں انتظار کرو۔ ابھی لے کر آتا ہوں۔"

وہ ٹیکسی سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا حلوائی کی دکان کی طرف جانے لگا۔ وہاں جگہ ایسی تھی کہ وہ گاڑی پارک نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے بہت فاصلے پر فرزانہ کو چھوڑ کر آنا پڑا۔ دل میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ اتر کر دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی نہ جائے۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کی ٹیکسی سے اتر کر دوسری ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ حلوائی کی دکان میں بھیڑ تھی۔ واپسی میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ کسی کو فرار ہونے کے لیے پندرہ منٹ بہت ہوتے ہیں لیکن جب واپس آیا تو وہ اپنی جگہ موجود تھی۔ اس نے قریب آکر دیکھا اس کا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی اور وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جانی نے ناشتے کو ڈیش بورڈ کے اوپر رکھا پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر بڑی آہستگی سے دروازے کو بند کیا اور گاڑی کو دھیرے دھیرے اسٹارٹ کرنے لگا۔ خواہ گاڑی کتنی ہی آہستگی سے اسٹارٹ کی جائے۔ انجن کے چلنے کا شور تو ہوتا ہی ہے لیکن اس شور کے باوجود وہ سوتی رہی۔ وہ دھیرے دھیرے ڈرائیو کرتا ہوا گھر کی طرف جانے لگا۔

تقریباً چھ دنوں سے وہ پوری نیند کے لیے ترس رہی تھی۔ حالات عجیب موڑ پر لے آتے ہیں۔ جس دشمن سے وہ ڈرتی تھی۔ اب اسی کے سائے میں سو رہی تھی۔ وہ گاڑی کو اپنے مکان کے احاطے میں لے آیا۔ اب سوچنے لگا' اسے جگایا جائے یا نہیں۔ اس نے جگانے سے پہلے اس کے چہرے کو دیکھا۔ خوابیدہ چہرے پر تھکن' ایسی معصومیت اور مظلومیت تھی کہ اسے جگانے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

مکان کے احاطے کی چار دیواری اونچی تھی۔ باہر سے کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے ٹیکسی کے اگلے دونوں دروازے آہستگی سے کھول دیے تاکہ اسے ٹھنڈی ہوا لگتی رہے۔ وہ پوری بھاجی کا پیکٹ اٹھا کر مکان کے اندر چلا گیا۔ وہاں اس نے پہلے شیو کیا۔ پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد لباس تبدیل کر کے ناشتا کیا۔ اس کے لیے چار پوریاں بچا کر رکھیں پھر پانی پینے کے بعد باہر آیا۔ ٹیکسی کے پاس پہنچ کر دیکھا وہ اس طرح بے سدھ ہو کر ساری دنیا سے غافل اور اپنے آپ سے بھی بے خبر سو رہی تھی۔

وہ اسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ اس نے آج تک ایسا خوابیدہ حسن نہیں دیکھا تھا رخسانہ کو دیکھا تھا۔ بے شک وہ بہت ہی حسین تھی لیکن آدھی تھی۔ آدھا چہرہ تھا آدھا حسن تھا۔ وہ جو ایک مکمل حسن کی طلب ہوتی ہے وہ نہیں تھی۔ رخسانہ کے ساتھ سوتے جاگتے یوں لگتا تھا جیسے وہ خواب دیکھتا ہو اور خواب کی ادھوری تعبیر ملتی ہو۔ اس وقت فرزانہ مکمل تعبیر بن کر اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئی تھی۔

وہ اسے دیکھتے دیکھتے آہستگی سے اسٹیئرنگ کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔ سیٹ پر بیٹھنے سے اس بات کا ڈر تھا کہ اس کی نیند ٹوٹ جائے گی۔ اس وقت یہی اچھا لگ رہا تھا کہ وہ سوتی رہے اور وہ دیکھتا رہے پھر وہ جانے کتنی دیر تک دیکھتا رہا۔ احاطے کے باہر اسے ایک ٹیکسی ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے ملنے آیا تھا۔

جانی جلدی سے اٹھ گیا کہ وہ ادھر نہ چلا آئے۔ تیزی سے چلتا ہوا احاطے کے گیٹ کے پاس گیا پھر اس نے پوچھا "تم اس وقت یہاں کیسے آ گئے؟"

"میری گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے' میں نے سوچا تمہارے پاس ہو تو لے لوں۔"

"میرے پاس نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے گاڑی بند رکھی ہے وہ دیکھو وہاں کھڑی ہوئی ہے چلو میں تمہیں دوسری جگہ سے دلوا دوں گا۔"

وہ اسے باتوں میں لگا کر وہاں سے لے گیا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ اس کے ساتھ گھر سے دور چلا آیا تھا کیونکہ اسی وقت اس کے سسر فرید احمد ناگن چورنگی کے اسٹاپ سے چلے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی جانی نے گھور کر پوچھا "آپ ادھر کیوں آئے ہیں؟ میں نے آپ دونوں کو منع کیا تھا۔"

وہ جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے ہوئے بولے "مجھے یاد ہے' تم

نے کہا تھا کہ ہم تمہارے گھر کی طرف نہ آئیں لیکن یہ رخسانہ کا خط آیا ہے۔"

اس نے خط کو چھیننے کے انداز میں لیتے ہوئے کہا "میں کل سے آپ کے یہاں نہیں گیا' آج آجاتا۔ اتنی جلدی کیا تھی۔ میں وہاں آکر خط لے سکتا تھا۔ آئندہ کسی بھی بہانے میرے گھر کی طرف نہ آئیں ورنہ میں کامی کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔"

وہ پریشان ہو کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولے "بیٹے میری بیگم سے ایک غلطی ہو گئی ہے میں نے تو کوئی جادو نہیں کیا۔ میں تو تمہارے پاس آسکتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ جب آپ اپنی بیوی کو اپنے کنٹرول میں نہیں رکھ سکتے ہیں تو کسی دن اس کے بہکانے پر آپ بھی مجھ پر جادو کرسکتے ہیں۔ مجھ سے بحث نہ کریں واپس چلے جائیں۔"

انہوں نے بے بسی سے جانی کو دیکھا پھر واپس گھوم کر جانے لگے۔ جانی نے سڑک کے دوسری طرف دیکھا۔ اس کا ٹیکسی ڈرائیور دوست دوسری ٹیکسی والے کو روک کر پیٹرول حاصل کررہا تھا۔ وہ ان کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ جب وہ دونوں ٹیکسیاں وہاں سے چلی گئیں تب وہ مطمئن ہو کر اپنے مکان کے احاطے میں آیا۔ فرزانہ اسی طرح سو رہی تھی۔

وہ اپنے برآمدے کے زینے پر بیٹھ گیا۔ لفافے کو چاک کرکے اس میں سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا پھر اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ رخسانہ کا خط بڑا ہی خوش خط تھا' اس نے لکھا تھا۔

"میرے سر کے تاج! میرے آسمان! میں لندن پہنچ گئی ہوں۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ میں یہاں کے ایک فلیٹ میں تنہا ہوں۔ انکل کسی کام سے لندن سے باہر گئے ہیں۔ میں تنہائی میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ تم اور کامی بڑی شدت سے یاد آرہے ہو۔ میرے پاس تم لوگوں کی یادوں کے سوا اور ہے بھی کیا۔ لندن رنگا رنگ دلچسپیوں کا مرکز ہے لیکن تمہارے اور کامی کے بغیر یوں لگتا ہے جیسے میں اجاڑ بیابان میں آگئی ہوں اور جب تک میرا چہرہ مکمل نہیں ہوگا میں اس بیابان میں تنہا بھٹکتی رہوں گی۔

جانی! اتنی دور آنے کو تو آگئی ہوں مگر دل تمہاری طرف اٹکا ہوا ہے۔ سوچتی رہتی ہوں پھر ڈرتی رہتی ہوں۔ جانے کب تم اس سے مل بیٹھو' پھر میرا کیا ہوگا جانی! میں تو تمہیں روکنے ٹوکنے کے لیے نہیں آسکوں گی۔ میرا خدا ہی تمہیں دیکھتا رہے گا۔ کہیں ایسا

تو نہیں کہ میں ادھر آئی ہوں اور ادھر تم نے اسے ڈھونڈ نکالا ہو۔"

جانی نے پڑھتے پڑھتے سر گھما کر دیکھا۔ ٹیکسی مکان کی دیوار کے سائے میں تھی اس لیے برآمدے سے نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ پھر سر جھکا کر پڑھنے لگا' لکھا تھا۔

"دیکھو جانی! اگر تم اس سے مل رہے ہو تو مجھ سے نہ چھپانا یہ مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔ میں اپنی محبت آدھی تمہیں دینا چاہتی ہوں۔ آدھی کامی کو دینا چاہتی ہوں۔ آدھا تمہیں یاد کرنا چاہتی ہوں' آدھا کامی کو یاد کرنا چاہتی ہوں لیکن اپنے بچے کو کیسے یاد کروں۔ میرا سارا خیال سارا وہم اور سارے اندیشے تمہاری طرف چلے جاتے ہیں۔ تمہاری ہی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔ کیا یہ مجھ پر ظلم نہیں ہے کہ میں تمہارے سلسلے میں ڈرتی رہوں اور مجھے اپنے بچے کو یاد کرنے کا موقع تک نہ ملے۔ جانی بیوی پر تو لوگ ظلم کرتے ہی ہیں' ایک ماں پر ظلم نہیں کرنا چاہیے۔"

جانی نے دونوں ہاتھوں سے خط کو دبوچ لیا۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں کیونکہ اندر سے ایک انسان آنکھیں کھول رہا تھا۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ساری دنیا سے اپنی آنکھوں کو سمیٹ کر بند آنکھوں کے پیچھے چھپالیتا ہے اور ان نظروں سے اپنے اندر کے جاگنے والے انسان کو دیکھتا ہے اپنا محاسبہ کرتا ہے وہاں وہ سوچ رہا تھا کہ اس خط کا جواب کیا دے گا۔ کیا جھوٹ لکھے گا کہ فرزانہ سے ملاقات نہیں ہوئی؟

اس کے دماغ نے سمجھایا۔ جھوٹ اور سچ کی بات نہیں ہے۔ اگر میں فرزانہ سے مل بیٹھا ہوں' اس کے پیچھے ابھی تک بھاگ رہا ہوں تو اس میں میری بیوی کا کیا نقصان ہے۔ بیوی پھر بیوی ہوتی ہے' اپنے بچے کی ماں ہوتی ہے۔ گھر' بیوی اور بچہ اپنی جگہ ہے۔ باہر جو محبت حاصل ہوتی ہے وہ ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے آدمی گھر سے باہر کھلی ہوا میں سانس لینے جارہا ہو۔ جیسے گھر کے گلدان کو دیکھتے دیکھتے باہر تازہ بہ تازہ نو بہ نو چمن میں نکل آیا ہو۔ میں اس پھول کو گھر کے گلدان میں نہیں سجا سکتا۔ کیونکہ ایک دن وہ پھول بھی باسی ہوجائے گا لہٰذا بیوی اپنی جگہ ہے اور باہر کی رنگین خوب صورتی اور خوشبو اپنی جگہ ہے میں دونوں میں سے کسی کو کسی کا حق نہیں دوں گا اور نہ ہی کسی کا حق چھینوں گا۔

وہ پھر خط کو کھول کر پڑھنے لگا "جانی! میں کل صبح اس ڈاکٹر سے پہلی بار ملنے جاؤں گی جو میرے چہرے کو مکمل کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میرا چہرہ بن جائے گا مگر اصل

بتانے والے تو تم ہو۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا مانگتی رہتی ہوں کہ میری واپسی تک تم بھٹکنے نہ پاؤ۔ کوئی تمہیں اپنے پیچھے نہ دوڑائے۔ جب میں تمہارے پاس آجاؤں گی تو اس کے بعد تمہیں سنبھال لوں گی۔ تم مجھ سے کتنے ہی بڑے سہی لیکن ایک ایسے بچے ہو جو دنیا کے میلے میں حیرت اور مسرت سے ہڑبڑا کر اپنوں کی انگلی چھوڑ کر گم ہونے لگتا ہے۔ یہ میری غلطی ہے۔ تم نے میری انگلی خوب پکڑلی تھی میں ہی چھڑا کر چلی آئی۔

جی چاہتا ہے، میں تمہیں ایسے ایسے انداز میں خط لکھوں کہ تم میری غیر موجودگی میں بھٹکنا بھول جاؤ۔ جانی! میری گھبراہٹ کو اور میرے اندیشوں کو سمجھو۔ خدا کے لیے اپنے ے پر قائم رہو۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ فرزانہ کو تلاش نہیں کروگے۔ اس سے نہیں ملو گے اور اگر کسی مجبوری سے مل بیٹھے ہو تو تمہیں اپنی زبان کا پاس رکھتے ہوئے بھی دوسری شادی کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ تم میرا انتظار کروگے۔ کیوں، کرو گے نا؟

وہ پڑھتا جارہا تھا اور اندر ہی اندر بے چین ہو رہا تھا۔ تذبذب میں گرفتار ہو رہا تھا کیا کرے کیا نہ کرے۔ فرزانہ اتنی قریب آگئی تھی کہ اب ہاتھوں میں آنے ہی والی تھی۔ ادھر دونوں ہاتھوں میں وہ کاغذ رخسانہ کے سہمے ہوئے دل کی طرح کانپ رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک برآمدے کے زینے پر بیٹھا رہا پھر اس نے خط کو تہ کرکے جیب میں رکھا۔ وہاں سے اٹھ کر ٹیکسی کے پاس آیا۔ وہ اسی طرح گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی اسے اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔ دوپٹہ شانے سے ڈھلک کر اس کی گود میں گر پڑا تھا۔ ایک خیال آیا کہ آہستگی سے جھک کر دوپٹے کو اٹھا کر اس کے چہرے کو اور بدن کے دوسرے حصوں کو ڈھانپ دے لیکن وہ بیدار ہو سکتی تھی اسے اپنے قریب دیکھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتی تھی۔

وہ وہاں سے کمرے کے اندر آیا۔ تھوڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا کہ رخسانہ کے خط کا جواب لکھ دے لیکن خط لکھنے کے دوران فرزانہ بیدار ہو جائے گی تو کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ ادھر وہ لکھنے میں مصروف رہے گا، وہ ادھر وہ اٹھ کر چپ چاپ چلی جائے گی یا پھر اس کے پاس آئے گی، پوچھے گی کہ کیا لکھ رہے ہو؟ رخسانہ کو خط لکھ رہے ہو تو کیا اسے بتا رہے ہو کہ میں اس کے گھر تک آگئی ہوں؟ اور اگر نہیں بتا رہے ہو تو اس

سے کیوں چھپا رہے ہو؟ کیا میں کوئی گناہ ہوں یا ایسی غلطی ہوں جو دنیا والوں سے اور خصوصاً اپنی بیوی سے چھپائی جاتی ہو اگر میں کوئی ایسی غلطی ہوں تو اس غلطی سے باز کیوں نہیں آجاتے؟

وہ ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا پھر اس نے الماری کو کھول کر رخسانہ کے خط کو کپڑوں کی تہ کے نیچے چھپا دیا اور الماری کو بند کر دیا۔ رخسانہ کی وہ تحریر ایک التجا تھی۔ ایک درخواست تھی اور درخواست کسی کی بھی ہو اور درخواست کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ متعلقہ دفاتر میں اور مصلحت پسند لوگوں کی الماری میں معاملے کو ٹالنے کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔

وہ کرسی لے کر کمرے سے نکلا اور ٹیکسی کے پاس آکر ایسی جگہ بیٹھ گیا۔ جہاں سے فرزانہ کا چہرہ نظر آتا تھا۔ جس وقت اس کی آنکھ لگی تھی اس وقت سورج مشرق کی طرف تھا اب وہ سورج سر سے گزر گیا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ تھوڑی دیر تک جس حالت میں سیٹ پر پڑی ہوئی تھی، اسی حالت میں پڑی سوچتی رہی پھر ہڑبڑا کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ دور جانی کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھا تو اپنے بدن کا ہوش آیا۔ جلدی سے دوپٹے کو اٹھا کر اپنے آپ کو ڈھانپنے لگی۔

جانی اپنی جگہ سے اٹھ کر قریب آتے ہوئے بولا "تم سو گئی تھیں۔ میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔"

وہ نظریں جھکائے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت دو بجنے والے تھے۔ اس نے حیرانی سے آنکھیں اٹھا کر پوچھا "کیا میں اتنی دیر تک سوتی رہی؟ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے جگانا چاہیے تھا۔"

"میں تمہیں چھ دن سے جگا رہا ہوں کیا آج بھی سونے نہ دیتا؟"

وہ منہ پھیر کر بولی "میں گھر جاؤں گی۔"

"پہلے گھر کے اندر جاؤ۔ وہاں منہ ہاتھ دھو لو۔ کنگھی کرو۔ اپنا حلیہ درست کرو پھر یہاں گاڑی میں آکر بیٹھو میں تمہیں پہنچا دوں گا۔"

"میں تمہارے گھر کے اندر نہیں جاؤں گی۔"

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں جب تک تم گھر میں رہوں گی، میں باہر رہوں گا۔"

تمہارے پیچھے نہیں آؤں گا۔ جاؤ میری بات مان لو۔ اس حالت میں تم سڑکوں سے گزرو
گی اور اپنے محلے میں پہنچو گی تو لوگ کیا کہیں گے؟"
اس نے چند لمحوں تک سوچا پھر ٹیکسی سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے
مکان میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو منہ ہاتھ دھونے اور چوٹی کنگھی کرنے کے باعث
گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ آکر اگلی سیٹ پر
بیٹھ گئی۔ جانی نے کرسی کو کمرے کے اندر رکھا۔ تمام کمروں کے دروازوں پر تالے لگائے
پھر گاڑی میں آکر بیٹھ گیا اسے اسٹارٹ کرکے ڈرائیو کرتا ہوا مکان کے احاطے سے نکل کر
بولا "اب ہم کسی ریستوران میں جائیں گے۔ وہاں تم دوپہر کا کھانا کھاؤ گی' اس کے بعد
تمہیں گھر پہنچاؤں گا۔"
گاڑی آگے بڑھنے لگی' فرزانہ نے کہا "میں تمہارے ساتھ کسی ریستوران میں کھانا
مناسب نہیں سمجھتی خدا کے لیے مجھے گھر پہنچا دو۔"
"میں نے گھر پہنچانے سے انکار نہیں کیا ہے۔ تم بھی میری بات سے انکار نہ کرو۔"
"تم میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا بہانا کب تک تلاش کرتے رہو
گے؟ کیا اسی طرح ساری زندگی گزر جائے گی؟"
"تم چاہو تو ساری زندگی بھی گزر سکتی ہے۔"
"تم سوچے سمجھے بغیر بول رہے ہو۔ یہ مت بھولو کہ رخسانہ تمہاری بیوی ہے اور
میری بہت اچھی سہیلی ہے۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے؟"
"بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے اور میں بھی جاہل نہیں ہوں۔ بے شک
ہمارے مذہب میں ایک کے بعد مرد کو دوسری تیسری شادی کی اجازت ہے مگر ان شادیوں
کے لیے کڑی شرائط عائد ہیں جنہیں تم پورا نہیں کر سکو گے۔"
"وہ کون سی شرائط ہیں؟"
"پہلی بات یہ کہ جس عورت سے دوسری شادی کرو گے' اس عورت کی رضامندی
ضروری ہے اور میں کسی کی سوتن بننے کے لیے کسی حال میں راضی نہیں ہو سکتی۔"
"ایک بات سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

ایسی محبت نہیں کرتی جو کسی عورت کا گھر جلا دے اور ایسی محبت نہیں کرتی جو بھرا
پرا گلشن اجاڑ دے اور ایسی محبت نہیں کرتی جو گلے میں ہڈی کی طرح اٹک جائے نہ نگلتے
بنے' نہ اگلتے بنے۔"
وہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ فرزانہ نے کہا "میں نے کہا تھا نا کہ تم یہ
شرائط پوری نہیں کر سکو گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دوسری شادی کے لیے اپنی پہلی
بیوی میں کوئی کھوٹ یا کمی نکالنی پڑتی ہے' کوئی مجبوری بیان کرنی پڑتی ہے۔ کیا مجبوری ہے
تمہاری؟ کیا رخسانہ ایک اچھی' گھریلو' وفادار بیوی نہیں ہے؟ کیا وہ دل و جان سے نہیں
چاہتی ہے؟ اس میں صرف ایک ہی کمی ہے کہ چہرہ مکمل نہیں ہے۔ جب وہ واپس آئے گی
تو وہ بھی مکمل ہو چکا ہوگا۔ تم ڈھونڈتے رہ جاؤ گے اس کے اندر کوئی عیب نہیں نکال سکو
گے پھر کس بنیاد پر تم دوسری شادی کرو گی؟"
"اس بنیاد پر کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"
"انسان صرف سانسوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باقی دنیا کی ہر چیز کے بغیر کچھ عرصے
تک جی لیتا ہے۔"
"کیا آدمی محبت کی خاطر مرتا نہیں ہے؟"
"میں نے تو سنا ہے کہ آدمی صرف نفرت سے مرتا ہے۔ وہ محبت کی خاطر زندہ رہتا
ہے اور دوسروں کو بھی زندہ رکھتا ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو کسی کو مار ڈالے۔"
جانی نے بے بسی سے کہا "بڑی مشکل ہے۔ میں تمہارے جیسا پڑھا لکھا نہیں ہوں
اور تمہاری جیسی باتیں نہیں بنا سکتا۔"
وہ ایک ریستوران میں پہنچے وہاں کھانا کھاتے رہے مگر خاموش رہے۔ جانی کی سمجھ
میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح اپنی طرف مائل کرے ویسے مائل کرنے کی ضرورت
نہیں تھی۔ یہ بات واضح تھی کہ فرزانہ کے دل میں اس کے لیے محبت ہے۔ نہ ہوتی تو وہ
اس کے ساتھ ریستوران میں کھانا نہ کھاتی۔ وہ اس کے گھر کے پاس ٹیکسی میں رات بھر
سوتا رہتا تھا۔ اسے سونے نہیں دیتا تھا لیکن اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس
کی خاموشی اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی اور خاموشی کے پیچھے کیا ہے' یہ جانی خوب سمجھتا
تھا۔

کھانے کے بعد پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اورنگی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ فرزانہ نے کہا "یہاں گاڑی روک دو۔ میں بس میں جاؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ محلے والے مجھے تمہاری ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھیں۔"

اس نے گاڑی روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر جانے لگی۔ جانی نے کہا "اب میں رات کو تمہارے گھر کے پاس نہیں آؤں گا۔ میری وجہ سے تم رات بھر جاگتی رہتی ہو۔"

اس نے مطمئن ہو کر کہا "شکریہ۔"

جانی نے کہا "میں دن کے وقت آیا کروں گا۔"

فرزانہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر زور سے دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا "تعجب ہے اتنی دیر سے سمجھا رہی ہوں پھر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"میں آؤں گا۔ خواہ تم کتنا ہی سمجھاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا پھر گول چکر کے دوسری طرف جا کر رک گیا وہ بس اسٹاپ پر اکیلی کھڑی ہوئی تھی جب ایک بس آئی اور وہ بیٹھ کر چلی گئی تب اسے اطمینان ہوا۔ اس کے بعد وہ سواریوں کو بٹھا کر ان کی منزلوں تک پہنچانے لگا۔ رات کے گیارہ بجے تک وہ ٹیکسی چلاتا رہا۔ آخری سواری کو بٹھا کر جب وہ جیل روڈ کی طرف گیا تو اچانک اسے یاد آیا کہ ایک بار مستری چاچا کسی راستے پر اتر گئے تھے۔ اس وقت فرزانہ برقعے میں چھپی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ مستری چاچا کسی عالم صاحب کے پاس گئے تھے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے' وہ کہاں گئے تھے۔

جانی کو بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ وہ یہ معلوم کرنے گئے تھے کہ جو شادی جھوٹ اور فریب کے ذریعے ہوئی ہے وہ جائز ہے یا ناجائز؟

جانی کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فرزانہ نے کہا تھا۔ رخسانہ کے اندر کوئی کھوٹ نہیں' کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ وفادار ہے محبت کرنے والی بیوی ہے تم کون سا عیب یا کمی نکالو گے اس میں؟

اب یہ بات سمجھ میں آرہی تھی۔ عورت کا جھوٹ سب سے بڑا جرم ہوتا ہے اور رخسانہ نے اس سے جھوٹ کہا تھا۔ اسے فریب دے کر شریک حیات بن کر آئی تھی جانی نے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچا "تعجب ہے مستری چچا کی وفات کے بعد میں نے اس

بات کی تحقیقات کیوں نہیں کی؟ بے شک میں رخسانہ کو دل و جان سے چاہتا ہوں' اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا لیکن حقیقت کا علم تو ہونا چاہیے۔ سچ کیا ہے' جھوٹ کیا ہے' جائز کیا ہے ناجائز کیا ہے' اس کا علم رکھنا ضروری ہے۔"

وہ رات کے ایک بجے گھر آکر سو گیا۔ اچھی نیند آئی لیکن کچھ ایسے خواب دیکھے جو جاگنے پر یاد نہیں آئے۔ اندر سے کچھ بے چینی تھی۔ فرض کرو اگر نکاح ناجائز ہوا۔ رخسانہ کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی بھی ناجائز ہوئی تب کیا ہوگا؟

دن کے آٹھ بج رہے تھے۔ جانی نے دانت مانجھتے اور کلی کرتے ہوئے سوچا نکاح ناجائز ہوگا تب بھی میں رخسانہ کو نہیں چھوڑوں گا۔

جب اسے چھوڑنا ہی نہیں تو پھر جائز اور ناجائز کے سلسلے میں معلومات کیوں حاصل کی جا رہی ہیں؟

"میں معلومات حاصل کروں گا۔ اگر رشتہ غلط ہوا تو میں دوسری بار نکاح پڑھاؤں گا۔"

جب ایک رشتہ ختم ہو جائے گا۔ جو بیوی ہے وہ بیوی نہیں رہے گی اور جب دوسری شادی کی نوبت آئے گی تو شادی کے لیے دو ہستیاں نگاہوں کے سامنے ہوں گی۔ ایک رخسانہ' دوسری فرزانہ' ایک وہ جو حاصل ہو چکی ہے دوسری وہ جو اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود حاصل نہ ہو سکی۔ کشش کس میں ہوگی؟ انسان فطرتاً اس کی طرف مائل ہوتا ہے جو حاصل نہیں ہوتی' جو بالکل نئی ہوتی ہے۔

وہ ناشتا کرنے کے بعد جھورے پینٹر کے پاس پہنچ گیا۔ جھورے نے اسے دیکھتے ہی پوچھا "استاد! تم حوالات سے باہر ہو؟"

جانی نے ناراضی سے کہا "تم بہت ہی بزدل ہو۔ دوستی کے قابل نہیں ہو مجھے چھوڑ کر چلے آئے تھے۔"

"میں تمہارے ساتھ جیل جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیا ہوا۔ کیا عامل بابا کا کوئی کمال دیکھا؟"

"بہت کمال دکھایا ہے' دراصل وہ جو بال میرے پاس تھے۔ وہ میری محبوبہ کے نہیں بلکہ میری ساس کے تھے۔"

"اچھا!" جھورے نے حیرانی سے کہا "جبھی تو ہم بال جلا رہے تھے تو تمہاری سانس پہنچ گئی تھی۔"

"بہرحال چھوڑو۔ میں دوسرا مشورہ لینے آیا ہوں۔"

"کیا اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے؟"

"میں وہ معلوم کرنا چاہتا ہوں جو مستری چاچا معلوم کرنا چاہتے تھے۔"

"اور مستری چاچا کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟"

جانی نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ جھورے نے اسے تھوڑی دیر گہری نظروں سے دیکھا پھر کہا "استاد تم تھالی کا بینگن ہو۔ کبھی بھابی کی طرف لڑھکتے ہو' کبھی فرزانہ کی طرف اب فرزانہ مل گئی ہے تو تم جائز اور ناجائز کے چکر میں پڑ گئے ہو کسی طرح کوئی ایسی بات ڈھونڈ رہے ہو کہ تمہیں فرزانہ سے شادی کرنے کا موقع مل جائے۔"

"محبت سے کسی کو حاصل کرنا جرم نہیں ہے اپنی گھر والی کو محبت سے سمجھایا جائے کہ دوسری عورت بھی میری ضرورت ہے تو وہ کبھی نہیں مانے گی۔ ہاں اگر عالم صاحب نے یہ فتویٰ دے دیا کہ نکاح جائز نہیں تھا تو میں تمہارے سامنے بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ رخسانہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس سے دوسری بار نکاح پڑھاؤں گا لیکن اس وقت رخسانہ میری احسان مند ہوگی۔ دوبارہ میرے نکاح میں آنے کے لیے وہ فرزانہ کو برداشت کرلے گی۔ میں دونوں کو برابر برابر چاہتا ہوں' دونوں سے برابر انصاف کروں گا مگر رخسانہ بیوی بن کر ایسا انصاف پسند نہیں کرے گی۔ جب بیوی کے رشتے سے خارج ہو جائے گی تو سب کچھ قبول کرلے گی۔"

جھورے نے قائل ہو کر کہا "درست کہتے ہو تمہاری بھی مجبوری ہے دونوں ہی تمہارے لیے ضروری ہیں تو ہیرا پھیری بھی ضروری ہوگئی ہے۔"

"اب بتاؤ' کیا کسی عالم کو جانتے ہو؟"

"ہاں! ادھر بنوری ٹاؤن کے پاس ایک مسجد ہے جہاں بہت سے عالم فتویٰ دیتے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔ وہیں چلتے ہیں۔"

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بنوری ٹاؤن کی مسجد کے سامنے پہنچ گئے۔ ٹیکسی کو لاک کرنے

کے بعد وہ دونوں مسجد کے اندر پہنچے۔ وہاں بہت سے بچے' جوان اور بوڑھے دور دور تک مصروف نظر آئے۔ کچھ لوگ کلام پاک کے مختلف سپارے کھول کر انہیں پڑھ رہے تھے۔ کچھ لوگ آپس میں بیٹھ کر کسی دینی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ جھورے نے ایک مولوی صاحب سے کہا "جناب! ہم ایک مسئلے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

اس مولوی نے ایک بڑے سے ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہاں تشریف لے جائیں آپ کو تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔"

وہ دونوں اس ہال میں پہنچے۔ ہال کے دروازے پر دارالافتاء لکھا ہوا تھا۔ وہ اندر گئے۔ اس ہال میں چاروں طرف کتنے ہی عالم دین بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے شاید اپنے اپنے مسئلے پر کچھ باتیں کر رہے تھے وہ دونوں ایک عالم صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ جانی نے کہا "جناب عالی! ہمارا ایک مسئلہ ہے۔"

عالم صاحب نے ایک کاغذ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جو بھی مسئلہ ہے اسے تفصیل کے ساتھ اس کاغذ پر لکھ دیں۔"

وہ دونوں کاغذ اور قلم لے کر ہال سے باہر آئے اور ایک جگہ بیٹھ گئے۔ جانی نے پوچھا "کیا لکھا جائے؟"

"وہی لکھو جو تم چاہتے ہو۔"

"یار! میں چاہتا ہوں کہ رخسانہ کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔"

وہ دونوں سوچنے لگے' پھر جانی نے لکھنا شروع کیا "محترم! مسئلہ یہ ہے کہ ایک لڑکی جس کا چہرہ تیزاب سے بگڑ گیا ہے' اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں آتا تھا پھر اس لڑکی رخسانہ کو ہسٹیریا کا مرض لاحق ہوگیا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ رخسانہ کی شادی کردی جائے مرض جاتا رہے گا۔ لہٰذا جب کوئی رشتہ نہیں آیا اور رخسانہ اس مرض کے حملوں سے ہوش و حواس کھونے لگی تو اس کے والدین نے جھوٹ اور فریب سے کام لیا۔ ایک لڑکے کو کسی قبول صورت لڑکی کی شکل دکھائی اور رخسانہ سے نکاح پڑھا دیا۔"

اتنا لکھنے کے بعد جانی نے جھورے سے پوچھا "یار پڑھ لو۔ رخسانہ کے خلاف تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں اسے مظلوم ظاہر کر رہا ہوں نا؟"

جھورے نے اسے پڑھنے کے بعد کہا "ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ آگے لکھو۔"

وہ لکھنے لگا "اس واقعے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لڑکا شرابی ہے سہاگ کی پہلی رات کو اس نے یہ تو سمجھا کہ لڑکی بدل گئی ہے لیکن نشے کی حالت میں اس نے ازدواجی وظیفہ ادا کیا۔ دوسری صبح اس نے ہوش میں آکر اس نکاح پر اعتراض کیا۔

لڑکے نے ایک اور حماقت کی۔ نکاح سے پہلے دلہن رخسانہ کے نام اپنا مکان لکھ دیا۔ مہر کی رقم پچاس ہزار روپے منظور کرلی۔ اب وہ نکاح پر اعتراض کرنے کے باوجود رخسانہ کو طلاق دینے کی جرات نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ایک تو وہ بے گھر ہوجائے گا۔ دوسرے مہر کی رقم ادا نہیں کرسکے گا۔ ایسی ہی الجھنوں میں وہ لڑکا اور رخسانہ ایک بچے کے والدین بن گئے اور اب وہ لڑکا اپنی بیوی رخسانہ اور بچے کے ساتھ راضی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔"

جھورے نے اسے پڑھتے ہوئے پوچھا "جب تم نے یہ لکھ ہی دیا ہے کہ راضی خوشی زندگی گزار رہے ہو تو پھر عالم دین سے کیا پوچھنے آئے ہو؟"

"بھئی میں آگے لکھ رہا ہوں' ذرا پڑھتے جاؤ۔"

پھر وہ لکھنے لگا "جناب عالی! سوالات یہ ہیں کہ لڑکے کو دھوکا دے کر جو نکاح پڑھایا گیا ہے کیا وہ جائز ہے؟ نکاح پڑھانے کے وقت رخسانہ کا نام اور ولدیت صحیح لکھائی گئی تھی۔

لڑکے سے جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے والے تین افراد ہیں دلہن رخسانہ اور اس کے ماں باپ۔ ان کا محاسبہ کیسے کیا جائے؟

کیا شریعت کی آڑ میں ایسے جھوٹ اور فریب کو برداشت کیا جاسکتا ہے؟

لڑکا اب دلہن رخسانہ سے راضی خوشی ہے اس کے باوجود کیا لڑکے کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اس نکاح کو فسخ کردے؟

اس مسئلے کا حل ہم یوں چاہتے ہیں کہ اب رخسانہ اور بچے کی زندگی برباد نہ ہو۔ رخسانہ کو معافی مل جائے اور وہ ازدواجی زندگی گزارتی رہے اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ جھوٹ بولنے والوں کو اور فریب دینے والوں کو سزا ملے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔"

اتنا لکھنے کے بعد انہوں نے وہ کاغذ مولوی صاحب کے حوالے کردیا پھر مسجد سے باہر آگئے۔ جانی نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیوں جھورے! میں نے ٹھیک لکھا ہے نا؟"

"ہاں' بالکل ٹھیک۔"

"میں نے کہیں رخسانہ کو الزام تو نہیں دیا؟"

"ہاں' نہیں دیا۔"

"میں تو رخسانہ کی بھلائی کے لیے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔"

"ہاں ہمارا فرض ہے۔"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔ بیشک فرض ادا کرنا چاہیے اور جو حقیقت ہے' اس کا علم رکھنا چاہیے لیکن حقیقت کا علم رکھنے کے پیچھے نیت کیا تھی؟ نیت یہ تھی کہ رخسانہ کی گردن پر چھری چلانے کا کوئی موقع ہاتھ آجائے۔ جب موقع مل جائے گا' تو وہ اس کی گردن سے چھری ہٹا کر اسے نئی زندگی دے گا پھر اس کے صلے میں چاہے گا کہ دوبارہ اس کے نکاح میں آنے سے پہلے وہ اسے ایک اور شادی کی اجازت دے دے۔ بات محض علم اور آگہی کی نہیں' نیت کی بھی ہوتی ہے۔

○☆○

رخسانہ اسپتال کے ایک بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ پٹیوں سے چھپا ہوا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے لیے تھوڑی سی جگہ رکھی گئی تھی۔ کھانے کے لیے منہ اور سانس لینے کے لیے نتھنے کھلے ہوئے تھے۔ حلق کے پاس جہاں ایک دو جگہ تیزاب کے چھینٹے پڑے تھے وہ ابھی نظر آرہے تھے۔ وہاں پلاسٹک سرجری نہیں ہوئی تھی ویسے وہ سرجری کے سب سے بڑے مرحلے سے گزر چکی تھی۔ ابھی چند چھوٹے چھوٹے مراحل باقی تھے۔

ڈاکٹر لوکیس مارکو نے آپریشن تھیٹر میں کہا تھا "بے بی! یو آر لکی۔ میرے پاس جتنے بھی کیس آتے ہیں' میں دو چار ماہ تک صرف ان کے چہرے کی اسٹڈی کرتا رہتا ہوں اور ابتدائی تیاریوں میں وقت صرف کرتا ہوں۔ تم پہلی لڑکی ہو جو ایک مہینے کے بعد ہی آپریشن کے مرحلے سے گزر رہی ہو۔ یہ محض اس لیے کہ تم پاکستان میں رہ کر میرے ابتدائی طریق کار کے مطابق عمل کرتی رہی تھیں اور اپنی تصویروں اور دیگر میڈیکل رپورٹ کے ذریعے میری مدد کرتی رہی تھیں۔"

بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کررہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل جائے گی لیکن چہرے کی پٹیاں اسی طرح رہیں گی۔ رفتہ رفتہ

وہ پٹیاں ہٹائی جائیں گی۔ چہرے کی اسٹڈی کی جائے گی یعنی چہرہ ایک ہی وقت میں پٹیوں
سے آزاد نہیں ہو گا۔ اس کے لیے کافی عرصہ لگے گا پھر یہ کہ ٹھوڑی کے نیچے حلق کے
پاس اور کان کے آس پاس بھی سرجری لازمی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سلسلے میں
ابھی اسے سات آٹھ ماہ تک لندن میں رہنا تھا۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔ اللہ بڑا کارساز ہے اور ایک سہارا چھوٹ جاتا ہے
تو دس سہارے بنا دیتا ہے' وہ اس وقت کی بات سوچ رہی تھی جب سید باقر علی کے ساتھ
اسپتال سے نکل کر اپنے سامان سمیت ایک زنانہ سینٹر میں گئی تھی وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا
کہ ایک پاکستانی خاتون سلمٰی قادر کا ذاتی اسپتال ہے اور اس خاتون کو ایک ایسی لیڈی
ڈاکٹر کی ضرورت ہے جس کا تعلق ایشیا کے کسی ملک سے ہو۔

یہ سنتے ہی باقر علی نے مسکراتے ہوئے کہا "چلو بیٹے! میں تمہیں سلمٰی قادر کے
اسپتال تک ابھی پہنچا دوں۔"

وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سلمٰی قادر کے یہاں پہنچے۔ وہ انہی کے انتظار میں بیٹھی
ہوئی تھیں لیکن انجان بنی ہوئی تھیں۔ باقر علی نے اپنا اور رخسانہ کا تعارف کرایا پھر اپنی
ضرورت کا اظہار کیا وہ اسی وقت رخسانہ کا انٹرویو لینے لگیں۔ اس کے متعلق معلومات
حاصل کرنے' اس کے تمام سرٹیفکیٹ اور ضروری کاغذات دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر
بولیں "مجھے تمہاری ہی جیسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ میں تمہیں پچیس پاؤنڈ فی ہفتہ دے
سکتی ہوں۔ تمہاری رہائش کے لیے یہاں ایک کمرا بھی مل سکتا ہے' کھانے کا انتظام بھی
ہو جائے گا اور ڈیوٹی کے اوقات یوں مقرر کر دیے جائیں گے کہ تمہاری پلاسٹک سرجری
میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔"

رخسانہ خوشی سے رونے لگی تھی اور ان کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ سلمٰی قادر نے
اس کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم میری بیٹی جیسی ہو۔ میں یہاں کی ایک میڈیکل
ایسوسی ایشن سے تمہارے لیے مالی امداد حاصل کروں گی جس کی نصف رقم تمہیں واپس
نہیں کرنی پڑے گی باقی آدھی رقم تم قسطوں میں ادا کر سکتی ہو۔"

رخسانہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ چشم زدن میں خود کو مکمل دیکھتے ہوئے
جانی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ تو پہلے ہی اس کا اسیر تھا۔ اب اس کے حسن سے اور زیادہ

مسحور ہو رہا تھا۔ رخسانہ نے خوشی سے باقر علی کا ہاتھ تھام کر کہا "پاپا! دیکھیے اللہ تعالیٰ
کس طرح سہارے پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو حوصلہ رکھنا چاہیے
اور اپنی مدد آپ کے طور پر کسی بھی مرحلے سے گزرنا چاہیے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھپتھپا کر کہا "ہاں بیٹے! تمہارے حوصلے
بلند ہیں۔ میری دعا ہے کہ تم کامیاب ہو کر یہاں سے واپس جاؤ' اچھا میں چلتا ہوں۔"

وہ اس سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس سے ملنے نہیں آئے۔ وہ
اسپتال کے مقررہ اوقات میں ڈیوٹی انجام دیتی تھی پھر اپنی پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں
اسپتال جایا کرتی تھی۔ نئی رہائش گاہ میں پہنچتے ہی اس نے اپنی امی کو اور جانی کو خط لکھ دیا
تھا۔ سلمٰی قادر کا پتا اور اس کا پوسٹ بکس نمبر بھی لکھ دیا تھا تاکہ وہ لوگ آئندہ اس نئے
پتے پر خط لکھیں۔

وہ اپنے والدین کو خصوصاً جانی کو اپنا دکھڑا سنا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس
نے سوچا جب واپس جائے گی تو روبرو تمام باتیں تفصیل سے بتائے گی۔ فی الحال خط کے
ذریعے پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری طرف جانی اور اس کی ساس نے بھی اپنے آپس
کے جھگڑوں کا ذکر خط میں نہیں کیا۔

جس ادارے سے اسے مالی امداد ملنا تھی وہاں ابھی کاغذی کارروائیاں جاری تھیں۔
امید تھی کہ امداد مل سکتی ہے۔ فی الحال وہ اپنے پلے سے رقم خرچ کر رہی تھی۔ اسی
دوران ڈاکٹر لوکیس مارکو نے کہا۔

"بے بی! تم نے مجھ سے ملازمت کے سلسلے میں کچھ کہا تھا۔ تم پلاسٹک سرجری کے
اخراجات اپنی ملازمت کے ذریعے پورے کرنا چاہتی ہو۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

"یس ڈاکٹر! میں رقم کے سلسلے میں کچھ پریشان ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں
پردیس میں ہوں۔"

"مجھے تمہاری پریشانیوں کا احساس ہے میرے پاس اشتہاری کمپنیوں کے لیے ایجنٹ
آتے ہیں انہیں نئے چہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاسمیٹکس بنانے والی کمپنیاں خصوصاً
مجھ سے رابطہ قائم کرتی ہیں۔ تم جانتی ہو کہ نئے چہرے تو وہی ہوتے ہیں جو پہلی بار جنم
لیتے ہیں لیکن وہ بچے ہوتے ہیں اور ان کمپنیوں کو جوان مردوں یا جوان عورتوں کی

ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت صرف میرے ذریعے پوری ہو سکتی ہے کیونکہ میں کسی کی جوان العمری میں اس کا چہرہ نیا بنا دیتا ہوں۔ جیسا کہ تمہارا چہرہ بن رہا ہے۔ کیا تم ماڈل گرل بننا پسند کرو گی؟"

رخسانہ نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے کہا "یہ ہمارے ہاں برا سمجھا جاتا ہے اگرچہ ماڈل بننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے مگر ہمارے یہاں کا ماحول اور سوسائٹی عجیب ہے۔"

"میں تمہارے ہاں کی سوسائٹی کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔ میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ معاوضے کے طور پر بہت بڑی رقم دیتے ہیں اتنی رقم کہ تمہاری پلاسٹک سرجری کے اخراجات بھی پورے ہو جائیں گے۔ تم یہاں سے دنیا جہاں کی شاپنگ کر کے جاسکو گی اور اپنے ساتھ کچھ رقم بھی لے جاسکو گی۔"

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بیٹھے بٹھائے آمدنی کی صورت نکل آئے گی لیکن جانی کی طرف سے ڈر تھا۔ وہ شاید اس کام کو پسند نہ کرتا۔ اس نے پوچھا "ڈاکٹر! آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اشتہاری کمپنی والے مجھے ماڈل کے لیے پسند کریں گے؟"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا "میں نے تمہارے تمام گراف اسکیچ اور وہ تصاویر دکھائی ہیں جنھیں میں نے اپنے طور پر فوٹوگراف کیا ہے۔ وہ لوگ تصویر دیکھ کر تمہارے حسن سے بے حد متاثر ہیں اور تمہیں بڑی سے بڑی قیمت دے کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ انہیں کاسمیٹکس کے لیے مشرقی لڑکی کی ضرورت ہے جو پاکستانی یا انڈین لباس پہنتی ہو۔ یہ لوگ اپنے آئیٹمز کو مشرقی ممالک میں پہنچانا چاہتے ہیں۔"

"وہ مجھے زیادہ سے زیادہ کتنا معاوضہ دیں گے؟"

"یہ میں کہہ نہیں سکتا۔ تم ان سے ملاقات کرنا چاہو تو اپنا پتا اور ملاقات کا وقت نوٹ کرا دو۔ میں انہیں اطلاع دے دوں گا۔ وہ تمہارے پاس آکر معاملات طے کرلیں گے۔"

دوسرے دن صبح اس کی رہائش گاہ پر چار افراد ملنے آئے ان میں ایک انگریز عورت اور دو انگریز مرد تھے۔ چوتھا ایک پاکستانی شخص تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "مجھے حسن مراد کہتے ہیں' یہ مسز ہاک اور یہ مسٹر ڈیوڈ ہاک اور یہ مسٹر رچرڈ ہیں۔"

رخسانہ نے صرف مسز ہاک سے مصافحہ کیا۔ باقی تعارف کے دوران وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی ہوئی اک ادائے ناز سے ان لوگوں کو آداب عرض کرتی رہی۔ مسٹر ڈیوڈ ہاک نے خوش ہو کر کہا "کیا خوب انداز ہے۔ ہمیں ایسی ہی مشرقیت کی ضرورت ہے۔"

رخسانہ نے سب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان کے بیٹھتے ہی سلمیٰ قادر نے کافی کی پیالیاں بھجوا دیں۔ وہ رخسانہ کا بہت خیال رکھتی تھیں اور یہ جانتی تھیں کہ کچھ لوگ اشتہاری معاملات میں رخسانہ سے بات کرنے آرہے ہیں۔ حسن مراد نے رخسانہ سے کہا "آپ بہت ہی خوش قسمت ہیں کہ لندن کی اتنی بڑی کاسمیٹکس کمپنی آپ میں دلچسپی لے رہی ہے اور آپ کو ماڈل کے طور پر پیش کرنا چاہتی ہے ورنہ یہاں ایک سے ایک حسین لڑکیاں پڑی ہیں۔"

رخسانہ نے مسکرا کر کہا "آپ میری خوش قسمتی کی بات نہ کریں۔ اگر میں اتنی خوش قسمت ہوں تو آپ لوگ اس کمپنی سے کہئے کہ وہ میرے موجودہ چہرے کی ماڈلنگ کریں۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ حسن مراد نے جھینپ کر کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ آئندہ آپ خوب صورت بننے والی ہیں۔ اس کی ماڈلنگ کی جائے گی۔ اس وقت آپ خوش قسمت ہوں گی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کمپنی کو میری خوش قسمتی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف میرے اس چہرے سے تعلق ہے جو ابھی بننے والا ہے۔"

"ہاں بات تو ایک ہی ہوئی۔"

"بات ایک کہاں ہوئی۔ آپ لندن کی ایک بہت بڑی کاسمیٹکس کمپنی سے مجھے مرعوب کرنے کے لیے خوش قسمت کہہ رہے ہیں اور میں عرض کر رہی ہوں کہ میں خوش فہمی میں مبتلا ہونے والی عورت نہیں ہوں۔"

حسن مراد نے اردو زبان میں کہا "بہتر ہے ہم اپنی زبان میں کچھ اہم باتیں کرلیں۔"

رخسانہ نے پوچھا "وہ اہم باتیں کیا ہیں؟"

"یہی' اس ماڈلنگ کے سلسلے میں۔"

"مجھے یہ تو معلوم ہو کہ آپ کا اس کمپنی سے کیا تعلق ہے؟"

"میں ماڈل تلاش کرتا ہوں اور کمپنیوں سے ان کا رابطہ قائم کراتا ہوں۔"

"آپ ایک درمیانی آدمی ہیں۔ جب کہ کمپنی کے لوگ براہ راست میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں' تو کیوں نہ میں ان سے ہی بات کروں؟"

حسن مراد نے کہا "دیکھیے' آپ کی ذہانت کا تو میں قائل ہوگیا ہوں لیکن میں آپ کو تھوڑی سی ذہانت اور دے دوں اور وہ یہ کہ ہم ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں۔ جو بھلائی میں آپ کے لیے کرسکوں گا۔ وہ پرائے دیس کے لوگ نہیں کرسکیں گے۔"

"چلیں اچھی بات ہے کہ آپ میری بھلائی کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایئے۔"

"آپ ہزاروں میل دور تنہا آئی ہیں۔ یہاں آپ کے اخراجات بہت زیادہ ہیں میں نے ڈاکٹر سے معلوم کیا ہے۔ آپ کی پلاسٹک سرجری کے سلسلے میں کم از کم پاکستانی ایک لاکھ خرچ ہوں گے۔ یعنی آپ کو یہاں ساڑھے پانچ یا چھ ہزار پاؤنڈ کی ضرورت ہے۔ میں چھ ہزار پاؤنڈ میں آپ کا معاہدہ کرادوں گا۔ میرا کمیشن بعد میں طے ہوجائے گا۔"

"بعد میں کیوں؟ ابھی طے کرلیں۔ میں پوری طرح اس معاملے کو سمجھنا چاہتی ہوں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولا "یہ ہماری آپس کی بات ہے' آپ میری ہم وطن ہیں۔"

وہ بولی "آپ مجھے ہم وطن نہ کہیں۔ اگر کہتے ہیں تو آپ کو مجھ سے ایک پنس بھی نہیں لینا چاہیے بلکہ مزید امداد پہنچانا چاہیے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں بھی لندن میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے اپنے بھی اخراجات ہیں۔ میں کچھ اسی طرح کماتا ہوں۔"

"بے شک آپ کماتے ہوں گے لیکن میرا آپ کا تعلق کیا ہے۔ میں آپ کو اپنے درمیان کیوں لاؤں۔ آپ کا کمیشن خواہ ایک پنس بنتا ہوں یا ایک ہزار پاؤنڈ بنتا ہو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے معاملات میں آپ کی ضرورت کیا ہے؟"

وہ فخریہ انداز میں مسکرا کر بولا "میرے بغیر یہ معاملات طے نہیں ہوسکیں گے۔"

"ٹھیک ہے آپ اپنے لوگوں کو یہاں سے لے جائیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا آپ چھ ہزار پاؤنڈ جیسی رقم چھوڑ

دیں گی جب کہ آپ کو یہاں قدم قدم پر ایک ایک پنس کی ضرورت ہے۔"

"میں اپنی ضرورت کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں نے ڈاکٹر لوئیس مارکو سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں ماڈلنگ میں دلچسپی نہیں رکھتی ہوں۔"

پھر اس نے اپنے انگریز مہمانوں کی طرف منہ کرکے کہا "مسٹرہاک! مجھے افسوس ہے کہ یہ حسن مراد صاحب جو معاملات طے کرنا چاہتے ہیں میں ان سے بالکل متفق نہیں ہوں اور میں یہ بات آگے نہیں بڑھانا چاہتی۔"

مسزہاک اور دوسرے مہمانوں نے تعجب سے حسن مراد کی طرف دیکھا۔ حسن مراد بوکھلا گیا' جلدی سے بولا "یہ مس رخسانہ کچھ ناراض ہوگئی ہیں۔ ابھی انہیں منالیتا ہوں۔"

مسزہاک نے کہا "آپ اپنی زبان میں کیوں منا رہے ہیں۔ انگریزی میں گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ ہم سب معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ باتیں کیا ہورہی ہیں؟"

رخسانہ نے کہا "آپ درست کہتی ہیں ہمیں اسی زبان میں گفتگو کرنی چاہیے۔"

مسٹررچرڈ نے کہا "دراصل ہم مسٹر حسن مراد کو اس لیے لائے ہیں کہ آپ ایک پاکستانی خاتون ہیں۔ ہم نے سوچا شاید آپ ہماری زبان اچھی طرح بول نہیں سکیں گی لیکن آپ تو فرفر بول رہی ہیں۔"

مسزہاک نے کہا "بہتر ہے کہ ہم بات شروع کریں۔ ہم آپ کو اپنے اشتہارات کے سلسلے میں انگیج کرنا چاہتے ہیں۔ انگیج منٹ کی صورت یہ ہوگی کہ ہم معاوضہ طے کریں گے' اس کے بعد آپ ہمارے اختیار میں ہوں گی۔ ہم آپ کو کیمرے کے ذریعے جس طرح ڈیولپ کرنا چاہیں گے کریں گے۔"

رخسانہ نے انکار میں سرہلا کر کہا "اول تو میں ابھی ماڈلنگ کے لیے راضی نہیں ہوں پہلے اپنے شوہر سے اجازت لوں گی۔ اس کے بعد ہاں کروں گی اور ہاں کرنے کے لیے چند شرائط ہوں گی۔ وہ شرائط آپ پہلے سے سن لیں۔ میں کیمرے کے سامنے کوئی ایسا لباس نہیں پہنوں گی جس سے بے حیائی ظاہر ہو اور فوٹوگراف کے لیے کوئی ایسا پوز نہیں دوں گی جس سے میں خود اپنی نظروں سے گر جاؤں۔ تیسری بات یہ کہ میرا فوٹوگراف کسی مرد کے ساتھ ہو تو میں اس کے ساتھ بیٹھ کر' کھڑے ہو کر' چلتے پھرتے تصویریں اتروالوں گی'

لیکن اسے اپنی انگلی پکڑنے کی بھی اجازت نہیں دوں گی۔ آپ لوگ غور کرلیں منظور ہو تو بات آگے بڑھے گی ورنہ یہیں ختم ہو جائے گی۔"

حسن مراد نے کہا "شاید ڈاکٹر لوئیس مارکو نے آپ کو پہلے ہی یہ بتادیا ہے کہ کمپنی والے آپ کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں' اسی لیے آپ ایسی شرائط پیش کررہی ہیں۔ کچھ تو سوچیے لباس کے ذریعے مختلف پوز کے ذریعے اور ایکشن کے ذریعے اگر ماڈلنگ میں دلکشی نہ پیدا کی جائے تو ماڈلنگ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔"

"مسٹر حسن مراد! دل کشی سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق مغرب میں ماڈلنگ کا انداز عریانیت کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔"

"دیکھیے مس رخسانہ!...."

"میں نے کہا ہے کہ میں اپنے شوہر سے اجازت حاصل کروں گی اس طرح سمجھ لینا چاہیے کہ میں مس نہیں مسز ہوں۔"

سوری مسز رخسانہ! جسے آپ عریانیت سمجھتی ہیں وہ نئے دور کے تقاضے ہیں' ایک آرٹ ہے۔ دقیانوسی قسم کے لوگ اسے عریانیت سمجھتے ہیں۔"

"اچھا۔ تو یہاں آنے والی پاکستانی لڑکیوں کو آپ یہی سمجھتے ہیں اور ہمارے ہم وطن بھی بنتے ہیں۔"

"دیکھیے آپ کی باتوں میں طنز ہے۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ آپ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ آپ ہمارے درمیان مداخلت نہ کریں۔ میں کمپنی کے لوگوں سے براہ راست گفتگو کررہی ہوں۔"

ڈیوڈ ہاک نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں آپ سے بات کرتا ہوں۔ ڈاکٹر لوئیس مارکو نے آپ کا فوٹو گراف دکھایا ہے اور اس بات کا یقین دلایا ہے کہ آپ فوٹو گراف سے بھی زیادہ حسین نظر آئیں گی۔ اتنا اندازہ ہمیں بھی ہو چکا ہے۔ ہم آپ کو معاوضے کے سلسلے میں مایوس نہیں کریں گے۔ آپ ہمیں مایوس نہ کریں۔ آپ کی شرائط اگرچہ سخت ہیں لیکن مشرق کی ایک آئیڈیل بیوی کو پیش کرنے کے لیے ہم نے جو اسکرپٹ تیار کیے ہیں اس کے مطابق عریانیت تو نہیں ہے لیکن ہیرو کے ساتھ فری کمنگ ہے۔"

"میں ایسا کوئی رومانی سین نہیں کرسکتی جس میں ہیرو میرا ہاتھ پکڑے۔ میرے شوہر

نے ایسا کوئی سین دیکھ لیا تو وہ مجھ کو قتل کردیں گے اور ہیرو کو تلاش کرتے ہوئے لندن پہنچ جائیں گے پھر یہ کہ میں اس وقت تک ایگری منٹ سائن نہیں کروں گی جب تک اپنے شوہر سے اجازت نہ لے لوں۔"

"یعنی آپ پاکستان خط لکھیں گی' پھر جواب آئے گا۔ اس کے بعد معاہدے پر دستخط ہوں گے اس میں تو بڑا وقت لگے گا۔"

رخسانہ نے پوچھا "اس میں وقت کا کیا سوال ہے۔ میری پلاسٹک سرجری میں کم از کم آٹھ دس مہینے لگ جائیں گے۔ آپ اتنا تو انتظار کریں گے؟"

"وہ تو ہم ضرور کریں گے لیکن جب معاہدہ ہو جائے گا تو ہم آپ کے چہرے اور قدو قامت کے مطابق اسکرپٹ میں تبدیلیاں کریں گے۔ اس کے مطابق بہت سی تیاریاں ہوں گی۔ آپ کے لباس تیار کرائے جائیں گے۔ جب تک آپ کے چہرے سے آخری پٹی نہیں ہٹائی جائے گی اس وقت تک آپ کے لیے ایسے لوگوں کو اور عورتوں کو مقرر کیا جائے گا جو آپ کو اٹھنے' بیٹھنے اور چلنے کے دل فریب انداز سکھائیں گے' آپ کے بولنے کا انداز بھی بدلا جائے گا اور بھی بہت سی ابتدائی تیاریاں ہوں گی۔"

"کچھ بھی ہو' مجھے شوہر سے اجازت لینی ہوگی۔"

"کیا آپ کے پاکستانی گھر میں ٹیلی فون ہے؟"

"میرے گھر میں نہیں ہے لیکن ایک پڑوسی کے گھر ٹیلی فون ہے اس کا نمبر مجھے یاد ہے۔"

"وہ نمبر آپ ہمیں دیں۔ ہم یہاں سے ٹرنک کال کے ذریعے آپ سے رابطہ قائم کراتے ہیں۔ آپ اپنے شوہر سے اجازت لے لیں۔"

"میرے شوہر گھر میں موجود نہیں رہتے۔ پہلے ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دینی ہوگی۔ پھر وہ کسی وقت آئیں گے تو اس کے بعد باتیں ہوں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ٹرنک کال کے جو بھی اخراجات ہوں' آپ جتنی دیر چاہیں گفتگو کریں اور جتنی بار چاہیں گفتگو کریں لیکن دو چار روز میں اس معاملے کو طے ہو جانا چاہیے اور معاہدے پر دستخط ہو جانے چاہئیں۔"

وہ بولی "آپ جلدی بولتے بھی ہیں اور جلدی معاملات بھی طے کرلینا چاہتے ہیں

معاوضے کا کیا ہوگا؟"

ہم آپ کو مڈل ایسٹ اور فار ایسٹ کے تمام معاملات میں اپنے آئیٹمز کی پبلسٹی کے لیے پیش کریں گے اس کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ ہزار پونڈ دے سکتے ہیں۔"

رخسانہ نے حسن مراد کی طرف دیکھا اور پھر انگریزی میں کہا "شاید آپ لوگ اردو کی تھوڑی بہت گنتی جانتے ہیں' اسی لیے حسن مراد نے جو پیشکش کی وہ آپ بھی کر رہے ہیں مجھے یہ منظور نہیں ہے۔"

"آپ اپنا معاوضہ بتائیں۔"

"میں کم از کم بارہ ہزار پاؤنڈ لوں گی۔"

"مسٹر ڈیوڈ ہاک ایک گہری سانس لے کر سیدھے بیٹھ گئے پھر مسکراتے ہوئے کہا "یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"میرے لیے بہت کم ہیں۔ آپ حساب لگائیں مڈل ایسٹ اور فار ایسٹ میں کتنے ممالک ہیں۔ ہر ملک میں سیکڑوں شہر اور قصبے ہیں۔ آپ کا مال ہر جگہ میرے چہرے کی پبلسٹی کے ذریعے بکتا رہے گا۔ اگر آپ یوں حساب نہیں کرنا چاہتے تو یوں کیجیے کہ میں پاکستان سے یہاں آئی ہوں۔ میرے رہنے سہنے' کھانے پینے' گھومنے پھرنے کے اخراجات ہیں۔ اس لحاظ سے کیا بارہ ہزار پونڈ زیادہ ہیں؟"

اسی شام رخسانہ کے بتائے ہوئے فون نمبر پر ٹرنک کال بک کرائی گئی۔ اسی نمبر پر پہلے یہ پیغام ارسال کیا گیا کہ جانی کو فون پر بلایا جائے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد دوبارہ رابطہ قائم کیا گیا۔ اس بار جانی کی آواز سنائی دی' وہ بہت خوش تھا۔ رخسانہ سے کہہ رہا تھا "مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی دور سے تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ تم کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں بہت مزے میں ہوں۔ تمہیں اور کامی کو یاد کرتی رہتی ہوں۔ جانی! ٹرنک کال کے ذریعے اتنی دور سے باتیں کرنے کے اخراجات بہت ہوتے ہیں۔ میں ایک کمپنی کے ذریعے تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ اس سلسلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اگر تم ناراض نہ ہو اور مجھے صحیح مشورہ تو دو میں اس پر عمل کروں گی۔"

پھر وہ اس معاہدے کے متعلق بتانے لگی۔ جانی چپ چاپ سنتا رہا پھر اس نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اجازت دینا چاہیے یا نہیں اپنی گھر والی کی تصویریں رسالوں

میں چھپیں اور فلموں میں آئیں تو اچھا نہیں لگتا ہے لیکن مجھے اچھا لگتا ہے اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھا کیوں لگتا ہے اور اچھا کیوں نہیں لگتا۔"

رخسانہ نے کہا "تم یہ سوچتے ہو گے کہ فلموں میں دوسرے لوگ مجھے دیکھیں گے یا میں کسی غیر مرد کے ساتھ نظروں آؤں گی شاید اسی لیے اچھا نہیں لگتا۔"

"ہاں' یہی بات ہے۔"

"اگر مجھے اجازت دو گے تو میں کسی مرد کے ساتھ فلم میں نظر تو آؤں گی لیکن اسے اپنا ہاتھ بھی نہیں پکڑنے دوں گی۔ میں سر سے پاؤں تک صرف تمہاری ہوں۔"

"پھر تو کوئی بات نہیں۔ تم شوق سے فلم میں آؤ۔ میں سینہ ٹھونک کر دوستوں کو بتاؤں گا دیکھو میری بیوی کتنی حسین ہے لیکن ذہین ہے' کتنی پڑھی لکھی ہے کیسی باتیں کرتی ہے اور اس کی شہرت دور دور تک ہے۔"

رخسانہ نے خوش ہو کر کہا "جانی! تو میں سمجھوں کہ تمہاری طرف سے اجازت ہے؟"

"ابھی میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اجازت دے کر اچھا کر رہا ہوں یا غلطی کر رہا ہوں مگر اتنا جانتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو' کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے بعد میں مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔"

"میں بہت سوچ سمجھ کر معاہدے پر دستخط کروں گی۔ تم ذرا امی سے بات کراؤ۔ اس کے بعد میں پھر تم سے بات کروں گی' وہیں فون کے پاس رہنا۔"

چند لمحوں کے بعد اسے اپنی امی کی آواز سنائی دی۔ سلام دعا کے بعد اس نے کہا "امی مجھے میرے بیٹے کی آواز سنایئے۔"

انہوں نے کہا "بیٹا! یہ میری گود میں ہے مگر چپ ہے۔ مسکرا رہا ہے' اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔"

پھر ان کی آواز ایسی آنے لگی جیسے نواسے کو بولنے پر مجبور کر رہی ہوں۔ رخسانہ نے پوچھا "امی سب خیریت تو ہے؟ آپ جانی سے لڑائی تو نہیں کرتی ہیں؟"

"کیا' میں ہی لڑائی کرتی ہوں! اتنی دور جا کر بھی مجھے الزام دے رہی ہو ویسے تم فکر نہ کرو۔ میں اور جانی بہت اچھی طرح میل ملاپ سے رہتے ہیں۔"

"امی! اس بات کا جواب ہاں یا نہیں میں دیجئے۔ کیا وہ فرزانہ سے مل رہے ہیں؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی' پھر آواز آئی "میں ہاں یا نہ میں جواب نہیں دے سکتی میں نے آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے تو جواب کیا دوں؟"

دوسری طرف سے رخسانہ نے جانی کی آواز سنی۔ وہ ریسیور کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس کی امی سے بول رہا تھا "یہ ہاں اور نہ والی کیا بات ہے؟ آپ نے آنکھوں سے کیا نہیں دیکھا ہے! اتنی بڑی بڑی تو آنکھیں ہیں آپ کی۔ کیا اب اپنی بیٹی سے کہیں گی کہ میں آپ کے لیے عینک بنوا دوں۔"

"امی آپ ریسیور جانی کو دیجئے۔"

جانی نے ریسیور لے کر ہیلو کہا۔ رخسانہ نے پوچھا "تم ابھی امی سے لڑائی کر رہے تھے؟"

"تینوں وقت گھر میں کھانا کھاتا ہوں۔ تمہاری امی کی خدمت کرتا ہوں' ان کے سر سے جوئیں نکالتا ہوں تمہیں یقین نہیں ہے تو پوچھ لو۔"

"میں کسی سے نہیں پوچھوں گی' تم سچ سچ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"کیا فرزانہ سے ملتے ہو؟"

ایک لمحے کی خاموشی رہی' پھر وہ جھجکتے ہوئے بولا "نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں کیسے ملوں گا۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ وہ کہاں رہتی ہے مجھے کیا معلوم ہے؟"

"جانی' تم کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے ہو نا۔"

"ہاں' نہیں بولتا ہوں۔"

"میری قسم کھا کر بولو۔"

"تمہاری قسم! میں فرزانہ سے نہیں ملتا ہوں۔"

"ہم دونوں کے کامران کی قسم کھا کر بولو۔"

"خواہ مخواہ قسم کھلا رہی ہو میں فرزانہ سے نہیں ملتا۔ میری بات کا یقین کر لو۔"

"نہیں جانی! کامران کی قسم کھاؤ۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "میں کامران کی قسم کھا کر بولتا ہوں کہ میں اس سے مل ہی

نہیں سکتا۔ اس کے دروازے پر تو تالا...."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ رخسانہ نے جلدی سے کہا "ہاں فرزانہ کہیں گئی ہوگی۔ سکھر میں اس کے چچا رہتے ہیں اسی لیے دروازے پر تالا پڑا ہوگا۔"

"نہیں' میں فرزانہ کی بات نہیں کر رہا تھا۔ دراصل وہ جو تالا...."

"ہاں' اب جھوٹ بولو۔ دیکھو جانی میں رو رو کر جان دے دوں گی۔ اگر تم نے اسے پالیا ہے' اسے اپنا بنانا چاہتے ہو تو مجھے صاف صاف بتا دو۔ میں اتنی دور ہوں' اپنی جان دے کر تمہارے لیے دوسری شادی کا راستہ ہموار کر دوں گی۔ تم پر الزام نہیں آئے گا اور میں مر جاؤں گی۔"

"رخسانہ! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری زندگی چاہتا ہوں' تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ تم اتنی دور رہ کر اپنے آپ کو ذرا بھی نقصان پہنچاؤ گی تو سوچو کہ ہمارے کامران کا کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنی ماں کے بغیر رہے گا؟ نہیں رخسانہ! ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

"تم میرے ہو تو سچ سچ بول دو۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ پردیس میں اپنی حفاظت کرو گی' اپنی صحت کا خیال رکھو گی اور ہنسی خوشی واپس آؤ گی۔ وعدہ کرو میں سچ بولوں گا تو ناراض نہیں ہو گی۔"

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا تو سنو' فرزانہ سے ملاقات ہو گئی ہے لیکن تین ہفتے سے اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے۔"

"کیا تم نے اسے پریشان کیا تھا؟"

پھر ایک لمحے کی خاموشی رہی' اس کے بعد بولا "نہیں۔ معلوم نہیں کیوں وہ چلی گئی۔"

"میں جانتی ہوں وہ کیسی لڑکی ہے۔ تم سے ملنا نہیں چاہتی ہوگی اور تم اسے مجبور کر رہے ہو گے۔"

"تم مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ہماری باتیں اندازے سے معلوم کر لیتی ہو۔ بات اصل میں یہی ہے۔ وہ مجھ سے کترا رہی تھی۔ میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

اس کے دروازے کے پاس چھ راتوں تک ٹیکسی میں بیٹھا رہا۔ تب وہ پریشان ہو گئی اور ایک دن مجھ سے ملاقات کی دوسرے دن غائب ہو گئی۔"

"جانی! یہ بہت بری بات ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے اس نے جان بوجھ کر تمہیں دھوکا نہیں دیا ہے اگر دیا بھی ہے تو سوچو کہ یہ دھوکا کتنا خوب صورت ہے۔ اس نے ہمیں ملا دیا۔"

"ٹھیک ہے' اب میں اس کے گھر کی طرف نہیں جاؤں گا۔ اسے پریشان نہیں کروں گا۔"

"ہاں جانی! میرا انتظار کرو۔ اپنے بچے کی خاطر سوچو۔ کوئی غلط قدم اٹھاؤ گے تو ہمارے بچے کے مستقبل پر اثر پڑے گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک سمجھاتی رہی پھر اس نے کہا "ٹرنک کال پر زیادہ باتیں کرنا مناسب نہیں ہے میرے روئیں روئیں کا پیار قبول کرو اور ریسیور امی کو دے دو' میں اب ریسیور رکھنے ہی والی ہوں۔"

اس کی امی کی آواز سنائی دی تو اس نے کہا "امی! مجھے سب پتا چل گیا ہے آپ بہت سی باتیں چھپا رہی ہیں۔ فون پر باتیں کرنے کا وقت بھی نہیں ہے اور جانی بھی وہاں کھڑے ہوئے ہیں لہٰذا آپ فوراً ہی خط میں سچی سچی باتیں لکھیں۔ کوئی بات مجھ سے نہ چھپائیں۔ میرے کاکی کو میرا بہت سا پیار دیں اور ابو کو میرا اسلام کہہ دیں' خدا حافظ۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن معاہدے پر دستخط ہوئے۔

کمپنی والوں نے رخسانہ کی تمام شرائط منظور کر لیں۔ اپنی طرف سے یہ لکھوا لیا کہ فی الحال ایک ہزار پونڈ پیشگی دیے جا رہے ہیں۔ اگر ڈاکٹر لوئیس مارکو کی پیش گوئی کے مطابق وہ حسن کا شاہکار نہ بن سکی تو یہ معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ پیشگی رقم ناقابل واپسی ہے البتہ چہرہ خاطر خواہ مکمل ہو گا تو معاہدے کی آدھی رقم ماڈلنگ سے پہلے ادا کر دی جائے گی۔ باقی آدھی رقم وہ کام کے دوران حاصل کرے گی۔ معاہدے کا انحصار چہرے کی تکمیل پر تھا۔

اور اب وہ پلاسٹک سرجری کے پہلے مرحلے سے گزر کر اسپتال کے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اس کا چہرہ ڈاکٹر لوئیس مارکو کی پیش گوئی کے مطابق مکمل ہو گا یا نہیں' یہ خدا ہی جانتا

تھا۔ ڈاکٹر کو اپنے آپ پر بڑا اعتماد تھا۔ بہرحال آنے والا وقت ہی اسے آئینہ دکھا سکتا تھا۔

ابھی وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ جانی اور فرزانہ کی ملاقاتوں کا کیا کیا جائے؟

یہ تو اچھا ہی ہوا کہ ٹرنک کال پر گفتگو ہو گئی تھی اور جانی کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ اگرچہ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ فرزانہ کے پیچھے نہیں جائے گا لیکن وہ یقین نہیں کر سکتی تھی وہ ہزاروں بار وعدے کر چکا تھا اور بار بار اس کے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ اب تو اس نے فرزانہ کا گھر بھی دیکھ لیا تھا۔

ویسے رخسانہ کو فرزانہ پر بڑا پیار آیا۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ فرزانہ تین ہفتے سے اپنے گھر کے دروازے پر تالا ڈال کر یقیناً سکھر گئی ہو گی۔ ورنہ بے چاری اور کہاں جا سکتی تھی۔ جانی اسے پریشان کر رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ فرزانہ بھی یہاں چلی آتی اور اسے ملازمت مل جاتی وہ سلمیٰ قادر کے ہاں جو ملازمت کر رہی تھی وہی ملازمت فرزانہ کو دے سکتی تھی' اب اسے اپنی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ ایک بڑے معاہدے پر دستخط کر چکی تھی۔

وہ سوچ میں گم تھی' اچانک جمشید کی آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اپنے اوپر چادر ڈال لی۔ سر گھما کر اس کی طرف نہیں دیکھا جمشید نے کہا "میں بہت شرمندہ ہوں۔ تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ یوں تو بہت پہلے آ جاتا لیکن پاپا نے منع کیا تھا کہہ رہے تھے کہ تم بہت غصے میں ہو مجھے تمہارے پاس نہیں جانا چاہیے۔ میں نے بہت دنوں تک برداشت کیا۔ شاید ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر رخسانہ نے آہستگی سے کہا "میں تمہیں معاف کرتی ہوں تم مجھے معاف کر دو۔ میں نے بھی تم سے جھوٹ کہا تھا۔ میرے جھوٹ کو سچ سمجھ کر تم نے مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔"

"جو کچھ ہوا' اسے ہم دونوں ہی بھول جائیں تو بہتر ہے۔"

"میں بھول چکی ہوں۔"

"میں تمہارے کام آنا چاہتا ہوں جو غلطی کی ہے اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جب ہم بھول ہی چکے ہیں تو پھر کس غلطی کی بات کر رہے ہو؟ کس بات کی تلافی کرو گے؟"

"وہ بات ختم ہو چکی ہے۔ میں نئے سرے سے تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔"

"شکریہ۔ اب میں کسی کی محتاج نہیں رہی۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر جمشید نے کہا "میں پاکستان جا رہا ہوں۔"

وہ چونک گئی۔ ایک دم سے اسے جانی کا اور فرزانہ کا خیال آیا۔ اس نے پوچھا

"کب جا رہے ہو؟"

"شاید اگلے ماہ جاؤں گا۔ وہاں کچھ عرصے تک رہوں گا۔"

رخسانہ نے پوچھا "تم فرزانہ کو اچھی طرح جانتے ہو؟"

"کون فرزانہ، تمہاری سہیلی؟"

"ہاں، کیا وہ خوب صورت نہیں ہے؟"

"ہاں، وہ بھی خوب صورت ہے۔"

"کیا تم اس سے شادی کرو گے؟"

اس نے چونک کر رخسانہ کو دیکھا پھر کہا "یقیناً وہ خوب صورت ہے۔ ڈاکٹر بن چکی ہو گی۔ کیا اس کی شادی نہیں ہوئی ہے؟"

"نہیں۔ میں چاہتی ہوں اس کی شادی ہو جائے یا پھر وہ پاکستان چھوڑ کر یہاں آجائے۔ اگر تم اسے اپنی طرف مائل نہ کر سکو تو کیا میری خاطر اسے یہاں ملازمت دلا سکتے ہو؟"

وہ الجھے ہوئے ذہن سے سوچنے لگا اور رخسانہ کو دیکھنے لگا، اس نے پوچھا "میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں تمہاری خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں مگر یہ کیا بات ہوئی، تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ وہ یہاں آکر ملازمت کرے یا شادی کر لے۔"

"جمشید! ابھی تم نے کہا ہے کہ میرے کام آنا چاہتے ہو۔"

"ضرور۔ میں اسے ملازمت دلاؤں گا۔ اگر تم چاہتی ہو اور وہ راضی بھی ہو جائے تو شادی بھی کر لوں گا مگر قصہ کیا ہے؟"

"میں بعد میں بتا دوں گی۔"

"رخسانہ! جب میں پاکستان جاؤں گا تو وہاں کسی نہ کسی طرح معلوم کر لوں گا۔ بہتر

ہے کہ تم ابھی بتا دو۔"

رخسانہ نے سوچا۔ یہ وہاں جائے گا تو جانی اور فرزانہ کا عشق چھپا نہیں رہے گا، وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "میرا چہرہ بگڑ گیا تھا جانتے ہو میری شادی کیسے ہوئی؟"

جمشید نے انکار میں سر ہلا کر کہا "تم نے بتایا ہی نہیں تھا۔ میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ تمہارا شوہر کون ہے۔"

رخسانہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی پوری داستان سنانے لگی۔ جمشید توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ بظاہر بہت سنجیدہ تھا مگر دل ہی دل میں خوشی سے کھل رہا تھا۔ اچھا! تو وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ بڑا خوش قسمت ہے کہ فرزانہ اس پر مرتی ہے۔ بڑا خوش نصیب ہے کہ یہ بھی اس پر جان دیتی ہے۔ دو ہیروئن کا ایک ہیرو۔ ٹھیک ہے، میں پاکستان تو جا ہی رہا ہوں، دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔ میں جو کچھ بھی کر سکا، کروں گا۔ رخسانہ تمہارے لیے کروں گا۔ فرزانہ خواہ کتنی ہی حسین ہو میرا مطالبہ حسن نہیں ہے۔ میرا مطالبہ جوانی بھی نہیں ہے۔ میرا مطالبہ تم ہو۔ تم میری ضد ہو۔ میری انا کے لیے ایک چیلنج ہو۔ میں تمہیں حاصل کیے بغیر دوستوں کے درمیان سر اٹھا کر نہیں چل سکوں گا اور کتنی توہین آمیز بات ہے کہ تم مجھ پر ایک ٹیکسی ڈرائیور کو ترجیح دے رہی ہو۔ ٹھیک ہے، میں پاکستان جا رہا ہوں تمہارے لیے رخسانہ! تمہارے لیے۔"

O☆O

جانی کلینک کے سامنے پہنچا تو خوش ہو گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ٹیکسی کو سڑک کے دوسری طرف روکا پھر وہاں سے چلتا ہوا کلینک کے دروازے پر آیا۔ مریض عورتوں اور بچوں کی بھیڑ نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ فرزانہ بہت عرصے تک غائب رہی تھی۔ اس کے پاس آنے والے کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس جانے لگے تھے۔

وہ دروازے کے پاس ہی دیوار سے لگ کر سگریٹ سلگانے لگا، انتظار کرنے لگا۔

ایک عورت اپنے بچے کو لے کر کلینک سے باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں دوا کی شیشی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اندر سے فرزانہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کمپاؤنڈر کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "ارشد! اور کوئی ہے تو بھیج دو۔"

"نہیں باجی کوئی نہیں ہے۔ آپ اتنے دنوں کے بعد آئی ہیں، عورتوں کو آپ کے

بارے میں معلوم نہیں ہوا ہے اب جس سے بھی ملاقات ہوگی' میں اسے بتادوں گا۔"

"ٹھیک ہے تم بھی جاؤ میں آرام کروں گی۔"

کمپاؤنڈر فوراً ہی نہیں گیا۔ شاید ڈسپنسری کی صفائی کرنے میں مصروف تھا۔ جانی کو بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد دوسرا سگریٹ سلگانا پڑا۔ دوسرے سگریٹ کے ختم ہوتے ہی کمپاؤنڈر باہر نکلا پھر اس نے کہا "باجی! السلام علیکم۔"

دروازے کے پاس ہی فرزانہ کی آواز سنائی دی "وعلیکم السلام۔"

جانی نے آگے بڑھ کر کہا "میں بھی سلام کرنے آیا ہوں۔"

وہ ایک دم سے ساکت ہوگئی۔ اس نے نہ تو حیرانی کا اظہار کیا اور نہ ہی پریشانی کا۔ وہ جانتی تھی کہ سکھر سے واپس آئے گی تو جانی ضرور اس کے دروازے پر آئے گا۔

کمپاؤنڈر اسے دیکھ کر رک گیا۔ جانی نے اس کی موجودگی میں کہا "ڈاکٹر صاحبہ! میری بیوی بہت بیمار ہے' ہم مجاہد آباد میں رہتے ہیں۔ میری ٹیکسی حاضر ہے۔ آپ فوراً چلیں۔ میں آپ کو اس ٹیکسی میں واپس پہنچادوں گا۔ آپ کی جو فیس ہوگی وہ ادا کروں گا۔"

فرزانہ نے پہلے تو کمپاؤنڈر کی طرف دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے کہا "میں باہر کسی مریضہ کو دیکھنے نہیں جاتی۔"

"ڈاکٹر صاحبہ انکار نہ کریں۔ حالات مجبور کریں تو جانا ہی پڑتا ہے۔ آپ نہیں جائیں گی تو۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر یوں دھمکی دینے کے انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "تو میں اندر چلا آؤں گا۔"

فرزانہ نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہا "اچھی بات ہے' انتظار کرو۔ میں دواؤں کا بیگ لے کر آتی ہوں۔"

وہ پلٹ کر اندر چلی گئی۔ کمپاؤنڈر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "باجی! آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں۔"

فرزانہ کی آواز سنائی دی۔ "میں چلی جاؤں گی تم فکر نہ کرو۔ پچھلی بار رات کے وقت مریضہ کو دیکھنے گئی تھی۔ اس لیے تمہیں ساتھ لے گئی تھی۔ اب تو دن کا وقت ہے' میں گاڑی میں جاؤں گی اور واپس آجاؤں گی۔ تم جاؤ۔"

جانی سڑک پار کرکے اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا پھر اسے اسٹارٹ کرکے کلینک کے سامنے لے آیا۔ فرزانہ دروازے پر تالا لگا چکی تھی۔ کمپاؤنڈر ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ جانی نے گاڑی کو آگے بڑھادیا۔

ٹیکسی چلتی رہی۔ ایک راستے سے دوسرے راستے پر مڑتی رہی۔ فرزانہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ جب اورنگی کا علاقہ پیچھے رہ گیا' تو اس نے پوچھا "یہ کیا تک ہے تم نے مجھے اس طرح کیوں مجبور کیا ہے؟"

جانی نے کہا "تم انکار کردیتیں۔"

"انکار کرتی تو پھر اور طرح مجھے پریشان کرتے۔ جانی ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ میں کب تک تم سے دور بھاگتی رہوں گی"

"بھاگنا چھوڑ دو۔ پریشانی ختم ہوجائے گی۔"

اس نے ٹیکسی کو سڑک کے کنارے روک دیا پھر پچھلی سیٹ کی طرف پلٹ کر کہا "آؤ۔ آگے بیٹھ جاؤ۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"ضد نہ کرو۔ مجھے تمہارے پاس بیٹھ کر سکون ملتا ہے۔ تمہیں بھی ملتا ہے۔ ملتا ہے نا؟"

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"جانی نے تھوڑی دیر تک ضد کی پھر گاڑی کو اسٹارٹ کرکے بڑھاتے ہوئے کہا "دو دن پہلے رخسانہ سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔"

"وہ کیسی ہے؟ کیا چہرے کی سرجری ہورہی ہے؟"

"اس نے سرجری کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن وہ ایک بہت بڑی اشتہاری کمپنی کے ساتھ معاہدہ کررہی ہے' اسے بہت بڑی رقم ملے گی' اس رقم سے وہ وہاں کے اخراجات پورے کرے گی۔"

"اس کا چہرہ تو بگڑا ہوا ہے' کمپنی والے اسے کس بات کی رقم دیں گے؟"

"یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔"

"تم کیسے شوہر ہو' یہاں سے اپنی بیوی کو اتنی دور بھیج دیا لیکن اس کے اخراجات کے

لیے رقم پوری نہیں دی۔ اب وہ کسی کمپنی سے معاہدہ کر رہی ہے۔ تم نے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ معاہدہ کیسے ہو رہا ہے۔ اشتہاری کمپنی والے تو غیر معمولی حسین عورتوں سے معاہدہ کرتے ہیں۔ ان کے چہرے کی فوٹوگرافی کے ذریعے پوسٹروں اور فلموں کے ذریعے اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کرتے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے جب رخسانہ کا چہرہ بن جائے گا۔ تب وہ کمپنی والے اس کی فلم بنائیں گے۔"

"لیکن چہرہ تو بنا نہیں ہے۔ کمپنی والے کیا جانیں کہ رخسانہ مکمل ہونے کے بعد غیر معمولی حسین لڑکی نظر آئے گی یا ایک عام شکل صورت کی لڑکی ہوگی۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ ٹیلی فون پر اتنی باتیں نہیں ہو سکتیں۔ ہم دوسری باتیں کرتے رہے۔"

"کیسی باتیں؟ مجھے بتاؤ گے؟"

"وہ بہت چالاک ہے۔ باتوں باتوں میں اس نے میرے منہ سے یہ بات اگلوا لی کہ میں تم سے مل چکا ہوں۔"

وہ سیدھی ہو کر سیٹ پر بیٹھ گئی پھر اس نے پوچھا "تم کیسے آدمی ہو؟ میرا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"زیادہ دلیری نہ دکھاؤ۔ یہاں ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ وہ ہزاروں میل دور پردیس میں ہے' اسے کسی طرح پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ اب وہ کیا سکون سے ہوگی؟ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولا "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"تم کبھی عقل کی بات سوچتے بھی ہو یا صرف جھگڑنا ہی جانتے ہو؟"

"میں اسے پریشان نہیں ہونے دوں گا۔"

"اب کیا کرو گے؟"

"میں آج ہی خط لکھ دوں گا کہ تم نے اپنا کلینک' اپنا مکان بیچ دیا ہے اور مجھ سے ملے بغیر کہیں چلی گئی ہو۔ مجھے تمہارا پتا نہیں معلوم اس طرح اسے اطمینان ہو جائے

گا۔"

"ویسے تم نے بہت برا کیا۔ فون پر میرا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ایک نہ ایک دن تو یہ بات کھلے گی کہ ہم ملتے ہیں۔"

"ہم ملتے ہیں نہ کہو۔ تم ملتے ہو۔"

"بات ایک ہی ہے۔ میں ملتا ہوں تو تم ملتی ہو۔"

"میں نہیں ملتی' مجھے الزام نہ دو۔"

"کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

"نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں میرا پیچھا چھوڑ دو' مجھے پریشان نہ کرو۔"

"میں پریشان نہیں کروں گا' کہہ دو کہ محبت کرتی ہو۔"

وہ چپ رہی۔

"میں تمہارا پیچھا بھی نہیں کروں گا۔ بول دو۔"

"جو کہنا تھا' میں کہہ چکی ہوں۔"

"اچھی بات ہے تو پھر سنو۔ میں ایک عالم صاحب سے مل چکا ہوں' اس سے میں نے بہت کچھ پوچھا ہے۔"

فرزانہ نے حیرانی سے پوچھا "جب تمہیں رخسانہ سے محبت ہے اور وہ ایک اچھی وفادار بیوی ہے تو اس چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیا حق بات کو نہیں جاننا چاہیے؟"

"میں بحث نہیں کروں گی مجھے بتاؤ عالم صاحب نے کیا کہا ہے؟"

جانی نے ڈرائیو کرنے کے دوران ایک ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ کے ایک حصے کو کھولا پھر اس میں سے تہ کیا ہوا کاغذ نکالتے ہوئے کہا "میں ایک ماہ پہلے عالم صاحب کے پاس گیا تھا' اپنے اور رخسانہ کے بارے میں بہت سے سوالات لکھ کر ان کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ دو دن بعد مجھے جواب مل گیا۔ لو اسے پڑھ لو۔"

فرزانہ نے اس کاغذ کو لے کر کھولا پھر اسے پڑھنے لگی۔ جانی نے جو مسئلہ پیش کیا تھا

اور اس سلسلے میں جو سوالات کئے تھے اس کے جواب میں لکھا تھا۔

"صورت مسئولہ میں لڑکی کے والدین نے دھوکا دہی سے جو نکاح کرایا ہے اس کا گناہ ان پر رہے گا اور دھوکا دہی کے تحت زر مہر سے زائد جو مکان لڑکی کے نام کر دیا گیا، وہ بھی ناجائز ہے۔

قانونی اعتبار سے تو یہ مکان لڑکی کو مل جائے گا لیکن قرآن وحدیث کی رو سے لڑکی کے لیے اس مکان کا لینا ناجائز ہو گا۔ حرام ہو گا کیونکہ شوہر کو اگر لڑکی کا حال معلوم ہوتا تو وہ مکان دے کر اس سے کبھی شادی نہ کرتا اس لیے لڑکی اور لڑکی کے والدین کی ذمے داری ہے کہ مکان شوہر کو واپس کر دے۔"

زر مہر پچاس ہزار روپے اگر لڑکے کی حیثیت سے زیادہ ہیں، دھوکے سے مہر زیادہ رکھا گیا ہے تو ضرورت سے زیادہ مہر بھی شوہر کو معاف کر دے اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکی کے والدین، داماد سے معافی مانگیں ورنہ آخرت میں مواخذہ ہو گا۔

شوہر کو اختیار ہے کہ چاہے بیوی کو طلاق دے یا بہ حیثیت بیوی رکھ لے۔ نکاح فسخ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کو رکھنے میں اجر ملے گا۔

دھوکا دہی، ناجائز حرام ہے اس کی تلافی کرنا ضروری ہے ورنہ دھوکا دینے والے، دھوکے کے تحت مال کھانے والے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

لڑکے کو حق ہے کہ اسے طلاق دے، واجب نہیں۔ رکھ لینا بہتر ہے۔

اس کی تلافی کی صورت میں یہ لڑکی مکان اور اپنی حیثیت سے زائد مہر شوہر کو معاف کر دے اور لڑکی کے والدین دھوکا دہی کی معافی مانگیں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور اس کے بعد شوہر بیوی کو اللہ، رسولؐ کی خوشنودی اور لڑکی کی دلجوئی کے لیے رکھ لے، طلاق نہ دے۔ فقط والسلام۔ فتویٰ محمد عبدالسلام۔"

اس کے نیچے مہر لگی ہوئی تھی۔

فرزانہ نے کاغذ کو اگلی سیٹ پر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا "یہ درست ہے کہ حقیقت کا علم ہونا چاہیے۔ جائز اور ناجائز کو سمجھنا چاہیے مگر تمہیں سمجھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جب تم نے رخسانہ کو نکاح کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ کر قبول کر لیا تو پھر وہ نکاح قبول ہوا۔"

"یہ تو اس کاغذ سے بھی ظاہر ہے کہ نکاح قبول ہو گیا لیکن میں اس نکاح کو فسخ کر سکتا ہوں۔"

"مگر تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"میں کر سکتا ہوں۔"

"میں یقین نہیں کر سکتی۔ تم رخسانہ کو بہت چاہتے ہو پھر یہ کہ تم ایک بیٹے کے باپ ہو۔ کیا تمہیں بچے سے محبت نہیں ہے؟"

"بات بچے کی نہیں ہے، اس عورت کی ہے جس سے تم نے نکاح پڑھوا دیا ہے۔ تمہارے دھوکا دینے سے ایسا ہوا۔ تم رخسانہ کی بھلائی چاہتی تھیں۔ اب میں تمہاری قربانی کو ضائع کر دوں گا۔"

"کیا تم میری وجہ سے ایسا کرو گے؟"

"جب تم رخسانہ کی بھلائی کے لیے مجھے دھوکا دے سکتی ہو تو میں بھی تمہاری بے مروتی اور بے حسی کے بدلے رخسانہ کو چھوڑ سکتا ہوں۔ آئندہ اگر اس کا چہرہ مکمل نہ ہو سکے اور وہ ادھوری لوٹ کر آ جائے تو تم کسی مرد کو پھر اپنا جلوہ دکھا کر پھانسنا اور رخسانہ کو اس سے بیاہ دینا۔ تمہارے فریب دینے کی مشق جاری رہے گی۔"

"مجھے طعنے نہ دو۔ عالم دین نے جو نصیحت کی ہے اس پر عمل کرو۔"

"اگر میں عالم صاحب سے تمہارے متعلق سوالات کروں تو اس کاغذ پر لکھا ہو گا کہ اپنا چہرہ دکھانے کے بعد تمہیں مجھ سے شادی کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب و شرافت یہ کہتی ہو تو کیا تم مجھ سے نکاح کرو گی؟"

وہ چپ رہی۔ جانی نے سوال کیا۔ "تم میری محبت کا اقرار نہیں کرتی ہو تو نکاح کیسے قبول کرو گی۔ اپنی بات آتی ہے تو رخسانہ کی حمایت میں کہتی ہو۔ مجھے ایمان کی باتیں سکھاتی ہو اور جب میری بات آتی ہے تو ایمان کو بھول جاتی ہو، جھوٹ اور فریب یاد رہ جاتا ہے۔"

"کب تک مجھے طعنے دیتے رہو گے۔ جو غلطی میں نے کی اس کی سزا مجھے دے چکے ہو۔ دل نہ بھرا ہو تو مجھے مارو، جان سے مار ڈالو۔"

"ضرور ماروں گا مگر ایک تیر سے دو شکار کروں گا۔ ایک تم کو دوسری رخسانہ کو۔ میں

اسے چھوڑ دوں گا۔ وہ مجھ سے محروم ہو گی اور تمہاری قربانی بھی ضائع ہو گی پھر تم دونوں سہیلیاں مجھے دور سے دیکھتی رہنا۔"

وہ پریشان ہو کر سر جھکائے سوچ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"جانی! کوئی ایسا راستہ نکالو کہ کسی کو کسی سے نقصان نہ پہنچے، ہم سب اپنی اپنی جگہ خوش رہیں۔"

"کیسے خوش رہیں؟ تم نے میرے دل میں اپنے لیے تمنا پیدا کر دی۔ میں تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں۔ میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔ تم مجھے مل جاؤ، میری بن جاؤ پھر مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں ہو گا۔"

فرزانہ نے بے بسی سے ایک گہری سانس لی پھر آہستگی سے کہا "گاڑی موڑ لو، کافی دیر ہو چکی ہے مجھے واپس جانا چاہیے۔"

اگلے چوراہے پر اس نے گاڑی موڑ دی "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تم مجھے ٹالنے کی کوشش کرتی جا رہی ہو مگر یاد رکھو، میں یہی کروں گا جو کہہ چکا ہوں۔"

"جو تمہاری مرضی ہے کرکے رہو۔ میں نے رخسانہ کے لیے ایک قربانی دی تھی تمہیں دھوکا دیا اس پر شرمندہ ہوں۔ تم اسے چھوڑ دو گے تو میری قربانی رائگاں نہیں جائے گی کیونکہ جو کرنا تھا، وہ میں کر چکی ہوں۔"

"تمہارے ایسا کہہ دینے سے بات ختم نہیں ہو گی۔"

"یہی تو معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ بات کیسے ختم ہو گی؟"

"ایسے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تم مل جاؤ۔"

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"نہ کرو مگر میری بن جاؤ۔"

"تم ہوش میں تو ہو۔ بغیر شادی کے تمہاری بن جاؤں؟ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ کیا میں کوئی بازاری لڑکی ہوں؟ یا سستے جذبات اور خیالات رکھنے والی ہوں کہ تم نے پیار کے دو بول بولے اور میں نے آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیا۔ نہیں جانی! میری نظروں میں میری ذات سب سے زیادہ اہم ہے میری ذات ہی میری دنیا ہے، میرا سرمایہ ہے۔ میرا دین ہے، میرا ایمان ہے۔ اگر میں نے اس ذات کو غلط ہاتھوں

میں دیا تو گویا اپنے ایمان سے گئی۔ میں اپنی نظروں سے گرنا بھی پسند نہ کروں گی۔"

"تم نے کہا میں نے سن لیا اب میں جو کہتا ہوں، اسے اپنے آنچل سے باندھ کر رکھو۔ تم میری ایسی تلاش ہو کہ جسے میں پا کر بھی نہ پا سکا اور جب تک نہیں پاؤں گا میری تلاش جاری رہے گی۔ میں تمہارے پیچھے بھاگتا رہوں گا۔ سڑک کے اس پار تمہارا کلینک ہے، اس پار میری ٹیکسی رہے گی۔ تم جہاں جاؤ گی میں تم سے دور دور رہوں گا۔ تمہاری مرضی ہے۔ تم منہ پھیرتی رہنا۔ میری مرضی ہے میں تمہارا سایہ بنتا رہوں گا۔"

اس نے کلینک سے بہت دور گاڑی روک دی۔ وہ پچھلی سیٹ سے اتر کر دواؤں کا بیگ اٹھا کر سر جھکائے سڑک پار کرکے دوسری طرف چلی گئی۔ وہ پلٹ کر جانی کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بیگ اٹھائے آہستہ آہستہ جا رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اسے اپنے بدن میں جگہ جگہ اس کی نظریں چبھتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی، وہ جا رہا تھا۔

مگر شاید نہیں جا رہا تھا۔ سڑک کے ایک طرف وہ چل رہی تھی اور دوسری طرف گاڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اگر وہ جا رہا تھا تو گاڑی کی آواز دور ہو جاتی لیکن آواز پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے ذرا سا سر گھما کر دیکھا۔ دوسرے کنارے پر وہ ٹیکسی کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اسی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لوگ راستے میں آجا رہے تھے۔ مرد عورتیں بچے سب ہی دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں لیکن کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جانی ٹیکسی میں بیٹھا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے کلینک کے دروازے پر پہنچ کر تالا کھول کر اندر چلی گئی پھر دروازے کو ایک دھڑاکے سے بند کر دیا۔

جانی تھوڑی دیر ٹیکسی میں بیٹھا ادھر دیکھتا رہا۔ اس نے گاڑی کا ہارن نہیں سنایا نہ ہی ٹیکسی کا رخ اس کے دروازے کی طرف کیا۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ انہیں ان کی منزل تک پہنچانے چلا گیا پھر اس کے بعد تمام دن ٹیکسی چلاتا رہا۔ رات کو ٹھیک آٹھ بجے کلینک کے سامنے سڑک کے اس پار گاڑی کو لا کر کھڑا کر دیا۔

روز کا یہی دستور ہو گیا۔ رات کے آٹھ بجے ٹیکسی وہاں آکر کھڑی ہو جاتی تھی اور صبح چھ سات بجے وہاں سے چلی جاتی تھی۔ کلینک کا دروازہ صبح دس بجے کھلتا تھا۔ مریض

عورتیں اور بچے علاج کے لیے آتے تھے۔ دن کے ایک بجے وہ دروازہ بند ہو جاتا تھا پھر شام کے چھ بجے کھلتا تھا اور نو بجے رات کو بند ہو جاتا تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے دوران کبھی فرزانہ کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ کلینک کے اندر اپنے گھر کے اندر گم ہو گئی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ اس کا کمپاؤنڈر اس کے لیے بازار سے سودا لے کر آتا تھا۔ گھر کا راشن بھی وہی پہنچاتا تھا۔ باہر کا جتنا بھی کام ہوتا تھا' وہ کرتا رہتا تھا۔
ایک صبح جانی نیند سے بیدار ہو کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے اٹھا پھر اس نے حسب عادت کلینک کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہ خلاف توقع کھلا ہوا تھا۔

پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت دروازے کے کھلنے کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ اس وقت کوئی مریضہ بھی نہیں آسکتی تھی۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر دروازے کو بند کرنے کے بعد آہستہ آہستہ سڑک پار کر کے کلینک کی طرف بڑھنے لگا۔ س کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے زبان دی تھی کہ کبھی اسے مخاطب نہیں کرے گا لیکن اب وہ اس کے کلینک کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا' فیصلہ کیا پھر دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ فرزانہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا' اسے دیکھتے ہی وہ چونک گیا۔ عجیب حالت تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں ذرا اندر کو دھنس گئی تھیں چہرہ مرجھا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہے کپڑے بھی شکن آلود تھے۔

ادھر فرزانہ نے بھی جانی کو دیکھا۔ جانی کی آنکھیں بھی اندر کو دھنسی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال بھی ہپیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ لباس بھی شکن آلود تھا۔ وہ مسلسل دو مہینے سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ اس طرح نیند پوری نہیں ہوتی تھی پھر یہ کہ ہوٹلوں کا کھانا کھاتا تھا۔ اپنی صحت کی فکر نہیں تھی۔ وہ پہلے سے آدھا ہو گیا تھا۔ اس نے بے اختیار پوچھا "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟"
جانی اس کی طرف پلٹ گیا۔ ایک دیوار کے روبرو ہو کر بولا "جب آدمی زبان کا پابند ہو اور کسی کو مخاطب نہ کر سکتا ہو تو وہ دیوانے کی طرح دیواروں سے باتیں کرتا ہے' اے

دیوار! میں تجھ سے بولتا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ جس کی محبت میں تڑپ رہا ہوں' جسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ میری وجہ سے اس قدر پریشان ہو گی کہ بیماروں جیسی حالت بنا لے گی۔"

فرزانہ نے اس کی باتیں سن کر پوچھا "تم نے بھی تو اپنی حالت ایسی ہی بنالی ہے۔ جانی! خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ ہم ایسے مقام پر ہیں جہاں ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے۔ محبت ایک خوب صورت جذبہ ہے' اسے بدصورت نہیں بنانا چاہیے۔ محبت کا چہرہ نہیں بگاڑنا چاہیے۔ آج میں اپنی زبان سے اقرار کرتی ہوں۔ میں ہر لمحہ تمہارے لیے جیتی ہوں اور تمہارے لیے مرتی ہوں مگر تم سے یہی کہتی رہوں گی کہ محبت کو بدنام نہ کرو۔ اپنا گھر نہ بگاڑو۔ رخسانہ کا حق نہ مارو اور اپنے بچے کے مستقبل کا خیال کرو۔ دیکھو جانی! ہم انسان ہیں۔ انسانوں کی طرح بہت ہی اچھے انداز میں ہمیں اپنی زندگی کے متعلق سوچنا چاہیے۔"

جانی نے دیوار کو دیکھتے ہوئے پوچھا "اگر میں تمہارے مشوروں پر عمل کروں تو کیا تم اپنی صحت کا خیال رکھو گی؟"
"ہاں رکھوں گی۔"
"جب بھی میری ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے گلابوں کی مہک اٹھتی ہے تو میری نگاہوں کے سامنے تمہارا چہرہ کھلنے لگتا ہے۔ میں تمہیں اسی تازہ گلاب کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم جیسا چاہتے ہو' میں ویسے ہی رہوں گی۔"
اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اب تم کبھی میری ٹیکسی کو اور مجھ کو نہیں دیکھو گی۔"

وہ جانے لگا۔ فرزانہ نے آواز دی "ٹھہرو جانی! پہلے میں تمہیں آنے سے روکتی تھی لیکن اب تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اپنا حلیہ بدلا ہے کہ نہیں۔ کل تم ادھر آنا۔ میں کھڑکی سے دیکھوں گی۔ میں وہی پہلے والے صحت مند ہنستے کھیلتے جانی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کی خاطر انسانوں کے حلیے میں رہیں گے۔"

وہ کلینک سے باہر آیا پھر اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس دن کے بعد اس کا حلیہ بدل گیا۔ خیالات بھی بدلنے لگے' اسے عقل آگئی تھی کہ وہ فرزانہ کا پیچھا کرے گا تو بیمار پڑ جائے گا۔ فکر اور پریشانیوں میں مبتلا رہے گا۔ اگر محبت ہے تو پھر فرزانہ کو محبت سے زندہ رکھنا چاہیے۔

وہ اپنا حلیہ بدلنے کے بعد ایک بار پھر فرزانہ کے سامنے آیا پھر اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس کی کلینک کی طرف پھر نہیں گیا۔ اپنے دھندے میں مصروف ہو گیا۔ وہ صبح سے شام تک ٹیکسی چلاتا تھا۔ وہ وقت اپنے بچے کے پاس جاتا تھا۔ اسے گود میں لے کر کھلاتا تھا۔ خوب پیار کرتا تھا' رخسانہ کو یاد کرتا تھا۔ کبھی اسے خط لکھتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ مہینے میں ایک آدھ ٹرنک کال کے ذریعے گفتگو کرتی تھی۔ اسے بتاتی رہتی تھی۔

چار ماہ کے بعد اس نے بتایا کہ چہرے کی سرجری ہو چکی ہے۔ چھ ماہ کے بعد اس نے بتایا کہ چہرے کی بہت سی پٹیاں ہٹا دی گئی ہیں اور جہاں سے پٹیاں ہٹائی گئی ہیں' وہاں کا چہرہ بالکل ہی بے داغ نظر آرہا ہے۔

وہ خوش ہو جاتا تھا۔ بڑی محبت سے اسے حوصلہ دیتا تھا۔ "رخسانہ! میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

ادھر فرزانہ کی محبت کسی طرح مٹائی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس محبت کو اپنے اندر چھپا کر رکھے گا۔ وہ اپنے من کو مار رہا تھا۔ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود اس سے دور رہنے پر خود کو مجبور کرتا جا رہا تھا۔ بعض حالات میں انسان کوششوں کے باوجود ناکام رہتا ہے' کبھی خود کو بنانا چاہتا ہے تو تقدیر بگاڑنے لگتی ہے۔

ایک دن اس کی ٹیکسی بگڑ گئی' اس نے گاڑی کو گیراج میں کھڑا کیا' اسے مرمت کے لیے چھوڑ کر ایک بس میں بیٹھ کر ناظم آباد کی طرف چلا آیا۔ وہ تھوڑا وقت اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ جب وہ سسرال کے قریب پہنچا تو اسے ایک سفید رنگ کی کار فرید احمد کے گھر کے سامنے رکتی ہوئی دکھائی دی' جانی قریب پہنچ گیا۔ کار کا اگلا دروازہ کھول کر ایک نوجوان باہر آیا۔ اس نے جانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مسٹر! ذرا! ایک منٹ! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں مسٹر فرید احمد کا مکان کون سا ہے؟"

جانی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا "بتا سکتا ہوں۔ آپ کون ہیں؟

کہاں سے آئے ہیں؟"

"میرا نام جمشید علی ہے۔ میں لندن سے آیا ہوں۔ فرید احمد صاحب کی بیٹی کی کچھ چیزیں لے کر آیا ہوں۔"

جمشید کا نام سنتے ہی جانی کو یاد آیا کہ رخسانہ اپنے کسی انکل جمشید کے ہاں رہنے کے لیے لندن گئی ہے۔ اس نے جمشید سے پوچھا "آپ فرید احمد کی صاحب زادی کو لندن میں کیسے جانتے ہیں؟"

جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ جاننے کی بات پوچھ رہے ہیں۔ جناب وہ تو لندن میں میرے ہی ہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ بائی دی وے آپ مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ میں تو آپ سے صرف فرید احمد صاحب کا پتا پوچھ رہا ہوں۔"

جانی نے کہا "آپ نے صحیح جگہ گاڑی روکی ہے۔ یہ سامنے والا مکان فرید صاحب کا ہے۔"

یہ کہہ کر جانی آگے بڑھ گیا۔ ذرا آگے جا کر ایک گلی میں مڑ گیا پھر وہاں سے پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جمشید دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد ہی فرید احمد نے دروازہ کھولا۔ جمشید سے کوئی سوال کیا۔ جمشید نے کوئی جواب دیا۔ دونوں میں کچھ اور باتیں ہوئیں جیسے ایک دوسرے کا تعارف ہو رہا ہو۔ اس کے سسر کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ اب دروازے کو پوری طرح کھول کر جمشید کو اندر بلا رہا تھا۔

جمشید جیسے ہی اندر گیا۔ جانی تیزی سے چلتا ہوا دوسری گلی میں آیا۔ وہ فرید احمد کے مکان کی پچھلی گلی تھی۔ مکان کا پچھلا دروازہ اتفاق سے کھلا ہوا تھا۔ بیگم آنگن کی صفائی کر رہی تھیں۔ اسی وقت فرید احمد نے آکر کہا "بیگم! جلدی آؤ' بہت بڑی خوش خبری ہے۔ وہ جمشید آیا ہے ہماری بیٹی نے بہت سا سامان بھیجا ہے' جلدی آؤ۔"

بیٹی کے متعلق سن کر بیگم نے جھاڑو ایک طرف پھینک دی۔ پچھلا دروازہ بند کرنا بھول گئیں۔ ایک دم کھنچی ہوئی ادھر چلی گئیں۔ جانی اس کھلے ہوئے دروازے سے اندر آگیا۔ اس کے اندر ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اسے ایک ایسا نوجوان جمشید نظر آیا تھا جو کسی طرح بھی رخسانہ کا انکل نہیں ہو سکتا تھا اور اگر انکل تھا بھی تو وہ ایک نوجوان کے پاس رہنے کے لیے کیوں گئی تھی؟

وہ دبے پاؤں آنگن سے گزرتا ہوا' ایک کمرے میں آیا۔ وہاں ایک پلنگ پر اس کا بیٹا سو رہا تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کمرے کے دروازے کے پاس آیا جس کے دوسری طرف نوجوان انکل جمشید بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنی ساس کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ہائے بیٹا جمشید! تم ہی جمشید ہو۔ رخسانہ تمہاری بڑی تعریفیں کرتی رہتی تھی جب وہ یہاں تھی اور تم لندن سے خط لکھا کرتے تھے تو میں نے بھی وہ خط پڑھے ہیں۔ ماشاء اللہ بہت خوب لکھتے ہو۔ بہت ذہین ہو۔ تم نے ہماری بیٹی کے لیے جو کچھ کیا ہے' ہم اسے کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔"

جمشید کی آواز سنائی دی "آنٹی! آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں کس قابل ہوں ذرا ٹھہریے' میں کار کی ڈگی سے وہ سوٹ کیس لے آؤں جو رخسانہ نے آپ لوگوں کے لیے بھیجا ہے۔"

بیگم نے خوش ہو کر پوچھا "ہائے اللہ! کیا ہے سوٹ کیس میں؟"

"آپ لوگوں کے لیے کچھ کپڑے ہیں' بچے کے لیے بہت سارے کھلونے ہیں اور اس نے اپنے شوہر کے لیے بھی کچھ بھیجا ہے' میں ابھی آتا ہوں۔"

جمشید باہر گیا اور جانی دانت پیس کر سوچنے لگا۔ اچھا! تو لندن سے رخسانہ کو یہی نوجوان خط لکھا کرتا تھا اور میری اس چڑیل ساس نے پہلے کبھی اس انکل جمشید کو نہیں دیکھا تھا۔ یعنی پہلے سے کوئی انکل وغیرہ کا رشتہ نہیں تھا۔ مجھے بے وقوف بنایا گیا تھا۔

دوسرے کمرے سے فرید احمد کی آواز سنائی دی "بیگم! یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ وہ اتنی دور سے آیا ہے کچھ چائے وغیرہ بناؤ۔ ناشتے کا انتظام کرو۔"

"ارے ٹھہریے بھی۔ میں ذرا دیکھ تو لوں میری بیٹی نے کیا بھیجا ہے۔ آپ بازار جا کر کھانے کا کچھ سامان لے آئیں۔"

"یوں کہو کہ میں باہر جا کر پہرہ دیتا رہوں۔ کہیں وہ جانی ادھر نہ آجائے۔ کہیں اس نے جمشید کو دیکھ لیا اور اسے پتا چل گیا کہ یہ وہی جمشید ہے جسے ہم نے رخسانہ کا انکل بتایا ہے تو وہ ہم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

بیگم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی "ہائے! میں اس کمبخت کو بھول ہی گئی تھی۔ اس کا جمشید سے سامنا ہو گا تو بڑی مشکل ہو گی۔ ادھر جمشید کو بتایا گیا ہے کہ رخسانہ کنواری

ہے' وہ شوہر کی حیثیت سے آئے گا تو کیا ہو گا؟"

جانی کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ خلا میں تک رہا تھا اور اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا "کیا رخسانہ جیسی بیوی ایسی بے وفا ہو سکتی ہے؟ ایک بار جھوٹ بول کر ہزار بار معافیاں مانگ کر پھر اتنا بڑا جھوٹ بول سکتی ہے؟ بیاہتا ہو کر اپنے آپ کو کنواری ثابت کرتی رہی ہے کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ وہ لندن میں جا کر کسی کے سامنے مجھے اپنا شوہر نہیں کہہ سکتی؟ مجھے شوہر کہنے سے اس کی بے عزتی ہوتی شاید۔"

سامنے والے کمرے میں جمشید سوٹ کیس لے کر آگیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "آنٹی میں اب سے تین ماہ پہلے ہی آنے والا تھا لیکن کاروباری مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ نہ آسکا۔ بہرحال یہ لیجئے آپ کی بیٹی کا سامان اور یہ رہا اس کا خط۔"

وہ خط لینے جا رہی تھیں' اتنے میں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔ انہیں جانی کمرے میں داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ فرید احمد بھی سہم کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے' وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ جانی مکان کے اندر کیسے آگیا جبکہ بیرونی دروازے کے پاس وہ خود کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے پوچھا "کیا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا؟"

جانی نے انہیں گھور کر دیکھا تو وہ نظریں پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے پھر اس نے ساس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک طرف کھڑی آہستہ آہستہ کانپ رہی تھیں۔ جمشید نے انہیں دیکھا پھر جانی سے کہا "مسٹر! آپ تو وہی ہیں' ابھی آپ نے اس گھر کا پتا بتایا تھا مگر آپ کون ہیں؟ یہ لوگ آپ سے اتنے سہمے ہوئے کیوں ہیں؟"

جانی نے غصے سے کہا "جھوٹ ہمیشہ سہما ہوا رہتا ہے اور جب وہ ظاہر ہو جائے تو پھر جھوٹ کی موت آجاتی ہے۔ اب ان دونوں کے سامنے موت کا فرشتہ کھڑا ہوا ہے۔"

جمشید نے اسے غور سے دیکھا پھر پوچھا "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ مسٹر بادشاہ جانی ہیں۔"

"مسٹر نہیں ہوں۔ صرف بادشاہ جانی بولو' مجھے آواز دو' اے ٹیکسی والے! رک جاؤ۔ مجھ سے کہو' ابے کدھر جاتا ہے' اس راستے پر چل۔ مجھے بولو کہ میں ایک سواری اٹھانے والا جانور ہوں جو گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کھینچ کر ان کے گھروں تک پہنچاتا

ہے۔ میں ایک گرا ہوا ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ مجھے مسٹر کیسے کہہ سکتے ہو جب کہ میری بیوی مجھے اپنا مسٹر نہیں سمجھتی۔"

بیگم نے ڈرتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "ضرور فرزانہ نے میری بیٹی کے خلاف تمہیں بھڑکایا ہے۔"

جانی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا "بڑھیا بکواس مت کر' نہیں تو میں تیرا گلا دبا دوں گا۔ جس لڑکی نے تیری بیٹی کے لیے قربانیاں دیں تو اس کے خلاف زہر اگل رہی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ۔ میں دوسرے کمرے میں کھڑا ہوا تم دونوں بڈھے اور بڈھی کی باتیں سن رہا تھا۔ جو کچھ میں نے سنا ہے اور سمجھا ہے تم لوگوں کی زبان سے سمجھا ہے۔"

جمشید نے جانی اور بیگم کے درمیان آکر کہا "مسٹر! ذرا سہولت سے کام لیں' مجھے بھی سمجھنے کا موقع دیں کہ آخر آپ کو غصہ کیوں آرہا ہے؟"

جانی نے فرید احمد کی طرف پلٹ کر کہا "اے جورو کے چمچے! اسے جواب دے۔"

فرید احمد نے سہمے ہوئے انداز میں کہا "بیٹے! ذرا عزت سے بات کرو' دیکھو اتنی دور سے ایک مہمان ہمارے ہاں آیا ہے۔"

"میں تم لوگوں کی عزت کروں' ایسا کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ مجھے کتنی بار دھوکا دیا ہے؟ کتنی بار جھوٹ کا سہارا لیا ہے اور خود تمہاری بیٹی نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کیا میں نے تمہاری بیٹی کو اپنا گھر' اپنی جائداد نہیں دی؟ کیا اپنا سب کچھ اس کے نام نہیں لکھ دیا؟ کیا اپنی محبت نہیں دی؟"

بیگم نے کہا "جھوٹ بولتے ہو۔ تم فرزانہ کے پیچھے بھاگتے رہتے ہو۔"

"یہ بات اپنی بیٹی سے پوچھو' فرزانہ کے پیچھے بھاگنے کے باوجود میں کس پر جان دیتا ہوں؟ کس کے لیے میں دن رات محنت کرتا ہوں تمہاری بیٹی کے لیے۔ ہاں تمہاری بیٹی کے لیے میں نے تم لوگوں کے جھوٹ اور فریب کو بھی معاف کردیا تھا مگر اب نہیں کروں گا۔ اب میں تمہاری بیٹی کو طلاق دے دوں گا۔"

فرید احمد نے چیخ کر کہا "نہیں بیٹے نہیں' ایسی بات زبان پر نہ لاؤ۔ شریف آدمی ایسا نہیں کرتے۔"

وہ کسی کی بات سنے بغیر تیزی سے پلٹ کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ بیگم اور فرید احمد آگے بڑھ کر اس کمرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جب وہ کمرے سے واپس باہر آیا تو اس کی گود میں بچہ تھا۔ "آج سے میرا اور میرے بیٹے کا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اسے لے جارہا ہوں۔"

بیگم چیخیں مارتے ہوئے اس کے پاس آئیں اور اسے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہنے لگیں "میں اپنے منے کو یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔ تم اسے نہیں لے جاسکتے۔ اس پر میری بیٹی کا بھی حق ہے۔ اسے آنے دو پھر فیصلہ ہوگا۔"

جانی نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "بکواس مت کرو۔ یہ میرا بیٹا ہے' جاؤ تھانے میں رپورٹ لکھواؤ' عدالت میں بتاؤ۔ اتنا قانون تو میں بھی جانتا ہوں کہ بیٹا باپ ہی کو ملتا ہے۔"

وہ جانے لگا۔ فرید احمد اس سے لپٹ گئے' گڑگڑانے لگے۔ "بیٹا اس طرح رشتہ نہ توڑو۔ ذرا صبر کرلو۔ رخسانہ کو آجانے دو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں' میری بیٹی معصوم ہے' اس نے تمہیں جان بوجھ کر دھوکا نہیں دیا۔ اس عورت کے بہکانے سے وہ کنواری بن کر گئی بخدا وہ تمہیں اتنا چاہتی ہے' اتنا چاہتی ہے کہ خداوند کریم اگر اجازت دے تو فوراً تمہارے سامنے سجدہ کرلے۔"

"میں نے ایسے سجدے دیکھے ہیں جن کے پیچھے دغابازی ہوتی ہے۔ لوگ تو خدا کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور میں تو پھر ایک معمولی انسان ہوں۔"

اس نے فرید احمد کو ایک زور دار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے کرسی کے پاس جاگرے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنے بچے کو لے کر باہر نکل گیا۔ بیگم فریاد کرتے ہوئے اس کے پیچھے جارہی تھیں۔ جمشید نے ان کا راستہ روک لیا "آنٹی! ذرا صبر سے کام لیں۔ ایک باپ اپنے بیٹے کو لے گیا ہے' وہ کوئی دشمن تو نہیں ہے۔ وہ غصے میں ہے۔ بعد میں سمجھا لیا جائے گا۔"

وہ جانی کو گالیاں دینے لگیں اور کوسنے لگیں۔ فرید احمد نے ناگواری سے کہا "اب کوسنے اور بددعائیں دینے سے کیا ہوتا ہے' اپنے اعمال کو دیکھو تم نے جو کیا' اپنی بیٹی کو جو سکھایا اس کا نتیجہ ایک دن سامنے آنا تھا' سو آگیا۔"

وہ غصے سے بولیں "میری قسمت تو اسی دن پھوٹ گئی تھی جس دن آپ سے شادی ہوئی۔ آپ جیسا بزدل میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے بچے کو اٹھا کر لے گیا اور آپ نے کچھ نہیں کیا۔"

"کیا کرتا' کیا تماشا بن جاتا؟ وہ غصے میں آگیا ہے' اسے اپنا ہوش نہیں ہے' نہ وہ ہماری عزت رکھتا' نہ اپنی عزت کا خیال کرتا۔ دنیا والوں سے چیخ چیخ کر کہہ دیتا کہ ہم شروع سے ہی اسے دھوکا دیتے آرہے ہیں۔ دنیا والوں کو جب حقیقت معلوم ہوگی تو سب اس کا ساتھ دیں گے اور سب ہمارے منہ پر تھوکیں گے۔"

جمشید نے کہا "آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں مہمان ہوں لیکن اپنے میزبانوں سے بیٹھنے کی درخواست کرتا ہوں۔"

بیگم نے کہا "بیٹا' تم بھی بیٹھو۔ تم اتنی دور سے آئے ہو اور ہمارے گھر میں ایسا تماشا ہوگیا۔ ہم کیا بتائیں بیٹا! یہ جانی ہے نا' ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ بالکل ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ ہماری بیٹی کی تو قسمت پھوٹ گئی ہے۔"

جمشید نے بیٹھ کر مسکراتے ہوئے کہا "مجھے رخسانہ نے سب کچھ بتادیا ہے۔ چہرہ کس کا دکھایا گیا اور شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے۔ رخسانہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ وہ وہاں جاکر شوہر کے لیے محبت اور بیٹے کے لیے ممتا کو نہ چھپا سکی۔ مجھے اور میرے پاپا کو سب کچھ بتادیا ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ وہ ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور ہے لیکن میں نے آپ کی بیٹی کی آنکھوں میں' اس کی زبان میں' اس کے دل میں' اس کے دماغ میں اور اس کی روح کی گہرائیوں میں اسی جانی کو دیکھا ہے۔"

بیگم اور فرید احمد نے سر جھکالیا۔ جمشید نے کہا "میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ آپ لوگوں کو داماد پسند نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو مجھے بھی یہ شخص بالکل پسند نہیں ہے۔"

بیگم اور فرید احمد نے سر کو اٹھایا۔ بیگم نے خوش ہو کر کہا "بیٹا! جو برا ہوتا ہے' اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ سونا آخر سونا ہوتا ہے۔"

"میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو آپ نے اپنی بیٹی کو کنوارا بنا کر شاید اسی لیے بھیجا تھا کہ میں سونا ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بے بسی سے بولیں "میں تو بہت کچھ چاہتی ہوں۔ اس کا

ایک بڑا سا گھر ہو' ایک بڑی سی کار ہو۔ میں اپنی بیٹی کو بہت خوش حال دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ ہنستی کھیلتی ہوئی زندگی گزارے لیکن معلوم نہیں یہ جانی اس کی تقدیر میں کیسے لکھا گیا۔"

"آنٹی! ہم چاہیں تو تقدیر کو بدل سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اب تقدیر بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ جانی کہہ گیا ہے کہ وہ رخسانہ کو طلاق دے دے گا۔"

فرید احمد نے کہا "بیٹے! تم خود جانتے ہو کہ رخسانہ اسے کتنا چاہتی ہے۔ وہ طلاق نہیں لے گی۔"

"جب جانی طلاق دے ہی دے گا تو رخسانہ کیا بگاڑ لے گی' وہ کچھ عرصے تک ماتم کرے گی' روئے گی' بلبلائے گی پھر خاموش ہوجائے گی۔"

بیگم نے پوچھا "لیکن ہمارا نواسا؟ اسے تو وہ لے گیا ہے رخسانہ اپنے بیٹے کے بغیر کیسے رہے گی؟"

"زندگی میں چاہے کتنے ہی گہرے زخم لگیں' وہ آہستہ آہستہ بھر جاتے ہیں۔ طلاق نامہ تو رخسانہ کے پاس پہنچ ہی جائے گا۔ اگر اس سے پہلے ہم یہ اطلاع دے دیں کہ اس کا بیٹا اللہ کو پیارا ہوگیا ہے تو....."

بات پوری ہونے سے پہلے ہی بیگم چیخ مار کر کھڑی ہوگئیں "نہیں' ایسی بات منہ سے نہ نکالو' میرے کامی کو کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"دیکھیے آنٹی! جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے موت تو ایک دن سب کو آنی ہے۔"

بیگم نے کہا "اس کی آئی مجھے آجائے۔ موت آئے گی تو میں اس کے پاؤں پکڑلوں گی۔"

"بے شک آپ موت کا راستہ روک سکتی ہیں مگر جانی کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ وہ اپنے بیٹے کا حقدار ہے اور اسے لے جاچکا ہے۔ آپ سر پٹختی رہیں' قانونی کارروائیاں کرتی رہیں لیکن نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں۔ بیٹا جانی کا ہے جانی کو ملے

گا۔ آپ لوگ میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک ماں سے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس کا بیٹا مر گیا ہے تو وہ رو رو کر برا حال کرلے گی لیکن ایک وقت اسے صبر آجائے گا اور جب وہ دیکھے گی کہ بیٹا زندہ ہے اور اس سے چھین لیا گیا ہے اور اس کے شوہر کے پاس ہے تو وہ جیتے جی مرتی رہے گی اور اسے چاہے سونے کا نوالا کھلاؤ' تب بھی وہ خوش نہیں رہے گی' کیا آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتی ہیں؟"

فرید احمد نے کہا "بیٹے! تم بہت اچھی باتیں سمجھا رہے ہو۔ جانی اپنے بیٹے کو لے گیا ہے' وہ رخسانہ کو بہت تڑپائے گا۔ وہ جیتے جی مرتی رہے گی یہ تو ہماری سمجھ میں آگیا ہے۔"

"جب پوری بات سمجھ میں آگئی ہے تو اس سے پہلے ہی رخسانہ کو ایک بڑا صدمہ پہنچایا جائے۔ وہ اپنے بیٹے کی موت کو رفتہ رفتہ برداشت کرلے گی۔"

"لیکن کیسے؟ جب وہ یہاں آئے گی تو اسے معلوم ہوجائے گا۔"

"رخسانہ چار پانچ ماہ سے پہلے نہیں آسکے گی۔ چلئے ہم سب لندن چلتے ہیں۔ میں آپ دونوں کے اخراجات برداشت کروں گا۔ وہاں جاکر ہم اسے بتائیں گے کہ کامی بہت بیمار تھا اور بیماری کی حالت میں اللہ کو پیارا ہوگیا یا پھر کہیں گے کہ جانی اپنے بیٹے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں اس کی غفلت سے بیمار رہ کر ختم ہوگیا۔ اس طرح رخسانہ کے دل کے کسی گوشے میں جانی کے لیے نفرت پیدا ہوجائے گی۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کا یہ ظلم برداشت نہیں کرے گی پھر جانی کا طلاق نامہ پہنچے گا۔ وہاں ہم سب رخسانہ کو سمجھاتے مناتے رہیں گے۔ آخر ایک دن وہ مان ہی جائے گی۔ حالات کے سامنے جھک جائے گی۔ میں اسے اتنی دولت دوں گا' اتنا خوش رکھوں گا کہ آپ دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور وہ بھی میری محبت کو محسوس کرے گی۔"

وہ کہہ رہا تھا' یہ سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک ٹیکسی والے کے مقابلے میں ایک کار والے کے پاس زیادہ خوش حال رہ سکتی ہے اور اس کی تمام آرزوئیں تمنائیں پوری ہوسکتی ہیں۔ سوسائٹی میں اونچا مقام مل سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں سمجھ میں آرہی تھیں۔ جمشید جانے کے لیے کھڑا ہوگیا "بیٹے' کہاں جارہے ہو۔ ہم تمہیں کچھ کھائے پیئے بغیر جانے نہیں دیں گے۔"

"آنٹی! یہ میرا ہی گھر ہے۔ ابھی میں ضروری کام سے جارہا ہوں کل آؤں گا تو آپ

لوگوں کو کسی اچھے ہوٹل میں لے جاؤں گا۔ کل میری طرف سے ڈنر ہے۔"

فرید احمد نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے پہلے ہمارے ہاں دعوت ہوگی۔ کل رات تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ گے لیکن شام ہی سے چلے آنا تاکہ موجود حالات پر گفتگو ہوسکے۔"

"آپ کہیں تو میں سارا دن یہاں گزار دوں اور آپ کو سمجھاتا رہوں۔ ویسے آپ والدین ہیں' اپنی بیٹی کی بہتری مجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ کل تک آپ لوگ اچھی طرح غور کرلیں۔ میرا مشورہ قابل عمل ہوگا تو ہم فوراً ہی عمل کریں گے۔ میں آپ لوگوں کو لندن لے جانے کے انتظامات کروں گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مکان سے باہر آئے۔ بیگم نے سفید رنگ کی ائرکنڈیشنڈ کار کو دیکھ کر خوشی سے کہا "ہائے یہ تمہاری گاڑی ہے؟ کتنی خوب صورت ہے' بیٹے وہاں کیا کاروبار ہے؟"

جمشید نے کہا "آنٹی! کاروبار اتنا پھیلا ہوا ہے کہ میں چلتے پھرتے نہیں بتاسکتا۔ کل اطمینان سے بتاؤں گا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ یہاں سے لندن تک کتنے ہی ملکوں کے بینکوں میں ہماری بڑی بڑی رقمیں جمع رہتی ہیں۔ رخسانہ جس ملک میں جائے گی' میری دولت سے کھیلے گی۔"

بیگم سن رہی تھیں اور خوشی سے کھل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ نواسے کو بھول گئی تھیں۔ جب جمشید ان سے رخصت ہوکر وہاں سے چلا گیا اور جب سناٹا چھا گیا تب نواسا ان کی گود میں ہمکنے لگا۔ انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ دور خلا میں تکنے لگیں۔ فرید احمد نے پوچھا "کیا ہر ملک کے بینک میں رہنے والے داماد کا چیک کیش کرا رہی ہو؟"

انہوں نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں۔ وہ صرف اپنے نواسے کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے طنز پر بھی دھیان نہیں دیا۔ چپ چاپ پلٹ کر مکان کے اندر آگئیں۔ فرید احمد نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ نیچ لوگوں سے رشتہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے ماحول کے مطابق نیچے کی سطح پر کمینگی دکھاتے ہیں' ہمارا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہم اونچے لوگ

اونچی سطح پر کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

بیگم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے "جانی! ہمارے مقابلے میں اعلیٰ ظرف ہے اس نے ہماری ایک غلطی اور دھوکے کو برداشت کر لیا تھا۔ رخسانہ کو معاف کر دیا تھا۔ اب دوسری بار اس کے سامنے رخسانہ کا جھوٹ کھل گیا۔ باپ اپنے بچوں کو برے ماحول سے الگ رکھتے ہیں' وہ بھی اپنے بچے کو ہمارے ماحول سے الگ لے گیا ہے۔ اس نے کوئی ظلم نہیں کیا ہے۔ یہ اس کا حق تھا' ابھی وہ غصے میں ہے' ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ کل ہم اس کے پاس جائیں گے' اسے سمجھائیں گے' اس سے معافی مانگیں گے' اس سے پہلے کہ وہ طلاق نامہ لکھے اگر ہم کسی طرح سمجھا بجھا کر اسے روک دیں تو بہتر ہے۔"

بیگم نے صوفے کے ہتھے پر ہاتھ رکھا پھر سر جھکا کر بازو میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

فرید احمد نے قریب آکر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ مجھے دیکھو میں نے زندگی کے تیس برس تمہارے ساتھ گزارے ہیں اور ہمیشہ ہر معاملے میں تمہارا ساتھ دیا ہے خواہ وہ جھوٹ ہو' سچ ہو' اچھائی ہو' برائی ہو۔ میں نے تمہیں کسی بات سے نہیں روکا لیکن آج صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ اگر تم نے جانی کو رخسانہ سے چھڑانے کی کوشش کی یا وہ الگ ہوتے رہے اور تم خاموش تماشائی بن کر رہنا چاہو گی تو میں اسے برداشت نہیں کروں گا۔ میں اب جانی کا ساتھ دوں گا اور اس کے لیے تم سب کو چھوڑ دوں گا۔ آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ اگر تمہیں جمشید پسند ہے' تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی اس سے منسوب ہو جائے اور پرانے رشتے ٹوٹ جائیں تو پھر تمہیں تمہاری چالبازیاں مبارک ہوں۔"

وہ ایک دم سے سر اٹھا کر بولیں "مجھے کچھ نہیں چاہیے' مجھے میرا کامی چاہیے۔ کامی نہیں ملے گا تو میں مر جاؤں گی۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔"

فرید احمد نے اطمینان کی سانس لے کر اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ نظریں جھکائے کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا "بیگم جب اچھائی کا ساتھ دیا جائے' اپنی غلطیوں کو تسلیم کر لیا جائے تو اچھائی کے راستے سجھائی دیتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے' ہمارا کامی ہمیں مل سکتا ہے۔"

وہ جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں "کیسے مل سکتا ہے؟"

"دیکھو' میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس پر غصہ نہ دکھانا۔ پہلے صبر اور تحمل سے میری تدبیر پر غور کرنا۔ تدبیر یہ ہے کہ ہم پہلے فرزانہ کے پاس جائیں۔ فرزانہ ہی ایک ایسی لڑکی ہے جو جانی کا غصہ ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ اسے سمجھا سکتی ہے اور کامی کو واپس لا سکتی ہے۔"

بیگم ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

○☆○

دن کے دو بج رہے تھے۔ فرزانہ کھانے کے بعد بستر پر لیٹنا چاہتی تھی اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ تیزی سے چلتے ہوئے' دروازے کو کھولتے ہوئے ڈسپنسری میں آئی۔ بیرونی دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس وقت کمپاؤنڈر نہیں آسکتا تھا۔ محلے پڑوس کی کوئی عورت آسکتی تھی لیکن جب بھی دستک ہوتی تھی تو اس کا گمان ہوتا تھا اور وہ بے اختیار بیرونی دروازے کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔ اس نے دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھا "کون ہے؟"

بند دروازے کے دوسری طرف سے یقیناً بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی مریضہ بے وقت آئی ہے' یقیناً اس کے بچے کو کوئی تکلیف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اس نے بے دلی سے دروازے کی چٹخنی گرائی اور اس کے پٹ کھول دیے لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

جانی بچے کو گود میں لیے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ آئے گا۔ پھر وہ توقع ختم ہو گئی تھی مگر وہ خلاف توقع نظر آگیا۔ کبھی حالات بڑے ستم ظریف ہوتے ہیں۔ سوچو تو وہ نہیں آتا' نہ سوچو تو چلا آتا ہے۔

وہ اندر آگیا پھر اس نے ایک ہاتھ سے دروازے کو بند کرتے ہوئے سختی سے کہا "تم نے مجھے انسانیت کا سبق پڑھایا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ میں محبت کو بدنام نہ کروں۔ تمہارے کہنے پر میں نے کتنے مہینوں سے تمہیں اپنی صورت نہیں دکھائی۔ آج بھی نہ دکھاتا لیکن جانتی ہو' آج میں اپنے بچے کو لے کر کیوں آیا ہوں؟"

فرزانہ اس کے پاس سے گھوم کر اپنی میز کے پاس جاتے ہوئے بولی "کیوں آئے ہو؟"

"اس لیے کہ محبت اور خلوص پر سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔"

فرزانہ نے پلٹ کر پوچھا "کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟"

"نہیں مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے رخسانہ کی پہلی غلطی معاف کر دی۔ اگر میں اسے ٹھوکر مار کر پہلے ہی دن گھر سے نکال دیتا تو آج اس قدر نہ پچھتاتا۔ میری ایسی توہین نہ ہوتی جیسی آج ہوئی۔"

"آخر کیا ہو گیا ہے؟"

"یہ ہوا ہے کہ وہ کنواری بن کر لندن گئی ہے۔ اس نے میرے رشتے سے انکار کیا ہے۔ جب انکار کیا ہے تو میں اس کا کچھ نہیں ہوا۔ میرا بچہ بھی اس کا نہیں ہوا۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آگیا ہوں۔"

فرزانہ نے حیرانی اور پریشانی سے کبھی اسے کبھی بچے کو دیکھا پھر سمجھانے کے انداز میں کہا "جانی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولا "کیا اب بھی میں نے اچھا نہیں کیا؟ کیا اب بھی وہ اچھا کر رہی ہے؟ جو لوگ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں' جھوٹ بول رہے ہیں' دھوکا دے رہے ہیں۔ وہ سب اچھا کر رہے ہیں اور میں اپنے بچے کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں تو میں نے برا کیا ہے۔ یہ تمہاری کیسی دنیا ہے؟ تم لوگوں کا کیسا انصاف ہے؟ تم لوگ کیسے پڑھے لکھے ہو جو ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور کو بے وقوف بناتے چلے آرہے ہو۔"

"جانی یہ بات نہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ رخسانہ نے اچھا کیا ہے۔ اگر اس نے خود کو کنواری کہا ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہے لیکن تمہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے' وہ آئے گی اور اپنی صفائی پیش کرے گی۔"

"کوئی صفائی پیش نہیں کرے گی۔ جمشید ایک دولت مند نوجوان ہے' میں ٹیکسی والا ہوں' وہ کار والا ہے۔ میں آج تک اپنی محبت سے اسے خرید نہیں سکا۔ ہمیشہ خوش فہمی میں مبتلا رہا لیکن یہ میرا بچہ ہے۔ یہ میری محبت کو سمجھے گا۔ وہ میری ہو یا نہ ہو' یہ تو میرا رہے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے' جب عالم دین نے کہا ہے کہ میں اس نکاح کو فسخ کر سکتا ہوں تو پھر میں ایسا ضرور کروں گا۔"

فرزانہ نے آگے بڑھ کر کہا "نہیں جانی! تم ایسا نہیں کرو گے۔ تم غصے میں کوئی ایسا

قدم نہیں اٹھاؤ گے کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ یہ بچہ صرف تمہارا نہیں ہے' رخسانہ کا بھی ہے اسے دونوں کی محبت چاہیے۔ اگر تم آپس میں جھگڑا کرو گے اور ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ گے تو بچے کی زندگی پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔"

"تم بہت زیادہ تعلیم یافتہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم نے آج تک مجھے بہت کچھ سمجھایا ہے۔ تم نے بھی محبت سے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ میں آج تم سے دو ٹوک فیصلہ کرنے آیا ہوں۔ میں تنہا اس بچے کی پرورش کر سکتا ہوں مگر بڑی مشکلیں پیش آئیں گی۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی۔ کیا میرے بچے کو پالو گی' اپنے پاس رکھو گی؟"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں محلے' پڑوس والوں کو کیا جواب دوں گی کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ کس رشتے سے تمہارے بچے کو پال رہی ہوں؟ پھر یہ کہ رخسانہ کی امی وغیرہ آئیں گی تو الگ جھگڑا کریں گی۔ میری مجبوریوں کو سمجھو۔ مجھ پر ایسے ایسے الزامات عائد کئے جائیں گے کہ میرا جینا دوبھر ہو جائے گا۔"

بچہ پھر رونے لگا فرزانہ نے اسے جانی کی گود سے لیتے ہوئے کہا "چلو ابھی ہم اسے اس کی نانی کے پاس پہنچا دیں۔ یہ وہیں حفاظت سے رہے گا۔"

"نہیں' میں اسے ان کے گھر میں نہیں لے جاؤں گا۔ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"بچہ رو رہا ہے۔ ضد نہ کرو۔"

"یہ بھوکا ہے۔ میں اس کے لیے دودھ لے کر آتا ہوں۔"

وہ جانے لگا۔ فرزانہ نے کہا "ٹھہرو۔ اسے یوں میرے پاس چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میری مجبوریوں کو سمجھو۔ تم بارہا یہاں آؤ گے جاؤ گے تو لوگ کیا کہیں گے۔ کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟"

اس نے پلٹ کر کہا "اب تو صرف تمہارا ہی خیال ہے۔ دیکھو فرزانہ' تم نے مجھے جس طرح سمجھایا' میں سمجھتا گیا۔ عالم دین نے بتایا کہ میں نکاح فسخ کر سکتا ہوں لیکن میں نے تمہارے سمجھانے پر ایسا نہیں کیا۔ میں پھر بھی رخسانہ کو قبول کرتا رہا۔ اب اس نے اتنا بڑا دھوکا کیا ہے' میری ایسی توہین کی ہے جسے کوئی مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ عورت زندگی میں آئندہ بھی مجھے دھوکا دیتی رہے گی۔"

"نہیں جانی! رخسانہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔"

"تم فضول باتیں نہ کرو۔ کیوں اس کی وکالت کرتی ہو؟ جب سارے ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔ میرا اپنا تجربہ اس کے ساتھ ہے کہ میں نے اس کے ساتھ کیسی زندگی گزاری ہے کیسی محبت اور کیسا خلوص دیا ہے' کیسا اعتماد ہے اس پر اور وہ ہے کہ مجھے دھوکا دیتی جارہی ہے۔ اب میں تمہاری کچھ نہیں سنوں گا۔ میں نے آخری حد تک اسے اپنانے کی کوشش کی اپنی شرافت کا ثبوت دیا۔ اب میری برداشت سے باہر ہوچکا ہے میں اسے چھوڑ دوں گا۔ میں کل ہی عالم دین سے معلوم کروں گا کہ کس طرح نکاح فسخ کیا جاتا ہے اور اس پر عمل کروں گا اور اس کے بعد میں تم سے شادی کروں گا۔ تم میرے اس بچے کی ماں ہو اب تم ہی اس کی پرورش کرو گی۔"

بچہ رو رہا تھا۔ فرزانہ اسے سینے سے لگائے تھپک تھپک کر چپ کرانے کی کوشش کررہی تھی "تم جوش میں ہو اور میں ہوش میں ہوں۔ ہم دونوں کے فیصلے مختلف ہوں گے۔ دیکھو جانی! آج میں تمہیں یہ بتاتی ہوں کہ جس رات تم بہت نشے میں تھے اور میں تمہارے کمرے میں رات گزار کر آگئی تھی۔ اس رات میں نے تمہاری الماری کو کھول کر رخسانہ کی ڈائری پڑھی تھی۔ رخسانہ نے آخری صفحے پر لکھا ہے' جاکر تم پڑھ سکتے ہو کہ وہ تمہیں پھر ایک بار دھوکے میں رکھ کر یا جھوٹ بول کر پچھتا رہی ہے اور اگر کبھی اس کا جھوٹ تم پر کھل جائے تو تمہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ آکر اپنی صفائی پیش کرے گی۔ یہ بات میں بھی یقین سے کہتی ہوں کہ اس کے جھوٹ کے پیچھے کوئی گندگی' کوئی غلاظت نہیں ہے۔ جانی! وہ تمہارے سوا کسی دوسرے مرد کا [illegible] نہیں دیکھ سکتی۔ میں رخسانہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم اس کے ساتھ اتنے عرصے زندگی گزار کر بھی اسے نہ سمجھ سکے۔"

وہ غصے میں مٹھیاں بھینچ کر بولا "تم اس کی حمایت نہ کرو۔ میں ایک سوال کرتا ہوں جس شوہر سے اسے سچائی ملتی ہے' اس نے جھوٹ بول کر اسے دھوکا کیوں دیا؟"

"اس نے دھوکا نہیں دیا۔ ایک عورت جب اپنے شوہر پر بہت مان کرتی ہے' بہت اعتماد کرتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ ایک آدھ بار جھوٹ بول کر گزر جائے گی۔ اس کا شوہر اسے کچھ نہیں کہے گا۔ اگر کہے گا تو وہ اپنی محبت سے' اپنے خلوص سے' اپنی وفاؤں سے

اسے سمجھائے گی۔ اسے موم کرلے گی۔ جانی! رخسانہ کو آنے دو۔ جیسے دوسری بیویاں اپنے شوہروں کا اعتماد حاصل کرلیتی ہیں۔ وہ ایک بار پھر تمہارا اعتماد حاصل کرلے گی۔ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

جانی نے اس کی گود سے اپنے بچے کو چھین کر لیتے ہوئے کہا "میں بھی تمہیں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں' تم ہمیشہ اس کی حمایت کرتی رہو گی اور میری مخالفت کرتی رہو گی۔ تم نے اس کی خاطر مجھے دھوکا دیا۔ آج بھی اس کی خاطر محبت سے انکار کررہی ہو۔ اتنا اچھا موقع ہے کہ میں اس کے جھوٹ اور فریب کا ثبوت پیش کرکے اسے سزا دے سکتا ہوں لیکن تم کبھی میرا ساتھ نہیں دو گی۔ یہ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ ٹھیک ہے' آج میں جارہا ہوں اور آج کے بعد تم میری صورت کبھی نہیں دیکھو گی۔"

وہ یہ کہہ کر تیزی سے چلتا ہوا جانے لگا۔ اس نے آواز دی "جانی رک جاؤ۔ دیکھو غصے میں کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔"

اس نے نہیں سنا۔ دروازے سے باہر چلا گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے آئی پھر اس نے کہا "تمہیں کاکی کی قسم ہے واپس آجاؤ۔"

اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑی ہوئی تھی اور اسے التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر سر کے خفیف سے اشارے سے کہا "آجاؤ۔"

وہ آگیا۔ ایک بار پھر دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا "تو تم میرا ساتھ دے رہی ہو؟"

"ساتھ دینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ابھی میں تمہارے بچے کو سنبھالوں گی تو بدنام ہوجاؤں گی۔ میں جو کہتی ہوں کیا اس پر عمل کرو گے؟"

"اگر تم محبت سے میری بھلائی کے لیے سوچو گی اور کہو گی تو ضرور عمل کروں گا۔"

"پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟"

"میں یہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ تمہیں نہ پایا تو پانے کے لیے آخری سانس تک بھاگتا رہوں گا۔"

"محبت پانے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ چاہنے کے لیے ہوتی ہے' ہم جسے چاہتے ہیں

اس کا گھر بسانے کے لیے ہوتی ہے۔ میں تمہارا گھر اجاڑ کر کبھی تم سے محبت کا ثبوت نہیں دے سکتی بلکہ محبت کی توہین کروں گی اور میں ایسا نہیں کر سکتی۔ دیکھو میری بات مان لو۔ ایک شرط پر میں تمہاری بن جاؤں گی لیکن اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

"تو پھر ابھی نکاح فسخ نہ کرنا۔ رخسانہ کا انتظار کرنا۔"

"وہ کیوں؟"

"جو میں کہہ رہی ہوں' وہ کرو۔ وہ آئے گی' اپنے طور پر صفائی پیش کرے گی۔ بڑے سے بڑے مجرم کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے تم اسے موقع کیوں نہیں دیتے؟ اگر نہیں دو گے تو یہ تمہاری زیادتی ہوگی۔"

"ہر معاملے میں میری زیادتی ہوتی ہے پھر مجھے الزام دے رہی ہو۔"

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں۔ تمہاری طرف سے ہونے والی زیادتی سے تمہیں بچا رہی ہوں۔ تم اپنے طور پر وہ کام کرو کہ بعد میں تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہ کرے۔"

"میں ایک عرصے سے اپنے ضمیر کے حکم پر چلتا آیا ہوں۔ آج بھی میرا ضمیر مطمئن ہے۔ تم اپنی تعلیم کے ذریعے' اپنی لچھے دار باتوں سے مجھے قائل نہ کرو کہ میں رخسانہ کو اب بھی اپنا لوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ میں کبھی اسے اپنے قریب برداشت نہیں کروں گا۔ چاہے تم مجھ سے شادی کرو یا نہ کرو۔ اب میں تم لوگوں کے فریب میں نہیں آؤں گا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آگیا۔ فرزانہ نے اسے پھر آواز دی لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ اب وہ کسی آواز پر مڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس کا اعتماد محبت پر سے اٹھ گیا تھا رخسانہ نے قریب آکر چرکا لگایا تھا۔ فرزانہ دور سے محبت کے بہلاوے دے رہی تھی۔ دونوں خوب صورت بلائیں تھیں۔ دونوں خوب صورت فریب تھیں اور وہ اپنے اور بچے کے سلسلے میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ ایک ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ بچہ اس کی گود میں تھا اور وہ فیڈر سے دودھ پلا رہا تھا۔ اس کا سوٹ کیس اوپری برتھ پر پڑا تھا۔ ٹرین تیز رفتاری

سے بھاگی جا رہی تھی۔ ٹرین کہاں جا رہی ہے اور اس کی کوئی منزل ہوگی لیکن اس ٹیکسی ڈرائیور کی کوئی منزل نہیں تھی جو ہمیشہ دوسروں کو منزلوں تک پہنچاتا آیا تھا۔

○☆○
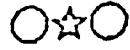
فرزانہ میز پر کہنیاں ٹیکے' دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس گہرا سناٹا تھا لیکن وہ اپنے اندر کے شور کو سن رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو آکر پوچھ رہے تھے' بہہ جانا چاہیے یا تھم جانا چاہیے؟

وہ جانے والے جانی کو نہ روک سکی۔ بہنے والے آنسوؤں کو کیا روک سکتی تھی۔ وقت رخصت یہ آنسو بہتے تو جانی کے سامنے زبان بن جاتے' وہ کچھ نہ بولتی۔ آنسو بولتے "رک جاؤ۔"

وہ آنسو بھیگا ہوا رومال بن جاتے۔ آنکھوں کی دہلیز پر لہراتے تو جانی کے پاؤں میں زنجیر پڑ جاتی۔ وہ تو خود اسیر ہونے آیا تھا۔ اپنے بچے کو سسرال والوں سے چھین کر رخسانہ سے رشتہ توڑنے کے لیے آیا تھا۔ اگر وہ بچے کو گود میں لے لیتی' جانی کو سہارا دیتی تو رخسانہ کی خوش قسمتی اس کے گھر چلی آتی اور اس کی بدقسمتی رخسانہ کے گھر پہنچ جاتی۔

ایسا کرنے میں کیا حرج تھا؟ وہ خود جانی کو اپنے پاس نہیں بلا رہی تھی۔ رخسانہ نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی خود ماری تھی۔ اپنے مرد کا اعتماد کھویا تھا اور بدقسمتی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ وہ تو اسے طلاق دینے پر' اسے چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ بس ایک اس کے ہاں کہنے کی دیر تھی۔ اس نے ہاں کہنے میں دیر کر دی۔ وہ بچے کو لے کر چلا گیا۔

وہ ایسے گیا جیسے اندر سے روح کھینچ کر لے گیا ہو۔ بے جان کر گیا ہو۔ وہ گھنٹے بھر سے اسی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ ہلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سانس بھاری لگ رہی تھی۔ پیچ در پیچ محبت جینے پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ جانی کو چھوڑا ہے تو سانس بھی چھوڑ دیتی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک گئی۔ سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ دل دھڑک دھڑک کر کہنے لگا وہ پھر آگیا ہے۔ گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ وہ وقت کو دہرانے آیا ہے کہ شاید اس کی محبوبہ کا فیصلہ بدل جائے۔

پھر دستک سنائی دی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آگے بڑھنے لگی تو پاؤں کانپنے لگے۔
اندر ہی اندر فیصلہ کپکپا رہا تھا "میں جانی کی بات مان لوں تو دنیا میرا کیا بگاڑ لے گی؟ سارا قصور رخسانہ کا ہے۔ اس نے اسے پا کر کھو دیا۔ میں اسے کھو کر پا رہی ہوں۔"

وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی' انکار میں آپ ہی آپ سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگی "نہیں' میں دنیا کی عدالت میں جانی کو جیت سکتی ہوں۔ رخسانہ کا کیس بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ضمیر کی عدالت میں جیت نہیں سکتی۔ رخسانہ نے انسانوں جیسی غلطیاں کی ہیں۔ دوسرے انسان کو اسے معاف کرنا چاہیے۔ اس کے گھر کو آباد رکھنا میرا فرض ہے۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

وہ منہ اٹھا کر کہنا چاہتی تھی "جانی واپس چلے جاؤ' بچے کو اس کی نانی کے پاس پہنچا دو۔"

لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔ دروازے کے دوسری طرف سے رخسانہ کی امی کی آواز سنائی دی "بیٹی دروازہ کھولو۔ میں ہوں۔ رخسانہ کی ماں۔"

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھل گیا۔ بیگم اور فرید احمد کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا۔ وہ جواب میں دعائیں دیتے ہوئے اندر آئے۔ فرید احمد نے دراوزہ بند کیا۔ بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا جانی یہاں آیا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"بچے کو لایا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"کہاں ہے بیٹی اسے مجھ سے نہ چھپاؤ۔ مجھے میرے نواسے کے پاس پہنچا دو۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

وہ جواب سنے بغیر بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ ادھر ادھر دیکھا پھر اندرونی دروازے کو کھول کر جھانکا۔ فرزانہ نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ کھڑی رہی۔ فرید احمد نے کہا "بیٹی! مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی؟"

"انکل آپ ہی لوگوں کا گھر ہے۔ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بغیر اجازت میرے گھر کی تلاشی لینے چلی گئی ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو ان کا ساتھ دے سکتے ہیں۔"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا "تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچہ یہاں نہیں ہے۔"

کمرے کے اندر سے بیگم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کامی کامی کہہ کر پکارتی جا رہی تھیں۔ فرید احمد نے کہا "یہ پاگل ہو جائے گی۔ نواسے کے بغیر مر جائے گی۔"

فرزانہ نے سرد لہجے میں کہا "کچھ لوگ چیخ چیخ کر مرتے ہیں۔ کچھ آواز بھی نہیں نکال سکتے۔"

فرید احمد نے ندامت سے سر جھکا کر کہا "میں تمہاری باتوں کو سمجھتا ہوں۔"

بیگم بڑبڑاتے ہوئے آگئیں "ہائے بیٹی! کامی تو کہیں نہیں ہے۔ کیا تم مذاق کر رہی ہو؟"

"خالہ جان! مذاق تو آپ کر رہی ہیں۔ آپ نے کامی سے میرا کون سا رشتہ جوڑا ہے کہ میں اسے یہاں رکھ لیتی۔ محلے والوں کو کیا جواب دیتی۔"

"اے تو مجھے پہلے روک لیا ہوتا۔ خواہ مخواہ اندر جا کر ڈھونڈ رہی تھی۔"

"آپ کو روکنا مناسب نہیں تھا۔ آپ سے بہت پہلے ایک بار آپ کی بیٹی جانی کو یہاں تلاش کرتے ہوئے آئی تھی۔ اس نے بھی اسی طرح گھر کی تلاشی لی تھی۔ میں آپ لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ میرے کہنے کے باوجود آپ کو کبھی یقین نہ آتا۔ اس لیے میں نے اندر جانے دیا۔ اب تسلی ہو گئی۔"

"خوب جلی کٹی سنالو میں سن لوں گی۔ آج ہماری بیٹی کی طرح ہمارا داماد بھی تعلیم یافتہ ہوتا تو ہمارے نصیب یوں نہ پھوٹتے۔"

فرزانہ نے چیخ کر کہا "تعجب ہے خالہ جان! اب بھی آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس نہیں ہوا۔ جانی کو الزام دے رہی ہیں۔ کیا کیا ہے اس نے؟ کیا اس نے کبھی آپ لوگوں کو دھوکا دیا ہے؟ کیا وہ آپ کی بیٹی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر رہا ہے؟ کیا وہ آپ کے بچے کو لے کر جا کر کسی سوکن کی گود میں ڈال رہا ہے؟ اس نے کیا کیا اور آپ لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔"

فرید احمد نے کہا "بیٹی! تم کتنا ہی احساس دلاؤ' ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ جن کے ذہنوں پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ ان تالوں کو تقدیر کی ٹھوکریں بھی نہیں کھول سکتیں۔"

اللہ تعالیٰ ہی کھولے تو کھولے۔"

پھر انہوں نے بیگم سے کہا "میں راستے بھر تمہیں سمجھاتا آیا ہوں کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ اپنے نواسے کو حاصل کرنے کے لیے نرمی سے باتیں کرنا چاہیے۔ جانی کو الزام نہیں دینا چاہیے۔ اب میں یہ باتیں فرزانہ کے سامنے ہی تمہیں سمجھا رہا ہوں۔"

وہ جلدی سے نرم پڑ گئیں۔ اچانک ہی مسکرائیں پھر آگے بڑھ کر فرزانہ کا ہاتھ تھام کر بولیں "میری تو مت ماری گئی ہے۔ میں آگے پیچھے کچھ نہیں سوچتی جو زبان پر آتا ہے، بولتی جاتی ہوں۔ مجھ بڑھیا کو پاگل دیوانی سمجھ کر معاف کردو۔ میرا نواسا کیا گیا ہے، میری عقل ہی چلی گئی ہے۔"

"آپ کی عقل کام نہیں کرتی ہے تو دوسروں کے مشوروں پر عمل کریں۔ آپ لوگوں نے جو زیادتیاں جانی کے ساتھ کی ہیں، اس کا حساب کریں۔ اس پر نادم ہوں اور اس ندامت کا اظہار جانی کے سامنے بھی کریں۔ وہ بہت اچھے دل کا مالک ہے، آپ کے نواسے کو پھر آپ کی گود میں لا کر رکھ دے گا۔"

"جو کہو گی، وہی کروں گی۔ تم میرے ساتھ جانی کے پاس چلو اور ہماری طرف سے صفائی پیش کرو۔ میں تمہارے سامنے اس سے معافی مانگوں گی۔ ہم اسے بتائیں گے کہ رخسانہ نے اسے دھوکا نہیں دیا ہے۔ یہ سب کچھ میری حماقتوں سے ہوا ہے۔"

"میرا جانی سے سمجھنے اور سمجھانے کا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن میں اپنی بدنامی کے داغ کو دھونے جاؤں گی۔ ذرا ٹھہریے میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔"

وہ کمرے میں آئی۔ الماری کھول کر اپنے لیے لباس کا انتخاب کرنے لگی۔ ایسے وقت دماغ میں بات آئی کہ موسم کے مطابق شوخ رنگ کا کوئی لباس پہنے گی تو بیگم اور فرید احمد کی نظروں میں جانی کو لبھانے والی کوئی چیز بن جائے گی۔ وہ الماری کے تمام کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جتنے لباس تھے، سب ہی پسندیدہ تھے۔ اسی لیے تو سلوائے گئے تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس میں وہ کمتر نظر آتی۔

گھر سے نکلنے کے لیے منہ ہاتھ دھونا اور کنگھی چوٹی کرنا بھی لازمی تھا لیکن سادگی سے بننا سنورنا بھی نگاہوں میں کھٹکنے لگتا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ اسی حال میں چلے۔ کسی کو کیا دکھانا ہے۔

اس نے آئینے کے سامنے آ کر خود کو دیکھا۔ اس کا لباس کہیں کہیں سے شکن آلود تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں اداسیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چہرہ اگرچہ جانی کی طرف سے کوئی چغلی نہیں کھاتا تھا تاہم اس چہرے پر محرومیاں صاف پڑھی جاتی تھیں۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ کیا مصیبت ہے۔ جانی دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ محبت اور محرومیوں نے میرا یہ حال بنا رکھا ہے۔

وہ پریشان ہو کر کبھی الماری کو، کبھی آئینے کو، کبھی اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ دنیا والوں کو کسی طرح قرار نہیں تھا۔ ہر طرح وہ بدنام ہوتی یا جانی کے دل میں خوش فہمی پیدا کر دیتی۔ آخر تھک ہار کر اس نے سوچا جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ دنیا والوں سے ڈرتے رہنے سے دنیا اور ڈراتی ہے۔ جب میرا دل صاف ہے تو میں کسی سے نہیں ڈروں گی۔

اس نے الماری کھولی۔ ایک جوڑا نکالا پھر باتھ روم میں چلی گئی۔ ڈسپنسری میں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیگم بے چینی سے اندرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کبھی اٹھ کر ٹہل رہی تھیں پھر وہ فرید احمد کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور دھیرے سے کہنے لگیں۔ "دیکھ لینا، جانی کے پاس جا رہی ہے، خوب بن سنور کر نکلے گی۔"

فرید احمد نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بیگم! تمہیں خدا کا واسطہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔"

"اے جب دیکھو زبان قابو میں رکھنے کی بات کرتے ہو۔ کیا زبان کاٹ کر پھینک دوں۔ کہنے والی باتیں بھی نہ کہوں۔ سانچ کو آنچ کیا ہے۔ ابھی وہ آتی ہوگی۔ خود دیکھ لینا۔"

پھر انہوں نے دیکھا اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے شلوار سوٹ میں اس کی گوری رنگت گلاب کی طرح کھل رہی تھی۔ وہ بدستور سنجیدہ تھی مگر چہرہ میک اپ کے بغیر ہی مسکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ سیاہ زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ کچھ شانے پر بکھری ہوئی تھیں۔ ان سیاہ بالوں کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ وہ سیدھے جانی پر جا کر ہی برسیں گے۔

بیگم کا دل ڈوبنے لگا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ فرزانہ نے آگے بڑھ کر

دروازے کو کھولا۔ سامنے ایک خوش پوش اسمارٹ سا نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے سر سے پاؤں تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے حیرت اور مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ فرزانہ نے اسے چند لمحوں تک سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔

"کیا تم جمشید ہو؟"

وہ مسکرا کر بولا "بھئی خوب پہچانا۔ میں تو سمجھ رہا تھا تم نے مجھے بھلا دیا ہوگا۔ مجھے بھی دیکھو لندن سے تمہارے پاس چلا آرہا ہوں۔ رخسانہ نے تمہارا پتا دیا تھا۔ یہاں آکر بہت دیر سے بھٹک رہا ہوں۔ لوگوں سے پوچھ رہا ہوں۔ کوئی مجھے ادھر بھٹکا دیتا ہے کوئی ادھر بھٹکا دیتا ہے۔ بہرحال تمہارے دروازے پر کھڑا ہوں۔ کیا دروازے سے ہی واپس چلا جاؤں؟"

وہ ایک طرف ہٹ کر بولی "اندر آجاؤ۔ یہاں رخسانہ کی امی اور ابو بیٹھے ہوئے ہیں۔"

وہ خوش مزاجی سے نعرے لگانے کے انداز میں اندر آیا۔ "اوہ مائی ڈیئر آنٹی اینڈ انکل! میں آپ لوگوں کو بتانا بھول گیا۔ ادھر آپ کے مسٹر جانی نے ایسا ہنگامہ کیا تھا کہ کچھ یاد نہیں رہا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ رخسانہ نے مجھے فرزانہ کا پتا دیا تھا۔ جانتی ہیں کیوں۔ فرزانہ کے لیے وہاں ایک بہت ہی عمدہ ملازمت کا بندوبست ہوگیا ہے۔ بہت اچھی تنخواہ ہے اور رہنے سہنے کا بھی معقول انتظام ہے۔"

پھر اس نے فرزانہ کی طرف پلٹ کر کہا "فٹافٹ تیار ہوجاؤ۔ میں تمہارا پاسپورٹ بنوا دوں گا۔"

"جمشید! تم ہوش میں تو ہو؟"

جمشید نے حیرانی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"کیا تم مجھے کوئی گری پڑی چیز سمجھتے ہو کہ یہاں آکر مجھے اٹھایا اور وہاں پہنچا دیا؟ میرا اپنا کوئی فیصلہ نہیں ہے؟ میری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے؟ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟"

"سو، سوری فرزانہ دراصل رخسانہ نے مجھ سے کہا تھا کہ تم وہاں ملازمت کرنا چاہتی ہو۔ جب میں یہ خوش خبری سناؤں گا تو تم فوراً وہاں چلنے کے لیے تیار ہوجاؤ گی۔"

"بے شک، میں یہی چاہتی تھی لیکن ہم کل جو چاہتے تھے، آج نہیں چاہتے اور جو آج چاہتے ہیں، وہ کل نہیں چاہیں گے۔ انسان کی مرضی اور اس کے ارادے بدلتے رہتے ہیں۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں بولا "تم دونوں سہیلیاں کالج میں بھی تیز تھیں۔ کوئی باتوں میں جیت نہیں سکتا تھا۔ میں آج بھی ہار مانتا ہوں، بھئی آئندہ سوچ سمجھ کر بولوں گا۔"

بیگم نے کہا "بیٹے! تم نے دیکھا ہے جانی ہمارے ساتھ کیسی بدتمیزی کر رہا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد وہ بچے کو ہم سے چھین کر لے گیا ہے۔"

فرزانہ نے انہیں گھور کر دیکھا۔ جمشید نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا "ایک ٹیکسی ڈرائیور سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔"

فرزانہ نے کہا "خالہ جان، بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ پھر جانی کے خلاف بول رہی ہیں۔ اپنے داماد کی توہین کرنے کا موقع دوسرے کو بھی دے رہی ہیں اور مسٹر جمشید! میں تم سے پوچھتی ہوں۔ اگر تمہاری بیوی ایک بار جھوٹ بول کر دوسری بار جھوٹ بولتی۔ ایک بار دھوکا دے کر دوسری بار دھوکا دیتی اور تم سے ہزاروں میل دور تمہارے جیسے کسی نوجوان کے پاس جاکر رہتی تو اس وقت تم کیا کرتے؟ میرا جواب یہ ہے کہ تم بھی ٹیکسی ڈرائیور بن کر سوچتا اور بولنا شروع کر دیتے۔ کچھ بولا کرو تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔"

فرید احمد نے کہا "بیٹی جانے بھی دو۔ جو سونا ہے، وہ سونا ہی رہے گا۔ ہمیں یہاں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے، فوراً جانی کے پاس چلنا چاہیے۔"

جمشید نے اپنے ایک کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "میں کان پکڑتا ہوں۔ آئندہ بہت ہی سوچ سمجھ کر بولا کروں گا اور ابھی تمہارے ساتھ چل کر جانی کی حمایت کروں گا۔ بے شک اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ باہر میری گاڑی کھڑی ہے، آؤ چلیں۔"

وہ سب باہر آگئے۔ فرزانہ نے دروازے پر تالا لگایا پھر بیگم کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ فرید احمد نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "جانی غصے میں تھا لیکن بچے کو نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ وہ ماں کی اور نانی کی گود کو پہچانتا ہے۔ اس وقت رو رہا ہوگا۔"

جمشید نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے عقب نما آئینے میں فرزانہ کو دیکھا پھر اس کے مزاج کو سمجھتے ہوئے کہا "انکل، آج کل جسے غصہ دلایا جائے گا اور جس پر ظلم کیا جائے

بر

گا' وہ کسی کو قتل نہ کرے' کسی کو گالی نہ دے لیکن اپنے بچے کو انتقاماً چھین کر تو لے جا سکتا ہے۔"

بیگم نے کہا "وہ ہماری کمزوری کو پا گیا ہے۔ بچہ کسی طرح بھی مجھے مل جائے۔ ہمیشہ کے لیے ہمارا ہو جائے تو میں جانی کے نام پر خاک ڈالوں۔ میری بیٹی کے لیے کیا رشتوں کی کمی ہے۔ جانے وہ کتنی حسین بن کر آئے گی۔ اس کے ساتھ ایسے داماد کا نام لیتے ہوئے شرم آئے گی۔"

فرزانہ نے ناگواری سے کہا "جمشید! گاڑی روکو' مجھے جانے دو۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ یہ خالہ جان اپنی بیٹی کو طلاق دلوا کر ہی رہیں گی۔"

جمشید نے بدستور ڈرائیو کرتے ہوئے کہا "نہیں فرزانہ! آنٹی کہتی ہیں تو کہنے دو۔ ہمیں وہاں چلنا ہی ہوگا۔ رخسانہ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ اگر ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان صلح کرا دیں تو یہ بڑی نیکی ہوگی۔"

"میں پہلے بھی ایسی نیکیاں کر چکی ہوں۔ میری نیکی کے باعث رخسانہ سہاگن بنی' اس کا نتیجہ ابھی تک بھگت رہی ہوں۔ دوسری نیکی کرنے جاؤں گی تو یقین کرو' یہ بدنامی میرے سر آئے گی کہ جانی نے میری وجہ سے رخسانہ کو طلاق دے دی۔ کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ ایک ماں خود اپنی بیٹی کی دشمن بن گئی ہے۔"

فرید احمد نے کہا "میں اور جمشید اس بات کے گواہ ہیں کہ بات کس کی طرف سے بگڑتی جا رہی ہے۔ کوئی تمہیں بدنام نہیں کرے گا۔ ہمیں وہاں چلنا چاہیے بلکہ بیگم کو گاڑی سے اتار دیا جائے۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں "بڑے آئے گاڑی سے اتارنے والے۔ میں اپنے نواسے کے پاس ضرور جاؤں گی۔ اسے کسی نہ کسی طرح لے کر آؤں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے جانی کے قدموں میں کیوں نہ گرنا پڑے۔"

فرزانہ نے کہا "خالہ جان! آپ سمجھ میں نہیں آتیں۔ کبھی تو جانی کو اتنا برا کہتی ہیں' اتنا نظروں سے گرا دیتی ہیں جیسے وہ انسان ہی نہ ہو اور کبھی اس کے قدموں میں خود گرنا چاہتی ہیں۔"

"بیٹی! یہ مینٹل کیس ہے تم انہیں نظر انداز کر دو۔"

وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے جانی کے مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ گاڑی سے اتر کر احاطے میں داخل ہوئے پھر دروازے کے پاس آ کر دیکھا تو تالا لگا ہوا تھا۔ بیگم نے کہا "معلوم ہوتا ہے وہ بچے کو لے کر ادھر نہیں آیا ہے۔"

فرید احمد نے سوچتے ہوئے کہا "پھر وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

جمشید نے کہا "بھئی یہ اس کا گھر ہے۔ کہیں بھی جائے گا لیکن یہیں آئے گا' پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔"

بیگم نے کہا "پریشان ہونے کی بات کیسے نہیں ہے۔ جانی باپ سہی مگر بچے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کب دودھ کے لیے' کب سونے کے لیے اور کب گود میں کھیلنے کے لیے روتا ہے۔ اب تو وہ روتا ہی رہے گا۔"

فرزانہ نے کہا "آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ اب تو وہ روتا ہی رہے گا۔ اپنے بڑوں کی غلطیوں پر۔"

"اے تم تو بولے جا رہی ہو۔ بولے ہی جا رہی ہو۔ طعنے کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کر سکتیں۔ سچ سچ بولو۔ کیا جانی تمہارے پاس بچے کو لے کر نہیں آیا تھا۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ وہ آئے تھے میں نے بچے کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ غصے میں چلے گئے۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں "اے ہے' کیا باتیں بنا رہی ہو۔ کیا سچ بولتے ہوئے منہ میں آگ لگتی ہے۔ تم نے اسے سکھایا پڑھایا ہے کہ وہ بچے کو لے کر کہیں چھپا دے پھر تم سے آ کر شادی کرے اس کے بعد بچہ تمہارا اور اس کا اور میری بیٹی منہ دیکھتی رہ جائے۔"

فرزانہ مٹھیاں بھینچ کر' دانت پر دانت جما کر غصے کو برداشت کر رہی تھی۔ جی چاہتا تھا' جو منہ میں آئے بولتی چلی جائے' خوب باتیں سنائے لیکن کیسے سنائے' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سامنے ایک بزرگ خاتون تھیں اور ان کی امی سے ان کا اچھا تعلق رہا تھا۔ وہ اچھے پڑوسی رہے تھے۔ ان کی بیٹی ایک اچھی سہیلی رہی تھی۔ ان کے لیے اس نے بہت دکھ اٹھائے تھے اور ان کی خاطر دکھ اٹھا کر خوشی بھی محسوس کی تھی۔ اب وہ کس منہ سے انہیں باتیں سنائے۔ جب وہ کچھ نہ کر سکی تو بے اختیار رونے لگی۔

فرید احمد نے غصے سے کہا "بیگم لعنت ہے تم پر۔ میں نے تمہاری جیسی جاہل عورت

اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں "میں نے بھی آپ جیسا تھالی کا بینگن کہیں نہیں دیکھا' اب تک میری ہاں میں ہاں ملاتے رہے' اب اس چھوکری کی حمایت کر رہے ہیں۔ میری محبت کو تو کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے۔ میں نواسے کے لیے مری جا رہی ہوں اور مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ کیا اکیلے میں نے ہی گھر بگاڑا ہے؟ اس میں جانی کا یا کسی اور کا کوئی قصور نہیں ہے؟ یہ اوپر سے رو رو کر تم لوگوں کے دلوں کو موم کر رہی ہے۔ ذرا اس سے تو پوچھو' یہ بن سنور کر کسے دکھانے آئی ہے۔"

فرزانہ ایک دم سے پلٹ گئی۔ تیزی سے واپس جانے لگی۔ جمشید اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا "رک جاؤ! میں سمجھ رہا ہوں۔ آنٹی کی زیادتی ہے۔ ان کی باتیں ناقابل برداشت ہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ میں تمہیں پہنچا دوں گا۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے جا رہی تھی۔ نہ سن رہی تھی۔ نہ جواب دے رہی تھی۔ جمشید اس کی خوشامدیں کرنے لگا۔ "دیکھو فرزانہ! میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنے آیا ہوں لیکن یہ آنٹی اور انکل درمیان میں آ گئے۔ رخسانہ نے تمہارے متعلق بہت کچھ کہا ہے' مجھے تنہائی میں تھوڑا سا موقع دو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آؤ میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی "مجھے مجبور نہ کرو۔ میرا پیچھا نہ کرو۔ چلے جاؤ۔ میں اکیلی گھر چلی جاؤں گی۔"

"فرزانہ! اس طرح بات نہیں بنتی۔ تم اتنی سمجھ دار ہو مگر ایک بات نہیں سمجھ رہی ہو کہ آخر ساری بدنامیاں تم پر کیوں آتی ہیں؟"

وہ غصے سے بولی "کیوں آتی ہیں؟"

"ہم یہ بات سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر نہیں کر سکتے۔ میری گاڑی ہے۔ آؤ بیٹھو۔ ہم اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے جائیں گے۔ اچھا ٹھہرو۔ وہاں جاؤ گی تو آنٹی پھر الٹی سیدھی باتیں کریں گی' میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔ دیکھو جانا نہیں' میں ابھی آیا۔"

وہ دوڑتا ہوا واپس مکان کے احاطے کے پاس آیا پھر گاڑی میں بیٹھ کر اسے واپس موڑ کر ڈرائیو کرتا ہوا فرزانہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں گاڑی روک کر اگلی سیٹ کا دروازہ

کھولا۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بیٹھ گئی۔ دروازے کو بند کر لیا پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑا فاصلہ خاموشی سے طے ہوا پھر جمشید نے کہا "رخسانہ نے مجھے بتایا ہے کہ شادی کیسے ہوئی۔ چہرہ تمہارا دکھایا گیا' دلہن اسے بنایا گیا۔ ان حالات میں اگر جانی تمہارے پیچھے بھاگتا ہے اور اگر تم جانی سے متاثر ہو گئی ہو تو یہ ایک قدرتی بات ہے۔ کیا میں تمہارے متعلق ایک ذاتی سوال کروں؟"

فرزانہ نے اسے دیکھا پھر پوچھا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں جانی سے محض متاثر ہوں یا محبت کرتی ہوں؟"

"کمال ہے۔ میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"اس میں کمال کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب سے رخسانہ کی شادی ہوئی ہے۔ جب سے جانی میرے پیچھے دوڑ رہے ہیں' تب ہی سے رخسانہ' اس کے والدین میرے سکھر والے رشتے دار یہاں تک کہ میری امی مرحومہ بھی یہی کہتی تھیں کہ میں جانی سے محبت کرتی ہوں۔"

"دنیا والوں کو رہنے دو۔ اپنی بات کہو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار خلا میں کسی کو دیکھتی رہی پھر اس کی آواز جیسے دور' بہت دور سے آئی "ہاں محبت کرتی ہوں۔"

"مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی صاف گوئی سے اعتراف کرو گی۔"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ میں کوئی جرم نہیں کر رہی ہوں۔ محبت کے معنی اگر یہ ہیں کہ میں کسی کو کسی سے چھین لینا چاہتی ہوں تو یہ محبت نہیں حماقت ہے' محبت تو اسے کہتے ہیں کہ جسے ہم چاہیں اس کے گھر کو آباد رکھیں۔ اسے بگڑنے سے بچالیں۔"

"تم نے اسے بچانے کے لیے کیا کیا؟"

"جو میری سمجھ میں آیا۔ کرتی رہی' جانی سے دور بھاگتی رہی۔"

"اس طرح اس کی دیوانگی بڑھتی رہی۔"

"میں کیا کروں۔ دیوانگی جانی کی ہے' میری نہیں ہے۔"

"نفسیاتی طریقہ کار پر غور کرو تو جو چیز حاصل نہیں ہوتی' ہاتھ آتے آتے رہ جاتی ہے اس کے لیے انسان ہر عمر میں للچاتا ہے۔ فرزانہ فراخ دلی سے اپنے غلطی کا اعتراف کرو۔

تم جانی کے عشق کو ہوا دیتی رہی ہو۔"

وہ جھنجلا کر بولی "تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا میں اپنی جان دے دیتی؟"

"ہرگز نہیں۔ سیدھا سادھا صاف راستہ تھا۔ تم شادی کر لیتیں۔"

"شادی کرنا میری مرضی' میری پسند کی بات ہے۔ کوئی دوسرا یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔"

"بے شک کوئی تمہیں مشورہ نہ دے' یہ تمہارے سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کا شوہر تمہارا دیوانہ بنتا جارہا ہے۔ اس کی دیوانگی بڑھتی جارہی ہے تو کیا تم کسی کو پسند نہیں کرسکتی تھیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہارا جیون ساتھی بن سکے؟"

"مجھے جیون ساتھی کا ارمان نہیں ہے۔"

"کیا تم پورے سماجی شعور سے یہ بات کہہ رہی ہو کیا ایسا کہتے وقت سمجھ رہی ہو کہ تمہاری جیسی نوجوان خوب صورت لڑکی تنہا زندگی گزارے جس کا آگے پیچھے کوئی رشتے دار نہ ہو۔ کوئی بزرگ نہ ہو تو دنیا والے اس پر کس طرح انگلی اٹھاتے ہیں۔ محلے پڑوس والے کیسی باتیں بناتے ہیں پھر یہ کہ رخسانہ کے گھر سے تمہاری بدنامی کا جو سلسلہ چلا آرہا ہے۔ وہ کب تک چلتا رہے گا۔ کیا تم نے اس کا حساب کیا ہے؟"

وہ خاموش رہی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔ جمشید نے کہا "تم دونوں سہیلیاں ذہین ہو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو ذہین ہوں۔ وہ غلطیاں نہ کرتے ہوں ادھر رخسانہ کی غلطی ایک طرف ہے' تمہاری غلطی یہ ہے کہ رخسانہ کے لیے قربانی دینے کے باوجود اس کے شوہر کو اپنے پیچھے دوڑنے پر مجبور کرتی رہیں۔ اس نے اپنے شوہر کا ایک نفسیاتی تجزیہ کیا ہے جو بالکل درست معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جانی تم سے محبت نہیں کرتا بلکہ ضد کرتا ہے جو چیز اس کے ہاتھ آکر چھین لی گئی ہے اس کے لیے ایک نادان بچے کی طرح مچل رہا ہے۔ اس نادان کو یہ یقین ہوجائے کہ تم پرائی ہوچکی ہو۔ کسی کی منکوحہ ہو تو وہ شریف آدمی پھر کبھی تمہاری طلب نہیں کرے گا۔"

"وہ دیوانہ ہے' دیوانگی سے باز نہیں آئے گا۔"

"ایک بیوی اپنے شوہر کو جتنی دور تک پہچانتی ہے' اتنی دور تک ایک محبوبہ پہچاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ جمشید نے کہا "یہ تو ایک الگ سی بات ہے کہ وہ دیوانہ باز آئے گا یا نہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ تم شادی کیوں نہیں کرتیں۔ اگر جیون ساتھی کے لیے کوئی اور پسند نہیں آتا ہے۔ اگر دلہن بننے کی خواہش نہیں ہے تو قربانی کے جذبے سے شادی کرو۔ ذرا غور کرو۔ تمہاری نیکیاں برباد ہورہی ہیں اور بدنامیاں سر آرہی ہیں۔"

جو بات سچی اور کھری ہوتی ہے' وہ دل پر اثر کرتی ہے اور انسان لاشعوری طور پر اسے مانتا ہے لیکن جس دل پر اثر کرتی ہے' وہ دل نہیں مانتا۔ فرزانہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ اس میں اعتراف کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جمشید نے کہا "ابھی تم نے کہا تھا کہ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے گھر کو بربادی سے بچایا جاتا ہے۔ تم اس کا عملی ثبوت دو۔ تمہاری شادی سے بہت سوں کی بگڑی بن جائے گی۔"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی "مجھے پیاس لگ رہی ہے' گھر پہنچادو۔"

جمشید نے ایک اسنیک بار کے سامنے گاڑی روک دی۔ ٹھنڈی بوتل لاکر اسے دی۔ "اسے پیو اور کچھ دیر میرے ساتھ رہو۔ میں اور بہت سی ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں بہت پریشان ہوں۔ اس مسئلے پر تمہارے ساتھ بحث نہیں کرسکوں گی۔"

"مسئلے سے فرار ہونے کی کوشش کی جائے تو وہ مسئلہ پہاڑ بنتا جاتا ہے۔ اسے حل کرنا چاہیے۔ آج فیصلہ کرلو کہ تمام پریشانیاں ختم ہوں گی یا پھر اسی طرح مسئلے کو روگ بنا کر پالتی رہو گی۔ آج کوئی فیصلہ ہوجائے۔"

وہ ٹھنڈا مشروب حلق سے اتارنے لگی۔ کلیجے میں ٹھنڈک پہنچ رہی تھی مگر دماغ جل رہا تھا۔ نیکی برباد ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جمشید بوتل واپس کرکے اپنی اسٹیرنگ سیٹ پر آیا پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ "میں جب کالج میں تھا اور تم دونوں سہیلیوں کو دیکھا کرتا تھا تو دوستوں میں شرط لگتی رہتی تھی۔ ہر لڑکا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ تم میں سے کسی ایک کو اپنی طرف مائل کرلے گا۔ میں بڑی بڑی شرطیں لگاتا تھا لیکن خود یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تم دونوں میں کون بہتر ہے۔ کون مجھے پسند ہے' یہی وجہ ہے کہ جب میں نے گمنام محبوب بن کر خط لکھا تو تم میں سے کسی کو مخاطب نہیں کیا بلکہ تم دونوں کو الجھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ دور ہی دور سے تماشا دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ جو بھی میری

طرف مائل ہوگی' میں اسے اپنالوں گا۔"

سامنے سرخ سگنل تھا۔ اس نے گاڑی روک دی پھر کہنے لگا "اس کے بعد وہ حادثہ پیش آیا۔ جب میری شرارت کی وجہ سے رخسانہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس وقت مجھے رخسانہ سے محبت ہوگئی۔ میں نے سوچا' اچھا موقع ہے میں اپنی دولت کے ذریعے اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کراؤں گا اور اس کا دل جیت لوں گا۔"

سگنل سرخ سے پیلا ہوگیا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھادی پھر کہنے لگا۔ "رخسانہ رفتہ رفتہ میرے خواب وخیال میں بس گئی۔ میری ضد بن گئی۔ میں نے اس کے لیے یہاں کی تعلیم چھوڑ دی۔ پاپا کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے لیے لندن چلا گیا۔ دوستوں سے پھر شرط لگی تھی اور میں یہ دعویٰ کرکے گیا تھا کہ رخسانہ کو لندن بلاؤں گا۔ اس کا چہرہ بناؤں گا اور اس سے شادی کرکے دکھاؤں گا۔ میں نے پاپا کے سامنے ضد بھی کی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایک برس کے اندر حالات بدل جائیں گے۔ رخسانہ وہاں آئی تو میں نے اسے بن بیاہی سمجھ کر اپنانے کی کوشش کی۔ ایک بار نشے کی حالت میں شیطان بن گیا لیکن وہ بہت ذہین اور ہمت والی لڑکی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بچالیا۔ اس کے بعد یہ بھید کھلا کہ وہ صرف شادی شدہ ہی نہیں ایک بچے کی ماں بھی ہے۔"

اس نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا "لیکن رخسانہ نے وہی غلطی کی جو تم نے جانی کے ساتھ کی۔ تم نے جانی کو اپنا چہرہ دکھایا اور اس کے لیے ایک چیلنج بن گئیں۔ رخسانہ نے خود کو بن بیاہی ظاہر کیا۔ میرے اعتماد سے کھیلا' مجھے بے وقوف بنایا۔ میرے سہارے آکر پلاسٹک سرجری کے ذریعے خود کو مکمل کرنا چاہا۔ اس کا یہ رویہ' یہ مکر' یہ جھوٹ' یہ فریب میرے لیے ایک چیلنج بن گیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کی کمزوری سے کھیل کر اس کے شوہر کو اپنی دولت سے خرید لوں گا یا پھر کوئی ایسا راستہ تلاش کروں گا کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کرنے پر مجبور ہوجائے۔"

وہ پھر ذرا دیر کے لیے چپ ہوا۔ اس کے بعد بولنے لگا "میں نے رخسانہ کو بتایا کہ میں پاکستان کچھ عرصے کے لیے جارہا ہوں۔ تب اس نے مجھے تمہارے متعلق بتایا۔ اپنے شوہر کے متعلق بتایا۔ اپنی پوری داستان سنائی اور یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ تم نے شادی نہ کی

یا اس ملک کو نہ چھوڑا تو جانی ایک دن تمہیں تلاش کرلے گا اور ایک دن تمہیں حاصل کرلے گا۔"

"میں جانتی ہوں' رخسانہ میرے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتی ہے۔"

جمشید نے انکار میں سرہلا کر کہا "ہوسکتا ہے کہ تم دونوں سہیلیاں آپس میں لڑتی ہو لیکن رخسانہ پیٹھ پیچھے کبھی برائی نہیں کرتی۔ کم از کم میرے سامنے ایسا نہیں کیا بلکہ تمہاری تعریفیں کی ہیں۔ بڑے اعتماد سے کہا کہ تم جانی سے دور رہنا چاہتی ہو۔ جانی ہی تمہارے پیچھے بھاگتا ہے۔ یہ سلسلہ ختم کرنے کے لیے ہم نے وہاں تمہاری ملازمت کا بندوبست کیا ہے۔ میں اس سے وعدہ کرکے آیا ہوں کہ تمہیں شادی پر راضی کروں گا یا لندن جاکر ملازمت کرنے کے لیے راضی کرلوں گا۔"

"اسی لیے تم اتنی دیر سے شادی کے لیے مجبور کررہے ہو۔"

"کوئی برا تو نہیں کررہا ہوں۔ آگے تو سنو کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"میں سن رہی ہوں۔"

"جب رخسانہ نے ذکر کیا' تب مجھے یاد آیا کہ میں اسے حاصل کرنے کی ضد میں تمہیں بھلا چکا ہوں۔ جب کہ تم دونوں میں سے کسی ایک کو اپنانا چاہتا ہوں۔ بہرحال ابھی تمہارے دروازے پر آکر میں نے تمہیں دیکھا تو اسی وقت دل نے کہا۔ تم میری بن جاؤ گی تو میں رخسانہ کو حاصل کرنے کی ضد چھوڑ دوں گا۔"

ایسا کہتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی ہوئی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ جمشید نے کہا "مجھ میں کچھ برائی ہے۔ کچھ اچھائی ہے۔ جانی میں بھی کچھ برائی اور کچھ اچھائی ہوگی۔ کوئی بھی پورا کا پورا شیطان نہیں ہوتا اور پورا پورا انسان نہیں ہوتا۔ اگر شیطان ہوتا تو اسے راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔ تم میری شریک حیات بن کر مجھے بے جا ضد سے بچاسکتی ہو۔ جانی کو اپنے پیچھے بھاگنے سے باز رکھ سکتی ہو۔ تمہارے ایک فیصلے سے سارے مسائل حل ہوجائیں گے۔"

وہ بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی "جمشید' تم بہت اچھے ہو لیکن میں بہت اچھی نہیں ہوں۔ شادی کا موضوع ختم کرو۔"

"ہم سب کے مسائل کا حل شادی ہے۔ اگر تم میری شریک حیات نہیں بننا چاہتیں

تو پھر جانی سے شادی کرلو۔"

فرزانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے سرہلا کر کہا "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم جانی سے شادی کرلو گی تو میں رخسانہ کو اپنا لوں گا۔ دو میں سے کوئی ایک بات ہونی چاہیے۔ اگر تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو میں یہاں رخسانہ کے خلاف جانی کے دل میں ایسے شبہات پیدا کردوں گا جس کے بعد ان کے درمیان طلاق لازمی ہو جائے گی۔"

"تمہیں ایسی گری ہوئی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔"

"غصہ نہ دکھاؤ۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ جو گری ہوئی بات میں رخسانہ کے لیے کررہا ہوں' وہی گری ہوئی حرکتیں تم جانی کے ساتھ کررہی ہو۔ شادی نہ کرنا' کسی کے شوہر کو اپنے پیچھے لگائے رکھنا' کون سا شریفانہ طرز عمل ہے فرزانہ! کسی پر کیچڑ اچھالنا' کسی کی برائی دیکھ لینا بہت آسان ہے لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی کمزوریوں کو سمجھنا اور اعتراف کرنا بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے۔ یہ حوصلہ اپنے اندر پیدا کرو۔"

"گاڑی روک دو۔ میں رکشے یا ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔"

"کیوں' حوصلہ نہیں ہے؟ میں آنٹی کو جاہل اور بدزبان سمجھ رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ جہاندیدہ خاتون ہیں۔ انہوں نے تم پر کیچڑ نہیں اچھالا بلکہ تمہاری حقیقت بیان کی اور تمہیں اس وقت رونا آگیا میں گاڑی تمہارے گھر کی طرف لے جارہا ہوں۔ چپ چاپ بیٹھی رہو اور اگر اترنا چاہو تو اس سے پہلے اعتراف کرو کہ تم جانی کو دانستہ دیوانہ بنارہی ہو۔ رخسانہ پر ثابت کررہی ہو کہ اس کا شوہر ساری عمر تمہارے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ اور تم اسے بھگاتی رہو گی۔ تم ایک ذہنی مریضہ ہو۔ دوسرے کو مسائل میں الجھا الجھا کر غیر شعوری طور پر خوشیاں حاصل کرتی ہو۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ اس وقت گاڑی پاپوش کے علاقے سے گزر رہی تھی۔ بے شمار لوگ آجارہے تھے۔ اس نے کہا "میں تمہارے ساتھ اپنے گھر تک نہیں جاؤں گی۔ محلے والے باتیں بنائیں گے۔ وہاں سامنے بس اسٹاپ پر روک دو۔"

جمشید نے گاڑی آگے لے جاکر روک دی اور پھر کہا "تم نے میری باتوں کا کوئی

جواب نہیں دیا۔"

اس نے جواب دیا "کسی عورت کو یقین ہو جائے کہ کوئی مرد اسے دیوانہ وار چاہتا ہے اور اس کی مٹھی میں ہے تو اس عورت کو دنیا جہاں کی خوشیاں مل جاتی ہیں۔ میں بھی شاید یہ خوشی حاصل کرتی ہوں لیکن جب تک وہ میری مٹھی میں ہے' اس وقت تک اسے رخسانہ کے خلاف بھڑکا نہیں سکو گے۔ بہکا نہیں سکو گے۔ اسے طلاق نہیں [illegible] گے۔ میں رخسانہ کی حفاظت کروں گی۔ اب اس کے سہاگ کی سلامتی اس بات [illegible] کہ جانی دیوانہ وار میری بات پر اعتماد کرے اور رخسانہ کو معاف کردے اور وہ ایسا کرے گا۔"

یہ کہتے ہوئے فرزانہ نے دروازے کو کھولا۔ گاڑی سے باہر جانے کے لیے ایک قدم نکالا پھر رک کر بولی "اس مسئلے کا حل شادی نہیں ہے۔ کیونکہ مرد کی ہوس کہیں جاکر نہیں رکتی۔ رخسانہ شادی شدہ ہے مگر تمہاری ہوس یہاں تک اس کے لیے جال بچھانے آگئی ہے پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میرے شادی کرنے کے بعد جانی میرا پیچھا چھوڑ دے گا؟ جمشید! شادی پرابلم نہیں ہے۔ تم لوگوں کی ہوس پرابلم ہے۔ ایک لڑکی کسی کی بیوی بن جاتی ہے' کسی بچے کی ماں بن جاتی ہے' اس کے باوجود تم لوگ اسے حاصل کرنے کے لیے شرطیں لگاتے ہو۔ کیسے ہو تم لوگ؟ بہتر ہے کہ تم کسی کو اپنی شریک حیات نہ بناؤ' اگر بناؤ تو پہلے ہوس کے بازار میں حساب لگاؤ کہ تمہاری بیوی اور تمہارے ہونے والے بچے کی ماں پر کتنے لوگ شرطیں لگارہے ہیں۔ شاید تمہیں شرم آجائے۔"

اس نے کار سے باہر نکل کر دروازے کو زوردار آواز کے ساتھ بند کردیا۔ قریب ہی ایک منی بس کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں جاکر بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ اپنے کلینک کے دروازے پر پہنچ کر تالا کھول رہی تھی۔ اس وقت کمپاؤنڈر نے آکر کہا "باجی! آپ کا خط آیا ہے۔ ڈاکیا واپس جارہا تھا۔ میں نے وصول کرلیا۔"

فرزانہ نے لفافے کو دیکھا۔ اس پر ایک طرف رخسانہ کا لندن کا پتا لکھا ہوا تھا۔ وہ ڈسپنسری میں آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لفافے کو چاک کرکے اس میں سے ایک تہ کیے ہوئے کاغذ کو نکالا پھر اسے کھول کر دیکھا۔ رخسانہ کی جانی پہچانی تحریر تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"میری پیاری اور بہت پیاری بہن!

یہ خط لکھتے ہوئے مجھے خوشی بھی ہو رہی ہے اور شرمندگی بھی۔ شرمندگی اس لیے کہ تم سے بہت لڑتی ہوں اور خوشی اس لیے کہ لڑنے کے باوجود تمہاری چاہت ایک خوشبو کی طرح میرے چار سو پھیلی رہتی ہے کیونکہ میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں۔ یہاں ہزاروں میل دور آکر مجھے احساس ہوا کہ میں نے تم پر بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ تم پر خواہ مخواہ الزامات لگائے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ہم اپنے محاذ سے ہٹ جاتے ہیں اور دور بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ ہمارے گھر میں دشمن ہی دشمن ہیں اور ہماری ایک عزیز ترین چیز چرا کر لے جائیں گے تو پھر ہمیں بے بسی اور دشمنوں کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت دشمنوں کی خامیوں کے ساتھ خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ یہی حال میرا ہوا۔ یہاں آکر میں نے ٹھنڈے دماغ سے تمہارے متعلق سوچنا شروع کیا تو میرے دل میں الہام کی طرح یہ یقین اترا کہ تم محبت' خلوص اور ایثار کا مجسمہ ہو۔ اس سے زیادہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گی۔ مبادا تم اسے خوشامد نہ سمجھ لو۔

فرزانہ تم نے مجھے بہت اچھا مشورہ دیا تھا کہ میں بن بیاہی بن کر اپنے گھر سے نہ نکلوں۔ میں نے تمہاری بات نہیں مانی' مجھے امی کا مشورہ محبت سے لبریز اور پر خلوص نظر آیا۔ تم مجھے دشمن دکھائی دیں اور میں یہ غلطی کر بیٹھی۔ اس کا نتیجہ جو مجھے ملا ہے' اسے میں جانتی ہوں اور خدا جانتا ہے۔ میں بار بار توبہ کرتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ عورتوں کو کم از کم ایسی کم عقلی سے محفوظ رکھے۔

میں نے جمشید اور اس کے پاپا کو بتا دیا ہے کہ میں جانی کی بیوی اور ایک بچے کی ماں ہوں۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ خط کے ذریعے جانی کو بھی صاف صاف لکھ دوں اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگوں پھر سوچا خط لکھنے میں وہ بات نہیں ہو گی جتنا کہ روبرو جانی کو قائل کر سکوں گی۔ وہ روٹھیں گے تو انہیں منا سکوں گی۔ یہ سوچ کر میں نے ان سے اب تک یہ بات چھپا رکھی ہے۔

جمشید مجھ سے وعدہ کر کے گئے ہیں کہ حالات کو میرے موافق بنائیں گے۔ تم نے مجھ سے بار بار کہا تھا کہ میں تمہارے لیے یہاں ملازمت کا بندوبست کروں تو میں نے یہ کیا ہے جہاں میں فی الحال ملازمت کر رہی ہوں' تم میری جگہ وہی کام کرو گی۔ تمہارے رہنے'

سہنے' کھانے پینے کے انتظامات ہو جائیں گے۔ یہاں جو خاتون اسپتال کی سرپرست ہیں وہ بہت مہربان اور شفیق ہیں۔ تمہاری امی کا سن کر میرے دل پر جو گزری اسے میں بیان نہیں کر سکتی۔ کئی بار قلم اٹھایا کہ رسمی طور پر خط لکھ دوں لیکن لکھا نہ گیا۔ انہوں نے مجھے ماں کا پیار دیا تھا۔ فرزانہ! صرف تم ہی نہیں' میں بھی ایک مثالی ماں کے سائے سے محروم ہو گئی ہوں۔ ان کی محبت اور عظمت ہمیشہ ہمارے دلوں میں نقش رہے گی۔

ان کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے لازمی ہے کہ تم ان کی خواہش کا احترام کرو۔ وہ ضد کرتی تھیں کہ تمہیں شادی کرنا چاہیے لیکن میں ضد نہیں کروں گی۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے مگر اتنا کہوں گی کہ اپنی امی کی خواہش کے حوالے سے تم اس مسئلے پر غور کرو اور کسی نتیجے پر پہنچو۔

فرزانہ میں پردیس میں بڑے حوصلے سے جی رہی ہوں اور یہ حوصلہ جانی کے دم سے ہے۔ اس کے بعد کامی کی محبت سوتے جاگتے مجھے تڑپاتی رہتی ہے میں کس طرح یہاں وقت گزار رہی ہوں۔ یہ میرا خدا جانتا ہے۔ ایک اندیشہ میرے دل میں انگارے کی طرح جلتا رہتا ہے۔ مجھے جلاتا رہتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جانی سے تمہارا سامنا ہو گیا ہے' وہ تمہیں پریشان بھی کر رہا ہے اور تم اس سے بھاگنے کے لیے سکھر بھی چلی گئی تھیں مگر تم کب تک بھاگتی رہو گی۔ تمہارے پاس ذہانت ہے' اخلاق اور شعور ہے۔ تم کوئی فیصلہ کر سکتی ہو۔ جس سے دور پردیس میں رہنے والی کے دل کا انگارہ سرد ہو جائے۔

فرزانہ! میں مر رہی ہوں۔ خدا کے بعد میری زندگی تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ میری بہن! میں یہاں رات کو گہری نیند سونا چاہتی ہوں۔ تم مجھے سلا دو۔ مجھے بھوک نہیں لگتی۔ مجھے کھلا دو۔ میں روتی ہوں' میرے آنسو پونچھ دو۔ میں ڈر رہی ہوں۔ مجھے اپنے بچے اور مہربان فیصلے کی گود میں چھپا لو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ فرزانہ مجھے بچا لو۔ میری بہن! میرے بچے کا' میرے سہاگ کا واسطہ ہے۔ اتنی دور میں تمہارے خط کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ ہر آنے والی سانس ایک نئی زندگی دیتی ہے۔ تمہارا آنے والا خط مجھے کیا دے گا؟ میری بہن! میں ہوں تمہاری بہن رخسانہ۔"

تحریر ختم ہو گئی لیکن فرزانہ اس طرح گم صم بیٹھی اس خط کو تکتی رہی۔ اس کاغذ پر رخسانہ کا چہرہ طلوع ہو گیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ یہ اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ کھانے

سے انکار کر رہی تھی۔ یہ لقمے بنا کر کھلا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ یہ تھپک تھپک کر اسے سلا رہی تھی۔

لیکن سب بے سود۔ کھانا کھلانے سے تھپک کر سلانے سے' آنسو پونچھ لینے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ قصہ ختم نہیں ہوتا' کسی کا گھر آباد نہیں ہوتا۔ اس کا تو بس ایک ہی راستہ تھا۔ رخسانہ نے بڑے اچھے انداز میں اسے لکھ دیا تھا اور یہ بات آج فرزانہ کے دماغ میں بھی مستحکم ہوگئی تھی کہ شادی کرنی ہوگی یا پھر یہ ملک چھوڑ کر جانا ہوگا۔ تب ہی رخسانہ کی بات بنے گی۔

وہ سوچتی رہی اور پریشان ہوتی رہی۔ اپنی شادی کا مسئلہ بڑا پریشان کن تھا۔ جس بات کے لیے دل آمادہ نہ ہوتا ہو' اس پر عمل کیسے کیا جائے؟ اسی وقت مریض عورتیں اور بچے ڈسپنسری میں آنے لگے۔ وہ مصروف ہوگئی۔ رات کو بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلتے بدلتے نیند آئی۔ دوسری صبح جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ بیداری کے بعد یوں لگا جیسے نیند میں بھی رات بھر جاگتی رہی ہو۔ وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کرکے باہر آئی۔ دروازے پر تالا لگایا پھر کمپاؤنڈر کے مکان میں جا کر اسے ڈسپنسری کی چابی دی "تم ڈسپنسری کے وقت میرا انتظار کرنا۔ مجھے دیر ہو سکتی ہے مگر وقت پر آنے کی کوشش کروں گی۔"

وہ ناظم آباد' فرید احمد کے ہاں آئی۔ وہاں دروازے کے سامنے ہی جمشید کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے پر پہنچی۔ وہاں جمشید اور رخسانہ کی امی چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے۔ فرید احمد ایک طرف سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ فرزانہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ رخسانہ کی امی اور جمشید بھی خاموش ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا "خالہ جان! کل تک آپ اپنے نواسے کی جدائی میں رو رہی تھیں اور اب قہقہے لگا رہی ہیں۔ کیا نواسہ مل گیا ہے؟"

وہ غصے سے بولیں "اے تم کون ہوتی ہو میرے معاملات میں بولنے والی؟ کیوں آئی ہو یہاں؟ چلی جاؤ۔"

"میں جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ میں اس گھر کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

"اری تو کیا آباد کرے گی۔ بربادی کی جڑ تو تو ہی ہے مگر اب معلوم ہوگا کیونکہ جمشید

نے جانی کے خلاف کچھ قانونی اقدامات کیے ہیں۔ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ لکھوا دی ہے کہ وہ بچے کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ جب وہ گرفتار ہوگا تو اس کے بعد مقدمہ چلے گا اور مقدمے میں کم از کم سات سال کے لیے ہم بچے کو جیت لیں گے۔ جانی سے چھین لیں گے۔"

فرید احمد نے اٹھتے ہوئے کہا "بیٹی بیٹھ جاؤ' یہ عورت بکواس کر رہی ہے۔ میں بہت دیر سے ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ انہوں نے ابھی پولیس اسٹیشن میں جانی کے خلاف رپورٹ نہیں لکھائی ہے اور نہ ہی میں اپنے داماد کے خلاف کوئی رپورٹ لکھوانے دوں گا۔ مسٹر جمشید! میں شرافت سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کبھی ہمارے دروازے پر قدم نہ رکھنا۔"

بیگم نے اچھل کر کہا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کون ہوتے ہیں میرے گھر سے جمشید کو نکالنے والے؟"

فرید احمد نے ڈانٹ کر کہا "بکواس مت کرو۔ آج میں صحیح معنوں میں مرد کا روپ دکھاؤں گا۔ اس کے بغیر عورت کو عقل نہیں آتی۔ خاموشی سے بیٹھی رہو۔ مجھے اس بات پر مجبور نہ کرنا کہ میں پہلے گالی دوں اور جب نہ سمجھو تو جوتوں سے پیٹنا شروع کر دوں۔"

بیگم ہکا بکا سی ہو کر فرید احمد کا منہ تکنے لگیں۔ انہوں نے کہا "میں آج تک تمہاری ہر جائز و ناجائز بات کو تسلیم کرتا رہا لیکن اب اس سے پہلے کہ میری بیٹی کو طلاق ملے میں تمہیں طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔"

پھر انہوں نے جمشید کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا "یہاں کھڑے ہوئے منہ کیا تک رہے ہو گیٹ آؤٹ۔"

جمشید تیزی سے پلٹ کر دروازے کی طرف گیا پھر وہاں سے گھوم کر بولا "آپ لوگوں نے میری توہین کی ہے۔ آپ یہ بھول گئے ہیں کہ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں کرنا چاہیے' آپ لوگوں کی بیٹی وہاں لندن میں ہے۔ میں چاہوں تو......"

فرزانہ نے فوراً ہی اس کی طرف پلٹ کر کہا "تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جو لوگ جھوٹ سے توبہ کرکے سچائی کے ساتھ اپنی بگڑی بنانے کی کوششیں کرتے ہیں' خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم ہمیں اپنی دھمکیوں سے مرعوب نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ اپنی توہین پر جھنجلاتا ہوا چلا گیا۔ بیگم گم صم کھڑی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ فرید احمد نے کہا "تم کان کھول کر سن لو۔ آئندہ رخسانہ کو جو خط لکھا کرو گی' وہ میری مرضی کے مطابق ہو گا۔ اسے یہ نہیں بتایا جائے گا کہ جانی کو ساری حقیقت معلوم ہو گئی ہے اور وہ بچے کو لے کر چلا گیا ہے۔"

فرزانہ نے کہا "انکل! میں آپ سے یہی کہنے آئی ہوں۔ رخسانہ کا خط میرے پاس آیا ہے۔ وہ جانی اور کامی کے سلسلے میں بڑی پریشان رہتی ہے۔ اس کی پریشانیاں دور کرنا' وہاں اسے سکون اور آرام سے رہنے کا موقع دینا ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم نے ذرا بھی کم عقلی کا ثبوت دیا تو وہ بے چاری ہلکان ہوتی رہے گی۔"

بیگم نے کہا "ہمارے خط لکھنے نہ لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ جمشید وہاں جا کر اسے ساری باتیں بتا دے گا۔"

فرزانہ نے کہا "ایک جمشید کے بتانے سے رخسانہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔ وہ آپ کی بات مانتی ہے۔ آپ پر اعتماد کرتی ہے۔ آپ پر بھروسا کرتی ہے۔ آپ جو لکھیں گی' وہ اس پر یقین کرے گی اور آپ وہی لکھیں گی جو ہم چاہیں گے۔"

فرزانہ کی بات سن کر رخسانہ کی امی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ انہوں نے کہا "اے تم کون چاہنے والی ہوتی ہو؟"

فرید احمد نے ڈانٹ کر کہا "پھر تم نے بکواس کی۔ اگر اب فرزانہ سے جھگڑا کیا یا اسے رلانے کی کوشش کی تو ساری زندگی میں تمہیں رلاتا رہوں گا۔"

فرزانہ نے پوچھا "کیا جانی کا کوئی پتا چلا؟"

"کچھ نہیں بیٹے۔ کل رات ہم بڑی دیر تک اس کے گھر کے چکر لگاتے رہے لیکن وہاں تالا ہی نظر آیا۔"

فرزانہ نے پوچھا "آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ جانی خود رخسانہ کو خط لکھتے تھے یا کسی سے لکھواتے تھے؟"

"وہ اردو پڑھنا جانتا ہے' کچھ لکھ بھی لیتا ہے۔ ہجے صحیح نہیں ہوتے اس لیے وہ اپنے کسی شاعر دوست سے خط لکھواتا تھا۔ اس کا نام شاید جھورا ہے۔"

"انکل ہمیں اس شخص کو تلاش کرنا ہو گا تاکہ ہم جانی کی طرف سے خط لکھوا کر

رخسانہ کو بھیجیں اور اسے تاثر دیتے رہیں کہ یہاں گھر کی فضا بالکل پر سکون اور دوستانہ ہے۔"

"بیٹی! تم نے رخسانہ کو خوش رکھنے اور اسے مطمئن رکھنے کے لیے بہت اچھی تدبیر سوچی ہے۔ ہم ابھی اس پر عمل کریں گے لیکن اس شخص کو کیسے تلاش کیا جائے؟"

"میں وہ گیراج جانتی ہوں جہاں جانی اپنی گاڑی لے جاتے ہیں۔ وہ مستری چاچا کا گیراج ہے۔"

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ چلو۔"

وہ جانے کے لیے دروازے کے قریب پہنچے پھر فرید احمد نے پلٹ کر کہا "بیگم! آج سے' تم میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی اور نہ ہی جمشید کو مکان کے اندر آنے دو گی۔ نہ ہی اس سے باتیں کرو گی' میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ فرزانہ کے ساتھ باہر چلے گئے۔ بیگم تھوڑی دیر تک دروازے کو دیکھتی رہیں پھر غصے سے پاؤں پٹخ کر بڑبڑانے لگیں۔ دروازے کے پاس جا کر انہیں دور جاتے دیکھا۔ اس کے بعد دروازے کو زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہیں۔ جی چاہتا تھا کچھ چیزوں کو اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں لیکن وہ صوفے پر ایک جگہ آ کر دھنس گئیں۔

تھک ہار کر بیٹھتے ہی انہیں بے اختیار رونا آ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دوپٹے کو سمیٹ کر پھر دوپٹے سے منہ چھپا کر رونے لگیں۔ انہیں شرمندگی نہیں تھی۔ انہیں اس بات کا بھی دکھ نہیں تھا کہ جانی کے بجائے' جمشید جیسا دولت مند لڑکا ان کا داماد نہیں بنے گا۔ وہ فرزانہ سے بھی متاثر نہیں تھیں۔ ان پر فرید احمد کی ڈانٹ ڈپٹ کا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ ان کو بس ایک ہی دکھ تھا۔ وہ نواسے کا دکھ تھا۔ نواسہ کہاں ہے؟ یہ خیال جب بھی آتا تھا' وہ رونا شروع کر دیتی تھیں۔ جمشید تھوڑی دیر تک ہنستا رہا تھا۔ وہ بھول گئی تھیں مگر محبت کو ہمیشہ بھلایا نہیں جا سکتا۔ انسان کتنا ہی سنگ دل ہو' ظالم ہو مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں کسی نہ کسی کی محبت جڑ پکڑ لیتی ہے اور اسے رونے پر مجبور کرتی ہے۔

○☆○

فرزانہ اور فرید احمد ایک رکشے میں بیٹھ کر گیراج کے پاس آئے۔ وہاں انہوں نے

جانی کے دوستوں سے جھورے پینٹر کا پتا دریافت کیا پھر کریم آباد پہنچے۔ وہاں آس پاس کی دکانوں میں جھورا پینٹر بہت مشہور تھا۔ فوراً ہی اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی چھوٹی سی دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ فرید احمد رکشے سے اتر کر اس کے پاس گئے۔

"تم ہی جھورے پینٹر اور شاعر ہو؟"

وہ خوش ہو کر اٹھ گیا پھر بڑی انکساری سے بولا "اجی شاعری کیا کرتا ہوں، تُک بندی کرتا ہوں۔ آپ فرمائیں کس کے اوپر شعر بولنا ہے۔ فوراً ہی پھڑکتا ہوا شعر تیار کردوں گا۔"

"مجھے شعر نہیں لکھانا ہے۔ جانی میرا داماد ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔"

اس نے فوراً ہی اپنے سامنے والی جگہ کو کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا "آیئے تشریف رکھیے۔"

انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا "جانی ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔ اپنے بچے کو ہم سے چھین کر لے گیا ہے۔ ہم کل سے اسے تلاش کر رہے ہیں مگر اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

جھورے نے اپنے کان کو پکڑتے ہوئے کہا "نہیں جناب، میں نے تو نہیں دیکھا، دیکھا ہوتا تو آپ کو بتا دیتا۔"

"دیکھو بیٹے، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے پاس چھپا ہوا ہو اور تمہیں تاکید کر دی ہو یا دھمکی دی ہو کہ اس کا پتا نہ بتایا جائے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم آپ کے بچے ہیں۔ آپ سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔"

"اور ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ جانی تم سے خط لکھوایا کرتا تھا؟"

"جی ہاں، میری رائٹنگ بہت اچھی ہے۔ میں اس کی طرف سے اپنی رخسانہ بھابی کو خط لکھا کرتا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے گھریلو حالات سے بڑی حد تک واقف ہو۔"

فرزانہ نے رکشے سے جھانک کر فرید احمد کو آواز دی۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس

آئے۔ اس نے کہا "انکل! میری ڈسپنسری کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں۔ اس شخص کو شام کے وقت گھر بلالیں۔ ہم وہاں اسے ساری باتیں سمجھائیں گے اور اس کے ذریعے جانی کی طرف سے خط لکھائیں گے۔"

"اچھی بات ہے تم جاؤ بلکہ مناسب سمجھو تو میں تمہاری خالہ جان کو اور جھورے پینٹر کو لے کر تمہارے کلینک میں آجاؤں گا۔ شام کے چھ بجے کے بعد تم مصروف رہتی ہو۔ ہم چار بجے آئیں گے اور جھورے سے اپنا کام نکال لیں گے۔"

وہ رکشے میں بیٹھ کر واپس کلینک میں آگئی۔ وہاں مریض عورتیں اور بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان مصروف ہو گئی۔ ایک بجے فرصت ہوئی۔ ارشد نے کہا "باجی! آپ کلینک بھی سنبھالتی ہیں۔ باہر کہیں بھاگ دوڑ میں بھی مصروف رہتی ہیں۔ آپ کو کھانا پکانے کا وقت نہیں ملتا۔ آج میں نے آپ کے گھر کی صفائی کر دی ہے اور آپ کے لیے کھچڑی اور ٹماٹر کی چٹنی تیار کر دی ہے۔"

فرزانہ نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا "ارشد! تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو۔ تم نے اتنی تکلیف کیوں کی۔ میرے گھر کی صفائی تمہیں نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارا کام کلینک میں ہے۔"

"نہیں باجی! کلینک کے وقت کلینک میں کام ہے۔ باقی اپنی بہن کے گھر میں ہے۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں آپ کو آرام پہنچاؤں۔ آپ کچھ پریشان رہتی ہیں۔ میرے بس میں ہو تو آپ فرمائیں۔ میں آپ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولی "نہیں بھیا! مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے بس بھاگ دوڑ کے باعث تھکن رہتی ہے۔"

"باجی! ایک بات بولوں۔ آپ غصہ تو نہیں کریں گے۔"

"نہیں تم میرے بھیا ہو بولو۔"

"میں کیا بولوں، امی کہتی ہیں۔ محلے کی عورتیں بھی کھسر پھسر کرتی رہتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

فرزانہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ سر جھکائے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا "محلے میں عورتیں اور کیا کہتی ہیں؟"

"عورتیں بھی ہتی ہیں' مرد بھی باتیں بناتے ہیں۔ انہوں نے دو تین بار ایک ٹیکسی ڈرائیور کو ادھر آتے دیکھا ہے۔ کل ایک بہت بڑی قیمتی کار میں کوئی دوسرا نوجوان آیا تھا۔ یہ لوگ تو بدنام کرنا جانتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ ان سے باجی کا کیا رشتہ ہے؟ کیوں آتے ہیں یہ لوگ؟ اگر آتے ہیں تو ان سے آپ کے رشتے کا پتا چلنا چاہیے۔"

وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ ارشد نے ہچکچاتے ہوئے کہا "باجی! سارا جھگڑا اکیلے رہنے کا ہے۔ اگر آپ کی امی زندہ ہوتیں تو اتنی بدنامیاں نہ ہوتیں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو جلدی سے شادی کرلینا چاہیے۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ آہستہ آہستہ اپنی پیشانی کو رگڑنے لگی۔ سر اتنا بھاری ہو رہا تھا جیسے گردن سے الگ ہو کر گر جائے گا پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا "تم جاؤ۔"

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ یہ بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی فیصلے کرتی رہی۔ پریشان ہوتی رہی پھر اس نے کلینک کے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ گھر کے اندر آئی۔ ارشد کمپاؤنڈر نے اس کے لیے کھچڑی تیار کی تھی۔ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دو چار لقمے زہر مار کر کے پانی پیا پھر پلنگ پر آکر لیٹ گئی۔

وہاں کروٹ کروٹ بے چینی تھی۔ کبھی ایک کروٹ میں جمشید کہتا تھا شادی کرلو۔ کبھی دوسرے کروٹ میں رخسانہ التجا کر رہی تھی۔ ارشد کمپاؤنڈر بھی کہہ رہا تھا۔ باجی میں نہیں کہتا۔ امی کہتی ہیں۔ اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ بیٹی میں نہیں کہتی۔ تمہاری پڑوسن کہہ رہی تھیں۔ پڑوسن کہہ رہی تھیں۔ بہن' میں نہیں کہتی۔ محلے کی عورتیں کہتی ہیں۔ محلے کی عورتوں سے ہمیں کیا پڑی ہے۔ یہ دنیا والے کہتے ہیں۔

سب کہتے تھے مگر کوئی منہ پر نہیں کہتا تھا لیکن یہ ایک سمجھنے والا سماجی کلیہ تھا کہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی تنہا زندگی نہیں گزارتی۔ گزارے گی تو بدنامی اس کے ساتھ چلے گی۔ کسی کا شوہر اس کے پیچھے پیچھے چلے گا۔ محبت روٹی سے بھی کی جاتی ہے لیکن کسی کے منہ سے روٹی چھیننے کو محبت نہیں کہتے۔ یہ ایک غیر انسانی فعل ہے اور وہ اس فعل کی مرتکب ہو رہی تھی۔

شام کو فرید احمد حسب وعدہ اپنی بیگم اور جھورے پینٹر کے ساتھ آئے۔ وہاں

انہوں نے اطمینان سے بیٹھ کر جھورے پینٹر کو ساری باتیں سمجھائیں اور جانی کی طرف سے خط لکھوایا۔ رخسانہ کو یہ تاثر دیا کہ اس کا گھریلو ماحول بہت ہی خوش گوار ہے۔ جانی برابر تینوں وقت گھر میں آکر کھانا کھاتا ہے۔ بچے کا خیال رکھتا ہے اور اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔

بہر حال جھورے پینٹر کی وجہ سے بات بن گئی تھی۔ بیگم نے بھی اپنی طرف سے خط لکھا۔ اس میں خاص طور پر جمشید کا ذکر کیا گیا اور رخسانہ کو بتایا گیا کہ جمشید یہاں آکر چھچھوری حرکتیں کرتا رہا تھا اور گھر کے ماحول کو بگاڑنے اور جانی کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کی سازش کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سازش ناکام بنادی گئی ہے اور اسے گھر میں آنے سے منع کردیا گیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ رخسانہ بھی جمشید کو لفٹ نہ دے۔

یہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے۔ ماحول خوش گوار ہوگیا۔ آخر میں بیگم نے فرزانہ کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی! میں بہت بری ہوں۔ جانی ٹھیک کہتا ہے کہ میں چڑیل ہوں۔ ہائے مجھے کیا ہوگیا تھا' میں جمشید کی باتوں میں آکر اپنی بیٹی کا گھر اجاڑ رہی تھی۔ توبہ توبہ' اللہ مجھے موت دے دے تو اچھا ہے۔"

"خالہ جان! آپ ہماری بزرگ ہیں۔ ٹھیک ہے آپ نے غصے میں ایسا کیا لیکن اب آپ سوچ سمجھ کر ہمارا ساتھ دیتی رہیں گی' ہم رخسانہ کو وہاں زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

بیگم اسے بہت ساری دعائیں دیتے ہوئے اپنے میاں کے ساتھ جھورے پینٹر کو لے کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے لیے تنہائی عذاب بن گئی پھر طرح طرح کے خیالات پریشان کرنے لگے۔ اس کے بعد مریض عورتیں اور بچے آگئے۔ وہ رات کے دس بجے تک مصروف رہی۔ اس کے بعد پھر تنہائی کا دور شروع ہوا۔ رات' خاموشی' تنہائی اور اس پر پریشانیوں کا ہجوم' وہ بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی۔ فیصلہ کرتی رہی۔ آخر رات کے ایک بجے وہ کاغذ اور قلم لے کر رخسانہ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اس نے لکھنا شروع کیا۔

"بہن! میری پیاری بہن!

مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے لیے جو کچھ کیا ہے' اس میں کمی رہ گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ جو نیکی ہم کرتے ہیں اس نیکی کا بھی آدھا چہرہ ہوتا ہے۔ باقی نیکی کے آدھے چہرے پر ہمارے مفاد' ہمارے جذبات اور ہماری خواہشات کا تیزاب پڑ جاتا ہے۔

میں اب تک اس ضد پر قائم رہی کہ میں شادی کیوں کروں؟ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ نیکی کر دی۔ میرا کام ختم ہو گیا لیکن نہیں بات اب سمجھ میں آئی ہے۔ نیکی کا عمل کبھی ختم نہیں ہوتا' نیکی تقاضا کرتی ہے کہ اسے اور پائیدار بنایا جائے اور تمہارے ساتھ جو میں نے کیا ہے اس کی پائیداری اسی وقت ہوگی کہ میں شادی کرلوں۔

اور رخسانہ آج میں فیصلہ کر رہی ہوں۔ سکھر میں میرے چچا کے صاحب زادے ہیں جو برسوں سے میری آس لگائے بیٹھے ہیں۔ بہت جلد شادی کا دعوت نامہ تمہارے پاس آئے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم شریک نہیں ہو سکو گی لیکن اس کے بعد خوش اور مطمئن رہو گی۔"

ایسا لکھتے لکھتے اس کا قلم رک گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا پھر اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر یوں رکھے جیسے ڈوبتے ہوئے دل کو تھام رہی ہو۔

اس کے چاروں طرف رات تھی۔ رت جگا تھا' سکوت تھا' سکتہ تھا "آہ محبت کی طرح اندھی رات' محبت گناہ کہلائے تو گناہ گار کے منہ کی طرح کالی رات۔ میری ضد میری انا کو خاک میں ملانے والی رات' میرے فیصلے پر آخری مہر لگانے والی رات۔ کیا تو آخری رات نہیں ہو سکتی؟"

اس کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ دل کے صحرا میں سرد ہوا چل رہی تھی۔

○☆○

ٹرین تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ بچہ زور زور سے رو رہا تھا۔ جانی نے کتنے ہی جتن کیے اسے فیڈر سے دودھ پلایا۔ اسے گود میں لے کر تھپک تھپک کر چپ کرانے کی کوشش کی پھر اسے لے کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ چپ نہیں ہو رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک نے پوچھا "بھائی اس کی ماں

کہاں ہے' اس کے پاس پہنچا دو۔"

دوسرے نے کہا "شاید وہ لیڈیز [illegible] ہے۔"

جانی نے کہا "نہیں اس کی ماں [illegible] ہے۔"

"نہیں ہے کا کیا مطلب ہے۔ خدا نخواستہ مر گئی ہے کیا؟"

وہ دھپ سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جانے کیوں اسے رخسانہ [illegible] اس کی [illegible] تھی کہ وہ نہ مرے۔ ساری عمر اس کے لیے نہ سہی۔ بچے کے لیے [illegible] ایک مسافر نے اس کی گود سے بچے کو لیتے ہوئے کہا "لاؤ [illegible] [illegible] ہوں۔ ضرور اسے کوئی تکلیف ہے۔"

وہ بچے کو لے کر پچھلی سیٹ کی طرف گیا۔ وہاں چند [illegible] بیٹھی ہوئی تھیں۔ جانی نے ادھر ایک نظر ڈالی۔ اتنا دیکھا کہ ایک عورت نے اس [illegible] اس کے بعد وہ منہ پھیر کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

اس کے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ گاڑی کے [illegible] رونے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی پھر وہ آہستہ آہستہ ختم ہو [illegible] چپ ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا' وہ سو گیا ہے۔ اس نے مسافر سے کہا "بھائی صاحب! آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ کی گھر والی نہ ہوتیں تو معلوم نہیں بچے کا کیا ہوتا۔"

"خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔ آپ یہ بتائیں کہ بچے کی ماں واقعی مر گئی ہے؟"

جانی نے سر جھکا لیا پھر انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا "نہیں وہ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"کیا؟" اس مسافر نے حیرانی سے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ مسافروں نے پوچھا "کیا بات ہے؟" اس نے بتایا "بیوی بھاگ گئی ہے۔ بچے کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔ عورتیں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر ممتا کو خاک میں ملا کر اپنے یاروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔"

یار کی بات آئی تو جانی کی نگاہوں کے سامنے جمشید کا چہرہ آگیا۔ وہ اچھا خوش پوش تھا۔ اسمارٹ تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی سی قیمتی کار تھی اور نہ جانے کتنا دولت مند ہوگا آخر کار رخسانہ ادھر پھسل گئی۔ ساری وفائیں خاک میں مل گئیں۔ عورت پر کیسے بھروسا کیا جائے؟ جب تک پاس ہوتی ہے' گلے کا ہار بن کر اپنی وفاداری اور خدمت

گزاری کا سکہ جاتی ہے۔ دور ہوتی ہے تو منہ پر تھوک دیتی ہے۔

جانی کو بڑی شدت سے اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "بھائی صاحب، بچے کو یہاں لے آئیں۔ آپ کی گھر والی کو تکلیف ہوگی۔"

"تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ میری گھر والی اسے سنبھال لے گی۔ آپ یہاں اطمینان سے بیٹھے رہیں۔"

وہ انکار میں سرہلا کر بولا "نہیں، اب تو اس بچے کی پرورش میرا ہی ذمہ ہے۔ مجھے ہی دن رات اس کا خیال رکھنا ہے۔ آج ایک دن آپ کے گھر والے سنبھال لیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ مجھے اس کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

وہ مسافر وہاں سے اٹھ گیا اور بچے کو لے آیا۔ جانی نے اپنی سیٹ خالی کر دی۔ وہاں اس کے لیے بستر بچھایا اور آرام سے سلا دیا۔ خود نیچے بیٹھ گیا۔ کمپارٹمنٹ میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ "ایک شخص بہت ہی ننھے بچے کو لے کر کہیں جا رہا ہے۔"

"بچے کی ماں نہیں ہے۔"

"بچے کی ماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

ہر طرف بچے کی ماں کا تذکرہ تھا مگر بہت ہی دھیمے دھیمے سروں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ گاڑی کے شور کے باوجود دور تک سرگوشیاں گنگنا رہی تھیں۔ لوگ آتے جاتے کبھی جانی کو کبھی بچے کو دیکھ رہے تھے اور جانی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر گزرنے والے کو اور آس پاس گھورنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔

خان پور کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو پولیس والے آگئے۔ ایک انسپکٹر نے چھڑی دکھاتے ہوئے کہا "اے اٹھو، یہ بچہ کس کا ہے؟"

جانی کمپارٹمنٹ کے فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا "میرا ہے جناب۔"

"اس کی ماں کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں کہاں ہے۔ اگر ہوتی تو میں اس بچے کو لے کر یوں در بدر نہ بھٹکتا۔"

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟" جانی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ تم کسی کے بچے کو اٹھا کر لے جا رہے ہو۔ تمہیں پولیس

اسٹیشن تک جانا ہوگا۔ یہ تمہارا نہیں ہے۔"

"یہ میرا ہے، میں ثابت کر دوں گا۔ میرے سوٹ کیس میں کچھ ثبوت رکھے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا "ہماری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ دوسرے کیسوں کو بھی نمٹانا پڑتا ہے۔ تم ہمارے سپاہیوں کے ساتھ تھانے چلو۔ میں بعد میں آؤں گا۔"

"جناب، اگر گاڑی چھوٹ جائے گی تو کیا ہوگا؟"

"دوسری گاڑی میں چلے جانا۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں یہاں ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ آپ دیکھ لیں، میں آپ کو مطمئن کر دوں گا۔ آپ میری گاڑی کیوں چھڑانا چاہتے ہیں؟"

"مجھ سے بحث نہ کرو۔ سیدھی طرح چلو ورنہ یہ سپاہی پکڑ کر لے جائیں گے۔"

ایک مسافر نے کہا "حوالدار صاحب! ایک مسافر اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ آپ اسے یہاں اتار دیں گے۔ آپ کی تفتیش میں دیر ہوگی تو اس کی گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

انسپکٹر نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "تم لوگ قانونی معاملات کو کیا سمجھتے ہو؟ کیوں ہمارے کاموں میں مداخلت کرتے ہو؟ ہم تم سے زیادہ قانون سمجھتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ کس مجرم کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔"

جانی نے کہا "میں مجرم نہیں ہوں۔ یہ میرا بچہ ہے میں اس کا باپ ہوں اور اس کے ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔"

"تو پھر ڈرتے کیوں ہو۔ تھانے چلو۔"

جانی نے بے بسی سے قانون کے محافظوں کو دیکھا پھر بچے کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر، سنبھال کر اٹھایا، کاندھے سے ایک بیگ لٹکایا۔ جس میں بچے کے کپڑے اور دودھ رکھا ہوا تھا پھر دوسرے ہاتھ سے اپنی اٹیچی اٹھائی۔ ان کے ساتھ جانے لگا۔ اسی وقت پچھلی سیٹ سے ایک عورت کی آواز سنائی دی "ٹھہرو، بھیا۔"

وہ رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ وہی عورت تھی جس نے اس کے بچے کو چپ کرایا تھا۔ اس نے قریب آکر ایک چھوٹی سی شیشی جانی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس میں گھٹی ہے۔ بچے کے ساتھ اسے رکھنا چاہیے۔ ابھی بچے کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ اس کی

وجہ سے یہ تڑپ رہا تھا۔ بچے کو سمجھنا پڑتا ہے اور تم نہیں سمجھ سکو گے۔ کسی طرح جلد سے جلد اس بچے کو کسی عورت کی پناہ میں دے دو' کوئی بوڑھی عورت ہوگی تو اسے سنبھال لے گی اور ہاں باہر بہت زیادہ سردی ہے۔ بچے کو سنبھال کر رکھنا۔ سرسوں کے تیل سے اس کی مالش کرتے رہنا۔"

جانی نے اسے بڑی عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا۔"

وہ جانے لگا "اس عورت نے کہا "سنو!"

وہ پھر رک گیا۔ وہ بولی "بیوی شوہر کو چھوڑ سکتی ہے۔ ماں بچے کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نہیں جانتی کہ میاں بیوی میں کیا بات ہو گئی ہے۔ اگر کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا تمہاری بیوی سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو بچے کی خاطر اسے معاف کر دو۔ ذرا سوچو' مرد اپنی عورت کی غلطی معاف نہیں کرے گا تو پھر اسے اور کون معاف کرے گا۔"

وہ سر جھکا کر پلٹ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پولیس والوں کے ساتھ گاڑی سے اتر گیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ باہر سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ بچے کو بار بار کمبل میں اچھی طرح لپیٹ کر سردی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ ایک سپاہی نے اسے وہاں ایک بینچ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

"سپاہی جی! یہاں اتنی سردی ہے۔ چھوٹا سا بچہ ہے۔ آپ مجھے اندر بیٹھنے کی اجازت دیں۔" اس نے کہا۔

سپاہی نے ہمدردی سے بچے کی طرف دیکھا پھر اسے اجازت دے دی۔ وہ اندر آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور تھانے دار کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی چھوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اسی وقت انسپکٹر وہاں پہنچا۔ اس نے اپنی بید میز پر رکھتے ہوئے کہا "ہاں' تو تمہارے پاس ٹکٹ ہے۔"

"جی ہے۔"

وہ جواب دیتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوٹ کیس کو اٹھا کر کرسی پر رکھا پھر اسے کھول کر ٹکٹ نکالا۔ اسے انسپکٹر کی طرف بڑھایا۔ انسپکٹر نے اسے دیکھنے کے بعد پوچھا "کیا ثبوت ہے کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔"

اسی وقت گارڈ نے سیٹی بجائی اور گاڑی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ جانی نے سوٹ کیس سے اپنا نکاح نامہ نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھایا پھر تصویروں کا البم نکالا۔ اس میں رخسانہ اور بچے کے ساتھ اس کی بہت سی تصویریں تھیں۔ بچے کا کلوز اپ بھی تھا۔ وہ انسپکٹر کی طرف البم بڑھانے کے بعد بچے کو بھی قریب لے آیا پھر کہنے لگا "تصویر اور بچے کو دیکھ لیجیے۔ یہ وہی ہے اور ان تصویروں میں جو عورت آدھا چہرہ چھپائے ہوئے ہے۔ وہ میری بیوی اور میرے بچے کی ماں ہے۔"

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"لندن میں۔"

انسپکٹر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ جانی نے کہا "آپ تصویروں کو دیکھیں ہر تصویر میں میری بیوی نے آدھے چہرے کو چھپا رکھا ہے۔ اس کا چہرہ خراب ہے یہ پلاسٹک سرجری کے لیے لندن گئی ہے۔"

"تم بچے کو لے کر کہاں جا رہے ہو؟"

"میری کوئی منزل نہیں ہے۔ میں نے لاہور کا ٹکٹ لے لیا ہے سوچا تھا جہاں دل چاہے گا' گاڑی سے اتر جاؤں گا۔"

"جب تمہاری بیوی لندن گئی ہے تو تم نے کراچی میں اس کی واپسی کا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

"وہ مجھے دھوکا دے کر گئی ہے۔ وہ ایک دولت مند نوجوان کے پاس رہنے گئی ہے۔"

"اوہ تو ایسی بات ہے۔ ویسے تمہاری باتیں کتنی سچی ہیں؟"

"میں ثبوت فراہم کرنے کے لیے یہاں آپ کے پاس ٹھہر گیا ہوں۔ گاڑی چلی گئی ہے۔ مزید ثبوت پیش کرنے کے لیے کراچی بھی واپس جا سکتا ہوں لیکن آپ مجھے خواہ مخواہ پریشان کریں گے۔"

"کراچی میں تمہارا اور کون ہے؟"

"وہاں اب میرا کوئی نہیں ہے اور جہاں میں جانے والا ہوں' وہاں بھی میرا کوئی نہیں ہو گا۔"

"کہاں جاؤ گے۔"

"اب کہاں جاؤں گا۔ آپ نے راستہ روک دیا ہے۔ صبح دیکھوں گا اگر یہ جگہ میرے بچے کے لیے مناسب رہی تو یہیں رہ جاؤں گا۔"

انسپکٹر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "ہوں' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں گاڑی سے اتار کر کچھ زیادہ غلطی نہیں کی ہے۔ تم کہیں بھی اپنی منزل بنا سکتے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ میری نظروں کے سامنے رہو۔ کہو تو یہاں تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کروا دیا جائے' تمہارے پاس کچھ رقم وغیرہ ہے یا نہیں؟"

"خدا کے فضل سے میں اچھا کھانے کمانے والا ہوں۔ ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اس وقت بھی میرے پاس دو ہزار روپے ہیں۔ ضرورت پڑی تو کراچی جا کر لے آؤں گا۔ وہاں میری ٹیکسی چل رہی ہے۔"

انسپکٹر نے آواز دی "سپاہی ممدو۔"

آواز آئی "جی جناب! حاضر ہوا۔" اس کے ساتھ ہی ایک سپاہی کمرے میں آیا۔

انسپکٹر نے کہا "تمہارے مکان میں ایک کمرا خالی ہے۔ تم کسی کو کرائے پر دینا چاہتے ہو یہ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔ تم اسے اپنے کمرے میں جگہ دے دو۔"

"جو حکم جناب۔"

انسپکٹر نے جانی سے کہا "میں دفتری کام سے کراچی جانے والا ہوں۔ تم وہاں کا پتا مجھے لکھاؤ گے اور ایسے لوگوں کے نام پیش کرو گے جہاں میں تمہارے متعلق مکمل تحقیقات کرسکوں۔ جب تک تحقیقات خاطر خواہ نہ ہوں اس وقت تک تم ہمارے سپاہی ممدو کے گھر میں رہو گے اور اس کی نظروں میں رہو گے۔"

جانی نے کہا "مہربانی ہے جناب!"

انسپکٹر نے کہا "اس میں تمہارا فائدہ بھی ہے۔ ایک تو تمہاری رہائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر ممدو کی بیوی بچے ہیں۔ ایک بوڑھی ماں ہے۔ وہ تمہارے بچے کو سنبھال لیں گی۔"

"جناب! ایک عرض ہے' میں اپنے مکان کا اور اپنے سسرال والوں کا پتا آپ کو لکھ دوں گا اور اس گیراج کا پتا بھی دوں گا جس کے مالک کی نگرانی میں میری ایک ٹیکسی چل

رہی ہے لیکن آپ مجھ سے اتنا وعدہ کریں کہ وہاں کسی بھی شخص کو میرا پتا نہیں بتائیں گے۔"

"تم ان لوگوں سے چھپنا کیوں چاہتے ہو؟"

"جناب! میری ساس یہاں آئے گی تو بچے کے لیے جھگڑا کرے گی۔ جب تک اس بچے کی ماں لندن سے واپس نہ آئے' اس وقت تک میں اس کا حق دار ہوں اور میں اسے کسی اور کی نگرانی میں رکھنا نہیں چاہتا۔"

"جب ماں واپس آئے گی تو کیا کرو گے؟"

"میں اسے....."

وہ کہتے کہتے رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا "میں اسے طلاق دے دوں گا اور عدالت میں بچے کا حق حاصل کروں گا۔"

لیکن وہ بات پوری نہ کرسکا۔ اسی وقت اس کی نگاہوں کے سامنے فرزانہ آگئی۔ وہ التجا کر رہی تھی "دیکھو جانی! غصے میں اور جوش میں آکر رخسانہ کو طلاق نہ دینا۔ اس کی واپسی کا انتظار کرو۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ ایسی باتیں کرے گی کہ تمہاری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔"

پھر اسے رخسانہ نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی "جانی! خدا کے لیے میری وفاداری اور خدمت گزاری کا حساب کرو اور میرا انتظار کرو۔"

انسپکٹر نے پوچھا "تم کہتے کہتے رک کیوں گئے؟"

وہ چونک کر بولا "میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب بچے کی ماں واپس آئے گی تو کوئی فیصلہ ہو گا۔ میں اس کے ساتھ زندگی گزاروں گا یا نہیں۔ رہ گیا بچہ تو اس کا فیصلہ عدالت میں ہو گا۔ ابھی تو میں ہی اس کا حق دار ہوں اسی لیے میں التجا کرتا ہوں کہ اس بچے کے نانی' نانا کو میری موجودہ رہائش گاہ کا پتا نہ چلے۔"

انسپکٹر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "قانون کے جو تقاضے ہوں گے' وہ میں پورے کروں گا۔ ہاں اگر حالات تمہارے موافق رہے تو تمہارے سلسلے میں مجھے ان سے کوئی بات چھپانی پڑی تو میں ایسا کرلوں گا۔ تم ممدو کے ساتھ جاؤ۔"

وہ ممدو کے ساتھ اس کے مکان میں آگیا۔ اسے قانون کی عارضی پناہ مل گئی۔ وہ

قانون کے محافظوں کی نگاہوں میں بھی تھا اور اس کی حیثیت ایک کرائے دار کی بھی تھی۔
ممدو کا مکان بہت بڑا تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں ایک کمرا ایسا تھا جو کسی کو بھی کرائے پر دیا جا سکتا تھا۔ وہ کمرا جانی کو مل گیا۔

جب وہ کمرے میں پہنچا تو صبح کے چار بجنے والے تھے۔ ممدو کی بوڑھی والدہ اذان سے پہلے اٹھنے کی عادی تھیں۔ جب انہیں پتا چلا کہ ایک شخص ایک ننھے بچے کے ساتھ کرائے دار کی حیثیت سے آیا ہے تو انہوں نے فوراً ہی بچے کو گود میں لے لیا پھر طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں۔ جواب دینا ضروری تھا اس لیے جانی جواب دینے لگا۔
اسی سوال و جواب میں دن نکل آیا۔

بوڑھی خاتون نے کہا "مجھے اپنی ماں سمجھو۔ یہ میرا پوتا ہے۔ اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہو اور اپنی نیند پوری کرو۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔"

وہ بوڑھی خاتون بچے کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ آرام سے سو گیا۔
پانچویں دن انسپکٹر نے اسے بلا لیا اور کہا "میں کراچی گیا تھا۔ تمہارے بتائے ہوئے پتے پر فرید احمد اور ان کے گھر والوں سے ملاقات کی۔ وہ لوگ بار بار تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ خانپور کی جو گاڑی گزر رہی تھی' اس میں جانی نام کا شخص ایک بچے کو لے کر جا رہا تھا۔ اس نے خود کو بچے کا باپ ثابت کر دیا تھا۔ وہ قانون کی نظروں میں قابل گرفت نہیں تھا۔ اب معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ میں نے جانی سے اس کا ایڈریس لیا تھا۔ اب کراچی آیا ہوں تو یونہی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

جانی نے خوش ہو کر کہا "جناب! آپ نے مجھ پر اور میرے بچے پر بڑا احسان کیا ہے۔ یقین کریں اگر میری ساس آ جاتیں تو بڑا ہنگامہ برپا کر دیتیں۔"

میں نے تمہاری ساس کو دیکھا ہے کچھ عجیب قسم کی خاتون ہیں۔ ان کے مقابلے میں ان کے شوہر فرید احمد بڑی سمجھ داری کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور لیڈی ڈاکٹر فرزانہ تھی۔ وہ بھی تمہاری حمایت میں بول رہی تھی۔ بہرحال مجھے تمہارے گھریلو حالات کا علم ہو گیا ہے۔ تم یہاں آزادی سے رہ سکتے ہو۔"

جانی شکریہ ادا کر کے جانا چاہتا تھا۔ انسپکٹر نے قریب بلا کر کہا "یہاں کرسی پر بیٹھو۔"
جانی بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے کہا "تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہاری بیوی لیڈی ڈاکٹر

ہے۔"
"لیڈی ڈاکٹر ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ آخر عورت ہی ہے نا؟"
"جانی تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہاری بیوی نے تم سے جھوٹ کہا۔ تمہیں دھوکا دے کر گئی' یہ بات درست ہے اس کے باوجود وہ تمہارے لیے دیانت دار ہے' سچی ہے' کھری ہے۔"
"آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟"
"میرے اپنے بھی کچھ تجربات ہیں۔ بعض عورتیں اپنے شوہروں پر اتنا اعتماد کرتی ہیں کہ تھوڑا بہت جھوٹ بول کر گزر جانے میں کوئی برائی نہیں سمجھتیں۔ کبھی اپنے شوہر سے کوئی بات چھپا کر کچھ ایسے کام کر جاتی ہیں جو گھریلو حالات کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اس سے شوہر کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"
"کیا یہ درست ہے کہ اپنے گھر کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے لیے یا اپنے آپ کو خوب صورت بنانے کے لیے عورت دوسرے مرد کا سہارا لینے چلی جائے؟"
"یہ انتہائی غلط اور غیر اخلاقی فعل ہے۔ اسے بے غیرتی کہیں گے۔ بعض عورتیں بڑے فخر سے یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کر گزریں گی بعد میں اپنے میاں کو سمجھا منا لیں گی۔ یہ ان کی خوش فہمی ہے اس سے گھر کے حالات کس طرح بگڑتے ہیں۔ گھر برباد کیسے ہوتے ہے۔ بعد میں اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے اور اس کا نتیجہ اب تمہاری بیوی کے سامنے بھی آنے والا ہے۔ اسے ابھی ان باتوں سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ جب وہ آئے گی تب اس پر قیامت ٹوٹے گی۔"

"جناب' ایسی عورتیں بے حس اور بے پروا ہوتی ہیں۔ برے نتائج کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ایک گھر اجڑا ہے تو دوسرے دس گھر آباد کر لیں گے۔ انہیں اپنی جوانی اور اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے۔ جب تک وہ حسین نہیں تھی' میرے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔ اب اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑیں گے۔ چہرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لندن کی بہت بڑی اشتہاری کمپنی نے اسے منہ مانگا معاوضہ دے کر اپنے اشتہارات کے لیے بک کر لیا ہے پھر جمشید جیسا دولت مند جوان اس کا دیوانہ ہے ایسی عورت کو نتائج کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟"

"اگر وہ دولت ٹھکرا دے۔ جس نوجوان کے ہاں پناہ لینے گئی تھی اس سے منہ موڑ لے' اپنے حسن پر غرور نہ کرے اور پہلے کی طرح تمہارے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے پر بضد رہے تب اس کی وفاداری اور پارسائی کا یقین ہونا چاہیے کیونکہ وہ سب کچھ ٹھکرا کر تمہارے ساتھ ہی رہنا چاہے گی۔"

جانی نے انکار میں سرہلا کر کہا "نہیں جناب! عورت یہ بھی سوچتی ہے کہ مرد جیسا بھی ہو ٹیکسی ڈرائیور ہو یا اونچے درجے کا احمق ہو۔ جب سوسائٹی میں اس کی ہوگئی ہے تو اپنی ازدواجی زندگی کا بھرم رکھنے کے لیے اور اپنی اولاد کی خاطر اس کے ساتھ زندگی گزارے۔ یعنی وہ اب میرے ساتھ پہلے جیسی محبت اور وفاداری سے نہیں رہے گی بلکہ اپنے بیٹے کی خاطر اور سوسائٹی میں بدنامی سے بچنے کی خاطر' میرا ساتھ گوارا کرلے گی۔ وہ ایک بار مجھے دھوکا دے کر گئی ہے۔ معلوم نہیں آئندہ کتنی بار دھوکا دے گی۔ کیا میں تمام عمر اس کا پہریدار بن کر رہوں گا؟"

انسپکٹر نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی پھر بے بسی سے سرہلا کر کہا "غلطی اس نے کی ہے۔ اب ایک غلط فہمی سے ہزاروں غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ پہلے جیسا اعتماد قائم نہیں ہوگا۔ ہم تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک جائیں گے مگر تمہارا دل صاف نہیں ہوگا۔ جہاں اعتماد مرجائے' وہاں سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر جانی اٹھ کر جانے لگا۔ انسپکٹر نے کہا "میری ایک بات مانو گے؟"

"میرے اور بچے کے فائدے کی بات ہوگی تو ضرور مانوں گا۔"

"میں بچے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کی ماں کو طلاق کبھی نہ دینا ورنہ بچہ جوان ہوگا تو سوسائٹی میں احساس کمتری کا شکار ہوگا۔ جب اس کے ہمجولی اسے کہیں گے کہ اس کی ماں کو طلاق ہوئی تھی تو اس کا سر جھک جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بیٹے کا سر کسی کے سامنے جھکنے نہیں دوگے۔"

وہ سرجھکا کر وہاں سے چلا گیا۔

چار ماہ گزر گئے۔ اخراجات کے لیے مزید رقم کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے سوچا کراچی جا کر اپنی ٹیکسی کی آمدنی کا حساب کرلے اور کچھ رقم لے آئے۔ اس کے لیے بچے

کو ممدو کی ماں کے پاس چھوڑنا پڑا۔ ویسے بھی کامی اس بوڑھی عورت سے مانوس ہوگیا تھا۔ دن رات انہی کے پاس رہتا تھا۔ جانی کو اس بات کا اطمینان تھا کہ اس کے حسب منشا بچے کی پرورش ہورہی ہے۔

ٹرین میں سوار ہوکر اس نے حساب لگایا۔ چار ماہ دس دن کے بعد وہ کراچی جارہا تھا۔ یوں تو اخراجات کے پیش نظر وہاں سے رقم لانے کا ارادہ تھا لیکن سفر شروع ہوا تو دل نے چغلی کھائی کہ وہ صرف اخراجات پورے کرنے کے لیے نہیں کسی کو دیکھنے' کسی کے متعلق کچھ معلوم کرنے جارہا ہے۔ شام کے چھ بجے اس نے کراچی کینٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ اس وقت دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوچہ جاناں کی طرف کھنچا جاتا ہو اور سیدھا وہیں جانا چاہتا ہو۔ وہ اسٹیشن سے باہر آیا پھر بس میں بیٹھ کر جہانگیر روڈ پہنچا۔ دور ہی سے اس نے دیکھا کہ مستری چاچا کا گیراج کھلا ہوا تھا۔ ان کا داماد ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کسی سے باتیں کررہا تھا۔ دوسرے مستری اور مزدور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ ذرا دیر وقت گزارنے کے لیے ایک ہوٹل میں جاکر بیٹھ گیا اور ایک پیالی چائے آہستہ آہستہ پینے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد گیراج کے مستری چلے گئے۔ وہ ہوٹل سے نکل کر گیراج میں پہنچا۔ مستری چاچا کے داماد نے اسے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا پھر خوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "تم نے تو اپنے گھر والوں کو پریشان کردیا۔"

"کس کا گھر؟ میرا کون پریشان ہونے والا ہے؟"

"ایسا نہ کہو' تمہارے سسرال والے بہت پریشان ہیں۔ جس دن تم گئے' اس کے دوسرے دن تمہارے سسر ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ آئے تھے۔"

"نوجوان لڑکی؟ کون تھی وہ؟"

چھوٹو نے آگے بڑھ کر کہا "استاد جی وہی لڑکی تھی جو پہلی بار تمہاری ٹیکسی میں بیٹھ کر کالج گئی تھی۔"

اس کی بات سنتے ہی پھر جانی کا دل محبت سے دھڑکنے لگا۔ اچھا تو وہ مجھے تلاش کررہی ہے۔ میرے جانے کے بعد محبت جوش مار رہی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا "وہ کیوں آئی تھی؟"

"وہ ہم لوگوں سے جھورے پینٹر کا پتا پوچھ رہی تھی۔ ہم نے اسے بتادیا پھر وہ دونوں اسی وقت چلے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس سے ملاقات ہوئی بھی یا نہیں۔"

اس نے مستری چاچا کے داماد سے کہا "جمال بھائی! میرے حساب میں کتنی رقم جمع ہوئی ہے؟"

"جانی! خود ٹیکسی چلانے اور دوسروں کو ٹیکسی دینے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تم ہزاروں روپے کی آمدنی کیا کرتے تھے مگر ان چار مہینوں میں صرف بائیس سو روپے تمہارے حساب میں ہیں۔ باقی گاڑیوں کی مرمت اور دوسرے اخراجات ہیں ان سب کا حساب میرے پاس لکھا ہوا ہے۔"

"مجھے حساب کی ضرورت نہیں ہے پھر کبھی اطمینان سے دیکھ لوں گا۔ ابھی دو ہزار دے دیجئے۔"

"اس وقت تو نہیں ہیں۔ میں کل صبح دے دوں گا۔"

"کل صبح گڑبڑ ہو جائے گی۔ میں کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا یا کسی نے مجھے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ جھگڑا ہو گا۔ میں غصے میں کسی کو قتل کر دوں گا۔"

"غصہ حرام ہوتا ہے۔ اطمینان سے بیٹھو اور میرے ساتھ روٹی کھاؤ۔"

"نہیں جمال بھائی! میں آپ کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ کے گھر والوں کو معلوم ہو گا تو وہ میرے سسر کو خبر کر دیں گے۔ آپ مجھے کسی مسئلے میں نہ الجھائیں۔ رقم دے سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ کل جھورا کسی وقت آئے گا اسے دو ہزار دے دیجئے گا۔"

"اچھا، تم جھورے پینٹر کے پاس رہو گے۔"

"آپ اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ابھی جھورے کے پاس جاؤں گا۔ ادھر آپ میرے ساس سسر کو لے کر پہنچ جائیں گے۔ دیکھئے جمال بھائی اگر آپ نے میرے معاملے کو اور زیادہ الجھانے کی کوشش کی تو میں آپ سے بھی تعلق ختم کر لوں گا۔"

"میں تمہارے معاملات کو الجھانا نہیں سلجھانا چاہتا ہوں۔ تم برے پہلو پر غور کرتے رہو گے تو زیادہ کڑھتے رہو گے۔ زیادہ غصہ آتا رہے گا۔ اگر کسی بات کے اچھے پہلو کو کبھی کبھی سوچتے رہو گے تو...."

جانی نے بات کاٹ کر کہا "اس بات کا کون سا اچھا پہلو ہے۔ کیا آپ مجھ سے زیادہ میری بیوی کو جانتے ہیں؟ کیا آپ نے فریب کھایا ہے؟ کیا آپ سے جھوٹ بولا گیا ہے؟ کیا آپ کی شادی ایسے ہوئی ہے جیسے میری ہوئی تھی؟ کیا آپ کی بیوی آپ سے پوچھے بغیر اپنے میکے بھی جاتی ہے جب کہ میری بیوی مجھ سے پوچھنے کے باوجود نہ پوچھنے کے برابر دھوکا دے کر لندن پہنچ گئی ہے۔ دیکھئے خواہ مخواہ میرا دماغ خراب نہ کریں۔"

"میں تمہاری تمام باتوں کو مانتا ہوں مگر کیا کروں۔ میرے گھر کی عورتیں بھی رخسانہ بھابی کی حمایت کر رہی ہیں۔"

"وہ عورتیں ہیں یقیناً حمایت کریں گی۔ آپ مرد ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟"

"اتنا کہتا ہوں کہ رخسانہ بھابی سے غلطی ہوئی ہے انہیں بڑی سے بڑی سزا دو۔ انہیں احساس دلاؤ لیکن اپنا گھر اور بچے کی زندگی برباد نہ کرو۔"

جانی ناگواری سے جانے لگا۔ چند قدم جانے کے بعد رک گیا پھر پلٹ کر بولا "ٹھیک ہے، میں اپنا گھر برباد نہیں کروں گا۔ آباد کروں گا۔ دوسری شادی کر کے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا بس اسٹاپ پر آیا پھر ایک بس میں سوار ہو کر کریم آباد پہنچ گیا۔ جھورے پینٹر کو تلاش کرتا ہوا ایک ہوٹل میں آیا۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ جانی کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "آہا! استاد کتنے دنوں بعد صورت نظر آئی ہے۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"جانی نے پوچھا کیا تم نے چائے پی لی؟"

"پی لی۔ آؤ تمہیں بھی پلاؤں۔"

"یہاں نہیں کہیں اور چلو۔"

وہ جھورے کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا کاؤنٹر کے پاس آیا۔ وہاں چائے کے پیسے ادا کیے پھر اسی طرح کھینچتا ہوا اسے ہوٹل کے باہر لے آیا۔ اس نے پوچھا "استاد! یہ مجھے پکڑ کر کہاں لے جا رہے ہو؟"

"کہیں دور چلیں گے۔"

"میری دکان پر چلو۔"

"نہیں وہ لوگ مجھے پکڑنے آجائیں گے۔"

"کیا پولیس والے تمہارا پیچھا کر رہے ہیں؟"

"سسرال والوں کے آگے پولیس والے کیا ہیں؟"

"اچھا سمجھ گیا۔ وہ فرید صاحب اور فرزانہ بی بی میرے پاس آئے تھے پھر شام کو میں فرزانہ بی بی کے کلینک میں گیا تھا۔ جانتے ہو کیوں؟"

جانی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے جواب دیا "میں تمہاری طرف سے رخسانہ بھابی کو خط لکھنے گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہاں بھابی کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ یہاں کے حالات کا علم نہ ہو۔ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ تم بچے کو لے کر چلے گئے ہو اسی لیے میں اب تک پانچ بار تمہاری طرف سے خط لکھ چکا ہوں۔"

جانی نے لپک کر اس کے گریبان کو پکڑ لیا پھر گریبان سے کھینچ کر ادھر سے ادھر لا کر بولا "تم نے میری اجازت کے بغیر اسے خط کیوں لکھا؟"

"میں کیا کروں۔ وہ مجبور کر رہی تھیں۔"

"کون؟"

"وہ وہ ڈاکٹرنی بی بی' میرا مطلب ہے فرزانہ بی بی۔"

جانی کے ہاتھ سے گریبان چھوٹ گیا مگر غصہ بدستور رہا "وہ کون ہوتی ہے ایسے کام کرانے والی۔"

"تم برا مانو یا جھگڑا کرو یا مجھے مار ڈالو مگر سچ بات یہی ہے کہ تم رخسانہ بھابی پر ظلم کر رہے ہو۔"

"ابے کیا کہتا ہے۔ میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔"

"میں نے کہا نا منہ توڑ دو۔ ہاتھ پاؤں توڑ دو لیکن وہ ہزاروں میل دور پردیس میں ہیں۔ اکیلی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ جمشید بڑی ہیرا پھیری کر رہا ہے۔ بھابی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اگر اتنی دور اس نے بھابی کو کوئی نقصان پہنچایا تو کون اس کی مدد کرنے والا ہے؟"

"مرنے دو اسے جیسے دھوکا دے کر گئی ہے۔ ویسے ہی اس کا یار اس کے ساتھ سلوک کرے گا۔"

"استاد! بھابی کو گالی مت دو۔ میں کئی بار تمہارے سسرال گیا ہوں۔ فرزانہ بی بی کے پاس بیٹھ کر میں نے خط لکھے ہیں۔ مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ یقیناً بھابی نے غلطی

کی ہے لیکن ایک عقل کی بات مجھ سے سیکھ لو' ان سے جتنا برا سلوک کرنا چاہو' جتنا بھی ان کو پریشان کرنا چاہو تو یہاں آنے کے بعد کرنا۔ وہ پردیس میں ہیں جانی تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟"

"میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتا۔"

وہ منہ پھیر کر جانے لگا۔ جھورے نے کہا "میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم جس کی آس لگائے بیٹھے ہو اور جس کے لیے تم بھابی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دینا چاہتے ہو تو سن لو۔ وہ چڑیا اڑ چکی ہے۔"

جانی جاتے جاتے رک گیا "کیا کہہ رہے ہو؟ کس چڑیا کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جو فرزانہ بی بی ہیں نا' ان کی شادی ہو چکی ہے۔"

جانی کے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا پہنچا۔ یوں لگا جیسے اچانک ہی کسی نے بھرپور طمانچہ مارا ہو۔ اس کے اندر یکبارگی آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ بے چینی سے جھورے کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا پھر اس نے دانت پیس کر دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا "اگر یہ جھوٹ ہوا تو میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

"آدمی غصے میں اپنا ہی خون پیتا ہے۔ ویسے یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ابھی دو دن پہلے فرید صاحب میرے پاس آئے تھے' انہوں نے کہا کہ شام کو میں ان کے گھر پر آ جاؤں۔ فرزانہ بی بی اور ان کے دولہا کو کھانے کی دعوت دی گئی تھی۔ مجھے بھی دعوت میں شریک ہونے کے لیے کہا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ وہاں بیٹھ کر بھابی کو ایک خط اور لکھ دوں۔"

وہ جھورے کی بات سن رہا تھا۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر ناک سے زور زور کی سانس لے رہا تھا جیسے درندہ غرّا رہا ہو پھر اس نے پوچھا "شادی کب ہوئی؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"میں نہیں مانتا۔ اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"تم اسے جلدی کہہ رہے ہو۔ چار مہینے کے بعد آئے ہو۔ جیسے دیر نہیں ہوئی' ویسے بھی جلدی اور دیر کی کیا بات ہے۔ یہ تو ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ شادی خاندان میں ہوئی ہے۔ اپنے چچا کے لڑکے کے ساتھ۔"

جانی کی کھوپڑی گرم ہو رہی تھی۔ اس وقت یہی چاہتا تھا کہ فرزانہ سامنے ہو اور وہ اس کا گلا گھونٹ ڈالے پھر اسے اپنی ساس کا خیال آیا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر کہا "میں سمجھ گیا۔ میری ساس نے اس کی شادی کرائی ہے۔"

"نہیں استاد! فرید صاحب کو اور ان کی بیگم صاحبہ کو تو شادی کی خبر ہی نہیں تھی۔ فرزانہ بی بی بہت پہلے سکھر چلی گئی تھیں۔ وہیں ان کے چچا نے اپنے لڑکے سے نکاح پڑھایا۔"

وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ محاورتاً جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اگر نہ بیٹھتا تو چکرا کر گر پڑتا پھر اس نے ڈوبتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے اس کو دیکھا ہے؟"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

وہ جھنجلا کر بولا "ابے اس دشمن کی بات پوچھ رہا ہوں جس نے اس سے شادی کی ہے۔"

"استاد! ایسے معاملات میں دشمن نہیں رقیب کہتے ہیں۔"

اس نے گھور کر دیکھا۔ جھورے نے کہا "پہلے پوری بات سن لو۔ یہ عاشقی کا معاملہ ہے۔ جو شریف آدمی ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو رقیب نہیں سمجھتے۔ محبت سے دعائیں دیتے ہیں کہ اپنی محبوبہ جس کے ساتھ بھی رہے خوش رہے۔ شاد و آباد رہے۔ تم بھی ایک شریف آدمی ہو کیا تم فرزانہ بی بی کو دعائیں نہیں دو گے؟"

وہ سر اٹھا کر دور خلاؤں میں تکنے لگا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی روح کھینچ لی گئی ہو۔ جسم فٹ پاتھ پر بیٹھا رہ گیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ یوں چلنے لگا۔ جیسے نیند میں چل رہا ہو۔ جیسے اب بھی خواب دیکھ رہا ہو' اور خواب نہ آ رہے ہوں تو پرانے خوابوں کو تازہ کر رہا ہو۔

بند آنکھوں کے پیچھے خواب صرف ایک ہی بار پھول کی طرح کھلتے ہیں۔ ایک پھول دوبارہ نہیں کھلتا۔ ایک ہی خواب شاید کسی نے دوبارہ دیکھا ہو۔ فرزانہ بھی ایسا خواب بن گئی تھی۔ جسے وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ دیر تک چلتا رہا۔ دیر تک سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتا رہا۔ اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی کے چلتے رہنے کی میعاد کیا ہے؟ بس وہ چل رہا

تھا۔ جیسے چلتے چلتے مر جائے گا۔

جھورے پینٹر کی تھکی ہوئی سی آواز سنائی دی "استاد کب تک چلتے رہو گے۔ میں تو بالکل تھک گیا ہوں۔ کہیں تو بیٹھ جاؤ۔"

اس نے پلٹ کر جھورے کو دیکھا پھر اپنے آس پاس یوں دیکھنے لگا جیسے نیند سے جاگا ہو اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ کہاں سویا تھا اور کہاں آنکھ کھلی ہے۔ جھورے نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے ہمدردی کروں یا کوئی نصیحت کروں؟"

"کچھ نہ کرو۔ چلے جاؤ۔"

"کیسے چلا جاؤں؟ میں روتا رہوں تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔"

"کیا تم قدم سے قدم ملا کر میرے دکھ میں شریک ہو رہے ہو؟"

جھورے نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "اگر تم رخسانہ بھابی کے لیے سوچو ان کی فکر کرو۔ کوئی تدبیر سوچو تو اسی طرح قدم ملا کر چلتا رہوں گا تمہارے ہر معاملے میں کام آؤں گا۔ بلکہ دنیا بھی تمہارا ساتھ دے گی اور اگر تم فرزانہ بی بی کے بارے میں سوچو گے تو میں ہی کیا دنیا بھی اسے حماقت کہے گی بلکہ تمہیں برا کہے گی۔ ایک شریف زادی جس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق سوچنا اب گناہ ہے۔"

"میں نہیں سوچوں گا۔" اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے پوچھا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ دماغ سوچنے کے قابل ہی نہ رہے۔"

"اس دماغ کو سوچتے رہنا چاہیے۔ اپنی شریکِ حیات کے متعلق اور اپنے بچے کے بارے میں۔ ارے ہاں میں تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ کامی کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ ابھی میں کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"بیشک باتیں نہ کرو مگر ایک آخری بات بول رہا ہوں۔ جب کامی جوان ہو گا تو تم سے ضرور پوچھے گا۔ ابو! میری امی ہزاروں میل دور تھیں۔ اکیلی تھیں۔ بے یار و مددگار تھیں آپ نے انہیں اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کا موقع دیے بغیر ان کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا؟ تب جانی تم کبھی اپنے بیٹے کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکو گے۔"

وہ منہ پھیر کر جانے لگا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں پہلے گیا تھا۔"

"آج نہ جاؤ۔ میرے ساتھ روٹی کھاؤ۔ میرے ساتھ رات گزارو۔ میں کسی کو تمہارے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ جب تمہارے ساتھ رہوں گا تو بھلا کس کو بتا سکوں گا۔"

"تم میرے سسرال والوں کا ساتھ دے رہے ہو۔"

"ہرگز نہیں میں حق کا ساتھ دے رہا ہوں۔ میں آخری سانس تک تمہیں سمجھاتا رہوں گا۔ تم جب تک نظر آؤ گے۔ تمہارے ساتھ چلتا رہوں گا۔"

وہ ایک بس میں سوار ہو گیا۔ جھورے بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ کینٹ اسٹیشن پہنچے۔ جھورے نے پوچھا "تم کہاں جاؤ گے اس وقت کون سی گاڑی ہے جو تمہیں کسی منزل تک پہنچائے گی؟"

"جس کی کوئی منزل نہ ہو وہ کسی بھی وقت، کسی بھی گاڑی میں اور کسی بھی راستے پر جا سکتا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ اب جاؤ۔"

"میں کیسے تمہیں چھوڑ دوں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

"نہیں واپس جاؤ اور میرے سسرال والوں کے چمچے بنے رہو۔"

"میں آئندہ بھابی کا نام نہیں لوں گا۔ صرف تمہاری باتیں کروں گا۔ تم کوئی غلط بات بولو گے تو میں ہاں میں ہاں ملاؤں گا۔"

"جھورے! میں جانتا ہوں۔ تم میرے گھر کی تباہی نہیں دیکھ سکتے۔ کسی نہ کسی بہانے جاننا چاہتے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کہاں رہتا ہوں لیکن تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ مجھے چپ چاپ جانے دو۔ اگر نہیں جانے دو گے تو میں تمہاری پٹائی شروع کر دوں گا۔"

جھورے نے اس کے چہرے کو تھوڑی دیر تک دیکھا پھر سر جھکا کر وہاں سے گھوم گیا۔ آہستہ آہستہ جانے لگا۔ جانی اسٹیشن کی عمارت کے باہر زینے پر کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دور بس اسٹاپ پر جا کر ایک منی میں سوار ہو گیا ادھر یہ منی میں بیٹھ کر دور کھڑے ہوئے جانی کو دیکھ رہا تھا۔ رات کے وقت اسے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ جھورے گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ چھپنے کے انداز میں عمارت کے ایک طرف سے چلتا ہوا ٹیکسیوں کے پیچھے سے گزرتا ہوا اسی بس اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ اس

وقت منی اسٹارٹ ہو رہی تھی۔ جھورے فوراً ہی اتر کر سامنے والے ہوٹل میں چلا گیا پھر دور ایک میز پر جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

جانی بس اسٹاپ پر آ کر دور جاتی ہوئی منی کو دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ جھورے اس میں بیٹھ کر جا چکا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسری منی آئی۔ وہ اس میں سوار ہو گیا۔ جھورے نے منی کا نمبر پڑھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ اورنگی جا رہا ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ آج وہ اسی شہر میں رہے گا۔

وہ کلینک کے سامنے پہنچ گیا لیکن دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ رات کے گیارہ سوا گیارہ ہو رہے تھے۔ آس پاس سناٹا چھا رہا تھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں اس نے ایک قریبی دکان دار سے پوچھا "یہ لیڈی ڈاکٹر کہاں گئی ہیں؟"

دکان دار نے جواب دیا "ان کا کلینک دو ہفتے سے بند ہے شاید اور دو ہفتے بند رہے گا۔ انہوں نے شادی کی ہے۔ دولہا دلہن کو ایک مہینے کی چھٹی تو ملنی ہی چاہیے۔"

جانی کو یوں لگا جیسے دکان دار اسے پتھر مار رہا ہو۔ وہ وہاں سے سر جھکائے چلا آیا۔ دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ وہ کہاں ہو گی؟ اپنے شوہر کے ساتھ ہو گی شاید کہیں سنیما دیکھنے یا تفریح کرنے گئی ہو گی۔ اس کے ساتھ ہنس رہی ہو گی اس کا ہاتھ اس کے شوہر کے ہاتھ میں ہو گا۔ وہ سوچتا رہا اور نگی سے ناگن چورنگی تک چلتا رہا۔ جب گھر پہنچا تو پاؤں نہیں دکھ رہے تھے۔ جسم تھکن سے خالی تھا لیکن دماغ بری طرح تھکا ہوا تھا۔ اتنا بھاری لگ رہا تھا جیسے کاندھے پر سر کی جگہ پہاڑ رکھا ہو۔ اس نے تالے کو کھولا پھر چار ماہ کے گرد آلود بستر پر آ کر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے بعد کیسے آنکھ لگ گئی۔ کچھ پتا نہ چلا۔

دوسری صبح دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا۔ رات کو وہ دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر کوئی اجنبی کھڑا ہوا دستک دے رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر وہاں سے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر بولا "فرمائیے آپ کون ہیں؟"

اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میرا نام رجب علی ہے۔"

جانی نے اس سے مصافحہ کیا۔ رجب علی نے کہا "کبھی کبھی آدمی اپنے نام سے اور

"...اپنے مقام سے پہچانا نہیں جاتا۔ اپنی پہچان کے لیے دوسروں کا حوالہ دینا پڑتا ہے۔ آپ مجھے فرزانہ کے حوالے سے شاید پہچان جائیں۔ وہ میری شریکِ حیات ہے۔"

جانی بڑی مضبوطی سے رجب علی کے ہاتھ کو گرفت میں لے کر مصافحہ کر رہا تھا۔ اس کی آخری بات سنتے ہی مصافحہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ رجب علی نے کہا "میں اپنی بیگم کے ساتھ آیا ہوں۔ وہ باہر رکشے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہی مجھے اس گھر کا پتا بتایا ہے۔"

جانی نے فوراً ہی برآمدے میں آ کر دیکھا۔ دور احاطے کے گیٹ کے پاس رکشہ کھڑا ہوا تھا اور اس میں سے سرخ جوڑا جھلک رہا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "آپ اپنی بیگم کو یہاں لے آئیں۔"

اس نے بات کاٹ کر کہا "آپ تکلف نہ کریں ہم آپ کے ہاں ضرور آئیں گے۔ فرید صاحب نے بھی ہماری دعوت کی تھی۔ جب آپ کی بیگم لندن سے واپس آجائیں گی۔ آپ کا ایک گھر ہو گا تو اس وقت دعوت کا مزہ بھی آئے گا اور دعوت عین رسم و رواج کے مطابق ہو گی۔"

جانی نے پوچھا "اگر میری یہ بات رسم و رواج کے خلاف ہے تو پھر آپ اپنی بیگم کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ میری بیگم مجھے آپ کے گھر تک پہنچانے آئی ہیں۔ اگر میں پتا جانتا تو تنہا آتا۔"

"یہاں آنے کی کوئی وجہ ہو گی۔"

"آپ مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے؟"

جانی نے ایک بار پھر رکشے کی طرف دیکھا پھر کہا "یہ مناسب نہیں ہے ایک عورت باہر رکشے میں بیٹھی رہے اور آپ میرے گھر میں بیٹھیں یا تو آپ بیگم کے ساتھ آ کر بیٹھیں یا جو کہنا ہو مختصر طور پر کہہ کر چلے جائیں۔ اگر میں کبھی اس قابل ہوا کہ آپ میاں بیوی کو اپنے گھر بلا سکوں تو ضرور یہ شرف حاصل کروں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں مختصر طور پر اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں فرزانہ کے چچا کا لڑکا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ دوسری بات کہئے۔"

"میں آپ کے، رخسانہ بھابی کے اور فرزانہ کے حالات سے پوری طرح واقف ہوں۔ آپ کی شادی سے لے کر اب تک کیا قصہ چلتا رہا۔ یہ میرے علم میں ہے۔ فرزانہ بہت ہی صاف گو ہے۔ اس نے مجھے ایک ایک بات بتا دی ہے۔ آپ نے بات مختصر کرنے کے لیے کہا ہے اس لیے صرف ایک سوال کر رہا ہوں۔ کیا میری بیوی عزت و آبرو سے میرے ساتھ پرسکون ازدواجی زندگی گزار سکے گی؟"

"آپ اس کے شوہر ہیں اس کی عزت و آبرو، اس کے سکون یا اس کے سکھ چین کے ذمے دار ہیں۔ یہ بات مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ مجھ سے خوش ہے مگر آپ سے سہمی ہوئی ہے۔ اس نے جو غلطی کی اس کی سزا اب بھی پا رہی ہے۔ آپ کی طرف سے آئندہ بھی ہونے والی بدنامیاں اسے دھمکیاں دے رہی ہیں۔ اس طرح میں شوہر ہو کر بھی اسے کیسے پرسکون رکھ سکوں گا؟"

جانی نے سر گھما کر پھر رکشے کی جانب دیکھا۔ پہلے فرزانہ سیٹ کے دوسرے حصے پر دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اب قریبی حصے پر ادھر چلی آئی تھی۔ سر جھکائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جانی کو صاف طور پر نظر آ رہی تھی۔ اس نے کتنے ہی زیورات پہن رکھے تھے سرخ جوڑا تھا۔ ایسی دلہن کی طرح کھل رہی تھی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن اب وہ پرائی تھی۔ اسے دیکھتے رہنے کا حق کسی اور کو حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے منہ پھیر کر کہا "میں وعدہ کرتا ہوں۔ آئندہ آپ کی شریکِ حیات کا نام کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا لیکن میں ایک سوال کر رہا ہوں کیا آپ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ پورے اعتماد سے زندگی گزار سکیں گے؟"

"ہاں کیوں نہیں؟ یہ سوال آپ کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟"

"اس لیے کہ وہ میرے نام سے بدنام ہوتی رہی ہیں اور ایک بدنام عورت ہمیشہ اپنے شوہر کی نظروں میں کھٹکتی رہتی ہے۔ ویسے میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ....."

رجب علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ قسم نہ کھائیں۔ مجھے اپنی شریکِ حیات پر مکمل اعتماد ہے جانتے ہیں کیوں؟ میں نے کبھی کسی پرائی عورت سے عشق نہیں کیا جو لوگ دوسری کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہی اپنی بیویوں پر شبہ کرتے ہیں۔"

جانی ایک دم سے تلملا گیا۔ تڑپ کر بولا "آپ مجھے طعنے دے رہے ہیں۔"

"نہیں' آپ کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔ فرزانہ نے مجھے ایک ایک بات بتائی ہے۔ ایک رات وہ آپ کے اس کمرے میں آئی تھی۔ تمام رات رہ کر دوسری صبح یہاں سے گئی تھی۔ اگر وہ حیا کو بالائے طاق رکھ کر گئی تھی تو مجھے اس پر شبہ کرنا چاہیے اور اسے سزا دینا چاہیے۔ اگر اس نے اپنی شرم و حیا کو برقرار رکھا تھا تو پھر آپ کو رخسانہ بھابی پر نہ تو شبہ کرنا چاہیے اور نہ ہی سزا دینا چاہیے۔ کیونکہ وہ بھی ٹھیک اسی طرح وہاں لندن میں کسی کے ساتھ ایک رات گزار چکی ہے۔"

اپنی بیوی کسی کے ساتھ رہ کر آئے تو اپنی مردانگی کو ٹھیس پہنچتی ہے اور کوئی دوسری اپنے ساتھ رہ کر جائے تو بھرپور رومانس کی انگڑائیاں سی آنے لگتی ہیں۔ یہ کم بخت بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ اس پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا۔ اس نے رجب علی سے کہا "میں اپنی بیوی کو معاف کروں یا سزائیں دوں یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ میاں بیوی کے درمیان آئندہ مداخلت نہیں کروں گا اور نہ ہی میری طرف سے کوئی بدنامی کی بات ہوگی لہٰذا آپ کو مطمئن ہو کر چلے جانا چاہیے۔"

اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ رجب علی مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے جانے لگا۔ جانی کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ بلکہ رکشے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر آ رہی تھی۔ رجب علی رکشے کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ فرزانہ کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ پھر واپس آیا۔ اس نے جانی سے کہا "میری شریک حیات پوچھتی ہیں کہ کامی کہاں ہے؟"

"میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ ماضی کو بھولنے اور بدنامیوں سے بچنے کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے اگر وہ میرے معاملات میں دلچسپی لیں گی تو مجھے بھی شہ ملے گی۔"

رجب علی نے تائید میں سر ہلایا پھر وہاں جا کر رکشے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک رکشہ کھڑا رہا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان بحث ہو رہی تھی پھر رکشا آگے بڑھ گیا۔ جانی اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا' دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

وہ دل برداشتہ ہو کر آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں آیا۔ دن کی روشنی میں کمرے کی ہر چیز گرد آلود نظر آ رہی تھی۔ وہ پچھلی رات اسی طرح گرد سے بھرے ہوئے بستر پر سو گیا

تھا۔ رخسانہ بڑی نفاست پسند تھی۔ اگر وہ کمرے کی یہ حالت دیکھ لیتی تو چیخیں مار کر جھاڑ پونچھ میں فوراً ہی مصروف ہو جاتی۔

اسے احساس ہوا کہ رخسانہ کی یاد آئی ہے۔ اس نے فوراً ہی سر کو جھٹک دیا جیسے دماغ سے اسے نکال رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا الماری کے پاس آیا پھر اسے کھول کر یونہی کپڑے اور دوسری چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شاید لباس بدلنا چاہتا تھا۔ شاید یاد آنے والی کو بھولنے کے لیے مصروف رہنا چاہتا تھا۔ اس نے دراز کھولی اوپر ہی وہ ڈائری نظر آئی۔ ڈائری کو دیکھتے ہی فرزانہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا "جانی! آج میں تمہیں بتاتی ہوں' جس رات تم بہت نشے میں تھے۔ اس رات میں نے تمہاری الماری کھول کر رخسانہ کی ڈائری پڑھی تھی۔ رخسانہ نے آخری صفحے پر لکھا ہے۔ تم جا کر پڑھ سکتے ہو۔ وہ تمہیں پھر ایک بار دھوکے میں رکھ کر یا جھوٹ بول کر پچھتا رہی ہے۔ اگر کبھی اس کا جھوٹ تم پر کھل جائے تو تمہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ آکر اپنی صفائی پیش کرے گی۔

وہ ڈائری کو دیکھ رہا تھا اور فرزانہ کی باتیں یاد کر رہا تھا پھر اس نے ڈائری کو اٹھا لیا۔ اسے کھولا۔ یونہی بے دلی سے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ چار ستمبر کے صفحے پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ وہاں رخسانہ نے لکھا تھا۔

"میرے جانی! میں تمہیں جان سے بڑھ کر چاہتی ہوں جو عورت جان سے زیادہ چاہے۔ وہ تھوڑا جھوٹ بولنے کا بھی حق رکھتی ہے کیونکہ اسے اپنے مرد پر بڑا مان ہوتا ہے۔ وہ مارے گا۔ ظلم کرے گا پھر اپنی ملکیت سمجھ کر معاف کر دے گا۔

جانی! میں پرسوں بہت دور چلی جاؤں گی۔ اگر کبھی تمہیں یہ بات معلوم ہو کہ میں نے تم سے کوئی بات چھپائی ہے تو میری رازداری کو فریب نہ سمجھنا۔ میرا انتظار کرنا۔ واپس آکر تمہیں سمجھاؤں گی۔ بعض حالات میں مصلحت اندیشی لازمی ہو جاتی ہے۔ میں ایسے فریب کو وقتی طور پر جائز سمجھتی ہوں۔ جس سے شوہر کو' بچوں کو اور گھر کو نقصان نہ پہنچے۔ میں قسم کھا کر جا رہی ہوں کہ کبھی کسی مرحلے پر بھی تمہاری خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گی۔ میرا ہاتھ صرف تمہارے ہاتھوں میں رہنے کے لیے ہے۔ یہ کسی اور ہاتھ میں کبھی نہیں جائے گا۔ جائے گا تو میں مرجاؤں گی۔"

اس نے جھنجلا کر ڈائری کو دور پھینک دیا۔ وہ اڑتی ہوئی.... پھڑپھڑاتی ہوئی گئی۔ جانی نے حیرانی سے دیکھا۔ ایک لمحے میں اسے یوں لگا جیسے رخسانہ تڑپتی ہوئی اور پھڑپھڑاتی ہوئی آکر اس کے قدموں سے لپٹ گئی ہو۔ دوسرے لمحے اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہ ڈائری دور جاکر اس کے جوتوں سے لپٹ گئی تھی۔

○☆○

رخسانہ اپنے حسن و جمال کو حیران ہو کر یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے ابھی تک خواب ہی دیکھ رہی ہو اور اپنے ادھورے چہرے کی تکمیل کی دعائیں نیند میں مانگ رہی ہو۔

وہ اپنے سامنے بڑے سے اسکرین پر جو کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ اس کے آس پاس اشتہاری کمپنی کی مسز ہاک، مسٹر ڈیوڈ ہاک اور مسٹر رچرڈ ڈیوڈ بیٹھے اس کے حسن کو اور اپنے کاسمیٹکس کے آئیٹمز کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور آہستہ آہستہ ان پر تبصرہ کر رہے تھے۔

سامنے اسکرین پر 'مناظر بدل رہے تھے۔ رخسانہ مختلف پوزمیں' مختلف انداز میں' کبھی کلوز اپ میں' کبھی لانگ شاٹ میں نظر آرہی تھی۔ ہر زاویے سے وہ ہوشربا تھی' ہر شاٹ میں ایک نیا جادو جگا رہی تھی۔ کبھی شیمپو کے حوالے سے اس کی ریشمی زلفیں یوں لہراتی تھیں جیسے ریشمی سکھیاں ساون میں جھولے جھول رہی ہوں۔ کبھی اس کے ہونٹوں کی کلیاں کھلتی تھیں اور لپ اسٹک کے مختلف شیڈز نظر آتے تھے۔ کبھی گالوں کے گلاب کھلتے تھے اور ان کے ذریعے ونشنگ کریم' کولڈ کریم اور ٹالکم پاؤڈر کو داد ملتی تھی۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی خوب صورت تھیں۔ اب ان میں کاجل بھری راتیں جاگ رہی تھیں اور آئی شیڈز کی رنگینیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ کیا تھی۔ کیا بن گئی تھی۔ ذرہ تھی' آفتاب بن گئی تھی۔ آفتاب بن کر بھی آسمان پر نہیں اڑ رہی تھی۔ بلکہ زمین پر بیٹھی جانی کو یاد کر رہی تھی۔ اپنے حسن کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ جس کے لیے وہ مکمل ہوئی ہے۔ وہ دیکھے گا تو کیسے اس کا دیوانہ بن جائے گا۔

پھر اسکرین سادہ ہو گیا۔ تاریکی چھٹ گئی۔ پروجیکشن ہال روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں آس پاس کے مرد اور عورتیں اٹھ کر اسے دیکھنے لگے۔ اس کی تعریفیں کرنے لگے اور اسے مبارک باد دینے لگے۔ رخسانہ دور کھڑے ہوئے ڈاکٹر لوئیس مارکو کو دیکھ رہی تھی

اشتہاری رش پرنٹ دیکھنے کے لیے ڈاکٹر کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مسز ہاک نے کہا "ڈاکٹر! آپ ایک لاجواب فنکار ہیں۔ آپ نے مسز رخسانہ کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔"

ڈاکٹر لوئیس مارکو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "میں بے جا تعریف پسند نہیں کرتا۔ آپ یقین کریں مسز رخسانہ میرے پاس آنے سے پہلے ہی قدرتی طور پر حسین تھیں۔ ان کا آدھا چہرہ حادثاتی طور پر بگڑ گیا تھا۔ باقی جو آدھا خوب صورت چہرہ رہ گیا تھا۔ میں نے اسی کے مطابق ان کے چہرے کو مکمل کیا ہے یعنی قدرت نے جو حسن انہیں دیا تھا۔ میں نے اس کی آدھی نقالی کی ہے۔ یہ میرا فن ضرور ہے لیکن میرا وہ کارنامہ نہیں ہے جو قدرت کا ہو سکتا ہے۔"

رخسانہ نے آگے بڑھ کر فرطِ عقیدت سے ڈاکٹر کے ہاتھ کو تھام لیا پھر اسے چوم کر کہا "آپ کی تعریفیں جتنی بھی کی جائیں کم ہیں لیکن اس کی بنیادی تعریف یہ ہے کہ آپ کا فن انسان کو بگڑی بنانا سکھاتا ہے آپ کا فن یہ اشارہ دیتا ہے کہ انسان ہمیشہ آدھا نہیں رہے گا۔ اپنے اندر کی بگڑی بناتے بناتے ایک دن وہ ضرور مکمل ہو گا۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے پروجیکشن ہال سے باہر آئے۔ مسز ہاک نے کہا "رخسانہ! تمہیں خوش خبری سنا دوں کہ صرف 'ایک ہفتے کا کام رہ گیا ہے۔ کچھ پوسٹرز اور کاسمیٹکس البم کے لیے تمہارے مختلف فوٹو گرافس کی ضرورت ہے آج سے دسویں دن تم واپس پاکستان جاسکو گی۔ تمہارے لیے پاکستانی طیارے میں ایک سیٹ ریزرو کرا دی گئی ہے۔"

رخسانہ کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ طویل سزا کاٹنے کے بعد دسویں دن جیل سے رہا ہونے والی ہو۔ گیارہویں دن اس کے تمام عزیز اسے خوش آمدید کہیں گے وہ اپنوں میں ہو گی اور جو سب سے زیادہ اپنا ہے اس کے پاس ہو گی۔

اس کے پاس ہونے کے تصور سے وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ مسز ہاک اس کی خوشیوں کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے دباتے ہوئے پوچھا "کیا وہ یاد آرہا ہے؟"

رخسانہ شرما گئی۔ مسز ہاک نے کہا "میں پاکستانی اور ہندوستانی لڑکیوں کو اکثر دیکھتی رہتی ہوں۔ تم لڑکیوں کے مسکرانے میں ایک عجیب دلکشی ہوتی ہے۔ ایسی مسکراہٹوں کا فوٹو گراف لینے کو دل چاہتا ہے۔"

وہ اسٹوڈیو کے ایک کینٹین میں آکر بیٹھ گئے پھر کافی کا دور چلنے لگا۔ رخسانہ نے کافی پینے کے دوران باتیں کرتے ہوئے ایک طرف دیکھا تو دور جمشید نظر آیا۔ وہ دفتر معلومات کی طرف سے آرہا تھا پھر کینٹین کی طرف رک کر وہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو خصوصاً عورتوں کو دیکھنے لگا جیسے رخسانہ کو تلاش کر رہا ہو۔ وہ انجان بن کر مسز ہاک سے باتیں کرنے لگی۔

جمشید کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔ وہ یقین سے اور کبھی بے یقینی سے رخسانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کالج کے زمانے میں اسے دیکھا تھا۔ وہ اسی رخسانہ سے مشابہت رکھتی تھی لیکن اس میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ قدرت نے اسے جس حد تک حسین بنایا تھا۔ اس میں ڈاکٹر لوکیس مارکو کی صناعی اور مشاقی بھی شامل ہو گئی تھی۔ قدرت نے اسے حقیقت بنایا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے تصوراتی بنا دیا تھا۔

جمشید ہچکچاتے ہوئے ان کی میز کے قریب آیا پھر جھجکتے ہوئے بولا "رخسانہ! کیا یہ تم ہو؟"

رخسانہ نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں' میں ہی ہوں بیٹھ جاؤ۔"

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رخسانہ نے کہا "جب میں پلاسٹک سرجری کے پہلے مرحلے سے گزرنے کے بعد اسپتال کے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی تو تم ملنے آئے تھے۔ تم نے کہا تھا' پاکستان جا رہے ہو۔ میں نے تم سے بہت ساری التجائیں کی تھیں۔ سوچا تھا' تم میرے مسائل دیانت داری سے حل کرو گے اور فرزانہ کو یہاں ملازمت کرنے کے لیے آنے پر راضی کر لو گے۔"

"ہاں' میں وعدہ کر کے گیا تھا۔" وہ سحر زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"اور اب آٹھ ماہ کے بعد واپس آئے ہو۔"

"رخسانہ! میری بھی تو سنو کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔"

"میرے پاس فرزانہ کا خط آیا ہے وہ برابر مجھے خط لکھا کرتی ہے۔ اس نے اپنے پہلے خط میں ہی تمہارا کچا چٹھا بیان کر دیا تھا۔ تم وہاں جا کر میری ازدواجی زندگی کو مزید تلخ بنانے اور جانی کے ہاتھوں مجھے طلاق دلوانے کے لیے سازشیں کر رہے تھے۔"

"تم بغیر سوچے سمجھے صرف فرزانہ کی باتوں میں آکر مجھے الزام دے رہی ہو۔ مجھے

تنہائی میں کچھ باتیں کرنے کا موقع دو۔"

"تاکہ تم مجھے جانی اور فرزانہ کے خلاف بھڑکا سکو۔"

"بھڑکانے کی بات نہیں ہے۔ میں جو کہوں گا سچ کہوں گا۔ جانی تم پر بے حد ظلم کر رہا ہے۔ وہ تمہاری ماں سے تمہارے بچے کو چھین کر کہیں چلا گیا ہے۔ بالکل لاپتا ہو گیا ہے۔"

رخسانہ نے بڑے اطمینان اور یقین سے پوچھا "یہ تم کب کی باتیں کر رہے ہو؟"

"جب میں پاکستان پہنچا تھا۔ اس کے دوسرے ہی دن میں نے تمہارے والدین سے ملاقات کی۔ ابھی میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ جانی آندھی طوفان کی طرح آن پہنچا اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تم اسے دھوکا دے کر یہاں آئی ہو۔"

رخسانہ نے جھینپ کر مسز ہاک وغیرہ کو دیکھا۔ اگرچہ وہ اور جمشید اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ تاہم رخسانہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے شوہر کو فریب دے کر آنے والی بات سب ہی کی سمجھ میں آرہی ہو اور سب اسے لعنت ملامت کرنے والے ہوں۔ وہ جلدی سے بولی "میں ایسی باتیں نہ تو کرنا چاہتی ہوں نہ سننا چاہتی ہوں۔ تم اول درجے کے جھوٹے ہو۔ جانی میرے خاندان میں موجود ہے اور میرے بچے کے ساتھ ہے۔"

"رخسانہ یقین کرو۔ تمہیں دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے پاس جانی کے جو خطوط آتے ہیں۔ وہ جانی نہیں لکھتے کوئی اور لکھتا ہے؟"

جمشید نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تمہارے پاس جانی کے بھی خطوط آتے ہیں؟"

"جانی کے بھی' امی کے بھی اور فرزانہ کے بھی۔ کیا یہ سب جھوٹے ہیں اور تم سچے ہو؟"

جمشید نے پریشان ہو کر چند لمحوں تک سوچا پھر کہا "میں کیسے یقین دلاؤں وہ میری آنکھوں کے سامنے بچے کو چھین کر لے گیا ہے۔" پھر وہ چٹکی بجا کر بولا "ہاں' ایک طرح سے میری باتوں کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ تم فون پر جانی سے گفتگو کرو اور اپنی امی وغیرہ سے کہو کہ وہ تمہیں اپنے بچے کی آواز سنائیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تم اپنے بچے اور

اپنے شوہر کی آواز فون پر نہیں سن سکو گی۔"

"میں ان آٹھ مہینوں میں بہت زیادہ مصروف رہی ہوں۔ صرف دو بار مجھے ٹیلی فون کرنے کا موقع ملا۔ ایک بار جانی گھر میں نہیں تھے۔ ٹیکسی لے کر گئے ہوئے تھے دوسری بار انہوں نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ اتنے مدہوش تھے کہ مجھ سے باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ہاں' دونوں بار میں نے اپنے بچے کی آوازیں سنی ہیں۔"

جمشید اپنی کھوپڑی سہلانے لگا پھر حیرانی سے بولا "مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فرزانہ پڑوس کے کسی بچے کو گود میں لے کر آگئی ہو اور اس کی آواز تمہیں سنا دی ہو۔ تم کیا سمجھو گی کہ وہ تمہارا بچہ تھا یا کسی اور کا؟"

"جمشید زیادہ نہ بولو۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی بہتر ہے کہ تم چلے جاؤ۔"

مسٹر ہاک اور مسٹر رچرڈ وغیرہ ان کی باتیں نہیں سمجھ رہے تھے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ رخسانہ اسے جانے کے لیے کہہ رہی ہے اسی وقت مسز ہاک نے کافی کی ایک پیالی جمشید کی طرف بڑھا دی۔ جمشید کو وہاں رکنے کا بہانہ مل گیا۔ اس نے کافی کی ایک چسکی لیتے ہوئے کہا "پاپا نے مجھے چھ ماہ کے لیے پاکستان بھیجا تھا۔ میں نے حالات تمہاری مخالفت میں دیکھے تو فوراً واپس آنے کا پروگرام بنایا لیکن پاپا نے سختی سے انکار کر دیا۔ کچھ کاروباری معاملات میں ایسا الجھایا کہ میں چھ ماہ سے پہلے نکل نہ سکا وہاں سے روانہ ہوتے وقت پھر پاپا کا پیغام ملا کہ پہلے مجھے فرینکفرٹ جانا ہوگا۔ وہاں سے پیرس جاؤں گا اور پھر لندن آؤں گا۔ یہ کاروباری دورے طویل ہو گئے۔ میں ہزار کوششوں کے باوجود تمہارے پاس نہ آسکا۔"

"تم مجھے خط کے ذریعے اطلاع دے سکتے تھے۔"

"میں تمہیں تین خط لکھ چکا ہوں اور تینوں خط سلمیٰ قادر کے پتے پر لکھے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ تمہاری رہائش وہیں ہے لیکن مجھے ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔"

"اور مجھے تمہارا ایک خط بھی نہیں ملا۔ تم بکواس کر رہے ہو۔"

ایسا کہتے وقت اسے باقر علی نظر آئے۔ وہ بھی دفتر معلومات کی طرف سے آرہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی رخسانہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر پاپا کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے

لگی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آکر رک گئے۔ باقر علی نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی رخسانہ! یہ تم ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آرہا ہے۔"

رخسانہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ باقر علی نے محبت سے اسے تھام لیا پھر کہا "نالائق بیٹے کو تلاش کرتا ہوا آیا ہوں۔"

اسی وقت جمشید نے قریب آکر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا "تم لندن کب پہنچے؟"

"ابھی دو گھنٹے پہلے۔"

"تم نے مجھ سے ملاقات کیوں نہیں کی؟"

"بس پاپا یونہی میں نے حساب لگایا تھا کہ رخسانہ کا چہرہ مکمل ہو چکا ہوگا۔ مجھے دیکھنے کی بے چینی تھی۔ میں نے اپنا تمام سامان لاکرز میں رکھا پھر سیدھا سلمیٰ قادر کے پاس پہنچا۔ رخسانہ کے متعلق دریافت کیا مگر انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اشتہاری فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہوں گی۔ اسی طرح بھٹکتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔"

باقر علی نے کہا "میں بھی تمہارے پیچھے بھٹک رہا ہوں۔ جیسے ہی سلمیٰ قادر نے فون پر بتایا کہ تم آگئے ہو۔ تو میں یہاں چلا آیا۔"

رخسانہ نے کہا "آپ کو مسز سلمیٰ قادر نے بتایا ہوگا کہ میں اس اسٹوڈیو میں ہوں۔"

"ہاں میں نے سلمیٰ قادر سے کہا تھا کہ اس نالائق کو تمہارا پتا نہ بتایا جائے۔ جمشید! تم میرے ساتھ چلتے ہو یا میں تنہا واپس جاؤں۔"

"پاپا! میں رخسانہ سے کچھ باتیں...."

رخسانہ نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "نہیں پاپا! میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔"

باقر علی نے کہا "سن لیا تم نے۔ چلو۔"

اس نے رخسانہ پر حسرت بھری نگاہ ڈالی پھر مجبوراً اپنے پاپا کے ساتھ چلتا ہوا ان کی کار کے پاس آیا۔ انہوں نے پوچھا "تم یہاں ٹیکسی سے آئے تھے؟"

"ایک دوست سے لفٹ لی تھی۔"

"چلو بیٹھ جاؤ۔"

وہ دونوں کار کی اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ باقر علی نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے آگے بڑھاتے ہوئے اسٹوڈیو کے احاطے سے نکل کر اپنے فلیٹ کا رخ کیا۔ راستے میں انہوں نے کہا "میں نے جان بوجھ کر تمہیں چھ ماہ کے لیے پاکستان بھیجا تھا کہ چھ ماہ میں پلاسٹک سرجری مکمل ہو جائے گی پھر معلوم ہوا کہ کچھ اور وقت لگے گا۔ کیونکہ رخسانہ شوٹنگ میں مصروف رہنے والی تھی۔ تب میں نے تمہیں فرینکفرٹ اور پیرس میں الجھا دیا۔ تمہیں یہاں آنے کا موقع نہیں دیا۔"

"پاپا آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسز سلمیٰ قادر، رخسانہ کے متعلق جانتی تھیں کہ وہ اس وقت اسٹوڈیو میں ہے لیکن انہوں نے مجھے نہیں بتایا اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو تین خط رخسانہ کو لکھے، انہوں نے انہیں غائب کر دیا تھا۔"

باقر علی نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "وہ تینوں خط تمہارے کردار کا آئینہ ہیں۔ وہ میرے پاس ہیں۔"

"پاپا! آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ کیا آپ اسے اپنی بہو نہیں بنا سکتے؟ آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کتنی حسین لڑکی ہے۔"

"وہ دنیا کا پہلا اور آخری حسن نہیں ہے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"لیکن پاپا....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہیں ایک شادی شدہ عورت کے متعلق ایسا سوچتے ہوئے، اس کا گھر برباد کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ مجھے تو یہ سوچ کر شرم آرہی ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔ میں آج آخری بار سمجھا رہا ہوں جب تک رخسانہ یہاں سے چلی نہ جائے تم اس کا سامنا نہیں کرو گے۔ جس دن مجھے یہ خبر مل گئی کہ تم نے اس سے ایک منٹ کی بھی ملاقات کی ہے تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔"

"آپ ایسا نہیں کریں گے، پاپا۔"

"کروں گا بیٹے، تمہیں یہاں سے وہاں تک جتنی بھی پروازیں ملتی گئیں۔ وہ سب میری دولت کی وجہ سے تھیں۔ میں تمہیں دولت سے محروم کر دوں گا تو تم دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو جاؤ گے۔ ابھی اس لڑکی کا چہرہ مکمل نہیں ہوا ہے۔ ہم سب مل کر اسے

مکمل کریں گے۔ لہٰذا مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمہارے پر کاٹ دوں۔ سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

جمشید نے شکست خوردہ انداز میں اپنے سر کو جھکا لیا۔

○☆○

"رخسانہ بھابی آرہی ہیں۔"

جھورے کی زبان سے یہ سنتے ہی جانی کا دل کچھ عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ نگاہوں کے سامنے آدھا چہرہ آگیا۔ وہ کہہ رہی تھی "جانی! تم لاکھ کوششیں کرو۔ مجھ سے نفرت نہیں کر سکو گے۔ تمہارے دماغ کے چور گوشے میں یہ بات ہے کہ میں بے وفا اور دولت کی لالچی عورت ہوں۔ اگر ہوتی تو لندن سے تمہارے لیے واپس نہ آتی۔ میں آرہی ہوں۔ صرف تمہارے لیے آرہی ہوں اور یہ بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔"

جھورے نے جانی کو سوچ میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر ایک بڑی سی تصویر اس کی طرف بڑھا دی "ذرا اسے دیکھو اور پہچانو یہ محترمہ کون ہیں؟"

جانی نے تصویر کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ اسے رخسانہ کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ رخسانہ جس کا آدھا چہرہ دیکھا تھا مگر تصویر میں وہ چہرہ مکمل تھا۔ رنگین تھا۔ محبت کی طرح سنگین تھا۔ بچوں کی طرح کھیل نہیں تھا کہ کھیلا اور اٹھا کر پھینک دیا۔ اس چہرے نے اس کے لیے نیا جنم لیا تھا۔ اس کا حسن اور اس کی دلکشی اس کی رعنائی اور اس چہرے کا غرور سب کچھ اپنے مرد کے لیے رکھا اور وہ چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا "جانی یہ تمہارے لیے صرف تمہارے لیے مکمل ہوا ہے۔ دوسرے اسے دیکھتے رہیں گے، تمنا کرتے رہیں گے اور تم سے جلتے رہیں گے۔"

وہ گھبرا گیا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ رخسانہ کے نئے نئے، تازہ تازہ حسن نے اسے سحرزدہ کر دیا ہو۔ بے شک وہ سحرزدہ کرنے والا حسن تھا لیکن وہ تصویر کو دیکھ کر جانے کتنے رنگین اور سنگین لمحات میں گم ہو گیا تھا۔ جو رخسانہ کے ساتھ گزرے تھے۔ وہ آدھے چہرے والی ایسی اداؤں بھری تھی کہ نفرت کے باوجود اب بھی یادوں کے فتنے جانتی تھی۔ اب اس کے مکمل حسن کے ساتھ اس کی اداؤں کا کیا عالم ہو گا؟ وہ تو دیکھے گا اور دیکھتا ہی رہ جائے گا۔ اسے گھر سے دھکے دے کر نکال سکے گا مگر دماغ سے نوچ کر نہیں پھینک سکے

گا۔

"کیا دیکھتے ہی رہو گے؟" جھورے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ہنستے ہوئے بول رہا تھا "میں جانتا تھا استاد! تم ڈوب جاؤ گے۔ ابھی تو یہ تصویر ہے۔ جب وہ سامنے ہوں گی تو کیا ہو گا؟"

جانی نے اونہہ کہہ کر حقارت کا اظہار کرتے ہوئے تصویر کو ایک طرف پھینک دیا۔

جھورے نے دوڑ کر اسے اٹھالیا "اب تو غصہ تھوک دو۔ بھابی کل صبح کی فلائٹ سے آ رہی ہیں۔"

وہ غصے سے بولا "کیا تم جورو کے بھائی ہو۔ تمہیں ساری باتوں کا علم ہوتا ہے۔ اس کے گھر والوں نے تمہیں اس کی تصویریں بھی رکھنے کے لیے دی ہیں۔"

"کوئی کسی کی گھر والی کی تصویر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ تم تین ماہ پہلے یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملاقات کی تھی۔ آئندہ بھی ملاقات ہو سکتی تھی۔ اسی لیے یہ تصویر گھر سے لے آیا۔ یہ میرے پاس رہے تو تم اعتراض کر سکتے ہو۔ اس پر صرف تمہارا حق ہے۔"

"میرا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے میرے سامنے نہ لاؤ۔ نہیں تو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"تم بھابی سے نہیں ملو گے؟"

"نہیں ملوں گا۔"

"تم ان سے یہ نہیں پوچھو گے کہ وہ تم سے جھوٹ بول کر کیوں گئی تھیں؟"

"مجھے کچھ نہیں پوچھنا ہے۔"

"کیا تم ڈرتے ہو؟"

جانی نے چونک کر اسے دیکھا پھر گھونسا دکھاتے ہوئے بولا "ابے کیا مار کھائے گا۔"

"کھالوں گا تمہارے انکار سے اور تمہارے دور بھاگنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بھابی کا اتنا قصور نہیں ہے۔ وہ بڑی محبت اور اعتماد سے تمہارے لیے چلی آ رہی ہیں۔ تمہارا قصور ہو یا نہ ہو مگر اپنے اندر کی اس کمزوری سے ڈرتے ہو جو تمہیں بھابی کی طرف کھینچ رہی ہے تم ان سے نفرت نہیں کر رہے ہو۔ تم انہیں سزا بھی نہیں دے سکتے تم

انہیں معاف بھی نہیں کر سکتے۔ تم انہیں بھلا بھی نہیں سکتے۔ تم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم وہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم ایک بیمار ذہن کے آدمی بنتے جا رہے ہو۔ خود تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ جب کہ سیدھی سی بات ہے اپنے بچے کے مستقبل کے لیے اپنے گھر کو شاد و آباد رکھنے کے لیے تمہیں بھابی کا ہاتھ تھام لینا چاہیے۔"

وہ پیچھے ہٹ کر اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے ڈرے گی۔ میرے آگے گڑگڑائے گی۔ التجائیں کرے گی، روئے گی، معافی مانگے گی لیکن میں اسے تڑپاؤں گا، سزائیں دوں گا۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا کہ تم سب دیکھو گے۔"

وہ منہ پھیر کر جانے لگا۔ جھورے نے آواز دی "رک جاؤ۔ کہاں جا رہے ہو۔ اپنا پتا ٹھکانا تو بتا دو۔"

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ آئے گی تو میں بھی آؤں گا اور اور....."

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ مٹھیاں بھینچ کر ذرا سا تلملایا پھر پلٹ کر تیزی سے چلا گیا۔ جھورا اسے دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ اس کا پیچھا کرے یا نہ کرے۔ پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو اس نے تعاقب کیا تھا۔ فرزانہ کو اطلاع دے دی تھی پھر فرزانہ دوسری صبح اپنے میاں کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی۔ اس کے بعد بھی جھورے نے کوشش کی تھی کہ جانی کا تعاقب کرتا ہوا اس کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جائے لیکن ناکامی ہوئی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اسی وقت فرید احمد آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی جھورے نے کہا "جناب! ابھی جانی آیا تھا۔ ابھی ابھی ادھر گیا ہے۔"

انہوں نے فوراً ہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا "کدھر گیا ہے؟"

"وہاں بس اسٹاپ کی طرف۔ آیئے۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ادھر جانے لگے۔ فرید احمد نے کہا "تم نے اسے کیوں نہیں روکا؟ کم از کم اس کا پیچھا ہی کرتے۔"

"وہ بہت ہی الٹے دماغ کا آدمی ہے۔ اسے خبر ہو جائے کہ میں اس کا پیچھا کرتا ہوں تو وہ لڑنا جھگڑنا شروع کر دے گا۔ میری ایسی بری طرح پٹائی کرے گا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔"

وہ بس اسٹاپ پر پہنچ کر اسے تلاش کرنے لگے۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ جھورے نے

کہا "میرا خیال ہے وہ اسٹیشن گیا ہے۔ ٹرین میں بیٹھ کر کہیں جاتا ہے۔ پچھلی بار بھی یہی ہوا تھا۔"

فرید احمد اس کے ساتھ اسٹیشن پہنچے۔ وہاں بھی اسے تلاش کیا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ دوپہر کو وہ جانی کے مکان کے دروازے پر پہنچے وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ شام کو بھی اس مکان کی طرف چکر لگایا مگر وہ جوں کا توں ویران پڑا ہوا تھا۔ دروازہ اسی طرح مقفل تھا۔

فرید احمد نے کہا "اگر وہ شہر میں کہیں چھپا رہتا ہے تو رات کو یقیناً اپنے مکان میں آکر سوتا ہوگا۔ ہم آدھی رات کے بعد آکر دیکھیں گے۔"

وہ آدھی رات کے بعد تقریباً ڈیڑھ بجے اس مکان کے دروازے پر پہنچے وہاں تالے کو دیکھ کر فرید احمد تھکے ہوئے انداز میں زینے پر بیٹھ گئے۔ سر تھام کر بولے "میں کیا کروں۔ کل میری بچی، بڑی امیدیں لے کر آرہی ہے۔ ہم نے اسے بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اب وہ آئے گی تو اپنا سینہ پیٹے گی۔ میں اپنی بچی کے لیے کیا کروں۔"

جھورے نے بے بسی سے سرہلا کر کہا "افسوس، کل کا دن کیا ہوگا۔ کل وہ آرہی ہیں ہمارے لیے خوشیاں لے کر اور ہم انہیں آنسو دیں گے۔ کل عید بھی ہے اور کل ماتم بھی ہوگا۔"

○☆○

عید کی صبح طلوع ہوگئی، وہ سب خوش رنگ لباس پہنے ائرپورٹ کی عمارت میں پہنچے۔ وہ بظاہر خوش تھے مگر دل میں ماتمی اندیشے گھر کر رہے تھے۔

فرزانہ، فرید احمد اور ان کی بیگم کو سمجھا رہی تھی "آپ اپنے چہروں پر خوشی کے تاثرات رکھیں ذرا بھی اداسی یا مایوسی کو جگہ نہ دیں ورنہ رخسانہ یہیں رونا شروع کردے گی۔ اسے سمجھا منا کر گھر تک لے جانا ہے۔ وہیں ساری باتیں اسے بتائی جائیں گی۔"

فرید احمد نے کہا "تم اپنی خالہ جان کے ساتھ یہاں ٹھہرو میں ذرا دیکھ لوں۔ شاید جانی آیا ہو اور کہیں چھپا ہوا ہو۔ اسے دیکھ کر ہمیں تسلی تو ہو جائے گی کہ وہ موجود ہے۔"

فرزانہ نے کہا "آپ ابھی نہ جائیں۔ وہ دیکھیے طیارہ رن وے پر اتر رہا ہے۔ جھورے تم اسے تلاش کرو۔"

وہ تلاش کرنے کے لیے چل پڑا۔ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ ایک ایک کو دیکھتا رہا مگر وہ نظر

نہیں آیا۔ نظر بھی کیسے آسکتا تھا کیونکہ جھورا اس کی نظر میں تھا۔ جدھر وہ تلاش کرنے جاتا تھا۔ ادھر سے جانی ہٹ جاتا تھا اور دوسری جگہ بھیڑ میں گم ہوجاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر واپس فرید احمد کے پاس چلا گیا۔

اس وقت طیارہ رن وے پر ٹھہر چکا تھا۔ سیڑھی لگائی جارہی تھی۔ دروازہ کھل رہا تھا۔ مسافر ایک ایک کرکے زینے سے اتر رہے تھے۔ جانی بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ کیوں دیکھ رہا تھا؟ جب کہ اسے نفرت تھی۔ وہ دشمن بنا ہوا تھا۔ اسے سزا دینا چاہتا تھا اس کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا پھر کیوں دیکھ رہا تھا؟

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے دھوکا دے کر وہ کتنی خوش ہے؟ کتنی دولت کما کر لائی ہے؟ اکیلی آئی ہے یا جمشید بھی ساتھ ہے؟ کتنے دنوں کے لیے آئی ہے؟ اس کے لیے آئی ہے یا اپنے بچے کے لیے آئی ہے؟

پھر وہ نظر آگئی۔ طیارے کے دروازے پر آکر چند لمحوں کے لیے ٹھہر گئی۔ وہ بہت دور تھی مگر ایک دم سے دل میں آکر دھڑک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بہت سارے جانے پہچانے لمحے جانی کے دل ودماغ پر دھاوا بولنے لگے۔ وہ ایک ایک زینہ اتر رہی تھی گہرے رنگ کے لباس میں گورے رنگ کا بدن کرن کرن جگمگا رہا تھا پھر وہ زینے سے نیچے آگئی۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اس کی چال میں تبدیلی آگئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب وہ پورے چہرے کے ساتھ اور پورے اعتماد کے ساتھ چل رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے عمارت کی طرف آئی۔ تھوڑی دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ دوسری طرف، نظر آئے گی۔ وہ لگیج ہال کے پاس ذرا دور جاکر کھڑا ہوگیا۔

اس کے اندازے کے مطابق وہ لگیج ہال کے دروازے پر نظر آئی۔ اس کی نظریں ہجوم میں بھٹک رہی تھیں۔ یقیناً وہ اسے تلاش کررہی تھی۔ اس کی امی آگے بڑھ کر لپٹ گئیں۔ وہ ماں سے لپٹ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی بانہیں ماں کے لیے تھیں، نظریں کسی اور کے لیے تھیں۔ فرید احمد اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر شاید دعائیں دے رہے تھے پھر اس کی نظریں فرزانہ پر گئیں اسی وقت جانی نے بھی فرزانہ کو دیکھا پتا نہیں اس وقت تک وہ بھیڑ میں کہاں چھپی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ رجب علی اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ رخسانہ نے اسے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھ کر

سہیلی کے گلے لگ گئی فرزانہ نے اپنے شوہر رجب علی کی طرف اشارہ کیا۔ رخسانہ رجب علی کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی کچھ کہہ رہی تھی ان کا آپس میں تعارف ہو رہا تھا۔ شاید کچھ ہنسی مذاق بھی ہوا کیونکہ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ہنستے ہنستے پھر چپ ہو گئی پھر اسے جانی کا خیال آگیا تھا۔

رجب علی سامان کی رسید لے کر لگیج ہال کی طرف چلا گیا۔ سامان کچھ زیادہ تھا۔ کسٹم والوں سے پاس کرانے میں دیر لگی۔ اتنی دیر میں رخسانہ ایک ایک سے پوچھ رہی تھی اور ہر ایک اسے کچھ نہ کچھ تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ کبھی مطمئن ہو جاتی تھی کبھی اس کی نظریں ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ آخر سامان آگیا پھر وہ لوگ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جانے لگے۔

ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیگم اور فرزانہ' رخسانہ کے آس پاس بیٹھ گئیں۔ رجب علی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فرید احمد جھُورے کے ساتھ سامان کو لے جانے کے لیے دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگے جب ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو رخسانہ نے پریشان ہو کر کہا "مجھے لگتا ہے جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ آخر جانی کیوں نہیں آئے؟"

بیگم نے کہا "میں تمہیں کہہ چکی ہوں بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جانی نے کہا کہ ہم تمہیں لینے آجائیں۔ وہ بچے کے پاس رہے گا۔ ابھی گھر چل کر ملاقات ہو جائے گی۔"

فرزانہ نے اسے باتوں میں بہلانے کے لیے کہا "تم اپنی ہی باتیں کیے جا رہی ہو۔ یہ بتاؤ میری ملازمت کا کیا ہوا۔ میں نے پاسپورٹ وغیرہ تیار کر لیا ہے۔ جانے کے لیے تیار بیٹھی ہوں۔ اپنا وہ کلینک والا مکان بیچ ڈالا ہے۔"

رخسانہ نے کہا "میں تمہارے لیے تمام ضروری کاغذات لے آئی ہوں۔ وہاں مسز سلمیٰ قادر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تم جب چاہو یہاں سے روانہ ہو سکتی ہو۔ کیا ہمارے دولہا بھائی بھی تمہارے ساتھ جائیں گے؟"

رجب علی نے کہا "بھابی' آپ میری فکر نہ کریں۔ میں لندن جیسے ماحول میں رہ نہیں سکتا۔ پہلے ہی فرزانہ سے کہہ دیا ہے۔ اگر یہ اپنی ضد پوری کرنے کے لیے لندن جانا چاہتی ہیں' ملازمت کرنا چاہتی ہیں' کچھ تجربات حاصل کرنا چاہتی ہیں تو شوق سے جائیں۔

میں یہیں اچھا ہوں۔"

رخسانہ نے پوچھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیوی وہاں رہے اور شوہر یہاں؟"

"اب یہی دیکھنا ہے کہ جس میں کشش زیادہ ہوگی وہ ادھر کھنچا چلا جائے گا یا تو میں ان کے پاس چلا جاؤں گا یا یہ میرے پاس آجائیں گی۔"

رخسانہ نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا دعویٰ ہے کہ میری سہیلی میں زیادہ کشش ہے۔ آپ ہی ادھر کھنچے چلے جائیں گے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ اسی طرح ہنستے بولتے راستہ کٹ گیا۔ وہ ناظم آباد والے مکان کے سامنے پہنچ گئے ٹیکسی سے اتر کر جب بیگم اپنے دروازے کا تالا کھولنے گئیں تو رخسانہ نے ٹھٹک کر پوچھا "یہ کیا' آپ تو کہہ رہی تھیں کہ جانی یہاں بچے کے ساتھ ہیں۔"

فرزانہ نے رخسانہ کا ہاتھ تھام کر کہا "جانی یہاں نہیں ہیں۔ وہ بچے کو لے گئے ہیں۔"

رخسانہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرزانہ کو تکنے لگی۔ جیسے دیکھ نہ رہی ہو بلکہ کہیں دور سوچنے لگی ہو۔ ایک طرف فرزانہ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ دوسری طرف بیگم نے اس کے بازو کو تھام کر کہا "بیٹی اندر چلو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا کر بولی "میں نہیں جاؤں گی۔ تم لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔ مجھے دھوکا دیتے رہے ہو۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔"

"بیٹی! ادھر تالا پڑا رہتا ہے۔ ہم پچھلی رات بھی وہاں چکر لگاتے رہے لیکن وہ نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہاں بچے کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ ہم سے ملتا بھی نہیں ہے۔"

یک بیک رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے پوچھا "وہ کیوں چلے گئے؟ کامی کو کیوں لے گئے؟ کیا جمشید نے مجھ سے درست کہا تھا؟"

فرزانہ نے کہا "پتا نہیں جمشید نے کیا لگائی بجھائی کی ہے تم اندر چلو۔ اس طرح ضدی بن کر کھڑی رہو گی تو محلے والے تماشا دیکھیں گے۔ سہولت سے کچھ سوچنا ہوگا۔ کچھ کرنا ہوگا۔ ہم سب مل کر جانی کو تلاش کریں گے۔"

وہ اسے سمجھا منا کر کمرے میں لے آئی۔ جون کا مہینہ تھا سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ صبح

دس بجے سے ہی یوں لگ رہا تھا جیسے انگارے برس رہے ہوں بیگم نے سیلنگ فین کو آن کیا۔ رخسانہ دوپٹے سے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی "آپ لوگوں نے مجھ سے یہ باتیں کیوں چھپائیں؟"

"بیٹی! وہاں تمہیں یہ باتیں معلوم ہوتیں تو سکون سے اتنے دن نہ گزار سکتیں۔"

"آپ نے کامی کو کیوں لے جانے دیا؟"

"میں کیا کرتی؟ اسے روکتی تو وہ محلے میں ہنگامہ شروع کر دیتا۔ سارے محلے والوں کو معلوم ہو جاتا کہ تم جھوٹ بول کر دھوکا دے کر لندن گئی ہو۔ ہم سب کا مذاق اڑایا جاتا۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ ہم مجبوراً خاموش رہے اور وہ بچے کو لے کر چلا گیا۔"

رخسانہ سامنے دیوار کو تک رہی تھی اور سن رہی تھی پھر اس نے کہا "اب میرے پاس کیا رہ گیا ہے؟ وہ میرے پاس کیا لینے آئیں گے؟ میں اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھی ہوں۔ جو کچھ میرے پاس تھا۔ اسے جھوٹ و فریب نے کھالیا۔ ایک بچے کی آس تھی۔ وہی ایک بیچ کی کڑی تھا۔ اسے بھی وہ لے گئے۔ میں کیا کروں میں کہاں جاؤں کہاں تلاش کروں؟"

وہ سب سر جھکائے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ رخسانہ نے کہا "تم سب خاموش کیوں ہو؟ فرزانہ کچھ بولو۔ مجھے گالیاں دو۔ مجھ پر لعنت بھیجو۔ میں نے اپنے شوہر کو ایک نہیں دو بار دھوکا دیا۔ مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے اور یہ کتنی بڑی سزا ہے۔ میں شوہر کے ساتھ ساتھ بچے سے بھی محروم ہو گئی ہوں۔"

پھر وہ اپنی امی کی طرف پلٹ کر بولی "اور امی' میرا گھر برباد کرنے والی آپ ہیں آپ نے داماد کی مخالفت میں یہ نہیں سوچا کہ ان کے خلاف مجھے بھڑکائیں گی اور کوئی ایسا مشورہ دیں گی جو ان کے مزاج کے خلاف ہوا تو میرا گھر برباد ہو گا۔ میں آپ کی باتوں میں آگئی میں آپ کو کیا بولوں۔ کیا الزام دوں۔ قصور تو میرا ہی ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھام رکھا تھا چہرہ اور ہاتھ آنسوؤں سے تر بہ تر ہو رہے تھے پھر اس نے آنسو پونچھنے کے لیے اپنے دوپٹے کو سنبھالنا چاہا۔ سر اٹھایا تو ایک دم سے رونا بند ہو گیا۔ آنکھوں کو یقین نہیں آیا کہ وہ جانی کو

دیکھ رہی ہے وہ سامنے ہی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ ایک قدم بڑھا کر اندر آگیا۔

سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سب کی نظریں اس پر مرکوز تھیں جانی کا حلیہ عجیب تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے مہینوں سے برسوں سے پریشان حال رہا ہو۔ سر کے بال بڑھے ہوئے اور بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں کسی قدر اندر کو دھنس گئی تھیں۔ بیمار بھی نظر آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رخسانہ تڑپ گئی۔

وہ جانی کہہ کر آگے بڑھی مگر وہ آگے نہیں بڑھا۔ وہ اور آگے بڑھی۔ وہ پتھر بنا رہا پھر وہ قریب پہنچ گئی۔ دل میں ڈر رہی تھی یک بیک وہ بھڑک نہ جائے۔ اس کے غصے کو خوب سمجھتی تھی پھر اس نے سہمے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو کو تھام لیا۔ وہ ایک دم پتھر کا مجسمہ لگ رہا تھا۔ کچھ نہیں بول رہا تھا۔ صرف اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

اس کے تیور دیکھ کر دور ایک گوشے میں کھڑی ہوئی فرزانہ اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ وہ بھی جانی کے مزاج کو اور غصے کو خوب سمجھتی تھی۔ اس درندے کے ہاتھوں مار کھا چکی تھی۔ جب بھی اس مار کی یاد آتی تھی تو بدن دکھنے لگتا تھا۔

رخسانہ نے آہستگی سے پوچھا "جانی! مجھے مارو گے؟ مجھے جان سے مار ڈالو مگر ایک بات کا یقین کر لو۔ جب تم یقین کر لو گے تو میں خوشی سے تمہارے ہاتھوں مر جاؤں گی۔ جانی! میں تمہاری اور صرف تمہاری رہی جہاں بھی گئی کسی نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں اپنے بچے کی قسم کھاتی ہوں۔ خدا اور رسولؐ کو گواہ بناتی ہوں۔ تم ایک بار اپنی زبان سے یہ کہہ دو کہ رخسانہ تم جھوٹی ہو۔ فریبی ہو۔ مکار ہو۔ ناقابل اعتبار ہو۔ مگر باحیا ہو۔ عورت کی شرم رکھنا جانتی ہو۔ تو بس اتنا سن کر خوشی سے مر جاؤں گی۔"

وہ گم صم کھڑا رہا جیسے گونگا ہو گفتار بھول گیا ہو۔ جیسے بہرا ہو' سماعت سے محروم ہو گیا ہو۔ رخسانہ نے اسے محبت سے جھنجوڑتے ہوئے کہا "میری بات کا جواب نہیں دو گے؟ دیکھو' میں وہی ہوں جس کے سامنے پہنچتے ہی تم پتھر سے موم بن جایا کرتے تھے۔ چلو اتنا ہی بتاؤ کہ میرا کامی کیسا ہے؟"

پہلی بار جانی کے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اس کی لب ہلے پھر وہ بڑے ہی مستحکم لہجے میں بولا "کامی تمہیں نہیں ملے گا۔ تم اس کے لیے عدالت کے دروازے کھٹکھٹا سکتی

ہو۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی "نہیں جانی! نہیں میں کبھی کے لیے کبھی اصرار نہیں کروں گی۔ تم مجھے چھوڑ دو گے، پھر بھی میں تمہاری شریک حیات بن کر ساری عمر گزار دوں گی میں تمہاری زبان سے صرف یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم مجھے بے حیا نہیں سمجھتے ہو۔"

"میں سمجھ کر بھی تمہارا کیا بگاڑ لوں گا۔ میں جہاں جاتا ہوں سب تمہاری حمایت کرتے ہیں۔ جس سے پوچھتا ہوں۔ وہ تمہیں معاف کرنے کے لیے کہتا ہے میں نے عالم دین سے فتویٰ حاصل کیا۔ وہ کہتے ہیں، میری مرضی پر ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں چھوڑ دوں اور چاہوں تو تمہیں اپنے گھر میں بسالوں لیکن تمہیں نہ چھوڑنے، تم سے صلح کرنے اور تمہیں رکھ لینے میں نیکی ہے۔ مجھے اس کا اجر ملے گا مگر کیا مل رہا ہے۔ ایک بار نہیں بار بار دھوکے مل رہے ہیں۔ میں کتنی بار عالم دین سے فتویٰ حاصل کروں؟"

"اب ایسا نہیں ہوگا جانی، چاہے مجھ سے کیسی قسم لے لو۔ مجھے سب سے بڑی سزا دے دو۔ مجھے ہر طرح سے آزمالو۔ میں منہ سے اُف نہیں کروں گی۔ تمہارے ہاتھوں سے سزا پاؤں گی۔ تم خود سوچو۔ اگر میں بے حیا ہوتی۔ لالچی ہوتی تو تمہارے ہاتھوں سزا پانے کے لیے کبھی واپس نہ آتی۔"

جانی نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا "تمہارا فیصلہ یہاں نہیں، ہمارے گھر میں ہوگا۔"

وہ خوش ہو کر بولی "میں ابھی چلتی ہوں۔ چلو۔"

"ایسے نہیں۔ اپنے یہ سینڈل اتار دو۔"

رخسانہ نے تعجب سے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے سختی سے کہا "تم نے سنا نہیں۔ اپنے سینڈل اتار دو۔"

وہ پیچھے ہٹ کر سینٹر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں سینڈل اتار دیے۔ ننگے پاؤں کھڑی ہوگئی۔ تب جانی نے کہا "میں اپنی ٹیکسی میں بیٹھ کر جا رہا ہوں۔ تم ٹیکسی کے پیچھے پیچھے پیدل آؤ گی۔ ننگے پاؤں چلو گی اور میرے گھر تک پہنچو گی۔ اگر تم میں یہ حوصلہ ہے اور تم یہ سزا برداشت کر سکتی ہو تو چلی آؤ۔"

"میں وہی کروں گی جو تم چاہو گے۔"

بیگم جلدی سے آگے بڑھ کر بولیں "ہوش میں تو ہو؟ ایسی جنم کی گرمی پڑ رہی ہے باہر لو چل رہی ہے۔ سڑکوں پر سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے، انگارے بچھا دیے گئے ہوں۔ اس پر تم ننگے پاؤں چل کر ناگن چورنگی تک جاؤ گی۔ کیا تم زندہ رہ سکو گی؟"

"امی! خبردار ہمارے درمیان اب کبھی نہ آنا۔ آپ ہی کی باتوں میں آ کر میری قسمت پھوٹ گئی ہے۔ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں مگر میں ان کے حکم کی تعمیل کروں گی۔ جو سزا ملے گی۔ اسے قبول کروں گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ رجب علی نے کہا "مسٹر جانی! ہم آپ کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے لیکن از راہ انسانیت آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی شریک حیات کو ایسی سزا نہ دیں۔ یہ سزا نہیں ظلم ہے۔"

"میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ سبھی لوگ معاف کرنے کے لیے کہتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں۔ اگر خطا کار کو اسی طرح معاف کر دیا جائے اور اس کو سزا نہ ملے تو ایسی خطائیں عام ہوتی رہیں گی۔"

وہ پلٹ کر دروازے کی طرف گیا پھر وہاں رک کر اس نے ایک نظر فرزانہ پر ڈالی۔ اس کے بعد رجب علی کو دیکھ کر کہا۔ اپنا اپنا انداز جدا ہوتا ہے۔ آپ کا انداز شاعرانہ ہے۔ میرا جارحانہ ہے۔"

وہ باہر آگیا۔ تیزی سے چلتا ہوا رخسانہ کے قریب سے گزرتا ہوا ٹیکسی کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کر دیا پھر کھڑکی کے پار رخسانہ کو دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ گھر کے دروازے پر بیگم، فرزانہ اور رجب علی آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جانی پھر ٹیکسی سے نکلا۔ تیزی سے قریب آ کر دھمکی دینے کے انداز میں بولا "صرف رخسانہ میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلتی رہے گی۔ اگر کوئی اس کے ساتھ آئے گا یا ہمارا پیچھا کرے گا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا اس وقت تک رخسانہ گاڑی کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سر پر آنچل رکھ لیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے

گی۔ وہ پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

اگرچہ یہ بہت ہی برا لگ رہا تھا۔ ایک مضحکہ خیز تماشا تھا۔ تاہم عبرت کا مقام تھا۔ اسی گھر سے وہ رخسانہ کو دلہن بنا کر لے گیا تھا۔ اسی ٹیکسی میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ دلہن عزت بن کر رہنے کے لیے آئی تھی۔ آج اس دلہن نے اپنا مان کھو دیا تھا۔ اس لیے بابل کے گھر سے ننگے پاؤں اپنے سسرال جا رہی تھی۔

گیارہ بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ سورج پر سر پر آ گیا تھا۔ دھوپ اتنی تیز، اتنی شدید تھی کہ کولتار کی سڑک جگہ جگہ سے پگھلتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور زمین ایسے جل رہی تھی جیسے پاؤں تلے انگارے بچھا دیے گئے ہوں۔

اور وہ چلتی جا رہی تھی۔ جانی گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا کر دور جاتا اور رک جاتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قریب آتی تھی۔ وہ گاڑی کو آگے بڑھا دیتا تھا۔ عقب نما آئینے میں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے پاؤں کی طرف بھی نظر جاتی تھی۔ وہ کیسے چل رہی تھی۔ یہ چلنے والی جانتی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو جانی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس سنگ دل کی بے نیازی جیسے کہہ رہی تھی۔

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

ناظم آباد کے پل تک پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹا گزر گیا۔ حالانکہ فاصلہ مختصر تھا۔ اگر ایک رفتار سے چلا جاتا تو صرف دس منٹ میں وہاں پہنچ سکتے تھے لیکن وہ کس طرح چل رہی تھی یہ اس کے پاؤں کے چھالے بتا رہے تھے۔ اس کے صرف پاؤں ہی نہیں بلکہ پورا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ گرمی سے تپ رہا تھا اسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اپنے وجود کے اندر سے دھواں ہی دھواں نکل رہا ہو۔

نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں پہنچ کر وہ ڈگمگانے لگی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے۔ پاؤں اٹھا کر آگے رکھتے وقت لرز جاتی تھی کہ پھر وہی انگارے ملیں گے پھر نئے چھالے بنیں گے۔ اپنے گھر کی جنت تک پہنچنے کے لیے ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بڑے ہی کرب سے بولی۔

"میرے اللہ میرے مالک، مجھے حوصلہ دے میں بچپن سے سنتی آئی ہوں کہ پل صراط

ایک آزمائشی راستہ ہے جو اس راستہ سے گزر جائے گا وہ سیدھا جنت کے دروازے پر پہنچے گا۔ جو گنہگار ہو گا جس کے قدم لڑکھڑائیں گے۔ جو گر جائے گا۔ وہ جہنم کی آگ میں پہنچے گا۔ میں گرنا نہیں چاہتی میرے مالک، مجھے حوصلہ دے۔"

حیدری کے پاس کچھ لوگوں نے ذرا توجہ دی۔ تعجب سے دیکھا کہ ایک بے حد حسین لڑکی ننگے پاؤں تپتی ہوئی سڑک پر سے گزر رہی ہے جب کہ اس کے آگے آگے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک خالی ٹیکسی چلی جا رہی ہے۔ یہ نصیب کی بات تھی کہ کراچی جیسے معروف شہر میں کچھ لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ تیز رفتار گاڑیوں سے گزرنے والوں نے بھی یقیناً دیکھا ہو گا اور نظر انداز کر دیا ہو گا۔ ایک بوڑھے شخص نے اپنی چھتری کو سنبھالتے ہوئے قریب آ کر پوچھا "بیٹی! تم کون ہو؟ اس طرح کیوں جا رہی ہو؟ کیا تمہارے پاس چپل نہیں ہیں۔ کیا تمہارے پاس بس کا کرایہ بھی نہیں ہے؟"

وہ چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے سیدھی ٹیکسی پر جمی ہوئی تھیں چہرہ پسینے سے تربتر تھا اور وہ چہرہ ایسا سرخ تھا جیسے آگ دہک رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ اگر بولنا بھی چاہتی تو شاید ہونٹوں کو جنبش نہ دے سکتی۔

بڑے میاں نے اس کے سر پر چھتری کا سایہ کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولنے لگے "تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ میرے ساتھ چلو میں بس میں تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا۔ کہاں رہتی ہو؟"

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں آ گئی ہو۔ وہ چھتری رحمت کی ٹھنڈی چھاؤں بن گئی تھی۔ اگرچہ پاؤں اس طرح جل رہے تھے۔ کولتار کی سڑک گرم گرم سلاخوں کی طرح تلوؤں کو داغ رہی تھی۔ چھالے صرف تلوؤں میں نہیں تھے۔ وہ تلوؤں سے اوپر جگہ جگہ پھول کی طرح کھل رہے تھے۔ شگوفوں کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ جب ان میں سے پانی بہتا تو کسی قدر ہلکی سی ٹھنڈک ہوتی پھر وہی جلن شروع ہو جاتی تھی۔

وہ چھتری کے سائے میں چند قدم تک چل سکی پھر چونک گئی۔ جانی بار بار ٹیکسی کا ہارن بجا رہا تھا۔ جیسے ڈانٹ رہا ہو۔ جھڑکیاں دے رہا ہو۔ وہ اس کے رشتے داروں کو دھمکیاں دے چکا تھا کہ کوئی ان کے پیچھے نہ آئے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ صرف

اپنے سہارے چلتی رہے گی۔ کسی کی مدد حاصل نہیں کرے گی۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی اس نے اپنے لرزتے ہوئے ایک ہاتھ کو اٹھا کر چھتری کو ایک طرف ہٹا دیا۔

بڑے میاں نے حیرانی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ بڑے میاں نے پھر ساتھ چلتے ہوئے سایہ کرتے ہوئے پوچھا "تم کیا کر رہی ہو؟ تم سائے میں چلنا کیوں نہیں چاہتیں؟"

اس نے پھر ایک ہاتھ سے چھتری کو ہٹا دیا۔ بڑی مشکل سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی "باباجی۔ آپ جائیں۔ میں ایسے ہی جاؤں گی۔"

"مگر ایسے ہی کیوں جاؤ گی؟"

"جو عورت.... عورت سائے میں رہ کر.... رہ کر دھوپ کو.... کو بھول جاتی ہے۔ اس کو دھوپ میں.... دھوپ میں چلنا چاہیے۔ سزا.... سزا پانا چاہیے...."

وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی جیسے اپنے سینے کا تمام زور لگا کر الفاظ ادا کر رہی ہو پھر وہ لڑکھڑا گئی۔ باباجی نے اسے سنبھالنا چاہا۔ اس سے پہلے ہی اس نے خود سنبھل کر ان کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ غصہ دکھاتے ہوئے' دانت پیستے ہوئے یوں بڑے میاں کو دیکھا کہ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس وقت تک کچھ اور لوگ پیچھے چلے آ رہے تھے۔ بڑے میاں نے کہا "یہ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ میں سائے میں لے جانا چاہتا ہوں سایہ قبول نہیں کرتی۔ میں بس میں بٹھا کر لے جانا چاہتا ہوں' یہ انکار کرتی ہے۔ اس کے پیروں کی حالت دیکھو۔ دیکھا نہیں جاتا۔ چھالوں سے رستا ہوا پانی میری آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ میری آنکھیں دھندلا رہی ہیں۔ یا خدایا! یہ کیا منظر ہے؟"

محبت کے جلتے ہوئے صحرا میں وہ آبلہ پا چلی جا رہی تھی۔ ایک عورت تیزی سے چلتے ہوئے اس کے برابر آئی "بہن! تم کون ہو؟ صورت شکل سے کسی شریف گھرانے کی لگتی ہو۔ لباس بھی اچھا اور مہنگا پہنا ہے۔ ایسا کپڑا ہمارے ہاں نہیں ملتا۔ تم کہاں جا رہی ہو۔ مجھے بہن سمجھ کر بولو۔"

وہ سامنے ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے چلتی رہی۔ اس عورت نے ذرا سختی سے کہا "توبہ ہے کیا پاگل ہو؟ میری باتیں سنائی نہیں دیتیں؟ کیا بہری ہو؟ دیکھو جواب نہیں دوگی تو ہم تمہیں پکڑ کر پاگل خانے پہنچا دیں گے۔"

تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ چلتی رہی۔ اس عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنی طرف کھینچنا ہی چاہتی تھی کہ رخسانہ نے ایک زور کی چیخ ماری۔ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا پھر اس عورت کے گریبان کو پکڑ لیا۔ وہ عورت اک دم سے گھبرا گئی۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر ایک جھٹکے سے اپنے گریبان کو چھڑایا پھر پلٹ کر بھاگتے ہوئے کہنے لگی "ارے! یہ تو پاگل ہے۔"

پیچھے سے کچھ لوگوں کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ کسی نے کہا "پاگل تو ہم ہیں۔ بس اسٹاپ کو پیچھے چھوڑ کر اس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔"

کسی بوڑھے نے کہا "کیوں نہیں جاؤ گے۔ جوان لڑکی جو ہے۔"

آوازیں دور ہونے لگیں۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ پیچھے والے پیچھے ہی رہ گئے تھے۔ کسی پاگل لڑکی کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ اگر معلوم ہوتا کہ وہ سزا کاٹ رہی تھی تب بھی کوئی اس کے ساتھ نہ آتا کیونکہ اس دنیا میں کوئی کسی کی سزا نہیں کاٹتا۔ اپنا دکھ آپ جھیلنا پڑتا ہے۔

وہ اب تھرتھرا رہی تھی۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ کوئی ظلم کی انتہا تھی۔ سورج سوا نیزے پر ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سر اس قدر گرم ہو گیا تھا کہ چکرا رہا تھا۔ آس پاس کا ماحول آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ آہستہ آہستہ نشہ چھا رہا تھا۔ جیسے شرابی ڈگمگاتے ہوئے چلتے ہیں۔ وہ اسی طرح چل رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ بس اتنا معلوم تھا کہ ہر قدم اس کی منزل کو قریب لا رہا ہے۔

اب وہ سخی حسن کے نسبتاً ویران راستے سے گزر رہی تھی۔ ناگن چورنگی زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ اسی وقت ایک ٹیکسی قریب آ کر رکی اس میں سے فرید احمد' ان کی بیگم' فرزانہ اور رجب علی باہر نکلے اور تیزی سے چلتے ہوئے رخسانہ کے آس پاس پہنچ گئے۔ اسے آواز دی لیکن جواب نہیں ملا۔ وہ نشے کی حالت میں' جنون کی حالت میں آگے اور آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ بول رہی تھی۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ آواز نہیں نکل رہی تھی۔

فرزانہ اس کی حالت دیکھ کر تڑپ گئی۔ تیزی سے ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہ ظلم کی انتہا ہے۔ جانی تم درندے ہو۔"

رجب علی بھی جانی کے قریب پہنچا پھر اس نے کہا "جانی! انسان بنو اور فوراً بھابی کو ٹیکسی میں بٹھا کر لے جاؤ۔"

جانی نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی کو آگے بڑھایا۔ رجب علی پیچھے رہ گیا۔ ٹیکسی کی رفتار اور بڑھ گئی۔ وہ دور چلا جا رہا تھا۔ رجب علی دانت پیس کر مٹھیاں بھینچ کر ادھر دیکھتا رہا فرزانہ نے کہا "وہ کسی کی بات نہیں سنیں گے۔ میں انہیں خوب جانتی ہوں۔"

پھر وہ دونوں پلٹ کر رخسانہ کے پاس آئے۔ وہاں اس کی امی اور ابو سمجھا رہے تھے "بیٹی! آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔"

فرزانہ نے بھی التجا کی۔ رجب علی نے بھی سمجھایا۔ تب وہ اپنی تھرتھرائی ہوئی قوتوں کو کام میں لاتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی "مجھ کو بولنے پر مجبور نہ کرو۔ بولوں گی تو گر پڑوں گی۔ مجھ کو اپنے اعتماد پر چلنے دو۔ چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

اس کی آواز میں ایسی لرزش، لہجے میں ایسی التجا اور التجا میں ایسا درد و کرب تھا کہ سب اس سے ذرا دور ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ سر جھکا کر چلنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے رخسانہ کو سہارا دیا یا اسے ٹیکسی میں زبردستی بٹھا کر پہنچایا تو جانی کبھی اسے معاف نہیں کرے گا۔ رجب علی سے یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ فوراً ہی مڑ کر دور کھڑی ہوئی ٹیکسی کے پاس گیا پھر اس میں بیٹھ کر کہا "ناگن چورنگی کی طرف چلو۔"

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ جانی کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ ٹیکسی کو احاطے کے باہر روکا۔ جانی باہر ہی کھڑا تھا۔ رجب علی نے ٹیکسی سے باہر آ کر دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کیا پھر غصے سے سنسناتے ہوئے پاس آ کر بولا "یہ کیسی درندگی ہے؟ کیا تمہیں ذرا بھی اپنی شریک حیات پر ترس نہیں آتا؟ کیا تم انسان نہیں ہو؟"

"میں آدھا انسان ہوں، آدھا شوہر ہوں، وہ آدھی عورت ہے، آدھی بیوی ہے۔ اس نے پلاسٹک سرجری سے ایک عورت کا چہرہ مکمل کر لیا۔ بیوی کا چہرہ میں مکمل کر رہا ہوں۔ جو یہ سزا پا کر ہی مکمل ہو گا۔"

وہ جھنجھلا کر بولا "کوئی ضروری نہیں ہے کہ بیوی کو سزا دینے کے لیے غیر انسانی سلوک کیا جائے۔"

وہ بڑے تحمل سے بولا "مجھے غیر انسانی سلوک پر مجبور کیا گیا ہے۔ جنہوں نے مجبور کیا

آپ ان سے کیوں نہیں پوچھتے؟"

رجب علی ذرا ٹھنڈا پڑ گیا۔ ذرا نرم لہجے میں بولا "میں جانتا ہوں۔ آپ کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے مگر اب بہت ہو چکا۔ خدا کے لیے بھابی کو معاف کر دو۔ انہیں گاڑی میں بٹھا کر لے آؤ۔"

جانی نے دور دیکھتے ہوئے کہا "اس کی ضرورت نہیں ہے وہ دیکھو وہ چلی آ رہی ہے۔"

رجب علی نے ادھر دیکھا۔ وہ بڑی مستقل مزاجی سے بڑے حوصلے سے ڈگمگاتے ہوئے ڈولتے ہوئے، لڑکھڑاتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلائے، کبھی اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے، کبھی گردن کو سہلاتے ہوئے کبھی اپنے سر کے بالوں کو نوچتے ہوئے چلی آ رہی تھی۔ رجب علی نے تڑپ کر کہا "جانی! خدا کے لیے اسے معاف کر دو۔ دیکھو، جب مجرم سزا کے اختتام کے قریب پہنچتا ہے تو اس کی باقی ماندہ سزا معاف کر دی جاتی ہے۔ تم بھی معاف کر سکتے ہو۔"

جانی نے کہا "ریس میں اول آنے والا گھوڑا جہاں سے اپنی دوڑ شروع کرتا ہے وہیں آ کر اپنی دوڑ ختم نہ کرے تو انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔"

رجب علی دانت پیستے ہوئے رخسانہ کے پاس تیزی سے جانے لگا۔ اس کے پیچھے فرید احمد، بیگم اور فرزانہ چلے آ رہے تھے۔ جانی وہاں سے پلٹ کر اپنے مکان میں آ گیا۔ کمرے میں محمد سپاہی کی بوڑھی والدہ بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا "ماں جی! میری بیوی آ رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی بوڑھی خاتون بچے کو لے کر اٹھ گئیں "کہاں ہے؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ میں اپنی بہو کا استقبال کروں گی۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے جانی کے ساتھ برآمدے میں آئیں۔ جانی نے دور آنے والی رخسانہ کی طرف اشارہ کیا۔ بوڑھی خاتون نے اپنی آنکھوں کے اوپر ایک ہتھیلی کا چھجہ بناتے ہوئے غور سے دیکھا پھر پوچھا "جانی! کیا تم نے وہی کیا ہے جو مجھ سے کہا تھا؟"

"جی ہاں، ماں جی!"

"کیا یہ اپنے گھر سے اتنی دھوپ میں ننگے پاؤں چلتی آ رہی ہے؟"

"جی ہاں' ماں جی!"

"بس کر درندے! جا اسے اٹھا کر لے آ۔"

"نہیں ماں جی! اسے خود ہی اپنے پیروں پر چل کر آنے دیں۔"

"میں کہتی ہوں جانی! اسے اٹھا کر لے آ۔ نہیں تو وہ مر جائے گی۔"

"نہیں مرے گی۔" جانی نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر سینہ تان لیا' پھر گردن اکڑا کر بولا "وہ جانی کی عورت ہے جان دے کر بھی دروازے تک پہنچے گی۔"

رخسانہ چلتے چلتے لمحوں کے لیے رک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر سامنے اپنے مکان کی طرف دیکھا۔ وہ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ مکان کے برآمدے میں کھڑا ہوا جانی بھی دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رخسانہ کی دم توڑتی ہوئی قوتوں کو جیسے ایک نئی زندگی ملی۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ لڑکھڑائی' سنبھل گئی' پھر آگے بڑھنے لگی۔ پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ چل رہی تھی۔ کیسے چل رہی تھی' یہ اس کا خدا جانتا تھا۔

وہ احاطے میں داخل ہو گئی۔ اب وہ کسی کمزور بوڑھی عورت کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پورا بدن لرز رہا تھا۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور آگ کی طرح سرخ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پانی میں آگ لگاتے ہوئے آئی ہو۔ وہ کسی طرح برآمدے کے زینے تک پہنچ گئی۔ ممدو کی بوڑھی والدہ نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی! مجھے افسوس ہے تجھے یہ سزا ملی۔ لے اپنے بچے کو سنبھال۔"

رخسانہ کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ جھوم رہی تھی' جیسے نشے میں ہو۔ عالم جنون میں ہو' جیسے اپنے آپ کو بھول گئی ہو۔ بس ایک ہی بات جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کہاں ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ سامنے نظر آیا۔

اس نے بچے کو گود میں نہیں لیا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ایک تنکا بھی اٹھا سکتی۔ وہ جانی کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے تھرتھراتے ہوئے دونوں بازوؤں کو اس کی طرف آہستہ آہستہ اٹھا کر پھیلایا۔ وہ بازو ایک لمحے میں فریادی تھے۔ دوسرے لمحے وہ چکرا گئی پھر اس پر آ گری۔ جانی نے فوراً اسے سنبھال لیا۔

وہ اسی کے بازوؤں میں سنبھلنے لگی تھی لیکن بے ہوش ہو گئی تھی۔ جس سہارے کے لیے آئی تھی اسے پہچان نہیں سکتی تھی پھر اس کا وقت عالم سکوت میں گزرنے لگا۔ اس

کے چاروں طرف خاموشی تھی۔ وجود کے اندر سناٹا تھا۔ دماغ چپ اور بے حس تھا۔ ساری کائنات ایسی ویران ایسی چپ چاپ تھی کہ ایک ذرا سی بھی آواز کہیں سے نہیں آتی تھی۔

اس نے دیکھا' وہ بادلوں کے سفید بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ بہت سی پریاں اس کے زخمی تلوؤں کو بادلوں کے پھاہوں سے سہلا رہی ہیں' مرہم رکھ رہی ہیں۔ اس کی تیمارداری کر رہی ہیں۔ غلام ہاتھ باندھے اس کے آس پاس سفید لباس میں سر جھکائے کھڑے ہیں پھر ایک فرشتہ اپنے پر پھیلائے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "رخسانہ بیگم! تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ تم نے پل صراط کو پار کر لیا اور تم جنت کے دروازے سے داخل ہو کر یہاں پہنچ گئی ہو۔ اب یہ جنت تمہارے لیے ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہیں نہیں۔ مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے جہاں میرا پیار نہ ہو' میرا شوہر نہ ہو۔ میرا بچہ نہ ہو۔ میں ایسی جنت میں نہیں رہوں گی۔ جانی! جانی!"

اسے جانی کی آواز سنائی دی "ہاں! رخسانہ میں تمہارے پاس ہوں۔ دیکھو' آنکھیں کھولو۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جانی اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ بستر کے ایک طرف اس کے ابو کھڑے تھے۔ اس کی امی نے اپنے نواسے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ اس نے بس ایک نظر ادھر ڈالی پھر جانی کو دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تصدیق کے لیے اپنے ایک ہاتھ کو جنبش دی۔ اسے کمزوری کا احساس ہوا' لیکن وہ ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھتا ہوا جانی کے پاس پہنچا پھر اس نے چھو کر دیکھا یقین ہو گیا کہ جانی اس کے پاس ہے تو وہ مارے خوشی کے کانپنے لگی۔ اس کا چہرہ کھل گیا۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری روشنیاں جگمگانے لگیں پھر وہ جگمگاتی ہوئی روشنیاں بھیگنے لگیں۔ آنکھوں کی دہلیز سے بہنے لگیں۔ چہرے کے گلاب پر شبنم شبنم ہو کر مسکرانے لگیں۔

○☆○

وہ بستر پر اوندھے منہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کا چہرہ نرم تکیے میں دھنسا ہوا تھا۔

گہری نیند میں رخسانہ کی رس بھری آواز سنائی دی "جانی! اٹھ بھی جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔"

وہ اسی طرح سوتا رہا پھر اسے کانوں کے قریب ہی مترنم سرگوشی سنائی دی "جانی! میرے اچھے جانی!"

جانی نے کچھ گدگدی سی محسوس کی۔ چہرے پر سرسراہٹ ہوئی۔ اس کی ریشمی زلفیں اسے جگا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے چہرے کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے پیچھے ساری دنیا چھپ گئی تھی۔ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ آہستگی سے بولی "دیر ہو رہی ہے۔ جلدی اٹھ جاؤ ورنہ ہم صحیح وقت پر ائرپورٹ نہیں پہنچ سکیں گے۔"

تب جانی جیسے نیند سے بیدار ہوا۔ تب اسے یاد آیا کہ آج فرزانہ اپنا ملک چھوڑ کر جا رہی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ادھر فرزانہ تصور میں آئی۔ ادھر رخسانہ نگاہوں کے سامنے مجسم تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر آئینے کے پاس گئی اور اپنے بالوں کو درست کرنے لگی۔ اس نے اتنا عمدہ لباس پہنا ہوا تھا کہ نگاہیں اس پر سے ہٹنا نہیں چاہتی تھیں' اور وہ بھی فرزانہ کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جا رہی تھی۔ بہت اچھا کر رہی تھی۔ ویسے بھی رخسانہ ایسی مکمل ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے وہ ساری دنیا کو بھلا سکتا تھا۔

اس نے سوچنے کے دوران رخسانہ کے پاؤں کی طرف دیکھا وہاں چھالے ختم ہو چکے تھے۔ زخم بھر گئے تھے کہیں کہیں زخموں کے نشان تھے وہ بھی مٹ رہے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھی سینڈل پہن رہی تھی۔ اس نے کہا "رخسانہ! میری بات مان لو۔ میں ائرپورٹ نہیں جاؤں گا۔"

"یہ بری بات ہے۔ میں نے فرزانہ اور اس کے میاں کو یہاں کھانے کی دعوت دینی چاہی' تم نے انکار کر دیا۔ تم کتراتے کیوں ہو؟ اس سے اچانک ہی کیوں نفرت کرنے لگے ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں نہ بلاؤں' کھانے کی دعوت نہ دوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نفرت کر رہا ہوں۔ میں الوداع کہنے کے لیے ائرپورٹ جاؤں تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہو گا کہ اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تم مجھ

سے زیادہ سمجھ دار ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے اس سے دور رہنا چاہیے۔ میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ میرا اس کے سامنے جانا' اس سے ملنا' اس سے باتیں کرنا بالکل بے معنی اور غیر ضروری ہے۔"

رخسانہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "چلو' میں تمہاری بات مانتی ہوں مگر مجھے ائرپورٹ تک پہنچانے تو جاؤ گے۔"

"میں تمہاری امی کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔ تم ان کے ساتھ چلی جانا۔"

وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے رخسانہ اور بچے کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ رخسانہ نے پوچھا "رات کو جلدی آؤ گے نا؟"

"ہاں' دو چار سواریاں اٹھاؤں گا۔ اس کے بعد گھر آ جاؤں گا۔"

"تم ٹھیک سوچتے ہو کہ فرزانہ کے سامنے نہیں جانا چاہیے لیکن آج وہ جا رہی ہے۔ اس بات کو محسوس کرے گی۔"

"کیا اس نے ایسی کوئی بات کہی ہے؟ کیا وہ میرے متعلق کچھ کہتی ہے؟"

"اس نے کچھ کہا تو نہیں ہے لیکن میں سمجھ سکتی ہوں۔"

"ابھی وہ یہاں سے روانہ ہو جائے گی پھر تمہارے سمجھنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہے گا۔ اس بات کو ختم کرو۔"

اس نے رخسانہ اور بچے کو اس کے میکے پہنچا دیا پھر وہاں سے ٹیکسی لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے دماغ میں یہ بات گونج رہی تھی کہ وہ چلی جائے گی۔ اپنا ملک چھوڑ دے گی۔ اپنوں کو چھوڑ دے گی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ایسے جا رہی ہے جیسے دنیا چھوڑ کر جا رہی ہو۔

دماغ میں بہت ساری باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کا شوہر ایک زمیں دار تھا۔ اس کے چچا بھی زمیں دار تھے۔ اس کے سسرال میں بڑی خوش حالی تھی۔ سنا تھا کہ بہت دولت مند لوگ ہیں۔ فرزانہ کے لیے کراچی میں ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ہزاروں میل دور ملازمت کرنے جا رہی تھی آخر کیوں؟

دو گھنٹے بعد وہ ائرپورٹ روڈ سے گزرتا ہوا اسٹار گیٹ کے پاس پہنچا۔ وہاں سے ائرپورٹ کا فاصلہ صرف ایک منٹ کا تھا لیکن وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے چھوٹے گیٹ کے پاس اس نے ٹیکسی کھڑی کر دی۔ اسے لاک کر کے ایک بس میں بیٹھ کر ائرپورٹ پہنچا۔ دور ہی

سے فرزانہ نظر آگئی۔ وہ رخسانہ سے باتیں کر رہی تھی' اس کے آس پاس رجب علی' بیگم اور فرید احمد کھڑے تھے۔ جانی ٹیکسی اسٹینڈ کے پاس تھا۔ مختلف ٹیکسیوں کے پیچھے سے چھپتا ہوا وہاں سے ایسی جگہ جانا چاہتا تھا۔ جہاں سے وہ سب کو دیکھ سکے اور کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔

لیکن فرزانہ نے اسے دیکھ لیا۔ وہ رخسانہ سے باتیں کرتے ہوئے اپنی جگہ سے گھوم کر ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ اسی وقت وہ نظر آگیا۔ ایک ٹیکسی کے پیچھے سے گزرتا ہوا دوسری طرف سے جارہا تھا پھر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوگیا تھا۔

وہ سب ایک کاؤنٹر کے قریب آکھڑے ہوئے۔ بیگم فرزانہ کو دعائیں دے رہی تھیں "بیٹی! جو کچھ بھی ہوا' اسے بھول کر یہاں سے جاؤ۔ زیادہ عرصے تک باہر نہ رہو۔ تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔"

فرید احمد بھی یہی سمجھا رہے تھے۔ رخسانہ بھی یہی پوچھ رہی تھی کہ آخر وہ کب تک مسز سلمیٰ قادر کے ہاں ملازمت کرتی رہے گی؟

فرزانہ نے کہا "میری رجب سے شرط لگی ہے۔ یہ کہتے ہیں میں ان کے پاس واپس آجاؤں گی اور میں کہتی ہوں کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر میرے پاس چلے آئیں گے۔ دیکھیں' کس کی جیت ہوتی ہے۔"

رجب علی ٹکٹ اور سامان کی رسیدیں لے آیا۔ رخسانہ نے کہا "جہاز کی پرواز کے لیے بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ پانچ دس منٹ اپنے میاں سے بھی تو باتیں کرلو۔ آیئے امی! ہم چلیں۔"

وہ سب فرزانہ کو گلے لگا کر' دعائیں دے کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ وہ رجب علی کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ایگزٹ کوریڈور کے پاس آئی۔ اس نے آہستگی سے کہا "جانی مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

رجب علی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا "کہاں؟"

"ادھر ادھر نہ دیکھو۔ انجان بنے رہو۔ میں اپنا ہاتھ بڑھا رہی ہوں' تم میرا ہاتھ تھام لو۔"

اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ رجب علی نے اسے تھام لیا "فرزانہ! تم نے جو کچھ کیا اور

اب جو کچھ کرنے جارہی ہو۔ اس کی مثال کم از کم میرے سامنے نہیں ہے۔"

"اور تم نے میرے ساتھ جو کیا اسے میں کبھی نہیں بھلاؤں گی۔"

"تم صرف جانی کو نہیں بھلا سکو گی۔"

اس کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رجب علی نے کہا "وہ کہیں چھپا ہوا دیکھ رہا ہوگا۔ یہی سمجھے گا کہ اپنے میاں سے رخصت ہوتے وقت رو رہی ہو۔ تمہارا ڈراما بہت ہی کامیابی سے جارہا ہے۔ آنسو سچے ہیں اس کے لیے' جھوٹے ہیں میرے لیے۔"

جانی ایک طرف گم صم کھڑا ہوا تھا۔ اس نے رخسانہ اور اس کے والدین کو واپس جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے دیکھے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ رخصت ہونے والی رو رہی تھی' اپنے میاں کے ساتھ کوریڈور سے گزرتے ہوئے جارہی تھی پھر اس کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچ کر دروازے کے قریب رک گئی۔ اس نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسوؤں کو پونچھا رجب علی کو دیکھا' پھر گھوم کر' دروازہ کھول کر' اس کے دوسری طرف نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

بڑی مشکل ہے۔ آنسوؤں کی زبان نہیں ہوتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دل کا لہو کس کے لیے آنکھوں سے بہہ گیا۔

○☆○

ختم شُد